حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

آیات واحادیث پر مکمل اعراب اور تخریج وتحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب ونظر کو بالیدگی اور فکر وروح کو بصیرت وتازگی بخشتا ہے

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی ومدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج وتحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب

مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب مدظلہ

بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا محمد ساجد صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

بیت السلام......اسلام کی ابدی صداقتوں اور سدا بہار تعلیمات سے معاشرے کو روشناس کرانے کیلئے قائم کیا گیا ایک اشاعتی ادارہ ہے

اغراض و مقاصد

- علماء اسلام کی گرانقدر علمی تالیفات و تصانیف کو عصر حاضر کے جدید طباعتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے زیور طبع سے آراستہ کرنا، تا کہ اسلاف کا ایمان افروز تحریری سرمایہ نئی نسل کو منتقل ہو سکے۔
- اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور فروغ کیلئے اہل علم و دانش کی جدید تخلیقات و تحقیقات کو سلیقے اور ڈھنگ سے شائع کرنا۔
- معاشرے میں امن، انصاف، علم و تحقیق، قومی یکجہتی و باہمی احترام کے جذبات کو فروغ دینا۔

امید ہے کہ! اس سفر میں آپ کی رہنمائی اور دعائیں بیت السلام کے ساتھ رہیں گی

عبدالصبور علوی
مدیر بیت السلام کراچی

نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی فون: 021-32711878 موبائل: 0321-3817119
e-mail: baitussalam_pk@yahoo.com
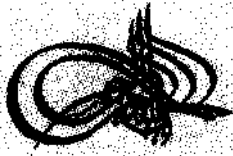
انتسابؒ

خطباتِ حکیم الاسلام

کی ترتیب وتدوین کے اس ذرہ بے مقدار کو اپنے اس صاحب عزیمت وعظیم المرتبت استاذ مستقیم الاحوال بزرگ عارف ربانی کے نامِ منسوب کرتا ہوں جو زندگی بھر خدمت قرآن حکیم میں مصروف عمل رہے اور طالبان قرآن کریم کی ایک دنیا ان سے اکتساب فیض کرتی رہی، بالآخر چالیس برس کی عظیم جدوجہد کے بعد اسی مسند پر جان جاں آفرین کے سپرد کردی، جہاں روز اول درس قرآن کریم کیلئے تشریف فرمائے ہوئے تھے میری مراد مجدد القرآت، استاذ الاساتذہ شیخ العرب والعجم، عارف باللہ سیدی ومولائی حضرۃ الحاج القاری رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرہٗ (خلیفہٗ ارشد حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ) سے ہے جن کے فیض صحبت، بے پایا عنایات اور خصوصی ادعیہ سے بندۂ ناچیز یہ کام کر پایا۔

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

عارف ربانی حجۃ القرأ، شارح شاطبی حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحب ؒ کا

مکتوب گرامی

پیارے عزیز قاری محمد ادریس صاحب نورک اللہ بعلمہ وعوفانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ بخیریت ہوں، مرض میں نہ اضافہ ہے اور نہ افاقہ، اللہ پاک سے احباب کی مخلصانہ دعاؤں کی بدولت صحت وقوت کا امیدوار وطلب گار ہوں، الحمدللہ سب نمازیں حرم شریف میں ہورہی ہیں، کبھی کبھی عمرہ بھی نصیب ہوجاتا ہے۔ ذہنی سکون، طبعی بشاشت میسر ہے۔ فللہ الحمد والشکر آپ کی مساعی حسنہ کے ثمرات خطبات حکیم الاسلام جلد اول مکمل سنے، بے حد لطف آیا۔ اللہ پاک حکیم الاسلام دامت برکاتہم اور جامعین خطبات کو اپنی شایانِ شان دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ یہ ایک مبارک اور عظیم کام کررہے ہیں، ان مواعظ، خطبات کا مقصود یعنی رجوع الی اللہ ورسولہ صحیح معنی میں امت مسلمہ کو عطا ہو۔

میرے پیارے! آیات قرآنی اور احادیث نبوی ؐ اعراب سے معریٰ ہیں، طبع ثانی میں صحیح اعراب لگادیئے جائیں کہ پڑھنے والے سب حافظ وعالم نہیں ہوتے آج کل خطبات ج ۲ سُن رہا ہوں وعظ ''راہ اعتدال، ص: ۴۰ میں'' ھن ام الکتاب کا ترجمہ شاید لکھنے سے رہ گیا ہے طبع ثانی میں اس کو بھی پورا کردیا جائے۔

(تمام احباب کو بہت بہت سلام اور چھوٹے بچوں کے لئے پیار ودعا پیش ہوں، اس پرچہ کی دعائیں اللہ پاک سب کے حق میں قبول فرمائیں۔)

دعوات فتحیہ

حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو اور پورے خاندان کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو کامل عافیت وراحت اور سکون واطمینان کے ساتھ رکھ کر جملہ ضروریات اپنے غیبی خزانے سے پوری فرماتے رہیں اور آج سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک بے شمار، بے حساب، حلال، بابرکت، باوسعت رزق بھی آپ حضرات کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو عطا فرماتے رہیں، نیز آپ حضرات کو اور ہم سب کو آخرت کی فکر وشوق دنیا کی فکر وشوق سے کروڑ درجے زیادہ نصیب فرمائے، نیز موت اور خاتمے کے دن کو ہم سب کے لئے کروڑوں عیدوں سے بڑھ کر خوشی کا دن بنا دیں، نیز ہماری قبروں کو اپنی رحمت سے جنت کا باغ بنا دیں اور دوزخ کے گڑھے نہ بنائیں اور سب کی تمام پریشانیوں کو راحتوں سے اور بیماریوں کو شفائے کامل عاجل مستمرہ سے اور مشکلات کو آسانیوں سے اور رنجوں اور غموں کو خوشیوں سے اور قرض داریوں کو سبکدوشیوں سے اور ع تنگیوں کو فراخیوں سے آن کی آن میں اور دم کے دم میں بدل دیں۔

امین یارب العلمین .بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

از: احقر کاتب السلام علیکم وعرض دعا قبول ہوں
بقلم عبدالقادر بن محمد متقی عفی اللہ عنہما
۱،۳،۱۹۸۲ (بعد عصر حرم نبوی شریف)

کلمات تبرک

الحمدلولیہ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ

امـا بعـد ...... برکۃ السلف، حجۃ الخلف، حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی کی علمی وروحانی شخصیت کا نام نامی آجانا مواعظ وخطبات کی اہمیت وافادیت کے لئے کافی ووافی ہے۔ علوم ومعارف پر مشتمل یہ گرانقدر مجموعہ اہل علم، خطباء، آئمہ مساجد اور مقررین ومبلغین کے لئے علم وحکمت کا عظیم سرمایہ ہے۔ عنوانات کے اضافے سے مضامین کا استحضار نہایت سہل ہوگیا۔

الحمدللہ بندہ نے شروع سے آخر تک تمام مسودہ بنظر عمیق دیکھا، اور متعدد مقامات پر برائے اصلاح نشاندہی کی۔ وفوق کل ذی علم علیم.

عزیزم مولوی حافظ قاری محمد ادریس سلمہٗ (فاضل خیرالمدارس، ملتان) نے شبانہ روز محنت وکاوش سے اسے مرتب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالآخر کتاب، موجودہ شکل میں منظر عام پر آگئی۔ دل سے دعاء ہے اللہ تعالیٰ میرے پیارے عزیز سلمہٗ کی اس محنت وجانفشانی کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے، اور اپنی جناب خاص سے اس کا اجر بے پایاں عنایت فرمائے۔ نیز علم وعمل، صحت وعمر میں برکت نصیب فرما کر خلوص وللّٰہیت کے ساتھ مزید بر مزید خدمت دین متین کے مواقع فراہم فرمائے، اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ (آمین) وھو یھدی السبیل

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

حرف سپاس

ناسپاسی ہوگی اگر اس مجموعہ صد رنگ کا سر نقطۂ آغاز اس بزرگ و مہربان شخصیت کو قرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مجھے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کر دیا، تشکر و امتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک ایسی ہی شخصیت کی جانب سے ہو جو بوقلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والد گرامی کی نسبت و عظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکت اسلوب کا تقاضا کرتا ہے، اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلۂ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کی علمی رہنمائی اور عملی شفقت و عنایت سے ہی میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستہ پند و حکمت کو مرتب کرسکوں۔ دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہٗ بتصدق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظل عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایہ فگن رکھے اور اپنی جناب خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایان شاں اجر و ثواب سے خوش وقت اور شاد کام فرمائے اور اس کوشش ناکام کو سعی مشکور سے مبدل فرمائے۔ (آمین)

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

حیاتِ طیبؒ......ایک مختصر خاکہ

- ......۱۳۱۵ھ جمادی الثانی، پیدائش، (تاریخی نام مظفر الدین اور اصلی نام محمد طیب رکھا گیا)
- ......۱۳۳۷ھ تکمیل درس نظامی
- ......۱۳۵۰ھ خرقہ خلافت از حضرت تھانویؒ
- ......۱۳۳۷ ابتدائے تدریس (جو ۱۳۴۳ھ تک جاری رہی)
- ......۱۳۴۸ھ سے ''اہتمام دارالعلوم دیوبند'' کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کر دی گئیں۔
- ......۱۳۶۰ھ ماہنامہ رسالہ ''دارالعلوم'' کا اجراء
- ......۱۳۶۸ھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لئے حضرت قاری صاحب کا بحیثیت رکن انتخاب
- ......۱۳۹۲ھ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے حضرت مہتمم صاحب کا بطور صدر انتخاب۔
- ......۱۴۰۰ھ دور اہتمام کا آخری سال، دارالعلوم کے اہتمام سے علیحدگی۔
- ......۱۴۰۳ھ (۶ شوال/ ۱۷/ جولائی ۸۳ء) وفات حسرت آیات
- ......تصنیفات و تالیفات کی تعداد ۵۹
- ......دیگر تحریری مواد کی تعداد ۱۷۹ (مقدمات تقریظات اور ملفوظات و مواعظ کی صورت میں)
- ......تقریباً ۳۶ کتب اور رسائل میں آپ کا تذکرہ

مقدمہ

از

ابن الحسن عباسی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام گرامی محتاج تعارف نہیں وہ ازھر ہند دارالعلوم دیوبند کے نصف صدی تک صدر و مہتمم رہے، انہوں نے اپنے دور میں دارالعلوم کو ترقی وشہرت کے بام عروج تک پہنچایا، ان کا دور دارالعلوم دیوبند کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں دارالعلوم کا فیض ہندوستان کے کونے کونے سے لیکر دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلا اور اس دور میں دارالعلوم سے نکلنے والے رجال کار نے ایک عالم کو سیراب کیا۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک باکمال عالم دین، ایک مدبر رہنما و منتظم اور خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسرے اوصاف کے ساتھ ساتھ قوت بیان کا وصف بھی عطا فرمایا تھا۔ وہ ایک شیریں بیان خطیب وواعظ اور دل کی گہرائیوں تک اپنی آواز اتارنے والے مبلغ وداعی تھے، وہ دھیمے اور سبک رفتار اسلوب میں سچائیوں اور صداقتوں کے دریا بہاتے اور دلوں کے خشک کھیتوں کو سیراب کرتے چلے جاتے، ان کے اس وصف سے متعلق حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''حق تعالیٰ شانہ، نے آپ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان وبیان کا خاص انداز اور افہام تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی ہے اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ حقائق وواقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار وحکم اور طریقت وحقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم ومعرفت کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور علوم وھبیہ کا طوفان امڈ آیا ہے۔ حضرت مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب کیا ہوگا اور بعض

اوقات ایک ایک دن کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر وخطابت کی نوبت بھی آئی لیکن ان کی ہر تقریر کا موضوع منفرد ہوتا تھا، اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف واسرار کے ایسے گل ولالہ بکھیرتے کہ حقائق ومعارف کے چمنستان میں نئی بہار آ جاتی۔ ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو بلا تکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ایک موقع پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب ومعانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنی بھرے جاتے ہیں، اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ ''کیا بات ہے؟'' پیش کیا کہ یہ انکار کے لئے بھی ہے اور اقرار کے لئے بھی، استفہام کے لئے بھی ہے اور اخبار کے لئے بھی، داد وتحسین کے لئے بھی ہے اور تحقیر وتقبیح کے لئے بھی، شاباش اور آفرین کے لئے بھی ہے اور زجر وتوبیخ کے لئے بھی۔ الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک ''کیا بات ہے؟'' کی تشریح ہوتی رہی اور حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب ولہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے۔ اور مجمع سحر بیان سے عش عش کر رہا تھا۔ حضرت مرحوم کی بعض تقریریں وقتاً فوقتاً شائع بھی ہوتی رہیں۔ حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہ (خطیب مسجد غفوریہ، حسن پروانہ کالونی ملتان) نے حضرت کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں اور اگر یہ محنت وجستجو جاری رہی اور حضرت کی جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئیں ہیں وہ سب شائع کر دی گئیں تو امت کے لئے حقائق ومعارف اور ''کلمات طیبات'' کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔'' (شخصیات وتاثرات، جلد ا، صفحہ: ۲۱۵)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے اسی وصف بیان کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک وعظ وخطابت کا تعلق ہے، اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایسا عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش وخروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ تکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر،

دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے۔ جوش وخروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی، اور قلب ودماغ کو نہال کردیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیروزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی، اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔ لاہور میں ایک صاحب، علماء دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے سے بہت متاثر اور علماء دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے، طرح طرح کی بدعات میں مبتلا، بلکہ ان کو کفروایمان کا معیار قرار دینے والے، اتفاق سے قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ لاہور تشریف لائے، اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا، یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ مس اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا، اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ہی اپنے عزائم میں زلزلہ سا آ گیا، دل نے اندر سے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب، گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہوسکتا، پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق ومعارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں؟ یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آگے موم ہوچکا تھا، میں نے اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی، اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائی۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ، اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا۔'' (نقوش رفتگان: صفحہ ۱۹۳)

اللہ جل شانہ اپنے نیک بندوں کے آثار وخدمات کی حفاظت کے لئے لوگوں کو مسخر کر دیتے ہیں اور وہ ان آثار وخدمات کی حفاظت کیلئے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو وقف کر دیتے ہیں۔

دارالعلوم دیو بند کے مدیر و مہتمم ہونے کی حیثیت سے حضرت حکیم الاسلام کو دنیا کے مختلف خطوں میں جانے اور وہاں دین اسلام کی دعوت وتبلیغ کی صدا لگانے کا موقع ملا، ان کے یہ خطبات ومواعظ کہیں قلم وقرطاس کے ذریعے اور کہیں ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ ہوتے رہے۔

حضرت مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری مدظلہ کے دل میں اللہ جل شانہ نے ان مواعظ وخطبات کو جمع کرنے اور کتابی شکل میں لانے کا داعیہ پیدا فرمایا اور انہوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگی کے ماہ وسال وقف کئے، وہ قرآن کریم کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ برسوں اس عظیم کام میں لگے رہے اور یوں امت کے لئے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات ومواعظ کا قیمتی اثاثہ محفوظ کر گئے...... حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہ خطبات، اسلام کے عقائد وعبادات، معاشرت ومعیشت، اخلاق واعمال، تہذیب وتمدن اور تاریخ وروایات کی تشریحات وحکمتوں کا گنج ہائے گراں مایہ ہیں......

مولانا قاری محمد ادریس صاحب صاحب کی مرتب کردہ ان خطبات کی اب تک شائع ہونے والی جلدوں میں مندرجہ ذیل ایک سو بیس خطبات وموضوعات آگئے ہیں:

1 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد اول......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ تک ② مقام نبوت اور اس کے آثار ومقاصد ③ کتاب خداوندی اور شخصیات مقدسہ ④ معجزہ علمی ⑤ جہلائے عرب سے مقام صحابیت تک ⑥ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ⑦ حیوۃ طیبہ ⑧ فلسفہ علم ⑨ وعظ یوسفی

2 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد دوم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① معارف القرآن ② رحمۃ للعالمین ③ بیت اللہ الکریم ④ عبادت وخلافت ⑤ اخلاص فی الدین ⑥ صحبت صالح ⑦ راہ نجات ⑧ راہ اعتدال ⑨ مقصد حیات ⑩ فلسفہ موت ⑪ اسلام میں تصور آخرت ⑫ فضیلت یوم الجمعہ ⑬ سنت حضرت خلیل علیہ السلام ⑭ حقیقت نکاح۔

3 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد سوم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① ذکر اللہ ② معرفت باری تعالیٰ ③ رضائے الٰہی ④ طریق اصلاح ⑤ تعارف اہل حق ⑥ تسکین فطرت ⑦ ادب اور اختلاف رائے ⑧ حقوق مالیہ ⑨ خطبہ طیبہ۔

4 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد چہارم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① مقصود بعثت ② یادحق ③ نبوت وملوکیت ④ ثمرات علم ⑤ عمل صالح ⑥ انسانی زندگی کا نصب العین ⑦ پرسکون زندگی ⑧

سیرت اور صورت ⑨ شعب الایمان ⑩ تعلیم وتبلیغ ⑪ تبلیغی جماعت اوراصلاح ⑫ جماعتی تبلیغ ⑬ فضیلت النساء ⑭ پیغام ہدایت ⑮ فکراسلامی کی تشکیل جدید ⑯ اسلامی تمدن ⑰ درس ختم بخاری ⑱ اظہار تشکر۔

5 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد پنجم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① شان بعثت ② عناصر سیرت ③ اسلام عالمی مذہب ہے ④ انسانی فضیلت کا راز ⑤ مقصد نعمت ومصیبت ⑥ افادات بخاری (حصہ اول) ⑦ افادات بخاری (حصہ دوم)

6 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ششم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① علمی معجزہ ② خلافت تجوید ③ نجوم ہدایت ④ آغاز بخاری ⑤ تعلیم وتدریس ⑥ تاثیر الاعمال ⑦ آداب دعاء ⑧ الہامی ادارہ اوراس کے فضلاء کی تنظیم ⑨ سائنس اوراسلام۔

7 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ہفتم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① خطبہ استقبالیہ اجلاس صدسالہ دارالعلوم دیوبند ② اساس توحید ③ حج بین الاقوامی عبادت ④ اہمیت تزکیہ ⑤ جواہرانسانیت ⑥ ملت اسلامیہ کا المیہ اوراس کا علاج ⑦ تعلیم نسواں ⑧ افادات علم وحکمت۔

8 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلد ہشتم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں خطاب ② موتمراسلامی قاہرہ میں خطاب ③ عالمی موتمراسلامی قاہرہ سے واپسی پرخطاب ④ تقسیم فلسطین اوراسرائیل کے وجود پرمسلمانان ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار ⑤ مذہب اورسیاست ⑥ مسلم پرسنل لاء ⑦ اسلام اورآزادی ⑧ عروج وزوال ⑨ تیونس اورمراکش کی جدوجہدآزادی ⑩ آئینہ خدمت جمعیۃ علمائے ہند ⑪ نصاب تعلیم کی تدوین ⑫ تصویرسازی کی مذہبی اورتمدنی حیثیت ⑬ اشتراک مذہب ⑭ دنیاوآخرت ⑮ عالم اصغر ⑯ افادات علم وحکمت۔

9 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلدنہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① اساسی عبادات ② اہمیت نماز ③ رمضان اوراس کے مقاصدوبرکات ④ فضیلت تقویٰ ⑤ اسلام میں عیدکا تصور ⑥ محبت ومعیت ⑦ تعلیم جدید ⑧ مرکزسعادت ⑨ امتیازدارالعلوم ⑩ آزادی ہندکا خاموش رہنما ⑪ اکابردیوبنداورآزادی ہند ⑫ حدیث پاکستان ⑬ امارت شرعیہ ⑭ الواعظ ⑮ اظہارتعزیت ⑯ جامع مذہب ⑰ افادات علم وحکمت۔

10 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلددہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام ② راہنمائے انقلاب ③ عظمت حفظ ④ آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب ⑤ اسلامی آزادی کامکمل پروگرام ⑥ تکمیل انسانیت ⑦ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ⑧ افادات علم وحکمت۔

11 ......خطبات حکیم الاسلام۔جلدیازدہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① فلسفہ نماز ②

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰-۴۸.

تفسیر سورۃ ملک ③ افادات علم وحکمت۔

12 ......خطبات حکیم الاسلام۔ جلد دوازدہم......اس مجموعہ میں درج ذیل خطبات شامل ہیں: ① تفسیر سورہ قلم ② آثار صحبت

ان خطبات میں بیان ہونے والی احادیث وروایات پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے، خطبات کے مرتب مولانا قاری محمد ادریس صاحب مدظلہ کی سوانح پر نظر ڈالی جاتی ہے کہ یہ ان کا حق ہے، حضرت قاری ہوشیار پوری صاحب ہمارے بزرگ استاد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں، مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین مدنی کے شاگرد اور دارالعلوم کراچی کے ہردل عزیز استاذ تھے، وہ ہرفن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، مجھ ناکارہ پر ان کی خصوصی شفقت نظر اس لئے تھی کہ ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولوی حبیب الرحمٰن تکرار کی جماعت میں میرے ساتھ تھے، ایک بار نماز مغرب کے بعد جب مسجد میں تکرار کی جماعتیں لگ گئیں تو حضرت تشریف لائے، مجھے بلاکر فرمایا، ہم عمرے کے لئے جارہے ہیں، آپ حبیب کے ساتھ محنت کریں، ہم آپ کے لئے وہاں جاکر دعا کریں گے......ان کا یہ جملہ آج تک کانوں میں رس گھول رہا ہے اور جو تھوڑی بہت خدمتِ دین کی توفیق مل رہی ہے یہ ان رجالِ باصفا اساتذہ اور بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے! حضرت قاری محمد ادریس ہوشیار پوری صاحب نے ہمارے کہنے پر اپنے جو حالات بھیجے ہیں وہ نذر قارئین ہیں:

> ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی ترتیب وتدوین محض اور محض فضل خداوندی کا مظہر اور ایک نااہل کی ستاری کے علاوہ اس کی تعبیر میرے لئے ممکن نہیں۔ تاہم اس کی نسبت سے قارئین ''خطبات'' مجھے جانتے ہیں، شکل وشباہت سے شناسائی نہیں۔ آپ کے حسب ارشاد اپنے احوال کے سلسلہ میں چند حروف لکھ دیتا ہوں، اس لئے کہ اصل کام ہے نہ کہ نام۔
>
> خاندانی پس منظر......میرے والد گرامی مرحوم نے ایک کاشت کار گھرانے میں آنکھ کھولی تاہم گھر کی فضا مذہب کے قریب اور دین دار تھی اور اہل حق سے گہرا تعلق تھا، اسی جذبے کی وجہ سے دادا مرحوم حاجی شیر محمد صاحب نے اپنی اولاد کے لئے دینی تعلیم دلوانے کا راستہ چنا۔ والد مرحوم نے مختلف مدارس میں پڑھا، گوجرانوالہ کے کسی مدرسہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے کہ وہاں سے تعلم حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند بڑے درجات کے اسباق کے لئے حاضری کا شرف نصیب ہوا۔ داخلہ امتحان حضرت اقدس شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ کے سپرد ہوا ''ہدایہ اولین'' میں سے کسی مقام کا انتخاب کرکے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''یہاں سے یہاں

تک مطالعہ کر کے لاؤ۔'' والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ تعلیمی زمانہ میں مجھے کاپیوں سے دلچسپی کم اور نفسِ کتاب سے مناسبت زیادہ تھی، چنانچہ میں نے مطالعہ کرلیا اور عرض کیا کہ: ''حضرت! میں حاضر ہوں۔'' فرماتے تھے کہ جب میں نے عبارت پڑھی تو حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: '' کافی ہے، مزید ضرورت نہیں۔'' اندازِ عبارت سے داخلہ مرحمت فرمانے کا فیصلہ فرمالیا تھا۔

الحمدللہ! اس کے بعد والد گرامی ان طلباء کرام کی فہرست میں شامل ہو گئے، جن کے لئے'' منجانب اللہ القاً وانتخاب'' کے مبارک الفاظ حلقۂ دیوبند میں مصروف ومتعارف ہیں۔

۱۹۴۷ء میں دورۂ حدیث شریف شیخ الاسلام حضرت محترم شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی، والد صاحب مرحوم کے ہم درسوں میں چند نمایاں حضرات یہ ہیں:

۱...... حضرت اقدس صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان محترم ومکرم مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ العالی۔

۲...... حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب نور اللہ مرقدہٗ۔

۳...... برادر محترم جناب مولانا مفتی خالد محمود صاحب زید مجدہم، مدیر اقرأ روضۃ الاطفال پاکستان کے والد گرامی حضرت محترم مولانا عبدالمجید صاحب سکھروی مرحوم۔

دارالعلوم دیوبند میں ختم بخاری شریف کے موقع پر ہمارے نانا مرحوم داعی کبیر حضرت محترم مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب ہوشیار پوری جو کہ خاتم المحدثین حضرت اقدس مولانا علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید نیز حضرت اقدس امام القرأ قاری محی الاسلام عثمانی نور اللہ مرقدہ (استاذ محترم حضرت اقدس شاطبی وقت قاری فتح محمد صاحب نور اللہ مرقدہ) کے بھی شاگرد رشید تھے۔

ان حضراتِ اہل اللہ سے تعلق کی بنا پر دنیوی رسوم ورواج سے طبیعت میں بہت تنفر تھا، چنانچہ بخاری شریف کے اختتامی سبق کے موقع پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اس سال تکمیل کرنے والے طلباء کرام میں اگر ''جٹ'' برادری کا کوئی طالب علم آپ کے ہاں سند فراغت حاصل کر رہا ہو تو میں چاہتا ہوں کہ اپنی بچی کا نکاح اسی مبارک مجلس میں اس سے کردوں۔''

آسمانی فیصلوں کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے، والد مرحوم کا نکاح دارالعلوم دیوبند کے

دارالحدیث میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا اور اس پر تقریر فرمائی کہ: ’’لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں کے کام نہیں ہوتے، مولویوں کے کام تو اس طرح بآسانی ہوتے ہیں۔‘‘

بہرحال یہ ’’خاندانی جوڑ‘‘ خالص دینی بنیادوں پر تھا، اس میں کوئی دنیوی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ چنانچہ اس کا ثمر یہ نکلا کہ نانا مرحوم کی نسبت سے ہمارے گھرانے میں ’’شغف بالقرآن الکریم‘‘ اور حفظ وقرأت کا اس قدر چرچا ہوا اور فضا تیار ہوئی کہ والدہ مرحومہ کے بعد بھی ان کی تمام اولاد قرآن حکیم کی تعلیم وتعلم میں بفضلہ تعالیٰ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد آئندہ نسل بھی حفظ وضبط کے ساتھ ساتھ قرأت عشرہ تک حاصل کر چکی ہے۔ والد مرحوم کی نسبت سے شعبہ کتب سے مناسبت ہوئی اور الحمدللہ! ہم چار بھائی عالم ہیں اور درجۂ کتب سے تھوڑی بہت شد بد رکھتے ہیں۔

چنانچہ والد صاحب مرحوم نے پاکستان آکر حضرت فخر الفقہاء مولانا خیر محمد صاحب مرحوم (بانی جامعہ خیر المدارس ملتان) کی زیرنگرانی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ بورے والا، جہانیاں کے مدارس میں کچھ وقت پڑھانے کے بعد فیصل آباد کے پسماندہ علاقہ ’’ماموں کانجن‘‘ میں تقریباً بائیس سال پڑھایا۔ مشکوٰۃ کے بعد یہاں کے طلبا کرام جامعہ خیر المدارس ملتان میں دورۂ حدیث شریف کرتے، ازاں بعد دارالعلوم کورنگی کراچی میں بیس سال سے زیادہ تدریس سے وابستہ رہے۔

میری پیدائش ملتان شہر میں ہمارے نانا مرحوم کے گھر اندرون حرم گیٹ ۱۹۵۱ء بوقت سحر ہوئی، نانا مرحوم جس مسجد (بیری والی مسجد حرم گیٹ) میں نماز کے لئے جاتے تھے، وہاں اعلان کروا کر دعا کروائی۔ نیز والد گرامی مرحوم نے میرا نام اپنے استاذ محترم کی محبت میں ’’محمد ادریس‘‘ رکھا کہ ان کی ابتدائی شفقت دارالعلوم دیوبند کے مبارک قافلہ میں شرکت کا سبب بنی تھی۔ والد مرحوم اپنے تدریسی سلسلہ میں مدرسہ عربیہ احیاء العلوم ماموں کانجن (فیصل آباد اس وقت لائل پور) میں تشریف لے گئے اس لئے ابتدائی تعلیم حفظ قرآن کریم وہاں ہوئی، اس وقت وہاں یہ حضرات جامعہ خیر المدارس کے توسط سے تشریف لاتے تھے، حسب مقدور ان سے قرآن کریم پڑھا:

۱.....قاری محمد یعقوب صاحب ملتانی۔

۲.....قاری محمد دین صاحب مرحوم جو بلوچستان کے تھے، والد صاحب مرحوم کے کتب

میں شاگرد بھی تھے، بہت بلند پایہ مدرس تھے، چھوٹے بچوں کے لہجہ اور تصحیح حروف میں امتیازی خصوصیات رکھتے تھے۔ (چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ خیر المدارس نے ان کو پھر اپنے ہاں بلوالیا اور عرصہ دراز تک خیر المدارس میں ایک منجھے ہوئے استاذ کی طرح خیر المدارس پر اپنی جان نچھاور کی اور اچھے اچھے حفاظ تیار کر کے شعبہ گردان میں بھیجے)۔

۳......محترم حضرت حافظ اللہ بخش صاحب ملتانی۔

۴......اور ان کے شاگرد حافظ فیض بخش صاحب مرحوم۔

ان سے تکمیل قرآن کریم کے بعد خیر المدارس ملتان میں مقری اعظم حضرت اقدس مولانا قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہ کے درجہ ضبط وتجوید میں بذریعہ قرعہ اندازی داخلہ مل سکا اور حسب ہدایت ڈاک کارڈ لے کر شوال المکرم ۱۳۷۸ھ میں حضرت اقدس کے اقدام عالیہ میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ یہاں کے تعلیمی معیار تک پہنچنے کے لئے دو سال ضبط میں صرف ہوئے، ہمارے رفقاء کرام میں خود صاحبزادہ محترم قاری محمد عبید اللہ بن قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

شعبہ تحفیظ سے فراغت کے بعد والد مرحوم نے اپنی نگرانی میں ماموں کانجن میں کتب کا آغاز کرایا، ان دنوں مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن میں حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ درجہ کتب کے ابتدائی مدرس کی حیثیت سے حسب ارشاد حضرت بانی جامعہ خیر المدارس ملتان جلوہ افروز تھے، والد مرحوم صدر مدرس تھے اور دیگر اساتذہ کرام بھی تھے۔

اس لئے تقسیم اسباق کے مطابق علم صرف حضرت اقدس لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں آئی، اجرأ صرف اور صرف میں بندہ کو دو حرف آنے لگے۔ البتہ نحو کے اسباق زیادہ تر والد صاحب مرحوم سے پڑھے، ہدایۃ النحو، کافیہ اور شرح جامی والد مرحوم سے پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لئے والد مرحوم نے بندہ کو جامعہ خیر المدارس میں داخلہ دلوایا۔ اس وقت کے اکابر میں ہدایہ اولین حضرت اقدس مولانا محمد شریف صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ مہتمم جامعہ کے پاس، شرح جامی حضرت شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد (بانی جامعہ امدادیہ، فیصل آباد) کے پاس پڑھی۔

شرح جامی کا امتحان حضرت اقدس بانی جامعہ خیر المدارس نے خود لیا اور میرے سے

الف لام کی اقسام پوچھیں، مجھے شرح جامی از بر اس لئے تھی کہ میں پہلے والد صاحب مرحوم کے پاس پڑھ کر آیا تھا اور یہاں نظم جماعت کی وجہ سے دوبارہ اس کا پڑھنا ضروری تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے استفسار پر جب میں نے اس کی تمام اقسام اچھی طرح سنادیں تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا: ''توں کتھوں آیاں؟'' (تم کہاں سے آئے ہو؟)، میں نے عرض کیا: ''ماموں کانجن سے۔'' فرمانے لگے: توں مولوی شفیع کا منڈا؟ (آپ مولانا محمد شفیع صاحب کے بیٹے ہو؟)، میں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمانے لگے: ''تاایں وسداپیا'' (اسی لئے صحیح بتارہے ہو)۔ میری یادداشت کے مطابق حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس میں ۵۲ نمبر دیئے، مع انعامی ۲ نمبرات۔ اس لئے کہ اس وقت درجہ کتب میں ۵۰ نمبر آخری حد ہوتے تھے۔ ۴۰ سے کم ہوجاتے تو طالب علم ناکام شمار ہوتا تھا۔

اس کے بعد اگلے سال دارالعلوم عیدگاہ کبیر والا میں داخلہ لیا، اس وقت یہاں اجلہ علماء رونق افروز تھے، معقولات اور فنون کی کتب کا بڑا چرچا تھا اور حقیقی تھا، بغیر کسی پابندی اور ضوابط کے طلباء کرام میں بڑا تعلیمی انہماک اور ذوق مطالعہ تھا، یہاں حضرت اقدس علامہ صوفی محمد سرور صاحب زید مجدہم (حال جامعہ اشرفیہ لاہور) کے پاس مختصر المعانی، جلالین شریف اور حضرت العلام مولانا ظہور الحق صاحب مرحوم کے پاس حسامی اور دیوانِ حماسہ پڑھیں، مولانا محمد امین صاحب کے پاس متنبی اور مقامات حریری پڑھیں، اور اس سے آئندہ برس مشکوٰۃ شریف حضرت اقدس محدث جلیل مولانا عبدالمجید صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم (بانی جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا، حال امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان) کے پاس اور ہدایہ رابع بھی انہیں سے پڑھا۔ نیز بیضاوی شریف اور ہدایہ ثالث حضرت العلام شہنشاہ تدریس مولانا منظور الحق صاحب مغفور کے پاس پڑھیں اور حضرت العلام مولانا علی محمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم کبیر والا کے پاس توضیح وتلویح اور مسلم الثبوت پڑھیں۔ یہاں موقوف علیہ کے سال سہ ماہی امتحان کے موقع پر بندہ کی الحمدللہ پہلی پوزیشن آئی اور اساتذہ کرام کی نظر عنایت نصیب ہوئی۔

آئندہ سال دورۂ حدیث شریف کے لئے کبیر والا سے ایک بڑی تعداد جامعہ خیر المدارس ملتان آگئی، یہ ناکارہ بھی اس میں شامل تھا، چنانچہ یہاں بخاری وترمذی

حضرت العلام جامع المعقول والمنقول مولانا محمد شریف کشمیری صاحب مرحوم کے پاس، مسلم شریف حضرت اقدس مولانا مفتی محمد عبداللہ ڈیروی صاحب مرحوم کے پاس، سنن ابی داؤد حضرت العلام فقیہ جلیل مولانا مفتی عبدالستار صاحب مرحوم کے پاس، طحاوی شریف حضرت مولانا محمد صدیق صاحب کے پاس، سنن نسائی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کے پاس اور ابنِ ماجہ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے پاس پڑھی۔ اس تمام تر تفصیل کے بعد بندہ نے بھی ''مولوی'' بن کر ۱۳۹۳ھ میں سند فراغت وتکمیل جامعہ خیر المدارس سے حاصل کر لی جبکہ قاری الحمد للہ پہلے ہی بن چکا تھا۔

مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن میں حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے ساتھ ہمارا ایک دیوار کے اشتراک کے ساتھ ۱۲ سال ہمسایہ داری کا یادگار اور محبت بھرا تعلق رہا) کے قلم نے ہمارے سامنے اپنے سفر کا آغاز کیا اور خوب یاد ہے کہ بعض اوقات آسان مسائل وعنوانات پر حضرت والا مشق کیا کرتے تھے اور ہم طلبا دور دور سے ان کی نشست و برخاست کے انداز اور قلم وقرطاس کے ساتھ انہماک کے طریقے دیکھا کرتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ''ماڈرن اسلام'' کے فتنہ نے حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اندر چھپے ہوئے علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کو جگا دیا اور ان کا قلم سیاہی کی بجائے تلوار کی چمک لے کر باطل کے سامنے نمایاں ہوا، ماہنامہ ''بینات'' میں آپ کے مضامین کو جگہ ملنی شروع ہوئی اور حضرت سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی جوہر شناس طبیعت نے حضرت لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ہاں بلا کر اپنا ہم نام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا ہم کام بھی کر لیا، حضرت کو دیکھ کر مجھے لکھنے کا شوق ہوا اور ملتان میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت میں مہینے کے تقسیم کردہ ایام میں کراچی سے تشریف لایا کرتے تھے، ان دنوں بندہ نے حضرت والا سے اصلاح مضامین لی اور اسی سے ترتیب وتدوین اور قلم پکڑنے کی معمولی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی۔

حضرت اقدس مقری اعظم قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کردہ نسبتِ قرآن کی وجہ سے الحمد للہ شعبۂ تحفیظ رشید آباد کالونی میں پڑھایا پھر شش ماہی امتحان کے بعد مسجد غفوریہ لکڑ منڈی چوک ملتان میں بطور خطیب، امام ومدرس قرآن کریم تقرر ہوا۔

یہاں طلبا ندارد تھے، چند ماہ کے انتظار اور طویل دعاؤں کے بعد طلبا کا رجوع ہوا تو یہاں جگہ کم پڑ گئی اور ہمارے بڑے ماموں حاجی محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے اپنی صابون فیکٹری کے ساتھ تقریباً ۲۱ مرلہ جگہ خریدی ہوئی تھی جو فیضی روڈ علی ولی کالونی میں تھی، انہوں نے وہ جگہ مسجد غفوریہ کے احباب کرام اور ناکارہ کے سپرد کی۔ الحمد للہ! یہاں تحفیظ القرآن الکریم کے نام سے مدرسہ ۱۴۰۱ھ میں قائم ہوا۔ الحمد للہ! اپنے علاقے میں مرکزی حیثیت کے ساتھ پاکستان کے دور دراز علاقوں سے طلبا کرام کا رجوع ہوا اور تکمیل کر کے حسب ہمت تعلیم وتعلم میں مشغول ہیں۔

شعبہ حفظ سے جو طلبا کرام فراغت حاصل کرنے کے بعد درجہ کتب میں داخلہ لینے کے لئے دیگر مدارس میں جاتے تو ہم لوگوں کو بڑی حسرت ہوتی "کاش ہمارے پاس جگہ ہوتی تو ہم ان طلبا کرام کو خود پڑھاتے" چنانچہ ایک مرتبہ میرا ایک جامعہ میں جانا ہوا تو میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ہمارے حفاظ طلبا کرام اس جامعہ میں ۴۱ ہیں۔ بہر حال والد گرامی مرحوم کا بہت اشتیاق اور بڑی تمنا تھی کہ تحفیظ کے ساتھ ساتھ شعبہ کتب بھی قائم کیا جائے۔

بڑے ماموں صاحب مرحوم علی ولی کالونی میں اپنی فیکٹری بیچ کر پیر کالونی میں چلے گئے، وہاں فیکٹری کے لئے جگہ لی تو وہاں اہلِ بدعت ک مساجد کی وجہ سے اپنے صحیح عقیدہ کے مطابق نماز پڑھنے اور بچوں کے لئے تعلیم وتعلم کی نیت سے جگہ خرید لی جو اس وقت دو کنال چھ مرلہ پر مشتمل تھی، پھر ۱۹۹۶ء میں احقر کے سپرد کی ہم نے آہستہ آہستہ اپنے رفقاء کرام سے مشاورت کر کے مزید خریداری کی جو الحمد للہ اس وقت تک ۴۵ کنال ہو چکی ہے۔ اس جگہ کو ہم نے جامعہ دار العلوم رحیمیہ کا نام دیا، آج الحمد للہ! جامعہ میں ۱۵۰۰ طلبا وطالبات شاخوں سمیت پڑھ رہے ہیں، شعبہ تحفیظ میں تقریباً پندرہ درس گاہیں، دورۂ حدیث شریف کے مکمل اسباق ہیں اور شعبہ تخصص فی الافتاء بھی بحمد للہ جاری ہے۔

الحمد للہ! اس وقت تک جامعہ سے تکمیل کرنے والے کل حفاظ کی تعداد ۲۵۰ ہو چکی ہے، جس کے پیچھے نسبت رحیمی کی کارکردگی اور اعجاز قرآنی ہے اور فضلا درس نظامی کی تعداد ۳۰۷ ہے، بہر حال یہ سب کچھ حق تعالیٰ شانہ کا کرم، اساتذہ کرام کی توجہات

اور والدین مرحومین کی دعاؤں کا مظہر ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس حضرات کی دعائیں، چونکہ دائمی ہوتی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ اس سلسلہ تعلیم وتعلم کو نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ انشاء اللہ مزید ترقیات وبرکات سے سرفراز فرمائیں گے۔

''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی بارہ جلدوں کی ترتیب وتدوین میں ''ربع صدی'' سے زیادہ وقت صرف ہوا، اس لئے کہ تقاریر وخطبات دستیاب نہیں تھے بالتدریج جیسے مواد ملتا گیا، اسی سے جلد تیار کی جاتی رہی، اس لئے جلد نمبر کے حساب سے مجموعہ تیار ہوکر اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا۔ ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے مجموعہ کے تیار ہونے میں دراصل ایک روحانی قوت کا کرشمہ تھا، اولاً اس میں حضرت العلام حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور خاندانی علمی وجاہت پھر دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے دنیا بھر کی شہرت واحترام نے اسے پذیرائی بخشی۔

ثانیاً ہمارے شیخ الشیخ مقری اعظم قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں نے اثر دکھایا، جب میرے پاس صرف چار تقاریر مرتب تھیں تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا سفرِ ملتان ہوا، مدینہ طیبہ سے آمد ہوئی تھی ''زہے قسمت'' مسجد غفوریہ میں آمد مبارک ہوئی۔ بندہ نے یہ تقاریر مرتب شدہ پیش خدمت کیں اور عرض کیا کہ: ''ان پر دم فرمادیجئے یہ بارگاہ عالی خداوند قدوس میں قبول ہوجائے۔'' چنانچہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے دم فرمایا، دوسری درخواست حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہ پیش کی کہ: ''مجموعہ بہت کم ہے، آپ ازراہ کرم یہ دعا فرمادیں کہ تقاریر بڑی تعداد میں مل جائیں اور مجھے اس سلسلہ میں سفر نہ کرنا پڑے اور تعلیمی طور پر درس گاہ کا ناغہ اور حرج نہ ہو۔'' یہ بات چونکہ حضرت والا کے مزاج عالی کے مطابق تھی تو بہت خوشی ہوئی۔ ایک ایسا منظر بن گیا جس میں بعض اوقات اہل اللہ سے کوئی غیر اختیاری جذبہ کے تحت دل کی گہرائیوں سے دعا نکل جاتی ہے، اور الحمد للہ! بندہ نے اس کا مشاہدہ کیا کہ دنیا بھر سے مجھے کیسٹیں دستیاب ہوئیں، مگر اس کے لئے مجھے سفر نہیں کرنا پڑا، ظاہری سبب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے برادر محترم مولانا قاری محمد رفیق صاحب مقیم جدہ اور برادر محترم جناب مولانا قاری سیف الدین صاحب مقیم ریاض سعودیہ اس کا ذریعہ بنے تاہم ان حضرات کے علاوہ بھی بہت سی تقاریر دستیاب ہوئیں۔ پھر حضرت والا سے اس ناکارہ کا مسلسل رابطہ رہا،

حرمین شریفین سے حضرت دعائیں دیتے رہے، ان ادعیہ مبارکہ سے یہ قبولیتِ عامہ نصیب ہوا اور الحمدللہ! اب تک اس کتاب کو علمی دنیا میں استحکام نصب ہوا۔

اب عزیزِ محترم عبدالصبور علوی سلمہ، تخریج وتحقیق کے ساتھ اعلیٰ معیار پر طباعت کا اہتمام کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مساعی کو قبول ومنظور فرمائے اور ہم سب کے لئے نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین (حضرت مولانا قاری) محمد ادریس ہوشیارپوری) مدیر وبانی جامعہ دارالعلوم رحیمیہ، ملتان

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات ومواعظ میں احادیث وروایات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے، وعظ ونصیحت اور تقریر وخطابت میں عموماً احادیث کریمہ کی صحت کے اس معیار کو بسااوقات برقرار نہیں رکھا جاسکتا جس کا محدثین کرام اہتمام کرتے ہیں اور خود حضرات محدثین کے نزدیک فضائل کے باب میں بعض شرطوں کے ساتھ ضعیف احادیث کو بھی بیان اور ذکر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات میں اس طرح کی احادیث پائی جاتی ہیں، احقر نے چند سال قبل جب ان خطبات کا مطالعہ کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان موثر خطبات ومواعظ کی احادیث کریمہ کی تخریج اصل مصادر اور مراجع سے ہونی چاہئے۔ بعض احادیث موضوع ہوتی ہیں، واعظین ان کو بھی ذکر کردیتے ہیں۔ کسی صحابی یا تابعی کے قول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے پیش کردیا جاتا ہے، علم حدیث کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ کسی حدیث موقوف یا مقطوع کو حدیث مرفوع کی صورت میں بیان کردیا جاتا ہے۔ عام خطباء اور مقررین کو ان احادیث کی تحقیق ومراجعت کا موقع نہیں ملتا اس لئے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات وتقریروں میں بیان کردہ احادیث وروایات کے محدثانہ طرز ومعیار پر تحقیق ہوجائے، اصل مراجع ومصادر سے ان کے حوالے نقل کئے جائیں اور ان روایات کی صحت وضعف کی حاشیہ میں وضاحت کرلی جائے اور اگر کوئی حدیث موضوع ہے تو اس کی بھی نشاندہی ہوجائے تاکہ منبر ومحراب کے منصب کے حاملین، ان احادیث وروایات کو ان کی اصل حیثیت کی روشنی میں بیان کریں..... حضرت حکیم الاسلام کے ان خطبات کو اللہ جل شانہ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی ہے اور برصغیر کے علاوہ اردو دنیائے اسلام میں یہ بکثرت پڑھے اور سنے جاتے ہیں، اس وقت دنیا کے اکثر خطوں میں دین اسلام کا جو کام ہورہا ہے واسطہ بالواسطہ، اس میں ازھر ہند دارالعلوم دیوبند کا فیض شامل ہے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے جنوب تک دارالعلوم دیو

بند کے فضلاء اور منتسبین کا ایک جال بچھا ہوا ہے، وہ مدارس و مکاتب، مساجد و خانقاہوں، جہاد و ابلاغ اور دعوت و تبلیغ کی جماعتوں اور مراکز کی شکل میں دین کی مختلف جہتوں پر کام کر رہے ہیں، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دارالعلوم دیو بند کے نصف صدی تک روح رواں رہے ہیں، انہوں نے یہ خطبات بھی دنیا کے مختلف حصوں میں ارشاد فرمائے ہیں اور اللہ جل شانہ نے انہیں ایک ہمہ گیر قبولیت عطا فرمائی ہے۔

برادر محترم عبدالصبور صاحب کو اللہ جل شانہ نے جدید طباعتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اکابر کی کتابیں چھاپنے اور عام کرنے کا ذوق عطا فرمایا ہے، خطبات حکیم الاسلام پر تخریج احادیث وروایات کی تحقیق کی ضرورت کو جب میں نے محسوس کیا تو ان سے کہا کہ اس عظیم کتاب کا تخریج و تحقیق شدہ ایڈیشن لانے کی ضرورت ہے، یہ آج سے تقریباً بارہ تیرہ سال قبل کی بات ہے انہوں نے اس کے لئے عزم کیا اور مختلف محقق علمائے کرام سے ان خطبات کی تخریج و تحقیق کرائی اور اس پر انہوں نے زر کثیر صرف کیا، وہ مستقل میرے رابطے میں رہے اور ہونے والا کام بھی مجھے دکھاتے رہے، درمیان میں کچھ رکاوٹیں بھی پیش آئیں اور زندگی کے جھمیلے کام کی رفتار کو روکتے رہے لیکن بالآخر یہ کام الحمدللہ مکمل ہو گیا اور ان بلیغ و عظیم خطبات کا تخریج شدہ ایڈیشن درج ذیل خصوصیات کے ساتھ آ گیا:

1.....ان خطبات میں موجود تمام احادیث وروایات کی اصل مراجع سے تخریج کر دی گئی ہے۔

2.....ان روایات کی صحت وضعف کی حاشیہ میں وضاحت کر دی گئی ہے۔

3.....بعض احادیث زبان زد عام ہیں لیکن وہ موضوع ہیں، ان خطبات میں بھی کہیں ایسی احادیث آ گئی ہیں تو اُن کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

کسی حدیث موقوف یا مقطوع کو حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا گیا ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

4.....تمام احادیث پر اعراب (زبر، زیر، پیش) لگا دیئے گئے ہیں تا کہ تلفظ میں غلطی کا امکان کم ہو۔

5.....ان خطبات میں جتنی قرآن پاک کی آیات ذکر کی گئی ہیں اُن سب کی تخریج (یعنی سورت و آیت نمبر کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

6.....تمام قرآنی آیات پر اعراب لگا دیئے گئے ہیں۔

7.....متن کی تصحیح کی حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے اور اُس کے پروف مختلف علماء سے متعدد بار پڑھوائے

گئے ہیں۔

اللہ جل شانہ اس محنت کو قبول فرمائے، ان خطبات کا نفع عام اور تمام فرمائے اور اسے سب محنت کرنے والوں کے لئے اس دن کا ذخیرہ بنائے جس دن نہ مال وزر کے انبار کام آئیں گے، نہ دوست واحباب اور اولاد واحفاد کا ہجوم..... **یوم لا ینفع مال و لا بنون الا من اتی الله بقلب سلیم.**

و صلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وعلی آله وصحبه اجمعین.

تقریظ

عارف کبیر، حجۃ القرأ، شارح شاطبی

حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحبؒ

حامداو مصلیا

امابعد...... ماشاءاللہ قاری ادریس صاحب بڑا تعمیری کام کررہے ہیں۔اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تقریریں طبع کرانے کا انتظام کررہے ہیں،اب تک چار تقریریں تو مکمل کر چکے ہیں،اسی طرح اور تقریروں کی بھی تلاش میں ہیں۔خدا کرے بہت سی تقریریں حضرت موصوف کی مل جائیں اور یہ اصلاحی ذخیرہ کافی ووافی جمع ہو جائے۔

اللہ پاک مولوی ادریس صاحب کے لئے بھی اس کو آخرت کی کامیابی کا بہترین ذریعہ بنائے اور اہل علم وعامۃ الناس کو حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کے ارشادات سے مستفیض فرمائے اوران کے ارشادات کو دنیا وآخرت کے لئے مشعل راہ بنائے۔(آمین ثم آمین)بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ و التسلیم

حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب مدظلہٗ مہاجر مدنی مدینہ منورہ

حال وارد ملتان۔شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ

تقریظ مبارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت اقدس محترم ومکرم مولانا محمد یوسف لدھیانوی (شہیدؒ)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب، طیب اللہ ثراہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حکمت قاسمی کے وارث وامین تھے، وہ اپنے ''خطبات ومواعظ'' میں حکمت کے موتی رولتے تھے، اور ایسے عجیب وغریب لطائف ومعارف کا دریا بہاتے تھے جو عام طور سے کتابوں میں نہیں ملتے، اس لئے بجا طور پر انہیں ''حکیم الاسلام'' کا خطاب حاصل تھا۔

عزیز محترم جناب مولانا الحاج الحافظ قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ اللہ تعالیٰ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات حکمت کی جمع وتدوین کا شوق نصیب فرمایا، موصوف نے حضرت مرحوم کے خطبات کی کسٹیں تلاش کرنے اور انہیں کاغذ پر منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا، ماشاءاللہ وہ اپنی مہم میں کامیاب ہوئے۔

''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے چھ جلدیں مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں، اس سلسلے کی یہ ساتویں جلد ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، حق تعالیٰ شانہ ان کے اخلاص وللّٰہیت میں مزید ترقی عطا فرمائیں، ان کی اس محنت کو شرف قبول نصیب فرما کر دارین میں مثمر برکات بنائیں، اور ان خطبات کے قارئین کو بھی اس صدقۂ جاریہ سے منتفع فرمائیں۔ **بحرمة سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد ن النبی الامی صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہ واتباعہٖ وبارک وسلم واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین**

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

(۱۷/۴/۱۴۱۰ھ)

مبارک تقریظ

استاذ المحترم حضرت اقدس مولانا عبدالمجید صاحب زیدت معالیہم

شیخ الحدیث جامعہ باب العلوم کہروڑ پکا ضلع ملتان

عزیز القدر قاری محمد ادریس صاحب! عافانی اللہ وایاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ...... حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب! رفع اللہ درجاتہ فی الجنۃ، کے خطبات علم وعرفان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا مندر ہیں، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ حکیم الاسلام کے مواعظ حسنہ سے ان کی حیات میں کتنے نفوس جہالت کی ظلمات سے نکل کر نور ہدایت کی طرف آئے جب بھی ان کے مواعظ کا مجموعہ طبع کرا کر آپ نے بھیجا تو آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، آپ نے ان جواہرات کو محفوظ کر کے ان کے افادہ کو عام وتام کر دیا، حکیم الاسلامؒ کی روح یقیناً آپ سے خوش ہوگی اور یہ نسبت طیبہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ اور مقبولیت عنداللہ کا باعث ہوگی۔

حکیم الاسلام کے خطبات تعریف وتوصیف سے بالاتر ہیں دعاء کرتا ہوں اللہ تعالیٰ صاحب مواعظ کے درجات بلند کرے اور متوسلین دیوبند پر آپ کے احسان کا اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا وآخرت میں بدلہ دے۔

ایں دعاء از من جملہ جہاں آمین باد

محب حکیم الاسلام خاکپائے علماء دیوبند

عبدالمجید

باب العلوم کہروڑ پکا ضلع ملتان

تقریظ مبارک

مخدوم العلماء

حضرت العلام مولانا محمد شریف صاحب مدظلہم

خلیفہ ارشد حضرت حکیم الاسلام دامت برکاتہم

نحمدهٗ ونصلی علیٰ رسوله الكريم

امابعد..... اکابر اولیاء اللہ کے ارشادات وفرمودات روحانی زندگی کی بقاء وترقی کے لئے عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اوران کی عدم موجودگی میں ان کی صحبت ومعیت کے قائم مقام ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا:

یک زمانہ صحبت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

آج کے پرفتن دور میں اس چیز کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔علوم ظاہریہ کی تکمیل کے باوجود تکمیل باطن کے بغیر انسان کی انسانیت اُجاگر نہیں ہوسکتی۔اور تکمیل باطن کے سلسلہ میں بزرگان دین کے اقوال وملفوظات اور مواعظ وخطبات نسخۂ اکسیر ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اور دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے ان کی خدمات جلیلہ سے پورا عالم اسلام آگاہ اور ایک زمانہ آشنا ہے۔آپ کے ارشادفرمودہ مواعظ کو عام مواعظ کی نسبت ایک خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔اس لئے جہاں عامۃ الناس آپ کے مواعظ طیبہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہاں اہل علم بھی خصوصیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عزیز القدر قاری محمد ادریس سلمہٗ کو جزائے خیر نصیب فرمائے۔انہوں نے حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کے مواعظ کو یکجا کردیا اور جگہ جگہ مفید عنوانات کے اضافے سے مرتب کردیا۔

اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت وترقی نصیب فرمادے۔اوراس محنت کو قبول فرما کراپنی رضا کا ذریعہ بنائے۔اوردین ودنیا میں کامیابی کا ذریعہ بنا کر نجات آخرت کا وسیلہ بنائے۔

آمین یارب العالمین. بجاہ سیدالمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

بندہ: محمد شریف جالندھری

مہتمم مدرسہ خیرالمدارس رجسٹرڈ ملتان شہر

تقریظ مبارک

جانشین اکابر حضرت مولانا قاری محمد حنیف صاحب جالندھری زید مجدہم
رئیس جامعہ خیر المدارس ملتان، وناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

”اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا“

ممتاز خطیب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

بدوِ شعور سے جن ہستیوں کے متنوع کمالات اور ہمہ جہت دینی خدمات کے باعث اُن کی عظمت و رفعت اور محبت کے نقوش ہمیشہ کے لئے دل میں جاگزیں ہو کر رہ گئے ماضی قریب کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں سرفہرست ترجمانِ علوم قاسمیہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی قدس سرہٗ کی ذات گرامی ہے۔ بلا تشبیہ جس طرح امام الانبیاء، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے اقدس کی زیارت سے مشرف ہونیوالے بعض سعیدُ الفطرت بے اختیار پکار اُٹھے کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہوسکتا، اسی طرح حضرت قاری صاحبؒ کی معصومیت آپ کے باطنی تقویٰ و طہارت کی ترجمان تھی۔ ہمارے استاذِ محترم جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد شریف صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث جامعہ خیر المدارس ملتان) فرمایا کرتے تھے کہ ”حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی گناہ صغیرہ کی آلودگی سے بھی پاک نظر آتی ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کو حق تعالیٰ شانہٗ نے بے شمار اِمتیازی خصوصیات سے نوازا تھا۔ آپؒ بیک وقت ایک عظیم خطیب، ادیب، محقق، مدبر، محدث، مفسر، متکلم، مصنف اور شیخ کامل تھے۔ آپؒ کی تقاریر حقائق و معارف شریعت اور اسرار و رموز طریقت کا دل نشین مجموعہ ہوتی تھیں۔ تخلیق و ایجاد مضامین اور عام واقعات سے علمی نکات و معارف کا استنباط حضرت قاری صاحبؒ کے ایسے اوصاف تھے جن میں کوئی خطیب و مقرر آپ کے ساتھ شریک نہیں، دقیق مضامین اور اہم اسلامی مسائل پر دو دو، تین تین گھنٹے مسلسل روانی اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح خطاب فرماتے تھے کہ سننے والے جھوم اٹھتے۔ برصغیر میں ایک سے ایک بڑھ کر خطیب و مقرر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی جادو بیانی سے بے شمار قلوب کو مسخر کیا۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، امیر شریعت سیّد عطاء اللہ بخاریؒ، سیّد سلیمان ندویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علاّمہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ جو مشہور و معروف ہیں۔ ان عظیم خطباء میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ کی تقریر میں دریاؤں کے جوش و خروش کے بجائے سمندر جیسی روانی اور سکون ہوتا تھا جو سامع کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسے قادر الکلام اور بے مثال خطیب عام مجمع میں بیٹھ کر حضرت قاری صاحبؒ کی تقریر سُنتے، سر دھنتے اور یہ کہہ کر داد دیتے کہ ''یہ قاری طیب نہیں قاسم نانوتویؒ کی روح بول رہی ہے''۔ (رحمہما اللہ تعالیٰ) تقریر اور خطابت کا ملکہ خُداداد ہوتا ہے۔ اس میں کسب کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیاضِ ازلی نے حضرت قاری صاحبؒ کو اس نعمت سے خوب خوب نوازا تھا۔

احقر کے لئے یہ سرمایۂ سعادت ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے ساتھ ایک مرتبہ ملتان سے لاہور تک سفر میں قدم بوسی کی نعمت میسّر آئی۔ دورانِ سفر حضرتؒ نے ایک نظم بھی مکمل فرمائی۔ پاکستان میں ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے نام سے حضرت قاری صاحبؒ کے پُر حکمت مواعظ وخطبات کو مربوط کتابی شکل میں پیش کرنیکی سعادت وسبقت حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم کے حصّہ میں آئی۔ آپ جامعہ خیر المدارس کے فاضل اور اساتذۂ خیر المدارس کے منظورِ نظر اور بالخصوص والد گرامی حضرت محترم مولانا محمد شریف صاحب جالندھریؒ کی ان پر خصوصی عنایت اس وقت شروع ہوئی جب خطبات کا سلسلہ منظر عام پر آنا شروع ہوا۔ اس لیے کہ آپ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ خطبات کی جمع وتدوین حضرت حکیم الاسلام کی وساطت سے دارالعلوم دیوبند کی علمی خدمت ہے۔ خوشی ہے کہ یہ سعادت جامعہ خیر المدارس کے ایک فاضل کے حصّہ میں آئی۔ اس طرح آپ کا شمار خیر المدارس کے ان فضلاء کرام میں ہوتا ہے جن کی تالیفی کاوشوں کو اہل علم میں پذیرائی اور قبولیت عامہ نصیب ہوئی۔ اس ناچیز کو متعدد غیر ملکی اَسفار میں جگہ جگہ خطباتِ حکیم الاسلام کی جلدیں نظر آئیں اور مرتب موصوف کے فاضل خیر المدارس ہونے کے ناطے میری مسرت دو چند ہوگئی، ہندوستان میں تو اس کے ابتدائی تعارف بلکہ صاحبِ خطبات حضرت اقدس حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ کی خدمت عالیہ میں اوّلین دو ۲ جلد اپنے ہاتھوں سے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جس کی تفصیل خطبات کی جلد ۶ کے پیشِ لفظ میں موجود ہے۔ اس عظیم سلسلہ کی بارھویں جلد اس وقت قارئین سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے، جو قاری صاحب موصوف کی ہمت ومحنت کے علاوہ صاحب خطباتؒ سے ان کی گہری محبت وعقیدت اور قلبی وابستگی کی دلیل ہے۔ احقر نے ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ کے سفرِ حج میں صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم کو بتایا کہ بحمد اللہ ''خطبات حکیم الاسلام'' کی بارھویں جلد بھی طباعت کے آخری مراحل میں ہے، حضرت نے انتہائی مسرّت کا اظہار فرمایا اور خُوب دُعائیں دیں۔ حضرت قاری صاحبؒ کی ان تقاریر کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا سورج کو چراغ دکھانا ہے ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

جو حضرات ان خطبات کا مطالعہ کر چکے ہیں یا آئندہ کریں گے وہ ان کی قدر ومنزلت کا خود ہی اندازہ لگائیں گے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ان خطبات کو حضرت صاحبِ خطبات کے لیے صدقہ جاریہ بنائیں اور جامع

خطبات محترم ومکرم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم کی اس پُر خلوص محنت کو قبول فرمائیں۔(آمین)

اسی طرح ان کے قائم کردہ ''دارالعلوم رحیمیہ'' ملتان جو جامع خیر المدارس کے شعبۂ قراءت وتجوید کے صدر المدرسین، استاذ القراء حضرت اقدس قاری ومُقری شیخ رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرہٗ کے نامِ نامی سے منسوب ہے اور ان کی علمی یادگار ہے۔اہلِ مدرسہ کی دعوت کے علاوہ بحیثیت ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ، مدرسہ میں متعدد بار حاضری ہوئی۔الحمد للہ مدرسہ کے نظم ونسق کو بہتر سے بہتر پایا۔بفضلہٖ تعالیٰ اَب دورۂ حدیث شریف بھی ہورہا ہے۔بہت دعائیں ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ادارہ کو اکابر کے طرز وفکر کے مطابق نُورِ علم پھیلانے کی توفیق خاص مرحمت فرمائے۔اور قبولیت کا اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔(آمین)

تقریظ مبارک

از: حضرت العلام مولانا

مفتی عبدالستار صاحب مدظلہ العالی (خیر المدارس ملتان شہر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً امابعد..... دعوت الی اللہ فریضۂ نبوت ہے۔ حضرت انبیاء علیہم السلام کے دعوت الی اللہ پر مشتمل مواعظ کا ایک حصہ ہمیشہ کے لئے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا ہے، تا کہ لوگوں کی ہدایت کا باعث ہو۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد اُمت کے کاملین مشائخ عظام وعلماء کرام اپنے اپنے ظرف واستعداد کے مطابق اس میراث نبوت میں سے حصہ پاتے ہیں۔ اللہ پاک ان کے کلام، ملفوظات ومکتوبات کے ذریعہ اپنی مخلوق کو ہدایت بخشتے ہیں۔ زندگیوں میں انفرادی واجتماعی انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ مردہ دلوں میں زندگی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ بند دل ہدایت ربانی کے لئے کھل جاتے ہیں۔ لکھو کھا اندھے، بینا، اور بہرے، شنوا ہو جاتے ہیں۔ کفر وشرک، بدعات ومعاصی کی ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں، ایمان ویقین اور اتباع سنت کے انوار سے قلب وقالب جگمگا اٹھتے ہیں۔ دعوت الی اللہ اور نالہائے صبحگاہی کی تاثیرات معاشرہ میں ضرور ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

عارِ رومی فرماتے ہیں:

گر نبودے نالۂ نے را ثمر　　　　نے جہاں را پُر نکردی از شکر

تاریخ شاہد ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر بصدقہ وفیض ختم نبوت، دعوت الی اللہ کا یہ کام مسلسل جاری ہے، اوران شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی دین جو کچھ امت کے پاس موجود ہے۔ یہ اسی تعلیم وتبلیغ اور اہل اللہ کے نالہائے صبحگاہی کا ثمرہ ہے۔

بسلسلہ وعظ ودعوۃ الی اللہ کی ایک کڑی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے حکیمانہ مواعظ وخطبات ہیں، جو آپ نے مختلف مواقع پر نہ صرف پاک وہند بلکہ حرمین شریفین افریقی ممالک یورپ تک میں ارشاد فرمائے اور تشنگان علوم ومعارف نبویہ کو سیراب فرمایا۔

جن حضرات کو موصوف کے حکیمانہ خطبات سننے کا کبھی اتفاق ہوا ہے۔ وہی اس کی حقیقت کو جان سکتے ہیں کہ آپ کا بیان علمی، ادبی، عملی، اخلاقی، روحانی ومعنوی اعتبار سے کتنا اعلیٰ ہوتا ہے۔ سنا ہے، کہ خیر المدارس جالندھر کے سالانہ جلسہ میں جب حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کا بیان ہوتا، تو حضرت شاہ عطاء اللہ

صاحب بخاری نور اللہ مرقدہ اسٹیج سے نیچے سامنے بیٹھ کر عجیب والہانہ شان سے آپ کا بیان سنا کرتے، اور مخصوص انداز میں داد دیتے اور فرماتے: ''یہ طیب نہیں بول رہا بلکہ حضرت قاسم نانوتویؒ کی روح بول رہی ہے''

حضرت قاری صاحب مدظلہم کے ایسے سینکڑوں مواعظ وخطبات ہوں گے جو سامعین نے سُنے۔ اور فضا میں تحلیل ہوگئے، اور بہت سے مواعظ کو بعض خوش قسمتوں نے ٹیپ بھی کیا۔ لیکن ان کے افادہ عوام کی صورت نہ تھی، کیوں کہ یا ہوا میں منتشر ہیں یا ٹیپ میں بند۔ اللہ پاک نے فاضل نوجوان عزیز مکرم جناب قاری محمد ادریس صاحب سلمہ کے قلب میں ان کے جمع واشاعت کا داعیہ پیدا فرمایا۔ چنانچہ اپنے طبعی ضعف اور ذمہ فرائض کے باوجود اس اضافی بارگراں کو اپنے ذمہ توکلاً علی اللہ لے لیا۔ موصوف نے نہ معلوم کہاں کہاں سے مواعظ کی کیسٹیں جمع کیں۔ پھر ان کو کاغذوں پر منتقل کیا، ترتیب کے دوران موقعہ بہ موقعہ مفید عنوانات کا اضافہ فرمایا۔ اور پھر بہترین کتابت وطباعت سے مزین کر کے یہ نادر تحفہ ہدیۂ ناظرین کیا۔ موصوف کی اس مساعی جمیلہ کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ اللہ پاک آں عزیز کی اس محنت وجانفشانی کو قبول فرما کر خلعت رضا وسعادت دارین سے نوازیں۔ (آمین)

فقط

امیدوارِ دُعاء

بندہ: عبدالستار عفا اللہ عنہ

تقریظ سعید

حضرت محترم مولانا محمد عابد صاحب زید مجدہم

اُستاذِ تفسیر جامعہ خیر المدارس ملتان

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِالْاَ نْبِیَاءِ وَخَاتَمِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اَمَّا بَعْدُ! حق جل شانہٗ کے اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات پر قابل رشک قسم کے انعامات ہیں جن میں سے خاص طور پر یہ بھی ہے کہ ہر دور میں علماء ربانیین حق کی ترجمانی اور دفاع کچھ ایسے طور پر کرتے رہے ہیں جو عالمِ انسانیت کے لئے مستقل طور پر ایک ذخیرۂ خیر ہے۔ گذشتہ صدی میں حق جل شانہٗ نے برصغیر میں اکابر اھلِ سُنت والجماعت علماءِ دیوبند کو اس شرف سے خُوب نوازا جس کے اثرات پُورے عالَم میں آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین قرنِ اوّل کے قافلے کے کچھ بچے ہوئے نُورانی لوگ تھے جنہوں نے نامساعد حالات کے باوجود وہ خدمات سرانجام دیں کہ اس کے اجمالی تذکرہ کے لئے بھی کئی دفتر چاہئیں۔

دین کا صحیح فہم، اتباعِ سُنت، اعتماد علی السلف، جامعیتِ دین کا اعتقاد، خلقِ خدا پر شفقت اور اس کی رہنمائی کے لئے ایسی تدابیر سوچنا اور اختیار کرنا، جیسے ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے بارے میں کرتا ہے، جیسی بے شمار صفات سے اللہ پاک نے اُن کو نوازا ہُوا تھا۔ یقیناً عمارت میں معمار کے ذوق و مزاج کو دخل ہوتا ہے، تصنیف اپنے مُصنف کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے، اسی طرح کوئی ادارہ اور مدرسہ اس کے بانی کے فکر و مزاج کا مظہر ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند سے علم و عمل، رشد و ہدایت کے جو چشمے اُبلے بلاشبہ اس میں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے اخلاص و فراست کا بھی بڑا حصہ ہے، اللہ پاک نے اپنے کرم سے آپ کی اولاد کو بھی اس نعمت سے نوازا، چنانچہ آپ کے نبیرہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ نے مسندِ اہتمام کے حوالہ سے دارالعلوم دیوبند کی نہیں، میں نے غلط کہا، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے وہ اسلام کا ایک درخشندہ باب ہے...... ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا محمد شریف صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ نے ایک بار فرمایا میں نے دو آدمی بڑے عجیب دیکھے ہیں، ایک حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ اور دوسرے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ، حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس میں ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے علوم کی بارش ہو رہی

ہے، جبکہ حضرت قاری صاحبؒ کی محفل میں معارف برس رہے ہوتے تھے، چنانچہ آپ جب کسی موضوع پر بیان شروع فرماتے تو کچھ ایسا دلنشین انداز ہوتا کہ سامعین مسحور ہوجاتے اور ایسے معارف وحقائق بیان کرتے کہ کبھی بزبانِ حال یوں کہتے: ''وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ'' اللہ پاک جزائے خیر نصیب فرماویں حبیب محترم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہم مدیر دارالعلوم رحیمیہ ملتان کو جنہوں نے حضرت قاری صاحب مرحوم کی آخری حیات میں ان جواہر کو لڑیوں میں پروکر ہار بنانا شروع کیا، چنانچہ جلد اوّل ودوم آپکی حیات میں آ گئی تھی، اور آپ کی نگاہِ ناز سے بھی مشرف ہوئی۔ حضرت مرحوم کی کرامت اور مرتب زید مجدہم کی سعادت ہے کہ خطبات کا یہ شجرہ طیبہ خوب پھلا پھولا حتیٰ کہ پورے عالم میں لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، تقبل اللہ تعالیٰ۔

اس وقت آپ کے سامنے خُطباتِ حکیم الاسلام کی بارہویں جلد ہے جو سورہ قلم کی تفسیر پر مشتمل ہے، اہلِ ذوق ان شاءَ اللہ اس جلد سے خوب مستفید ہونگے، حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ ایک خاص شان ومقام رکھتی ہے۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد رحمہ اللہ القرطبی نے اپنی زندہ جاوید تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن میں سورۃ ''ن'' کے بارے میں بڑے عجیب وغریب حقائق بیان فرمائے ہیں، فرماتے ہیں حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے کہ ''ن'' رحمٰن کا آخری حرف ہے۔ ①

حضرت امام جعفر صادقؒ کا قول ہے کہ ''نَهْرٌ مِنْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يُقَالُ لَهُ نُوْنٌ''. نون جنت کی نہروں میں سے ایک نہر ہے۔ ② ابو العاسیہ کا قول ہے کی وہ اللہ پاک کے اسماء حسنٰی میں سے نصیر، نور، ناصر، کا پہلا حرف ہے۔ ③ بہر حال یہ اشارات سُورۃ ''ن'' کی اہمیت اور عظمت کی نشاندہی کررہے ہیں، ان شاءَ اللہ قارئین اس قسم کے لطائف ومعارف سے اس جلد کے مطالعہ کے دوران خوب لطف اندوز ہوں گے۔

اس شجرہ طیبہ کے پھلنے پھولنے میں جناب مرتب حضرتِ اقدس مولانا قاری محمد ادریس صاحب مدظلہٗ کے اخلاص اور جُہد کا بنیادی حصہ ہے۔ کہ: خطباتِ حکیم الاسلام کو الحمد للہ علمی حلقوں میں استقرار ملا۔ اسی طرح موصوف نے چند سال قبل بفضلہٖ تعالیٰ ''دارالعلوم رحیمیہ'' کے نام سے ملتان میں حضرت اقدس مقریء اعظم شیخ القراءٔ مولانا قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے منسوب ان کی علمی یادگار کے طور پر ایک ادارہ قائم کیا، جس میں بفضلہٖ تعالیٰ اَب دورۂ حدیث شریف تک درجہ کُتب بھی جاری ہے۔ شعبہ حفظ تو الحمد للہ پہلے ہی مستحکم تھا۔ سینکڑوں حُفاظ کرام اس مدرسہ سے اخذِ فیض کرچکے ہیں اور کررہے ہیں اور ملک بھر میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ① زمانۂ طالب علمی سے حضرت قاری صاحب زید مجدہم اور فقیر، ہم درس، ہم فکر وہم خیال ہونے کے ساتھ روحانی طور پر بھی ایک شیخ سے بیعت ہوئے۔

حضرتِ اقدس شیخ التفسیر مولانا محمد عبداللہ صاحب بہلوی نوّر اللہ مرقدہٗ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہوئے اوران کی زیرِ تربیت رہنے کا موقع نصیب ہوا حضرت اقدسؒ نے نگاہ کرم فرماتے ہوئے ایک رمضان المبارک کی تراویح میں خود پیچھے کھڑے ہوکر حضرت قاری صاحب کا قرآن کریم سنا، حضرت اقدسؒ نے تمام طلباء میں امتحان لے کر موصوف کا نسبتِ رحیمی سے اِنتخاب فرمایا تھا اور ختم قرآن کریم کے موقع پر اپنی مستعمل دستار عطا فرمائی تھی۔ ظاہر ہے ان حضراتِ اکابر کے عطایا رسمی ہدایا نہیں ہوتے۔

ان حضراتِ اکابر کی توجہات کی برکت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے محض اپنے فضل وکرم اور بالخصوص ان کے والد ماجد حضرتِ اقدس مولانا محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ جنہوں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے دورۂ حدیث کی سند حاصل کی۔ نیز ختم بخاری کے موقع پر دارالحدیث دیوبند میں علمانہ وطلباء کے برگزیدہ ومبارک اجتماع میں آپ کا نکاح حضرت مدنیؒ نے نہایت سادگی اور طالب علمانہ لباس میں پڑھایا۔ اور خیر وبرکت کی دعا فرمائی تھی۔

حق تعالیٰ شانہٗ ان سے دین کا کام لے رہے ہیں۔ میرے اصرار پر حضرت قاری صاحب زید مجدہم اپنے والد ماجد کے حالات قلمبند کر کے خطباتِ حکیم الاسلام میں دے رہے ہیں تا کہ جس شخصیّت نے خطباتِ حکیم الاسلام کی گیارہ (۱۱) جلدوں میں راہنمائی کی ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات میں آجائے۔

بہرحال اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں دُعا ہے کہ حضرت محترم مرتب زید مجدہم کے علم وعمل، اخلاص وتقویٰ اور عمر میں بے انتہا برکات عطا فرمائے اوران کی اس سعی کو سعئ مشکور فرمائے۔

ایں دعاء از من واز جُملہ جہاں آمین باد

اظہار عقیدت

محترم ومکرم حضرت والعلام مولانا محمد اسحٰق خانصاحب زیدت عنایاتہم

(رکن اسلامک مشن متحدہ عرب امارات، دبئ، وسر پرست اعلیٰ جمعیت اہل سنت والجماعت متحدہ عرب امارا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ اشرف الانبياء وسيد المرسلين نبينا محمد وعلىٰ اٰله وصحبه اجمعين. وبعده..... دین اسلام، دین دعوت وتبلیغ ہے، کیونکہ یہ دین ساری دنیا کو کفر وشرک اور ضلالت وغوایت کے مختلف اندھیروں سے نکال کر توحید وسنت کی روشنی میں لانے اور راہ حق پر ڈالنے کے لئے آیا ہے، اسی لئے اللہ پاک، اپنے پیغمبر علیہ السلام کو واشگاف الفاظ میں تبلیغ حق کا حکم دیتا ہے، ارشاد ربانی ہے: **يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته.** (الأية)

''اے پیغمبر! (بلاکم وکاست) پہنچا دو وہ پیغام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آپ کے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے، اور اگر بالفرض آپ نے ایسے نہ کیا تو آپ نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔''

اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: **بلغوا عني ولو اٰية** (پہنچا دو میری طرف سے اگر چہ وہ ایک آیت ہی ہو''۔ اسی لئے امت مسلمہ امت دعوت وتبلیغ کہلاتی ہے اور سلف وخلف میں بے شمار ایسی مقدس وپاکیزہ ہستیاں گذری ہیں جنہوں نے دعوت وتبلیغ کے اس میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، انہی مکرم ومحترم ہستیوں میں سے ایک ہستی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند انڈیا) کی بھی ہے، جن کو قدرت کی فیاضیوں نے علم وفضل کی بیکرانیوں کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی حلاوت ولطافت سے بھی بطور خاص نوازا تھا، گھنٹوں آپ کے بیان سے بڑے بڑے مجمعوں پر ایک سحر طاری ہو جایا کرتا تھا اور دنیا ہمہ تن گوش بن جایا کرتی تھی۔

اس پر مزید یہ کہ آپ کے اخلاص اور صدق دروں کے باعث یہ سب سرمایہ کیسٹوں کی شکل میں محفوظ بھی ہو گیا، دبئ میں راقم آثم کو ہندوستان کے بعض ثقہ حضرات نے سنایا کہ بمبئی میں ایک ادارہ صرف حضرت قاری صاحب مرحوم ومغفور کی کیسٹوں کی حفاظت وترویج کے لئے قائم کیا گیا ہے جس میں حضرت مرحوم کی سترہ ہزار کیسٹوں کا ذخیرہ جمع کر لیا گیا ہے۔

سبحان اللہ اتنا قبول عام اور اس طرح تحفظ شاید ہی پورے برصغیر ہندو پاک کے دوسرے کسی بھی خطیب کو نصیب ہوسکا ہو، یہ آپ کے اخلاص وللّٰہیت کا بین ثبوت ہے۔ (فرحمه الله رحمة واسعة)

اپنے ملتان کے حالیہ مختصر دورے کے دوران مجھے محترم مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری زید مجدہٗ نے بتایا کہ آپ ''خطبات حکیم الاسلام'' کی ساتویں جلد ترتیب دے رہے ہیں، اور وہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے تو مجھے اس سے دلی خوشی بھی ہوئی، اور حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حکیمانہ خطبات کی اس مقبولیت ومحفوظیت کا تعجب انگیز احساس بھی، اس ضمن میں موصوف نے راقم آثم سے اس کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے فرمایا تو راقم آثم نے کیف ما اتفق نہایت جلدی میں یہ کچھ اُلٹے سیدھے نقوش حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دلی تعلق اور قلبی عقیدت کی بناء پر اور رضاء الٰہی کے حصول کے لئے سپرد قلم وقرطاس کر دیئے، اللہ پاک قبول فرمائے، اور محترم قاری صاحب موصوف اور ان کے رفقاء کرام کی ان مساعی جمیلہ کو بار آور فرمائے، جو وہ اس کار خیر میں فرما رہے ہیں۔ (آمین ثم آمین) وصلى الله تعالىٰ علىٰ نبينا محمد وعلىٰ وٰله وصحبه وسلم

محمد اسحٰق خان (عفاالله عنه بحاوفاه)

نزیل ملتان، پاکستان

تحریر ۱۸، ۱۱، ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۲، ۶، ۱۹۸۹ء

بروز جمعرات بوقت پونے گیارہ بجے شب

گرامی قدر راخی فی اللہ حضرت محترم مولانا قاری ابوانس عطاء اللہ بخاری صاحب زید مجدہم
امام خطیب النور مسجد، الیف بلاک ورئیس مدرسہ نزہۃ الظہور (شمالی ناظم آباد کراچی)

علم و حکمت کی کہکشاں

بِاسْمِہٖ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی

محترم و مکرم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری دامت برکاتہم العالیہ کی زیرِ نظر کتاب ''خطباتِ حکیم الاسلام جلد۱۲'' اسی سلسلۃ الذہب کی تازہ ترین کڑی ہے جس میں اس عظیم المرتبت، عبقری شخصیت، جو اکابر علماء دیوبند کے سچے جانشین، علوم و معارف کے پاسبان، روایات اسلاف کے امین، مُحبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار، اقلیمِ علم کے تاجدار، اپنے دَور کے عمدہ قاری، جید حافظ، صاحبِ علم وکمال، کامیاب معلّم، نامور متکلّم، محدّثِ کبیر، عالمی خطیب، شگفتہ قلم مصنف، نکتہ دان فلسفی، مردم شناس مُربی، لطائف و اسرار، حقائق ومعارف پر گلفشاں، ایسے کہ چمنستانِ ادب وحکمت اور گلستانِ فصاحت وبلاغت میں بہار آجائے۔ مادرِ علمی دیوبند کی انتظامی خدمت پر ساٹھ برس تک چمکنے والا ستارہ، نبیرہ حجۃ الاسلام، حضرتِ اقدس مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے وہ خطبات اور تقاریر و مقالات کے بکھرے ہوئے وہ ذخائر، حکمت ونکات کے وہ موتی جواب تک منظم تحریروں میں دستیاب نہیں تھے۔ حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب ہوشیار پوری دامت برکاتہم نے صفحۂ قرطاس پر اپنے قلم کے ذریعے ان کو نظم وترتیب کے ساتھ یکجا کرتے ہوئے ایسی کہکشاں سجائی ہے جس کے سامنے نظامِ شمسی کی کہکشاں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے کہ نظامِ شمسی کی کہکشاں صورتوں اور رنگوں کے تعارف کا ذریعہ ہے جس کی بُنیاد مادہ ہے۔ اور علم وحکمت کی کہکشاں جائز ونا جائز، عدل وظلم کا امتیاز، باہمی اجتماعی وانفرادی حقوق کی حدود اور مقاماتِ قلب وباطن کی صحت وفساد میں صحیح سمت متعین کرنے کا نام ہے جو ظاہر ہے نظامِ شمسی سے ممکن نہیں۔ اس لئے ہوشیار پوری صاحب، کی سجائی ہوئی کہکشاں اپنی چمک دمک، روشنی، حرارت، نور، تابندگی اور تاریکیوں کو منور کرنے میں بے مثال ہے۔ موصوف مکرم، میرے مشفق ومہرباں استاذِ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے لائق اور ہونہار فرزند ہیں۔ وہ ایک باصلاحیت منظّم، کامیاب مدرس بہترین قلم کار اور عالمِ باعمل ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسی دولتِ علم سے نوازا ہے جس کے بارے میں شیخ رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

علم را بردل زند بارے بود

اس علم نے کیسی ''یاری'' نبھائی؟۔ انہیں ایسا توشۂ آخرت فراہم کرنے میں معاونت کی جس پر ہم جیسے ٹوٹا

چھوٹا لکھنے والے رشک کرتے ہیں۔ میں جب ہوشیار پوری صاحب کے تصنیفی سرمائے پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنی نام نہاد تحقیق وتنقید، تبصرہ وجائزہ قطعی بے کار اور ہیچ محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے جو راستہ منتخب کیا وہ جہاں ان کی نیک نیتی اور خلوص کا مظہر ہے وہاں شُہرت وتعریف اور مال وزر سے ان کی بے نیازی پر دال ہے۔ بااین ہمہ!

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

خداوند کریم اُن پر مہربان ہے۔ عُمر بھر درس وتدریس اور مدرسہ کے انتظامی امور کے لئے سارا دن ''چکی کی مشقت'' اٹھانے کے ساتھ ساتھ ''مشقِ سخن اور مشق قلم'' جاری رکھنا کس قدر صبر آزما اور جان لیوا کام ہے۔ اس کا اندازہ شاید عام قاری بلکہ بہت سے اہلِ قلم بھی نہیں کر سکتے بقول شخصے:

انہیں کا ہے یہ کام، جن کے حوصلے ہیں سوا

غیر معمولی مصروفیات کے اس عالم میں انہوں نے جس استقلالِ مزاج کے ساتھ اور جس خاموشی وتندہی سے اور: ع

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا''

کا مصداق بن کر اپنا کام جاری رکھا، ہمارے ہاں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، انہوں نے جہاں اپنی عاقبت کا زادِ راہ فراہم کیا ہے وہاں ہم جیسوں کے لئے رُشد وہدایت کی جُوت جگائی ہے۔ ممتاز علماء کرام اور مُستند مؤلفین نے ان کی تصانیف کی صحت واستناد پر صاد کیا ہے اس بارے میں میرا کچھ کہنا ''چھوٹا مُنہ اور بڑی بات'' ہوگی۔ یہ چند بے ربط سطور محض تعمیلِ ارشاد کے طور پر کہی جارہی ہیں ورنہ میں خود کو اس موضوع پر کچھ کہنے یا لکھنے کا اہل نہیں پاتا۔ یہ اُن کی ذرّہ نوازی ہے اور اس عنایت کے لئے میں تہہِ دل سے ان کا ممنون وسپاس گذار ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی دینی خدمات اور مساعئ جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطاء کرے۔ (آمین ثم آمین)

فقط دُعائے خیر کا طالب
ابوانس عطاء اللہ بخاری

تقریظ مبارک

حضرت اقدس محترم ومکرم مفتی محمد وجیہہ صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث دار العلوم مظاہر العلوم ٹرسٹ لطیف آباد نمبر۹ حیدرآباد سندھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مکرم ومحترم مولانا قاری حافظ محمد ادریس صاحب دامت برکاتہم نے خطبات حکیم الاسلام کو جمع فرمانے اور اس کی اشاعت کا جو کام انجام دیا ہے یہ دین کی ایک اہم خدمت ہے جس کی دس جلدیں آچکی ہیں اور دو جلدوں کے مسودے تیار ہیں۔ بکھرے ہوئے موتیوں اور جواہرات کو جمع کر کے ایک ذخیرۂ علمی اُمت مسلمہ کے سامنے پیش فرما کر ایسی خدمت انجام دی جیسا کہ منتشر صحائف قرآن کو جمع کر دیا گیا۔ یہ علمی ذخیرہ اگر اس کی کھوج نہ لگائی جاتی تو ضائع ہو جاتا۔ اس علمی ذخیرہ سے بہت فائدہ پہنچا اور پہنچتا رہے گا۔ (ان شاء اللہ) جو حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ کیلئے صدقۂ جاریہ ہے۔ اور مولانا قاری محمد ادریس صاحب کیلئے بھی اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور درجات عالیہ سے نوازیں اور مزید خطبات اور جامع خطبات کو جزائے خیر عظیم عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین

احقر العباد: محمد وجیہہ غفرلہ

دار العلوم مظاہر العلوم لطیف آباد نمبر۹

حیدرآباد سندھ ۳۰ رجب ۱۴۱۸ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ جلد اوّل

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

أَمَّا بَعْدُ!

خدماتِ قاسمؒ وطیبؒ کی جھلک..... الحمد للہ ''خطبات حکیم الاسلام'' ایک عرصہ کی محنت ومشقت اور جدوجہد کے بعد مرتب ہوئی اور بسیار سعی وکاوش سے کتابت وطباعت کے مراحل سے بخیر وخوبی گذر کر منظر عام پر آئی، حکیم الاسلام حضرت مولانا جناب قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ جس خانوادۂ علمی سے تعلق رکھتے ہیں اس کی شہرت ایسی ہمہ گیر ہے کہ حضرت موصوف کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُمت مسلمہ بالعموم اور اہل سُنت والجماعت کا عظیم طبقہ بالخصوص جس عظمت وتقدس اور احترام کی نگاہ سے اسے دیکھتا ہے وہ کوئی مخفی بات نہیں ہے۔ میری مراد حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اور حضرت حکیم الاسلام قاری طیبؒ صحیح معنوں میں ''ماہتاب قاسمی'' ہیں۔

حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ نے دُنیائے اسلام کے لئے بالعموم اور برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص جو قابل قدر اور گرانمایہ خدمات سرانجام دی ہیں، اور افق ہند پر چھائے ہوئے کفر وضلالت کے بادل جس طرح انکی آہِ سحر گاہی اور اخلاص وللّٰہیت کی بدولت چھٹے ہیں، اس سے تاریخ کا ایک بہت بڑا اور زرّیں باب مرقوم ہے۔ اربابِ بصیرت اور تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی ان نامساعد حالات سے بخوبی واقف ہے جن میں اسلام کے چراغ کو گل ہونے سے بچانے کیلئے وہ غیر مسلم طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اور ایسی مجاہدانہ قربانیاں پیش کیں جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائیں گی۔ اور پھر اپنے بعد اپنا تربیت یافتہ ایک مستقل طبقہ چھوڑا جو آج تک ان کے اس مقدس مشن کو لئے آگے بڑھ رہا ہے اور ہر طرف سے اُسے خدا کی نصرت وحمایت حاصل ہو رہی ہے۔

دار العلوم دیوبند جو بظاہر ایک ادارہ ہے۔ جہاں علومِ دینیہ کی درس وتدریس کا سلسلہ صبح وشام جاری ہے۔ طالبانِ علم کی تشنگی کا سامان ہوتا رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے دل میں جو مسلمانان ہند کے اجتماعی مفاد اور اسلام کے لئے تڑپ تھی، اس اجتماعی مفاد کے حصول کی خاطر آپ نے اپنی تحریک اور مشن کو علم کی چادر اوڑھا دی تھی..... الحمد للہ وہ آج تک اسی راہ پر سرگرم عمل ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ اس ادارہ نے علم وفضل میں کیا عروج پایا؟ اور دنیائے اسلام میں کیا

مقام پایا اور کیا کیا خدمات سرانجام دیں؟ اس کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا یا مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیائے اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کوئی صاحبِ علم، دین کے کسی شعبہ میں کسی خدمتِ دینی میں لگا ہوا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ دارالعلوم دیو بند کا ہی فیض یافتہ ہے۔ دارالعلوم کا فیض پُر تاثیر ایسا ہمہ گیر ہے کہ صدیوں اس کے اثرات انشاء اللہ باقی رہیں گے۔ حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ نے گو اپنے کو مٹائے رکھا لیکن جس کو اللہ پاک عزت وشرف سے نمایاں کرنا چاہیں تو وہ مشیت ایزدی کے تحت ہو کر ہی رہتا ہے الحمدللہ وہ اپنے علمی کارہائے نمایاں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں اور جس عشق ومحبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اتباعِ دین کے ساتھ انہوں نے زندگی گزاری، کہا جاسکتا ہے کہ۔

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

کا وہ حقیقی مصداق ہیں۔ آج اس دارالعلوم کو قائم ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے وہ اسی آب وتاب سے اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ کفر کی حرکات گو اس پہ خندہ زن ہوں مگر نورِ نبوت کا چراغ بھی اس کو مل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرات اکابر دیو بند سے جو کام لیا ہے اس کے ظاہری وسائل کم اور حقیقی وروحانی وسائل اسمیں بطور اصل عنصر کے شامل رہے ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ اس دور میں علومِ قاسمی کے سچے وارث اور امین ہیں۔ ان کے اندازِ بیان سے حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کی تقاریر جو میرے پاس پہنچیں تو اس جذبے کے ساتھ کہ علوم چند اشخاص کی حد تک نہیں رہنے چاہئیں بلکہ ان کو عام ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان تقاریر کو ایک کتابی شکل دینے پر آمادگی ہوئی اور ان تقاریر کو پڑھنے والے.... مجھے امید ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کریم ابن کریم، ابن کریم کی شان کے حامل ہیں۔ اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام نور اللہ مرقدہ کا قائم کردہ ''دارالعلوم'' نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا ان کے زیرِ اہتمام جس حسن وخوبی سے چل رہا ہے کہا جاسکتا ہے کہ روحِ قاسمی قالبِ طیّب میں جلوہ گر وجلوہ آراء ہے۔

حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کی تقاریر بالمشافہ سُننے کا اتفاق کم ہی ہوا اور پاکستان میں حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری بھی ہوتی ہے تو پروگرام کچھ اس نہج سے بنتے ہیں کہ عامۃ الناس کو حضرت قاری صاحب کے علوم ومعارف سے استفادہ کا موقع کم ہی ملتا ہے، جہاں اس میں حکومت کے مروّجہ اصول وضوابط آڑے آتے ہیں اور حضرت قاری صاحب چند مخصوص مقامات (مثلاً جامعہ اشرفیہ لاہور، دارالعلوم کراچی، خیر المدارس ملتان اور دارالعلوم اکوڑہ خٹک) کے علاوہ آزادانہ طور پر ہر جگہ نہیں پہنچ سکتے، وہاں خود عامۃ الناس میں معتقدین، متوسلین اور اکابر دیو بند سے متعلقہ ایک مستقل طبقہ اپنی گراں بار مصروفیات اور دینی مشاغل کے پیشِ نظر نیز ہوش رُبا گرانی کے باعث اپنے اندر ہمت وسکت نہیں پاتا کہ وہ اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر برابر مسافرت میں شریک رہ سکے

اور حضرت قاری صاحب کے نکتہ رس اور حکیمانہ اندازِ تکلم سے فیض یاب ہوسکے۔ (قاری طیب صاحبؒ اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں)۔

آج کے دور میں اصلاحی جلسوں کی تقاریر کا "رُخ" بھی کچھ اس ڈھب کا ہوگیا ہے کہ تقریر کے اختتام پذیر ہونے کے بعد حاضرین میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں اصلاح کے علاوہ باقی سب کچھ مل جاتا ہے۔ سیرت طیبہ کے نام پر منعقد ہونے والی بڑی بڑی مجالس میں بھی سیرت کے علاوہ باقی بہت کچھ مل جائیگا مگر سیرت ہی مفقود ہوگی۔

خطباتِ حکیم کی خصوصیات...... حضرت حکیم الاسلام مدظلۂ کے خطبات میں جہاں عوام کے لئے اصلاحی افادیت ہے وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اسلام کو ایک اجتماعی نظام حیات ماننے کی بجائے "اسلام ہر ایک کا ذاتی وشخصی مذہب ہے" کے فلسفہ کا قائل ہے اسے بھی دعوتِ فکر ہے۔ اندازِ بیان نہایت شستہ، سنجیدگی اور متانت سے بھرپور، روانی اور تسلسل کا شاہکار ہے جو دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ بیان میں قصص وواقعات، قرآن حکیم کی آیات کی بے نظیر تفسیر احادیث کی بہترین تشریح، حکایات وتمثیلات اور حکیمانہ نکات کی خوب سے خوب آمد ہوتی ہے۔ سامعین اکثر دم بخود محوِ وعظ ہوتے ہیں۔ اہل علم بات بات پہ سر دُھنتے ہیں۔ اور مجمع پر ایک سناٹے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ كَأَنَّ عَلٰى رُؤُوْسِهِمُ الطَّيْرَ۔ حضرت قاری صاحب مدظلۂ اپنی انہی خصوصیات کے باعث مجلس وعظ سے جب مخاطب ہوں تو انکی تقریر حشو وزوائد اور مکررات سے مبرّا ہوتی ہے اور تحریر نُما تقریر ہوتی ہے۔ تاہم سلسلہ کلام بہرحال تحریر سے کچھ مختلف ہوجانا ایک فطری امر ہے۔ بندہ نے پورے خطبات کو لفظ بلفظ قلم بند کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے تاہم تحریر میں لاتے وقت کچھ جملوں کی نوک پلک ضرور سنواری ہے اور اسمیں بھی مقدور بھر یہی کوشش رہی ہے کہ حضرت قاری صاحب کے الفاظ میں ہی جملوں کی نشست وبرخاست کو درست کردیا جائے۔ اب حضرت قاری صاحب کے مواعظ سے مستفیض ہونے والے اصحاب ہی اس بات کا فیصلہ کر پائیں گے کہ کس حد تک مجھے کامیابی ہوسکی۔ حضرت قاری صاحب مدظلۂ العالی کی شخصیت یا ان کے خطبات ومواعظ کے بارے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے تاہم یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب میں اگر کوئی حسن وخوبی نظر آئے تو اسے حضرت قاری صاحب کی خطابت کا ایک حصہ سمجھا جائے اور جو اس میں نقص وکمی محسوس ہو تو اسے راقم آثم کی طرف منسوب فرمادیں، جس پر راقم بصد ندامت معذرت خواہ ہے۔

بندۂ ناچیز: محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلۂ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد دوم

حامدا للہ العظیم ومصلیا علی رسولہ الکریم

اما بعد ......خطبات حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے سلسلہ کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے۔ اہل علم کی طرف سے جلد اول کی پذیرائی اور مقبولیت نے دوسری جلد کی ترتیب کو میرے لئے آسان تر کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جلد دوم ضخامت میں بڑھ گئی۔ (مجموعی طور پر اس میں چودہ (۱۴) خطبات شامل کئے گئے ہیں)

حضرات علمائے دیوبند شریعت وطریقت دونوں کے جامع ہیں۔ جہاں یہ تعلیم شریعت کے لئے حجت تسلیم کئے جاتے ہیں، وہاں تزکیۂ باطن کے لئے بھی رہبر کامل مانے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں سے دونوں چشمے جاری ہیں۔ تزکیہ باطن کے لئے جہاں اذکار ومجاہدے بتلائے اور کرائے جاتے ہیں اسی سلسلہ میں تذکیر وتبلیغ بھی ایک مؤثر حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے ایک طرف یہ انما بعثت معلما کا پرتو نظر آتے ہیں تو ساتھ بلغوا عنی ولو آیۃ کی عملی تفسیر بھی نظر پڑتے ہیں۔

تاثیر وعظ کا تعلق الفاظ سے نہیں جذبات قلب سے ہے۔ اور جذبات قلب کی اصلاح ''پیش مرد کاملے پامال شو'' کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے خطبات کا یہ مجموعہ جہاں علمی لطائف ونکات کا حامل اور ہر قسم کے رطب ویابس سے پاک ہے، وہاں اصلاح باطن اور تزکیۂ قلوب کے نسخۂ اکسیر بھی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا اور مبالغہ نہ ہوگا کہ اس مجموعیہ سے جہاں علماء، فضلاء اور خطباء بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ وہاں راہ سلوک واحسان کا طلاب اپنی تشنگی کا ساماں بھی کر سکتا ہے۔ جہاں ایمان ویقین سے بہرہ ور دیندار اس کی لذت وشیرینی سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔ وہاں عقل وفلسفہ اور جدید روشنی کا بھٹکا ہوا خیرہ چشم ومرعوب بھی اپنے آئینہ قلب کو جلا بخش سکتا ہے۔

قحط الرجال کے اس دور میں بزرگان دین کے ملفوظات ومواعظ ان کی صحبت کے قائم مقام ہیں۔ جن کو پڑھتے رہنے سے قلب میں نورانیت اور عمل صالح کا جذبہ زندہ رہتا ہے۔ ورنہ حوادث زمانہ نے ایمانی چنگاری کو زائل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس لئے یہ صحبت ومعیت کا بہترین بدل بھی ہیں اور حفاظت ایمان کا ذریعہ بھی۔

جغرافیائی حدود حائل ہونے کے باعث میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ میں جلد اول ودوم کے مسودات حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کر سکتا، اور ان سے نظر ثانی کی درخواست کرتا۔ البتہ استاذ الاساتذہ امام القرأت آیۃ من آیات اللہ حضرت مولانا القاری المقری فتح محمد صاحب دامت برکاتہم، مہاجر مدنی سے بذریعہ

مکتوب چند اقتباسات ارسال کر کے تحسین وتائید حاصل ہوئی۔ اور پاکستان کے جید اور ممتاز ومستند علماء اپنے اساتذہ کرام کی خدمت میں اس مسودہ کو پیش کر کے ان سے اس بارے میں کچھ لکھنے کی درخواست کی، جسے انہوں نے منظور فرمایا۔ چنانچہ مخدوم العلماء حضرت مولانا محمد شریف صاحب مدظلہٗ خلیفہٗ ارشد حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ (مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان) اور اسوۃ الصلحاء حضرت العلام مولانا مفتی عبدالستار صاحب زید مجدہم (خیر المدارس ملتان) نے مختلف مقامات سے پڑھا اور تحسین فرمائی۔ نیز کتاب کے بارے میں کلمات تبرک ارقام فرمائے، جو کتاب میں شامل کر دیئے گئے۔

علاوہ ازین والد محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہٗ (استاذ دارالعلوم کراچی) نے بالاستیعاب پورے مسودے کا مطالعہ فرمایا، اور قابل اصلاح عبارت کی نشاندہی فرمائی۔ خصوصاً احادیث کی عبارت نقل کرنے میں احتیاط سے کام لیا گیا۔ اس کے باوجود بندے کا علم ناقص ہے خطاء کا احتمال باقی ہے۔ اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اہل علم اس کی اصلاح فرمادیں اور بندہ کو بھی مطلع فرمائیں۔ بندہ اس کا شکر گزار اور ممنون ہوگا۔

اس اظہار حقیقت کے بغیر چارۂ کار نہیں کہ اس مجموعہ کی تمام تر خوبیاں علوم قاسمی کے حامل اور وارث وامین کے لئے زیبا ہیں۔ اور بندہ کی حیثیت محض ایک نااہل مرتب کی ہے۔ اور بس

من ہیچم وکم زہیچ بسیارے　　　وزہیچ کم ازہیچ نیاید کارے

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جلد دوم میں بیشتر تقاریر کیسٹز سے لی گئی ہیں، جو مختلف مقامات پر ریکارڈ کی گئیں۔ اس سلسلہ میں بندہ برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہٗ اور مولانا قاری سیف الدین صاحب زید مجدہٗ (مقیم سعودی عرب) کا خاص طور پر شکر گزار اور ممنون ہے کہ انہوں نے بندۂ ناچیز کو یہ تقاریر مہیا فرمائیں۔ اور جلد اول کی طرح اس مجموعہ میں بھی تعاون فرمایا۔ میں ان دو حضرات کے حق میں کلمات تشکر وامتنان کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ حقیقی صلہ تو حق تعالیٰ شانہٗ ہی دے سکتے ہیں۔

بہر حال یہ مجموعہ حاضر خدمت ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے فضل وکرم سے اس کو شرف قبولیت سے نواز کر اس کے منافع کو عام وتام فرمادیں۔ اور ہم سب کے لئے دین ودنیا کے لحاظ سے خیر وبرکت، صلاح وفلاح اور ذریعۂ نجات اخروی بنائیں۔ (امین یارب العلمین. بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم.)

چشم دارم کہ دہد رقم مراحسن قبول　　　آنکہ دُرّ ساختہ است قطرۂ بارانی را

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ / یکم اگست ۱۹۸۱ء

پیش لفظ جلد سوم

حامداً الله العظیم ومصلیاً علی رسوله الکریم وعلیٰ اٰله واصحابه واتباعه اجمعین. اما بعد ...... اس کارخانۂ کون ومکان کی تمامتر زینت وآرائش اوراس میں رکھے گئے بے شمار خزائن اس انسان کے لیئے بنائے گئے ہیں اوراسے انسان تو اپنے خالق کے لئے بنایا گیا ہے: ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للاٰخرة. (الحدیث)

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے جو مقصود بعثت انبیاء علیہم السلام ہے۔ مگر انسان اس کو فراموش کر چکا اور جن کا وہ مخدوم تھا، ان کو مخدوم بنا کر راہ راست سے بھٹک گیا۔ تعلیم انبیاء علیہم السلام نے اسے فکر ونظر اور قلب ودماغ کے لحاظ سے اس کائنات سے اتنا اونچا بنایا تھا کہ اس ساری دنیا کی حقیقت کو یہ فرمایا۔ کہ ایک مچھر کے پر برابر اس کی وقعت نہیں۔ اور خالق انسان کی یہ صدا اس کو سُنائی ''تو میرے لیئے ہے'' اور اس دنیا کی کوئی چیز تیرا بدل نہیں''۔ بلکہ فرمایا گیا کہ تیرے اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال وافعال کا صلہ ایسا تیار کیا گیا ہے۔ کہ کسی انسان نے دیکھا سنا تو کیا ہوگا، اس کا ادنیٰ تصور بھی قلب بشر پر نہیں گزرا الغرض، ترغیب وترہیب، انذار وتبشیر اور تبلیغ وتذکیر کے ذریعے اسے متوجہ کیا گیا۔ کہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی لہو ولعب اور اس کی زیب وزینت متاع الغرور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور متاع زندگی صرف کرنے کے بعد بھی تیرے بنائے ہوئے منصوبے تار عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اس کائنات سے مقصود خالق کائنات کا تعارف تھا۔ مگر انسان اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو کر رہ گیا۔ بلکہ خود انسان کا وجود اس کے لیئے دعوت فکر ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون. حصول معرفت کی بجائے یہ خدا فراموشی سے زیادہ خود فراموش بن گیا۔ نہ اس کے سامنے اس زندگی کا کوئی نصب العین ہے اور نہ زندگی کے بعد آنے والے دور کا کوئی خاکہ ہے، نہ اس کا ثواب عقاب اور جزا وسزا مدنظر ہے۔

انسانیت کے سب سے بڑا محسن حضرات انبیاء علیہم السلام کا مقدس وبرگزیدہ طبقہ ہے جس نے انسان کو ابدی راحتوں اور حقیقی نعمتوں کی راہ پر گامزن کیا اور اسے اس کا نصب العین یاد دلایا اور کس شان سے یاد دلایا۔ لااسئلکم علیه اجرا. نیز حیات مابعد الموت سے روشناس کرایا۔ جس سے نہ صرف اس کی یہ زندگی بھی صبر وشکر، عفو ودرگزر، ورع وتقویٰ، زہد وقناعت اور سجدۂ وعبادت جیسے اعمال صالحہ واخلاق حمیدہ میں ڈھل گئی۔ بلکہ

اس زندگی کو اپنانے والے دنیا سے جاتے ہوئے اہل دنیا سے بطور شہادت کہہ گئے: فزت برب الکعبۃ.

بہر حال امن وآشتی، سکون واطمینان اور راحت وچین کے الفاظ نہیں۔ ان کے حقائق ومعارف اور ان کی سچی کیفیات ومصادیق انبیاء علیہم السلام کے دامن رحمت اور ان کی تعلیمات میں پوشیدہ مضمر ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد آنے والے دور کے لیئے فرمایا گیا۔ ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا اور العلماء ورثۃ الانبیاء. وراثت علوم وکمالات نبوت بعد از ثبوت نسبت ملتی ہے جیسا کہ وراثت دنیا بعد از ثبوت نسبت حاصل ہوتی ہے۔ علماء ربانی اور مشائخ حقانی نے اس ورثۂ نبوت کو خوب سے خوب پھیلایا۔ نہ اس میں حصول منفعت کو پیش نظر رکھا، نہ مضرت کے اندیشوں کو خاطر میں لائے، نہ حب مال وجاہ انہیں زیر کر سکی، نہ بادشاہوں کی پیش کشیں ان کی استقامت میں لرزہ پیدا کر سکیں۔ ان کا مسلک یہ رہا۔

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم — با میر خان بگوئے کہ روزی مقدر است

بلکہ اس دنیا کی بے حقیقتی ودولت کا اس طرح برملا اظہار کیا۔

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من ملک نیم روز را بیک جو نمی خرم

قلب انسانی کا اس معراج پر پہنچا یہ بلا تعلیم انبیاء علیہم السلام کے ممکن نہیں۔ اور باطن کی بادشاہی اس دنیا کی محبت کو دل سے نکالے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں — ایں خیال ست ومحال است جنوں

اور قلب کی جب اصلاح ہو جاتی ہے۔ پھر قالب سے نکلنے والے اعمال بھی اعمال صالحہ کہلاتے ہیں اور دربار خداوندی میں وہ باقیمت ہو جاتے ہیں۔

آج کے سائنسی دور میں جب کہ اعمال کی قیمت دل سے نکل چکی ہے۔ انسان میں شرافت ودیانت عنقاء ہوگئی اور اخلاقی اقدار پامال ہوگئیں۔ جہاں اس کے اور اسباب ہوں گے۔ وہاں ایک بڑا سبب خود سائنس کے اسباب وسامان ہیں۔

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کچل دیتے ہیں آلات

لیکن یہ بھی ناانصافی ہوگی کہ ساری ذمہ داری اسباب وسامان پر ڈال دی جائے اور ان کو مصرف میں لانے والے انسان سے چشم پوشی کر لی جائے۔ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے آدمی خدا تک پہنچ سکتا لیکن بات وہی ہے کہ ان کے استعمال کا طریقہ کار بھی تعلیمات نبویہ سے معلوم ہو سکے گا۔ پھر ساری دنیا دین بن جائے گی ورنہ دین بھی دنیا ہو کر رہ جائے گا۔ جو بغیر روح محض ایک لاش ہے۔ جس کی کسی معاشرے میں کوئی قیمت نہیں چہ جائیکہ آخرت یا دربار خداوندی میں اس کی قیمت ہو؟ اور اس پر اجر وثواب کی اُمید رکھی جائے۔

حضرات اہل اللہ انہی تعلیمات کے حامل ہیں اور انہی تعلیمات کے ذریعہ الحمد للہ ایک زمانہ روشن ہے۔ آپ

کے ہاتھوں میں موجود کتاب ''خطبات حکیم الاسلام'' کی تیسری جلد ہے اور اس میں اس چشمۂ فیض کے مدیر و مہتمم کے خطبات و مواعظ جمع ہیں۔ جس ادارے کے نورِ علم سے پورا عالم جگمگا رہا ہے جہاں اہل اللہ بھی پیدا ہوتے ہیں اور مدرس و معلم بھی قومی راہنما اور مبلغ و مصلح بھی ان مواعظ و خطبات میں کہا کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لئے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

الحمدللہ ناظرین کرام پہلی دو جلدیں دیکھ چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اس جلد کو بھی شرف قبولیت بخش کر اس کے منافع کو عام و تام فرما دیں گے اور جہاں حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے لئے ذخیرۂ آخرت اور باعث اجر و ثواب ہوگی۔ وہاں خود قارئین کرام کے دینی فوائد بھی اس سے پورے ہوں گے۔ نیز خطباء دائمہ کے لیے یہ تحفۂ گراں مایہ ثابت ہوگی۔

اس جلد کے تمام مسودے پر گرامی قدر حضرت والد ماجد صاحب دامت برکاتہم نے بھی نہایت محنت و عرق ریندی سے نظر ڈالی اور پورا مسودہ بنظر عمیق دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس جلد میں خطبۂ طیبہ کے علاوہ جتنی تقاریر آئی ہیں، وہ سب ٹیپ ریکارڈ سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ خطبۂ طیبہ انڈیا کا مطبوعہ رسالہ ہے جس میں وہ اہم خطبۂ صدارت ہے جو حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے جامعہ عربیہ اشرفیہ نیا بھوجپور ضلع شاہ آباد آرہ و بہار، انڈیا، کے سترہویں جلسۂ سالانہ منعقدہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ صفر المظفر ۱۳۸۸ھ کو ارشاد فرمایا تھا برائے افادہ من وعن ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ سے سننے میں غلطی ہوسکتی ہے تصحیح میں غلطیاں رہ جاتی ہیں کوشش کی گئی ہے کہ کتاب میں کم از کم علمی غلطی نہ رہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر پڑے تو حضرات اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اسے حضرات حکیم الاسلام مدظلہٗ العالی کی ذات والا ستودہ صفات کی طرف منسوب نہ فرما دیں، بلکہ اسے مرتب کی نااہلیت پر محمول فرمایا جائے اور اس سے مطلع فرمایا جائے، بندہ اس پر شکر گزار اور ممنون ہوگا۔

اس کتاب کی تدوین میں اپنے ان قابل احترام بزرگوں کا ذکر خیر اور ان کا اظہار تشکر ضروری خیال کرتا ہوں، جنہوں نے مجھے تقاریر کی کیسٹز مہیا فرمائیں یعنی برادر محترم حضرت مولانا قاری سیف الدین صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہما ان حضرات کی بدولت کیسٹز میں محفوظ مواد کتابی شکل میں منظر عام پر آسکا، اللہ تعالیٰ ان ہر دو حضرات کو بہت بہت جزائے خیر نصیب فرمادے اور اپنے دربار عالی سے اپنی اور ان کی شایان شان اجر جزیل عطا فرمادے اور تادم آخر اپنی رضا کے ساتھ خدمت کلام اللہ کی توفیق نصیب فرمادے اور شرف قبولیت بخشے۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

بندۂ ناچیز محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد چہارم

اما بعد ......حضرات اہل اللہ کے خطبات ومقالات اوران کے سوانح وتذکرے دل کی دنیا کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ ہیں، دل سے دنیا کی محبت زائل ہوجائے اورحق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت ومحبت سے دل معمور ہوجائے، اس کے لئے اصل تو اہل اللہ کا فیض صحبت ہے جس علم وعمل میں رسوخ پیدا ہوتا ہے، علم کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے اور مقصود علم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، قولب کا زنگ دور ہوکر امراض باطنیہ کا احساس ہونا شروع ہوجاتا ہے اور یہی احساس ان کے ازالہ کا ذریعہ بن کر زینۂ ترقی ثابت ہوتا ہے۔ آج کے جدید دور نے صحبت ومعیت کی اہمیت کو حسی مثالوں سے اس طور پر نمایا کردیا ہے کہ اب اس کا انکار گویا واقعات کو جھٹلانا ہی نہیں بلکہ خود اپنی عقل وخرد کی ناکامی کا اعتراف بھی ہے، جیسے آم کو لیموں یا کسی اور پھل کی قلم لگادی جائے تو آم کی صورت گو دہی رہے جو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے اُسے روز اول سے ودیعت کی گئی ہے، تاہم اس کا ذوق باطن اور اندرونی مزہ دہ ہوگیا جو لیموں کے باطن کا تھا۔

اہل اللہ کے قلوب سے اپنے قلب کی پیوندکاری سے اھل اللہ کا ذوق وشوق اوران کی باطنی کیفیات دل میں منتقل ہونا شروع ہوجاتی ہیں اوراسی صحبت کے اثرات سے انسان کا قلب وقالب بدلتا چلا جاتا ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے: یا ایھا الذین امنوا تقو اللہ و کونوا مع الصادقین...... اہل ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے جو کہ مقصود ہے اور حصول مقصود کا آگے سہل راستہ ہے کہ: ''سچے لوگوں کے ساتھ ہوجاؤ'' گویا تقویٰ کے حصول کا ذریعہ صادقین کی معیت ہے۔

چونکہ قرآن حکیم ابدی کتاب ہے اس کے تمام اوامر ونواہی بھی ابدی ہیں، تو اہل صدق کی معیت اختیار کرنے کا حکم بھی ابدی اور دائمی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل صدق وصفا کا وجود مسعود ہمیشہ ہوگا، ورنہ حکم کے پورا کئے جانے کی کوئی صورت نہیں، الغرض اہل صدق ہمیشہ تھے اور ہمیشہ ہوں گے، ہاں اس جنس گرانمایہ کی قلت وکثرت ہوسکتی ہے اور اہل طلب کو ڈھونڈنے سے کیا کچھ نہیں مل سکتا؟

بہر حال صحبت صالحین کی اس قدر اہمیت ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا چھوٹے سے چھوٹا عمل پوری امت کے تمام اعمال پر اسی لئے بھاری ہے کہ وہ صحبت نبویؐ سے ایسے باطنی کمالات حاصل کر

چکے ہیں کہ جس کیفیت اور حسن استغراق سے وہ حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ قدس میں عجز و نیاز کا اظہار کر پاتے ہیں، وہ کسی ایسے شخص کے لئے ممکن ہی نہیں جس نے صحبت نبویؐ سے حصہ نہ پایا ہو، اسی کو تو کہا ہے کہ ''وہ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا'' اسی مسیحائی اعجاز کا ظہور تھا کہ دنیا کے جس خطے کی طرف ایک صحابیؓ بھی نکل گئے تو دنیا کی دنیا بدلتی چلی گئی، یہی قلب کی وہ دولت ہے جس کے سامنے دنیا کا کوئی فکر، فکر نہیں رہتا اور پوری دنیا کے بارے میں (متاع الدنیا قلیل) کی قلبی وحقیقی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور فقر میں شاہی کرنے والا انسان اپنی صفات میں ملکوت کو شرما دیتا ہے کہ

نے تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے — جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

دنیا کے جاہ وجلال سے حجاب غرور اُٹھ جاتا ہے اور مردار بکری کی دینار و درہم سے خرید کو معیوب سمجھنے والا انسان اپنی زندگی کے سرمایہ سے دنیا و مافیہا کی خرید پر آمادہ نہیں ہوتا کہ

نرخ بالاکن ، ہنوز ارزانی

صبر وتوکل، زھد وغناء ورع وتقویٰ کی وہ شمع قلب میں فروزاں ہو جاتی ہے کہ وہ زبان حال سے کہتا ہے:

من دلق خود بافرشاہاں نمی دھم — من فقر خود بملک سلیماں نمی دھم
از رنج فقر درد لے گنجے کہ یافتم — ایں رنج را براحت شاہاں نمی دھم

اسی خزانے کا مالک جذب وشوق اور قائیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے — ایک ڈھیر ہے یاں خاک کا اور آگ دبی ہے

حکیم الامت حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ ایک مقام پر فیض صحبت کی اسی تاثیر و اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

''صحبت اولیاء میں ایک خاص بات قلب میں ایسی پیدا ہو جاتی ہے جس سے خروج عن الاسلام کا احتمال نہیں رہتا، خواہ گناہ اور فسق و فجور سبھی کچھ اس سے وقوع میں آویں، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاوے، مردودیت تک کبھی نوبت نہیں پہنچتی، برخلاف اس کے ہزار برس کی عبادت میں بذاتہٖ یہ اثر نہیں کہ وہ کسی کو مردودیت سے محفوظ رکھ سکے، چنانچہ شیطان نے لاکھوں برس عبادت کی لیکن وہ اس کو مردودیت سے نہ روک سکی، یہی معنی ہیں اس شعر کے:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسی چیز جو مردودیت سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے ہزارہا سال کی اس عبادت سے بڑھ کر ہے جس میں یہ اثر نہ ہو۔'' نیز ایک اور مقام پر فیض صحبت اور اگر وہ میسر نہ ہو تو اس کے لئے بدل کیا ہو، اس کے بارے میں ارشاد ہے:

''کمال اسلام کے لئے ضرورت ہے علم اور ہمت کی اور تیسری چیز ایک اور ہے جس سے علم وہمت میں قوت پیدا ہوتی ہے وہ اہل اللہ کی صحبت ہے، یہ عجیب چیز ہے جس سے اس مردہ جسم میں روح پڑ جاتی ہے اسی کو کہا ہے کہ:

مقام امن دمے بےغش و رفیق شفیق ۔ گرت بدام میسر شود زہے توفیق

اگر ہمیشہ میسر نہ ہو تو گاہے گاہے سہی، جب بھی موقع ہو۔

ایک اور چیز اس کے قائم مقام بھی ہے کیونکہ جب مروارید میسر نہ ہو تو صدف سے ہی کام نکال لیا جاتا ہے اس کا بیان اس شعر میں ہے:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است صراحی مے ناب وسفینہ غزل است

یعنی بزرگوں کے تذکرے اور حالات جن میں برقی اثر ہے کہ کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو ان کو پڑھ کر ایک دفعہ تو مستعد ہو ہی جاتا ہے ان میں بھی صحبت کی سی برکت ہے، اگر صحبت میسر نہ ہو تو اسی کو اختیار کرو بہت کام دے گی۔

(الاسلام الحقیقی، ص:۹۲)

بہرحال ان مواعظ وخطبات سے ان شاء اللہ جہاں علمی نکات واسرار آپ کے سامنے آئیں گے وہاں روحانی رموز ودقائق بھی حل ہوں گے، اس دور صدف میں صحبت اہل اللہ کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے ان انوار وبرکات سے بھی حصہ وافر پائیں گے۔

دادیم تراز گنج مقصود نشان گرمانر سیدیم شاید تو برسی

بہرحال خطبات حکیم الاسلام کی چوتھی جلد اس وقت آپ کے زیر ملاحظہ ہے مختلف موضوعات پر مواعظ جمع ہیں، مضامین کے لحاظ سے ہر وعظ انفرادیت کا حامل اور اپنی نوعیت میں ندرت رکھتا ہے، آج سے ۴ سال قبل جو مواعظ طیبہ کی جمع وترتیب کا سلسلہ شروع کیا تھا اب چوتھی جلد کی شکل میں اس کا مجموعہ آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے۔

آغاز سفر میں ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ خطبات کا سلسلہ اتنا وسیع اور ان کا پھیلاؤ اس قدر ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی کم ہمتی کو دیکھوں تو بات اب بھی سمجھ سے بالاتر ہی نظر آتی ہے کہ آخر یہ کام کیسے سرانجام پایا؟ محسن اساتذۂ کرام اور مخلص احباب کرام کی دعائیں شامل حال رہیں تو یہ کام ہو سکا، اس لئے جو کچھ بھی آپکو نظر آرہا ہے اس کو ہرگز اس بندۂ عاجز کی محنت کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اپنی دعوات صالح کا ثمرہ خیال فرمادیں۔

اور اس کا اصل سبب تو حضرت العلام حکیم الاسلام مدظلہٗ العالی کا اخلاص وللھیت ہے جس کی قبولیت کا یہ مظہر ہے، حق تعالیٰ شانہٗ ہم سب کیلئے اس کا نافع بنائیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ کے ارشاد فرمودہ خطبات الحمدللہ ہر لحاظ سے جامع ہوتے ہیں، ایسے علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی خطبات ومواعظ پر عنوان قائم کرنا مجھ ایسے بے بضاعت کے لئے نہایت مشکل کام تھا مگر بفضلہ تعالیٰ سرانجام پایا۔ بایں ہمہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عنوانات قائم کرنے میں جس نزاکت اسلوب کو ملحوظ رکھنا چاہیے

تھا وہ ''ذوق ادب'' سے خالی ہونے کی بناء پر نہ رکھ سکا قارئین کرام کو خطبات کے علمی مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے جو خوش کن کیفیات حاصل ہونگی خدا نہ کرے کہ اس میں ترتیب عنوانات ان کے ذوق سلیم کے لئے بارگراں ثابت ہو۔اپنی سعی وکوشش کی حد تک حسن ترتیب کا خیال رکھا ہے مگر پھر بھی کمی کا رہ جانا امر لازم ہے:

فدایت دیدہ ودل رسم آرائش ازمن مپرس خراب ذوق گل چینی چہ داند باغبانیہا

اپنے احباب مخلصین حضرت الحاج مولانا القاری المقری سیف الدین صاحب مدظلہٗ مقیم مکہ مکرمہ اور حضرت الحاج مولانا قاری ومقری محمد رفیق صاحب مدظلہٗ مقیم جدہ (سعودی عرب) کا تہہ دل سے ممنون اور شکرگزار ہوں کہ انہوں نے خطبات کی تمام جلدوں کے لئے بھرپور مواد مہیا فرمایا۔اور اس طرح یہ عظیم علمی سرمایہ منظرعام پر آسکا،اپنے برادر عزیز قاری محمد قاسم عزیز سلمہ کا بھی شکرگزار ہوں کہ وہ بھی اس سلسلہ میں اپنی ذاتی مصروفیت کے باوجود تعاون فرماتے رہے حق تعالیٰ شانہٗ ان تمام حضرات کے درجات بلند فرمادیں اور ان کو بہت بہت اجر وصلہ نصیب فرمادیں۔اور ان خطبات ومواعظ کو شرف قبولیت نصیب فرمادیں۔امین ثم امین یارب العٰلمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰہ والتسلیم الف الف مرۃ۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہٗ

یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ / مطابق ۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ جلد پنجم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ واتباعہٖ اجمعین. اما بعد ......

خطبات حکیم الاسلام جلد پنجم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے، **اللھم لا احصی ثناء علیک کما اثبت علیٰ نفسک. اللھم لک الحمد کالذی تقول وخیرا مما نقول.** خطبات کی ترتیب کا جب آغاز ہوا تھا تو جلد اول کی ترتیب کے بعد اپنے محدود وسائل کے پیش نظر بندہ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اپنے اکابر واساتذہ کرام کی دعاؤں سے یہ سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا، اور اس کے ساتھ ساتھ اہل علم میں مقبولیت بھی بڑھتی گئی۔

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے اپنے بندوں میں مقبول بنایا، امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے فضل عظیم اور دریائے کرم کے صدقے اپنے جناب اقدس میں اسے قبول فرما کر آخرت کی نجات کا ذریعہ بنا دیں گے **وما ذٰلک علی اللہ بعزیز**

ہمارے سلسلۂ قرآن حکیم کے جد امجد حضرت اقدس عارف باللہ شیخ القراء مولانا قاری فتح محمد صاحب (مہاجر مدنی) قدس اللہ سرہٗ نے تو اس ناکارہ کی اس قدر حوصلہ افزائی وعزت فرمائی کہ حضرت والاؒ کی شفقتوں کے اظہار کے لئے بندہ کے پاس الفاظ نہیں جب کبھی بھی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، باہتمام دریافت فرماتے خطبات کی مزید جلد آئی، اور اتنا شغف رکھا کہ چاروں جلدیں اہتمام کے ساتھ اپنی مجالس میں سنیں، جلد چہارم کے بعد بھی دریافت فرمایا کہ اور جلد آئی، بندہ نے عرض کیا پہلے بھی آپ کی دعاؤں سے سب کچھ ہوا، آپ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے، انشاء اللہ آجائیگی، الحمدللہ حضرت اقدس کی دعاؤں سے پانچویں جلد تو آپ دیکھ رہے ہیں، مگر افسوس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا، اور میں جلد حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ حضرت رحمہ اللہ کو اپنے مدارج قرب میں بہت زیادہ ترقیات سے نوازے آمین!

بہرحال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں سے یہ کام جاری رہا اور انشاء اللہ ابھی جاری ہے اسی طرح اپنے عظیم محسن استاذ حضرت اقدس شیخ القراء قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں ایک بار حاضری ہوئی

فرمانے لگے۔ بھائی! میں تو آپ کو روزانہ یاد کرتا ہوں، آپ پتہ نہیں یاد کرتے ہو یا نہیں؟

آپ کے اس فرمان پر مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی بہت زیادہ ہوئی پھر ارشاد فرمایا: ''بھائی! وہ آپ کی ''خطبات حکیم الاسلام'' کی جلد میرے تکیے کے نیچے رکھی ہے جب رات کو (تدریس سے فارغ) ہوکر گھر جاتا ہوں تو اسے دیکھتا ہوں''۔

پھر فرمایا: ''بھائی! زندگی میں سب یاد کرتے ہیں اور محبت کا اظہار کرتے ہیں حقیقی محبت کا پتہ تو مرنے کے بعد چلتا ہے اس وقت کون یاد رکھتا ہے۔''

حضرت اقدسؒ کا اشارہ اس طرف (جو میں سمجھ سکا) چونکہ کتاب کا انتساب حضرت والا کی طرف تھا کہ اب تو آپ محبت کا اظہار کر رہے ہو مرنے کے بعد بھی یاد رکھنا، مراد حضرتؒ کی یہ تھی اس وقت آدمی کو دعاؤں میں یاد رکھا جائے، فراموش نہ کیا جائے، یہ حضرتؒ کی کمال تواضع تھی، ورنہ کجا بندۂ نابکار اور کجا میری دعاء، ان حضرات اکابر کے اس تذکرہ خیر و برکت سے خود خطبات اور مرتب خطبات سے جو انکی محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ خطبات کی اہمیت اور مرتب کے لئے نجات کی سند ہے، ایفائے عہد اور تعمیل حکم کے لئے خود بھی حضرت اقدسؒ کے ہے دعا گو ہوں اور تمام قارئین کرام سے بھی ملتجی ہوں۔

اسی طرح حضرت اقدس شیخ القراء قاری فتح محمد صاحبؒ اگرچہ وصال فرما گئے مگر اب بھی حضرت والا کا خط مبارک برائے حصول برکت اور ''دعوات فتحیہ'' کو اسی طرح جزو کتاب بنایا جارہا ہے جس طرح ان کی حیات مبارکہ میں تھا، اللہ تعالیٰ ان سب اکابر کو ہماری طرف سے بہت جزائے خیر نصیب فرمائے آمین!

بہر حال ان حضرات اکابر کی دعاؤں نے بہت کام دیا، علاوہ ازیں اور بہت سے اکابر اور خطبات کے قارئین کرام نے بہت دعاؤں سے نوازا، امر واقعہ یہ ہے کہ یہ اکابر کی دعاؤں اور قارئین خطبات کے دعاؤں کا ثمرہ ہے اور بس!

پانچویں جلد کی ترتیب کے سلسلہ میں جو مطبوعہ تقاریر حاصل ہوئیں وہ بھی شامل کی گئیں، لیکن بعض جگہ کچھ ناگزیر تبدیلی کرنی پڑی، بالخصوص بعض عنوان بدلنے پڑے اور ان کو خطبات کے اس طرز کے موافق کیا گیا جو قارئین کرام کے پہلی چار جلدوں کے مطالعہ کی وجہ سے ایک خاص ذوق بن گیا تھا با ایں ہمہ بندہ ادارہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک پشاور، اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مبلغ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت بہاولپور کا بھی تہہ دل سے بھی شکر گزار ہے کہ انہوں نے یہ تقریر بہم پہنچائی۔

اسی طرح اپنے برادر محترم جناب مولانا محمد رفیق صاحب انور نعمانی (مقیم مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفاً وکرامۃ) کا تہہ دل سے شکر گزار اور ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے پانچویں جلد کا خاصا مواد مہیا کیا اور پانچویں جلد میں ان کی طرف سے بہت ہی زیادہ معاونت ہوئی، اس تبلیغی سلسلہ میں جس پاکیزہ جذبے سے انہوں نے معاونت کی

ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور دارین میں اس کا بدلہ نصیب فرمائے آمین!

خطبات حکیم الاسلام کی پانچویں جلد کے منظر عام پر آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، ظاہری طور پر جہاں مواد کا نہ ملنا باعث تاخیر ہوا، وہاں یہ بھی سبب بنا کہ میری اہلیہ محترمہ کا بچے کی ولادت کے چند روز بعد انتقال ہو گیا اور ذہنی سکون جو ترتیب و تالیف کے کام کیلئے لازمہ ہے، نہ رہا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے، قارئین با تمکین سے ان کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اور یہ استدعاء بھی ہے کہ خطبات کی چھٹی جلد کی تکمیل کیلئے دعاؤں سے یاد فرمائیں، احسان وکرم ہوگا۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ

پیش لفظ جلد ششم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ الہ وصحبہ ومن تبعھم باحسان الیٰ یوم الدین. امابعدُ...... حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل وکرم اوران کی بے پایاں عنایات سے خطبات حکیم الاسلام کی جلد ششم حاضر خدمت ہے۔الحمدللہ پہلی پانچ جلدوں کومقبولیت حاصل ہوئی، منظرعام پرآنے کے بعد مسلسل اشاعت ہورہی ہے،اورمتعدد ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے،قارئین خطبات کی اسی دلچسپی کے باعث بندہ کا بھی حوصلہ بڑھتا رہا،اورالحمدللہ یہ سلسلہ چل رہا ہے،جلد ششم بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

حضرت اقدس حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہٗ کی نابغۂ روزگار شخصیت کواللہ تبارک وتعالیٰ نے ایجاد کلام اورحسن بیان کی خوبیوں سے بہت نوازا ہے۔اوران کے بحرآفرین خطبات کوسننے والے بلا مبالغہ لاکھوں انسان آج بھی موجود ہیں بیان کی خوبی حقیقت یہ ہے کہ دیدنی ہے نہ کہ شنیدنی،جس کاتعلق بطورخاص کیفیت بیان سے ہے۔اس لئے وہ کاغذ وقلم کی دسترس سے باہر ہےاوراس کامصداق ہے۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید ۔۔۔ لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ اپنے ذوق تقریر کے بارے میں خود ہی رقمطراز ہیں:

تحریر وتقریر میں مجھے دلچسپی لڑکپن سے ہی تھی۔اسے بڑھانے اورترقی دینے نیز اس لائن پرسفرکرانے میں میرے اکابر پیش پیش رہتے تھے،میری طالب علمی کےدور میں حضرتالاستاذ علامہ محمد انورشاہ کشمیریؒ جومجھے اپنے ساتھ پنجاب کےایک تبلیغی دورہ میں لے گئے،بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے اجتماعات میں میری تقریریں کرائیں،یہ واقعہ کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کا ہے،لیکن مجھےاچھی طرح یاد ہے کہ ملتان کےایک جلسہ میں میں اس طرح شریک ہواکہ بارش میں کپڑے بھیگ چکے تھےاورمیں نے ستر پوشی کے لئے ایک بڑا ساکمبل اپنے بدن پر لپیٹ رکھاتھا،نہ سرپرٹوپی تھی اورنہ پیر میں جوتا،اسی ہیئت سےاس میں اس بڑے اجتماع کےسامنے آ گیا۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے مجمع کوخطابت کرتے ہوتے میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ:''یہ فقیر صاحب جو آپ کےسامنے کھڑے ہیں مستقبل کےایک بہت بڑے مقرر ہیں،ہرگز یہ خیال نہ کیجئے کہ فقیروں کی طرح کمبل پوش ہیں توان کے پاس کچھ نہیں بلکہ یہ سمجھے کہ اس گدڑی میں لعل بھی مخفی ہے۔''

یہ حضرت استاذ مرحوم کی حوصلہ افزائی تھی،ورنہ کہاں ایک معمولی ساطلب علم اورکہاں لعل ویاقوت ایسی اکابر

تو میرے مربی تھے۔

۱۹۴۹ء کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ملک کے تعلیمی مسائل پر لکھنؤ میں ایک کانفرنس طلب کی، اس میں احقر کو بھی تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا آزادؒ نے میری تقریر کی جو تحسین فرمائی وہ الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ غرض میری زندگی کا ایک بڑا حصہ تینوں براعظموں کے طویل سفروں میں گذرا ہے اور حق تعالیٰ نے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائی، برما، حجاز، افغانستان، عدن، جرمنی، جنوبی افریقہ، لیبیا، روڈیشیا، مدغاسکر، حبشہ، زنجبار، سری لنکا، ایسٹ افریقہ، رے یونین، کویت، لبنان، اردن، فرانس، اور انگلستان اور بہت سے ممالک میں مجھے بار بار آنے جانے اور وہاں مذہبی اور علمی سوسائٹیوں میں شرکت کا موقع ملا ہے، میں جہاں تک حق تعالیٰ کے اس فضل وکرم پر ہزاروں ہزار شکریہ ادا کرتا ہوں اور عہدہ برآ نہیں ہوسکتا کہ ان لاکھوں بندوں تک مجھے اسلام، ایمان انسانیت اور دیوبند کے مسلک کے تحت اخوت درو داری کا پیغام پہنچانے کی توفیق عطا ہوئی وہیں اس اعتراف پر بھی مجبور ہوں کہ اپنے اساتذہ اور مربیوں کی نظیر شاذ ونادر ہی کہیں دیکھنے میں آئی، جن سے میری علمی اور اخلاقی تربیت کا تعلق رہا ہے۔''

جس طرح آپ نکات ومعارف اور لطائف وحقائق کو بزبان اردو بلا تکلف بیان فرماتے ہیں اور گھنٹوں کے بیان میں بھی کچھ تامل نہیں ہوتا، تسلسل اور حلم ووقار کے ساتھ گو''مرقوم مقالہ'' پڑھتے چلے جارہے ہیں، اسی طرح آپ کو عربی اور فارسی میں تقریر وبیان پر بھی کامل دسترس حاصل تھی، چنانچہ عرب ممالک اور افغانستان میں آپ بزبان عربی وفارسی بلا تکلف فصیح وبلیغ تقاریر فرماتے رہے، اور علم وعرفان کی بارش برساتے رہے، جس کا آپ ان مشاہدات وتاثرات سے بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں، جو آپ کی گوناگوں فضائل ومناقب کی حامل تاریخی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تذکرہ نگار اور اہل قلم حضرات نے صفحات تاریخ میں رقم کئے ہیں۔

''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کے مرتب: محترم جناب سید محبوب رضوی صاحب آپ کے انداز خطابت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: علمی سلسلے میں درس وتدریس کے علاوہ فن خطابت اور تقریر میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل تھی، اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق کے ساتھ سنی جاتی تھیں، اہم سے اہم مسائل پر بھی دو، دو تین، تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے سے آپ کو کوئی رکاوٹ اور تکلف نہیں ہوتا تھا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں آپ اپنے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص طور پر مقبول ہیں، اور بعض معرکۃ الآراء تقریریں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع بھی ہوچکی ہیں، ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہنچی ہو، ان کی رواں رواں اور دلکش تقریر جب علم کے گہرے سمندر سے گذرتی تھی تو لہروں کا سکوت قابل دید ہوتا تھا۔

جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاسوں میں آپ کے خطبات صدارت بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے

تھے آپ کی علمی تقریروں سے ایک خاص حلقہ اثر پیدا ہوا۔ بیرون ہند میں بھی آپ کی خطابت کے اثرات وہاں کے علمی حلقوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔

۱۳۵۳ھ میں بسلسلہ سفر حجاز آپ نے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کے صدر کی **حیثیت سے سلطان** ابن سعود کے دربار میں جو تقریر فرمائی اس نے سلطان کو بہت متاثر کیا، سلطان ابن سعود نے شاہی **خلعت** اور بیش بہا قیمت کتب کے عطیہ سے اعزاز بخشا۔

دوسرے بیرونی ممالک میں افغانستان، برما، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، عدن، کویت، حجاز، حبش، مصر، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ ممالک کا دورہ فرما چکے تھے، جہاں اپنی اردو، عربی، اور فارسی کا لوہا منوایا۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم ناظم جمعیت علماء ہند کا آپ کے بارے میں مشہور مقولہ ہے کہ اب تک مہتممین دارالعلوم دیوبند ثوابت تھے اور مولانا قاری محمد طیب صاحب سیارہ ہیں۔

آپ کو ہر جگہ سپاسنامے دے گئے، اور لوگوں کو دارالعلوم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے مسلک کی اشاعت ہوئی، دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی تھی وہ تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ تھی، ان کمالات کی وجہ سے ملک و بیرون ملک میں آپ کو ایک خاص امتیازی مقام حاصل تھا، عام تبلیغی دوروں کے علاوہ جب دیوبند میں قیام ہوتا تو عصر سے مغرب تک عمومی مجلس کا معمول رہتا تھا جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے اور تبلیغ و اصلاح ہوتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی سفر و حضرت میں جاری رہتا تھا، آپ کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع ہے، جو ہند اور بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۳۳۶ھ سے ہر جمعہ کو جامع مسجد دیوبند میں تقریر کا معمول تھا، جو تقریباً بیس بائیس برس تک جاری رہا، بعد میں کثرت اسفار کی وجہ سے متروک ہو گیا اور تقریریں ملک گیر ہو گئیں۔

۱۳۵۳ھ میں جب کہ شاہ ابن سعود مرحوم پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ بال بال بچ گئے، ہندوستان کے وفد نے فضلاء و عمائدین کی طرف سے مبارک باد کا جلسہ فندق مکہ میں منعقد کیا گیا جس کا صدر مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بنایا گیا تھا علماء ہندوستان کے وفد نے شاہ ابن سعود کو مبارک باد پیش کی اس موقع پر آپ نے ہی عربی کی مختصر تقریر کے بعد جلسہ تبریک کی تجویز پڑھ کر سنائی تھی۔

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ بمبئی نے جس میں تمام فرقوں کے علماء اور تمام مؤثر تنظیموں کے سربراہ شریک تھے، آپ کو اپنا صدر منتخب کیا اس سلسلے میں دو مرتبہ وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے آپ کو دعوت دے کر بلایا اور پرسنل لاء کے موضوع پر گفتگو کی، بہر حال ملک و قوم میں آپ کا ایک خاص علمی وقار قائم تھا، کئی اکیڈیمیاں آپ کی تالیفات کی طباعت و اشاعت کا کام انجام دے رہی ہیں۔

مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں متعدد مرتبہ شریک ہو چکے تھے اور پوری دنیا میں تبلیغی دورے فرما چکے تھے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند)

ماہنامہ بینات کراچی کے مدیر حضرت اقدس مولانا محمد یوسف صاحب زید مجدہم، حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات خطابت کو تحریر فرماتے ہیں، جس میں انہوں نے خصوصیت سے خطبات حکیم الاسلام کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان و بیان کا خاص انداز اور افہام و تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلاتکلف خطاب فرماتے تھے، زبان ایسی صاف اور شستہ اور جملے ایسے نپے تلے کہ گویا سامنے کتاب رکھی اور اس کی عبارت پڑھ کر سنا رہے ہیں، حقائق و واقعات کی ایسی منظر کشی فرماتے تھے گویا واقعہ متمثل ہو کر سامعین کے سامنے کھڑا ہے، شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز و لطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم و معرفت وہبیہ کا طوفان آمڈ آیا ہے۔

حضرت قاری صاحب مرحوم نے اپنے ساٹھ پینسٹھ سالہ علمی دور میں خدا جانے ہزاروں مرتبہ خطاب فرمایا ہوگا، اور بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ انہیں تقریر و خطابت کی نوبت بھی آئی، لیکن ان کی ہر تقریر کا ہر موضوع منفرد ہوتا تھا، اور جس موضوع کو بھی چھیڑتے اس میں لطائف و اسرار کے ایسے گل و لالہ بکھیرتے کہ حقائق و معارف کے چمنستان میں نئی بہار آجاتی، ان کے علوم اکتسابی سے زیادہ وہبی تھے مشکل سے مشکل مسائل کو بلاتکلف سامعین کے ذہن میں انڈیل دینا اور بات بات میں نکتہ پیدا کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

ایک موقعہ پر یہ مضمون ارشاد فرما رہے تھے کہ مطالب و معانی کو صرف الفاظ سے ہی نہیں ادا کیا جاتا، بلکہ لب ولہجہ اور انداز تکلم سے بھی الفاظ میں معنیٰ بھرے جاتے ہیں، اور اس کی مثال میں اردو کا ایک فقرہ ''کیا بات ہے؟'' پیش کیا کہ یہ انکار کیلئے بھی اور اقرار کے لئے بھی، استفہام کے لئے بھی ہے اور اخبار کے لئے بھی، داد و تحسین کے لئے بھی ہے اور زجر و توبیخ کے لئے بھی۔

الغرض مسلسل ایک گھنٹہ تک ''کیا بات ہے'' کی تشریح ہوتی رہی ارو حضرت مرحوم اس کے ہر مفہوم کو لب ولہجہ کی تبدیلی سے سمجھاتے رہے اور مجمع سحر بیان سے عش عش کر رہا تھا۔

حضرت مرحوم کی بعض تقریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں، حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ خطیب مسجد غفوریہ حسن پروانہ کالونی ملتان نے حضرت کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطبات حکیم الاسلام'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں اور اگر یہ محنت و جستجو جاری رہی اور حضرت جتنی تقریریں محفوظ کر لی گئی ہیں وہ سب شائع کر دی گئیں، تو امت کے لئے حقائق و معارف اور ''کلمات طیبات'' کا ایک عظیم ذخیرا فراہم ہو جائے گا۔ بہر حال حضرت قاری صاحبؒ کی عبقری شخصیت گوناگوں فضائل شیخ طریقت، بے

بدل خطیب، صاحب طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادرالکلام شاعر، کامیاب مدرس اور شگفتہ قلم مصنف تھے، حکمت قاسمی کے شارح اور روایات سلفؒ کے امین تھے قدرت فیاض نے حسن و جمال اور فضل و کمال کے ساتھ ساتھ عقل و دانش، فہم و فراست، حلم و وقار، حسن تدبیر اور نظم و نسق کی بے پناہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو خطابت کا خاص ذوق، زبان و بیان کا خاص انداز اور افہام و تفہیم کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں بلا تکلف بولتے تھے اور خطاب فرماتے تھے، شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے، شریعت کے اسرار و حکم اور طریقت و حقیقت کے رموز ولطائف اس طرح بیان فرماتے تھے گویا دریائے علم و معرفت کا بند ٹوٹ گیا ہے اور علوم وہبیہ کا طوفان امڈ آیا ہے۔

نیز بندہ کے نام ایک مکتوب گرامی میں بھی تحریر فرمایا: محمد یوسف لدھیانوی (ماہنامہ بینات نیوٹاؤن کراچی)

عزیز مکرم جناب مولانا قاری محمد ادریس صاحب سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ..... پرسوں آپ کی کتاب ''خطبات حکیم الاسلام'' محمد سعید سلمہٗ نے دی، اس کا ابتدائیہ پڑھا اور جستہ جستہ مقامات سے اصل کتاب بھی پڑھی، حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور توفیق مزید سے نوازیں، آپ نے بہت مفید کام کیا ہے اور بڑی محنت سے کیا ہے، یہ ان شاء اللہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا، دعوات صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام: محمد یوسف ۷/۴/۱۴۰۱ھ

ماہنامہ البلاغ کے مدیر اور سپریم کورٹ کے جج حضرت مولانا محمد تقی عثمانیؒ صاحب زید مجدہم (استاذ حدیث دارالعلوم کراچی) حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے انداز خطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو وعظ و خطابت کا ایک ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں حضرت قاری صاحب کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش وخروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پرتکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر موٴثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محفوظ اور مستفید ہوتے تھے مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے، جوش وخروش نام کو نہ تھا لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب و دماغ کو نہال کر دیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا، جو انسان کو زیر وزبر کرنے کی بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا، حضرت قاری صاحب نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی

اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے۔

بہر حال برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے۔

عالی جناب پروفیسر احمد سعید صاحب تھانویؒ ایم اے، آپ کے حسن خطابت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام اور درس وتدریس کے علاوہ تبلیغی واصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں، جو نا قابل فراموش ہیں، آپ کو فن خطابت اور تقریر میں ید طولیٰ اور خداداد ملکہ اور قوت گویائی حاصل تھی، اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھیں اہم سے اہم اسلامی مسائل پر دو دو تین تین گھنٹے مسلسل اور بے تکلف تقریر کرنے اور ٹھوس علمی مواد پیش کرنے میں آپ کو کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، حقائق واسرار شریعت کھولنا اور تخلیق وایجاد مضامین آپ کا خاص حصہ تھا، جسے آپ کے اکابر واساتذہ بھی تسلیم کرتے تھے، تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص تسلی حاصل کرتا تھا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آپ کی تقریریں خصوصی طور پر مقبول ہوئیں، آپ کی معرکۃ الآراء تقریریں خود یونیورسٹی نے شائع کی ہیں، جیسے ''سائنس اور اسلام'' ملک کے علمی طبقوں میں آپ کو مدعو کیا جاتا تھا، اور ملک کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس میں آپ کی گونج نہ پہنچی ہو۔

بمبئی وغیرہ جیسے اہم شہروں میں آپ کی علمی تقریروں سے دارالعلوم کا ایک خاص حلقہ پیدا ہوگیا، ان علمی واصلاحی تقریروں کا وودبینکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ چکا تھا، بیرون ہند میں بھی آپ کی خطابت کے کافی اثرات اونچے حلقوں میں پہنچ چکے تھے۔

۱۳۵۳ھ میں بسلسلۂ سفر حجاز جب کہ آپ دوسرے حج کے لئے روانہ ہوئے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کی حیثیت سے سلطان ابن سعود کے دربار میں باریاب ہوئے، اور آپ کی تقریر عربی میں ہوئی، سلطان نے جواباً شکریہ کی تقریر کی، اور بوقت رخصت شاہی خلعت اور بیش قیمت کتب دینیات سے اعزاز بخشا، اسی سفر میں مدینہ منورہ کے المدرسۃ الشرعیہ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر بھی آپ کی عربی تقریر قابل ذکر ہے، جو مختلف عربی ممالک کے مجمع میں ہوئی اور بہت پسند کی گئی تھی۔

۱۳۷۸ھ میں آپ کا سفر افغانستان علمی خدمات کی ایک مستقل تاریخ ہے، آپ نے دارالعلوم دیوبند کے نمائندہ کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند اور حکومت افغانستان کے درمیان علمی وعرفانی روابط قائم کرنے کے لئے یہ سفر اختیار فرمایا اور حکومت افغانستان کے مہمان ہوئے، وہاں کے علمی حلقوں نے آپ کا خیر مقدم کیا کابل کی انجمن

ادبی اعلیٰ سرکاری سوسائٹی جمعیت علماء افغانستان، مجلس قانون ساز وغیرہ اداروں نے آپ کو تقریر کے لئے مدعو کیا۔ آپ نے فارسی زبان میں برجستہ تقریریں کیں، جس سے تمام حلقے متاثر ہوئے، اسی طرح بیرونی ممالک میں برما، کینیا، جنوبی افریقہ، زنجبار، روڈیشیا، ری یونین، مدغاسکر، حبشہ، مصر، شام، اردن، عراق، ایران، پاکستان وغیرہ میں آپ کی علمی تقریروں نے عوام وخواص کو بے حد متاثر کیا، عام تعلیمی خدمات کے سلسلے میں حکومت افغانستان کی خواہش پر آپ نے کابل کی تمام یونیورسٹیوں کا معائنہ فرمایا اور ان کے بارے میں اپنی تفصیلی رائے پیش کی، جسے حکومت نے استحسان کی نگاہ سے دیکھا۔

۱۳۵۹ھ میں والی ریاست قلات، بلوچستان اور ریاست بہاولپور پنجاب کے وزیر تعلیم نے آپ کو نصاب تعلیم تیار کرنے کے لئے مدعو فرمایا۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ مدرسہ بورڈ آسام، پنجاب یونیورسٹی الٰہ آباد یونیورسٹی اور جامعہ نظامیہ حیدرآباد نے آپ کو دینیات کے پرچوں کا ممتحن قرار دیا۔

غرضیکہ آپ پوری دنیا کے بہترین خطیب اور بین الاقوامی طور پر ایک عظیم اسکالر تسلیم کئے جاتے تھے، اور ہندوستان و پاکستان کے ہر خطہ میں پہنچ کر آپ نے تقریر وخطابت کے ذریعے اسلامی مقاصد کی اشاعت اور مسلک دارالعلوم دیوبند کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا، پاکستان میں متعدد بار تشریف لائے اور جامعہ اشرفیہ لاہور، خیر المدارس ملتان، دارالعلوم کراچی، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار جامعہ رشیدیہ ساہیوال، اور راولپنڈی و پشاور کے دینی مدارس میں اپنی علمی تقاریر سے لاکھوں افراد کو منور کیا، اور ہزاروں کی اصلاح فرمائی، مغربی ممالک میں ہزاروں افراد کو مشرف بہ اسلام کیا، اور آج دنیا بھر میں لاکھوں عقیدت مند پھیلے ہوئے ہیں۔

گرامی قدر حضرت محترم مولانا پروفیسر محمد اشرف خان صاحب زید مجدہم فرماتے ہیں کہ: ان کا دعوت دارشاد کا میدان بھی آفاقی تھا، اور طرز اصلاح وتربیت اشرفی، مواعظ وخطبات کا انداز البیلا، اچھوتا، دلکش اور ہر طبقہ کے لئے دل آویزی وتاثیر، قاسمی حکمت کی گہرائی اور ان کے اپنے اخلاق کی شیرینی ونرمی، پائی جاتی ہے، زبان خلق نے انہیں ”حکیم الاسلام“ کے نام سے پکارا اور حق یہ ہے کہ ان کی تصنیفات اور مواعظ وخطبات نے اس خطاب کی توثیق کردی۔ ماہنامہ البیان پشاور (ذی قعدہ ۱۴۰۳ھ)

حضرت اقدس مولانا تاج محمود صاحب مرحوم (فیصل آباد) فرماتے ہیں: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے پوتے، ایک جید عالم دین، بلند مرتبہ فقیہ، بے شمار کتابوں کے مصنف، قادر الکلام خطیب اور ملت اسلامیہ کے ممتاز حکیم وفلسفی تھے، نصف صدی سے زائد تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اعلیٰ رہے اور اس دوران انہوں نے دنیا کی اس مشہور علمی اور دینی درس گاہ کو چار چاند لگادئے، حضرت قاری صاحبؒ بے شمار خوبیوں اور اوصاف کا مجموعہ تھے، لیکن حق تعالیٰ نے انہیں زبان وبیان پر جو

ندرت اور قدرت عطا کر رکھی تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے، وہ جب بھی کسی موضوع پر تقریر کرنے بیٹھتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے دل ودماغ کا کنکشن عالم بالا میں کہیں جڑ گیا ہے، وہ بولتے کیا تھے موتی رولتے تھے اور ان کا بیان سن کر بے ساختہ زبان سے نکلتا تھا کہ ''لفظ لفظ ٹپکتا ہے عرش سے'' آپ نے بڑے بڑے جلسوں اور اجتماعات میں اپنی بے مثال حکیمانہ تقریریں کیں اور اس مقصد کے لئے پاکستان اور بھارت کے چپے چپے پر سفر کرتے رہے، بلکہ پوری دنیائے اسلام نے ان کے قدموں کا یمن اور ان کی میزبانی کا مجد حاصل کیا۔ آپ کی تقاریر، مواعظ ایسے سلجھے ہوئے ہوتے کہ آپ بے ڈھب جذبات کا شکار ہوئے بغیر روانی اور تسلسل سے بولتے جاتے تھے، موضوع کی مناسبت سے مسلسل عجیب وغریب مثالیں، حکایات، واقعات قرآن وحدیث اور عقلی ونقلی دلائل پیش کرتے جیسے کہ مقالہ وغیرہ پڑھ رہے ہوں۔

آپ کی ہر بات سامعین کے ذہنوں میں اترتی جاتی اور قلب ودماغ میں بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تقریر فرما رہے تھے جس میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی پہنچ گئے، شاہ صاحب کچھ دیر تو خاموش بیٹھے رہے اور یہ عظیم الشان خطاب سنتے رہے، مگر پھر یک دم وجد کی سی حالت طاری ہوگئی، بے اختیار نعرۂ تکبیر بلند کیا، اور چند منٹوں کی اجازت لے کر مائیکروفون پر آ کھڑے ہوئے، اور اپنے دو شعر حضرت قاری صاحب کی نذر کرتے ہوئے قاری صاحب کی طرف ہاتھ کے اشارے سے بار بار ان اشعار کو پڑھتے رہے۔

یہ تھا قاری صاحب کی تقریر کا اثر، کہ امیر شریعت جیسا بے مثال خطیب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ الغرض حضرت قاری صاحب مرحوم فن خطابت کے شہنشاہ تھے اور آخر دم تک اپنے فن خطابت سے دنیائے اسلام کو محظوظ فرماتے رہے، ساری عمر تبلیغ دین کی خدمت میں مصروف رہے، اس کے ساتھ ساتھ دار العلوم دیوبند جیسے عظیم ادارے کے مہتمم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، سچ یہ ہے کہ اب حضرت قاری صاحبؒ جیسا مہتمم دار العلوم کو ملنا مشکل ہے۔ (لولاک فیصل آباد)

حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب رشیدی نور اللہ مرقدہٗ حضرت حکیم الاسلامؒ کے حسن بیان کو داد دیتے ہوتے لکھتے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ تقریر کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نسیم صبحگاہی محوِ خرام ناز ہو، وہ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ان کے انداز تکلم میں جوئے آب رواں کی نغمگی تھی جو فردوس گوش بن جاتی تھی، ان کے لب ولہجہ میں حدی خوانوں کا سوز اور ان کی گفتگو میں نو دمیدہ غنچوں کی مہک تھی، جو دماغوں کو معطر کرتی اور دلوں کی دنیا میں ہلچل برپا کر دیتی، وہ ہماری عظمت رفتہ کی حسین وجمیل یادگار تھے۔ (الرشید ساہیوال)

علاوہ ازیں اور متعدد مواقع ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر و بیان کا موقع دیا، اور اہل علم آپ کے

ندرت بیان اور جودت فکر پر داد وتحسین دیتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جو اپنے وقت میں تحریر وتقریر کے لحاظ سے یکتائے زمانہ اور نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، کی زیر صدارت سرکاری عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب وتدوین کے سلسلہ میں کونسل ہال لکھنؤ میں کانفرنس کا اہتمام کیا گیا، حضرات علماء دیوبند بھی اس میں شریک ہوئے، جن کی قیادت حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ فرما رہے تھے

اس موقع پر آپ نے بیان فرمایا: مولانا آزاد مرحوم جیسے عظیم خطیب بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کا بیان سن کر جھوم اٹھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کا وہ بیان آج بھی تاریخ خطابت کا زرین باب اور انمول شاہکار ہے۔

تعلیم جدید سے متاثر طبقہ آپ کے علم وحکمت سے بھرپور بیان کو بڑی وقعت واہمیت کے لحاظ سے ''سماع قبول'' کے طور پر سنتا، اور اس طرح آپ کے حکیمانہ بیانات سے ان میں اسلام سے لگاؤ اور محبت وگرویدگی بڑھتی۔ علی گڑھ یونیورسٹی جو ہندوستان میں علم جدید کا مرکز اور منبع ہے، اور دارالعلوم دیوبند سے اس کو نظریاتی تقابل بھی رہا اس میں آپ نے بعض انتہائی بلند اور وقیع عنوانات پر تقاریر کیں، آپ کے بیان اور اسلوب بیان سے بڑے بڑے پروفیسرز انگشت بدنداں رہ گئے، اور ان میں یہ احساس اجاگر ہوا کہ حقیقی علم کیا ہے، اور جسے ہم نے علم کا نام دے رکھا اس کی حقیقت کیا ہے۔

اعتراف حقیقت کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بعض تقاریر کو شائع چنانچہ جلد ششم میں بھی آپ کی ایک تقریر کو جو ''سائنس اور اسلام'' کے نام سے موسوم ہے، شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔

مزید بھی ایسی تقاریر کی جستجو اور تلاش جاری ہے جو اپنے مواقع بیان کے لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل تھیں تاکہ انہیں خطبات حکیم الاسلام کی سلسلہ وار جلدوں میں ترتیب دیا جاسکے، اور دنیائے علم اس سے بھرپور استفادہ کرسکے۔ (وھو المستعان)

مارچ ۱۹۷۶ء میں حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا امتیاز خطابت یہاں بھی قائم رہا اس کے بارے میں ''ذکر طیب'' میں (سوانح حیات حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ صاحب بخاری) نے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی رپورٹ کے حوالے سے لکھا ہے۔

مارچ ۱۹۷۶ء میں حکومت پاکستان کی دعوت پر پھر پاکستان تشریف لائے، حکومت پاکستان نے ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے انعقاد کا پروگرام بنایا تھا، اور اس میں دنیائے اسلام کی نامور علمی شخصیتوں کو دعوت دی گئی تھی، ہندوستان سے اس پروگرام میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی پاکستان تشریف لائے، پاسپورٹ وغیرہ کے مراحل میں تاخیر کی وجہ سے حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ وزیر اعظم

پاکستان کی طرف سے دے گئے استقبالیہ اور سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس ہی میں شریک ہوسکے، جب کہ کانفرنس کا افتتاح حضرت حکیم الاسلام ہی کے عظیم الشان خطاب سے ہونا تھا حضرت حکیم الاسلام نے سیرت کانفرنس کے اختتامی اجلاس سے خطاب فرمایا اور آپ نے اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا۔

پاکستان نے جو یہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد کی ہے میں پاکستان کو توجہ دلاتا ہوں کہ اس بین الملکی کانفرنس کے پیش نظر اتحاد باہمی کے جو مبارک اور خوش آئند اثرات ونتائج ہیں، ان میں اس بات کو ضرور ملحوظ رکھا جائے کہ پڑوسی ممالک کا زیادہ حق ہے کہ ان کو اتحاد کے جذبہ سے پاکستان زیادہ سے زیادہ اپنے سے قریب کرے، اوران پڑوسی ممالک میں اس کا سب سے زیادہ حقدار ہندوستان ہے۔

حضرت نے اپنی تقریر کے دوران یہ بھی ارشاد فرمایا کہ پاکستان نے عالمی اتحاد کے سلسلہ میں دوعظیم الشان اقدامات کئے ہیں، ایک سربراہ کانفرنس اور دوسری سیرت کانگریس جو عالمی اتحاد کا موجب ہوگی۔

۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو کراچی میں منعقد کئے گئے سیرت کانگریس کے استقبالیہ میں جو شہر کراچی کی طرف سے دیا گیا تھا، انتظام کرنے والی سیرت کمیٹی نے حضرت حکیم الاسلام سے درخواست کی کہ وہ مہمانوں کا شکریہ ادا کریں۔ حضرت نے کلمات ترحیب وتشکر پیش کرتے ہوئے یہ دلچسپ بات ارشاد فرمائی کہ اس کانگریس کے مہمان خصوصی عرب ممالک کی مؤقر شخصیتیں ہیں، جن کی مہمانی کا شرف عجمیوں کو حاصل ہے، اور عجم ہونے کے رشتہ سے پاکستان اور ہندوستان دونوں برابر ہیں، اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت میں مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک میزبان کی حیثیت سے ہندو پاکستان دونوں کی طرف سے خیر مقدم کرتا ہوں اور عرب مہمانوں کے لئے سپاس گذار ہوں۔

سیرت کانگرس کے اختتامی اجلاس میں سیرت کمیٹی کی طرف سے حکیم الاسلام کو چاندی کے منقش خول میں جو ایک مخملی بکس کے اندر تھا ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا، جس میں دارالعلوم دیوبند کی اور حضرت کی دینی، علمی اور اصلاحی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ یوں تو تمام پاکستان ہی مہمانوں کا شکر گذار ہے، لیکن اہل پاکستان کو سب سے زیادہ دو شخصیتوں نے متاثر کیا ہے ایک حرم مکہ کے امام شیخ عبداللہ بن السبیل اور دوسرے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب شیخ الجامعہ دارالعلوم دیوبند۔

جب حضرت اقدس اس اختتامی اجلاس سے باہر تشریف لانے لگے تو عوام کے زبردست ہجوم نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چونکہ عوام حضرت حکیم الاسلام کی تقریر سننے آئے تھے، جس سے اب تک محروم رہے ہیں، اس لئے ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتے جب تک اس جلسہ میں حضرت ممدوح کی کوئی مفصل تقریر نہ ہو۔

چنانچہ قاری زاہر قاسمی صاحب نے لوگوں کو اطمینان دلایا اور جلسہ دوبارہ جمایا گیا اور ساٹھ ستر ہزار افراد کے ایک زبردست اجتماع میں حضرت کی تقریر ہوئی، جو ایک تاریخی اہمیت کی تقریر تھی۔

خطبات کی تین جلدیں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں ہی طبع ہو چکی تھیں، تاہم صرف اول، دوم جامعہ خیر المدارس ملتان کے مہتمم برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب زید مجدہم کی وساطت سے ہندوستان حضرت والا کی خدمت میں پہنچائی جاسکیں، انہوں نے میری طرف سے عرض کیا کہ ان خطبات کے بارے میں کچھ تحریر فرما دیجئے۔

ارشاد فرمایا: میں اپنی ہی تقریروں کے بارے میں خود ہی کیا لکھوں؟

تاہم بعد میں حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کی نیابت اہتمام کی ذمہ داری ادا کر رہے تھے، سے خط لکھوا کر بھیجا، اس کا فوٹو شامل کتاب کیا جا رہا ہے، اس خط میں خصوصیت سے ''مقصد خطبات'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مکرمی جناب مولانا محمد ادریس صاحب زیدرت افضالکم!

سلام مسنون...... جناب کا گرامی نامہ اور احقر کی تقریروں کی دو جلدیں موصول ہوئیں مشاء اللہ آپ نے جس ضرورت سے ان کو شائع کیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح و درست ہے، کہ خود حضرت حکیم الاسلام مدظلہ کا مزاج اختلافی امور میں الجھنا نہیں بلکہ اتفاقی امور پر امت کو جمع کرنا ہے۔

حضرت والا جلدوں کی ترسیل کے لئے شکریہ ادا فرماتے ہیں اور دعاء گو ہیں کہ حق تعالیٰ ان تقریروں کو صاحب تقریر، مخاطبین، سامعین اور قارئین سب کیلئے نفع بخش بنائے، جزاکم اللہ، اس وقت حضرت والا سفر میں تشریف لے گئے ہیں، بطور رسید یہ عریضہ بیرنگ ارسال ہے کہ اس وقت ترسیل جواب کی یہ ہی ایک صورت سامنے ہے۔

امید ہے کہ مع الخیر ہوں گے۔ (والسلام) خورشید عالم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

مکرمی جناب مولانا محمد ادریس صاحب

سلام مسنون...... جناب گرامی نام اور احقر کی تقریروں کی دو جلدیں موصول ہوئیں ماشاءاللہ آپ نے جس ضرورت سے ان کو شائع کیا ہے وہ اپنی جگہ جم و درست پر کہ خود حضرت حکیم الاسلام مدظلہ (غور طلب)

الحمد للہ! خطبات کی اشاعت ہندوستان میں بھی ہوئی، اور بڑے پیمانے پر اسے پذیرائی حاصل ہوئی، قارئین و ناظرین کرام سے بندہ کی خصوصیت سے التجاء و استدعاء ہے کہ اس کی قبولیت کے لئے بہت اہتمام سے دعاء فرما دیں تو ان کا مجھ پر احسان ہوگا کہ اصل چیز قبولیت ہے۔

قارئین خطبات کو یہ جان کر یقیناً مسرت ہوگی کہ ساتویں جلد ترتیب کے آخری اور کتابت کے ابتدائی مراحل میں ہے، انشاءاللہ جلد منظر عام پر لانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

جلد ششم کی ترتیب کے سلسلہ میں اخی الکریم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہ جدہ (سعودیہ) کا

بہت زیادہ تعاون شامل حال رہا، ان کی جدوجہد سے کیسٹوں میں محفوظ یہ علمی سرمایہ حاصل ہوسکا، جو بعد میں کاغذ پر منتقل ہوا، اللہ تعالیٰ ان کو بہت زیادہ جزائے خیر نصیب فرمائے، اور ہم سب کو قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

اہل علم کی خدمت میں یہ استدعاء ہے کہ اگر اس مجموعے میں کوئی علمی غلطی نظر پڑے تو اسے بندۂ نابکار کی طرف نسبت کرتے ہوئے اطلاع فرمائیں تو احسان عظیم ہوگا۔ (تقبل الله منا و منكم)

بندۂ نابکار: محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

۲۷ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ / مطابق ۱۶ مارچ 1989ء

پیش لفظ جلد ہفتم

حامداللہ العظیم ومصلیا علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین. امابعد..... خطبات حکیم الاسلام کے سلسلے کی ساتویں جلد بحمد اللہ تعالیٰ آپ کے پیش نظر ہے، اس سلسلہ کی افادیت وقبولیت جو پردۂ غیب سے ظہور پذیر ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ مجھ ایسا بندۂ نابکار تو کم از کم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، ہر جلد کے اختتام پر نئی جلد کا مواد میسر نہیں ہوتا تھا، لیکن جب نئی جلد کی ترتیب کا کام شروع ہوا، مواد مہیا ہوتا جتا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تکمیل کے مراحل آجاتے، فللہ الحمد، خطبات کے قارئین کرام جو اہل علم و فضل بھی ہیں اور علم دوست احباب بھی ان کی دعائیں بہت ہی زیادہ شامل حال رہیں۔

الحمد للہ! خطبات ومواعظ کے سلسلہ میں ان خطبات کو وہی مقام ملا جو خود صاحب خطبات حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کا ہے، پاکستان میں اس کی اشاعت کا سلسلہ روز افزوں ہے اور حال ہی میں ایک محترم دوست، جو کتابوں کی طباعت واشاعت کا بہت ذوق رکھنے والے ہیں، ہندوستان تشریف لے گئے تو ان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں چار کتب خانوں سے خطبات حکیم الاسلامؒ شائع ہو رہی ہے، بایں ہمہ مانگ بڑھ رہی ہے۔ جس طرح یہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے لئے ایک سلسلہ جاریہ ہے اور اس کا دینی فائدہ ان شاء اللہ ان کی ذات گرامی کو یقیناً پہنچ رہا ہوگا، اسی طرح مرتب خطبات کے لئے بھی یہ ایک بڑی دینی سعادت ہے اور امید ہے کہ آخرت میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر قبولیت کا معاملہ فرمائیں گے، جو دنیا میں ظاہر ہو رہا ہے، دنیا میں قبولیت ظاہری اندازوں سے بڑھ کر ہوئی ہے تو آخرت میں دنیوی اندازوں سے بڑھ کر ہوگی، کیونکہ آخرت ہی درحقیقت فضل خداوندی کا مظہر ہے، اور دنیا تو اس کا پرتو اور نمونہ ہے۔ **(وما ذلک علی اللہ بعزیز)**

مواعظ طیبہ کے اس مجموعہ میں ایک اہم خطبہ ''اجلاس صد سالہ دارالعلوم (دیوبند) کا خطبۂ استقبالیہ'' ہے جو اس لحاظ سے خصوصی امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ دارالعلوم کی ایک مختصر تاریخ اور اس کے قیام کے اغراض ومقاصد، عوامل ومحرکات اور خدمات وکارکردگی کا ایک مختصر جائزہ بھی ہے۔

نیز اکابر علماء کرام اور صلحاء امت جو اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تقویٰ بھی ہوں کہ ایسے حساس بین الاقوامی اجتماع، جو قوموں کی تاریخ میں چشم فلک بار بار نہیں دیکھا کرتی، کے سامنے پڑھا گیا، اس خطبہ کا یہ امتیاز ہے، نہ صرف خطبات کے سارے مجموعہ میں یہ شرف امتیاز صرف اسی خطبۂ طیبہ کو حاصل ہے بلکہ خود حضرت حکیم

الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی نے زندگی میں لاکھوں کے اجتماع سے خطاب کیا ہوگا، مگر سامعین کا یہ اجتماع انفرادیت کا حامل تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں کہ تمام تر جلدوں میں موجود مواد کا بیشتر حصہ کیسٹوں سے لیا گیا ہے، اور کیسٹوں کو جمع کرنے میں جو جدو جہد اور انتھک کوشش برادر محترم حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب (حال مقیم جدہ، سعودیہ) مدظلہ نے خصوصی طور پر سرانجام دی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ انہی کا حصہ ہے، اور یہ اس تعلق و محبت کا مظہر ہے جو ان کو حضرات علماء دیو بند سے عموماً اور حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات ستودہ صفات سے خصوصاً ہے۔

اس سلسلے کے منظر عام پر آنے کے بعد دیگر احباب نے بھی کرم فرماتے ہوئے کیسٹز مہیا کیں، جن کا اجمالی طور پر تذکرہ خیر و برکت شامل اشاعت ہوتا رہا، افادات علم و حکمت کے نام سے آپ کے سامنے آنے والا علمی مواد بھی کیسٹز سے لیا گیا ہے، یہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی کراچی آمد کی یادگار ہے، اس کی تاریخ و مقام تو معلوم نہیں ہوسکا، تاہم ایک دورے کے موقع پر آپ نے چند روز پاکستان میں قیام فرمایا تو مغرب کے بعد مجلس کا اہتمام ہوتا، جس میں شہر کے اطراف و اکناف سے علماء کرام اور علم دوست احباب شرکت فرماتے، کوئی صاحب سوال کرتے اور حضرت حکیم الاسلامؒ اپنی وھبی خصوصیت کی بناء پر اس کے جواب میں علم و حکمت کے موتی بکھیرنا شروع فرمادیتے، چونکہ سوال کرنے والا شخص مجمع میں ہوتا تو اس کا سوال ریکارڈ نہیں ہوسکا دھیمی آواز میں کچھ نہ کچھ سنائی تو دیتا ہے مگر مکمل طور پر نہیں، اس لئے سوالات کا سلسلہ نہیں رکھا گیا بلکہ صرف وہ علمی جوابات جو حضرت حکیم الاسلامؒ نے بیان فرمائے ان کو شامل کتاب کرلیا گیا، اور عنوانات قائم کردیئے گئے ہیں، جس کے بعد جواب سے مفہوم ہونے والا سوال ازخود متعین ہوجاتا ہے اور سوال کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی، افادات علم و حکمت کا ایک معتدبہ حصہ خطبات کی ساتویں جلد میں شامل کیا جارہا ہے اس سلسلہ کا بقیہ حصہ ان شاء اللہ آٹھویں جلد میں شامل کیا جائے گا۔

اگرچہ یہ مواعظ نہیں ہیں، جس کو خطبات کے سلسلہ میں منسلک کیا جائے، لیکن بوجوہ ان کو اس سلسلے میں داخل کرلیا گیا، اس سے اصل غرض تو یہ ہے کہ شائقین خطبات تک یہ تمام علوم بھی پہنچ جائیں، نئے نام سے کتاب مرتب کی جاتی تو تعارف کے بعد بھی شاید وہ افادیت سامنے نہ آتی جو اس طور پر معلوم ہوتی ہے۔ نیز بعض سوالات کے جوابات اتنے طویل ہیں کہ وہ بجائے خود ایک مستقل ''خطبۂ طیبہ'' کی حیثیت رکھتے ہیں، علاوہ ازیں جوابات کا جو خاص اسلوب بیان ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخاطب کی رعایت رکھتے ہوئے اسے اختیار کیا گیا ہے، اس لئے وہ علمی ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہے جو تقریر و بیان میں بھی کارآمد ہے۔

بہرحال ''افادات علم و حکمت'' کے نام سے یہ تمام تر موجود مواد بھی مرتب شدہ صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ آپ قدر افزائی فرمائیں گے۔

بقیہ تقاریر حسب معمول جمع کر کے عنوانات قائم کردیئے گئے ہیں، اس وقت خطبات حکیم الاسلامؒ کی آٹھویں جلد زیر ترتیب ہے، اور تقریباً یکصد سے زائد صفحات کتابت بھی ہو چکے ہیں، کوشش یہی ہے کہ جلد ۸ مراحل تکمیل سے گذر کر جلد آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے، مگر اس میں آپ کے تعاون دعاء کی از حد ضرورت ہے، یہ جو کچھ ہے قارئین خطبات ہی کی دعاؤں کا مظہر ہے اور بس اللہ تبارک وتعالیٰ قبولیت کاملہ سے نوازے اور ان خطبات کو ہم سب کیلئے صلاح وفلاح اور خیر و برکت کا باعث بنائے۔ (آمین ثم آمین) بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

والسلام: بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہٗ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ / ۲۷، اکتوبر ۱۹۸۹ء / بروز جمعۃ المبارک

پیش لفظ جلد ہشتم

حامداللہ العظیم ومصلیا علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ الہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

امابعد:

خطبات حکیم الاسلام کے سلسلہ کی آٹھویں جلداس وقت آپ کے زیرمطالعہ ہے، پہلی جلدوں کی نسبت اس جلدکو یہ امتیاز وخصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بہت سی وہ تقاریر آ گئی ہیں جوسیاسی مضامین پر مشتمل ہیں، سیاسی مسائل ہر دور کے جذباتی اور نفسیاتی طور پر احساس نزاکت کے حامل رہے ہیں، عام طور پر اس میدان میں کام کرتے ہوئے افراط وتفریط کے شکار ہونے کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے، مثبت پہلو پر کام کرنے کے باوجود بعض اوقات فریق مخالف کی طعن وتشنیع سے صراط مستقیم پر قائم رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے، علماء کرام میدان سیاست میں آئیں تو بے شک سیاست دین کا اہم شعبہ ہے مگر اس میدان میں آنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ علماء کرام کے مقام کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریوں میں کمی آجاتی ہے بلکہ ایک گونہ اس میں اضافہ ہی ہوجاتا ہے۔

اہل علم کی سیاست اور عوام الناس اوران کے رہنماؤں کی سیاست اور طریق سیاست میں کھلا امتیاز اور بین فرق ضروری ہے۔

بعض اوقات احتجاجی جلسوں اور کانفرنسوں سے خطاب کرنا ہوتا ہے، جذبات سے مغلوب لوگون کے جذبات سے کھیل کران کومزید اشتعال میں لانا اور بہرصورت فریق مخالف کوزیر کرنا یہ اہل علم کی شایان شان نہیں، اس لئے ایسے مواقع پر اہل علم کو اپنا امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے، حجت وبرہان اور قوت استدلال سے بات میں وزن پیدا کرنا عق وفہم کا راستہ ہے جو ہر ذی شعور کا حق ہے اور یہی اہل علم کی شان ہے۔

یہ عرض کرنا بے جانہ ہوگا علماء کرام کے طبقہ سے ہٹ کر جولوگ سیاست میں حصہ لیتے ہیں وہ اس میں مذہبیت کے عنصر کو غالب رکھنا تو درکنار اس کو خارج کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے اس میں جھوٹ فریب، غلط بیانی، وعدہ خلافی چالبازی، ڈپلومیسی اور قول وفعل کا تضاد روزمرہ کا عام معمول ہے، اس لئے قطع نظر اس کے کہ حق کیا ہے، اس کو دیکھنے کی بجائے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ جولوگ چاہتے ہیں وہ کہنا خواہ وہ ضمیر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو آج کی سیاست کا بنیادی اصول ہے۔

اس کے بالمقابل حاملین مذہب اولا یہ دیکھتے ہیں کہ حق کیا ہے بس اس کو کہنا ضروری خیال کرتے ہیں،

خواہ لوگ اس کو اچھا نہ سمجھیں، گویا ان کے پیش نظر حق تعالیٰ کی رضا ہے، عوام الناس کی رضا نہیں ہے، اس لئے اپنے علم ودانست کے مطابق جس کو وہ حق جانتے ہیں حق تعالیٰ کی مسؤلیت کے پاکیزہ جذبۂ خوف سے اسی کو کہتے ہیں، بالفاظ دیگر پانی کی رو کے ساتھ تیرنا بہت آسان ہے، مگر اس کے مخالف سمت تیرنا بہت مشکل ہے، لیکن اہل حق اور علم پر جب یہ ذمہ داری آئے تو وہ اس کو بھی بکمال شان نبھاتے ہیں۔

ملکوں کی تاریخ میں صدی نصف صدی کوئی بڑی عمر نہیں ہوتی، ماضی قریب میں جمعیت علماء ہند نے سیاسی طور پر کس کردار کی پختگی کا اظہار کیا، آزادئ ہند سے قبل، تقسیم ہند اور آزادئ ہندوپاک کے ہنگاموں میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور مسلمانوں کی کس طرح راہنمائی کی ہے، اس کا اندازہ آپ ان خطبات صدارت اور اُن تقاریر سے کرسکیں گے جو حضرت حکیم الاسلام نوراللہ مرقدہٗ نے جمعیت علماء ہند کے زیر اہتمام منعقدہ جلسوں میں ارشاد فرمائے۔

ان خطبات میں جہاں نظریات کی پختگی نظر آئے گی وہاں اہل علم کی سیاسی طور پر شان امتیاز، ان کی گفتگو، طرز تکلم، مسائل پر نظر، ان کے حل کا طریق کار اور اس سب کچھ کے ساتھ مذہبیت کا عنصر نمایاں نظر آئے گا۔

نیز انداز فکر اور پروگرام میں صرف اقتدار وحقوق سے متعلقہ سیاست ہی کو پیش نظر رکھنا کافی نہیں سمجھا گیا، چنانچہ ان خطبات ومقالات میں آپ دیکھیں گے جہاں حکومت سے گفتگو ہے اور بہت سے مسائل میں اظہار مذمت اور غم وغصہ کا حکومت کو ہدف بنایا گیا وہاں عامۃ الناس کی معاشرت کی اصلاح اور ان کی اخلاق کی نگہداشت کا پروگرام بھی شامل ہے، برطانوی اور سیکولر حکومت کی موجودگی میں مسلمان بچوں کا تعلیمی مستقبل کیا ہوگا؟ ان کا ظاہر وباطن اسلام وایمان سے کیسے مانوس اور معمور ہو؟ وہ مذہب کو ایک حقیقت جان کر کیسے قبول کریں؟ اور اس پر کیسے قائم رہیں، ان تمام امور پر ان خطبات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

الغرض علماء کی سیاست میں جہاں دینوی معاملات سامنے ہوتے ہیں وہاں آخرت کی بہبود اور اس کا پروگرام بھی ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔

مذہب کی بنیاد پر ہی کی جانے والی سیاست سے مستحکم اور پائیدار قومی انقلاب آئے ہیں، ہمارے اکابر مذہب کی للّٰہیت کے ساتھ جہاں بھی گئے اپنے اثرات چھوڑ کر آئے، اور اگر خدانخواستہ مذہب کو سیاست سے خارج کر دیا جائے تو کم از کم علماء ایسی سیاست سے بزد آزما ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ اپنے الفاظ میں ''مذہب کی سیاست میں کیا اہمیت ہے؟'' ذیل کے واقعہ سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''ابھی دوتین برس کا واقعہ ہے میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال، دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ستمبر (۱۹۶۵) شروع ہون سے ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! ملک کے

حالات بہت نازک اور خراب ہیں میں نے کہا جی ہاں، اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہا کوئی سبب بھی اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا ہاں سبب بھی اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا ہاں سبب ہے۔ کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں، آپ ہیں سیاسی اور برسرِ اقتدار انسان، آپ ہر چیز کو سیاسی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ تو میرا نقطۂ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ تو اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا۔ اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں، تو میں نے کہا سن لیجئے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی ترقی نہیں کرسکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے۔ اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کرسکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کرسکتی ہے۔ دنیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ جلد نہم

حَامِدًاللّٰهِ الْعَظِيْم، وَمُصَلِّياً عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ   امّا بعد.

سلسلۂ خطبات حکیم الاسلام کی نویں جلد اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ جو حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کے علوم وھبیہ کا ایک جدید وحسین مرقع ہے۔

الحمد للہ پہلی تمام جلدوں کو قبول عام نصیب ہوا اور اس قدر قلبی اشتیاق سے اظہار پسندیدگی کیا گیا جس کا حاشیۂ خیال میں بھی واہمہ نہ گزرا تھا۔

حضرت اقدس حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی زندگی کا ایک طویل دور اہتمام دارالعلوم (دیوبند) کے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں گزرا۔ اس لئے دارالعلوم کے امور ذمیہ کے سلسلہ میں سفر جزو زندگی رہا۔ آپ رحمہ اللہ نے نصف صدی سے زائد حصہ پر محیط اس سفر کو تبلیغی واصلاحی مقاصد، نیز دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے تعارف کا ذریعہ بنایا اور دنیا بھر کے گوشے گوشے میں جانا ہوا۔ ان اسفار میں ہونے والے ''خطبات ومواعظ'' کے قلمبند کرنے کا اہتمام کیا جاتا تو آج ایک ''عظیم علمی ذخیرہ'' اکابر دارالعلوم کی تصانیف میں امتیازی مقام کا حامل ہوتا۔

اور شاید یہ کہنا مبالغہ پر مبنی نہ ہو کہ وہ اپنی تعداد میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ''مواعظ اشرفیہ'' کے قریب قریب تو ضرور ہوتا، ماہنامہ دارالعلوم کی وہ فائلیں جس میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے اسفار کی ماہانہ تفصیل بحیثیت مہتمم دارالعلوم درج کی جاتی، اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔ تاہم اس حد تک کہنے کی اب بھی گنجائش ہے کہ اکابر دارالعلوم میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خطبات ومواعظ کے بعد اور کسی بزرگ کے خطبات اتنی تعداد میں مدون ہو کر منظر عام پر نہ آ سکے جس قدر حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے ہیں۔

اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آج کے حسی، مشاہداتی اور عقلی واستدلالی دور میں یہ خطبات اہل علم اور عامۃ الناس کے لئے یکساں مفید ثابت ہوئے۔ اہل علم اور خطباء کرام اس سے مواد لے کر بات کو وسعت دے سکتے ہیں۔ اور عامۃ الناس ان کی سہولت وآسانی سے محظوظ ہوتے ہیں، بالخصوص آج کے دور میں اردو ادب کا ذوق آشنا طبقہ جہاں ان سے اپنے ادبی ذوق کی تسکین حاصل کر پاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن وفہم میں

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی تعبیر و تفہیم کا خاص انداز کہ بڑے بڑے علوم کو آسان پیرائے میں سمجھا دیا گیا، بہت ہی مفید اور موثر ثابت ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے ''علوم قاسمیہ'' کو اردو ادب کا وہ جدید لباس پہنا دیا جو آج کے دور کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر تیار کیا گیا ہو، اس لئے جب ان خطبات کو بیان کیا جاتا ہے تو سامعین کا قلب و دماغ ان کو اپیل کرتا ہے۔ شاید انہی خصوصیات کی بناپر ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کی پذیرائی میں مسلسل اضافہ ہے اور طلب مزید جاری ہے۔

اسی بناپر مرتب نے اس بات کا بطور خاص اہتمام رکھا کہ جو تقریر یا کوئی علمی نکتہ جو حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی طرف منسوب ملا، اُسے جمع کر دیا گیا اور اہل علم کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اسی اہم ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ''افاداتِ علم وحکمت'' کا سلسلہ بھی جاری کیا گیا۔

اسفار میں ہونے والی اصلاحی و تبلیغی تقاریر کے علاوہ خطبہٴ جمعہ بھی آپ رحمہ اللہ کا معمول تھا۔ تقریر جمعہ کی وہ نوعیت نہ تھی جو آج کل بالخصوص ہمارے ملک میں رواج پذیر ہے۔ بلکہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد محض تقریر ہی سننے کے لئے دلی اشتیاق سے لوگ بیٹھتے اور آپ کا بیان ہوتا۔ بیان کی جاذبیت اور کشش کا یہ عالم ہوتا کہ اس میں دارالعلوم سے علماء صلحاء اور طلباء کرام کے علاوہ اہل شہر بھی بکثرت شرکت کرتے۔

چنانچہ دارالعلوم دیو بند کے استاذ سابق اور جامعہ خیر المدارس ملتان شہر (پاکستان) کے صدر المدرسین جامع المعقول والمنقول شیخ الحدیث حضرت العلام مولانا محمد شریف صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ نے اس خطبہٴ جمعہ کے متعلق تاثرات کا اس موقع پر اظہار فرمایا جب صاحب خطبات حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ، کا سانحہٴ ارتحال پیش آیا اور جامعہ خیر المدارس ملتان میں اجلاس تعزیت منعقد ہوا۔

فرمایا کہ: دارالعلوم میں عام طور پر یہ معروف و مشہور تھا کہ حضرت اقدس خاتم المحد ثین علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ کے ہاں علوم کا ورود ہوتا تھا کہ درس حدیث میں تمام علوم پر کمال دسترس اور بالغ نظری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک ہی درس میں گویا تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔ کسی فن سے متعلق ذرا کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی تو غیر اختیاری طور پر بہتے ہی چلے گئے۔ اور حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے ہاں معارف کا ورود وہبی طور پر ایسے مربوط انداز میں ہوتا کہ دعویٰ کے ثبوت میں دلیل اور استدلالی طرز میں تقریر کا منفرد انداز ایک عجیب سماں پیدا کر دیتا۔ سامعین ایسی محویت سے اسے قبول کرتے کہ ان کے عقلی اشکالات بھی مرتفع ہو جاتے۔ اور ساتھ ساتھ روحانیت سے بھی محظوظ ہوتے۔

عام طور پر فلسفیانہ انداز تقریر سے سامعین طبیعت کا بار اور گرانی محسوس کرتے ہیں مگر یہاں روحانیت و عقلیت کا حسین امتزاج اس کو ایک روح پرور کیف و نشاط میں تبدیل کر دیتا۔ اسی لئے آپ کی تقریر سے لوگ ''تحیر معرفت کی دولت'' سے جھولیاں بھر کر جاتے۔

دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اسی لئے اطراف عالم سے حصول علم کی غرض سے تشنگانِ علوم اپنی سیرابی کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور علومِ قرآن ونبوت سے سرفراز اور بامراد ہوکر دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے ممنونِ احسان ہوکر لوٹتے ہیں۔ الغرض ایک عالَم کا عالَم اپنی تشنگی کا سامان کرتا ہے اور برابر کررہا ہے۔ مگر یہ چشمۂ خودرو بفضلہٖ تعالیٰ روبہ ترقی ہے۔ اور اہل علم یہاں خدمت خلق کی ایک لائق صد تحسین اور قابل ہزار تقلید ایسی مثال قائم کئے ہوئے ہیں جس کی نظیر عالَم میں ملنا مشکل ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کو یہ امتیازی شرف حاصل ہوا کہ انہوں نے طلب علم کی نیت سے آنے والوں کے لئے علمی خدمت کے علاوہ ان کی ضروریات سے متعلق انتظامی امور بھی سرانجام دیئے۔ اور انسانی زندگی کا ایک طویل اور حسین وزریں باب رقم کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے ترجمان کی حیثیت سے عالم اسلام کے علاوہ امریکہ، افریقہ اور برطانیہ۔ الغرض بلاامتیاز وتخصیص ملک اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ''تبلیغ علوم'' کی عظیم خدمت کا فریضہ بھی آپ نے ادا کیا۔

آپ کے زیرِنظر خطبات ایسے ہی مواقع کے ارشادات وفرمودات کی صدائے بازگشت ہیں جو قلم وقرطاس سے گزرکر اصلاحِ احوال کیلئے آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ اور تعمیر مستقبل کے سلسلہ میں آنے والی نسل کے لئے ''ذخیرۂ علم وحکمت''۔

اللہ تعالیٰ خطبات کے اس سلسلۃ الذہب کو صاحب خطبات، مرتب ناکارہ اور جملہ قارئین کرام کے لئے دین ودنیا کے لحاظ سے صلاح وفلاح اور آخرت کے لئے ذریعہ نجات بنائے اور کامل قبولیت سے نوازے آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

بندۂ نابکار

محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہ

۲۳ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

مطابق ۲، اکتوبر ۱۹۹۱ھ بروز بدھ

فیضی روڈ ملتان شہر، فون نمبر ۶۳۲۱۶

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ جلد دہم

حَامِدًالِلّٰهِ الْعَظِيْم، وَمُصَلِّيًا عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ   امّا بعد.

خطبات حکیم الاسلام جلد دہم بحمد اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں میں ہے، تقاریر و مواعظ کے سلسلہ میں جو مواد میسر آسکا وہ ہدیہ قارئین کرام کر دیا گیا۔ تاہم ابھی اس قدر منتشر مواد موجود ہے کہ ان کو جمع کیا جائے تو مزید کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مقدور بھر سعی و کاوش سے جو ہو سکا وہ پیش خدمت کر دیا گیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کرم سے سلسلۂ خطبات کو یہاں تک پہنچایا اللہ تعالیٰ اسی فضل سے قبول فرماتے ہوئے مزید مواد مہیا فرمادیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ مزید جلد بھی پیشِ خدمت کی جائے گی۔

جلد دہم میں شامل ایک اہم تقریر ''اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام'' دارالعلوم دیو بند کے کتب خانہ سے حاصل ہوئی جو تقاریر یا خطباتِ صدارت مطلوب تھے ان کے حصول کے لئے مہتمم دارالعلوم حضرت محترم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ حضرت والا نے کتب خانہ دارالعلوم میں ان کو تلاش کرایا۔ تو صرف یہی تقریر مل سکی۔ اس سلسلہ میں حضرت موصوف نے جو کاوش فرمائی اس کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذمہ داری کے جس منصب پر آپ ہیں، اس کے پیشِ نظر اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس کام کو سرانجام دینا محض للہیت کے جذبے سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس جذبے کا بدل شکریے کے کوئی رسمی الفاظ ادا نہیں کر سکتے، تاہم دعا مسنون اس کے لئے مکافاتِ احسان کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہے۔

فجزاكم الله احسن الجزاء

اس سلسلہ کی تفصیل کچھ عرض کر دی جائے تو وہ جہاں اکابر کے علو ظرف اور ہمت عالی کا مظہر ہوگی وہاں ہم چھوٹوں کے لئے مشعل راہ اور لائق تقلید بھی ہوگی۔

جو تقاریر طلب کی گئی تھیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

ا۔ جلسۂ احتجاج بسلسلہ آزادی فلسطین۔ (بمبئی)

۲۔ جمعیت علماء دینی تعلیمی کانفرنس۔ (دہلی)

۳۔ دینی تعلیمی کانفرنس جمعیت العلماء سہارنپور (۱۳۸۰ھ)

۴۔ بچھرایوں ضلع مرادآباد کا اجلاس جمعیت العلماء صوبہ یو، پی

۵۔ جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی دو عظیم اجلاس ۱۳۶۳ھ و ۱۳۶۴ھ (۱۳۶۴ھ) کی یہ تقریر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی نے فراہم فرمائی۔)

۶۔ اسی طرح اس حدیث مسلم کی شرح جس میں فرمایا گیا:

جہنم سال میں دو مرتبہ سانس لیتی ہے جو ماہنامہ نقش دیوبند بابت ماہ جولائی، اگست، دسمبر ۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کی جستجو جاری ہے۔

کاش! اگر یہ تمام تقاریر دستیاب ہوجاتی ہیں تو ایک جلد خطبات کی اور تیار ہوجائے۔ یہاں اس کو نقل کرنے سے مقصود بھی یہی ہے کہ اگر کسی صاحب علم کے پاس یہ مواد ہو یا کسی جگہ اس کی راہنمائی ہوسکتی ہو تو مطلع فرمائیں۔ ان شاء اللہ اس کے حصول میں ہر ممکن سعی کی جائے گی اور اس کو قارئین خطبات کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

بہر حال دارالعلوم عریضہ ارسال کیا گیا۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی طرف سے جو جواب آیا اس کی نقل کتاب کی زینت بنادی گئی۔

اس سلسلہ میں بندہ نے لکھا کہ جو تقاریر دستیاب ہوجائیں اس کی فوٹو کاپی کر کے بذریعہ ڈاک بھیج دی جائے اور جو اس کا خرچ ہو اس سے آگاہ کردیا جائے گا۔ وہ ادا کردیا جائے گا۔

چنانچہ ایک تو حضرت والا نے یہ زحمت اٹھائی کہ تقریر تلاش کے بعد بھجوائی اور اس سلسلہ میں تاخیر کی وجہ لکھی اور صفائی معاملات کے پیش نظر اس کا پورا خرچہ لکھ بھیجا۔

(حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا خط)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ جلد یازدہم

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَبَعْدُ!

خطباتِ حکیم الاسلامؒ کی گیارہویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ گرامی کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے، بالخصوص اس لیے کہ اگر کوئی باصلاحیت نہ ہو، پھر اس سے کچھ ہو جائے، تو اس کے ذمہ شکر اور زیادہ ہو جاتا ہے...... بندہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے خطبات کی ترتیب وتدوین کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، یہ جو کچھ ہے محض فضل خداوندی سے وجود میں آیا......

قارئین خطبات اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی شخصیت وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہے جسے حق تعالیٰ شانہٗ نے دارالعلوم دیوبند ایسی شہرہ آفاق علم وعمل اور کردار واخلاق کی یونیورسٹی کی مسندِ اہتمام پر فائز رکھا۔ آپ کا دورِ اہتمام ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ علمی لحاظ سے یہ کتنی بڑی خدمت اور سعادت ہے، اہل علم سے مخفی نہیں۔ بجا طور پر قلبی وجدانی کیفیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ۔ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ثُمَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ، احقر کو بعض اوقات یہ مسرت کے لمحات نصیب ہوتے رہتے ہیں، جب یہ سوچتا ہوں کہ خطباتِ حکیم الاسلامؒ کی ترتیب وتدوین جہاں حضرت حکیم الاسلامؒ کے علوم ومعارف کی خدمت ہے، وہاں یہ دارالعلوم دیوبند کی بھی خدمت ہے......اور حجۃ الاسلام آیت من آیات اللہ حضرت مولٰنا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے معارف وحکم کا نسلِ نو کے لیے تعارف کا ذریعہ بھی ہے۔

الحمد للہ اس ناکارہ نے ان آنکھوں کو مسرور ہوتے ہوئے اور قلوب کو احساسِ شکر سے لبریز ہوتے ہوئے بارہا مشاہدہ کیا، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فیض علم حاصل کیا اور ان حضرات کے دل میں ان خطبات کی قدر ومنزلت ہے اور بہت سے حضرات کے یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ خطباتِ حکیم الاسلامؒ کی وجہ سے عرصہ سے آپ سے اشتیاق ملاقات تھا نیز یہ کہ:

"خطباتِ حکیم الاسلام کی وجہ سے غائبانہ تعارف تو آپ سے پہلے ہی تھا۔ اب ملاقات بھی ہو گئی......ایسے حضرات کے اظہارِ محبت کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ ان کو الفاظ کا جامہ پہنایا جا سکے.....

بہت سے مقتدر دینی راہنما جوملکوں ملک سفر پر رہتے ہیں اور خطاب و بیان سے ان کی زندگی عبارت ہے، نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ ہم نے فلاں ملک میں آپ کی خطبات دیکھی......اور یہ بندہ نے بھی دیکھا کہ جلسۂ عام یا جمعہ کے خطبہ میں حضرات مقررین اس کتاب سے استفادہ کر کے تقریر کر رہے ہیں......فَالْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِکَ......

اخبارات میں ان کی تقریر انہی خطبات کے اسباب پر مشتمل ہوتی ہے، اہل علم کی ایک کثیر تعداد انہی خطبات سے علمی استفادہ کر رہی ہے اور اگلی جلد کی منتظر رہتی ہے....گیارہویں جلد ایسے حضرات کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس میں الحمدللہ سورۂ ملک کی پوری تفسیر ہے جو عجیب وغریب علوم و معارف پر مشتمل ہے۔...

حضرتِ اقدس حکیم الاسلامؒ نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ ماہ رمضان المبارک قیام بمبئی میں فرمایا، تو روزانہ اسی سورۃ کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرماتے جسے بڑے اہتمام سے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ کر لیا گیا۔ بندہ کو یہ ریکارڈ شدہ مواد دوبئی سے برادر محترم مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب خانگڑھی نے حضرت اقدس حکیم الاسلامؒ کے تلمیذ رشید اور خاص ارادت مند حضرت محترم مولانا عبدالمتین صاحب منیری زید مجدھم سے حاصل کر کے بھیجا، جس پر بندہ تہ دل سے ان کا شکر گزار اور ممنون احسان ہے۔ الحمدللہ وہ تمام تر تفسیری مواد جلد نمبر ۱۱ میں مرتب ہو گیا۔

ازاں بعد احقر کے بہت ہی محب ومہربان رفیق حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب جدہ (سعودیہ) نے سورۂ قلم کی تفسیر پر مشتمل ۱۰ کیسٹس دیں، جو آج کل لکھی جارہی ہیں، اس طرح بارہویں جلد اپنے مراحل آغاز میں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان حضرات کو بہت جزائے خیر نصیب فرمائے اور علوم دینیہ کی اشاعت وترویج کا پورا پورا اجر عظیم عطا فرمائے اور ہم سب کے لیے قبولیت کاملہ نصیب فرمائے۔ (آمین)

نیز اس ناکارہ کے لیے جلد نمبر ۱۲ کی تکمیل آسان فرمائے۔ آمین۔ الحمدللہ خطبات کا یہ مجموعہ ہندوستان میں بھی شائع ہوا، اللہ تعالیٰ توفیق مزید سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

بندہ کو کراچی میں ہندوستان سے شائع شدہ ایک جلد ہاتھ لگی اور یہ دیکھ کر تعجب اور حیرت ہوئی کہ جس ادارہ نے اس کو شائع کیا، اس نے یہ انتہائی زیادتی کی کہ احقر کا لکھا ہوا پیش لفظ اھداء، انتساب، کلمات تحسین اور اپنے اساتذۂ کرام کی تقریظات، اور شروع کتاب سے تقریباً پچیس تیس صفحات انہوں نے غائب کر دیئے اور اپنی طرف سے نیا پیش لفظ کسی اور شخصیت کے نام انتساب یہ سب کچھ اپنی طرف سے لکھ کر کتاب کو شائع کر دیا۔ دینی کتب کا شائع کرنا جہاں ایک لحاظ سے دینی خدمت ہے وہاں کاروباری منفعت بھی ہے۔ ایسے حضرات سے گذارش ہے کہ آپ کتاب کی اشاعت کریں، مگر یہ صحیح نہیں کہ علمی طور پر کتاب میں قطع وبرید کی جائے۔ یہ نہ صرف شرعی طور پر مستحسن نہیں بلکہ علم وادب اور تصنیف وتالیف کی لائن میں کوئی اچھا تاثر نہیں۔ اگر آپ نے اشاعت کرنی ہی تھی تو کم از کم مرتب اور اس کے اساتذۂ کرام، نیز متعلقین کو تو قارئین کرام کی دعاؤں سے محروم نہ فرماتے......

ان حضرات کو جیسے اپنے اساتذۂ کرام سے تعلق خاطر ہے اور اپنے نسب کے لحاظ سے بڑوں سے محبت ہے

یہی حق دوسروں کے لیے بھی وہ تسلیم کرلیں تو اس میں ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہے.....لیکن جو طرز عمل اختیار کیا گیا، دوسرے ملک میں رہتے ہوئے ان سے کوئی براہ راست گلہ شکوہ نہیں، تاہم وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرح کے طرز فکر سے عقیدت و محبت کے شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں.....کیا احقر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے والد محترم رحمہ اللہ کے لیے جو ان خطبات میں علمی رہنمائی فرماتے رہے قارئین خطبات سے دعا چاہے.....اگر یہ حق صحیح ہے تو پھر خطبات سے ان کے تذکرے کو محو کر دینا زیادتی نہیں؟........اسی طرح جن اساتذہ کرام کے سامنے بیٹھ کر علم اور اہل علم سے شد بد نصیب ہوئی اگر ان کی طرف خطبات کی ترتیب و تدوین کا انتساب کر کے اپنے قلبی جذبات کی تسکین کی جائے یا ان کے کلمات تقریظ کو کتاب کی زینت بنایا جائے.....مگر کوئی بھی ادارہ اس کو ختم کر کے اپنی طرف سے یہ تأثر دے کہ گویا کتاب مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے اور اس کے ابتدائی احوال لکھ کر وہ اس کو سند اور حجت دے رہے ہیں جبکہ واقعہ ایسا نہ ہو، تو یہ قرین انصاف نہیں ہے۔

اس لیے ان حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ممکن ہو تو خطبات کی ترتیب کے لیے مواد فراہم کر کے تعاون فرمائیں، جو ان کا منصب ہے، اگر تعاون نہیں فرما سکتے.....جیسا کہ اب تک انہوں نے نہیں کیا، تو کم از کم یہ زیادتی بھی نہ فرمائیں، خطبات کو شائع کرنا چاہیں تو بلا کم و کاست اور قطع و برید کے شائع فرمائیں، امید ہے کہ وہ ان جذبات و احساسات کے اظہار کو محسوس نہ فرمائیں گے۔

جلد نمبر ۱۱ کے منظر عام پر آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ بندہ شعبۂ تحفیظ میں مدرس ہے .....مگر ایک عرصہ سے ارادہ تھا کہ شعبہ کتب بھی قائم کیا جائے تو گذشتہ (۲) دو سال سے بندہ اس کوشش میں لگ گیا، چنانچہ دار العلوم رحیمیہ ① کے نام سے ایک نئے ادارہ کی بنیاد ڈالی گئی، اس کے لیے قطعۂ ارض خرید کیا گیا۔

الحمد للہ اب دار العلوم رحیمیہ کی بنیاد مضبوط ہو گئی، شعبہ کتب اور شعبہ تحفیظ دونوں اس میں قائم ہو گئے ہیں کسی بھی نو آغاز مدرسہ کے ابتدائی مراحل میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ انہی حضرات کے سامنے ہیں جو اس مرحلہ سے گزرتے ہیں گذشتہ (۲) برس کی اس مسلسل مشغولیت نے تحریری کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا.....لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ اس وقت دار العلوم رحیمیہ میں شعبۂ کتب کے پانچ درجات قائم ہو گئے ہیں اور شعبہ کتب میں داخل ہونے والے تمام تر طلبہ حفاظ کرام ہیں، اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا، ایک مربوط تعلیمی نظام قائم ہو گیا، تقریباً ۱۷ اساتذۂ کرام الحمد للہ دار العلوم رحیمیہ اور اس کی شاخوں میں شب و روز طلبۂ کرام کی خدمت میں منہمک ہیں۔

حضرات قارئین کرام سے دلی التجا ہے کہ وہ اس نو آغاز دار العلوم رحیمیہ کو اپنی دعاؤں میں خصوصیت سے یاد فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرات اکابر سے اسے ایک نسبت خاص عطا فرمائے اور مقام قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

خطبات کے قارئین کرام سے ایک انتہائی دردمندانہ گذارش ہے کہ احقر کے والد محترم حضرت اقدس مولانا محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ، ۲۲ شوال المکرم ۱۴۱۶ھ کو وصال فرما گئے، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، خطبات کی

حسن ترتیب وتدوین میں جہاں ان کی دعائیں شامل حال رہیں وہاں ان کی علمی وعملی شفقتیں بھی ساتھ رہیں۔آج یہ سایۂ رحمت ہمارے پورے خاندان سے اٹھ گیا...قارئین خطبات سے ان کے علودرجات کے لیے دعاؤں کا خواہاں ہوں......امید ہے کہ وہ کرم فرمادیں گے۔

والسلام
قاری محمد ادریس
بانی ومدیر دارالعلوم رحیمیہ، چوک شاہ عباس
سورج کنڈ روڈ، پیر کالونی نمبر ۱ ملتان شہر
فون نمبر: ۲۳۲۲۰۲
۲۳۱۷۴۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ دوازدہم

حَامِدًا لِّلّٰهِ الْعَظِیْمِ وَمُصَلِّیًا عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَ بَعْدُ!

خطباتِ حکیم الاسلام کے سلسلہ کی جلد نمبر ۱۲ آپ کے ہاتھوں میں ہے ان خطبات ومواعظ کی ترتیب و تدوین کے ابتدائی مرحلہ میں حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ گذری تھی کہ یہ سلسلہ بفضلہٖ تعالیٰ اتنا طویل ہو جائیگا۔ چونکہ فضلِ خداوندی کے متوجہ ہونے کیلئے دلیل اور قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ بس حق جل واعلیٰ کی کرم فرمائی کا یہ مشاہدہ وظہور ہے کہ وہ ہر ناممکن العمل کو اپنے ارادۂ مبارک سے ممکن فرما سکتے ہیں۔ جوں ہی خطبات دستیاب ہوتے رہے ان کو سلسلہ میں پرویا جاتا رہا، موضوعاتی ترتیب کو ملحوظ رکھنا اسی لئے مشکل تھا۔ گویا جمع شدہ مواعظ کی یہ ترتیب نہیں ہے بلکہ ہر میسر آنے والے خطبہ کو زیر ترتیب جلد میں پیش کر دیا گیا اور جلدوں کا نمبرات سے تعارف ہوتا رہا۔ جلد نمبر ۱۲ میں الحمد للہ سورہ قلم پ ۲۹ کی مکمل تفسیر ہے۔ احقر کی معلومات کی حد تک اس سُورۃ کے تمام مضامین پہلی مرتبہ منصۂ شہود پر آ رہے ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام نَوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهٗ کی تمام مطبوعات بحمد اللہ بندہ کے پاس موجود ہیں۔ بندہ کے ناقص علم کے مطابق اس سُورۃ کی تفسیر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف سے لبریز خصوصیات کے ساتھ پہلے نگاہ سے نہیں گذری۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام اس رائے سے اتفاق فرماتے ہوئے اسے مزید اشتیاق ومحبت سے پڑھیں گے۔

بارہویں جلد کے سلسلے میں برادر محترم جناب مولانا قاری محمد حنیف صاحب جالندھری زید مجدہم نے کرم فرمایا کہ جامعہ خیر المدارس کے بارے میں حضرتِ اقدس حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے جو مشاہدات وتاثرات وقتاً فوقتاً اپنی آمد کے بعد کتابُ الرّائے میں لکھے وہ سب عطا فرما دیئے، جو بارہویں جلد کی زینت بن رہے ہیں۔ یہ تاثرات ان دو بزرگ اور زیرک تاریخی شخصیات کے باہمی تعلق اور دو اداروں کے سربراہوں کی اس رفاقت کا تذکرہ ہے جو علومِ نبوت کی درسگاہوں کے ذمہ دار ہیں۔ میری مُراد دار العلوم دیوبند اور جامعہ خیر المدارس ہے۔ اس میں خیر المدراس کی عہد بہ عہد ترقی کی منازل طے کرنے کا تدریجی تذکرہ ہے۔ بے شک یہ تاثرات خاص خیر المدارس کے بارے میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے قلمبند فرمائے، تاہم منظر عام پر آنے سے اس کی افادیت مزید ہوگئی۔ حضرت مہتمم جامعہ زید مجدہم نے ''کرم بر کرم'' یہ فرمایا کہ ممتاز خطیب کے عنوان سے خطبات کی جلد ۱۲ کے

لئے ایک وقیع تحریر سپرد قلم فرمائی جس میں صاحب، اور مرتبِ خطبات سے متعلق تذکرہ خیر و برکت فرمایا۔ ناکارہ مرتّب ان کی اس کرم فرمائی کا دل و جان سے شکرگزار و ممنون احسان ہے۔

اسی طرح میرے عظیم محسن اور مخلص بھائی حضرت مولانا ابوانس عطاءُ اللہ بخاری زید مجدہم نے ''علم و حکمت کی کہکشاں'' کے عنوان سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی ہمہ پہلو شخصیت پر مختصر انداز میں بہت ہی جامع، وقیع اور دلآویز تحریر ارسال فرمائی جو زینتِ کتاب ہے۔ اسی طرح دیرینہ رفیق و کرم فرما برادر محترم حضرت مولانا محمد عابد صاحب زید مجدہم نے سورۂ قلم کی خصوصیات کے سلسلے میں جلد ۱۲ کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

یہ ناکارہ ان ہر دو حضرات کا تہہ دل سے سپاس گذار اور دعاء گو ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دارین میں اس کی بہتر سے بہتر ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ اس ناکارہ کو حضرت شہید اسلام، حضرت اقدس لدھیانویؒ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ ماموں کانجن کے ابتدائی دورِ تدریس میں احقر نے بالخصوص علم صَرف حضرتِ شہیدؒ سے حاصل کیا اور ان کے ماہرانہ طرزِ تدریس کی وجہ سے نہایت سہل الحصول انداز میں پڑھا۔ پھر جب حضرت شہیدؒ عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت سے وابستہ ہوئے اور ملتان دفتر میں قیام تھا تو گاہے گاہے یہ ناکارہ حاضرِ خدمت ہوتا تھا۔

خطبات کی ترتیب وتدوین کے اس دور میں جب تین جلدیں منظرِ عام پر آئیں تو حضرت حکیم الاسلامؒ کے وصال کا سانحہ پیش آیا۔ آپ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمات کے سلسلہ میں جو شذرہ ''بینات'' کراچی کے لئے لکھا تو اسی ذیل میں یہ چند کلمات بھی تحریر فرمائے۔ ''حال ہی میں عزیز محترم مولانا قاری محمد ادریس ہوشیار پوری سلمہٗ (خطیب مسجد غفوریہ پروانہ کالونی ملتان) نے حضرتؒ کی تقریروں کی کیسٹیں فراہم کر کے ''خطباتِ حکیم الاسلام'' کے نام سے تین ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں۔ اگر یہ محنت وجستجو جاری رہی اور حضرتؒ کی جتنی تقریریں محفوظ کرلی گئیں وہ سب شایع کردی گئیں تو اُمت کے لئے حقائق ومعارف اور ''کلماتِ طیّبات'' کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہوجائے گا'' (مقالاتِ یوسفی (۱۶۔۲۱۵) الحمدللہ! حضرت اقدسؒ کی حسبِ خواہش حق تعالیٰ شانہٗ نے فضل فرمایا کہ بارہویں جلد منظرِ عام پر آرہی ہے۔ اور جلد ۱۳ کی ابتدا کی جارہی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت شہیدِ اسلامؒ اور دیگر قارئین کرام کی دعاؤں کی وجہ سے فضل وکرم کا معاملہ فرمائے اور سابقہ جلدوں کو قبول فرما کر نئی آنے والی جلد کے لئے آسانی فرمائے۔ (آمین)

مرتب ناکارہ

قاری محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہ

جمعۃ المبارک ۲۸ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ

خادم دار العلوم رحیمیہ ملتان

محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا......اِلٰى قَوْلِهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾" ①

بزرگانِ محترم! یہ جلسہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، جلسہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے منعقد کیا گیا ہے۔ گویا اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر کیا جائے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ کا ذکر عینِ عبادت ہے اور اللہ کے نزدیک بڑی بھاری طاعت اور قربت ہے اور سارے کمالات و برکات کا سرچشمہ ہے اس لئے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ایک نعمت ہے جو مسلمانوں کو عطا کی گئی۔ تو میں اس وقت میلادِ نبوی ہی کے بارے میں چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں گذارش کروں گا اور اسی مناسبت سے یہ چند آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں، جو آپ کے سامنے ابھی پڑھی گئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میلاد کے سلسلے میں...... آپ بھی چونکہ ولادت کا ذکر سننے کے لئے آئے ہیں، ولادت کا ذکر بھی کروں لیکن میں ایک ولادت کی بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو ولادتوں کا ذکر کروں گا۔

ولادتِ نبوی جسمانی اور روحانی ...... ممکن ہے آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ ولادت تو ایک ہی ہوتی ہے، پیدائش ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے تو دو ولادتیں کیسی؟ لیکن میری گزارشات کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقتاً نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو ہی ولادتیں ہوئیں۔ ایک ولادت باسعادت تو ۱۲ یا ۸ ربیع الاول کو علےٰ اختلاف الاقوال ہوئی اور ایک ولادت حضور کی چالیس برس کے بعد ہوئی، یعنی روحانی ولادت...... جب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے دنیا میں ظاہر ہوئے۔ ۱۲ ربیع الاول کو ولادتِ جسمانی ہوئی اور چالیس برس بعد

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰-۴۸۔

ولادتِ روحانی ہوئی جس کو ہم نبوت سے تعبیر کریں گے۔

۱۲ ربیع الاول کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال دنیا میں ظاہر ہوا اور چالیس برس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال دنیا میں ظاہر ہوا۔ تو ایک جمال کی حیثیت سے ولادت ہے اور ایک کمال کی حیثیت سے ولادت ہے۔ دونوں ولادتوں میں ہمارے لئے ان کا ذکر عینِ عبادت اور طاعت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا میں جمال ظاہر ہونا یہ بھی عالم کیلئے عظیم ترین نعمت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال دنیا میں ظاہر ہونا یہ اس سے بھی بڑی نعمت ہے جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی ہے تو جمال محمدی وہ بھی ایک ایسی امتیازی شان ہے کہ دنیا میں اتنا بڑا جمیل اور صاحب جمال پیدا نہیں ہوا جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمال والے تھے اور اتنا بڑا با کمال بھی کوئی پیدا نہیں ہوا جتنا کہ کمال والے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ تو دونوں ولادتیں امتیازی شان رکھتی ہیں، نہ ولادتِ جسمانی کی نظیر ہے اور نہ ولادتِ روحانی کی نظیر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو ہمارے سامنے ظہور ہوا محمد بن عبداللہ کا اور چالیس برس کے بعد ظہور ہوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔ اُس وقت آپ ابن عبداللہ کی حیثیت سے دنیا میں آئے اور چالیس برس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے۔

ولادتِ روحانی کے بارے میں عامۃ الناس کا طرزِ عمل...... عام طور سے لوگ ولادتِ جسمانی کو اہمیت دیتے ہیں اور اسی ولادت کے ذکر کو ''ذکر میلاد'' کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ذکر میلاد کا ابتدائی درجہ ہے۔ حقیقی درجہ وہ ولادت ہے جو چالیس برس کے بعد ہوئی، اس لئے کہ پہلی ولادت میں ہمارے لئے عمل کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اور دوسری ولادت میں ہمارے لئے عمل کے نمونے موجود ہیں جس سے ہم سعادت حاصل کر سکتے ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی ولادت جمال کی ہوئی کہ چہرہ مبارک ایسا تھا، انگلیاں ایسی تھیں، بال ایسے تھے، خونچیں ایسی تھیں، بدن اور قد وقامت یہ تھا۔ اس میں ہمارے لئے کوئی نمونہ عمل نہیں ہے۔ خوشی کی تو انتہائی چیز ہے کہ ہمارے پیغمبر کو اللہ نے وہ جمال اور موزونیت عطا فرمائی کہ عالم میں ایسا حسن و جمال کسی کو نہیں دیا گیا۔ خوشی اور فخر کا موقع ہے لیکن عمل کا نمونہ کچھ نہیں...... یہ نہیں ہے کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ تھے ہم ویسے ہاتھ بنالیں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنگ مبارک تھا ہم اپنا رنگ ویسا کرلیں۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قد وقامت تھا ویسا ہم اپنا قد وقامت بنالیں۔ اس میں عمل کا نمونہ ہمارے لئے نہیں ہے خوشی کا موقع ضرور ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے جب آپ ظاہر ہوئے اس میں سامنے یہ چیز ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایمان ایسا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقیدہ یہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یہ تھا، نماز ایسی، روزہ ایسا، حج ایسا اور جہاد ایسا تھا...... اس میں ہمارے لئے نمونہ عمل ہے، جیسی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی ہم بھی ویسی نماز پڑھیں، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روزے رکھے ہم بھی ویسے روزے رکھیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کیا ہم بھی ویسا ہی حج کریں، جس طرح

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھریلو معاشرت تھی ہم بھی ویسی ہی معاشرت بنائیں، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جماعتی زندگی تھی ہم بھی ویسی ہی زندگی بنائیں۔ اس میں عمل کا نمونہ ہے میرے خیال میں یہ جو پہلی ولادت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے یہ اس لئے ہے کہ اس میں کرنا کرانا کچھ نہیں پڑتا کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، خوش ہولیے یا زیادہ سے زیادہ خوش ہو کے مٹھائی بانٹ لی اور خود ہی کھا بھی لی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ولادتِ روحانی ہی اصل مقصود ہے...... اور دوسری ولادت سن کر ذمہ داریاں بڑھتی ہیں کہ ہمیں مسلمان بننا پڑے گا، ہمیں یہ کام یوں کرنا پڑے گا، زندگی کا نمونہ ایسا بنانا پڑے گا۔ عمل کرنا لوگ نہیں چاہتے، اس لئے دوسری ولادت کا تذکرہ نہیں کرتے اور اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور پہلی ولادت میں عمل کا نمونہ نہیں خوشی خوشی کا موقع ہے اس لئے اس کو زیادہ اختیار کرتے ہیں، ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے یہ ذکر عبادت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں آئے ایسے ہی اس کا ذکر بھی عبادت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح نماز پڑھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح حج کیا، حضور نے اس طرح جہاد کیا، بلکہ یہ اس سے بھی بڑی عبادت ہے۔ اس میں ہمارے لئے سعادت حاصل کرنے کا موقع ہے۔ جبکہ اُس میں محض خوش ہونے کا موقع ہے۔ مگر بہرحال یوں تو دونوں ولادتوں کا ذکر ہمارے حق میں عبادت ہے اگر چہ پہلی ولادت مقدمہ ہے اور دوسری ولادت مقصود ہے کیونکہ اگلا مقصود ظاہر کرنا تھا اس لئے ولادتِ جسمانی سامنے رکھی گئی تاکہ ولادتِ روحانی کا موقع آجائے تو پہلی ولادت تمہید اور دوسری ولادت اصل مقصود ہے۔ رسالت و نبوت کو دنیا میں لانا تھا اس لئے ذاتِ اقدس کو پیدا کیا گیا مگر تمہید ہو یا مقصد ہو، یہ دونوں کا ذکر طاعت اور عبادت۔ اس لئے تھوڑا تھوڑا ذکر میں دونوں قسم کی ولادتوں کا کروں گا۔

جمالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... تو میں نے عرض کیا کہ پہلی ولادت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال ظاہر ہوا۔ جسم مُبارک ایسا تھا، رنگ ایسا تھا، قد و قامت ایسا تھا، چال ڈھال ایسی تھی۔ یہ بھی امتیازی چیز تھی کہ پورے عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں، فرماتے ہیں: ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، سُرخ حُلّہ پہنے ہوئے، سرخ چادر اور سرخ ہی لنگی۔ لیکن محدثین اور شراح حدیث اس کی تفصیل کرتے ہیں کہ وہ ساری سرخ نہیں تھیں، سرخ اس لئے کہا گیا کہ اس پر دھاریاں سرخ پڑی ہوئی تھیں جبکہ کپڑا سفید تھا، سفید زمین کے کپڑے میں سرخ دھاریاں تھیں۔ یمن سے چادریں آیا کرتی تھیں بعض سیاہ دھاریوں کی، بعض سرخ دھاریوں کی، بعض سبز دھاریوں کی۔ تو اس دن یمن سے سرخ دھاری کی کوئی چادر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی پہنے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا، چاندنی کھل رہی تھی، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا کبھی چہرۂ مبارک کو اور کہتا تھا کہ ان میں کون زیادہ حسین ہے؟ آخر مجھے فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ چاند میں وہ

حسن و جمال نہیں جو چہرۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر حسن و جمال ہے اس لئے چاند سے ہٹ کر میری نگاہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر جم جاتی تھیں۔ ① اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیسی صورتِ زیبا دیکھی تھی۔

صحابہؓ کی عادت مبالغہ کی نہیں تھی۔ صحابہ کرام سے زیادہ سچا اس عالم میں دوسرا نہیں پیدا ہوا۔ اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ اس امت میں جو بھی بڑے سے بڑا قطب، غوث اور ابدال پیدا ہوا وہ صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہ سب کے سب متقی، عدول، پاکباز اور پارسا ہیں، ان سے بڑھ کر مقدس طبقہ اس امت میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ قرآن وحدیث نے جس طبقے کی برگزیدگی کی شہادت دی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے، اس لئے ان کے ہاں شاعریت نہیں تھی، مبالغہ آرائی نہیں تھی۔ جو کچھ کہتے تھے اپنے اللہ کو سامنے رکھ کر حقیقت کہتے تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کوئی شاعری اور مبالغہ نہیں کیا بلکہ اصل حقیقت بیان کی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسی پاک صورت پہلے کبھی دیکھی نہ آئندہ دیکھیں گے۔ ② یہ کوئی مبالغہ یا شاعری نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے اور اس کے متعلق صحابہ کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ عشاقِ رسول محبت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فنا تھے اور جو فانی ہو محبت میں وہ تو کہا ہی کرتا ہے، وہ اچھی چیز ہی کہے گا، وہ تو محبت ہی کی بات کرے گا، تعریف ہی کی کہے گا لیکن قرآن کریم میں بھی اس کی شہادت موجود ہے۔ جب اللہ کے کلام سے کوئی چیز اخذ کی جائے تو قرآن ذمہ دار بن جاتا ہے، پھر اس میں شاعریت کا کوئی شائبہ یا شوشہ باقی نہیں رہتا تو قرآن کریم میں بھی اس کا مآخذ موجود ہے اور سمجھنے والے اس کے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ تو پہلے میں قرآن کا واقعہ بیان کردوں اور پھر اس واقعہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو اخذ کیا ہے اس کو عرض کروں گا۔

حسن یوسف علیہ السلام...... حدیث میں فرمایا گیا کہ یوسف علیہ السلام سب سے زیادہ حسین دنیا میں گذرے ہیں۔ اور خود فرمایا حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جب اللہ نے حسن و جمال پیدا کیا تو آدھا حُسن ساری دنیا کو دیا اور آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا۔ ③ تو حسن و جمال میں کوئی شک نہیں، جب حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تو اس سے بڑھ کر شہادت نہیں ہوسکتی کہ یوسف علیہ السلام سے زیادہ کوئی حسین نہیں، حُسن ان کا اُونچا تھا، ان پر زلیخا عاشق ہوئی ہیں، جو بادشاہِ مصر کی بیوی تھیں اور صرف زلیخا ہی عاشق نہیں تھیں بلکہ مصر کی تمام بیگمات اپنے دلوں کو یوسف علیہ السلام کے عشق میں کھوئی ہوئی تھیں لیکن زلیخا نے چونکہ انہیں خریدا تھا اور کنعان کے قافلے نے آ کے زلیخا کے ہاتھ انہیں بیچ دیا تھا اس لئے یوسف علیہ

---

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی الرخصة فی لبس الحمر للرجال ج:١٠ ص:٦.

② الشمائل المحمدیة للترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ ج:١ ص:٧.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء ص:٧٠٥ رقم:٤١١.

السلام گویا زلیخا کے مملوک تھے، دوسری طرف جا نہیں سکتے تھے تو بیگماتِ مصر لاکھ عشق کریں مگر کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں تو انہوں نے ایک ڈھنگ اختیار کیا کہ زلیخا پر طعنے کسنے شروع کئے، کہ دیکھو زلیخا کیسے تھوڑے دل کی عورت ہے جو اپنے غلام پہ عاشق ہوگئی ہے، اسے شرم نہیں آتی، بادشاہ کی بیگم ہے اور غلام پر عاشق؟ یہ طعنے دینے کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ زلیخا کا دل اتر جائے اور کسی طرح یوسف علیہ السلام کو ہم قبھا ئیں...... زلیخا اس سے ہٹ جائے تو اس پر ہم قابض ہوں، تو یہ مقصد تھا طعنے دینے کا۔ زلیخا بھی سمجھ گئی اور روز روز کے طعنے سُنتے سُنتے تنگ آ گئی، آخر اس نے ایک دن ارادہ کیا کہ میں ایک دفعہ ان سارے طعنوں کا جواب دے دوں تو اس نے بیگماتِ مصر کو چائے کی پارٹی دی۔ چائے کا لفظ میں نے اس لئے کہا کہ کھانے کے سوا جو پارٹی ہوتی ہے چائے کی کہلاتی ہے، چاہے اس زمانے میں چائے ہو یا نہ ہو، مگر بہر حال وہ پارٹی تھی، کھانے کی نہ تھی، بلکہ وہ تفریحی پارٹی تھی اور کچھ تقلّہ کی چیزیں اس میں رکھی گئی تھیں، پھل فروٹ وغیرہ بہتر سے بہتر چنے گئے تھے، بہر حال ملکہ تھیں بادشاہ کی بیگم تھیں تو اس کے ہاں کیا کمی تھی! بڑا دسترخوان سجایا، پھل، فروٹ، مٹھائیاں اور جو اس زمانے کے تکلفات تھے سب رکھے گئے۔ پھل کاٹنے کے لئے چھریاں رکھی گئیں اور بیگماتِ مصر کو دعوت دی گئی، تمام وزراء زادیاں، امیر زادیاں اور انکی بیگمات آئیں اور خوب اپنا اپنا بناؤ سنگھار کر کے عمدہ لباس اور زیورات پہن کر آئیں۔ مقصد یہ تھا کہ شاید یوسف کی نظر پڑ جائے، مجھے ہی پسند کر لے، ہر بیگم یہ چاہتی تھی تو انتہائی آراستہ پیراستہ ہو کر بہترین زیورات اور لباس پہن کر جمع ہوئیں۔ دسترخوان سجایا گیا، جب زلیخا نے دسترخوان پر سب کو بٹھلایا تو یوسف علیہ السلام کو ایک کمرے میں چھپا دیا اور کہا جب میں کہوں تو باہر آئیں پہلے باہر نہ آئیں۔ یوسف علیہ السلام اندر بیٹھ گئے۔ خیر بیگماتِ مصر بیٹھیں، قرآن کریم میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا کہ: ﴿ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ﴾ ① بیگماتِ مصر نے زلیخا کو طعنے دینے شروع کئے کہ اپنے غلام پر عاشق ہوگئی، شرم آنی چاہئے ﴿ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ ② ہم تو اسے گمراہ سمجھتے ہیں بھلا غلام پر بھی عاشق ہونے کے کوئی معنی ہیں! ﴿ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ ﴾ ③ جب زلیخا نے پہچان لیا کہ طعنہ دینا محض اس لئے ہے کہ میرا دل اتر جائے یوسف سے اور یہ یوسف پہ قابو پالیں ﴿ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً ﴾ ④ تو دسترخوان تیار کیا، پھل فروٹ سجائے ﴿ وَاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا ﴾ ⑤ ہر ایک کے سامنے ایک ایک چھری رکھ دی کہ پھل کاٹیے اور کھائیے۔ جب انہوں نے چھریاں ہاتھ میں لیں اور پھلوں کو تراشنا شروع کیا۔ ایک دم یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ باہر آ جائیں۔ یوسف علیہ السلام باہر آئے، ان کا حسن و جمال دیکھنا تھا کہ بیگمات اتنی مبہوت ہوئیں کہ آپے سے باہر ہوگئیں، بجائے پھل کاٹنے کے کسی نے انگلی کاٹ لی، کسی نے خونچہ کاٹ لیا، کسی نے بازو کاٹ لیا، سب لہولہان ہوگئیں اور یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال دیکھ کر انہیں اپنے آپ کا ہوش نہ رہا۔ جب

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۰. ② ایضا ③ ایضاً، الآیۃ: ۳۱. ④ ایضا ⑤ ایضاً.

یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو بہت بھاری اور بڑا سمجھا اور ہوش وحواس کھو بیٹھیں اور ہاتھ کاٹ ڈالے ﴿وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ① اور کہا کہ واللہ یہ بشر نہیں، کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اترا ہے۔ یہ حسن وجمال بشر میں کہاں ہے! یہ خوبصورتی، یہ نزاکت، یہ قدِ رعنا اور یہ زیبائش!!! یہ کہاں بشر ہوسکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہ کوئی فرشتہ ہے۔ جب تعریف میں رطب اللسان ہوئیں تو زلیخا نے کہا: یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیا کرتی تھیں، میں نے تو نہ کبھی انگلی کاٹی اور نہ ہاتھ کاٹا، تم کو کیا مصیبت آئی کہ تم نے انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ میرے ساتھ روز یوسف ہیں مگر میں اپنے آپے میں ہوں، تم نے ایک نظر دیکھا اور آپے سے باہر نکل گئیں۔ تو جب تمہاری یہ حالت ہے اگر میری یہ حالت ہوگئی ہے تو طعنے کی کونسی بات ہے؟ تمہیں طعنے دینے پر شرم آنی چاہیے کہ میں غلام پر عاشق ہوگئی، پھر تم کیوں عاشق ہوئیں؟ تم پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ اب بے چاری بیگمات چپ ہوگئیں، اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں، پھر کسی کی زبانِ طعن وتشنیع نہیں کھلی، زلیخا چھوٹ گئیں اور ہمیشہ کے لئے چھٹکارا ہوگیا۔ یہ تو وہ واقعہ بیان ہوا جو قرآن کریم نے یوسف علیہ السلام کے حسن کے بارے میں بیان کیا۔

حسنِ یوسف علیہ السلام پر جمالِ محمدی علیہ السلام کا تفوق..... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیا فرماتی ہیں؟ مجھے وہ سنانا ہے، مذکورہ واقعہ تو اس کے لئے تمہید تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ بیگماتِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تھا تو ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، اگر میرے محبوب کو دیکھتیں تو دلوں کے ٹکڑے کر ڈالتیں، یہ گویا صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرق بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جمال حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن وجمال سے زیادہ تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حدیث میں فرمایا کہ آدھا حسن پوری دنیا کو دیا گیا اور آدھا یوسف علیہ السلام کو، تو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ساری دنیا کے مجموعے کو حسن دیا گیا اتنا تنہا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حسن دیا گیا اور یوں وہ یوسف علیہ السلام سے بھی بڑھ کر ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کہاوت صحیح ہے کہ بیگماتِ مصر نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو انگلیاں کاٹ ڈالیں، میرے محبوب کو دیکھ پاتیں تو دل صحیح سالم نہ رہتے بلکہ دلوں کے ٹکڑے کر ڈالتیں۔ اس سے جمالِ محمدی کا اندازہ ہوا۔ یوسف علیہ السلام کے بارے میں ''حسن'' کا لفظ استعمال کیا ''فَاِذَا قَدْ اُعْطِيَ شَطْرُ الْحُسْنِ'' ② آدھا حسن پوری دنیا کو دیا گیا (اور آدھا حسن حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ''جمال'' کا لفظ استعمال کیا گیا، جمال برتر ہوتا ہے حسن پر۔ حسن کہتے ہیں قد وقامت کی موزونیت کو کہ ہر عضو اور ہر جوڑ بند اپنی جگہ اتنا مکمل ہو کہ نگاہیں نہ پھریں، وہاں سے ہٹنے نہ پائیں، وہ حسن نظروں پر مجموعی طور پر قابو پالے۔ تو حسن کہتے ہیں رنگ کی سفیدی اور ظاہری نقشے کے اچھے ہونے کو اور جمال کہتے ہیں مجموعۂ قد کے تناسب کو، اعضاء

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء ص: ۷۰۵ رقم: ۴۱۱.

کے جوڑ بند کے درست ہونے کو اور اپنی اپنی جگہ موزوں ہونے کو، انگلی دیکھو تو معلوم ہو کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی، ناک دیکھو تو معلوم ہو کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتی، ہر ہر عضو اتنا موزوں، اتنا کامل کہ اس سے آگے کمال کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اسے کہتے ہیں جمال۔ تو جمال فائق ہے حسن کے اوپر، بڑھا ہوا ہے حسن سے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے لئے جمیل کا لفظ بولا گیا، حسین کا لفظ نہیں بولا گیا "اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ" اللہ خود بھی جمیل ہے، جمال والے کو پسند بھی کرتا ہے۔ ① یہ نہیں کہا گیا کہ "اِنَّ اللّٰہَ حَسِیْنٌ یُحِبُّ الْحُسْنَ" اللہ حسن والا ہے حسن والے کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے کہ حسن کہتے ہیں حسن صورت کو اور جمال کہتے ہیں جمالِ ذات کو کہ ذات بالکل موزوں اور مناسب ہے اور حسن کے معنی صورت اور اچھا رنگ ہیں۔ بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جمال دیا گیا تھا، اس لئے احادیث میں جہاں آپکے جمال کا ذکر ہے تو ان میں آپ کے ایک ایک عضو کی تعریف ہے، بال ایسے تھے، دندان مبارک ایسے تھے جیسے موتی پروئے ہوئے ہوں، بال نہ بالکل لٹکے ہوئے نہ بالکل خمیدہ، کچھ لٹکے ہوئے کچھ گھنگھریالے، تو لٹکے ہوئے بھی اور چھلے دار بھی۔ بالکل لٹکے ہوئے بال ہوں تو یہ حسن نہیں سمجھا گیا، اور بالکل لٹکے ہوئے نہ ہوں بلکہ چھلے چھلے پڑے ہوئے ہوں تو یہ بھی حسن نہیں سمجھا گیا۔ گھنگھریالے بھی ہوں اور پھر کچھ لٹکے ہوئے بھی ہوں کہ دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو اسے جمال کہتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، کچھ لینے کے لئے آپ نے دست مبارک دراز فرمایا، چادر مبارک اتر گئی اور بغلیں کھلیں تو فرماتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چاندی کی کوئی شفاف چیز رکھی ہوئی ہو کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ② گردن کے متعلق تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے عاج کی ہو یعنی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ہو، اس قدر صاف اور ستھرا اس کا رنگ تھا۔ تو جس چیز پر نگاہ پڑ جاتی تھی نگاہ ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ بہر حال احادیث میں آپ کا سراپا ذکر کیا گیا ہے اور شمائل پر مستقل کتابیں لکھی گئیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُخِ زیبا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قد و قامت اور سراپا کی تعریف بھی کی گئی ہے امام ترمذیؒ نے ایک مستقل کتاب شمائل ترمذی کے نام سے لکھی ہے، اس میں وہی احادیث ذکر کی گئی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جمال کا اور حسن کا ذکر ہے، جو مستقل روایتوں کا ذخیرہ ہے۔

سیرت کی حقیقت اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... تو بہر حال ۱۲ ربیع الاول کو ایک ذاتِ مقدس کو اللہ نے نمایاں کیا کہ اس سے زیادہ حسین و جمیل نہ پہلے عالم میں پیدا ہوئی تھی نہ بعد میں پیدا ہوگی، ایک کامل نقشہ انسانیت کا ایسا پیش کیا گیا کہ اس سے زیادہ حسین و جمیل نقشہ دوسرا نہیں ہے اور یہ تو قاعدہ کی بات ہے کہ جیسا سانچہ ہوتا ہے ویسی ہی اس میں چیز ڈھلی ہوتی ہے، سانچہ مکمل ہے تو جو چیز ڈھلے گی وہ بھی مکمل ہوگی۔ سانچہ اگر بے

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه، ص: ۶۹۳ رقم: ۲۶۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصلوة، باب رفع الیدین فی الدعاء، ص: ۳۸۱ رقم: ۲۰۷۴.

پینڈ کا ہے تو جو اس میں ڈھالو گے وہ بھی بے پینڈ کا ہوگا تو جب سراپا، قد وقامت اور نقشہ وقالب مکمل تھا تو حقیقت بھی تو اتنی ہی مکمل آنی چاہئے تھی، اس لئے جیسے جمال بے نظیر تھا، ویسے ہی کمال جو اس میں بھرا ہوا تھا، وہ بھی بے نظیر تھا، اس کمال ہی کا نام سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اسی کمال سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائل پیدا ہوئے، تو ایک ہے شمائل، شمائل کہتے ہیں ظاہری اوصاف کو، اور خصائل کہتے ہیں باطنی خصلتوں کو، یعنی اخلاق کو، عادات کو، کمالات کو۔ تو جب شمائل اعلیٰ ہوں گے تو خصائل بھی اعلیٰ ہوں گے۔ نقشہ بے نظیر تھا، تو جو چیز ڈھلی ہوئی تھی وہ بھی بے نظیر تھی، جیسے صورت اعلیٰ تھی ویسے ہی سیرت بھی اعلیٰ تھی۔ اس واسطے میں نے عرض کیا صورت خود مقصود نہیں ہوتی، صورت سیرت کے دکھلانے کا آئینہ ہوتی ہے۔ صورت پہچاننے کا ذریعہ ہوتی ہے، کسی شخص کو دیکھ کر جب آپ اس کو پہچان لیتے ہیں تو صورت دیکھ کر ہی اصلیت پہچانتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے یعنی اس کی حقیقت کیسی! اس کی عادات کیسی اور اس کی باتیں کیسی ہیں! تو پہلا ذریعہ پہچاننے کا صورت ہے، تو ذریعۂ تعارف ہے صورت۔ حقیقت میں جو چیز پہچاننے کی ہے وہ صورت کے اندر ڈھلی ہوتی ہے اور اس کا نام سیرت ہے۔ تو صورتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہچاننے کا وسیلہ بنی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ولادتِ جسمانی ذریعہ بنی ولادت روحانی کے پہچاننے کا تاکہ اس ذات کو ظاہر کیا جائے۔ اس ذات سے دنیا کے لئے پھر کمالات نمایاں ہوں تاکہ دنیا ان کمالات پر چل کر خود سعادت حاصل کرے، تو اصل چیز سیرت ٹھہر جاتی ہے۔

سیرتِ مقدسہ اور عصمتِ انبیاء کا جزوِ اوّل...... سیرتِ مقدسہ میں سب سے پہلا جز جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کا آتا ہے وہ عصمت ہے۔ اہل سنت والجماعت اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نبوت ملنے سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں...... یعنی وہ پہلی زندگی میں بھی گناہ نہیں کرسکتے اور نبوت ملنے کے بعد تو معصومیت نمایاں ہے، پھر تو گناہ کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ اگر نبی کی زندگی میں کوئی ادنیٰ گناہ کا بھی تصور ہو تو پھر اس کی زندگی نمونہ نہیں بن سکتی، جو لوگ اس کے مطابق عمل کریں گے احتمال ہوگا کہ یہ چیز غلطی سے کی ہو، یہ چیز ممکن ہے...... گناہ ہو، تو چونکہ امتی کے لئے نبی کی زندگی قول وفعل میں نمونہ بنتی ہے، ہر شخص نبی کے قول وفعل پر عمل کرنے کا پابند ہے، تو یہ جبھی کرسکتے ہیں کہ جب ہر قول وفعل اتنا پاک اور مقدس ہو کہ اس میں نافرمانی کا شائبہ تک نہ ہو، کسی گناہ کا شائبہ نہ ہو، کسی معصیت کا احتمال نہ ہو، اگر نبی کی زندگی میں گناہ اور معصیت کا احتمال ہوگیا تو زندگی بے اعتبار ہو جائے گی۔ پھر وہ نمونہ اور تقلید کے قابل نہیں رہے گی۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کو حق تعالیٰ معصوم پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے گناہ نہیں ہوسکتا۔

انبیاء کے معصوم ہونے کی فطری وجہ...... انبیاء سے گناہ کیوں نہیں ہوسکتا! اسکی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو انبیاء علیہم السلام کی طینت اور مادہ اتنا پاک رکھا جاتا ہے کہ اس کے اندر گناہ کی کھپت نہیں ہوتی۔ حدیث میں نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے: کہ انبیاء علیہم السلام پیدا تو کئے جاتے ہیں مٹی سے، لیکن ان کی مٹی میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہوتا ہے۔ ترابِ جنت (جنت کی مٹی) سے ان کا بدن بنایا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب جنت کی مٹی کا عنصر شامل کر دیا گیا اور دنیا کی مٹی معمولی درجہ میں ہے، غالب حصہ وہ ہے جو جنت کی مٹی ہے تو جنت کی مٹی سے ...... پاک مٹی دوسری نہیں ہوسکتی، اِس خاک کے اندر کدورت ہے اور اُس خاک کے اندر طہارت اور پاکیزگی ہے، لطافت اور نورانیت ہے۔ تو گویا انبیاء علیہم السلام جنتی الاصل ہوتے ہیں، ان کی اصل جنت کی ہے، ہماری اصل اس دنیا کی ہے۔ ہم اپنی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ گناہ کی لذتوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام اپنی اصل کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ پاکی، طہارت، نیکی اور تقویٰ وتقدس کی طرف بڑھتے ہیں۔ مثل مشہور ہے "کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ" ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے، جو اصلیت ہوتی ہے اس میں وہ ظاہر ہوتی ہے۔ تو انبیاء میں اصلیت جنت کی مٹی ہے اس لئے دنیا میں رہ کر بھی ان کا قلب رجوع رہتا ہے جنت کی طرف، دنیا کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا۔ اپنی اصل کی طرف جاتے ہیں۔ تو جنت کی مٹی چونکہ پاک ہے، اس واسطے نیک طینت ہونے کی بناء پر انبیاء علیہم السلام کے اندر گناہ کا تصور تک نہیں ہوتا۔ جب تصور ہوگا پاکی کا ہوگا، اسی لئے نبی کی طبیعت اتنی پاک بنتی ہے کہ طبیعت کو جب بھی آزاد چھوڑ دیں خیر ہی کی طرف جائے گی، اصلاح ہی کی طرف جائے گی، نیکی ہی کی طرف چلے گی ...... کبھی شر کی طرف نہیں جائے گی، نیک عمل ہی کی طرف جائے گی۔ آپ کے عرف میں کہاوت ہے جو آدمی نیک ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ "بہت نیک طینت آدمی ہے" یعنی معلوم ہوتا ہے مٹی بہت اچھی ہے کوئی برائی کا کام کرتا ہی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جوہر اگر پاک ہو تو پھر اس سے افعال بھی پاک ہی سرزد ہوں گے۔ اور جوہر میں اگر کدورت ہو تو افعال میں بھی کدورت ہوگی۔ تو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں جنت کی مٹی شامل ہوتی ہے اور غلبہ اسی کا ہوتا ہے اس واسطے ان کی سیرت اتنی پاک ہوتی ہے کہ طبیعت پاک بنتی ہے، نبی کی طبیعت کو جب چھوڑا جائے تو خیر کی طرف ہی چلے گی، بدعملی کی طرف نہیں جائے گی۔ رُخ ہی طبیعت کا یہ ہے تو انبیاء علیہم السلام چونکہ نیک طینت اور پاک طینت ہوتے ہیں اس لئے طبیعت بھی پاک ہوتی ہے۔ اس طبیعت سے جو بھی وہ عمل کریں گے نیک ہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت جو اترتی ہے تو نبی کی طبیعت پر اترتی ہے ...... جتنے افعال انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتے ہیں وہ افعال ہی شریعت بنتے ہیں۔ نبی کا کہا ہوا اور کیا ہوا ہی تو شریعت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو کہہ دیا وہ نمونہ اور شریعت بن گیا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بات کریں اس طرح تم بات کرو، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سوتے تھے ...... اس طرح آپ کو سونا چاہیے، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کھانا کھاتے تھے ...... اس طرح آپ کو کھانا کھانا چاہیے، جس طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہنستے تھے آپ کو بھی یوں ہی ہنسنا چاہیے۔ یہ ہنسنا، بولنا، کھانا اور پینا طبیعت ہی کے افعال ہیں اور جب حضور کے یہ سارے افعال نمونہ ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ شریعت نبی کی طبیعت کے اوپر اترتی ہے، جو نبی کہہ دے وہ شریعت، جو کر کے دکھلا دے وہ شریعت، تو جب تک طبیعت اتنی مقدس اور پاک نہ ہو کہ اس میں برائی کا شائبہ نہ ہو تو شریعت کیسے بنے گی؟ اس لئے نبی کی طبیعت پر شریعت اترتی ہے اور نبی کی عقل پر علم اُترتا ہے کہ اس طبیعت سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ شریعت ہو جاتے ہیں اور علم کے بارے میں نبی کے اقوال جو ہوتے ہیں وہ وحی ہوتے ہیں کیونکہ عقل کامل پر وحی آتی ہے تو علم بھی انبیاء علیہم السلام کا کامل، عمل بھی کامل تو...... بہر حال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم ہیں: اولاً تو اس لئے کہ طبیعت پاک پیدا کی گئی؟ اس لئے کہ جو ہر پاک رکھا گیا، جنت کی پاک مٹی سے انبیاء کے بدن کو بنایا گیا کہ جب بھی وہ چلے گا نیکی کی طرف چلے گا، اولاً تو اس وجہ سے معصومیت آتی ہے کہ گناہ کی طرف نبی کی طبیعت رجوع ہی نہیں ہو سکتی، یہ فطری بات ہے۔

عصمتِ انبیاء علیہم السّلام کا دوسرا جزو...... دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اللہ کے جلال اور جمال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ان کا قلب ہر وقت اللہ میں منہمک اور اس کی محبت میں غرق ہوتا ہے اور اتنی کامل محبت حاصل ہوتی ہے کہ گویا ہر وقت وہ حق تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ بادشاہ کے دربار میں اگر آپ جائیں اور نگاہوں کے سامنے بادشاہ ہو کیا اس وقت آپ کو تصور آئے گا کہ آپ اس بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کریں؟ جب کہ بادشاہ کی عظمت سامنے، اقتدار سامنے اور شاہی تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا ہے تو نافرمانی کرنا تو بجائے خود ہے...... آپ کی یہ بھی جرأت نہ ہوگی کہ نگاہ ادھر ادھر بھی پھیریں۔ ادب کے ساتھ نگاہ نیچی رہے گی۔ بادشاہ سامنے موجود ہے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں تو جب ایک معمولی بادشاہ کے مشاہدہ کا اثر انسان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ نہ بے ادبی کر سکتا ہے اور نہ ہی شاہی دربار میں گستاخی کر سکتا ہے، نہ نافرمانی کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ جس ذات کو ہو اور ہر وقت رہے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی پر آمادہ ہو! کس طرح ممکن ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے یا منشاءِ حق کے خلاف کرے۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام مشاہدہ کے سبب سے بھی معصوم ہوتے ہیں تو ایک معصومیت آتی ہے جوہر (مٹی) کی پاکی کی وجہ سے، دوسری معصومیت آتی ہے مشاہدۂ حق کی وجہ سے کہ اللہ کا جلال و جمال سامنے ہے، ہر وقت اللہ کے سامنے ہیبت زدہ ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کریں! آپ کو یقین ہے کہ سنکھیا سے موت آتی ہے۔ انسان کبھی جرأت نہیں کر سکے گا کہ سنکھیا کھالے۔ جہالت سے یا لاعلمی سے کھالے تو کھالے، لیکن اگر علم ہے کہ سنکھیا سے موت آتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سنکھیا ہے تو آدمی اس سے دور چلے گا کہ ایسا نہ ہو کہ اس کا دھواں میرے ناک میں چلا جائے اور میں موت کے قریب ہو جاؤں۔ اس لئے کہ آپ کو علم ہے کہ سنکھیا موت لانے والا ہے حالانکہ آپ نے تجربہ نہیں کیا کہ سنکھیا کھا کے دیکھا ہو اور آدمی کا انتقال ہوا ہو اور انتقال کے بعد دوبارہ پتہ چل گیا ہو، تو تجربہ عملاً نہیں ہے محض دوسروں سے سننے پر یقین ہے۔ تو جب دوسروں کے سننے پر یقین ہو جائے اور آدمی اس پر بھی کھانے کے لئے آگے نہ

بڑھے تو انبیاء علیہم السلام کے لئے تو سنی سنائی نہیں، بلکہ اللہ کے جلال و جمال کا آنکھوں دیکھا یقین ہے اور وہ مشاہدہ کررہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کریں اور اپنے بھی یقین کے خلاف کریں!۔

تو دو باتیں ہوئیں ایک یہ کہ طینت (مٹی) پاک ہے اس کی وجہ سے نبی کی طبیعت کبھی شر کی طرف نہیں جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مشاہدۂ حق ان کے سامنے رہتا ہے۔ ہر وقت اللہ کی عظمت، اس کا قہر، اس کا جلال، اس کی رحمت اور اس کی شان جلال و جمال آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے، گویا نبی ہر وقت دربارِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے۔ تو شاہی دربار میں رہ کر بادشاہ کی خلاف ورزی اور بادشاہ کی نافرمانی کا تصور نہیں آسکتا، پھر کیسے ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہ کی طرف چل پڑیں!۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا جُزوِ سوم...... اور تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ اوّل تو طینت پاک، پھر مشاہدہ حق اور اس کے ساتھ ساتھ حفاظتِ خداوندی بھی شامل ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت بشریت کے تقاضے سے طبیعت مائل بھی ہو جائے تو اللہ کی حفاظت ہوتی ہے کہ نبی گناہ کر نہیں سکتا اور اس کی زندگی پاک رہتی ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ زلیخا نے جب سات کمرے بنوائے اور یوسف علیہ السلام کو اندر بلایا اور تمام کمروں کے تالے لگوا دیئے تو اس کے بعد اپنی بات اور مقصد سامنے رکھا۔ قرآن کریم کہتا ہے: ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾ [1] کہ زلیخا نے بھی ارادہ کیا اور یوسف علیہ السلام نے بھی۔ یعنی بتقاضائے بشریت وسوسہ کے درجہ میں ایک چیز دل میں آئی، فرمایا ﴿لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ [2] ہوسکتا تھا کہ یوسف مبتلا ہو جائیں یعنی ارادہ کرلیں، عملاً تو نہیں کرسکتے تھے، مگر ارادۃً۔ مگر خدا نے حفاظت کی کہ وسوسہ سے بھی دور رہے۔

یوسف علیہ السلام کی وسوسے سے حفاظت کا طریقہ...... یہ حفاظت کیسے ہوئی؟ حدیث میں ہے ممکن تھا کہ یوسف علیہ السلام کے دل میں خواہش کا وسوسہ پیدا ہو...... لیکن جو چھت کی طرف نگاہ اٹھائی تو یعقوب علیہ السلام کا چہرۂ مبارک چھت پہ نظر پڑا جو دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی یوسف علیہ السلام بھاگے۔ وہاں سات دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ جس دروازے پر پہنچے تالا ٹوٹتا گیا، دروازہ کھلا آگے پہنچے...... وہ بھی دروازہ کھلا، آخر ساتوں کمروں سے باہر آگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے انبیاء علیہم السلام کی طینت پاک ہے اور جیسے مشاہدۂ جلال و جمال کی وجہ سے حق تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرسکتے، اسی طرح حفاظتِ خداوندی بھی شاملِ حال ہوتی ہے کہ اگر بمقتضائے بشریت کوئی بات وسوسہ کے درجہ میں آئے تب بھی وہ عمل نہیں کرسکتے، اللہ ان کو محفوظ رکھتا ہے۔

قبل از نبوت بھی نبی معصوم ہوتا ہے، حضور کا ایک شادی میں شرکت کا واقعہ...... حدیث میں ہے کہ آپ نے خود اپنا واقعہ بلکہ دو واقعے ارشاد فرمائے، جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ نبوت سے پہلے بھی نبی معصوم ہوتے

---

[1] پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴.
[2] پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۲۴.

ہیں تو حفاظتِ خداوندی کی مثال دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ میری عمر چودہ سال کی تھی، مکہ میں قریش میں کوئی شادی تھی اور شادی بڑے گھرانے میں تھی، تو ناچنے گانے کا بھی کچھ سامان تھا۔ جب دولت بڑھتی ہے تو اسی قسم کی خرافات لوگوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ مفلسی رہے اور کچھ دولت کم ہو تو سیدھا سادھا شادی بیاہ کا معاملہ ہو جاتا ہے، لیکن دولت بڑھتی ہے تو طغیانی اور سرکشی بھی بڑھتی ہے۔ اگر حق تعالیٰ حفاظت نہ فرمادیں اور کسی کے دل میں صلاحیت نہ ہو تو دولت آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ تو وہاں بھی یہ ہوا کہ دولت مند گھرانہ تھا، ہونا تو یہ تھا کہ روٹی کی سوجھتی، سو جھی یہ کہ شادی میں کچھ رنگ ہو، کچھ ناچ ہو، کچھ تعیش ہو اور کچھ کھیل تماشے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ قریش کے ہم عمر نو جوان کچھ لڑکے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا: چلو وہاں شادی ہے اور قریش کی برادری ہے ہم بھی شادی میں چلیں۔ یہ تفصیلات تو آپ کے سامنے نہیں تھیں کہ وہاں ناچ رنگ ہوگا، مگر یہ تھا کہ بہر حال تھوڑی بہت کچھ رنگ رلیاں ہوں گی تو لڑکپن کے زمانے میں اس طرف طبیعت کا میلان ہو جانا کوئی عجب بات نہیں ہے۔ دس بارہ برس کے بچوں نے کہا کہ ہم بھی شادی میں شریک ہوں اور وہاں کھیل تماشے بھی ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ساتھ چلا گیا، کھیل تماشے شروع ہونے کا وقت رات کا تھا، جیسے ہمارے ہاں بھی ان کاموں کے لیے عشاء کے بعد رات کا وقت ہوتا ہے، تو عشاء کے بعد ناچ رنگ تھے تو فرماتے ہیں کہ میں جاکے بیٹھ گیا، ابھی پروگرام شروع نہیں ہوئے تھے کہ مجھ پر اتنی شدید نیند طاری ہوئی کہ بیٹھنا میرے قبضہ میں نہ رہا اور میں سو گیا۔ ساری رات سوتا رہا مجھے خبر نہیں کہ ناچ ہوا یا گانا ہوا اور رنگ رلیاں منائی گئیں یا کیا قصہ ہوا! پوری رات اللہ نے میری حفاظت کی اور جب میں اٹھا ہوں تو سننے میں آیا کہ بہت باجے گاجے بجے، بہت گانے باجے بجائے گئے، بہت ناچ رنگ ہوئے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں لیکن مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ ① یہ تھی حفاظتِ خداوندی۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ارادے سے بھی نہیں گئے تھے کہ وہاں ناچ رنگ میں شریک ہوں گے مگر یہ ضرور تھا کہ کچھ کھیل تماشہ ہوگا تو بارہ تیرہ برس کی عمر میں کسی کھیل تماشے کے لئے بچہ جائے یہ کوئی بری چیز نہیں ہوتی، اتنا قلب مبارک میں آیا کہ کچھ کھیل تماشہ ہے لیکن کھیل ناجائز قسم کا تھا، اس لئے کہ اس میں باجے تھے۔

مزامیر کی ممانعت اور دف کی اجازت کی توجیہ...... اور حدیث میں مزامیر کی ممانعت فرمائی گئی ہے اگر اجازت دی گئی ہے تو دف کی اجازت ہے، کہ نکاح ہوا اس میں دف بجادی تو اس میں کچھ تعیش نہیں ہوتا بلکہ کانوں کو اور بھی تکلیف ہوتی ہے راحت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ جبکہ ستار میں یا ہارمونیم میں تعیش اور غفلت کی بات ہوتی ہے، وہ دف کے اندر نہیں ہوتی۔ مگر وہاں مقصود حقیقت میں دف بجانا بھی نہیں وہ تو اعلان مقصود ہوتا ہے کہ نکاح ہو

---

① اخبار مكة للفاكهي، ج: ۴، ص: ۳۹۵، رقم: ۱۶۶۱، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: تاریخ الاسلام للامام الذهبیؒ، مقدمة باب ماعصم من امر الجاهلية، ج: ۱ ص: ۱۶.

دف بجادو تا کہ اعلان ہو جائے تو بہر حال دف اور چیز ہے، باجے گانے اور چیز ہیں کیونکہ شرعاً ممنوع ہیں۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ نے میری حفاظت کی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ باجا بجا ہے یا ناچ گانا ہوا ہے۔ ایک تو یہ واقعہ ہے جس سے واضح ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی جیسے طینت پاک ہے جس کی وجہ سے وہ گناہ نہیں کرتے اور جیسے انہیں مشاہدہ ہوتا ہے؛ اللہ کے جلال و جمال کا جس کی وجہ سے گناہ نہیں کرتے، ویسے ہی اللہ کی حفاظت بھی شامل حال ہوتی ہے۔ اگر کبھی بشری تقاضے سے وسوسہ بھی قلب میں آئے تو اللہ کی حفاظت گناہ ہونے نہیں دیتی اس کی نظیر ایک تو یہ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

قبل از نبوت بیت اللہ کی تعمیر کا واقعہ...... دوسرا واقعہ پیش آیا کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف غالباً ۲۵ برس کی تھی، مکہ مکرمہ میں ایک سیلاب آیا اور مکہ چونکہ نشیب میں ہے، چاروں طرف پہاڑ ہیں، بارشیں تو بہت کم ہوتی ہیں مگر جب زیادہ ہوتی ہیں تو سارا پانی حرم میں آجاتا ہے اور بیت اللہ بالکل بیچ میں ہے گہرائی میں تو سیلاب آیا اور بیت اللہ کے اندر پانی داخل ہو گیا، جس کی وجہ سے دیواروں کے اندر کا چونا بھی نکل گیا، بنیادیں گر گئیں، ایسا ہو گیا گویا پتھر اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے، مصالحہ باقی نہیں رہا، اندیشہ تھا کہ دیواریں گر جائیں۔ قریش نے ارادہ کیا کہ بیت اللہ کی از سرِ نو تعمیر کریں، اس کے لئے چندہ جمع ہوا مگر اس زمانے کے قریش باوجودیکہ شرک میں مبتلا تھے اور انتہائی بدعملیوں کا شکار تھے، لیکن اللہ کے گھر میں مشتبہ مال لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو ڈکیتی بھی مارتے تھے سود اور سٹہ وغیرہ بھی کرتے تھے، جائز و ناجائز ہر طرح کی کمائی تھی۔ لیکن باوجود اس شرِ نفس کے...... ان میں یہ احساس تھا کہ خدا کا گھر پاک کمائی کا مستحق ہے، اس میں کوئی مشتبہ کمائی نہیں آنی چاہیے۔ تو چندہ لینے دینے میں یہ عہد کیا گیا کہ مال ڈکیتی کا نہ ہو، سود کا نہ ہو اور بیواؤں کا نہ ہو، کمائی وہی ہونی چاہیے جو خالص حلال کے ذریعے ہو جو ہم اپنی تجارت کے ذریعے اور زراعت کے ذریعے کماتے ہیں۔ اس کو لے کر جو چندہ جمع کیا گیا تو وہ اتنا نہیں ہو سکا کہ بیت اللہ کی تعمیر ابراہیمی بنیادوں کے اوپر کی جائے۔ تو اسے گوارا کیا کہ پوری تعمیر نہ ہو حطیم کا حصہ چھوڑ دو، حطیم کو چھوڑ کر پھر بیت اللہ کی تعمیر کرو تو چندہ کافی ہو جائے گا۔ چنانچہ آج بھی وہ حصہ حطیم کا چھوٹا ہوا ہے۔ جو حج کر کے آئے ہیں انہوں نے دیکھا ہو گا کہ جو بیت اللہ شریف کے متصل ایک گول دائرہ سا بنا ہوا ہے، جس میں حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ علیہما السلام کی قبریں ہیں، اس کے درمیان اور بیت اللہ کے درمیان میں تقریباً پونے دو گز کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، وہ بھی بیت اللہ کا حصہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جو خود بنا (تعمیر) کی تھی اور تعمیر بنائی تھی اس میں وہ حصہ بھی بیت اللہ کے اندر شامل تھا، لیکن قریش کا چندہ اتنا نہیں ہو سکا کہ پوری بناءِ ابراہیمی پر تعمیر کر دیں، اس لئے اس حصہ کو چھوڑ دیا اور چھوڑ کر خالص کمائی سے بیت اللہ کو تعمیر کر دیا (۱)۔ یہ تو تھی نیک بات کہ پاک کمائی لگنی چاہیے اللہ کے گھر میں مشتبہ کمائی نہ لگے۔

مگر ایک حرکت جہالت کی بھی تھی، آخر تھے تو جہلائے عرب ہی، کوئی اسلام کی روشنی تو آئی ہی نہیں تھی۔ انہوں

نے یہ سوچا کہ بیت اللہ کی ہم تعمیر کریں اوران کپڑوں میں کریں جن میں رات دن گناہ کرتے ہیں، جن میں رات دن معصیتیں کرتے ہیں، سیاہ کاریاں کرتے ہیں، ان کپڑوں کے اندر کیسے تعمیر کریں! لہٰذا ننگے ہوکر تعمیر کرو تا کہ بالکل پاکی کے ساتھ تعمیر ہو۔ یہ جہالت کا شوشہ تھا، اس واسطے کہ بالکل ننگا ہونا تو بے حیائی کی بات تھی۔ تو اگر لباس میں کوئی ناپاک حرکت کی تھی کہ کوئی گناہ کیا ہے تو ننگا ہونا بھی تو گناہ میں شامل ہے۔ تو ایک گناہ سے بچے تو دوسرے گناہ کی طرف آ گئے۔ بقول شخصے کہ ''کنوئیں میں سے نکلے تو کھائی میں جا گرے'' انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم جو گناہ کرتے ہیں تو ان کپڑوں میں تھوڑا ہی کرتے ہیں، اس بدن میں کرتے ہیں تو پھر کھال کو بھی کھینچ دینا چاہیے کہ اس کھال سے کیسے بیت اللہ کی ہم تعمیر کریں اور اس بدن سے کیسے کریں جس میں ہم گناہ کرتے ہیں۔ آخر کپڑوں نے بے چاروں نے کیا قصور کیا تھا کہ بدن تو گناہ کر کے پاک کا پاک اور کپڑے ہو گئے ناپاک! اس میں ہم نے چوری کی تھی اور ڈکیتی ڈالی تھی! بھئی کپڑے کا کیا قصور؟ قصور تو تمہاری کھال کا اور تمہارے گوشت پوست کا ہے، اُسے کھینچتے اور اُسے بدلتے...... مگر یہ جہالت کی کہ بولے: ننگے ہو جاؤ، اس لئے کہ کپڑوں نے گناہ کیا ہے تو کپڑوں کو پھینک دو۔

حضور کی حفاظت کا واقعہ...... چنانچہ برہنہ ہوکر تعمیر شروع کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب میں آیا تو قریش نے کہا: اے محمد! تم بھی شریک ہو جاؤ تعمیر میں، یہ مقدس کام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے۔ مگر قریش نے کہا: دیکھو ننگے ہو جاؤ، برہنہ ہو جاؤ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا۔ شریعت تو نہیں اتری تھی کہ یہ مسئلہ معلوم ہوتا کہ ستر کہاں تک ہے، کتنے بدن کو چھپانا واجب ہے اور کتنے کو نہیں؟ مگر نبی کی طبیعت میں ہی، فطرت میں ہی پاکی ہوتی ہے، سلامتی ہوتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ میں برہنہ ہو جاؤں۔ مگر قریش نے زور دیا کہ نہیں! جب تمہارے سارے عزیز بلکہ بزرگ لوگ بھی سب برہنہ ہوکر تعمیر میں لگے ہوئے ہیں! تمہاری عمر تو ابھی چھوٹی ہے، ابھی تم لڑکپن میں ہو، اپنے بزرگوں کی تعمیل کرو۔ فرماتے تھے میں نے کچھ ارادہ بھی کیا کہ جب یہ سب اس طرح ہیں تو میں بھی برہنہ ہوکر تعمیر کروں، میں اس ارادے اور خیال ہی میں تھا اور گویا میں نے ابھی لنگی پر ہاتھ ڈالا ہی تھا تو اچانک مجھ پر اس زور کی غشی طاری ہوئی کہ میں زمین پر گر گیا، جیسے کوئی پٹخ دیتا ہے زمین کے اوپر اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا! افاقہ اس وقت ہوا جب تعمیر مکمل ہو چکی تھی، لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ الغرض حق تعالیٰ نے مجھے برہنہ ہونے سے محفوظ رکھا۔ ① تو برہنگی فی الحقیقت ایک معصیت کی شان ہے، ستر کا کھل جانا معصیت کی شان ہے۔ اسلام میں مرد کا ستر رکھا گیا ہے ناف سے لے کر گھٹنوں تک۔ اس حصّہ بدن کو چھپانا واجب ہے، نماز کے اندر اس حصّہ میں سے کوئی حصّہ کھل جائے گا تو نماز نہیں ہوگی، چاہے کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو نماز نہ ہوگی، اس لئے کہ یہ حصّہ بدن واجب الستر ہے۔ عورت کا ستر گردن سے ٹخنوں تک ہے اس حصہ بدن سے کوئی حصہ اگر کھل جائے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔

① تاریخ الاسلام للامام الذهبي، مقدمة، باب ماعصم من امر الجاهلية، ج: ١ ص: ٦١ .

تہذیبِ مغرب کی تباہ کاریاں...... آج کل تو ہماری بہنیں جو لباس پہنتی ہیں...... بازو ہیں تو وہ الگ کھلے ہوئے، گلے الگ کھلے ہوئے، سینے کا حصہ الگ کھلا ہوا تو ایسے لباس میں نماز مطلقاً نہیں ہوتی (بشرطیکہ ہماری بہنیں نماز پڑھیں اور جو نماز کے قریب ہی نہ جائیں تو......؟) ان کی آرائش زیبائش ممکن ہے ہو جائے، لیکن اللہ کے ہاں کوئی تقریب یا قرب وطاعت اس میں نہیں ہوتی...... جب کہ یہ حصۂ بدن کھل جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: بہت سی عورتیں زمانے میں پیدا ہوں گی جو کَاسِیَاتٌ ہوں گی عَارِیَاتٌ ہوں گی، لباس پہنے ہوئے ہوں گی اور پھر بھی ننگی ہوں گی، لباس ہوگا بدن پر اور پھر بھی برہنہ ہوں گی، مَائِلَاتٌ مُمِیْلَاتٌ خود بھی مائل ہوں گی اجنبی مردوں پر اور ان کو بھی مائل کریں گی اپنے اوپر، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ عورتیں جنت میں داخل نہیں کی جائیں گی۔ ① اس لئے کہ انہوں نے فتنے کا دروازہ کھول دیا، دنیا کو جہنم میں دھکیلنے کا انہوں نے ارادہ کرلیا تو دو لفظ فرمائے گئے کاسیات عاریات لباس پہن کر پھر بھی ننگی ہوں گی۔ اس کی تین صورتیں ہیں کہ لباس پہنے ہوئے بھی ہوں پھر بھی ننگی ہوں۔

برہنگی کی تین صورتیں اور مادرزاد برہنگی کا فیشن...... پہلی صورت تو یہ ہے کہ لباس ہی نہ ہو؛ یعنی بالکل عریانی ہو، یہ بھی آج کل فیشن چلا ہے۔ یہاں مشرق میں تو نہیں آیا مگر یورپ میں اور جرمنی وغیرہ میں یہ فیشن آیا تھا اب معلوم نہیں باقی ہے یا نہیں۔ لیکن میں آج سے تیس برس قبل کی بات کر رہا ہوں کہ ایک مستقل احاطہ بنوایا گیا تھا جس کا نام ''ایوانِ فطرت'' رکھا گیا، اس میں وہ لوگ داخل ہو سکتے تھے جو بالکل برہنہ ہوتے تھے۔ کوئی لباس ان پر نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ننگے رہو، فطرتاً پیدا بھی ننگے ہوئے تو اب کیوں کپڑے پہنتے ہو؟ وہاں کی گورنمنٹ نے یہ انتظام کیا کہ ان کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ یہ عنایت کی گورنمنٹ نے کہ ان کے لئے احاطہ بنوا دیا، جو وہاں داخل ہوتا تھا ان پر پابندی ہوتی تھی کہ لباس سے داخل نہ ہوگا تو وہاں تو کَاسِیَاتٌ کا کوئی سوال ہی نہیں کہ کس پر لباس ہوگا! وہاں تو عَارِیَاتٌ ہی عَارِیَاتٌ ہیں، عریانی ہی عریانی ہے۔

لیکن حدیث جو بیان کر رہی ہے وہ: کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ ہیں کہ لباس پہنے ہوئے اور پھر بھی ننگی۔ اس کی تین صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ لباس ناقص اور ناتمام ہو، یعنی لباس پہنا ہے مگر بازو کھلے ہوئے ہیں، لباس پہنے ہوئے ہے مگر سینہ کھلا ہوا ہے، لباس پہنے ہوئے ہے مگر کمر کھلی ہوئی ہے، لباس پہنے ہوئے ہے مگر پنڈلی کھلی ہوئی ہے، تو کَاسِیَاتٌ بھی کہا جائے گا کہ لباس پہنے ہوئے ہے مگر پھر بھی ننگی ہیں، اس لئے کہ ستر کھل گیا تو عَارِیَاتٌ بھی کہا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لباس پہنے ہوئے ہو وہ گردن سے لے کر ٹخنوں تک پورا ہو، مگر وہ اتنا باریک ہو کہ لباس سے سارا بدن نظر آرہا ہو، کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں، لباس پہنے ہوئے ہیں مگر پھر بھی برہنگی اور

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب النار یدخلها الجبارون والجنة ... ج:۴ ص:۱۲۹۱.

عریانی ہے۔اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس بدن پر ہے اور پورے بدن پر ہے اور وہ باریک بھی نہیں ہے، موٹا لباس ہے مگر اتنا چست ہے بدن کے اوپر کہ بدن کی حیثیت پوری نمایاں ہے، جیسے آج کل کے بعض مہمل پائجامے دیکھے گئے ہیں جنہیں عورتیں پہنتی ہیں، یہاں سے لے کر وہاں تک بالکل بدن کے اوپر لپٹے ہوئے ہیں، جیسے کہ پونچھڑے کے اوپر کپڑا لپیٹ دیا گیا ہے۔ خدا جانے اس طریقہ میں کیا حسن و جمال ہے؟ جب لباس میں عریانی آ گئی تو سارے بدن پر چھا گئی...... سوچنے کی ضرورت ہی نہیں کرتے کہ اصلیت اور اپنی ذات کے لحاظ سے یہ کام بھلا ہے یا بُرا ہے، اک فیشن ہے بس چلنا چاہیے۔ دین کے بارے میں کوئی تقلید کرلے تو طعن کرتے ہیں کہ یہ تقلید کر رہا ہے بے شعوری سے عمل کر رہا ہے اور دنیا کے بارے میں رات دن تقلید ہے کہ ایک صدا امریکہ سے یا برطانیہ سے چلی...... آنکھ بند کر کے لوگوں نے اس کے اوپر عمل کیا تو کون سی اس میں تحقیق کرتے ہیں؟ کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نقصان ہے! کچھ نہیں بس فیشن چلنا چاہیے، تو یہی لباس چل پڑا کہ یہاں سے لے کر وہاں تک ٹانگوں سے رانوں تک پاجامہ لپٹا ہوا ہو تو اگر چہ کپڑا تو موٹا ہے مگر بدن کی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ غرض تین صورتیں ہوئیں کہ باوجود لباس کے پھر ننگا پن نمایاں ہو یا تو لباس ناتمام ہو کہ اس سے کچھ بدن ڈھکا ہوا تھا کچھ کھلا، یا لباس پورے بدن پر ہے مگر نہایت باریک کہ جس سے بدن جھلک رہا ہو، یا لباس پورے بدن پر ہے موٹا بھی ہے مگر چست اتنا ہے کہ بدن کی حیثیت نمایاں ہے۔ یہ سب کَـاسِیَـاتٌ اور عَـارِیَـاتٌ کے حکم میں ہیں۔ تو عورتوں کا لباس ایسا ہونا چاہئے کہ بدن نہ جھلکے، اگر باریک ہو تو کم از کم نیچے کوئی ایسا کپڑا ہو کہ جس سے بدن چھپ جائے یا اوپر ہی کوئی باریک کپڑا پہن لے اور اتنا چست بھی نہ ہونا چاہیے کہ بدن کی پوری حیثیت نمایاں ہو بلکہ ایسا کچھ فراخ ضرور ہو کہ بدن کی حیثیت بھی نمایاں نہ ہو اور بدن ڈھلکے بھی ناں۔

ستر اور حجاب میں فرق...... وجہ اس کی یہ ہے کہ عریانی سے شریعت نے روکا ہے ایک حصّہ بدن کھولنے کی اجازت دی ہے اور ایک حصّہ کی...... کسی حالت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ جس حصہ کو کھولنے کی اجازت دی ہے اور اس کے کھلے ہونے کی حالت میں نماز ہو جاتی ہے، وہ چہرہ ہے اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ نماز میں ہاتھ پیر ڈھانپنا عورت پر ضروری نہیں ہے یہ حصّے کھلے رہیں تو نماز ہو جائے گی لیکن گردن سے لے کر ٹخنوں تک کا کوئی حصّہ نہیں کھلنا چاہیے، یہ ستر کا حصّہ ہے۔ جیسے مرد میں ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصّہ ستر ہے جو نہیں کھلنا چاہیے۔ اب آگے جو عورت کے لئے پردہ ہے وہ حجاب کہلاتا ہے وہ ستر میں داخل نہیں ہے، کوئی اجنبی آ گیا تو نقاب ڈال لیا ورنہ ضروری نہیں ہے یا اجنبی دور اور بعید ہے کہ پہچان ممکن نہ ہو تو بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے تو حجاب کا تعلق دوسروں سے ہے اور ستر کا تعلق اپنی ذات سے ہے، حجاب جب ہوگا جب کوئی اجنبی دیکھنے والا ہوگا اور ستر ہر صورت میں ہوگا کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو ہر صورت میں حصّہ ستر چھپانا ضروری ہوگا۔ نماز میں یہ حصہ کھل جائے گا تو نماز نہیں ہوگی۔

بہر حال عریانی اور ننگے پن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو جس شریعت میں عریانی کو برا کہا گیا اس شریعت

کے لانے والے پیغمبر کیسے عریاں ہو سکتے تھے! کیسے بدن کو ننگا کرتے! تو آپ کی فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ برہنہ نہ ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے ارادہ نہیں کیا، محض کچھ وسوسے کے درجے میں ایک چیز قلب میں آئی تو حفاظتِ خداوندی شامل ہوگئی اور پھر اس طرح سے میں گرا ہوں کہ جیسے کسی نے پٹخ دیا ہو۔ یہ تھی حفاظتِ خداوندی۔

انبیاء میں عصمت جبری نہیں بلکہ ارادی ہے...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی سیرت میں نبیادی چیز عصمت اور معصومیت ہے یعنی گناہ سے پاکیزگی، تو نبوت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام گناہ نہیں کرتے اور نبوت کے بعد بھی۔ اور گناہ نہ کرسکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حق تعالیٰ مجبور کردیتے ہیں کہ وہ نہ کرسکیں اور معاذ اللہ انبیاء میں کوئی ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ کمال تو یہ ہے کہ انبیاء اپنے ارادے سے بچیں، یہ کمال ہے، مجبور ہو کر بچنا یہ کمال میں شامل نہیں ہے۔ تو اس کی صورت میں نے عرض کی کہ انبیاء اپنے ارادے سے ہی معصیت سے بچتے ہیں مگر معصیت کا ارادہ کر نہیں سکتے کیونکہ ان کے جوہروں میں معصیت کی طلب نہیں ہے جب مٹی پاک رکھ دی تو برائی کی طلب کہاں سے پیدا ہوگی؟ اور اس کے ساتھ ساتھ جب انہیں اللہ کی ذات وصفات کا مشاہدہ ہے گویا ہر وقت دربارِ خداوندی میں حاضر ہیں تو پھر برائی کا ارادہ کرنے کی ہمت کیسے ہوگی! معصیت کا ارادہ کیسے کرسکتے ہیں! اور تیسری چیز کہ اگر بتقاضائے بشریت بھی وسوسے کے درجے میں کوئی بات دل میں آئے تو حفاظتِ خداوندی انہیں گناہ کرنے نہیں دیتی، اس لئے ان کی زندگی معصوم اور پاک رہتی ہے۔

حضور کی حفاظت خداوندی کا ایک اور واقعہ...... حدیث میں ہے کہ جب آپ کے اوپر وحی آئی تو وحی آنے کے کچھ عرصہ بعد وحی کا انقطاع ہوگیا۔ اسے "فترت کا زمانہ" کہتے ہیں کہ وحی منقطع ہوگئی اور چند دن وحی آنا بالکل بند ہوگئی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر ایک انقباض اور قبض طاری ہوا اور طبیعت اس درجہ بے چین رہتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھتے تھے کہ اب زندگی بے کار ہے۔ جب وہ جلال وجمال سامنے آکر چھپ گیا تو اب زندگی بے کار ہے، اس کے بغیر زندگی کوئی چیز نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خودکشی کا ارادہ کیا کہ بس میں اپنے آپ کو ختم کرلوں۔ حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ میں چلا تا کہ پہاڑ سے اپنے کو گرالوں، تو چلنے کے وقت ہی اچانک آواز آئی: "یا محمد!" دیکھتا ہوں تو کہنے والا نظر نہیں آتا، ادھر آواز نے متوجہ کیا اور میں اس فعل (خودکشی) سے رُک گیا۔ بعد میں پھر ارادہ کیا کہ اپنے کو گرادوں یہ بھی کیا زندگی ہے! نہ وہ مشاہدہ، نہ وہ جمال اور نہ وہ تجلیات، سامنے کچھ بھی تو نہیں، کیا فائدہ اس زندگی کا! پھر ارادہ کیا کہ اپنے آپ کو گرادوں۔ پھر آواز آئی اور کسی نے بازو تھام لیا کہ کیا کرتے ہو؟ پھر میں رک گیا مگر نظر کوئی نہیں آیا۔ اس کے بعد ایک دن پھر ارادہ کیا کہ اپنے کو ختم کرلوں...... تو حضرت جبریل علیہ السلام کی صورت ظاہر ہوئی

اور اصلی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا۔ ①

معصیت کو ذریعۂ تبلیغ بنانا اصولِ تبلیغ کے خلاف ہے...... یہی ہے وہ حفاظت خداوندی، خودکشی چونکہ اس دین کے اندر ناجائز اور ممنوع تھی اور بعد میں پیغمبر ہی ارشاد فرمانے والے ہوئے کہ خودکشی حرام ہے، تو پہلے کیسے اس کا ارتکاب کر سکتے تھے! یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی داعی، کوئی واعظ اور کوئی نصیحت کرنے والا کوئی نیکی کرانا چاہے مگر یوں سمجھے کہ نیکی کا کام تب ہی کرا سکوں گا جب اتنی کچھ برائی کرالی جائے گی، کیونکہ لوگ بغیر برائی کے جمع نہیں ہونگے، جیسے باجے گاجے اور ہارمونیم سے لوگوں کو مناسبت ہے تو کچھ باجے گاجے اور ہارمونیم رکھ لیں کہ اس حیلے سے لوگ جمع ہو جائیں گے پھر میں وعظ سناؤں گا تو معصیت کو تبلیغ کا ذریعہ بنانا یہ تو نہایت ہی مضر چیز ہے اس لئے کہ آپ جب ایک دفعہ باجا بجا چکے اور لوگوں کو جمع کرلیا اور اب جو لوگوں کو منع کیا تو وہ کہیں گے جناب آپ نے کیوں بجایا تھا؟ تو کسی ایسی معصیت کو نیکی کا ذریعہ بنانا جو ناجائز اور ممنوع ہے...... یہ تبلیغ کی حکمت کے خلاف ہے۔ یہ تو اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لینے والی بات ہے۔ آج دین کے کسی مسئلہ میں تساہل کیا اور ڈھیل دے دی، کل کو اگر کوئی فتویٰ پوچھے گا تو یہ جواب دینے کا ہمارا منہ نہیں ہوگا کہ یہ ناجائز ہے، وہ تو کہیں گے یہ چیز کل آپ نے بھی کی تھی، اب آپ کہتے پھریں کہ کل یہ مصلحت تھی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ مسئلہ کے مقابلہ میں مصلحت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ سیدھا سادھا مسئلہ ہے اس پر عمل کیا جائے، کاہے کی مصلحت! مصلحت یہی کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے اس پر عمل کرو اور بس۔

تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ آئندہ حکم دینے والے تھے کہ ناچ گانا ممنوع ہے، خودکشی کرنا حرام ہے تو خود کبھی بھی اس کا ارتکاب نہیں فرما سکتے تھے۔ وسوسے کے درجہ میں ایک بات آئی بلکہ وہ بھی خیال گذراں کے طور پر...... تو فوراً حفاظتِ خداوندی شامل حال ہوگئی۔ اپنے نبی کو ایسی چیزوں سے بچایا کہ کل نصیحت کرنے کا منہ رہے۔ اس واسطے انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، کوئی گناہ صغیرہ اور کبیرہ نہیں کر سکتے اگر ادنیٰ درجہ کا بھی گناہ سرزد ہو جاتا تو دوسروں کو نصیحت کرنے کا منہ نہ رہتا لوگ کہتے کہ آپ کی پہلی زندگی تو یہ ہے ساری رنگ رلیاں آپ منا چکے ہیں پھر آخر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں؟ ہم کو بھی تھوڑا بہت گناہ کرنے دیجیے ہم بھی کل کو بچ جائیں گے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچ گئے۔ یہ تہمت تھی اور اسی تہمت سے بچانے کے لئے اللہ نے اپنے انبیاء کو اتنا مقدس پیدا کیا کہ نبوت سے قبل بھی ان سے گناہ سرزد نہیں ہونے دیا اور بعد از نبوت بھی۔ تو انبیاء علیہم السلام کی زندگی کا سب سے بنیادی پتھر اور پہلی اینٹ عصمت اور معصومیت ہے جس سے انکی زندگی مقدس بن جاتی ہے، اس کے بعد وہ اب جو کام کریں گے وہ اسوۂ حسنہ ہوگا، نمونہ ہوگا اور امت کو حکم کیا جائے گا کہ تم بھی اس کے اوپر چلو۔ اس لئے نبی کی زندگی میں معصیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا گناہ نہیں ہوتا۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میلادِ مبارک کی بنیادی چیز درحقیقت عصمت ہے جو ولادت سے شروع

① السمط الثمین فی فضائل امهات المؤمنین ،باب فضائل خدیجة رضی الله عنها، ص: ۵۳.

ہوتی ہے، چالیس برس جو نبوت سے قبل کے ہیں وہ بھی معصومیت کے ہیں اور ۲۳ برس جو بعد کے ہیں وہ بھی معصومیت کے ہیں۔ اس طرح سے ۶۳ سال کے اس طویل عرصہ میں ادنیٰ درجہ کی کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے جس پر انگلی رکھی جاسکے۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غیر مُسلموں کی شہادت، ایک واقعہ...... یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اپنے بلکہ غیر مسلم بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جو تاریخ دان انصاف سے غور کرتے ہیں اور نبوتوں کی زندگی سے من جملہ کچھ واقفیت رکھتے ہیں، انہوں نے شہادتیں دی ہیں کہ دنیا میں ایسا کامل ومکمل انسان جس کی زندگی پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔

لکھنؤ میں آج سے چند برس پہلے کا واقعہ ہے ایک جلسۂ سیرت ہوا۔ ''فردوسِ ادب'' ایک بڑی انجمن ہے وہ ہر سال لکھنؤ میں جلسہ کرتی ہے، سیرتِ طیبہ سننے کے لئے بڑا اجتماع ہوتا ہے، کوئی پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ آدمی جمع ہوتے ہیں، جہاں تک نگاہ جاتی ہے آدمی آدمی نظر آتے ہیں، اکثر مجھے بلاتے رہتے ہیں، مگر فرصت نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ میری شرکت ہوئی۔ آدمیوں کا سمندر معلوم ہوتا تھا۔ تو انہوں نے ''کے ایم منشی'' جو کہ یوپی گورنمنٹ کے گورنر تھے اور ہیں یہ ہندو...... ان کو بھی دعوت دی اور صدارت بھی انہیں کی رکھی۔ ہمیں یہ بات پسند نہیں آئی، شرکت کی دعوت دینا تو ٹھیک ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات سنیں۔ لیکن ایک مقدس جلسہ کی صدارت یا اس میں ایسی توقیر کسی مقدس ہستی کیلئے ہونی چاہیے غیر مسلم کے لئے موزوں نہیں، کسی مسلم یا نیک کی ہی ایسی توقیر ہونی چاہیے، اس میں اس شخصیت کی طرف میلان اور جھکاؤ بھی ہوتا ہے، چنانچہ اگر توقیر بھی کی جائے تو مسلم ہی کی کی جائے، اس لئے کہ جلسہ کا مقصد اسلام پیش کرنا ہے تو اسلام (والے) ہی کی عظمت نمایاں ہونی چاہیے۔ پیش کر رہے ہوں آپ اسلام اور تعظیم...... نمایاں ہو غیر اسلام یا غیر مسلم کی! یہ اصول کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ ہاں سیرت کے جلسوں میں شرکت کی دعوت سب کو دی جائے، تاکہ غیر مسلم پیغمبر کے حالات کو سنیں اور دین کی طرف ان کی توجہ ہو۔ الغرض انہوں نے دعوت دی...... مگر کے ایم منشی نے معذرت کی اور کہا مجھے کام زیادہ ہے فرصت نہیں ہے کہ میں آسکوں اور مزید کہا کہ باوجودیکہ میرے دل کا تقاضا ہے کہ اس مقدس جلسے میں شریک ہوں مگر کام اتنا پڑا ہوا ہے کہ مجھے کان کھجانے کی فرصت نہیں ہے، ہاں میں اپنا پیغام لکھ کر بھیج دیتا ہوں جو میری طرف سے شریک ہونے والا میرے پیغام کو پڑھ کر سنادے گا۔ پچیس تیس ہزار کے مجمع میں وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا یوپی کا گورنر تھا اور مذہباً ہندوؤں میں سے تھا۔ اس کے پیغام کے دو جز تھے پہلا جز تو یہ تھا کہ: ہم تاریخی اعتبار سے اس بات کا یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ دنیا میں اتنا کامل اور مکمل انسان کوئی پیدا نہیں ہوا جتنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ان کی زندگی پر کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ حصہ کمزوری کا ہے۔ جس پہلو کو دیکھو مقدس اور کامل ہے؛ گھریلو زندگی کو دیکھو تو اعلیٰ درجہ کی مقدس، جماعتی زندگی کو دیکھو تو ہر برائی سے

مبرّ ا اور منزہ، اجتماعی زندگی کو دیکھو تو خیر و برکت کی زندگی، تنہائی کی زندگی کو دیکھو تو خیر و برکت کی زندگی۔ غرض اجتماعی وانفرادی، سونے کی، جاگنے کی، ہنسنے کی، بولنے کی اور ہر پہلو کی زندگی بے مثال ہے۔ کوئی پہلو زندگی کا ایسا نہیں ہے جس میں ادنیٰ درجے میں کوئی طعنہ دیا جا سکے یا ادنیٰ درجے میں کوئی اعتراض کیا جا سکے۔ اور بعض لوگ جو پھر بھی اعتراض کرتے ہیں تو ایسے لوگ اعتراض کرنے کو تو خدا پر بھی کر دیتے ہیں۔ دہریئے تو خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے تو اس بد طینتی کا تو کوئی علاج نہیں۔ لیکن انسان جب اپنی انسانیت کے ساتھ غور کرے اور عقل سے سوچے اور تاریخ کو سامنے رکھے تو وہ لازماً اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی کامل اور مکمل ہستی ہیں کہ کہیں ادنیٰ درجہ کے طعن وملامت کی گنجائش نہیں، یہ تو پہلا جز تھا۔ اور دوسرا جز پیغام کا یہ تھا کہ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلام کے اصولوں پر بنایا ہے اسلام کے اصولوں کو سامنے رکھ کر بنایا ہے جس نے آپس کی اونچ نیچ ختم کر دی، چھوت چھات ختم کر دی، نسلی امتیازات ختم کر دیے، رنگ وروپ کا کوئی فرق نہیں رکھا، ملک والوں کے سب کے حقوق برابر ہیں، راستہ کھلا ہوا ہے جس کا جی چاہے ترقی کرے، جس کا جی چاہے آگے بڑھے، اب کوئی خود کسی کے آڑے آ گیا وہ بات الگ ہے یا تعصبات کیوجہ سے کوئی کسی کا راستہ روک دے وہ انفرادی دوڑ ہے، وہ اشخاص کی بد طینتی ہوگی اور قانون کا نقصان نہیں کہلائے گا۔

اسلام ابدی اور عالمگیر قانون ہے...... دوسرا جز انہوں نے یہ لکھا کہ ہم فخر کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے ملک کا قانون اسلام کو سامنے رکھ کر بنایا ہے، گویا مسلمانوں کے لئے بڑی عبرت کا موقع ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے قانون بنانے میں اگر بنیاد ہاتھ لگی تو اسلام ہی کی بنیاد ہاتھ لگی۔ اس زمانے میں انصاف دینے والا اگر کوئی قانون ہے تو وہ اسلامی قانون ہے اور دوسرے قوانین اس دور میں نہیں چل سکتے، نجات اسی قانون کے اندر منحصر ہے وہی سامنے آئے گا تو نجات ہوگی۔ آج اگر ہم چھوت برتنے لگیں تو دنیا تو بین الاقوامی ہوگئی ہے کہیں ہوائی جہازوں کا سفر، کہیں ریلوں کا سفر...... وہاں آپ چھوت چھات کریں گے، دوسرے کے سائے سے بھی بچیں گے تو سوال یہ ہے کہ آپ جہاز میں تشریف کیسے لائے؟ دوسرے ملک میں کیسے جا رہے ہیں؟ وہاں تو لوگوں کے سائے ملیں گے تو اگر بعض اقوام کا سایہ بھی ناپاک ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں اپنے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کیا تھی؟ تو دنیا بین الاقوامی ہوگئی اور انٹرنیشنل ہوگئی ہے آج اس کے اندر چھوت چھات چل سکتی ہے اور نہ نسلی امتیازات چل سکتے ہیں، جو چلانے والے ہیں وہ بالآخر ندامت کے ساتھ اسلام کی طرف رجوع کریں گے، آج کی دنیا میں وہ لوگ چل نہیں سکتے، انہیں دنیا ہی کے ساتھ چلنا پڑے گا۔

ہندوؤں کے ہاں چھوت چھات کی بیماری...... میں کہتا ہوں کہ ہندوؤں کے مذہب میں بنیادی چیز چھوت چھات تھی، ان کے ہاں برہمن پر غیر برہمن کا سایہ تک نہ پڑنا چاہیے ورنہ ناپاک ہو جائے گا، برہمن غیر برہمن کے ہاتھ کا کھا نہیں سکتا، غیر برہمن کا کھانے کو ہاتھ لگ جائے تو برہمن کے لئے وہ نجس ہوگیا، لہٰذا وہ دور سے کھانا

دے گا کہ سایہ بھی نہ پڑے، ہندو غیر ہندو میں فرق، غیر ہندو کا سایہ پڑ جائے تو چیز ناپاک ہوگئی، وہ دور سے کھانا دیں گے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ یہ چھوت چھات ہے جس کے چھوڑنے پر آج دنیا مجبور ہے اور وہی لوگ ناکام ہوئے جو بنیادی طور پر اس مذہب کے حامل تھے۔ خود گاندھی جی جن کے ہاں بھنگی نجس العین کا درجہ رکھتا ہے تو خود انہوں نے بھنگی بستی میں قیام کیا تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ اب بھنگی غیر بھنگی کا فرق نہیں چل سکتا۔ اب تو دنیا میں رائے شماری اور فرد شماری ہے۔ ہر عاقل بالغ ملک کے اندر ایک درجہ رکھتا ہے، وہاں اونچ نیچ یا امتیازات کی کوئی کھپت نہیں ہے، ہمارے ہاں یوپی کے وزیر اعظم تھے گورنر کملا پنڈت۔ ان کا یوپی کا دورہ ہوا، ہمارے دیوبند کے قریب ایک گاؤں رن کھنڈی ہے، دورے میں وہ گاؤں بھی شامل تھا تو ان کا پروگرام چھپا۔ پروگرام یہ تھا کہ رن کھنڈی میں آ کے مندر کے ایک چمار کے گھر میں ٹھہریں گے اور اس کے گلاس میں دودھ پئیں گے تاکہ یہ بتلا سکیں کہ آج نسلی امتیازات ختم ہو چکے ہیں، آج وہ چلنے والے نہیں ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں صدیق وفاروق کی عظمت...... انگریز کے دور میں جب ابتداء میں کانگریس گورنمنٹ قائم ہوئی جو کہ عارضی تھی لیکن بعد میں پھر مستقل ہوگئی، اس وقت گاندھی جی نے ایک مضمون لکھا تھا جو انڈیا کے اخبارات میں چھپا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اگر ہمارے ہندوستانی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں اور ہمارے منسٹرز عالمگیر عظمت چاہتے ہیں تو انہیں صدیق وفاروق کا نمونہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے کہ روم اور شام کی حکومتیں ان کے قدموں میں گریں۔ لیکن ان کے پیوند لگے کپڑے چھوٹے اور نہ جو کی روٹی چھوٹی، نہ فقر وفاقہ چھوٹا اور نہ ان کے زہد وقناعت میں کوئی فرق آیا تو اگر ہمارے کانگریسی منسٹرز چاہتے ہیں کہ دنیا میں وقار حاصل کریں تو صدیق وفاروق کا نمونہ اختیار کریں تو...... کتنی عبرت کی چیز ہے کہ آج غیر مسلموں کو بجز مسلمانوں کی زندگی کے اور کوئی نمونہ نہیں ملتا، نمونہ ملا تو وہی صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما۔ اپنی قوم میں انہیں کوئی ایسا نمونہ نظر نہیں پڑا کہ وہ قوم کو نصیحت کرتے کہ فلاں کی زندگی پر چلو۔ انہیں مستند طور پر کسی اور قوم میں بھی کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں پڑی جو تاریخی طور پر سامنے آئے اور ان کو اپنی مثال پیش کرنے کے لیے مجبور کر سکے، اگر نمونہ ملا بھی تو صدیق اکبر کا نمونہ، فاروق اعظم کا نمونہ، علی المرتضیٰ کا نمونہ اور عثمان غنی کا نمونہ ملا رضی اللہ عنہم اجمعین...... جس سے اندازہ ہوا کہ غیر مسلم بھی سمجھتے ہیں کہ یہی شخصیتیں مقدس تھیں جن کی زندگی پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

احوالِ صحابیت سے عصمتِ نبوی پر استدلال اور درجاتِ عصمت...... تو جس ذات بابرکات کے خدام ایسے تھے کہ آج دنیا ان کا نام لے کر کہتی ہے کہ ان کا نمونہ اختیار کرو تو خود اس ذات بابرکات کا نمونہ کیا ہوگا! خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات کا کیا مقام ہوگا! حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اگر پھل کڑوا ہے تو کہیں گے درخت بھی خراب ہے اگر پھل کانٹے دار ہے تو کہیں گے درخت بھی برا، پھل شیریں ہے تو کہیں گے درخت بھی عمدہ تو درخت پہچانا جاتا ہے اپنے پھل سے جس

ذات کے پھل ایسے تھے جیسے صدیق اکبر، فاروق اعظم اور ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم۔ان کو اپنے جیسا نمونہ بنا کر پیش کیا۔جس کے بنائے ہوئے افراد ایسے تھے خود وہ ذات کیسی ہوگی! جس درخت کے پھل ایسے تھے تو اس درخت کی شاخ کیسی ہوگی......تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں سب سے پہلے بنیادی چیز جو آتی ہے وہ عصمت اور معصومیت ہے اس کے بعد آگے اسوۂ حسنہ آتا ہے۔اگر معاذ اللہ گناہ کا شائبہ نبی کی زندگی میں پایا جائے تو زندگی امت کے لئے نمونہ نہیں بن سکے گی۔اس سے واضح ہوگیا کہ نبی کی زندگی میں گناہ کی کوئی سبیل نہیں،ممکن نہیں کہ نبی سے گناہ سرزد ہو جائے تو نبی کی ہر نقل وحرکت پاک ہوگی اور شریعت بننے کے قابل ہوگی۔اس کے بعد درجہ آتا ہے اخلاق کا،اس کے بعد اعمال کا اور پھر احوال کا۔یہ معصومیت کے درجے ہیں تاکہ جب اخلاق سامنے آجائیں تو وہ بھی خرابی سے معصوم ہوں، اعمال سامنے آئیں تو ہم کہہ سکیں کہ یہ بھی پاک تھے......ان میں بھی عصمت تھی لہٰذا ان کا نمونہ اختیار کرو۔احوال سامنے آئیں تو ان میں بھی عصمت تو وہ بھی معصوم تھے اس لئے انہیں اختیار کرو تو پہلے عصمت، اس کے بعد اخلاق، پھر اعمال، پھر احوال، پھر اقوال اور پھر پوری زندگی آتی ہے اور ان میں بھی بنیادی درجہ اخلاق ہی کو حاصل ہے۔(معصومیت کے ساتھ) انبیاء علیہم السلام کے اخلاق وہ ہوتے ہیں کہ دنیا میں ان کی کوئی نظیر اور مثال پیش نہیں کی جاسکتی وہ اخلاق ربانی کا نمونہ ہوتے ہیں۔حق تعالیٰ پیغمبر کو اپنے اخلاق کا نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں تو پیغمبر کا ایک ایک خلق اللہ کے اخلاق کی مانند ہوتا ہے،گویا اگر اخلاق ربانی کو مجسم کرنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات بن جائے گی، وہ اخلاق ربانی کا نمونہ ہوگا۔علم،صبر،شجاعت،سخاوت اور زہد......آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک چیز مثالی ہے۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ کی ادنیٰ سی جھلک......حدیث میں ہے کہ "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَجْوَدَ رِيْحاً مُرْسَلًا" ① عام حالات میں تو سخاوت تھی ہی لیکن رمضان شریف کے بارے میں تو کہا گیا کہ آپ کی سخاوت ایسی ہوتی تھی جیسے نسیم صبح چلتی ہے۔صبح کی ٹھنڈک اور ہوا ہر گھر میں، ہر قلب میں اور ہر دماغ میں پہنچتی ہے، اس سے فرحت پیدا ہوتی ہے۔یعنی کوئی گھرانہ ایسا خالی نہیں ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت کے آثار اس گھر تک نہ پہنچتے ہوں، آپ کی داد ودہش عام ہوتی تھی، ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال تقسیم فرماتے اور اشیاء تقسیم فرماتے تھے۔"اَجْوَدَ رِيْحاً مُرْسَلًا" چھوٹی ہوئی ہوا سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت تھی، ہوائیں اتنی نہیں پھیلتی تھیں جتنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت پھیلتی تھی۔

سخاوت اس وقت کامل ہوگی جب زہد کامل ہوگا اگر دنیا کے ساتھ دل اٹکا ہوا ہوگا تو دوسرے کو دینا طبیعت گوارا نہیں کرے گی۔اس لئے ایسا آدمی شریعت پر عمل کرنے کے لئے دنیا کی ہر چیز سے بالاتر ہوگا کہ سارا مال نکل جائے

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الفضائل، باب كان النبي صلى الله عليه وسلم اجود الناس بالخير من الريح المرسلة، ص: ۱۰۸۹ رقم: ۶۰۰.

تب بھی پرواہ نہ ہوگی، یہ جب ہوگا جب زہد کامل ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام کے زہد سے بڑھ کر کس کا زہد وقناعت ہوسکتا ہے ! اور پھر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا زہد وقناعت ...... اس کی تو کوئی حد ونہایت ہی نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مغرب کی نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے، اذان ہوچکی تھی صفیں درست ہوچکی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مصلّی پر تشریف لائے تکبیر بھی ہوچکی تھی قریب تھا کہ نیت باندھ لیں لیکن ایک دم گھبرا کر گھر تشریف لے گئے اور کچھ منٹ وقفہ کرنے کے بعد واپس تشریف لائے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز پڑھائی۔ نماز پوری ہونے کے بعد حضرات صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ تکبیر ہوجانے کے بعد خلافِ معمول گھر تشریف لے گئے، کچھ دیر لگی اور بعد میں تشریف لائے یہ کیابات تھی؟ فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک دینار رکھا ہوا ہے؛ اس زمانے کی اشرفی جو ہمارے ہندوستانی سکے کی قیمت میں اڑھائی روپے سمجھ لیجیے؛ تو گھر کے طاق میں دینار رکھا ہوا تھا جب میں نیت باندھنے لگا تو مجھے یاد آ گیا اور نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ رات گذر جائے اور اس کے گھر میں سونا چاندی ہو اسی لئے میں گھبرا کر گھر گیا اس کو صدقہ کیا اور گھر کو پاک کیا پھر آ کر تمہیں نماز پڑھائی ① ظاہر ہے کہ یہ زہد وقناعت تو انبیاء ہی برت سکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عادت وخصلت اپنانا ہر کسی کا بس نہیں ...... آج لوگ کہتے ہیں کہ سیرت کا جلسہ کرو۔ سیرت کہتے ہیں عادت وخصلت کو، تو کس کی جرأت ہے کہ انبیاء کی ان عادات کی پیروی کرے تو سیرت نبی کی ذاتی زندگی کا نام ہے۔ ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہ انبیاء کی ذاتی زندگی پر چل سکے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بس میں نہیں ہوا کہ سب حضور کی ذاتی زندگی پر چل سکیں ایک دو چل سکے ہیں ورنہ عام صحابہ قانونِ شریعت پر چلتے رہے ہیں اور اسی میں ہماری بھی سعادت ہے۔ یہ حوصلہ کرنا کہ ہم ہُو بہُو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کریں اور قدم بہ قدم چلیں ...... یہ ہماری مجال نہیں ہے۔ خاص اولیاء اللہ میں سے تو کوئی چل سکتے ہیں اور رہی ہماری بات! ہم اگر شریعت کے دائرے میں ہی رہیں تو یہی ہمارے لئے بڑی سعادت کی بات ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر آدمی حرام سے بچ جائے اور فرائض ادا کرتا رہے یہ اس زمانے کا جنید وشبلی ہے۔ آج کا جنید وشبلی پہلے کا سا نہیں ہوسکتا کہ ایک مستحب کا ترک نہ ہو اور ایک مکروہ کا ارتکاب نہ ہو۔ آج کا بڑا مقدس شخص وہی ہے جو فرائض ادا کرتا رہے اور حرام سے بچ جائے، بس اس سے زیادہ کوئی کامل نہیں۔ فتنے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اس زمانے میں آدمی یوں چاہے کہ میں زندگی صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی طرح گذاروں تو یہ ممکن نہیں ہے، نہ زمانے کے حالات ہیں اور نہ ہمارے اندر طاقت ہے، نہ ہی ہمیں حوصلہ کرنا چاہیے۔ بس حوصلہ کی بات یہ ہے کہ شریعت کے دائرے سے باہر نہ نکلے، ناجائز چیزوں کا ارتکاب نہ کرے، جائز چیزوں کی حدود کے اندر رہے اور مشتبہ اور حرام سے بچ جائے بس اتنا کافی ہے، ورنہ انبیاء کی زندگی پر تو اکابر اولیاء اللہ بھی نہ چل سکے۔

---

① السنن للنسائي، كتاب السهو الرخصة للامام في تخطي رقاب الناس ج: ٥ ص: ١٩٢.

عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ کا واقعہ.....تاریخ میں ہے کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ کے دس دس ہزار مریدین ایک وقت میں جمع رہتے تھے اور لنگر سے کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ایک دن تشریف لائے اور باورچی خانے کو دیکھا جہاں ان دس ہزار کا کھانا پکتا تھا۔فرمایا کیسا کھانا ملتا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: گوشت روٹی، کبھی دال بھی ہوتی ہے اور کبھی چاول بھی۔فرمایا: اللہ اکبر! ہم یہاں اس لئے بیٹھے ہیں کہ نبی کی سُنتوں کو رائج کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو کی روٹی کے سوا کوئی چیز نہیں کھائی اور ہم یہ گوشت روٹی اور دال کھا رہے ہیں! چنانچہ حکم دیا بند کردو یہ سب چیزیں اور وہی جو کی روٹی کھلاؤ۔

اور جو کی روٹی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے ہوتی تھی تو وہ جَو بھی چکی کا پِسا ہوا نہیں ہوتا تھا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو جَو کھاتے تھے وہ تو ایسا تھا کہ پتھر کی رکابی میں جَو ڈال کے اسے پتھر سے کوٹ لیا دو ٹکڑے ہوگئے پھونک ماری تو بھوسہ اڑ گیا (اسی سے کھاتے تھے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور یہ جَو بھی مہینے میں دو تین مرتبہ نصیب ہوتی تھی ورنہ فاقے پہ فاقے! ایک ایک مہینہ گذر جاتا تھا کہ گھرانۂ نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا۔① تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ ہم یہاں نیابت کے لئے بیٹھے ہیں، گویا نائب رسول اللہ کی گدّی ہے اور ہم یہ مزے اڑائیں! سب کو جَو کی روٹی دی جائے۔چنانچہ یہ سب چیزیں بند کردی گئیں؛ گوشت، دال اور چاول وغیرہ سب ختم ہوگئے۔جَو کی روٹی اور زیتون کا تیل دیا جانے لگا۔ظاہر بات ہے کہ روحانیت تو الگ چیز ہے لیکن معدہ بھی تو جَو کی روٹی کا تحمل نہیں کرسکتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے ہاضمے خراب ہوگئے، کسی کو دست آنے لگے، کسی کو بخار آگیا۔تو آدھے سے زیادہ لوگ بیمار ہوگئے۔ذکر اللہ کی جو مجلسیں تھیں وہ سُونی ہونے لگیں، کوئی ہائے ہائے کررہا ہے اور کوئی بخار میں مبتلا ہے۔خانقاہ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔حضرت شیخ نے تین دن کے بعد فرمایا کہ ذکر اللہ کی آوازیں کیوں نہیں آتیں؟ عرض کیا گیا کہ حضرت نے حکم دیا تھا کہ گندم کی روٹی بند کردی جائے اور جَو دیئے جائیں۔گوشت دال بند کردی جائے اور زیتون کا تیل کافی ہے، اس سنت کے مطابق چلو۔اس پر عمل کیا گیا.....لوگ اس روٹی کو ہضم نہیں کرسکے برداشت نہیں کرسکے، سب کے سب بیمار ہوگئے۔اب یہ سارے حجروں میں بیمار پڑے ہوئے ہائے ہائے کررہے ہیں۔ذکر اللہ وغیرہ سب ختم ہوگیا تو حضرت شیخ جیلانیؒ نے کانوں کو ہاتھ لگا کے فرمایا: ہم نے گستاخی کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتی زندگی کی پیروی کا حوصلہ کیا۔یہ ہمارا کام نہیں ہے یہ انبیاء ہی کے ظرف تھے، وہ اس چیز کو برداشت کرتے تھے۔ہمارا کام اتنا ہی ہے کہ جائز کے دائرے میں رہیں ناجائز سے بچیں۔پھر حکم دیا کہ گوشت روٹی پکے، وہی چیزیں جو پکتی تھیں پکائی جائیں، ہمارے پیٹ اس قابل نہیں ہیں کہ وہ جَو کی روٹی برداشت کریں۔

سیرت کے نام جلسہ کرنے کی نزاکت.....تو حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی ذاتی زندگی جس کا نام سیرت ہے

---

① كتاب الجوع لابن ابى الدنيا ص: ٣.

اس پر عمل کرنا یہ ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں تو بعض اوقات کہا کرتا ہوں کہ سیرت کے نام سے جلسہ کرنا بعض دفعہ تو ڈر لگتا ہے کہ یہ بے ادبی کی بات نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیرت کا جلسہ ہوگا، سیرت بیان ہوگی اور کیوں ہوگی! تا کہ ہم سیرت پر عمل کریں۔ ہم لوگ کہاں اس قابل ہیں کہ سیرت پر چلیں! کیا آپ میں اور ہم میں...... اور سب کے ساتھ میں اپنے کو بھی کہتا ہوں کہ ہم میں یہ جرات ہے کہ گھر میں جتنا سونا چاندی ہو، بیوی سے لیکر سب صدقہ کردو کہ میرا گھر پاک ہو جائے؟ اسلئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصلّٰی پر نماز نہیں پڑھائی جب تک گھر کو سونے سے پاک نہیں کیا، کیا کسی میں جرات ہے؟ کوئی نہیں کرسکتا۔ کیا کسی میں یہ جرات ہے کہ آج سے جَو کی روٹی شروع کردے؟ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نہیں کر سکے۔ ہماری اور آپ کی کیا مجال ہے؟ تو بہرحال سیرت کا نام لے کر جلسے کرنا بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بے ادبی میں داخل نہ ہو جائے!۔ جلسہ ہونا چاہیے...... اصلاحی جلسہ، وعظ وتقریر کا جلسہ۔ سیرت کے جلسہ کے معنی ہیں کہ ہم سیرت پر عمل کریں گے۔ حالانکہ شریعت تو ہم سے نبھتی نہیں، ناجائز چیزوں میں تو ہم مبتلا ہیں اور ہم عمل کریں گے سیرت کے اوپر...... آرزو تو کرو مگر...... اپنی بساط کو دیکھ کر آرزو کرو۔ یہ کہ ہم بالکل قدم بہ قدم سیرت پہ چلیں گے یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا زہد وقناعت میں ٹھیک رسول اللہ کے نقش قدم پر چلنے میں دوسروں پر سختی فرمانا

...... تو بہرحال میں عرض یہ کررہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زہد وقناعت کو دنیا برداشت نہیں کرسکتی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم تک برداشت نہ کرسکے، ایک آدھ گنے چنے صحابہ ہیں جنہوں نے ٹھیک حضور کی ذاتی زندگی پر عمل کیا: جیسے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، ان کا مذہب یہ تھا کہ اس وقت کا کھانا ہے تو شام کا کھانا جمع کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ذخیرہ ہے اور کنز میں داخل ہے۔ یہ تو خزانہ ہوگیا جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے کہ اگر کنز اور خزانہ بنایا تو جہنم میں اس سونے چاندی کے مال کو پگھلا کے جہنمی مالک کو داغ دیا جائے گا تو یہ ان کا ذاتی مذہب تھا کہ اس وقت کا کھانا ہے تو رات کے کھانے کی فکر جائز نہیں ہے، یہ توکل کے خلاف ہے۔ اگر ایک لباس بدن پر ہے تو دوسرا لباس رکھنا جائز نہیں ہے، یہ بھی توکل کے خلاف ہے۔ تو صحابہ میں یہ ایک نمونہ ہے دوسرے برداشت نہیں کرسکے۔ چنانچہ ملکِ شام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور شام کا متمول ملک...... تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دسترخوان پہ کئی کئی کھانے ہوتے تھے۔ لباس میں بھی عمدگی اور ایک لطافت پیدا ہوگئی تھی۔ مکان بھی ذرا اچھے بن گئے تھے اور یہ کوئی ناجائز بات بھی نہیں تھی، کیونکہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "اِنَّ اللہَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ" ① یعنی اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے، دولت دے تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ اس کے اثرات بھی اس کے اوپر دیکھیں، ڈھنگ کا کھانا اور ڈھنگ کا پہننا ہو، پھٹے حال سے نہ رہے، خراب خستہ حال نہ رہے۔ تو منشاءِ خداوندی یہ ہے کہ نعمت دی جائے تو اس کا اثر بھی بدن کے اوپر آنا

① السنن للترمذی، کتاب الأدب، باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری...... ص: ۱۹۴۳ رقم: ۲۸۱۹.

چاہیے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اگر اچھا لباس پہنا اچھی غذائیں کھائیں تو معاذ اللہ کوئی ناجائز کام نہیں کیا، ان سے زیادہ مقدس کون ہے! مگر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی کے گھر پہنچے اور دیکھا کہ دستر خوان بچھ رہا ہے اور دو کھانے رکھے ہیں...... بس لاٹھی لے کر کھڑے ہوگئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستر خوان پر کب دو کھانے تھے؟ تم نے یہ کیسے رکھ لیے؟ ہٹاؤ ان کو۔ یہ نہیں تھا کہ فقط نصیحت کر دیتے، لاٹھی لے کے مار کٹائی شروع کر دیتے تھے کہ اس کھانے کو ہٹاؤ، کسی کے گھر اگر دو چار کپڑے اندر رکھے ہوئے ہیں تو لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں کب زائد کپڑے تھے جو تم نے رکھے ہوئے ہیں صرف وہ کپڑے رہنے چاہئیں جو بدن کے اوپر ہیں۔ یہ صندوق میں کیوں دو جوڑے رکھے ہیں...... پھر لاٹھی مار کے حکم دیتے تھے کہ نکالو اور ان کو صدقہ کرو۔ آخر لوگ تنگ آگئے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا کہ انہوں نے تو سب کی زندگی تلخ کر دی ہے! اب سب تقویٰ کے اس انتہائی مقام کو کیسے پہنچیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام تھا۔ اور کس طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی زندگی کی پیروی کریں! آپ انہیں حکم دیجئے کہ یہ شہر میں نہ رہیں۔ شریعت میں توسّعات (گنجائشیں) ہیں، اگر کوئی مالدار ہے زکوٰۃ دے دے گا تو مال پاک ہوگیا، یہ نہیں ہے کہ وہ سارا مال جا کے سمندر میں بہا دے تو پاک ہوگا۔ کسی کے پاس دو جوڑے کپڑے ہیں؛ پرانے ہوں یا نئے، فقیروں کو بھی دے دیئے خود بھی پہن لیے بس پاک ہوگئے۔ اب یہ کہ کوئی اچھا کپڑا پہننے ہی نہ پائے یہ تو شریعت کا معارضہ ہے، شریعت تو گنجائش دے اور یہ گنجائش نہیں دیتے! آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ آپ شہر چھوڑ دیں اور جنگل میں قیام کریں۔ ①

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکالیف دوسرے انبیاء سے بڑھی ہوئی ہونے کی توجیہ...... تو اسلام خُلقِ عظیم سے پھیلا ہے نہ کہ تلوار کے زور سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صبر، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحمل، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت وغیرہ...... یہ وہ اخلاقِ ربانی تھے جنہوں نے واضح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے پیغمبر اور اس کے رسول ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معجزات اور پھر وحی کے ذریعہ آنے والے علوم یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ذریعے قلوب کے اندر ایمان پیدا ہوتا ہے اور لوگ دین کی طرف آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کسی نبی کو کسی قوم سے وہ اذیتیں نہیں اٹھانی پڑیں جو مجھے جھیلنی پڑی ہیں اور جتنی تکلیف مجھے پہنچی...... تنی تکلیف کسی نبی کو نہیں پہنچی ② حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو زیادہ تکلیف پہنچائی گئی، ساڑھے نوسو برس تبلیغ فرمائی اور قوم ان کا مذاق اڑاتی رہی۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے تکلیفیں پہنچیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنی تکلیفیں نہیں پہنچیں۔ پھر کیوں فرما رہے ہیں کہ جتنی اذیتیں مجھے پہنچیں وہ کسی کو نہیں پہنچیں؟ اس کی بناء (وجہ) یہ

① اس سے آگے تقریر کا کچھ حصہ ریکارڈ نہ ہوسکا ۱۲ منہ ② حلیة الاولیاء، مالک بن انس، ج:۳ ص:۱۱۲.

ہے کہ اذیت جب زیادہ پہنچتی ہے جب شفقت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی آپ کو کسی سے محبت ہوگی اس سے اگر آپ کو تھوڑی بھی تکلیف پہنچے گی تو زیادہ محسوس ہوگی کیونکہ اسے تکلیف پہنچانے کا حق نہیں تھا، میں تو اتنی محبت کروں اور یہ ایذاء پہنچائے، اگر دشمن آپ کو گالیاں بھی دے آپ خیال بھی نہیں کرتے، لیکن اگر آپ کا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو گھر سے نکال دیں گے اور انتہائی صدمہ پہنچے گا کیونکہ اس سے یہ توقع نہیں تھی، کہ جس پر اتنی شفقت اور رحمت ہو وہ تکلیف پہنچائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چونکہ امت کے حق میں بے حد شفقت تھی اور بے حد رحمت تھی اس لئے ان کی اذیت دگنی اور تگنی ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لگتی تھی کہ میں تو اتنا شفیق اور یہ میرے ساتھ یہ برتاؤ کریں، تو شدّتِ شفقت کیوجہ سے اذیت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

اسی لئے حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ ذرا سی اس شفقت میں کمی کریں، اتنی زیادہ شفقت نہ کریں کہ اخیر میں خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی بھگتنی پڑے۔ فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (1) شاید آپ اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کر ڈالیں گے کہ یہ کیوں نہیں مسلمان ہوجاتے۔ آپ ان کو چھوڑ یئے، تبلیغ کردیجیے، نہیں مانتے تو جائیں جہنم میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا کیوں دُکھ اٹھاتے ہیں، لیکن غایتِ رحمت کیوجہ سے دُکھ اٹھاتے تھے، انتہائی شفقت اور خُلقِ عظیم کیوجہ سے اس درجہ رحیمانہ اخلاق تھے کہ حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ اتنی شفقت بھی نہ کریں کہ خود آپ کو تکلیف پہنچے۔

خاتم النبیّین کا مطلب..... تو حاصل یہ نکلا کہ (نبی میں) صبر ہو، سخاوت ہو اور شجاعت ہو۔ چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اس واسطے اخلاق میں بھی خاتم الاخلاق ہیں کہ اخلاق کا وہ درجہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا، علم کا جو درجہ دوسرے انبیاء کو دیا گیا اس سے دُگنا چوگنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو مقامِ علم ہے وہ مقام دوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا۔ جو مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال کا ہے وہ دوسرے انبیاء کو نہیں دیا گیا...... اس لئے اور انبیاء علیہم السلام فقط نبی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط نبی نہیں تھے بلکہ خاتم النبیّین تھے۔ اور خاتم النبیّین کا مطلب یہ ہے کہ نبوت، علم اور اخلاق کے جتنے مراتب ہیں وہ سب آپ کی ذات بابرکات کے اوپر ختم ہو چکے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارے کمالات کے منتہاء ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر آکر سب کمالات کی انتہاء ہوگئی تھی۔ گویا اب کوئی درجہ نبوت کا باقی نہیں رہا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی آئے اور اس درجہ کو لے کر چلائے اور تبلیغ کرے۔ آپ کی ذات بابرکات کے اوپر سارے مراتب ختم کردیے گئے، اس لئے آگے نہ نبوت کی ضرورت تھی اور نہ شریعت کی ضرورت تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین خاتم الادیان تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب خاتم الکتب تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت خاتم الشرائع تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات

(1) پارہ: ١٩، سورة الشعرآء، الآية: ٣.

خاتم الانبیاء تھی۔ تو ختم نبوت کی وجہ سے ہر چیز کا انتہائی مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا گیا تھا؛ علم کا، اخلاق کا اور سارے کمالات کا کیوں کہ نبوت ختم ہو چکی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔

نبوت رحمت ہے تو اس کا ختم ہونا زحمت ہے، اشکال اور اس کا جواب ...... ممکن ہے کوئی شخص یہاں شبہ کرے کہ نبوت ختم ہو چکی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے کوئی نبی نہیں تو نبوت تو سب سے بڑی رحمت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا تو ہزاروں نبی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آنے چاہئیں تھے مگر معاذ اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو رحمت نہیں زحمت بن گئے کہ نبوت جیسی رحمت کا دروازہ ہی بند ہو گیا کہ نبی آنے ختم ہو گئے، تو یہ رحمت کہاں ہوئی معاذ اللہ! یہ تو زحمت ہو گئی۔ اس لئے آپ کے رحیم ہونے کا تقاضا ہے کہ نبوت کا دروازہ کھلا رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہزاروں نبی آنے چاہئیں۔ بعض ایسے لوگوں نے جو خود چاہتے تھے کہ ہم نبی بن جائیں مگر بن نہیں سکے۔ اتفاق سے دعوے بھی بہت کچھ کئے مگر نبوت پچھی نہیں۔ قطعِ نظر اس کے کہ نبوت ختم ہو چکی تھی مل نہیں سکتی تھی ...... پھر بھی اس کا دعویٰ ان کی ذات پر پھبا ہی نہیں۔ جیسے بعض لوگ ٹوپی اوڑھ لیتے ہیں اور ان کو اچھی نہیں لگتی، اسی طرح کوئی چہرہ تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ کوئی لباس پہن لے پھب جاتا ہے اور کوئی ایسا بھدّا ہوتا ہے کہ لباس بھی اس کے اوپر بھدّا ہو جاتا ہے۔ تو قطعِ نظر نبوت ختم ہونے یا نہ ہونے کے ...... نبوت ان کی ذات پر پچھی نہیں اور چسپاں نہ ہو سکی، مگر انہوں نے نبوت کے دعوے کرنے کے لئے یہ شبہ پیدا کیا کہ نبوت عظیم رحمت ہے اور جو نبوت کا دروازہ بند کرے وہ رحمت کہاں رہا؟ وہ تو زحمت بن گیا تو دروازہ کھلا رہنا چاہیے، نبی آتے رہنے چاہئیں۔ یہ شبہ ممکن ہے کسی کے ذہن میں ہو یا ڈالا جائے اس کے لئے جواب عرض کرتا ہوں۔

جواب ...... حاصل یہ ہے کہ ختمِ نبوت کا معنی قطعِ نبوت کا نہیں کہ نبوت قطع ہو گئی اور دنیا سے منقطع ہو گئی بلکہ ختم نبوت کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں، یعنی نبوت کامل ہو گئی اور چیز کے کامل ہونے کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا ہے کہ وہ آئے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے رات کا وقت ہے اور ستارے چمکنے شروع ہوئے، غروب کے بعد ایک چمکا، دوسرا، تیسرا، ہزار، لاکھ، کروڑ، دس کروڑ ...... حتیٰ کہ سارا آسمان جگمگا اٹھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے اور چاند بھی نکلا ہوا ہے تو چاند ستارے نور پھیلا رہے ہیں لیکن رات نہیں جاتی، دن نہیں ہوتا، رات کی رات رہتی ہے۔ سب نے مل کر کتنی روشنی دی مگر رات موجود ہے اور رات نہیں جاتی۔ آفتاب کے آنے کا جب وقت ہوا تو ابھی نکلا نہیں تھا صرف پو پھٹی تھی کہ بس صبح صادق نے اطلاع دیدی کہ آفتاب آ رہا ہے۔ بس خبر آئی تھی کہ اندھیرا غائب ہونا شروع ہوا اور دنیا میں چاندنا ہو گیا۔ ایک ہی ستارے (یعنی سورج) نے آ کے سارے جہاں کو چمکا دیا۔ یعنی وہ تو لاکھوں کروڑوں مل کر روشنی ڈال رہے تھے مگر رات کو زائل نہیں کر سکے، دھکا نہیں دے سکے، رات کی رات ہی رہی۔ اور ایک ستارہ ایسا نکلا کہ اس نے آ کے ساری رات کو دھکیل دیا۔ پورے عالم میں چاندنا ہو گیا۔ اگر آفتاب

یوں کہے کہ: "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" میں نے سارے انوار کو ختم کر دیا، سارے انوار میری ذات پر ختم ہیں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں اور نہ اب کوئی نیا ستارہ آنے والا ہے اس لئے کہ میں اتنا کامل نور لے کے آیا ہوں کہ اب کسی ستارے کی حاجت نہیں۔ جو موجود تھے ان کا بھی نور ماند پڑ گیا، ان کے نور بھی غائب ہو گئے اور اب وہ نمایاں ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آفتاب نے ستاروں کا نور چھین لیا ہے۔ وہ تو منوّر ہیں مگر آفتاب کی تیزی اور چمک کے سامنے ان کی چمک ماند ہے، وہ نظر بھی نہیں آتے۔ ایسے وقت میں آفتاب یوں کہے: "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" کہ میں ہوں خاتم انوار، سارے انوار اور ساری چمکیں مجھ پر ختم ہو گئی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب نور کا کوئی ایسا درجہ باقی نہیں ہے کہ اب کوئی اور ستارہ آئے اور نور پھیلائے۔ اب مغرب کے وقت تک میں اکیلا ہی کافی ہوں کسی ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں یہ دن ہی ختم ہو جائے، یہ جہاں ہی ختم ہو جائے تو یہ بات الگ ہے۔ لیکن جب تک یہ دن موجود ہے کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے۔ اس لئے کہ انوار میری ذات کے اُوپر ختم ہو گئے۔ تو کیا آفتاب کے "أَنَا خَاتَمُ الْاَ نْوَارِ" کہنے کا یہ مطلب ہوگا کہ نور ختم ہو گیا! نور مٹ گیا دنیا سے! اندھیرا چھا گیا! یا یہ مطلب ہوگا نور کے ختم ہونے کا کہ نور کے مراتب ختم ہو گئے، کامل ہو گئے...... اب کسی دوسرے ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں، دوسری چمک کی حاجت نہیں ہے۔ تو ختمِ انوار کے معنی قطعِ انوار کے نہیں بلکہ تکمیلِ انوار کے ہیں کہ نور کامل ہو گیا اور اب کسی اور نور کی ضرورت نہیں ہے۔

آفتابِ نبوت کا طلوع...... اسی طرح سمجھ لیجئے کہ نبوت ایک آسمان ہے۔ سب سے پہلے نور کا ستارہ حضرت آدم علیہ السلام کا چمکا اور اس نے آ کے نور پھیلایا، اس کے بعد نوح علیہ السلام کے نور کا ستارہ چمکا، پھر حضرت ہود علیہ السلام کا، پھر حضرت صالح علیہ السلام کا اور ﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا﴾ ① پھر پے در پے انبیاء علیہم السلام آنے شروع ہوئے۔ ابراہیم علیہ السلام آ رہے ہیں، موسیٰ علیہ السلام آ رہے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہزاروں پیغمبر بنی اسرائیل میں سے آ رہے ہیں۔ گویا آسمانِ نبوت ستاروں سے بھر گیا مگر دنیا میں چاندنا نہ ہوا، یعنی دن نہ نکلا۔ رہی رات کی رات۔ پھر فاران کی چوٹیوں سے صبح صادق علیہ السلام کا طلوع ہوا۔ اس نے خبر دی کہ آفتابِ نبوت آنے والا ہے۔ ابھی آیا نہیں تھا خبر آئی تھی کہ دنیا میں چاندنا پھیلنا شروع ہو گیا۔ ستارے گُل ہونا شروع ہو گئے اور آفتاب نے نکلتے ہی اعلان کیا کہ اب میں آ چکا ہوں، اب کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے۔ میرا نکلنا ہی کافی ہے، پوری دنیا کے لئے اب میں کافی ہوں۔ نبوت ختم ہو گئی یعنی مراتبِ نبوت میری ذات پر منتہی ہو گئے، کامل ہو گئے۔ مزید نبوت کو پھیلانے کی اب کوئی وجہ باقی نہیں اور اب کسی کو نبی بنا کر نہیں لایا جائے گا۔ اب میری نبوت غروبِ آفتاب تک کام کرے گی...... یہاں تک کہ صبحِ قیامت طلوع ہو جائے اور یہ دن ختم ہو جائے۔

---

① پارہ: ۱۸، سورة المؤمنون، الآية: ۴۴.

اس کے بعد اللہ کو اختیار ہے دنیا بنائے یا نہ بنائے یا سب کو جنت میں رکھے۔ مگر جب تک یہ دنیا قائم ہے میں آفتاب ہوں، میرا نور کافی ہے، میرے بعد بڑے بڑے لوگ آئیں گے..... مگر ان کے راستے سے بھی میری ہی نبوت کا نور چمکے گا۔

انوارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی صورتیں..... محدثین آئیں گے تو ان کے راستہ سے میری نبوت کا نور ظاہر ہوگا، فقہاء آئیں گے؛ ابوحنیفہ، مالک، شافعی رحمہم اللہ وغیرہ..... ان سب کے اندر سے میرے انوار ظاہر ہوں گے، خود ان کا کوئی نور نہیں ہوگا۔ صوفیائے کرام آئیں گے؛ جنید، شبلی اور بایزید بسطامی وغیرہ..... ان کی ذات کا کوئی نور نہیں ہوگا، سب سے میری ہی نبوت کا نور چمکے گا۔ کسی طبقے سے میرے علم کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے اخلاق کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے زہد وقناعت کا نور نمایاں ہوگا۔ سب میرے انوار کو ظاہر کریں گے اور ایک میری نبوت قیامت تک کافی ہوگی۔ اس کے لئے آئینے آتے رہیں گے، ان میں سے وہ نور چھنتا رہے گا چمکتا رہے گا، دنیا کو روشنی ملتی رہے گی۔ نبوت کی اس لئے ضرورت نہیں کہ نبوت کے سارے درجات میرے اوپر ختم ہو گئے۔ تو یہاں ختم نبوت کا یہ معنی لینا کہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا یہ دنیا کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ نبوت مکمل ہو گئی ہے اور وہی کام دے گی قیامت تک..... نہ یہ کہ نبوت منقطع ہو گئی ہے اور دنیا میں اندھیرا پھیل گیا ہے۔ نہ علم رہا اور نہ اخلاق رہے تو یہ معنی نہیں کیا گیا۔ اس لئے دھوکے میں نہ پڑا جائے، ختم نبوت کے معنی قطع نبوت کے نہیں، بلکہ کمالِ نبوت اور تکمیلِ نبوت کے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مراتبِ نبوت ختم ہو گئے ہیں اب جتنے بھی مجدد آئیں گے، محدث آئیں گے، آئمہ آئیں گے، صلحاء وشہداء آئیں گے اور مجاہدین آئیں گے..... سب کے اندر ایک ہی نور کام کرے گا۔ سب پیکر ہوں گے اور ان سب پیکروں سے ایک ہی کا نور ظاہر ہوگا، ہوں گے وہ کمالاتِ نبوت۔ تو گویا "ایک ذات" اللہ نے ایسی پیدا کی کہ اس کے انوار وبرکات سے پچھلوں کو نبوتیں ملتی چلی گئیں، اگلوں کو ولایتیں ملتی چلی گئیں..... پہلے نبی بنتے گئے، بعد والے ولی بنتے چلے گئے، تو ولایت بھی وہیں سے چلی، نبوت بھی وہیں سے چلی۔ تو اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نکتۂ خیر ہیں کہ پچھلے انبیاء کی نبوتیں درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے مستفیض ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے فائدہ اٹھاتے رہے اور بعد میں آنے والے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات سے ولی، مجدد اور محدث بنتے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت درجۂ کمال پر ہے..... فلاسفہ کہتے ہیں کہ آفتاب کا ہی نور درحقیقت ستاروں میں کام کرتا ہے، چاند میں اپنا ذاتی نور نہیں ہے۔ ستاروں میں اپنا نور نہیں ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ذات (سورج سے) صیقل شدہ ہیں، آفتاب کا جہاں مقابلہ ہوا ان میں چمک پیدا ہو گئی۔ تو درحقیقت اولیاء اللہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم آئینوں کی مانند تھے، وہ چمک لیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور کی۔ نبوت آج بھی آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی کام کررہی ہے۔ کوئی اور نبوت نہیں ہے وہی نبوت ہے جو چل رہی ہے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط نبی نہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں اور ختم نبوت کے معنی کمالاتِ نبوت کی انتہاء اور تکمیل نبوت کے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو لاکر نبوت کے تمام مراتب ختم کردیے گئے۔

نبوت کی دو بنیادیں ہیں...... اور نبوت کی دو ہی بنیادیں ہیں: ایک کمالِ علم اور ایک کمالِ اخلاق، تو علم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلیٰ اور اخلاق بھی اعلیٰ۔ علم تو ایسا کہ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں أُوتِيتُ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ① اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کردیے گئے ہیں، میرے سینے میں بھر دیئے گئے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے فرمایا ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ ② اے نبی! ہم نے آپ کو ان چیزوں کی تعلیم دی جو آپ پہلے سے نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے۔ اور اخلاق کے بارے میں فرمایا ﴿وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ ③ آپ خلق عظیم کے اوپر ہیں۔ یعنی اخلاق کا جو انتہائی مرتبہ ہے وہ آپ کو دیا گیا ہے۔ تو جب علم بھی انتہائی اور اخلاق بھی انتہائی ہے ...... بس یہی دو بنیادیں ہیں نبوت کی، تو پھر نبوت بھی انتہائی ہوگئی اور یوں آپ خاتم النبیین ہیں۔ تو ختم نبوت میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پوشیدہ ہے۔

ابتدائی درجہ عصمت اور معصومیت کا ہے، اس کے بعد اخلاق کا ہے، اس کے بعد اعمال کا ہے اور اس کے بعد احوال کا ہے۔ تو میں نے کچھ روشنی ڈالی عصمت کے اوپر، کچھ روشنی ڈالی اخلاق کے اوپر، اعمال اور احوال کا باب بہت وسیع ہے...... اس کے لئے وقت درکار ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے وقت تنگ ہوگیا ہے، اخیر ہوگیا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ اب اس تقریر کو ختم کیا جائے۔

قرآن ہی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے...... اور کون ہے جو سیرت کی ساری چیزیں بیان کرسکے، اس واسطے کہ سیرت کے بارے میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ تو فرماتی ہیں کہ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق ہے۔ جسے اخلاق دیکھنے ہوں قرآن دیکھ لے۔ ④ تو قرآن کے عجائبات قیامت تک تمام نہیں ہوں گے تو سیرت کے عجائبات کہاں سے تمام ہوسکتے ہیں! قیامت تک لاکھوں بیان کرنے والے بیان کرتے جائیں پھر بھی سیرت مکمل بیان نہیں ہوسکتی۔

اختتامِ تقریر...... اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ اب بیان ختم کروں، میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ: ﴿مَا كَانَ

---

① روح المعاني عن القسطلاني، سورة الكهف، الآية: ۸۲ ج: ۱۱ ص: ۳۸۰.

② پارہ: ۵ سورة النساء، الآية: ۱۱۳.

③ پارہ: ۲۹ سورة القلم، الآية: ۴.

④ مسند احمد، حديث السيدة عائشة رضي الله عنها ج: ۵۰ ص: ۱۱۶.

مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ ① محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں یعنی نسبی رشتہ نہیں ہے، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی روحانی رشتہ کے باپ ہیں اور مادی اور نسبی رشتے کے باپ نہیں ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: " اَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ ② میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں یعنی روحانی باپ۔ تو جیسے اولاد ماں باپ سے تربیت (جسمانی پرورش) پاتی ہے تو روحانی اولاد روحانی ماں باپ سے تربیت (روحانی پرورش) پاتی ہے۔ تو میں روحانی باپ ہوں اور سارا عالم میرے زیرِ تربیت ہے اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ روحانی باپ ہو یا مادی باپ وہ ایک ہی ہوا کرتا ہے، دو دو باپ کسی کے نہیں ہوا کرتے۔ تو میں چونکہ روحانی باپ ہوں اس لئے ایک ہوں تو میرے بعد کوئی اور باپ آنے والا نہیں ہے۔ میری اُبُوّت اتنی مکمل ہے کہ وہ تربیت کے لئے کافی ہے: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ ③ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اب نبوت کا یا باپ ہونے کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ نبوت کے درجہ میں کوئی روحانی باپ بن جائے، نبوت ختم ہو چکی۔ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ نبوت کو ایک محل سمجھو جس کی تعمیر ہو رہی تھی جسکی آخری اینٹ میں ہوں۔ میں نے قصرِ نبوت کو مکمل کر دیا۔ ④ اب کوئی انتظار کی حالت باقی نہیں ہے اب نہ باہر سے کوئی چیز آئے گی نہ اندر سے باہر جائے گی۔

خلاصہ بیان ...... بہر حال چونکہ جلسہ کا موضوع نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میلادِ مبارک تھا تو ایک میلادِ جسمانی کا ذکر کیا اور زیادہ تفصیل میلادِ روحانی کی کی کیونکہ ہماری سعادت کا تعلق میلادِ روحانی سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت سے ہے اور رسالت کے اخلاق، اعمال اور احوال سے ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل میں نے زیادہ کی اور اسی لئے یہ آیت پڑھی تھی کیونکہ وہ ساری تفصیلات اس آیت میں تھیں لیکن چھپی ہوئی تھیں اور وہ آیت ختمِ نبوت کے بارے میں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی کمالات اسلئے ہیں کہ آپ کی نبوت انتہائی تھی اور اس واسطے آپ کے انتہائی علم و اخلاق کا ذکر بھی آیا، اس لئے ختمِ نبوت کا ذکر بھی آیا۔ اور چونکہ ختمِ نبوت کا ذکر کرنا تھا تو آیت وہ پڑھی جس میں ختمِ نبوت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اسی سے یہ سیرت شروع کی۔

اب وقت زیادہ ہو گیا ہے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس پاک اور عظیم الشان پیغمبر کی زندگی اور نقشِ قدم پر چلنا نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے نبی پاک کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے اور ہم کو سچا اور سیدھا مسلمان بنائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

---

① پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰. ② السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب کراھیۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ، ص: ۱۲۲۳ رقم: ۸. ③ پارہ ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۴۰.
④ الصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ ﷺ خاتم النبیین ج: ۱۱ ص: ۴۰۴.

مقام نبوت اور اس کے آثار ومقاصد

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!......قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ① . وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ. اَوْكَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ. ②

تمہید......بزرگانِ محترم! اس دنیا میں ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ جب اس کی ضد سامنے آتی ہے تو اصل چیز گویا واضح ہو جاتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے اس دنیا کو اضداد پر قائم کیا ہے۔ یہ عالم بھی عالمِ اضداد ہے جو بھی کمال اس دنیا میں لایا گیا اس کے مقابلے میں اس کمال کی ایک ضد ضرور رکھی گئی ہے تاکہ وہ کمال کھل جائے اور واضح ہو جائے، خواہ وہ کمال مادی ہو یا روحانی ہو...... ضد سے خالی نہیں ہے۔ اس دنیا میں اگر نور رکھا گیا ہے تو نور کے مقابلے میں ظلمت بھی رکھی گئی ہے۔ تاکہ ظلمت کے تقابل سے نور کو لوگ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اگر دنیا میں چمکتا ہوا دن لایا گیا ہے تو اس کے مقابلے میں ظلمانی رات بھی رکھی گئی ہے تاکہ دن کی خوبیاں رات کے تقابل سے واضح ہو جائیں۔ اگر اسلام لایا گیا تو اس کے مقابلے میں کفر رکھا گیا تاکہ اس کی ٹکر سے اسلام کی خوبیاں اور قوتیں واضح ہوں۔ اگر ایک طرف اخلاص لایا گیا تو اس کے مقابلے میں نفاق رکھا گیا تاکہ نفاق کے مقابلے سے اخلاص کے کمالات کھل جائیں۔ اگر صدق رکھا گیا تو صدق کے مقابلے میں کذب اور جھوٹ بھی رکھا گیا تاکہ کذب کے مقابلے سے صدق کی خوبیاں واضح ہوتی رہیں۔ اسی طرح چلتے رہیے علم رکھا گیا تو اس کے مقابلے میں جہالت رکھی گئی۔ اخلاق لائے گئے تو اس کے مقابلے میں بداخلاقی لائی گئی تو ہر خوبی کے مقابلہ میں خرابی ضرور رکھی گئی ہے۔

عالمِ اضداد میں اشیاء کے تقابل کی حکمت......اور یہ اس لئے ہے تاکہ جب خوبی اور خرابی کا مقابلہ ہو تو

① السنن لابن ماجة، كتاب السنة، باب فضل العلماء...... ص: ۱۹۱ ۲۴۹ رقم: ۲۲۹.

② السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها. ج: ۱۰ ص: ۱۹۱. حدیث صحیح ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ۱ ص: ۵۸.

خوبی کی قوتیں کھل جائیں۔ بغیر مقابلہ اور تقابل کے کسی کمال کی خوبی کھلتی نہیں ہے۔ جب تک علم کو آپ جہالت سے ٹکرائیں گے نہیں اس وقت تک علم کے مخفی گوشے واضح نہیں ہو سکتے۔ اگر علم کے مقابلے میں اعتراضات نہ کئے جائیں اور سوالات نہ کئے جائیں جو جہل پر مبنی ہوتے ہیں تو جواب سے جو علم کے کمالات کھلتے ہیں وہ چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ اس لئے علم کو ٹکر دی جاتی ہے جہل سے، کبھی اعتراضات کی صورت سے، کبھی شبہات کی صورت سے اور کبھی الزامات کی صورت سے تاکہ جواب دینے والے جواب دیں تو اس کے مخفی گوشے کھل جائیں۔ قرآن کریم میں بھی اسی لئے فرمایا گیا کہ: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ﴾ ① نہیں، بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تاکہ باطل کے ٹکراؤ سے حق کی مخفی قوتیں نمایاں ہوں اور کھلتی رہیں۔ تو اس دنیا میں اضداد بھی ہیں اور اضداد کا ٹکراؤ بھی ہے۔ بغیر ٹکراؤ اور تصادم کے کمالات کی خوبیاں واضح نہیں ہوتیں۔

مثلاً دو پہلوان ہیں اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں لیکن ان میں کشتی اور ٹکر نہ ہو تو ٹکراؤ کے بعد جو مخفی قسم کے داؤ پیچ کھلتے ہیں وہ چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ اس لئے پہلوان کو پہلوان سے ٹکرایا جاتا ہے تاکہ فن کی مخفی قوتیں واضح ہوں۔ ہر جگہ آپ یہی دیکھیں گے...... اس واسطے اس عالم کو ظلمانی بنایا گیا اور نورانی بھی بنایا گیا تاکہ ظلمت اور نور کے تقابل سے نور کی اصلیت اور اس کی قوت کھلے۔

اندھیروں میں آفتاب...... سب سے زیادہ ظلمت اور اندھیرے کا زمانہ اس دنیا میں وہ تھا کہ جس کے خاتمہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ آپ کی بعثت سے پہلے کا دور انتہائی ظلمت کا دور تھا، انتہائی اندھیری کا دور تھا۔ کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو اس زمانۂ جاہلیت میں موجود نہ ہو۔ جہالت کی برائیاں الگ، بداخلاقی کی برائیاں الگ، بدعملی کی برائیاں الگ، بداعتقادی کی برائیاں الگ، غرض جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں وہ سب کی سب ایک زمانے میں جمع ہو گئی تھیں اور وہ زمانہ: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ② کا مصداق تھا کہ ظلمت در ظلمت اور پے در پے اندھیریاں دنیا کے اندر چھائی ہوئی تھیں۔ اسی لئے حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: "إِنَّ اللهَ نَظَرَ إِلَى قُلُوْبِ بَنِيْ آدَمَ فَمَقَتَ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ إِلَّا غُبَّرَ أَهْلِ الْكِتٰبِ" ③ اللہ نے انسانوں کے دلوں کی طرف نگاہ کی تو غضب آلود نگاہ سے دیکھا، عرب کو بھی عجم کو بھی۔ یعنی کہیں خیر باقی نہیں رہ گئی تھی، ہر جگہ ظلمت ہی ظلمت تھی، ہر جگہ برائی ہی برائی پھیلی ہوئی تھی سوائے چند اہل حق کتابیوں کے جو پہاڑوں میں اور گھاٹیوں میں پڑے ہوئے تھے اور بستیوں میں ان کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ تو کلیتہً دنیا میں ایسا دور تو کبھی نہیں آیا کہ حق سرے سے باقی ہی نہ رہے۔ یہ دنیا قائم ہی حق کے اوپر ہے۔ باطل محض

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۸۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۰۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمها، باب الصفات التی یعرف بها اهل الجنۃ، ص: ۱۱۷۴ رقم: ۷۲۰۷۔

ہو تو دنیا اسی دن تباہ کردی جائے گی۔ تو ایسا کوئی دور نہیں آیا کہ حق سرے سے دنیا میں نہ رہے یہ ضرور ہوتا ہے کہ حق مخفی ہو گیا، مغلوب ہو گیا، کم ہو گیا، لیکن رہا ضرور۔

تو اس دور میں یہ کیفیت تھی فرمایا کہ "اِلَّا غُبَرَ اَهْلِ الْكِتٰبِ" سوائے چند اہلِ کتاب کے جو بیچارے گرد آلود اور بہت ہی پھٹے پرانے حال میں پہاڑوں اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے اپنے دین کو بچائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے دنیا قائم تھی، اگر دنیا میں اتنا حق بھی نہ ہوتا تو یہ (دنیا کا) خیمہ اُکھڑ جاتا۔ حدیث شریف میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ" قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا دنیا کے اندر موجود رہے گا، جب ایک بھی نہ رہے گا اسی وقت قیامت قائم کردی جائیگی۔ ① تو قیامت عالم کی موت کا نام ہے یعنی موت نہیں آئے گی جب تک حیات کی ذرا بھی رمق باقی رہے گی اور اس عالم کی حیات اللہ کا ذکر اور اس کا نام ہے۔ تو ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود رہے گا تو قیامت نہیں آئیگی، جب ایک بھی نہیں رہے گا وہی وقت عالم کی موت کا ہوگا۔ اس لئے آدم علیہ السلام سے لیکر قیامِ قیامت تک کوئی دور ایسا نہیں آیا اور نہ آئے گا جس میں حق کا نام ونشان باقی نہ رہے۔ بس جب دنیا کو ختم کرنا ہوگا تب حق کا نشان مٹ جائے گا باطل ہی باطل رہ جائے گا۔ تو اس زمانۂ جاہلیت میں جب باطل انتہا کو پہنچ گیا تھا، جب ظلمتیں انتہا کو پہنچ گئی تھیں ...... تب بھی گنے چنے اہلِ کتاب یعنی اہلِ حق موجود تھے، جو پہاڑوں میں پڑے ہوئے تھے ۔بستیوں سے الگ چھپے ہوئے تھے، وہ اللہ کا نام لیتے تھے جس کی وجہ سے یہ (دنیا کا) خیمہ کھڑا تھا۔ عام حالت ظلمت کی تھی تو اللہ نے بنی آدم کے قلوب پر نگاہ کی " فَمَقَتَ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ " غضب آلود نگاہ سے دیکھا عرب کو بھی عجم کو بھی۔ قلوب کے اندر خیر باقی نہیں تھی ظلمت ہی ظلمت تھی۔ ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ ان اندھیریوں میں غیرتِ خداوندی جوش میں آئی کہ اس ظلمت میں چاندنا کیا جائے تو فاران کی چوٹیوں سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ہاتھ میں سورج تھا اور ایک ہاتھ میں چاند۔ دو روشن چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھیں، ایک چمکتا ہوا سورج اور ایک چمکتا ہوا چاند۔ کیونکہ اس ظلمت کو دور کرنے کے لئے دو قسم کی روشنیوں کی ضرورت تھی، دُھری روشنی کی ضرورت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لائے کہ دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور بائیں ہاتھ میں چاند۔ آپ سمجھے ہوں گے کہ وہ یہ سورج ہوگا جو آسمان پر چمکتا ہے اور یہ چاند ہوگا جو رات کو چمکتا ہے۔ ان چاند و سورج کی کوئی حیثیت اور وقعت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت کے سامنے ان انوار کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

آپ کا اعلانِ تبلیغ اور عرب قوم کا طرزِ عمل ...... انکی تو کُل حیثیت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

① الصحیح لمسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها، باب الصفات التي يعرف بها اهل الجنة، ص: ۱۱۷۴ رقم: ۷۲۰۷.

جب راہِ حق کی دعوت دی اور پورا عرب دشمن ہو گیا تو قریش نے مل کر ابو طالب کو واسطہ بنایا اور کہا: خدا کیلئے اپنے بھتیجے سے کہہ دو کہ وہ جو چاہے ہم سے لے لے مگر ہمارے بتوں کا برائی سے نام نہ لے، ہمارے دین کی تفسیخک نہ کرے، وہ جو چاہے ہم سے لے لے۔ تم اپنے بھتیجے کو سمجھا دو ورنہ پھر اس کے بعد ہمارے اوپر ذمہ داری نہیں رہے گی۔ تو ابو طالب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: کہ اے میرے بھتیجے! قوم نے مجھے وکیل بنا کے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میں قوم کا پیغام تیرے پاس پہنچا دوں اور وہ یہ ہے کہ تو نے۔ وہ دعویٰ کیا ہے اور دعوت دینا شروع کی ہے اگر تیرا مقصد یہ ہے کہ کچھ پیسے روپے جمع ہوں، سونا چاندی جمع ہو...... تو تیری قوم اس کے لئے تیار ہے کہ پورے ملک کا سونا جمع کر کے تیرے قدموں میں ڈال دیا جائے، اگر حسن و جمال مقصود ہے تو قریش کی بیٹیاں حاضر ہیں جس کو تو چاہے قبول کر لے، اگر سرداری مطلوب ہے تو آج سے ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ تجھے پورے عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیں اور ہم تمہارے سامنے رعیت کی حیثیت سے آ جائیں...... جو تمہارا مقصد ہو کر لو مگر خدا کے لئے ہمارے معبودوں کو جو ہم نے بنا رکھے ہیں ان کو برا بھلا مت کہو اور ہمارے دین کے بارے میں کوئی برا کلمہ استعمال مت کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے چچا! کہہ چکے جو تم نے کہنا تھا؟ قوم کا پیغام سنا چکے؟ ابو طالب نے کہا: ہاں سُنا چکا۔ فرمایا کہ میری طرف سے تم انہیں کہہ دو کہ اے میری قوم! تم اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج لا کر رکھ دو اور ایک ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دو تب بھی میں یہ کلمہ کہنا نہیں چھوڑوں گا جو میں زبان سے نکال چکا ہوں...... بس یا تو میں اپنی جان ختم کر دوں گا یا دنیا میں اس کلمہ کو پھیلا کر رہوں گا۔ تو اس چاند سورج کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کُل یہ حقیقت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ دونوں بھی آ جائیں تو میں اپنا کلمہ چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ یعنی وہ کلمہ جس کو میں لے کر کھڑا ہوا ہوں جو توحید و رسالت کا بیان ہے، اس کے مقابلے میں اس چاند سورج کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ① تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں جو تشریف لائے تو ہاتھ میں یہ چاند سورج نہیں تھا۔ اس چاند سورج کی تو کوئی وقعت اور حقیقت ہی نہیں ہے۔ میری مُراد سورج اور چاند سے کیا ہے......؟ آپ اس شان سے آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب موجود تھی جو سورج سے زیادہ روشن تھی اور بائیں جانب ''قلبِ محمدی'' تھا جس میں اخلاق کی نورانیت بھری ہوئی تھی۔ تو ایک طرف آفتاب کہ جس کی روشنی علم خداوندی تھی، یعنی قرآن کریم جو اس علم سے لبریز ہے۔ اور ایک طرف اخلاقِ محمدی کی روشنی تھی جو قلبِ نبوت میں بھرے ہوئے تھے۔ تو دو چیزیں آپ لے کر آئے تھے ایک چمکتا ہوا علم اور ایک چمکتے ہوئے اخلاق۔ ایک روشن کتاب اور ایک روشن دل۔

بنیادِ نبوت ......اور یہ اس لئے کہ بہر حال حکماء و فلاسفہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ چاند میں خود اپنی روشنی نہیں ہوتی۔

① الابانة الكبرى، ج: ١٠ ص: ٩٣.

بلکہ سورج اس کے مقابلہ میں آتا ہے سورج ہی کی روشنی اس میں سے ہو کر گزرتی ہے تو وہ ٹھنڈی بن جاتی ہے۔ وہی سورج کی تیز روشنی تھی جب چاند میں آتی ہے تو وطن کی اور موقع کی خصوصیات کی وجہ سے اسمیں ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے آگ کو اگر کسی خاص وطن سے اور موقع سے گزارا جائے تو وہ برودت کے آثار پیدا کرتی ہے۔

یہی آپ کی بجلی جو پاور ہاؤس سے چلتی ہے اگر آپ اس کو کسی مشین کے اندر لگا دیں تو وہ آگ ہے (ہیٹر وغیرہ)، اس میں تیزی ہے، اسمیں گرمی اور حدت ہے، ہاتھ لگا دیں تو آپ کے ہاتھ کو پکڑ لے گی اور جلا دے گی لیکن یہی بجلی اگر اس کو ریفریجریٹر کے ذریعہ سے نمایاں کریں تو یہی بجلی ٹھنڈی ہو جاتی ہے، پھل رکھ دو تو ٹھنڈے ہوں گے، کھانا رکھ دو تو ٹھنڈا ہوگا۔ یہ وہی آگ ہے جو پاور ہاؤس سے چلتی ہے لیکن مقام اور موسم کی خصوصیت کی وجہ سے اسمیں ٹھنڈک کے آثار پیدا ہو گئے۔ تو ایک چیز ایک جگہ آگ ہوتی ہے جو قابل تحمل نہیں ہوتی اور وہی چیز دوسرے مقام میں لا کے رکھی جائے تو قابل برداشت ہو جاتی ہے۔

تو اللہ کی چمکتی ہوئی کتاب یعنی علمِ خداوندی اتنا بالا اور اُونچا تھا کہ مخلوق اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی مگر جب اسی علم الٰہی کو قلبِ نبوت سے گزارا گیا اسمیں اعتدال کی روشنی پیدا ہو گئی۔ اس میں ٹھنڈک اور برودت آ گئی جو قابل قبول بن گئی تاکہ دنیا اس سے استفادہ کر سکے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا میں اس شان سے تشریف لائے کہ آپ کے ایک ہاتھ میں سورج تھا یعنی اللہ کی روشن کتاب اور ایک ہاتھ میں چاند تھا یعنی اخلاق نبوت اسمیں بھرے ہوئے تھے اور اسمیں روشنی بھی تھی۔ تو ایک علم اور ایک اخلاق۔ یہ چیزیں آپ لے کر آئے۔ آپ دیکھیں اور غور کریں کہ نبوت کی بنیاد دو چیزوں کے اوپر ہے ایک علمی کمال اور ایک عملی کمال۔ یہی دونوں چیزیں ہیں جو تمام کائنات کی سعادت ہیں۔ علم کامل اور عمل کامل، اگر علم نہ ہو روشنی نہیں ہو سکتی، راستہ نظر نہیں آ سکتا، منزل مقصود سامنے نہیں آ سکتی اور اگر اخلاق نہ ہوں تو راستہ کے اوپر چلنے کی قوت پیدا نہیں ہو سکتی، اخلاق قوت مہیا کرتے ہیں، علم راستہ نمایاں کرتا ہے تو عالم کا علم اس کو چلا نہیں سکتا، صرف راستہ دکھلانا علم کا کام ہے، چلنا آدمی قوت سے ہے۔ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تب منزلِ مقصود پر آدمی پہنچتا ہے۔ تو اس لئے علم کی بھی ضرورت پڑتی ہے عمل کی بھی تو نبوت کی بنیاد دو چیزیں ہیں: ایک علمی کمال اور ایک اخلاقی کمال۔

کمالِ علم و عمل کی کُل چار قسمیں ہیں...... اسی واسطے قرآن کریم میں کمالِ علم اور کمالِ عمل کے لحاظ سے چار نوعیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک آیت کریمہ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ ① جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ کن لوگوں کے ساتھ ہوگا؟ وہ نبیوں کے، صدیقوں کے، شہداء کے اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ تو چار قسمیں بیان کی گئی ہیں: ایک نبی، ایک صدیق، ایک شہید اور ایک صالح۔ غور کیا جائے تو یہ چاروں

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۶۹.

قسمیں علم اور عمل کے لحاظ سے مزید دو قسمیں ہیں۔ علم کی بارگاہ کی دو قسمیں ہیں نبی اور صدیق اور عمل کی بارگاہ کی بھی دو قسمیں ہیں شہید اور صالح۔ پہلی قسم: یعنی علم اولاً نبی کے قلب پر آتا ہے کہ نبی علم کے لحاظ سے اصل ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق کرنے والے کو صدیق کہتے ہیں۔ تو صدیق اور تصدیق یہ بھی علم کی ایک قسم ہے۔ نبی گویا نَبأ سے ہے جس کے معنی خبر دینے کے ہیں۔ اور صدیق کے معنی تصدیق کنندہ کے ہیں اور تصدیق خود علم کی قسم ہے تو حاصل یہ نکلا کہ نبی اور صدیق یہ علم کے دو افراد ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ نبی علم میں اصل ہے اور صدیق تابع ہے۔ بالذات اور اصل علم کے لحاظ سے نبی ہے اور تابع ہونے کی حیثیت دیکھی جائے تو وہ صدیق کی ہے۔ تو صدیق نبی کے تابع ہوتا ہے اس لئے علم کے دو افراد ہو گئے: ایک نبی اور ایک صدیق۔ عمل کے بھی دو ہی افراد ہیں ایک شہید اور ایک صالح۔ شہید اصل ہوتا ہے عمل میں اور صالح اس کے تابع ہوتا ہے۔ شہید اسے کہتے ہیں جو اللہ کے راستے میں فقط خواہشات ہی نہیں بلکہ اپنے نفس کو بھی ختم کر دے۔ جو جان تک اللہ کے راستے میں لگا دے وہ شہید ہے اور صالح اس کو کہتے ہیں جو نیکی کا راستہ اختیار کر لے یعنی نفس کی خواہشات کو پامال کرتا رہے جو اللہ کی مرضی کو آگے رکھے اسے صالح کہتے ہیں۔ تو شہید اگر جان دے کر فضا ہموار نہ کرے صالحین کی صلاح چل نہیں سکتی۔ صالحین اپنی صلاح پر جبھی قائم رہیں گے جب فضا پُر امن ہو فتنے نہ ہوں اور امن قائم ہو۔ اگر دنیا میں فتنہ پھیلا ہوا ہے تو نمازی کو نماز کی ہوش رہے گی نہ تلاوت کرنیوالے کو تلاوت کا ہوش رہے گا، نہ درود پڑھنے والے کو درود کا ہوش رہے گا تو شہداء اپنی جان دے کر فضا صاف کرتے ہیں تاکہ صالحین اپنی صلاح کو برت سکیں۔ اس لئے اعلیٰ ترین عمل شہید کا ہوتا ہے، صالح اس کے تابع ہوتا ہے تو عمل میں شہید اصل ہے اور صالح اس کے تابع۔ علم میں نبی اصل ہے صدیق اس کے تابع ہے۔ تو ایک علم کا کمال ہے اور ایک عمل کا کمال ہے۔ تو دو فرد علم کے ہیں اور دو فرد عمل کے ہیں، نبی اور صدیق علم کے فرد ہیں، ایک اصل اور ایک تابع۔ اور شہید اور صالح عمل کے افراد ہیں: ایک اصل اور ایک تابع۔ یہ دو چیزیں ہیں، تو معلوم ہوا کہ دنیا کے اندر سعادت کی بنیاد دو ہی چیزیں ہیں ایک علم اور ایک عمل۔ تو نبوت کی بنیاد در حقیقت یہی دو چیزیں ہیں انبیاء علیہم السلام ایک علمی کمال لے کر آتے ہیں اور ایک عملی کمال جن کو اخلاق کہا جاتا ہے۔ اخلاق عمل کی بنیاد ہوتے ہیں۔

عمل کی بنیاد اخلاق ہیں...... اخلاق عمل کی بنیاد ہوتے ہیں اگر اندر اخلاق نہ ہوں عمل سرزد نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے اندر شجاعت کے اخلاق موجود ہیں تو حملہ آوری، ہجوم اور اِقدام کے افعال آپ سے سرزد ہوں گے، اگر آپ کے اندر سخاوت کا مادہ اور خُلق موجود ہے تو داد و دہش، دینا اور غریبوں کے ہاتھ پہ رکھنے کے افعال آپ کے ہاتھ سے نمایاں ہوں گے، اگر بخل کا مادہ موجود ہے تو آپ عطاء نہیں کریں گے، اگر بزدلی کا مادہ موجود ہے تو آپ پیچھے کو ہٹیں گے۔ تو اندر کا مادہ فعل کو حرکت دیتا ہے۔ اسی اندرونی مادے کو جو فعل کو حرکت میں لایا اخلاق کہتے ہیں تو جیسے اخلاق ہوں گے ویسے اعمال سرزد ہوں گے تو عمل کی قوتیں در حقیقت اخلاق ہیں لیکن اخلاق اپنا کام کر نہیں

سکتے جب تک کہ راستہ نظر نہ آئے، علم راستہ دکھاتا ہے۔ تو دو ہی چیزیں کمالات کی بنیاد ہو گئیں ایک علم اور ایک اخلاق۔ علم راہ دکھلائے گا اور اخلاق اس پر چلائیں گے، اخلاقی قوت آدمی کو اس پر دوڑائے گی۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ریل گاڑی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ انجن دوڑتا ہے اور ہزاروں لاکھوں من بوجھ والی لوہے کی گاڑی کو اپنے ساتھ کھینچ کر لے جاتا ہے، مگر انجن کے چلنے اور منزل تک پہنچنے کی شرط کیا ہے؟ ایک تو یہ کہ اس کے سامنے لائن بنی ہوئی ہو، لوہے کی لائن اس کے سامنے بچھی ہوئی ہو، جس پر انجن کو اتارا جا سکے اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے اندر اسٹیم کی طاقت بھری ہوئی ہو، آگ اور پانی کو جمع کر کے بھاپ کی طاقت اس کے اندر بھر دی جائے۔ تو اگر لائن بچھی ہوئی نہ ہو تب بھی انجن نہیں چل سکتا اور لائن بچھی ہوئی ہو مگر انجن کے اندر اسٹیم کی طاقت نہیں ہے تب بھی انجن نہیں چل سکتا۔ لائن پر انجن کھڑا ہوا ہے مگر اندر نہ آگ ہے نہ پانی اور بھاپ کی طاقت پیدا نہیں ہوتی تو دھکیل دھکیل کے آپ اسے کہاں تک چلائیں گے؟ ہزاروں آدمی مل کر دھکا دینے لگیں گے تو یہ بالشت بھر چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا۔ تو جب تک انجن کے اندر چلنے کی طاقت نہ ہو تو نہیں چل سکتا۔ اور اگر اندر طاقت بھری ہوئی ہے مگر لائن بچھی ہوئی نہیں ہے تو جتنا زور سے چلے گا زمین میں دھنستا چلا جائے گا، منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچے گا۔ تو منزل مقصود تک پہنچنے کی دو ہی شرطیں ہیں کہ لائن بھی بچھی ہوئی ہو اور اس لائن پر چلنے کی قوت بھی موجود ہو اور اسٹیم کی طاقت بھی ہو تب چلے گا۔ اور چلے گا تو پھر ایسا چلے گا آپ اس کے ساتھ ہزار ہا من لوہا اور ہزار ہا من بوجھ جوڑ دیں سب کو گھسیٹ کر منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔ ہزاروں ڈبے، ہزاروں انسان، ہزاروں اشیاء اور سامان سب کو گھسیٹ گھساٹ کے منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔ اس لئے دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

شریعت اور طریقت کا حسین امتزاج...... تو ٹھیک اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر انسان مثل انجن کے ہے، اس میں بھی دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ اس کے سامنے کھلا ہوا چلنے کا سیدھا راستہ، اسے منزل سامنے نظر آئے اور ایک اس کے اندر چلنے کی طاقت موجود ہو، تو وہ سیدھا راستہ جس پر چل کر یہ منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی کا نام صراط مستقیم ہے اور شریعت حقہ ہے ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ ① یہ ہے میرا سیدھا راستہ، اس کا اتباع کرو اس کی پیروی کرو۔ تو وہ راستہ جس پر آدمی چلے گا اس کا نام شریعت ہے لیکن راستہ سامنے ہو، محض نظر آ جائے، مگر اندر چلنے کی طاقت نہ ہو تو آدمی چل نہیں سکے گا۔ وہ اندر کی طاقت کیا ہے؟ وہ اخلاق کی قوت ہے...... جس کو طریقت، ریاضت اور مجاہدہ سے پیدا کرتی ہے، پھر عشق نبوی کی وہ آگ پیدا ہوتی ہے جو ہر مسلمان کے اندر سلگ رہی ہے تو آگ اور اسٹیم اسے اس راستے کے اُوپر دوڑاتی ہے۔ اگر راستہ سرے سے نہیں ہے چلنے کی کوئی شکل نہیں ہے اور نہ اندر عشق محمدی موجود ہے نہ عشق خداوندی موجود ہے تو اس میں چلنے اور دوڑنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ تو شریعت کا علم راستہ دکھلاتا ہے اور طریقت کی ریاضت چلنے کی طاقت پیدا کرتی ہے۔ جب دونوں

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۳۔

چیزیں جمع ہوتی ہیں تو پھرایسے آدمی صرف خود ہی نہیں چلتے بلکہ ان کے پیچھے ہزاروں انسانوں کو جوڑ دو وہ سب کو گھسیٹ کر منزلِ مقصود تک پہنچادیتے ہیں ۔ان میں اس کی طاقت ہوتی ہے ۔تو دو طاقتوں کی ضرورت ہے ایک شریعت کی طاقت اور ایک طریقت کی طاقت ۔طریقت اخلاق بنائے گی اور شریعت راستہ دکھلائے گی: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ انسان کے لئے مدرسہ کی بھی ضرورت ہے اور خانقاہ کی بھی ضرورت ہے ۔اگر مدرسہ نہ ہواور تعلیم نہ ہوتو علم سامنے نہیں آسکتا اور اگر خانقاہ نہ ہواور اخلاق درست نہ ہوں تو چلنے کی طاقت پیدا نہیں ہوسکتی ۔تو مدرسہ اور خانقاہ دونوں کو جمع کیا جائے جب جا کے آدمی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

مولویت اور صوفیت میں جنگ کیوں؟ ...... میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ جو آجکل مولویوں اور صوفیوں کی جنگ چھڑی ہوئی ہے پچھلوں کی جنگ تو ایسی نہ تھی ۔ اگر حقیقی معنوں میں ایک سچا عالم ہوتو صوفی کا اس سے زیادہ قدردان کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا ۔اور اگر سچا درویش اور صوفی ہوتو عالم کا اس سے زیادہ قدردان کوئی نہیں ہوسکتا ۔لیکن اگر علم بھی ناتمام ہواور عشق بھی ناتمام ہوتو یہ اس کا مدِّ مقابل ہوگا وہ اس کا مدِّ مقابل ہوگا ۔ یہ لڑائی اب بعد کے لوگوں میں چلی ہے ، پہلے کے کاملین میں کبھی لڑائی پیدا نہیں ہوئی ۔

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی محفل سماع اور حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا احتساب

......حضرت سلطان المشائخ وسلطان الاولیاء خواجہ نظام الدین دہلویؒ آپ جانتے ہیں کہ کتنے بڑے پائے کے عالم ہیں ، درویش ہیں ،صوفیاءِ چشتیہ میں اُن کا آفتاب کا سا مقام ہے ۔ایک روشن دل اللہ نے ان کو عطاء فرمایا تھا ۔ بہت بڑی ذات ہے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی ۔ اُس زمانے میں جبکہ حضرت خواجہ کے فیوض وبرکات سے دنیا مالا مال ہورہی تھی ، اخلاقی دولتیں کما کما کے لے جارہی تھی ...... اسی زمانے میں حکومت کی طرف سے حکیم ضیاء الدین سنامی رحمۃ اللہ علیہ جو کوتوال اور محتسب تھے اس کی نگرانی کرتے تھے کہ کوئی بداخلاقی یا خلافِ شرع حرکت نہ کرنے پائے ۔کسی کو بھی دیکھا کہ بدعات میں مبتلا ہے یا خلافِ شرع امور میں مبتلا ہے فوراً گرفتار کرتے تھے ۔پھر حکومت کی جانب سے احتساب ہوتا تھا اور سزائیں دی جاتی تھیں ۔

پہلے تو یہ واقعہ سُناؤں کہ دونوں کا مقام کیا ہے؟ حضرت سلطان المشائخ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یارانِ طریقت بیٹھے ہوئے تھے اور سماع ہورہا تھا مگر سماع کی صورت باجے گاجے کی نہیں تھی جو مُحَقِّق مشائخ ہیں ان کے ہاں مزامیر اور باجے گاجے نہیں ہوتے ۔ سماع کے معنیٰ یہ تھے کہ خوش آوازی سے پڑھنے والا کوئی نعت پڑھ رہا تھا کوئی غزل پڑھ رہا تھا جس میں اربابِ احوال کے قلوب کی گرہیں کُھل جاتی تھیں ، گُتھیاں کھل جاتی تھیں تو خوش آوازی سے کوئی پڑھنے والا مغنّی پڑھ رہا تھا اور سب پر حالات طاری ہورہے تھے اور کیفیات طاری ہورہی تھیں ۔ اس لئے کہ سماع حضراتِ صوفیاء نے حظِّ نفس کے لئے نہیں سُنا ۔ جب قبض طاری ہوتو قبض کو دفع کرنے کا ایک

علاج ہے ایک معالجہ ہے کوئی غذا نہیں ہے کہ رات دن کھائی جائے۔

محض ایک علاج ہے معالجہ کے طور پر اسے استعمال کرتے تھے تو انقباض رفع کرنے کے لئے یارانِ طریقت جمع تھے اور جائز حدود میں سماع ہو رہا تھا اس میں ''مزامیر'' نہیں تھے، باجے گاجے نہیں تھے مگر ظاہری طور پر بظاہر ایک ایسی چیز تھی کہ خلافِ شرع مجمع نظر آتا تھا۔ یا اس درجہ کی چیز تھی کہ یہ تو خواص ہیں مگر ان کے اس فعل کو دیکھ کر عوام کہیں باجے گاجے بھی استعمال نہ کرنے لگ جائیں۔ تو حکیم ضیاء الدین سنامیؒ نے آکر اس کو روکنا چاہا اور ڈانٹ کر کہا کہ خلافِ شرع امر بند کرو مگر وہاں ہوش کسے تھا جو سُنتا، وہاں تو سب اربابِ احوال تھے اپنے اپنے حال میں غرق، لہٰذا کسی نے نہ سُنا۔ حکیم ضیاء الدینؒ نے دیکھا کہ کوئی سُنتا نہیں...... سمجھ گئے کہ صاحبِ حال لوگ ہیں، یہ نہیں کہ کوئی بغاوت یا تمرّد کر رہے ہیں، بلکہ واقعی حال میں غرق ہیں تو اوّل تو اتمامِ حجت کے لئے زور سے کہا کہ بند کرو اس سماع کو، لوگوں میں اس سے فتنہ پھیلے گا، وہاں کون سُنتا تھا۔ سارے صاحبِ حال تھے تو حکیم ضیاء الدینؒ نے حکم دیا کہ خیمے کی طنابیں کاٹ دو، جب خیمہ ان کے سر پر گرے گا جب یہ سماع کو بند کریں گے۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر طنابیں کاٹ دیں، مگر وہ خیمہ ہوا کے اوپر قائم رہا۔ ساری رسیاں کٹ گئیں خیمہ نہیں گرا۔ اب بے چارے حکیم ضیاء الدینؒ صاحب کیا کریں! امر بالمعروف بھی کر دیا اور تغییر بالید بھی کر دی کہ ہاتھ سے اس چیز کو مٹانا بھی چاہا مگر نہیں مٹی، اس واسطے کہ وہ تو سچے لوگ سن رہے تھے سب کے سب اربابِ حال تھے۔ اب یہ دیکھا کہ کسی طرح نہیں بن پڑی تو یہ خیال ہوا کہ کہیں سپاہیوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہی امرِ حق ہے، یہ خواہ مخواہ ہم سے امرِ حق کا مقابلہ کرا رہے ہیں تو کہا دیکھو کہ یہ سارے بدعتی ہیں اور بدعت میں مبتلا لوگ ہیں مگر اس وقت یہاں سے چلو، اس وقت یہ غرق ہیں، کسی دوسرے وقت میں امر بالمعروف کریں گے۔ چنانچہ اپنے سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے گئے اور خیمہ اسی طرح کھڑا رہا۔ تو سماع کی یہ کیفیت تھی تو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے مُریدین اور جو بیٹھنے والے تھے چونکہ سارے سچے تھے، اربابِ حال تھے، اور سماع کسی حظِ نفس کے لئے نہیں تھا بلکہ ترقیٔ مدارج کے لئے یا رفعِ قبض کے لئے تھا۔ اس سچائی کی وجہ سے خیمہ اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ اپنی جگہ درست تھے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی ڈانٹ ڈپٹ اپنی جگہ درست تھی۔ اس واسطے کہ وہ نظامِ شریعت کے قائم کنندہ تھے، انکی حیثیت پولیس اور فوج کی تھی۔ تو پولیس کا کام یہی ہے کہ قانون کے خلاف کوئی چیز دیکھے تو فوراً ڈانٹ ڈپٹ کرے۔

حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مقام...... اس کے ساتھ ساتھ دوسری کیفیت یہ تھی کہ جب حکیم ضیاء الدینؒ کی وفات کا وقت آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت کی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے اور اطلاع کرائی کہ جا کے حکیم ضیاء الدین سے عرض کیا جائے کہ نظام الدین مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ہے تو حکیم صاحب نے اندر سے جواب بھجوایا کہ روک دو، میں بدعتی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ خواجہ نظام الدینؒ نے جواب بھجوایا کہ عرض کر دو کہ بدعتی بدعت سے توبہ کرنے کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔ اسی وقت حکیم ضیاء الدینؒ نے

اپنی پگڑی بھیجی کہ اسے بچھا کے خواجہ صاحبؒ اس کے اوپر قدم رکھتے ہوئے آئیں اور جوتے کے ساتھ قدم رکھیں ننگے پاؤں نہ آئیں۔ خواجہ صاحبؒ نے پگڑی کو اُٹھا کے سر پہ رکھا کہ یہ میرے لئے دستارِ فضیلت ہے اور اس شان سے تشریف لے گئے، آ کر مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور حکیم ضیاء الدینؒ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی موجودگی ہی میں حکیم ضیاء الدینؒ کی وفات کا وقت آ گیا اور خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ الحمدللہ حکیم ضیاء الدینؒ کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا ہے کہ ترقی مدارج کے ساتھ ان کا انتقال ہوا۔

اپنے اپنے فرائض پہ دونوں قائم ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی پگڑی بھیجتے ہیں کہ جوتیوں سمیت قدم رکھ کے آئیں، ان کا یہ حال ہے کہ اسے سر کے اوپر رکھا کہ یہ میرے لئے دستارِ فضیلت ہے، میرے لئے سعادت ہے تو اِدھر ولی کامل ہیں جو طریقت میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور اُدھر عالم ربانی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کو پہچانتے ہیں اگر معاذ اللہ دونوں ناقص ہوتے...... وہ ان کے مقابل آتے اور وہ ان کے مقابل آتے۔ دنیا میں جھگڑا فتنہ پھیلنا شروع ہو جاتا تو کاملین کا فرق یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عظمت کو پہچانتے ہیں ایک دوسرے کی بڑائی اور بزرگی کو مانتے ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام...... انہیں حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ حضرت خواجہ صاحب کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے تو کسی نے ایک شعر پڑھا، خواجہ صاحبؒ پر وجد طاری ہوا اور کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے۔ حکیم ضیاء الدینؒ نے دامن جھٹک کر کہا: بیٹھ جاؤ! خبردار! شریعت کی عظمت کو سامنے رکھو۔ خواجہ صاحبؒ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد پھر کسی نے شعر پڑھا، خواجہ نظام الدین پر پھر وجد طاری ہوا پھر کھڑے ہو گئے تو حکیم ضیاء الدینؒ نے پھر دامن تھاما کہ بیٹھ جاؤ، آدابِ شرعیہ کو سامنے رکھو پھر بیٹھ گئے۔ تیسری دفعہ پھر کسی نے شعر پڑھا اور پورے وجد کے ساتھ خواجہ نظام الدین کھڑے ہوئے اور رقص کرنے لگے تو حکیم ضیاء الدینؒ بھی کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کے گردن جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو حکیم ضیاء الدینؒ سے پوچھا گیا کہ پہلے دو دفعہ میں تو تم نے دامن جھٹک کر خواجہ صاحبؒ کو بٹھا لیا اور تیسری دفعہ جب وہ کھڑے ہوئے تو تم بھی ان کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اگر بھلائی تھی تو پہلے کیوں روکا تھا؟ اور بُرائی تھی تو تیسری بار میں ہاتھ باندھ کے کیوں ساتھ ہو گئے؟ تو حکیم ضیاء الدینؒ نے جواب دیا کہ پہلی دفعہ جب خواجہ صاحبؒ کھڑے ہوئے تو انکی روح کو عروج ہوا، آسمانِ دنیا تک روح پہنچی، یہاں تک میری رسائی تھی میں پکڑ لایا اور کہا کہ تم فرشی ہو! بندگی کی صورت اختیار کرو، ایسا عروج مت اختیار کرو جو بندگی کی شان کے خلاف ہے، وہاں سے پکڑ لایا۔ دوبارہ عروج ہوا تو پھر حضرت خواجہ صاحبؒ کی روح ساتویں آسمان تک پہنچی، میری بھی وہاں تک رسائی تھی تو پھر پکڑ کے لایا کہ اپنی حد پر قائم رہو زیادہ عروج میں مت آؤ۔ تیسری دفعہ عروج ہوا تو تجلیاتِ الٰہیہ سامنے تھیں...... میں بھی ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا، میں بدعتی کی تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوا تھا بلکہ تجلیاتِ الٰہیہ کے

سامنے کھڑا ہوا تھا۔

صوفیاء کیلئے علماء کی ذمہ داری...... اس سے اندازہ ہوا کہ حکیم ضیاء الدین خود بھی صاحب باطن تھے مگر ان کو شریعت کے نظام کو قائم رکھنے، اس کی بقاء اور اس کے استحکام کا کام سپرد تھا تو علماء کی مثال پولیس جیسی ہے اور صوفیاء کی مثال ہے جیسے مقربانِ بادشاہی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے دربار میں ہروقت حاضر ہیں۔ تو بادشاہ کے دربار میں لوگ بعض اوقات ایسی بے تکلفی کی باتیں کرتے ہیں کہ باہر آ کے وہ باتیں نہیں کرسکتے۔ بادشاہ کی موجودگی میں بے تکلفانہ کرگزرتے ہیں لیکن وہی باتیں اگر سڑک پر آ کر کریں گے تو پولیس کے آگے جوابدہ ہونگے۔ وہ چلاتے رہیں کہ ہم تو مقربانِ بادشاہی ہیں۔ پولیس کہے گی کہ بادشاہ کی مجلس میں جا کے جو چاہے کرو، منظر عام پر جب آؤ گے تو قانون کی پابندی کرنے پڑے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم قانون کی حفاظت کریں، جب تم مقامِ قرب میں پہنچو اور بادشاہی دربار میں موجود ہو تو جو تمہارا جی چاہے کرو وہ قانون سے بالاتر چیز ہے لیکن جب آؤ گے سڑک پر، جب آؤ گے میدان میں، جب آؤ گے لوگوں میں...... تو یہاں قانون کی پابندی کرنا پڑے گی۔ ہم نہیں جانتے کہ تمہارا کیا حال ہے! کچھ بھی ہو مگر ہم قانون کے سپاہی ہیں تو علماء کی مثال پولیس جیسی ہے اور صوفیاء مقربانِ شاہی ہیں تو وہ اپنی بے تکلفی میں کچھ بھی کریں لیکن باہر آ کر کریں گے تو شریعت کے نظام کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

سماع کے بارے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط کا واقعہ...... میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند جو صرف عالم ہی نہیں تھے عارف کامل بھی تھے، ربانی بھی تھے، درویش بھی تھے، صاحب کشف وکرامات اور اولیاء اللہ میں سے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دفعہ کھلجے میں تشریف لے گئے۔ کھلجے میں حضرت کے بہت سے مریدین اور متوسلین تھے تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب جو حضرت کے شاگردوں کے شاگرد تھے، ان کے دیوان خانے میں عصر کے بعد حضرت کی مجلس ہوئی، چار پانچ سو آدمی حضرت کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، جنہوں نے مجھے یہ واقعہ سُنایا ان کا نام حاجی امیر شاہ صاحبؒ ہے، یہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص خدام میں سے تھے، مخصوص متوسلین میں سے تھے، انہوں نے واقعہ بیان کیا کہ حضرت کی مجلس تھی تو اس مجلس میں اچانک ان کا بھتیجا آ گیا۔ رنگ مست خان اس کا نام تھا، گلا نہایت بہتر پایا تھا، موسیقی کا بڑا بھاری استاذ تھا اور امیر شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اس کی حالت یہ تھی کہ ایک دفعہ ہم دوست احباب جمع تھے، کچھ کھانے پکانے کا سامان ہو رہا تھا تو کچھ دوست گوشت دھو رہے تھے کچھ پیاز کاٹ رہے تھے اور کچھ لوگ پانی کے گھڑے بھر رہے تھے یعنی سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے تو رنگ مست خان آ گیا اور اس نے آ کر مکان کے دروازے میں داخل ہوتے ہی حافظ شیرازیؒ کی یہ غزل شروع کی کہ:

غلام نرگسِ مستے کہ تاج دارانند ——— خرابِ بادۂ لعلے کہ ہوشیار انند

کہتے تھے کہ اس شان سے پڑھی ہے کہ ایسا سماں بندھا کہ جس کا چاقو پیاز میں تھا وہ پیاز ہی میں رہ گیا، جس کا

ہاتھ گھڑے پر تھا تو گھڑے پر رہ گیا، جو سل بٹے پر مصالحہ پیس رہا تھا اس کا ہاتھ بٹے پر رہ گیا جیسے معلوم ہو کہ سب پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی، لوگوں نے اپنے ہوش گم کر دیئے تو اس کی آواز اس غضب کی تھی۔

امیر شاہ صاحب مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں یہ رنگ مست خان آ گیا اور حضرت کی چارپائی پر پائنتیوں آ کے بیٹھ گیا۔ حضرت سرہانے بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب کہتے تھے کہ میرے پھوپھا نے حضرت کی پشت سے رنگ مست خان کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ شروع کر دے۔ اس نے یہ غزل شروع کی کہ:

غلام نرگسِ مستے کہ تاج دارانند

لیکن مست ''غلام نرگسِ مستے'' تک آیا اور آگے چپکا ہو گیا اس کے بعد میرے پھوپھا نے حضرتؒ کی پشت سے پھر اشارہ کیا کہ بھئی پڑھتا کیوں نہیں؟ اس نے پھر غزل شروع کی، اب کے ''غلام نرگسے'' تک آیا پھر چپ ہو گیا۔ پھر میرے پھوپھا نے گھورا کہ پڑھتا کیوں نہیں؟ تو پھر اس نے لے باندھ کر یہ شروع کی اب کے صرف ''غلام'' کہہ کر رک گیا اور چپ ہو گیا...... یہاں تک کہ مجلس برخاست ہو گئی۔ تو امیر شاہ صاحب کہتے تھے کہ میرے پھوپھا نے کہا کہ کم بخت! اس دن تو تو نے اس طرح پڑھا کہ سماں باندھ دیا اور معلوم ہوا کہ سب پر سکتہ طاری ہو گیا ہے آج تجھ پر کیا مصیبت آئی تھی؟ اس نے کہا جو مجھ پر مصیبت آئی وہ تم نے نہیں دیکھی۔ کہا کیا مصیبت آئی؟ کہا کہ پہلی دفعہ جب میں غلام نرگسِ مستے تک پہنچا ہوں تو حضرت نانوتویؒ کا ہاتھ بڑھا اور میری زبان پکڑ لی اب میں کیا کرتا چپ ہو گیا، پھر تم نے گھورا پھر میں نے شروع کیا، اب کے ''غلام نرگسے'' تک آیا تو حضرت کا ہاتھ پھر بڑھا اور میری زبان پکڑ لی، میں مجبور ہو کر چپکا ہو گیا تیسری دفعہ تم نے گھورا، پھر شروع کیا اب کے ''غلام'' کہنے پایا تھا کہ پھر زبان پکڑ لی۔ انہوں نے کہا: کہ ہم نے تو نہیں دیکھا! کہا: خدا کی قسم تینوں دفعہ ہاتھ بڑھا اور میری زبان کھینچ لی۔ یہ تو اس نے کہا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خان صاحب کو (یعنی امیر شاہ صاحب) کو خطاب کر کے ایک جملہ فرمایا...... جس سے ان لوگوں کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے، فرمایا: کہ خان صاحب جس طرح سے میں ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں اسی طرح مجھ پر مولویت کا دھبہ بھی لگا ہوا ہے، اس کی رعایت کرنا بھی آپ لوگوں کا فرض ہے۔ اب اگر یہ غزل اس طرح سے ہو جاتی تو کہنے والے یوں کہتے کہ مولوی بھی گانے بجانے کے اندر مشغول ہو گئے یہ کوئی نہ دیکھتا کہ کونسی جائز حد تھی اور کونسی ناجائز حد تھی!۔

جائز اور مشتبہات میں خواص کی ذمہ داری...... تو خواص کو بہت سی جائز چیزیں بھی ترک کرنا پڑتی ہیں، اس بناء پر کہ کہیں عوام اس سے آگے نہ مبتلا ہو جائے۔ عوام کی خاطر بعض جائز چیزیں ترک کر دینا پڑتی ہیں...... احتیاط سمجھ لیں، تقویٰ سمجھ لیں، بہرحال چھوڑ دینی پڑتی ہیں جیسے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَّبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ ①

① الصحيح للبخاری، كتاب الايمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ص: ٦ رقم: ٢.

حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام چیزیں بھی کھلی ہوئی ہیں، حلال وحرام کے بیچ میں کچھ چیزیں مشتبہ ہیں، ان میں حلال ہونے کا شائبہ بھی موجود ہے اور حرام ہونے کا شائبہ بھی موجود ہے۔ متقی وہ ہے جو ان مشتبہات سے بچ جائے، جو بچ کر جائیگا وہ اپنے دین کو ہر بُرائی سے بری کر لے جائیگا۔ تو مشتبہات سے بچنا یہ تقوی کا ایک شعبہ ہے اور کاملین مشتبہات سے تو ضرور بلکہ بعض جائز چیزوں سے بھی بچ جاتے ہیں کہ لوگ حرام میں نہ مُبتلا ہو جائیں۔

عوام کو مکروہات سے بچانے کیلئے علماء کا جائز کو ترک کرنا...... امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اثر نقل کیا ہے اور اس کو حدیث مرفوع کہا ہے، سند جس درجے کی بھی ہو مگر بہر حال ایک چیز ہے جو قواعد شرعیہ کے بالکل مطابق ہے اور وہ اثر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جب علماء جائزات کے حصول کی فکر میں پڑ جائیں گے تو عوام مکروہات کا ارتکاب کریں گے، جب علماء مکروہات کا ارتکاب کریں گے تو عوام حرام میں مبتلا ہوں گے اور جب علماء حرام چیزوں میں مبتلا ہوں گے تو عوام کفر میں مبتلا ہوں گے۔ اس واسطے سب سے زیادہ احتیاط خواص کے لئے ضروری ہوتی ہے کہ وہ عوام کی خاطر اور ان کو بچانے کی خاطر مکروہات تو مکروہات بعض جائز چیزوں کا بھی ترک کردیں تا کہ ان کے جائزات کے ارتکاب کرنے سے عوام مکروہات کا ارتکاب نہ کرنے لگ جائیں تو حضرات اہل اللہ کی شان یہ تھی کہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ جس طرح میں صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مجھ پر مولویت کا دھبہ بھی لگا ہوا ہے اس کی رعایت رکھنا بھی آپ لوگوں کا فرض ہے۔ اگر یہ غزل آج ہو جاتی تو اس کے جائز ہونے میں کلام نہیں تھا یہاں کوئی باجے گاجے نہیں تھے کوئی ہارمونیم نہیں تھا، کوئی ستار وغیرہ نہیں تھا۔ خوش آوازی سے ایک بات ہوتی مگر بہر حال مجلس مولوی کی تھی عوام یہ کہتے کہ گانا بجانا ہو رہا ہے وہ پھر اپنے لئے ستار بھی جائز کر لیتے۔ اس واسطے یہ اہل اللہ اتنی احتیاط بُرتتے ہیں۔

مقامِ علم و مقامِ اخلاق...... تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مقام دو ہی ہیں: ایک علم کا مقام ہے اور ایک اخلاق کا مقام ہے۔ علم راستہ دکھلاتا ہے اخلاق چلنے کی قوت پیدا کرتے ہیں، دونوں چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں تب آدمی کامیاب ہوتا ہے۔ تو نبوت بھی درحقیقت دو ہی بنیادوں پر قائم ہے ایک کمالِ علمی ایک کمالِ اخلاقی، یہی دو چیزیں انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں اور یہی بنیادِ نبوت ہیں۔ جب یہ بنیاد نبوت کا معیار ہوئی تو اس سے خود سمجھ لیجئے کہ جو ذاتِ اقدس کمالِ علم میں اس رتبہ پر پہنچ جائے کہ اس رتبہ پر اور کوئی نہ پہنچا ہوا ہو اور اخلاقی کمال میں اس مقام پر پہنچ جائے کہ کوئی اس مقام پر بھی نہ آیا ہو تو وہی نبی سب سے بڑا نبی ہوگا، اس لئے کہ معیارِ نبوت جو کچھ تھا وہ اسمیں حدِ کمال پر آیا ہوا ہے۔

ذاتِ نبوی میں شانِ علم...... جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیکھا جائے تو علم کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ" مجھے اگلوں کے اور پچھلوں کے تمام علوم عطاء کر دیئے گئے ہیں جتنے پچھلوں کو علوم دیئے گئے...... تمام انبیاء جو جو علوم لے کر آئے ہیں

وہ سارے علوم میری ذات میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔تو اگلوں کے علوم یعنی انبیاءِ سابقین کے سارے علوم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہیں اور پچھلوں کے علوم بھی یعنی قیامت تک جو آنے والے ہیں؛ علماء، فضلاء اور حکماء وغیرہ ان سب کے علوم بھی۔ظاہر بات ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے پروردہ ہیں، وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم سے ہی مستفیض ہیں، وہ تو ہیں ہی آپ کے علوم، آپ ہی کی جوتیوں کے صدقے سے عالم عالم بنے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی جوتیوں کے صدقہ سے صدیق صدیق بنے، تو وہ تو ہیں ہی آپ کے علوم۔لیکن بتلایا گیا کہ پچھلے انبیاء کے جو علوم ہیں وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں جمع کر دیئے گئے ہیں کہ جتنے اگلوں کے علوم تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں جمع ہیں اور جتنے پچھلوں کے علوم تھے وہ بھی ایک ذات میں جمع ہیں۔تو ایک عظیم نکتۂ خیر اللہ نے پیدا کیا کہ اگلے اور پچھلے سارے علوم اس میں جمع کر دیئے گئے،

ذاتِ نبوی میں اجتماعِ علوم کی محسوس مثال......تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محسوس مثال علم کے لحاظ سے ایسی ہوگی جیسے کہ آپ اپنے اندر دیکھتے ہیں کہ چہرے پر آنکھ ہے تو آنکھ بھی عالم ہے مگر صورتا، رنگ کو دیکھے گی اور صورت وغیرہ کو پہچانے گی۔آوازوں کا پہچاننا یہ آنکھ کا کام نہیں، ہاں کان ہیں وہ آوازوں کا علم حاصل کرتے ہیں کہ آواز اچھی ہے یا بُری، بلند ہے یا پست، تو کان آوازوں کے عالم ہیں، وہ صورتیں نہیں دیکھتے۔ناک خوشبو اور بدبو کی عالم ہے وہ سونگھ کر بتلا دے گی کہ گلاب کا پھول ہے اور چنبیلی کا پھول ہے، لیکن ناک یہ چاہے کہ گلاب کی شکل دیکھ لے...... یہ ناک کا کام نہیں ہے۔زبان کا کام یہ ہے کہ وہ ذائقہ بتلائے کھٹا ہے یا میٹھا، یا نمکین ہے زبان کو اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ تو آوازیں سُن لے تو زبان کا یہ کام نہیں ہے۔تو اس چہرے میں آنکھ بھی موجود، کان بھی موجود، زبان بھی موجود اور ناک بھی موجود۔دوسرے لفظوں میں گویا یوں کہا جائے کہ یہ علماء کی ایک بستی ہے اور ہر فن کا عالم الگ الگ ہے۔آوازوں کا عالم کان ہے، صورتوں کی عالم آنکھ ہے، ذائقوں کی عالم زبان ہے، خوشبو اور بدبو کی عالم ناک ہے۔یہ سارے علماء ہیں اپنے اپنے موضوع کا علم رکھتے ہیں۔اور یہ اللہ کی صناعی اور حکمت ہے کہ اسی ایک بالشت کے چہرے میں ساری چیزیں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں۔کان میں اور آنکھ میں زیادہ سے زیادہ فرق ہے دو تین انچ کا، کان اور آنکھ میں کوئی زیادہ فاصلہ...... میل دو میل کا نہیں ہے کہ کان آنکھ کے کاموں میں دخل نہ دے سکے، کان کو یہ موقع نہیں ہے کہ وہ آنکھ کا کام سرانجام دے۔ملے ہوئے ہیں مگر اپنی حدود سے باہر قدم نہیں لے جاسکتے۔تو ہر ایک اپنے اپنے علمی کام میں مشغول ہے۔لیکن یہ سارے علوم کان، ناک، آنکھ، زبان کے...... یہ خدا تعالیٰ نے حسِ مشترک میں جمع کر دیئے ہیں؛ جس کو ''اُمُّ الدِّ مَاغ'' کہتے ہیں۔دماغ کا یہ جو ابتدائی حصہ ہے اس میں سارے علوم جمع ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب آپ آنکھ سے دیکھتے ہیں تو آنکھ تو دیکھ کر فارغ ہو جاتی ہے لیکن صورت دماغ میں موجود رہتی ہے۔اگر آنکھ میں صورت رہتی ہے تو پھر آنکھ نے اپنا کام جو ختم کیا تھا اور آنکھ پر پردہ آ گیا تھا تو صورت ماند ہو جانی چاہیے تھی، لیکن جس چیز کو آپ نے دیکھ لیا ہے دیکھنے کے بعد بھی آپ آنکھ بند کریں تب بھی

صورت آپ کے سامنے موجود رہتی ہے تو یہ کوئی خزانہ ہوگا جس میں یہ صورت جمع ہوجاتی ہے، وہی دماغ کا خزانہ ہے۔

آپ نے روٹی چکھ لی اور ذائقہ معلوم کرلیا لیکن جب کھانے پینے کا کام ختم ہوگیا تب بھی ذائقہ کا ایک اندازہ آپ کے قلب میں موجود ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں دستر خوان پر اتنے برس ہوئے میں نے کھانا کھایا تھا گویا اب تک وہی ذائقہ زبان میں موجود ہے تو یہ احساس کیسے ہے اب تک...... کیا یہ ذائقہ ابھی تک موجود نہیں ہے؟ کسی ذائقہ کا یاد رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ ذائقہ موجود ہے، کہ زبان نے ذائقہ چکھ لیا اور چکھ کر خزانے میں پہنچادیا وہاں موجود ہے۔ آنکھ نے صورت کو دیکھ لیا اور صورت کو لے جا کے خزانے کے اندر جمع کردیا، وہاں ساری صورتیں جمع ہیں اب جب آپ کا جی چاہے آپ انہیں دیکھ لیں۔ آپ نے اگر دِلّی کی سیر کی ہوگی جامع مسجد دیکھی ہوگی، لال قلعہ دیکھا ہوگا تو دیکھا تو ایک دفعہ تھا لیکن اگر دن میں دس بار اپنے ملتان میں بیٹھ کر دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار ۔۔۔ اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

بس جہاں گردن جھکائی پوری جامع مسجد سامنے موجود، پورا لال قلعہ سامنے موجود، تو کہیں تو جمع ہے...... تبھی تو سامنے ہوجاتا ہے، یقیناً اندر موجود ہے۔ تو یہ سارے حالات اندر کی کارگزاریاں ہیں اور جو کچھ انکی معلومات ہیں وہ آپ کے ذہن میں یا دماغ میں جمع ہیں تو یہ ام الدماغ ہے۔ یہ اُن سارے حالات کا مجموعہ ہے، اسمیں دیکھنے کی طاقت بھی ہے، سُننے کی طاقت بھی ہے، چکھنے کی طاقت بھی ہے اور خوشبو بدبو کے ادراک کی طاقت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سارے جب اپنا کام کر گذرتے ہیں تو ان کے محسوسات دماغ کے اندر جمع رہ جاتے ہیں تو خزانہ اصل ہوا، بلکہ غور کیا جائے تو دیکھنے میں آنکھ اصل نہیں ہے بلکہ دماغ ہی دیکھنے میں اصل ہے۔ دماغ متوجہ ہوتا ہے تب آنکھ دیکھتی ہے اگر دماغ متوجہ ہی نہ ہو آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ کُھلے بندوں آپ بازار چلے جائیں جہاں تماشے ہو رہے ہوں جب آپ واپس آئیں گے تو دوسرا بھائی کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑے تماشے ہو رہے تھے، آپ کہیں گے کیسا تماشہ؟ وہ کہے گا: یہ سب جلوس تھے اور رنگ رلیاں منائی جارہی تھیں...... لیکن آپ کہتے ہیں: میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا، وہ کہے گا: بندۂ خدا! آپکی آنکھ کھُلی ہوئی تھی کہ نہیں؟ تو آپ یہی کہیں گے کہ اوہو! میں اپنے دھیان میں ہی غرق رہا مجھے پتہ ہی نہیں چلا کیسا جلوس، معلوم ہوا کہ دیکھنے والا آنکھ نہیں ہے، آپ کا دل دیکھنے والا ہے، دل متوجہ نہیں تھا تو آنکھوں سے آپ کو کچھ نظر نہیں آیا تو اصل میں دیکھنے کا خزانہ اندر موجود ہے، چکھنے کا خزانہ اندر موجود ہے اور سُننے کا خزانہ اندر موجود ہے، یہ کان اور ناک وغیرہ محض آلات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کی خدانخواستہ آنکھ پھوڑ دی جائے تو دماغ میں اس سے خلل نہیں آتا، کان نہ رہیں تو دماغ میں نقصان نہیں ہوتا لیکن دماغ پر لاٹھی ماردی جائے تو آنکھ بے کار، پاؤں بھی بیکار اور ناک بھی بے کار پھر کوئی حواس اس کے اندر باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ جب خزانہ ٹوٹ گیا جہاں سے فیض پہنچ رہا تھا تو کان، ناک، آنکھ تو سب بے کار ہوگئے۔ لیکن اگر آنکھ، کان اور ناک باقی نہ رہے تو دماغ کا کوئی نقصان نہیں، اس واسطے کہ وہ اصل خزانہ ہے۔

جب یہ مثال سمجھ میں آ گئی تو غور کیجئے کہ اس عالم میں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ ہر نبی کا ایک مخصوص علم ہے، ہر نبی کو کچھ خصوصی علوم عطاء کئے گئے ہیں، لیکن دین ایک ہی دیا گیا۔ مگر دین کے بتلانے اور سمجھانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کو مختلف علوم دیئے گئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اساء وصفات کا علم دیا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ① یوسف علیہ السلام کو ملک گیری اور خوابوں کی تعبیر کا علم دیا گیا: ﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ ② حضرت خضر علیہ السلام کو علم لدنی دیا گیا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ③ داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کا علم دیا گیا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ﴾ ④ سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر کا علم دیا گیا کہ پرندوں کی بولیاں جانتے تھے: ﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ ⑤ ہر نبی کا ایک مخصوص علم ہے۔ تو سارے انبیاء ایسے ہیں کہ کوئی آنکھ ہے، کوئی ناک ہے اور کوئی کان ہے، مختلف علوم کے حامل ہیں۔ لیکن جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال اُمّ الدماغ کی ہے کہ سارے حواس کا علم لاکر اس دماغ میں جمع کر دیا گیا ہے۔

دماغ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے یا دماغ ہی نہ رہے تو آنکھ، ناک اور کان وغیرہ کچھ نہیں رہتا لیکن اگر آنکھ، کان اور ناک باقی نہ رہیں تو دماغ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا تو سارے انبیاء گذر چکے ہیں مگر دماغ اسی طرح قائم ہے۔ لیکن خدانخواستہ دماغ نہ ہوتا تو نہ آنکھ رہتی، نہ کان رہتے اور نہ ناک رہتی، کوئی چیز نہ رہتی۔ تو تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم درحقیقت خزانۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستفاد اور نکلے ہوئے ہیں۔ اصل نکتۂ خیر حق تعالیٰ کی جانب سے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے فیضان سے انبیاء میں نبوتوں کے علوم آئے یعنی سبب آپ بنائے گئے ہیں۔ آپ کے ذریعے سے اور آپ کے سبب سے انبیاء علیہم السلام کو علوم عطاء فرمائے گئے ہیں۔

نبی الانبیاء پر ایمان لانے کیلئے انبیاء کو پابند کیا گیا...... حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''خصائص کبریٰ'' میں یہ حدیث نقل کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں: ''اَنَا نَبِیُّ الْاَنْبِیَاءِ'' اور انبیاء امتوں کے نبی ہیں میں نبیوں کا نبی ہوں، میں نبیوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے اور کہا ہے کہ تم اس نبی پر ایمان لاؤ، فرمایا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ ⑥ اللہ نے نبیوں سے عہد لیا، کیا عہد لیا؟ کہ جب میں تمہیں کتاب بھی دوں، حکمت بھی دوں، نبوت بھی عطا کروں اور پھر وہ رسول عظیم الشان...... کونسا؟ وہ جو تم سب کی تصدیق کرے، جو کچھ میں نے تمہیں علوم دیئے ہیں ان سب کی تصدیق کرے تو تمہارا کام کیا ہوگا؟ ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ کہ تم اس کے اوپر ایمان

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۱. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۶۵.
④ پارہ: ۱۷، سورۃ الأنبیاء، الآیۃ: ۸۰ ⑤ پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶. ⑥ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

لاؤ، اگر زمانہ پاؤ تو ایمان لے آؤ اور نہ پاؤ تو اپنی قوموں کو ہدایت کرو کہ ایمان لائیں، یہ بھی تمہارا ایمان لانا ہے۔ جس سے اندازہ ہوا کہ آپ پر ایمان لانے کا نبیوں کو پابند کیا گیا ہے۔

اصل الاصل ایمان صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ اصل میں ایمان نبی کا ہوتا ہے۔ مؤمن جو ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ہمارا ایمان نبی کے ایمان کا عکس ہوتا ہے۔ ہم تم جو مؤمن ہیں اصلی مؤمن نہیں ہیں، اصلی مؤمن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض کے طفیل سے ہم ساروں پر ایمان کا عکس پڑ گیا تو ہم تم بھی مؤمن نظر آنے لگے۔ بالاستقلال ہمارا ایمان نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کے تابع محض ہے کیونکہ اصل حقیقی مؤمن آپ ہیں اور آپ کے ایمان کی چمک اور روشنی جس پر پڑ گئی وہ مؤمن کہلانے لگا تو اصل میں ایمان کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ ہمارے ایمان کا وجود تابع ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کے وجود کے۔

بالکل اسی طرح جیسا کہ آفتاب نکلے اور مختلف دھوپوں کے ٹکڑے آپ دنیا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں کوئی گول ہے، کوئی چوکور ہے، کوئی مثلث ہے اور کوئی مربع ہے تو اگر دھوپ سے پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ تو یوں کہے گی کہ آفتاب کا جز اور آفتاب کا ایک حصہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خود اصلی وجود کچھ نہیں، وجود تو آفتاب کا ہے اس کی وجہ سے میرا وجود بھی نظر آتا ہے۔ میں خود آفتاب سے کٹ کر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی بلکہ میرا وجود اسی وقت تک قائم ہے جبتک کہ میں آفتاب کی کرنوں سے وابستہ رہوں۔ اگر میں اس سے کٹ جاؤں تو میرا وجود ختم ہو جائے۔

تو مؤمن کے ایمان کا وجود اصل میں نبی کے ایمانی وجود کے تابع ہے۔ تو جب انبیاء علیہم السلام مؤمن بنائے گئے اور ہدایت کی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ تو ایسی صورت بن گئی کہ حقیقی ایمان صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے اور آپ کے فیضان سے پھر انبیاء علیہم السلام کو بھی ایمان عطاء کیا گیا۔ لہٰذا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و ایمان کا ''نکتۂ خیر'' ہیں۔

تو اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کہ اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ اگلوں کے...... یعنی سارے انبیاء علیہم السلام کو جو علوم دیئے گئے ہیں وہ میرے سینے میں جمع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضان سے دوسروں کو پہنچائے گئے ہیں۔ آپ حِسِ مشترک اور ام الدماغ ہیں۔ اور انبیاء مثل آنکھ، ناک اور کان کے ہیں۔ جس کسی کو بھی کوئی علم ملا...... اس علم کا فیض یہاں سے پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں: ''عُلِّمَ اٰدَمُ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا كَمَا عُلِّمْتُ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا'' آدم علیہ السلام کو سارے اسماء و صفات کا علم دیا گیا جیسا کہ سارے اسماء و صفات کا مجھے علم عطا کیا گیا ہے۔ ①

---

① کنز العمال، ج: ۱۲ ص: ۱۸۵، رقم: ۳۴۵۸۸ (الدیلمی عن ابی رافع)

تعبیر خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ علمی......حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیرِ خواب کا علم دیا گیا اور قرآن کریم میں متعدد واقعات خواب کی تعبیر کے آئے ہیں جو یوسف علیہ السلام سے وابستہ ہیں ۔ یہ بڑا عجیب علم ہے لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیکھا جائے تو آپ نے فقط خوابوں کی تعبیر ہی نہیں دی بلکہ فنِ تعبیر کے اصول بھی بتلا دیئے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت کے اندر بڑے بڑے مُعَبِّر بن گئے۔ تعبیر خواب کے امام پیدا ہو گئے، بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ تو یوسف علیہ السلام نے تعبیریں بتلائیں اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب کی تعبیر کے اصولِ کُلّی بتلائے۔ اس سے تعبیر دینے والے تیار ہو گئے جو کہ لاکھوں کی تعداد میں گذرے ہیں۔ یہ ایک مستقل علم اور فن بن گیا۔

تعبیر خواب کے عجائبات

واقعہ ۱: خواب میں آگ دیکھنا......امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ حضرت! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں۔ فرمایا کہ جلدی جا اور اپنے گھر سے بال بچوں اور سامان کو نکال دے، تیرا گھر گر پڑے گا۔ یہ گیا، جلدی جلدی سامان نکالا، بیوی بچوں کو نکالا، ساری چیزیں باہر نکالیں آخر چند گھنٹے کے بعد سارا مکان اوپر سے نیچے آن پڑا۔ تعبیر ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہو گئی۔ کوئی پانچ چھ ماہ کے بعد پھر ایک شخص آیا اور اس نے کہا: کہ حضرت! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں! فرمایا: چار پائی کے نیچے کھدائی کر! تجھے سونا ملے گا۔ کھدائی کی تو دیکھا کہ لاکھوں روپے خالص سونا، زرِ سُرخ ملا اور وہ شخص مالدار ہو گیا۔

لوگوں نے امام ابن سیرینؒ سے عرض کیا کہ ایک شخص نے یہی خواب دیکھا آپ نے اس کا تو گھر گروا دیا اور دوسرے نے وہی خواب دیکھا تو اُسے خزانہ دلا دیا۔ ایک نے کیا قصور کیا تھا اور دوسرے نے کونسا انعام کا کام کیا تھا، خواب تو ایک ہے! فرمایا کہ پہلے نے گرمی کے موسم میں خواب دیکھا تھا اور گرمی میں چار پائی کے نیچے آگ دیکھنا یہ انہدام بنیاد کی دلیل ہوتی ہے تو میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر جائے گا۔ دوسرے نے یہ خواب دیکھا سردی کے موسم میں اور سردی میں چار پائی کے نیچے آگ انتہائی نعمت اور خوشگوار چیز ہوتی ہے اور اس کی آگ کی صورت سونے کی صورت کے مشابہ ہوتی ہے تو میں نے تعبیر دیدی کہ سونا ملے گا۔ تو گویا فنِ تعبیرِ خواب کے اصول ہیں انہیں اصولوں کی رو سے تعبیریں منقّٰی ہو جاتی ہیں واضح ہو جاتی ہیں۔

واقعہ ۲: امام مالکؒ کا خواب اور ابن سیرین کی تعبیر......انہی ابن سیرینؒ اور امام مالکؒ کا زمانہ ہے۔ امام مالکؒ جلیل القدر امام ہیں، تابعی بھی ہیں اور صاحبِ مذہب ہیں۔ امام مالکؒ کی حالت یہ تھی کہ مدینہ منورہ سے انتہائی محبت تھی اور مدینہ کی محبت میں غرق تھے۔ درحقیقت محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی، اس کی وجہ سے امام مالکؒ کو مدینہ کی ایک ایک چیز عزیز تھی، مدینہ کی زمین کا ایک ایک ذرّہ عزیز تھا اور یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے

میں مدینہ کی زمین میں دفن ہو جاؤں۔ اس ڈر کی وجہ سے نفلی حج ادا نہیں کرتے تھے کہ کہیں مدینہ سے باہر میرا انتقال نہ ہو جائے۔ یہ چاہتے تھے کہ یہیں انتقال ہو اور یہیں دفن ہو جاؤں۔ جی چاہتا ہے حج نفل ادا کرنے کو مگر اس ڈر کی وجہ سے نہیں جاتے تھے۔

ایک دن خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دربار ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دربار میں حاضر ہیں تو بڑے درد و التجاء سے عرض کیا اور بڑی لجاجت سے کہا: کہ یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کر لے اور اسی ڈر کے مارے حج نفلی نہیں ادا کرتا کہ مدینہ سے باہر جا کے کہیں میرا انتقال نہ ہو جائے اور مدینہ سے باہر دفن نہ کر دیا جاؤں تو مجھے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ ابھی عمر کے کئی برس باقی ہیں تو ہر سال نفلی حج ادا کر لیا کروں گا۔ اس لئے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ اُٹھا کر اس طرح پانچ انگلیاں سامنے کر دیں اور ادھر انکی آنکھ کھل گئی۔ امام مالکؒ حیران کہ پانچ انگلیوں سے مراد آیا یہ ہے کہ پانچ ماہ تمہاری عمر کے رہ گئے ہیں! یا پانچ برس مراد ہیں! یا پانچ دن مراد ہیں! یا پانچ ہفتے مراد ہیں! میں نے عمر کی مدت پوچھی تھی آپ نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں...... اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ ہفتے مراد ہیں! پانچ ماہ مراد ہیں! یا پانچ برس!۔

اس لئے ایک آدمی کو ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا تا کہ اس خواب کی تعبیر پوچھ کر آئے مگر یہ تاکید کر دی کہ نام نہ لینا کہ مالک نے یہ خواب دیکھا ہے، یوں کہنا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے، میرا نام نہ لیا جائے، ذکر نہ کیا جائے۔ یہ خادم ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ایک نیک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس نے پوچھا کہ میری عمر کتنی باقی رہ گئی ہے؟ آپ نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں تو اس خواب دیکھنے والے نے تعبیر پوچھی ہے۔ امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا: اس شخص نے نام بتلانے کی ممانعت کر دی ہے۔ فرمایا: کہ یہ خواب بہت بڑا عالم ہی دیکھ سکتا ہے، جاہل تو جاہل معمولی علم کا آدمی بھی یہ خواب نہیں دیکھ سکتا، یہ خواب کسی بڑے عالم کا خواب ہے اور مدینہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ تو کیا مالک رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ خواب نہیں دیکھا؟ اب یہ چپ ہو گیا فرمایا: کہ جاؤ اس سے اجازت لے کر آؤ آ کر بتاؤ! تب میں تعبیر بتلاؤں گا وہ شخص واپس آ گیا۔ اس نے جا کے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا: کہ حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں، اس واسطے (نام ظاہر کرنے کی) اجازت دے دیجیے! فرمایا: اچھا میرا نام لے دو۔ اس نے آ کے نام لے دیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خواب دیکھا ہے۔

فرمایا کہ امام مالکؒ ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے یہ چھوٹے موٹے عالم کا کام نہیں تھا کہ یہ خواب دیکھتا۔ فرمایا: جا کر امام مالک کو تعبیر بتلا دو کہ تم نے اپنی عمر پوچھی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ انگلیاں دکھلائیں...... تو نہ پانچ

برس مراد ہیں، نہ پانچ مہینے مراد ہیں، نہ پانچ ہفتے مراد، بلکہ اشارہ ہے حدیث کی اس روایت اور قرآن کی اس آیت کی طرف ھِیَ مِنْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلَّا اللہُ ① کہ کسی کی موت کا وقت ان پانچ چیزوں میں سے ہے کہ جن کا علم اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اللہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ② اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم کہ کب آئے گی، کسی کو پتہ نہیں دیا گیا کہ کب آنے والی ہے اور بارش کی اصلیت وحقیقت کہاں سے ہے، اس کا بتدائی سرچشمہ کون ہے، کہاں سے چلتی ہے؟ اللہ کے سوا دوسروں کو پتہ نہیں ہے۔ اسباب کے درجے میں ہم کچھ پتہ چلالیں کہ مون سون آئے گا وہ برسے گا اور بادل بنیں گے...... لیکن خود مون سون کیسے بنا! اس کے اوپر کا سرچشمہ کیا ہے اور اصل کی اصل کیا ہے! کس طرح پانی کی تکوین ہوئی؟ یہ سب اللہ ہی جانتا ہے۔

﴿وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ﴾ اور ان اصولوں سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ لڑکا بنے گا یا لڑکی بنے گی...... لڑکا ہوگا یا لڑکی! کسی جدید خبر گش سے کسی کو معلوم ہو جائے! یہ ممکن ہے، لیکن ان اصولوں کی اطلاع کہ لڑکا اور لڑکی رحمِ مادر میں کس طرح بنتے ہیں! یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ کسی شخص کو پتہ نہیں ہے کہ کل کس زمین میں وہ دفن کیا جائیگا! تو امام مالک کو کہہ دینا جاکے، کہ پانچ انگلیوں سے پانچ دن، پانچ سال یا پانچ مہینے مراد نہیں ہیں بلکہ پانچ اصول مراد ہیں کہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ خدا ہی جانتا ہے کہ کس زمین میں کون دفن ہوگا! کس زمین میں کس کا انتقال ہوگا!۔ تو امام ابن سیرینؒ نے یہ تعبیر دی اور فرمایا کہ امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں، اس واسطے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ علمی جواب دیا ہے کہ ہر عالم اس خواب کی تعبیر کو نہیں سمجھ سکتا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیریں دی ہیں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن وحدیث کی رُو میں تعبیر کے اصول قائم کر دیئے کہ جس سے تعبیر خواب ایک عظیم فن بن گیا اور اس سے بڑے بڑے امام بن گئے۔ بڑی بڑی کتابیں اس فن کے اندر لکھی گئیں۔ امام ابن سیرینؒ کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیریں اور اصولوں کو ایک کتاب کے اندر جمع کیا گیا ہے۔ دو بڑی ضخیم جلدیں ہیں ''تَاْثِیْرُ الْمَنَامِ فِیْ تَعْبِیْرِ الْمَنَامِ'' اس میں ہزاروں خوابوں کی تعبیریں ذکر کی گئی ہیں اور وہ اصول ذکر کئے گئے ہیں جن کے ذریعے خواب کی تعبیریں نکالی جاتی ہیں۔ ③ تو ابن سیرینؒ بڑے امام ہیں ان کے بعد بڑے بڑے علماء اور بھی گزرے جو بہترین تعبیریں دینے والے ہیں۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام، ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۴۸.

② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.

③ یہ کتاب اردو میں ترجمہ ہوکر تعبیر الرؤیا کے نام سے اسلامی کتب خانوں میں عام دستیاب ہے۔

واقعہ ۳: نواب صدیق کا حضور کی امامت کرنا...... قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو بھوپال میں قاضی القضاۃ تھے، مشہور تھے کہ ادھر تعبیر دی اور ہاتھ کے ہاتھ تعبیر کے مطابق واقعہ پیش آجاتا۔ ان کے زمانے میں ایک شخص نے خواب دیکھا جو ایک نوجوان اہل حدیث تھا اس نے خواب دیکھا۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا زمانہ ہے اس زمانے میں قاضی محمد ایوب صاحب بھوپال کے قاضی القضاۃ ہیں۔ ان کے دفتر میں وہ نوجوان اہل حدیث ملازم تھا۔ قاضی صاحب دورے پر گئے بھوپال سے کوئی چالیس میل کے فاصلہ پر پڑاؤ تھا۔ اس نے خواب دیکھا اور قاضی صاحب کے پاس آکے ذکر کیا کہ حضرت میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ نماز کیلئے ایک بہت بڑی جماعت کھڑی ہوئی ہے، لاکھوں آدمی ہیں، صفیں بندھی ہوئی ہیں اور صفِ اولیٰ میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں اور نواب صدیق حسن خاں امامت کرارہے ہیں۔ یہ میں نے خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر کیا ہے؟

تو وہ نوجوان یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس میں اشارہ ہوگا نواب صدیق صاحب کی کسی فضیلت کی طرف! کسی منقبت، بزرگی اور بڑائی کی طرف...... جو امامت کرارہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا: کہ کیا واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے؟ کہا کہ حضرت واقعی! فرمایا: کہ اگر واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خاں کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ بھی چُپکا ہوگیا، اس کے ذہن میں جو بات تھی تعبیر اس کے برعکس آئی کہ اگر واقعی ایسے دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خاں فوت ہو چکے ہیں۔ کچھ دیر بعد اطلاع آئی کہ نواب صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ کچھ عرصہ سے ان کی بیماری چل رہی تھی۔ سب لوگ دوڑ گئے اور ماتمی جنازہ بن گیا، تین دن ریاست کی طرف سے ماتم رہا۔ تین دن کے بعد یہی اہل حدیث نوجوان قاضی صاحب کے پہنچا کہ حضرت تعبیر بالکل ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہوئی، جیسے تعبیر دی تھی وہ واقعہ ہوگیا...... لیکن آپ نے خواب کی یہ تعبیر کیسے سمجھی؟ ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب کی کوئی بڑائی، کوئی عظمت اور کوئی فضیلت ظاہر ہوگی، ان کو امام کے درجے پر دکھلایا گیا تھا؟ لیکن آپ نے بالکل برعکس تعبیر دی، یہ تعبیر آپ نے کیسے سمجھی؟۔

سُبحان اللہ! عجیب اصول بیان کیا ہے، فرمایا: کہ میں نے اس سے یہ تعبیر سمجھی کہ نبی کی موجودگی میں کسی کو امامت کا حق نہیں ہے، اگر نماز میں نبی کے آگے کوئی ہوگا تو جنازہ تو ہوسکتا ہے زندہ نہیں ہوسکتا...... کہاں پہنچا دماغ؟ یہ تعبیر اصول کو سامنے رکھ کر دی تو بڑے بڑے معبّر اس اُمت کے اندر گذرے ہیں۔

واقعہ ۴: یعقوب نانوتوی کا خواب اور قاسم نانوتوی کی تعبیر...... اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند بھی فنِ تعبیر خواب میں مشہور تھے کہ ادھر تعبیر دی اِدھر واقعہ ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہوجاتا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ عقلی دلائل بھی ہوتے۔ دلائل سے تعبیر دیتے کہ اس خواب کی تعبیر یہی ہونی چاہیے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور فقط عالم ہی نہیں تھے عارف باللہ اور کامل اولیاء اللہ میں سے تھے اور صاحبِ کشف وکرامت لوگوں میں سے تھے۔ وہ فرماتے

ہیں کہ میں نے ایک خواب دیکھا اور اپنے بھائی مولانا نانوتوی صاحب کی خدمت میں خواب پیش کیا۔ نانوتہ میں ہی خواب دیکھا، جامع مسجد میں نماز پڑھی اور حضرت نانوتوی سے عرض کیا کہ بھائی صاحب! میں نے خواب دیکھا ہے تعبیر کچھ سمجھ نہیں آئی۔

خواب یہ ہے کہ میں اپنے گھر سے چلا تو میں نے اپنے ساتھ دنبے کی شکل کا بھینسا دیکھا، جیسے بڑا...... بھینسا ہوتا ہے، ایسا وہ دنبہ ہے، وہ میرے مدّ مقابل آیا اور میرا راستہ روک لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سینگ پکڑ لئے، میری اور اس کی کشاکشی ہو رہی ہے کبھی وہ مجھے دوگز دھکیل کے پیچھے کر دیتا ہے اور کبھی میں زور لگا کے اسے دھکیل دیتا ہوں اور وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ غرض اسی طرح کی کشاکشی ہوتی رہی...... اسی کشاکشی میں اس نے میری بائیں ران پر سینگ مارا تو دو تین قطرے خون کے نکل پڑے اور میری آنکھ کھل گئی۔ پھر انہوں نے عرض کیا: اس کی کیا تعبیر ہوگی؟ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حضرتؒ نے فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ''بنی اعمام'' میں کسی چھوٹی بچی کا انتقال ہو جائے گا۔ یہ تعبیر دے ہی رہے تھے کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں فلاں صاحب کے جو بچی پیدا ہوئی تھی اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ فرمانے لگے لیجیے بھائی صاحب! تعبیر بھی آ گئی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی حیران، عرض کیا: کہ حضرت! تعبیر تو واقعی ہو گئی، مگر آپ اس سے کیسے سمجھے کہ ''بنی اعمام'' میں سے، چچا تایاؤں کی اولاد میں سے ایک بچی کا انتقال ہو جائے گا؟۔

تب حضرت نے اس کے دلائل بیان کرنا شروع کیے۔ یعنی خواب کا مسئلہ ہے اور اسے دلائل سے ثابت کر رہے ہیں۔ فرمایا: کہ آپ نے ایک دُنبے یا مینڈھے کو دیکھا جو بھینسے کی شکل میں ہے! پھر فرمایا: حدیث میں فرمایا گیا ہے: کہ موت کو قیامت کے دن مینڈھے کی شکل میں متشکّل کیا جائیگا اور جنت و دوزخ کے درمیان میں لا کر اس کو کھڑا کیا جائیگا۔ جنت والوں کو منادی کی جائیگی کہ سب جنت کی شہرِ پناہ پر آ جاؤ تو جنت والے ڈریں گے کہ کہیں جنت سے ہمیں نکالا تو نہیں جا رہا! ڈرتے ڈرتے شہر پناہ کے اوپر آ جائیں گے۔ پھر جہنم والوں کو منادی کی جائے گی کہ تم بھی شہر پناہ کے اوپر آ جاؤ! تو وہ اس توقع میں خوش ہو کر آئیں گے کہ شاید ہمیں جہنم سے نکلنے کی اجازت ہو جائے۔ تو دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں گے بیچ میں ایک مینڈھا کھڑا کر دیا جائیگا۔ پوچھا جائے گا: کہ اے اہلِ جنت اور اہلِ نار! جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ کہیں گے کہ: یہ موت ہے۔ اس لئے کہ سب کو سابقہ پڑ چکا ہوگا تو یہی...... مینڈھے کی شکل میں موت ہوگی، جس سے سلبِ روح ہوتی ہے۔ پھر اس مینڈھے کو ذبح کر دیا جائے گا، فرمایا جائے گا کہ اب موت کو موت آ چکی ہے۔ اے اہلِ جنت! اب موت کا کوئی سوال نہیں، جنت میں ابدالآباد کی زندگی بسر کرو۔ اور اے اہلِ جہنم! اب موت کو موت آ گئی ہے، ابدالآباد تک تم اسی جہنم میں رہو۔ تو جنت والوں کو اتنی خوشی ہوگی کہ اگر موت کو موت نہ آ گئی ہوتی تو شاید شادیٔ مرگ سے وہ مر جاتے اور جہنم والے اتنے حسرت زدہ ہوں گے کہ اگر موت کو موت نہ آ گئی ہوتی تو شاید حسرت و غم میں مر جاتے۔ بہر حال حضرتؒ نے مولانا

یعقوب کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ: موت کو مینڈھے کی شکل دی جائے گی اور آپ نے مینڈھے کو دیکھا اور سینگ پکڑ کر مقابلہ کیا تو آپ کا یہ مقابلہ موت سے ہوا۔ فرمایا: خواب کی تعبیر کا پہلا جز تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ عرب میں عربی زبان میں جب بھی قبیلوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو جدّی رشتوں کو بطن کہتے ہیں، یعنی پیٹ کا حصّہ۔ دادا پردادا وغیرہ یہ بطون کہلاتے ہیں اور بنی اعمام یعنی چچا تائے کے لڑکے، ان کو فخذ سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی ران کا حصّہ۔ تو فرمایا کہ آپ کا موت سے مقابلہ ہوا اور مقابلہ میں موت کا سینگ آپ کی ران میں لگا اس سے میں سمجھا کہ بنی اعمام میں موت واقع ہوگی، جدی رشتہ والوں سے کوئی نہیں مرے گا بلکہ چچا تائے کے رشتہ والوں میں سے کوئی مرے گا اور فرمایا کہ بائیں ران سے خون نکلا تو اس سے میں سمجھا کہ مرنے والی لڑکی ہوگی کیونکہ لڑکی بائیں جانب کی پیدائش ہے اور فرمایا کہ خون کے صرف دو تین قطرے نکلے اس سے میں سمجھا کہ کوئی چھوٹی عمر کی بچی ہوگی۔ ان سارے مقدمات کو ملا کر میں نے تعبیر دی اور وہ ہاتھ کے ہاتھ نمایاں ہوگئی۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف کتنے خوابوں کی تعبیریں ہی ارشاد فرمائی ہیں بلکہ قرآن وحدیث میں ایسے اصول ارشاد فرمائے ہیں جس سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تعبیر دینے والے پیدا ہو گئے اور یہ ایک مستقل فن بن گیا۔

واقعہ ۵: تعبیرِ خواب میں مولانا قاسم نانوتویؒ کی باریک بینی ...... وہ بات یاد آ گئی تو اسے بھی کہہ دوں پھر آگے چلوں۔ حضرت نانوتویؒ کی ہی خواب کی تعبیر کا ایک اور واقعہ بھی یاد آ گیا۔ مولانا محمد منیر صاحبؒ جو حضرتؒ کے بھائی تھے۔ وہ ایک دن تشریف لائے کہ بھائی صاحب! میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ خواب یہ ہے کہ بریلی کی جانب سے کچھ بطخیں اُڑتی ہوئی آئیں اور میرے مکان پر آ کر اُتر گئیں اس کی کیا تعبیر ہوئی؟

حضرت نے فرمایا کہ بھائی جان! اگر آپ مٹھائی کھلائیں تو ہم آپ کو بیس روپے مہینہ کی ملازمت دلا دیں اور اگر مٹھائی نہیں کھلاتے تو پھر گیارہ روپے مہینہ کی ملازمت، انہوں نے کہا کہ حضرت میں مٹھائی کھلاؤں گا۔ تو فرمایا کہ: اس کی تعبیر یہ ہے کہ بریلی میں بیس روپے ماہوار پر تمہاری نوکری ہو جائے گی۔ یہ تعبیر دی چار پانچ دن کے بعد مولانا محمد منیر صاحبؒ کے پاس ان کے کسی عزیز کا خط آیا کہ مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ پر کچھ معاشی تنگی ہے، خرچہ نہیں چل رہا تو میں نے فرضی طور پر آپ کے نام کی ایک درخواست دیدی اور وہ قبول ہو گئی، بیس روپے مہینہ کی ملازمت آپ کی ہو گئی ہے آپ چلے آئیں۔ وہ حضرت نانوتویؒ کے پاس آئے کہ وہ جو تعبیر دی تھی...... تو واقعی بیس روپے کی ملازمت مل گئی ہے۔ مگر اول تو یہ عرض ہے کہ آپ نے اس خواب سے یہ تعبیر کیسے سمجھی؟

تو حضرتؒ نے واقعی عجیب دلیل بیان کی، فرمایا کہ: تم نے بریلی سے بطخیں آتی ہوئی دیکھیں، اس سے تو میں یہ سمجھا کہ بریلی کی طرف سے رزق حلال آئے گا اور تمہارے گھر میں رزق آ گیا۔ پھر بطخوں کو تم نہیں لائے از خود آئیں اس سے میں یہ سمجھا کہ بلا طلب کے تمہاری ملازمت ہو جائے گی تو یہ بھی صحیح نکلا کہ تم نے درخواست بھی نہیں

دی تھی۔ اب یہ کہ ملازمت بیس روپے مہینہ کی ہو یا گیارہ روپے کی ہو! تو فرمایا: اس میں صورتِ حال یہ ہے کہ ''بــــط'' کا لفظ عربی میں تو مشددہ ہے، یعنی ایک ب اور دو ط سے اور فارسی میں یہ مخفف ہے ایک ب اور ایک ط سے۔ تو فارسی میں بط کہتے ہیں اور عربی میں بطّ کہتے ہیں۔

اب تعبیر دینے والے کو یہ اختیار ہے کہ فارسی کا لفظ لے لے یا عربی کا تو اگر میں فارسی کا بط لے لیتا تو اس میں ایک ب اور ایک ط ہے تو ب کے عدد دو اور ط کے عدد نو ہیں تو نو ۹ اور دو ۲ ملکر گیارہ ہوئے۔ اور عربی کا بط لیتا تو ایک ب اور دو ط ہوئیں تو ب کے دو، ایک ط کے نو اور دوسری ط کے بھی نو...... تو نو اور نو ملکر اٹھارہ، اٹھارہ اور دو بیس ہوگئے۔ معبر کو اختیار ہے کہ وہ فارسی کا بط لے یا عربی کا بط لے لے۔ اس واسطے میں نے یہ تعبیر دی تھی۔ یہ باریک بینیاں اسوقت تک نہیں ہوسکتیں جب تک تعبیرِ خواب کے اصول ذہن کے اندر نہ ہوں تو تعبیرِ خواب میں علم کی بھی ضرورت ہے، موسم کی پہچان کی بھی ضرورت ہے اور اعداد وشمار کے جاننے کی بھی ضرورت ہے۔ شریعت نے قرآن وحدیث میں بہت سے اصول قائم کردیئے ہیں اور یہ ایک مستقل فن بن گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات میں علوم کی کثرت ...... تو انبیاء علیہم السلام کو جو علوم دیئے گئے وہ حدِ کمال کیساتھ جمع ہوکر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں ...... خواہ تعبیرِ خواب کا علم ہو، خواہ مَنطِقَ الطَّیر پرندوں کی بولیوں کا علم ہو اور خواہ اسماء وصفات کا علم ہو...... یہ سب علوم اسی ذات بابرکات میں جمع کردیئے گئے ہیں اور آپکے بعد جو علماء آنے والے ہیں وہ آپ ہی کے در کے فیض یافتہ ہونگے، وہ تو عالم ہی اسلئے ہونگے کہ آپکا فیض پہنچ رہا ہے۔ تو ایک ذات بابرکات میں سارے علوم کا ایک جھمگٹ ہے۔ جس خصوصیت سے آپکو علم دیا گیا وہ اوروں کو نہیں ملا تو اور انبیاء کی حقیقت فقط انبیاء کی ہے وہ صرف نبی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط نبی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں اور ختمِ نبوت کے معنی منتہاءِ نبوت کے ہیں کہ نبوت کی انتہا ہوگئی۔

یعنی سارے درجاتِ نبوت اس ذات اقدس کے اُوپر پورے ہوگئے۔ ظاہر بات ہے کہ جو خاتم النبیین ہوگا وہ تمام اوصاف وکمالات میں بھی خاتم ہوگا۔ تو خاتم العلوم بھی آپ کو کہا جائے گا کہ تمام علوم کے درجات آپکے سینے میں جمع کردیئے گئے۔ آپ کو خاتم الاخلاق بھی کہا جائے گا کہ اخلاق کے سارے نمونے اور کمالات آپکی ذات بابرکات میں جمع کردیئے گئے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ جب نبوت کا معیار اور مقامِ نبوت کی کسوٹی کمالِ علم اور کمالِ اخلاق ہے تو جس کا علم سب سے بڑا ہوگا اس کی نبوت بھی سب سے بڑی ہوگی۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم سب سے بڑھ کر بھی ہے اور سب پر حاوی بھی ہے، تمام علوم کے آپ جامع ہیں اور پھر آپ کے جو مخصوص علوم ہیں وہ الگ ہیں۔ اس لئے علم میں آپ سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور اسی واسطے آپ کو انبیاءِ سابقین کے لئے مُصَدِّق کہا گیا کہ آپ ان کی نبوت کی اور ان کے علوم کی تصدیق کرنے

والے ہیں اور تصدیق وہی کیا کرتا ہے جو پہلے سے علوم جانتا ہو، جو کسی چیز سے واقف نہ ہو وہ تصدیق نہیں کیا کرتا بلکہ وہ تو سلام کیا کرتا ہے تا کہ کسی کو علم نہ ہو جائے کہ یہ علم نہیں رکھتا۔ اور یہ کہنا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے اس چیز کو جانتا ہے تو آپ کو ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ ① کہا گیا ہے کہ اے پیغمبرو! جو تمہیں علوم دیئے جائیں گے ان کی تصدیق کرنیوالے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہوں گے تو تصدیق کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ سارے علوم آپ کے اندر جمع تھے۔

اس کی شرح اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ کی حدیث نے کردی یعنی مجھے اگلوں اور پچھلوں ...... سب کے علوم عطاء کر دیئے گئے ہیں۔ جب آپ کی ذات بابرکات علوم میں سب سے اونچا مقام رکھتی ہے تو نبوت میں بھی سب سے بڑا مقام ہوگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسا نبی دوسرا نبی نہیں ہوسکتا، آپ ہی کو خاتم النّبیین بننا چاہیے تھا، آپ ہی نبیوں کے سردار بننے والے تھے اور آپ ہی کو نبی الانبیاء کہا گیا۔ تو ایک رکن مقامِ نبوت کا کمالِ علم ہے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سب سے اُونچے تھے تو آپ کا مقامِ نبوت بھی سب سے اونچا ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ اخلاق ...... اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اخلاق میں بھی سب سے اونچا مقام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عطاء کیا گیا اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو مقام سب سے آخری اور اونچا ہوتا ہے تو نیچے کے سارے مقامات اس میں جمع ہوتے ہیں مثلاً آپ یوں کہیں کہ فلاں آدمی ''بخاری'' پڑھا ہوا ہے تو بخاری آدمی کب پڑھے گا؟

پہلے میزان و مُنْشَعِب پڑھے، پھر قدوری پڑھے، پھر شرح وقایہ پڑھے اور پھر ہدایہ وغیرہ پڑھے ...... تب جا کے بخاری پڑھے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جسے بخاری آ گئی اسے میزان بھی آ گئی، اسے منشعب بھی آ گئی، اسے شرح وقایہ بھی آ گئی اور ہدایہ بھی آ گئی، نیچے کی ساری کتابیں آ گئیں۔ لیکن جو میزان پڑھ چکا ہے ضروری نہیں کہ اسے بخاری بھی آ جائے تو نیچے کی چیز جاننے سے اوپر کی چیز کا جاننا ضروری نہیں مگر جو اوپر والی چیز کو جان جائے تو نیچے کی ساری چیزیں جان جائے گا۔

قرآن وحدیث کی رُو سے اخلاق کی کُل تین قسمیں ...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب اخلاق کا اعلیٰ مقام دے دیا گیا تو اس کے نیچے جتنے مقامات تھے وہ خود بخود اس میں آ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جامع اخلاق بھی ہیں۔ اور وہ کس طرح سے ......؟ وہ یہ کہ ہم نے جہاں تک غور کیا تو قرآن واحادیث سے اخلاق کی تین قسمیں معلوم ہوتی ہیں: ایک اخلاقِ حسنہ، ایک اخلاقِ کریمانہ اور ایک اخلاقِ عظیم۔ خُلُقِ حَسَن، یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خطاب فرمایا کہ: یَا خَلِیْلِیْ اَحْسِنْ خُلُقَکَ! اے میرے خلیل! اپنے اخلاق کو حسن بناؤ۔ اگرچہ کفار کے ساتھ معاملہ پڑے تب بھی اخلاقِ حَسَنَہ سے پیش آؤ۔ اس سے معلوم

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۱.

ہوا کہ ایک خُلقِ حَسَن ہے، جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔

ایک خُلُقِ کریم ہے جسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ ① میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ کریمانہ اخلاق کو مکمل کر کے تمہارے سامنے پیش کردوں۔ اور ایک خُلُقِ عظیم ہے جو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذاتی خلق ہے، جس کو قرآن میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ ② اے نبی! آپ خُلُقِ عظیم کے اوپر ہیں۔ تو تین قسمیں نکلیں، ان تینوں میں فرق کیا ہے؟ خلق حسن ابتدائی درجہ ہے، خلق کریم درمیانہ درجہ ہے اور خلق عظیم انتہائی درجہ ہے۔

اخلاقِ حَسَنہ کی تشریح...... خُلُقِ حَسَن کہتے کسے ہیں؟ عدل کامل کو یعنی آپس کے معاملہ میں کوشش کرو کہ اس میں حدِّ اعتدال سے نہ گزرو۔ اگر آپ کو خدانخواستہ کوئی ایک تھپڑ مار دے تو آپ بھی اتنے ہی زور سے تھپڑ مار دو جتنی زور سے اس نے مارا تھا تو کہا جائے گا کہ آپ خُلُقِ حَسَن کے اوپر ہیں لیکن اگر آپ تھپڑ کے جواب میں مُکّہ مارتے تو کہا جاتا کہ بڑے بداخلاق آدمی ہیں، اس نے تو تھپڑ ہی مارا تھا آپ نے مُکّہ مار دیا، تعدّی کی اور زیادتی کی تو تعدّی اور ظلم سے بچ جانا یہ خُلُقِ حَسَن ہے۔

یعنی عدل کے اوپر قائم رہنا اور بال برابر اس چیز کا پورا پورا بدلہ دے دینا یہ خُلُقِ حَسَن کا مفہوم ہے۔ اسی طرح اگر آپ نے کسی کو ایک روپیہ دیا ہے اور آپ خواہش مند ہیں کہ بدلے میں وہ بھی مجھے ایک دے تو یہ خُلُقِ حَسَن کی بات ہے اور اگر آپ یوں کہیں کہ میں تو دُوں ایک اور اس سے وصول کروں پانچ، تو کہا جائیگا کہ یہ بداخلاقی کی بات ہے، یہ زیادتی کی بات ہے۔ تو خُلُقِ حَسَن کا حاصل اعتدال اور معاملات کا عدل ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر کوئی شخص کسی کے اوپر حملہ کر دے اسکی آنکھ پھوڑ دے تو اسے بھی حق حاصل ہے کہ حملہ کر کے آنکھ پھوڑ دے مگر ایک ہی پھوڑے دو نہیں پھوڑے، دو پھوڑے گا تو کہا جائے گا کہ ظالم ہے۔ تو غرض خُلُقِ حَسَن کا حاصل یہ ہے کہ اَدل بَدل ہو تو پورا پورا ہو، عدل کے مطابق ہو اور انصاف کے مطابق ہو اس سے گزرنا بداخلاقی ہے

اخلاقِ کریمہ کی تشریح...... دوسرا درجہ خُلُقِ کریم کا ہے اسمیں اَدل بدل تو نہیں ہوتا، اس میں ایثار ہوتا ہے کہ دوسرا زیادتی کرے آپ اسے معاف کر دیں۔ ایک نے تھپڑ مارا آپ نے کہا مجھے حق تو تھا بدلہ لینے کا مگر اس احمق اور بے وقوف سے کیا بدلہ لوں، جائیں معاف کرتا ہوں۔ یہ کریمانہ خُلُق ہے۔ دوسرے نے گالی دی آپ کو بھی حق تھا کہ اتنی زیادتی آپ بھی کرتے لیکن آپ نے معاف کر دیا تو یہ ایثار کا درجہ ہے اس کو خُلُقِ کریم کہیں گے۔

اخلاقِ عظیمہ کی تشریح...... اور تیسرا درجہ خُلُقِ عظیم ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو نہ صرف یہ کہ آپ معاف بھی کر دیں بلکہ اُلٹا اس کے ساتھ احسان بھی کریں، یہ خُلُقِ عظیم کہلاتا ہے۔ جس کو حدیث

---

① السنن الکبریٰ للبیھقی، کتاب الشھادات، باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیھا ج: ۱۰ ص: ۱۹۱. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: المقاصد الحسنۃ، حرف الھمزہ ج: ۱ ص: ۵۸. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴.

میں فرمایا گیا کہ: صِلْ مَنْ قَطَعَکَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَکَ وَاَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَآءَ اِلَیْکَ ① جو تمہارے ساتھ قطع تعلق کرے تم جوڑنے کی کوشش کرو اور جو تمہارے ساتھ بُرائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرنے کی کوشش کرو یہ خُلُقِ عظیم کہلاتا ہے اور یہ خُلُق جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

سابقہ شریعتوں اور شریعتِ محمدی کے درمیان اخلاق کا موازنہ..... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خُلُقِ حسن کی تعلیم دی یعنی مکمل عدل واعتدال کی۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَکَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ② ہم نے تورات میں فرض کردیا تھا اور لاگو کردیا تھا کہ اَدل بدل ہوگا۔ اگر کوئی تمہارا دانت توڑ دے تمہارا فرض ہوگا کہ تم بھی دانت توڑو تمہاری کوئی آنکھ پھوڑ دے تمہارا فرض ہوگا کہ تم بھی اس کی آنکھ پھوڑ دو انتقام لینا تورات میں واجب کیا تھا معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ ③ سخت شریعت تھی تو ناک کا بدلہ ناک، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ، کان کا بدلہ کان، دانت کا بدلہ دانت، اور کوئی زخم لگائے تو تم بھی زخم لگاؤ برابر سرابر تو یہ خُلقِ حسن تھا جس کی تعلیم موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دَور ہے، انہوں نے خُلُقِ کریم کی تعلیم دی۔ یہاں مذہبِ عیسوی میں تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو نہ یہ کہ تم بدلہ نہ لو بلکہ بایاں گال بھی سامنے کردو کہ بھائی! ایک تھپڑ اور مارتا چل۔ یہ ایثار کی بات ہے کہ بدلہ نہیں لیا بلکہ معاف کردیا بلکہ اپنے کو پیش کردیا کہ لے اور مار لے..... اگر تیری خوشی اسی میں ہے اور تیرا جی اسی میں ٹھنڈا ہوتا ہے تو مار تھپڑ! میں کھانے کے لئے تیار ہوں، تیرا دل ٹھنڈا ہونا چاہیے۔ یہ ایثار کی تعلیم ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جامع تعلیم دی۔ وہ یہ کہ نہ تو یہ فرمایا: کہ تم پر بدلہ لینا واجب ہے اور نہ یہ فرمایا: کہ تم پر معاف کرنا واجب ہے، بلکہ دونوں چیزیں جمع کیں اور ساتھ میں اعلیٰ مقام بھی پیش کردیا اور فرمایا کہ: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ﴾ ④ برائی کا بدلہ برائی ہے، تمہیں حق ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی کرے تم بھی برائی کرو۔ کوئی تمہیں

---

① کنز العمال ج: ۳ص: ۳۵۹ رقم: ۶۹۲۹. حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: قال ابن الرفعة فی المطلب: لیس فیہ الا انقطاع الیٰ انہ یقوی بالآیة، وفیما قال نظر لان فی اسنادہ الحسین بن زید بن علی وقد ضعفہ ابن المدینی وغیرہ دیکھئے: التلخیص الحبیر، کتاب الاقرار ج: ۳ ص: ۴۷۹. ② پارہ: ۶، سورة المائدة، الآیة: ۴۵. ③ مذکورہ آیت کا بقیہ تتمہ ہے: فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ کَفَّارَةٌ لَّهٗ ...... الخ یعنی جو شخص بدلہ معاف کردے وہ اس (کے گناہوں) کے لیے کفارہ ہوگا اور جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔ قرآن پاک میں ایک اور جگہ ایسے ہی حکیمہ الفاظ امت محمدیہ کے لیے بھی نازل ہوئے ہیں: اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا۔ تو شریعت موسوی میں بھی مظلوم پر بدلہ لینا فرض نہیں تھا بلکہ اس کے لیے باعثِ کفارہ تھا جیسے حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اتنا کہنے پر اکتفاء فرمایا کہ اے میرے ماں جائے بھائی! میرے سر اور ڈاڑھی کے بال پکڑ کر نہ کھینچ! اور مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دے۔ ہاں اگر مظلوم حاکم کے پاس جائے تو حاکم کو بدلہ دلوانا فرض تھا، دیت ان کے ہاں مشروع نہ تھی یہ فقط امتِ محمدیہ کا خاصہ ہے۔ ④ پارہ: ۲۵، سورة الشوریٰ، الآیة: ۴۰.

تھپڑ مارے تم بھی تھپڑ مارو جو مُکّہ مارے تم بھی مُکّہ مار دو، برائی کا بدلہ برائی ہے، بدلہ لینے کا حق تمہیں حاصل ہے لیکن آگے فرمایا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ ① اور اگر تم معاف کر دو تو اللہ کے ہاں بڑے بڑے درجے ملیں گے تو دونوں حق دیدیئے: انتقام لینے کا حق بھی اور معاف کر دینے کا حق بھی۔

اس واسطے کہ اسلام دنیا کی ہر قوم کے لئے پیغام ہے اس میں نرم مزاج قومیں بھی شامل ہیں اور سخت مزاج بھی۔ اگر یہ تعلیم دی جاتی کہ انتقام لینا تمہارے اوپر واجب ہے تو بیچاری نرم خُو قومیں جیسے مشرقی بنگال کے رہنے والے ان میں سے کوئی بھی اسلام قبول نہ کرتا کہ اس خُونخوار مذہب کو کون قبول کرے! کہ اگر کوئی تھپڑ مارے تو تمہارے اوپر بھی فرض ہے کہ تم بھی تھپڑ مارو! کوئی لاٹھی مارے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی لاٹھی مارو! یہ تو بڑا سخت مذہب ہے اور اگر یہ تعلیم دی جاتی کہ معاف کرنا واجب ہے تو شاید جو پٹھان ہے وہ ایک بھی اسلام قبول نہ کرتا کہ اس بزدلانہ مذہب کو کون قبول کرے کہ بھئی اگر کوئی مارے تو دوسرا گال بھی پیش کر دو، کیوں بھئی کس لئے! ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ تو دونوں طرح کی قوموں کو جان کر اسلام نے دونوں قوموں کو یہ حق دیئے کہ برائی کا بدلہ برائی سے لے لینا یہ بھی حق ہے اور اگر معاف کر دے تو اجر و عزیمت کی بات ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلُقِ عظیم...... اور اگر معاف کر دینے کے بعد اس کے ساتھ خیر خواہی بھی کرے تو یہ خُلُقِ عظیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق ہے۔ جس کو ایک موقع پر قرآن کریم نے فرمایا کہ: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ ② اے پیغمبر! یہ تو ہم نے کوٹ کوٹ کر رحمت تمہارے قلب کے اندر بھری ہے، اس سے تمہارے قلب میں نرمی اور لینت ہے، رأفت اور ترس کھاتا ہے۔ اگر آپ سخت گیر ہوتے تو یہ جو پروانوں کی طرح لوگ جمع ہیں سب بھاگ جاتے اور کوئی پاس نہ پھٹکتا۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب میں نرمی اور رحمت و رأفت بھر دی تو اس کا تقاضا کیا ہونا چاہیے پہلا مقام آپ کا یہ ہے کہ اگر آپ کے ساتھ کوئی برائی کرے تو آپ ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ③ معاف کر دیں، بدلہ بالکل نہ لیں، یہ ہے آپ کی شان۔ آگے فرمایا کہ فقط یہی نہیں، اس سے بڑھ کر آپ کا مقام ہے کہ کوئی برائی کرے تو نہ صرف معاف کر دیں بلکہ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ④ اس کے لئے دعائے مغفرت بھی کریں، وہ باغی ہو گیا آپ اس کے لئے دعا مانگیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وسعتِ ظرف ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حوصلہ ہونا چاہیے تو پہلا درجہ یہ کہ معاف کر دیں، دوسرا درجہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مغفرت کی دعا بھی کرنی چاہیے۔ اور تیسرا درجہ ایک اور آگے بتلایا گیا کہ یہ بھی آپ کی شان کے اندر ہے اور آپ کا مقام اس سے بھی زیادہ بلند ہے، وہ کیا ہے؟ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ⑤ ان برا بھلا کہنے والوں سے بُلا کر مشورہ بھی کریں تا کہ وہ یہ سمجھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اپنا سمجھا۔ تو وہ تو کر رہے ہیں برائی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں

① پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۴۰۔ ② ③ ④ ⑤ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۵۹۔

اپنا بنا رہے ہیں، وہ تو دے رہے ہیں گالیاں، آپ ان کو دعائیں دے رہے ہیں، یہ خُلقِ عظیم ہے۔

تو جو خلقِ عظیم کا مالک ہوگا خلقِ حسن بھی اس کے نیچے آ گیا، خلقِ کریم بھی اس کے نیچے آ گیا، اس لئے کہ جب اعلیٰ مقام حاصل ہے تو درمیان کا اور ادنیٰ مقام بھی حاصل ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اخلاق کا بھی وہ نمونہ دیا گیا ہے کہ سارے اخلاقی نمونے اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔

مقامِ نبوت کے آثار..... تو علم کا تو وہ مقام کہ سارے علومِ نبوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کر دیئے گئے۔ اخلاق کا وہ مقام کہ سارے پیغمبروں کے اعلیٰ اخلاق جمع کر دیئے گئے اور یہی دو چیزیں بنیادِ نبوت تھیں؛ کمالِ علم اور کمالِ اخلاق تو جب یہ دونوں چیزیں اعلیٰ طریق پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہیں تو آپ کی نبوت سب سے زیادہ اونچی نبوت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ نبوت اتنا بڑا اور اونچا مقام ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں "لِیْ مَعَ اللہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ" ① ایک وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے وہ قرب حاصل ہوتا ہے، وہ نزدیکی مجھے میسر آتی ہے کہ وہاں تک نہ کوئی مقرب فرشتہ پہنچا اور نہ کوئی نبی مُرسل پہنچا، جہاں تک اللہ کے ہاں میری رسائی ہے۔ تو بہرحال اس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ نبوت واضح ہوا۔

اس مقامِ نبوت کے آثار کیا ہیں؟ ان آثار کو ان دو حدیثوں میں بیان کیا گیا جن کو میں نے خطبہ کے شروع میں تلاوت کیا تھا، دو غرضیں آپ نے اپنی بعثت کی بیان کیں، دو مقصد بیان فرمائے۔ وہ کیا ہیں؟ ایک یہ کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا اور دوسرے بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق میں اس لئے بھیجا گیا ہوں دنیا میں تا کہ تعلیم دے کر دنیا میں علم پھیلاؤں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تکریم کر کے سب کو با اخلاق بنا دوں، تو جو دو رکن مقامِ نبوت کے ہیں علم اور اخلاق، انہی دو کے پھیلانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے یہی بعثت کی غرض و غایت ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لائے تو صحابہ کے دو گروہ تھے ایک ایک طرف اور ایک ایک طرف۔ ایک گروہ تو مسئلے بیان کرنے میں لگا ہوا تھا، علمی مسائل میں مصروف تھا کہ یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، مسئلہ یہ ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام! الغرض علمی باتیں ہو رہی تھیں اور ایک جماعت عبادت اور زہد و تقویٰ میں مشغول تھی، کوئی تلاوت میں مشغول تھا، کوئی درود پڑھنے میں مشغول تھا، عبادت میں لگے ہوئے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کِلَا کُمَا عَلَی الْخَیْرِ تم دونوں جماعتیں خیر پر ہو، یہ عُبّاد اور

① حضرات صوفیاء اس حدیث کو اکثر ذکر کرتے ہیں یہ حدیث رسالہ قشیری میں مذکور ہے لیکن ان الفاظ کے ساتھ لی وقت لا یسعنی فیه غیر ربی علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں ویشبه ان یکون معنی ماللترمذی فی الشمائل ولا بن راهویة فی سنده عن علی فی حدیث طویل. دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف المیم ج: ۱ ص: ۱۹۰.

زُہّاد کی جماعت بھی خیر پر ہے اور یہ علماء وفضلاء کی جماعت بھی خیر پر ہے، مگر فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا بھائی! میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور یہ فرما کر اس جماعت میں بیٹھ گئے جو مسئلے مسائل کا تذکرہ کر رہی تھی۔ تو نبوت کی سب سے بڑی غرض وغایت تعلیم ہے، جس سے علم دنیا کے اندر پھیلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم معلم بن کر آئے اور دنیا کے اندر آپ نے علم پھیلایا اور لوگوں کو عالم بنایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزۂ علمی دیا گیا...... ظاہر ہے کہ علم اللہ کی صفت ہے، بندہ کی صفت نہیں۔ اس علم کو پھیلانا گویا بندہ کو خدا سے وابستہ کرنا ہے چونکہ آپ تعلیم دینے کے لئے تشریف لائے، تو سب سے بڑی نبوت آپ کی، اور سب سے بڑی تعلیم بھی آپ کی، اسی واسطے آپ کو معجزہ بھی ''علمی'' دیا گیا یعنی ہزاروں معجزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی ملے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے، جو علمی معجزہ ہے۔ اس علمی معجزہ نے سب کو تھکا دیا اور عاجز کر دیا کہ کوئی اس کی نظیر نہ لاسکا۔ قرآن نے چیلنج بھی کئے اور فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ ① اگر سارے جن اور انسان مل جائیں اور ایک دوسرے کی مدد پر کھڑے ہوجائیں کہ اس قرآن کی نظیر لے آئیں تو وہ نہیں لاسکتے، یہ ناممکن ہے۔ تَنَزُّل کر کے کہا کہ سارے قرآن کی نظیر نہیں تو کم سے کم دس سورتیں ہی بنالائیں ﴿فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ ② کفار نے یہ الزام دیا تھا کہ یہ تو افتراء کردہ کلام ہے، یہ تو تہمتیں باندھ رکھی ہیں تو فرمایا گیا کہ یہ تہمت ہے تو اسی قسم کی تہمتیں تم بھی باندھ لاؤ، دس ہی صورتیں بنالاؤ۔

پھر اور زیادہ تنزل کیا کہ: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ ③ دس سورتیں تو تم نہ لاسکے، ایک ہی سورت بنالاؤ جو قرآن جیسی ہو کہ اس کا اسلوب بیان بھی وہی ہو، فصاحت وبلاغت بھی اعجازی ہو، اسمیں علوم بھی اتنے ہی بھرے ہوئے ہوں، اسمیں لطائف وحِکم بھی بھرپور ہوں، تو اس جیسی ایک ہی سورت بنالاؤ۔ اور اس سورت میں بھی یہ قید نہیں لگائی کہ سورۂ بقرہ جیسی سورت ہو جو ایک ہی سورت اڑھائی پارے کی ہے بلکہ: ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ جیسی چھوٹی سی سورت لے آؤ جو ایک سطر سے بھی کم میں آجاتی ہے۔

پھر اور تنزل کیا کہ: ﴿فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾ ④ سورت تو سورت ہے ایک آیت اور ایک بات ہی قرآن جیسی بنالاؤ مگر نہیں لاسکے تو لوگوں نے لڑائیاں لڑیں، گالیاں دیں، برا بھلا کہا لیکن یہ صاف صورت کیوں نہ اختیار کی کہ اس کی نظیر بنا کے پیش کر دیتے، سارے جھگڑے ختم ہوجاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو سب سے بڑا معجزۂ علمی قرآن ہے اور معجزہ کے معنی یہ ہیں کہ دنیا تھک جائے مگر مثل نہ لاسکے...... اس کو معجزہ کہتے ہیں۔

علمی معجزہ دیئے جانے کی حکمت...... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ علمی ہے، اگرچہ عملی

---

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۸۸. ② پارہ: ۱۲، سورۃ هود، الآیۃ: ۱۳.

③ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۳۸. ④ پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآیۃ: ۳۴.

معجزے بھی ہزاروں دیئے گئے۔ لیکن پچھلے انبیاء کو صرف عملی معجزے دیئے گئے؛ عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتی دیا گیا، موسیٰ علیہ السلام کو عصاءِ موسیٰ اور یدِ بیضاء دیا گیا، ابراہیم علیہ السلام کو نارِ خلیل کا معجزہ دیا گیا، یوسف علیہ السلام کو قمیصِ یوسف کا معجزہ دیا گیا کہ ان کا کرتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈالا گیا تو ان کی بینائی لوٹ آئی، آنکھیں واپس آگئیں، داؤد علیہ السلام کو "اِلَانَۃُ الْحَدِیْد" کا معجزہ دیا گیا کہ لوہے کو ہاتھ میں لیتے تو موم کی طرح سے پگھل جاتا تھا مختلف انبیاء کو مختلف عملی معجزات دیئے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے عملی معجزات سینکڑوں دیئے گئے تھے مگر سب سے بڑا معجزہ علمی دیا گیا تھا وہ قرآن کریم ہے اور اس کا اثر کیا ہے؟

یہ قاعدہ کی بات ہے جب دنیا سے کوئی عامل رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے، عمل باقی نہیں رہتا، جب عامل گیا تو عمل بھی گیا۔ لیکن اگر عالم دنیا سے رخصت ہو جائے تو علم رخصت نہیں ہوتا وہ باقی رہتا ہے...... ابد تک باقی رہتا ہے۔ تو معجزہ درحقیقت نبوت کی دلیل ہے تو انبیاءِ سابقین کے معجزات عملی تھے جب وہ دنیا سے تشریف لے گئے ان کے معجزات بھی چلے گئے تو کسی کی نبوت کی دلیل آج تک دنیا میں موجود نہیں ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علمی معجزہ دیا گیا اور علم عالم کے جانے سے ختم نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے مگر دلیل نبوت آج تک موجود ہے، اس لئے نبوت بھی موجود ہے۔ اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے تحت آ جاؤ اور ان کی شریعت پر عمل کرو اس لئے کہ جب وہ نبوت موجود نہیں اور یوں موجود نہیں کہ دلیل نبوت موجود نہیں اس لئے ہم نبوتِ موسوی کیلئے چیلنج نہیں کر سکتے، ان کی شریعت پر عمل کے لئے بھی نہیں کہہ سکتے لیکن نبوت محمدی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ نبوت موجود ہے...... تو ان کی شریعت پر عمل کرو، اس لئے کہ اس کی دلیل موجود ہے اور وہ قرآن ہے جو کہ علمی معجزہ ہے، آج بھی اس کا چیلنج اسی طرح موجود ہے جیسے پہلے تھا۔

حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عجیب تعبیر ...... تو سب سے بڑی چیز آپ کو علمی معجزہ دیا گیا آپ کی ذات بابرکات میں علم رچایا گیا۔ حدیث میں ہے کہ اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِي ① سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا تو یہاں یہ نور مراد نہیں جو چاند سورج کا حسی نور ہوتا ہے، یہ تو اس نور کے مقابلے میں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور ہے، بہت کم درجے کی چیز ہے۔ وہ نور تو حقیقتِ محمدی ہے جو علم سے گوندھ کر بنائی گئی ہے، اس کے اندر اصل علم ہے۔ گویا علم رگ و پے میں رچایا گیا اور استعدادِ علمی رچائی گئی ہے، تو حقیقتِ محمدیہ درحقیقت علم ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں بھی علم بھرا گیا، معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا، امت بھی آپکی علمی امت بنائی گئی۔

کثرتِ تصنیف امتِ محمدیہ کی خصوصیت اور اندلس و بغداد کے کتب خانوں کا حال ...... یہی وجہ

---

① علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں: وقد اشتهر بين القصاص حديث "اول ماخلق الله نوری" وهو حديث لم يثبت بهذا المعنىٰ وان ورد غيره موافقا له في المعنىٰ... دیکھئے: الآثار المرفوعة في الاخبار الموضوعة ج: ۱ ص: ۴۲۔

ہے کہ قرآن کی برکت ہے کہ امام اوزاعیؒ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کی خصوصیت ہے، دنیا کی کسی امت میں وہ تصانیف نہیں ملیں گی جو اس امت میں ملیں گی، کتب خانے بھر دیئے، ہزار دو ہزار لاکھ دو لاکھ نہیں کروڑوں کتابیں آج تک موجود ہیں اور مدت سے چلی آ رہی ہیں، مصر کے کتب خانے، اندلس کے کتب خانے......

جب وہاں اندلس میں انقلاب آیا اور مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی اور عیسائیوں نے غلبہ پالیا تو تعصب میں آ کر عیسائیوں نے یہ چاہا کہ ان کا لٹریچر، ان کا ادب اور ان کا سب علمی ذخیرہ فنا کر دیا جائے تا کہ ان کا وجود باقی نہ رہے تو ایک مستقل عملہ اندلس کی حکومت نے مقرر کیا تا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کر دیا جائے۔ ایک عورت نے اندلس کی تاریخ لکھی ہے اس میں وہ لکھتی ہے کہ اندلس کے کتب خانوں کو ضائع کرنے کے لئے ایک مستقل عملہ اندلسی حکومت نے مقرر کیا تا کہ مسلمانوں کا ادب اور علم باقی نہ رہے اور اس پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے، مستقل انچارج آفیسر رکھا...... تو پچاس برس میں جا کر سب کتب خانے ضائع ہو سکے ہیں۔ تو ایک ایک ملک کے اتنے کتب خانے تھے۔ یہ مسلمانوں کی تصنیف وتالیف نہیں تھی تو اور کیا تھا؟

بغداد کے اوپر تاتاریوں کا جب سیلاب آیا ہے اور خلافت تباہ ہوگئی اور پارہ پارہ ہوگئی تو بغداد جو دجلہ کے کنارے پر ہے اور دجلہ بہت بڑا دریا ہے، جس کا پل مسلمانوں نے توڑ دیا تھا۔ تاتاریوں نے جب بغداد کو فتح کر لیا تو صرف ایک کتب خانہ مسلمانوں کا لوٹ کر اس کی کتابیں دجلہ میں بھر کر سڑک بنائی گئی...... وہ بہت چوڑی سڑک بنائی گئی وہ اتنی چوڑی سڑک تھی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر گذر سکتی تھیں۔

یہ صرف ایک کتب خانے کی کتابیں تھیں جس سے دجلہ کا پل بنایا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ان کی سیاہی بہہ کر جو پانی میں گھلی ہے تو ایک مہینے تک علماء کو لکھنے کے لئے دوسری روشنائی کی ضرورت نہیں تھی، دجلہ کا پانی روشنائی کا کام دیتا تھا تو جس قوم کے ایک ملک کے ایک شہر کے صرف ایک کتب خانے کا یہ حال ہو تو اندازہ کیا جائے کہ بغداد میں کتنے کتب خانے ہوں گے! اندلس میں کتنے ہوں گے! حجاز میں کتنے ہوں گے! مصر میں کتنے ہوں گے!۔ خود آپ کے پاکستان میں کتنے کتب خانے ہیں! بہت سے کتب خانے وہ ہیں سندھ وغیرہ میں جن کو آج تک کیڑا چاٹ رہا ہے، ان کتابوں کو کوئی پڑھنے والا اور لکھنے والا نہیں ہے...... ہزاروں کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں، ذخیرے کے ذخیرے ہیں، یہ سب علماءِ اسلام کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ سب کی سب کتابیں قرآن حکیم کی شرح ہیں۔ ہر کتاب کے شروع میں کوئی نہ کوئی آیت ہے جس سے مضمون کو شروع کیا گیا ہے۔ تو قرآن کریم اتنا عظیم علمی معجزہ ہے کہ لاکھوں کتب خانے بن گئے، لاکھوں افراد عالم بن گئے کوئی حد کتابوں اور کتب خانوں کی باقی نہ رہی۔

قرآن معجزہ نما بھی ہے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معجزۂ علمی دیا گیا تو جس ذاتِ اقدس کا علم اتنا بڑا...... تو اس کی نبوت کتنی بڑی ہوگی! اس کی تعلیم کتنی بڑی ہوگی! تو فرمایا کہ: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں معلم بنا کر بھیجا گیا

ہوں تو تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے ذریعے دی۔ اس قرآن نے دنیا بھر کے اندر علم پھیلایا جس سے بڑے بڑے علماء تیار ہو گئے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ قرآن خود ہی معجزہ نہیں بلکہ معجزہ نما بھی ہے۔ معجزے بناتا بھی ہے اس لئے کہ قرآن پر چل کر ہی تو خواجہ معین الدین اجمیریؒ خواجہ اجمیری بنے اور اکابرِ اولیاء اللہ اسی پر چل کر اولیاء اللہ بنے تو قرآن درحقیقت نہ صرف خود معجزہ ہے بلکہ معجزہ نما بھی ہے اور یہ سلسلہ تا قیامت چلتا ہی رہے گا۔ تو اتنے علوم آپ کی ذات بابرکات میں رکھ دیئے گئے جو تا قیامت ختم ہونے کو نہیں آئیں گے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے علوم ہیں جو علماء، صوفیاء، محدثین اور فقہاء کے ذریعے ظاہر ہو رہے ہیں۔

حضور کا ایک ایک صحابی پورا پورا جہان تھا...... علم کا تو یہ عالم تھا اور تربیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تھی کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار اور بعض روایات میں اس سے زیادہ ایک لاکھ ۴۴ ہزار کا عدد آیا ہے تو ایک لاکھ چوالیس ہزار نمونے بنا کے رکھ دیئے۔ کسی مربی اور معلم کی یہی خوبی سمجھی گئی ہے کہ اپنے شاگرد کو اپنے جیسا بنا دے تو ایک ایک کو ایسا بنایا کہ ایک ایک امت اور جہان کے برابر بن گیا، ایک ایک صحابی پوری امت بن گیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھو تو پوری اُمت، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو پورا جہان، عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو اکیلے ہی پورا عالم اور علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کو دیکھا جائے تو ایک ہی فرد پورا جہاں۔

حدیث میں ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ نے پوری امّت ایک پلڑے میں رکھی اور مجھے ایک پلڑے میں تو میرا پلڑا جھک گیا، میرا ایمان اور علم و عمل ساری امّت سے وزن دار ثابت ہوا۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایک پلڑے میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بٹھایا گیا اور دوسرے پلڑے میں ساری امّت کو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا، علم و عمل اور اخلاق کے لحاظ سے وہ پوری امّت سے وزن دار ثابت ہوئے۔ پھر اس پلڑے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بٹھایا گیا اور ساری اُمت دوسرے پلڑے میں رکھی گئی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا پلڑا جھک گیا۔

تو صدیق، فاروق رضی اللہ عنہم اور دوسرے ایسے نمونے بنائے کہ ایک فرد جہانوں کے برابر ثابت ہوا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیضِ تعلیم اور فیضِ تربیت تھا۔ تو صدیق اکبر و فاروقِ اعظم و عثمان غنی، علیُ المرتضٰی، خالد سیف اللہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود وغیرہم رضی اللہ عنہم ...... یہ تو وہ چند ہیں جن کے نام زبان پر آ گئے ہیں ورنہ ایک ایک صحابی کو دیکھا جائے تو امّت کے سارے اقطاب اور بڑے بڑے غوث جمع ہو جائیں لیکن پھر بھی صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ تو جو اخلاص، معرفت اور للّٰہیت ایک صحابی کے قلب میں جمع تھی اس کا نمونہ غیر صحابی کے قلب میں موجود نہیں ہو سکتا، صحابہ نے نہ صرف اپنی زندگی کو تج دیا تھا بلکہ زندگی کی غرض و غایت ہی دین بن گیا تھا۔

عشقِ رسول میں ایک صحابی کا اپنی آنکھیں اور کان گنوانا...... حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے: ایک صحابی ہیں جو عوام صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہیں کوئی علماء اور فقہاء میں ان کا شمار نہیں ہے کھیتی باڑی کرتے تھے ہل چلا رہے تھے کہ کسی شخص نے جا کر خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ بس ہل چھوڑ کے دعاء کے لئے

ہاتھ اُٹھائے کہا کہ اے اللہ! یہ میری آنکھیں اس لئے تھیں کہ تیرے نبی کا دیدار کریں، یہ میرے کان اس لئے تھے کہ تیرے نبی کا کلام سنیں...... جب آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) دنیا میں نہیں تو میری آنکھیں ختم کردے اور میرے کان بھی ختم کردے، اَب نہ بینا رہنا چاہتا ہوں اور نہ شنوا۔ تھے مستجاب الدعوات ......اسی وقت نابینا ہو گئے اور اسی وقت بہرے بھی ہو گئے اور پھر مرتے دم تک نہ کسی کی صورت دیکھی اور نہ کسی کی آواز سنی۔ تو گویا انہوں نے اپنی بینائی اور شنوائی کا، آنکھ اور کان کا مقصد اللہ کے رسول کا کلام سُننا اور ان کا جمالِ مبارک دیکھنا بنالیا تھا اور یہی ان کی غرض وغایت تھی۔

تو جس قوم کا یہ حال ہو کہ ادنیٰ ادنیٰ فرد...... جس کا علماء میں بھی شمار نہ ہو، وہ اس درجہ معرفت، للّٰہیت اور اخلاص کامل پر ہو کہ سارے بدن کی قوتوں کی انتہائی غرض نبی ہی ہو تو اس سے بڑھ کر اور کون نمونے تیار کرسکتا ہے! تو ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے بنا دیئے۔ یہ تعلیم اور تکمیل اخلاق کا اثر تھا جس صحابی کو دیکھو علم وعمل کا ایک مجسمہ معلوم ہوتا ہے، ایثار اور زہد وقناعت کا ایک مجسمہ نظر آتا ہے۔ قلوب کی یہ رفتار اُمت کے اور کسی طبقے میں نہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں تھی۔

صحابہ کرام قرآن کی رُو سے ہمیشہ کیلئے مقدس ہیں...... اسی لئے قرآن کریم نے من حیث الطبقہ اگر کسی طبقے کی تقدیس بیان کی ہے تو وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہ پورے کے پورے طبقے کو مقدس قرار دیا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ① یہ تو سابقین اولین مہاجرین و انصار تھے اور جو بعد میں ملتے گئے مہاجرین وانصار کے ساتھ، ان سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ طبقے کے طبقے کے ساتھ اللہ تعالیٰ رضامندی کا اعلان کر رہے ہیں۔ اُس طبقے کے ساتھ کبھی رضامندی ظاہر نہیں فرماسکتے جس طبقے کے اندر کھوٹ موجود ہو یا ان میں کوئی خرابی موجود ہو اور اعلان کر رہے ہیں قرآن کے اندر اور قرآن قیامت تک رہنے والی چیز ہے تو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ کا وعدہ بھی قیامت تک رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے اُترنے کے بعد کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں آسکتا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی فرق پڑسکے، وہ برگزیدہ ہی رہیں گے اور تاقیامت پسندیدہ ہی رہیں گے...... ورنہ قرآن کی آیت غلط ثابت ہوگی تو من حیث الطبقہ جس طبقہ کی تقدیس کی ہے اور بزرگی بیان کی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہیں فرمایا ﴿اُولٰٓئِکَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ٥ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً﴾ ② یہ بزرگ لوگ ہیں (یعنی) خدا کے فضل اور احسان سے۔ تو اللہ تعالیٰ جن کو بزرگ کہے انکی بزرگی میں کیا کلام ہوسکتا ہے؟

کوئی یوں کہے: صاحب! پہلے تو ایسے ہی تھے مگر بعد میں معاذ اللہ ان میں کچھ نفاق پیدا ہو گیا تھا تو قرآن کریم

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰۔ ② پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۷-۸۔

نے اس کی بھی تکذیب وتردید کردی فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴾ ① یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو پہلے ہی جانچ لیا تھا امتحان لے لیا تھا یہ پرکھے پرکھائے لوگ ہیں۔ تو جن کو خدا پرکھ لے ان میں کھوٹ نہیں آسکتا ورنہ پرکھ غلط ثابت ہوگی تو بہر حال طبقے کے طبقے کو مقدس کہنا یہ صرف حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم وعمل کا نمونہ ہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ ② میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کسی کی اقتداء کروگے ہدایت پاؤ گے۔ کہیں فرمایا: اَللّٰہَ اَللّٰہَ اِفِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ مِّنْ بَعْدِیْ غَرَضًا ③ میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کو ہدف نہ بناؤ، ان پر ملامت نہ کرو، ان پر اپنی جانب سے تنقید مت کرو اور ان کے بارے میں خدا سے ڈرو! تقویٰ اختیار کرو۔ تو بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم وعمل کا نمونہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، اتباعِ سُنّت کے اندر غرق تھے کہ ان کے عمل کو دیکھ کر نبی کی سنتوں کا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاشرت کا پتہ چل جاتا تھا۔

تو دو غرضیں بیان فرمائی گئیں اور میری تقریر کا حاصل بھی یہ نکلا کہ ایک تو مقام نبوت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کس مقام کی تھی اور علم وعمل کے اعتبار سے آپ کا مقام کیا تھا، علم واخلاق کے اعتبار سے آپ کا مقام کیا تھا اور ایک یہ کہ نبوت کے مقاصد اور غرض وغایت کیا تھی، تو ان دو حدیثوں سے وہ غرض وغایت ظاہر ہوئی کہ وہ تعلیم علم اور تربیتِ اخلاق تھی۔

اُمّتِ محمد یہ کبھی ہلاک نہیں ہوسکتی...... اور پھر تیسری چیز یہ کہ اس تعلیم وتربیت کے آثار کیا تھے جو نمایاں ہوئے؟ وہ اس طرح کہ علم وعمل کے لاکھوں نمونے پیدا ہوگئے اور وہ نمونے صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ آخِرُہٗ ④ میری اُمت کی مثال اس بارش جیسی ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بارش کا پہلا حصہ زمین کے لئے فائدہ مند ہوگا یا بیچ کا یا اخیر کا۔ مطلب یہ ہے کہ خیریت اول سے لے کر اخیر تک امت میں گھومتی ہوئی موجود ہے: اول بھی خیر، بیچ بھی خیر، اخیر بھی خیر۔ مگر مراتب کا فرق رہے گا، فرقِ مراتب الگ چیز ہے مگر نفسِ خیریت اور نفسِ ہدایت وہ پوری اُمت میں مشترک ہے، اخیر میں بھی اعلیٰ نمونہ ملیں گے، وسط میں بھی اعلیٰ نمونے ملیں گے اور ابتداء

---

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳. ② مسند عبد بن حمید، احادیث ابن معرؓ ج: ۲ ص: ۳۰۲. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیھقی واسندہ الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء بایھم اقتدیتم اھتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف "التلخیص الحبیر" میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الجیر، باب ادب القضاء ج: ۵ ص: ۴۹۸.

③ السنن للترمذی، ابواب المناقب، باب فی من سب اصحاب النبی، ص: ۲۰۴ رقم: ۳۴۶۲.

④ المعجم الاوسط للبطرانی، من اسمہ سیف ج: ۸ ص: ۳۳۸ رقم: ۳۸۰۲.

میں بھی ملیں گے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ کَیْفَ تُھْلَکُ اُمَّۃٌ اَنَا اَوَّلُھَا وَالْمَھْدِيُّ وَسَطُھَا وَالْمَسِیْحُ آخِرُھَا ① وہ اُمت کیسے ضائع ہوسکتی ہے جس کی ابتداء میں میں ہوں اور انتہاء میں مسیح علیہ السلام اور بیچ میں حضرت مہدی علیہ السلام ہوں۔ یہ اُمت ضائع ہونیوالی نہیں ہے۔

کبھی فرمایا: "لَاتَزَالُ طَآئِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّھُمْ مَّنْ خَاذَلَھُمْ وَلَامَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللہِ" ② میری اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ باقی رہے گی (چاہے چھوٹی ہو) جو منصور من اللہ ہوگی حق پر قائم رہے گی، وہی کچھ کرتی رہے گی جو کچھ میں نے کیا، وہی کچھ کہتی رہے گی جو کچھ میں نے کہا ہے، وہی اس کا نعرہ ہوگا جو میرا نعرہ ہے۔ انہیں کوئی رسوا کرنیوالا رسوا نہیں کر سکے گا ذلیل کرنیوالا ذلیل نہیں کر سکے گا۔

کبھی فرمایا: اس اُمت میں خلف الرشید سے پیدا ہوتے رہیں گے، اخلاف پیدا ہوتے رہیں گے وہ کیا کریں گے؟ تحریف کرنے والوں کی تحریفات کو مٹا دیں گے، مبطل اور باطل پسندوں کی دروغ باطنیوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جاہلوں کی جاہلانہ تاویلات کے پردے چاک کرتے رہیں گے اور حق کو حق اور باطل کو باطل نمایاں کریں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث میں اطلاع دی کہ خیریت منحصر نہیں ہے کہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ختم ہوگئی...... ہمیشہ اہل خیر آتے رہیں گے ہمیشہ اخلاف رشید پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ اُمت آفتابوں ماہتابوں سے بھری ہوئی ہے تو آثارِ نبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتے ہیں کہ نبی کے زمانے میں بھی نمونے پیدا ہوئے اور ابد الآباد اور قیامت تک کی اطلاع دیدی کہ پیدا ہوتے رہیں گے: اِنَّ اللہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِاۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا ③ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر مجدد بھیجتے رہیں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے اور لوگوں نے جو اس میں خلط ملط کر دیا ہوگا اس کو نکھار کر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ تو صدی کے سرے پر الگ وعدے کئے، صدی کے اندر رہ کر اخلاف الرشید پیدا ہونے کے الگ وعدے کئے گئے، پوری اُمت کے اندر عالم وقت کے الگ وعدے کئے گئے تو یہ امت مجموعی حیثیت سے، طبقاتی حیثیت سے اور زمانے کی حیثیت سے خیر سے بھری ہوئی ہے۔ تو یہ آثارِ نبوت ہیں کہ ہر دور کو خیر سے لبریز کر دیا، ہر زمانے کو خیر سے بھر دیا تو یہ وہی کر سکتا ہے جس کا مقام نبوت سب سے زیادہ بلند ہو جس کے علم اور اخلاق سب سے زیادہ اونچے اور بڑھ کر ہوں اور جس کے پیدا کردہ نمونے ایسے ہوں کہ کسی پیغمبر کو وہ صحابہ نہ ملے ہوں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملے ہوں، کسی پیغمبر کو وہ جاں نثار نہ ملے ہوں جو آپ کو عطا کئے گئے ہوں۔

حاصل تقریر...... بہرحال یہ تو مجھ سے میرے بعض بزرگوں نے فرمایا تھا ورنہ دراصل میرے ذہن میں تو دوسرا

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، ج: ١١ ص: ٣٣٢.

② السنن لابن ماجه، كتاب السنة، باب اتباع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ص: ٢٣٧٧ رقم: ٦.

③ السنن لابی داود، كتاب الملاحم، باب مايذكر فی قرن الماة، ص: ١٥٥٣ رقم: ٣٢٩١.

مضمون تھا جو عرض کرنا تھا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ میں زیادہ تر طلباء کو خطاب کروں گا طلباء کے فرائض پر۔ اس کے ذیل میں دوسرے لوگ بھی فائدہ اُٹھالیں گے، اس واسطے کہ ساری اُمت تو طلباء نہیں ہے، سارے طالبانِ علم نہیں ہیں، ایک خاص طبقہ طلباء کا ہے تو ارادہ تو میرا یہ تھا کہ طلباء کے فرائض اور طلباء کی خصوصیات اور ان کے اخلاق ذکر کئے جائیں...... لیکن جلسہ میں آتے وقت بعض عزیزوں نے فرمایا کہ اگر مقامِ نبوت اور مقاصدِ نبوت کے بارے میں کے بارے میں کچھ بیان کیا جائے تو شاید زیادہ بہتر ہوگا اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کئے۔

تو میں نے دو حدیثیں تلاوت کیں ان دو حدیثوں میں مقاصدِ نبوت اور بعثت کی غرض و غایت بھی واضح ہوگئی اور چونکہ یہ غرض و غایت انتہائی اونچی تھی اس لئے مقامِ نبوت پر بھی روشنی پڑگئی اور پھر جب آثارِ نبوت سامنے آئے تو اس سے نبوت کی عظمت اور بڑائی ......اور واضح ہوئی۔ اس لئے میں نے تین باتیں عرض کیں: مقامِ نبوت، مقاصدِ نبوت اور آثارِ نبوت اور اس کے بارے میں یہ چند جملے عرض کیے جو اس وقت ذہن میں تھے۔

اللہ تعالیٰ اس امت کو اپنے پیغمبر کا متبع بنائے اس لئے کہ اتباع ہی میں علم اور اخلاق نصیب ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ امت اپنے پیغمبر سے کٹ جائے، اگر اس سلسلہ سے جو علم و اخلاق کا چلا آرہا ہے یہ اُلٹ کر کٹ جائے تو یہ اُمت علم سے بھی محروم ہو جائے گی اور اخلاق سے بھی۔ علم نبی کے دامن کے سوا کہیں نہیں ملے گا، اخلاقِ فاضلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن کے سوا کہیں نہیں ملیں گے۔ تو ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن کو سنبھال لیں، دامن پکڑ لیں، وہ کہیں ہو...... مگر آپ گرد و غبار سمجھ کر اس کو جھٹکیں نہیں، دامن کو اگر گرد لگ جائے تو لگی رہنی چاہیے کہ یہ میرے ہی مقام اور مکان کی گرد ہے، میرے ساتھ وابستہ رہے گی۔ تو جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جائیں گے دامن جائے گا، یہ گرد و غبار بھی وہیں جائیگا تو دامن سے وابستہ ہو جایئے، یہی سب سے بڑی بات ہے۔

اصل بنیادی چیز وابستگی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریل گاڑی میں سب سے اونچا فرسٹ کلاس کا ڈبہ سمجھا گیا ہے جس میں بڑے بڑے لوگ تموّل کے اعتبار سے یا اپنے کمال کے اعتبار سے سفر کرتے ہیں۔ اسی فرسٹ کلاس میں ایک چھوٹا کمپارٹمنٹ ہوتا ہے جسے سرونٹ کلاس کہتے ہیں، سرونٹ کلاس میں نہ ڈبے ہوتے ہیں نہ برقی پنکھے ہوتے ہیں، نہ کوئی سامانِ راحت ہوتا ہے، وہ تھرڈ کلاس ہے مگر لگا ہوا اور جڑا ہوا فرسٹ کلاس سے ہے، اس میں ملازمین بیٹھتے ہیں اس کی وابستگی کا اثر یہی ہے کہ جہاں جاکے فرسٹ کلاس رُکے گا وہیں جاکے ملازمین کا سرونٹ کلاس رُکے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آقا کے ملازم کے ڈبے کو روک دو، سرونٹ کلاس روک دو بلکہ جہاں آقا اُتریں گے ملازم بھی وہیں اُترے گا اور جس کوٹھی میں آقا کا قیام ہوگا اس میں ملازمین بھی حصہ لیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ جگہ جوتیوں میں ملے...... مگر ملے گی اسی کوٹھی کے اندر، ملازمین باہر نہیں نکالے جائیں گے۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عالَم کے فرسٹ کلاس میں سوار ہیں اور ہم سارے سرونٹ ہیں تو جہاں آقا کی سواری جنت

کے مقام میں جائے گی وہیں یہ بندے اور غلام بھی ساتھ جائیں گے ...... بشرطیکہ وابستگی رہے تو وابستگی قائم رکھنا یہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ علم بھی آقا سے وابستگی سے آئے گا اور اخلاق بھی۔ اسی سے کٹ گئے تو نہ علم باقی رہے گا نہ اخلاق تو اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم تعلیم نبوت سے مستفیض ہوں، اخلاقِ نبوت سے مستفید ہوں اور حق تعالیٰ شانہ دنیا وآخرت میں ہماری اس خصوصیت کو قائم رکھے اور دنیا کو ہمارے سے استفادہ کا موقع دے اور ہمیں کتاب وسنت اور علماء ربانی سے استفادہ کا موقع عطاء فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اَللّٰھُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّاتِنَا مَآ اَحْیَیْتَنَا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَآ اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَایَۃَ رَغْبَتِنَا اَللّٰھُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَّا یَرْحَمُنَا وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

کتابِ خداوندی اور شخصیتِ مقدسہ
ہدایت کیلئے دونوں ضروری ہیں

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ...... ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَامَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ ①

احوالِ واقعی ......آپ حضرات کی دعوت پر میں دارالعلوم (دیوبند انڈیا) سے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اس ملک (پاکستان) میں حاضر ہوا اور آپ حضرات سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا، سعادت بھی میسر آئی اور اس کا موقع ملا کہ ہم اپنی بساط کے مطابق آپکو فائدہ پہنچائیں اور آپ سے فائدہ حاصل کریں۔ گویا ہماری یہ مجلس ایک دینی مجلس ہے جس کا مقصد افادہ اور استفادہ، فائدہ پہنچانا اور فائدہ حاصل کرنا ہے، نیز دینی منافع کو ترقی دینا ہے تاکہ ہم لوگ صراطِ مستقیم پر قائم رہیں اور کج راستوں سے بچ کر پھر اسی راستے پر چلیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا ہے۔

دین کی تاریخ کا اصولِ مُسلّم کہ کتاب کے ساتھ معلم بھی آئے ......دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور دنیا سے زیادہ دین کی تاریخ کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہدایت کے دو طریقے مقرر فرمائے ہیں۔ دونوں جمع ہوتے ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ہوتی ہے، دونوں نہ ہوں تو کلیۃً گمراہی رہتی ہے اور دونوں میں سے ایک نہ ہو تو راستہ ٹیڑھا رہتا ہے۔ جب دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو سیدھے راستہ کی ہدایت ملتی ہے۔ ایک قانونِ خداوندی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے قلوبِ مبارکہ پر آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ نے کتابیں اتاریں۔ تو ایک چیز تو قانونِ الٰہی ہے جو منزل من اللہ ہے،

① پارہ :۲۷ ، سورۃ الحدید، الآیۃ:۲۵.

دوسری چیز وہ شخصیتیں ہیں جنکے ذریعہ سے اس قانون کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس قانون کے احکام معلوم ہوتے ہیں، احکام کی علتوں کا اور بنیادوں کا پتہ چلتا ہے، مسائل کے دلائل کا علم ہوتا ہے اور اس کے لئے شخصیتیں اتاری گئیں۔

تو ہدایت کے یہی دو طریقے ابتداء سے لے کر آج تک رہے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ نے تیس صحیفے نازل فرمائے لیکن صحیفوں کے ساتھ آدم علیہ السلام کی شخصیت کو بھی بھیجا تا کہ وہ جا کر ان صحیفوں کے مطالب کو سمجھائیں، ان کے احکام پر لوگوں کو مطلع کریں۔ اگر صحفِ ابراہیم علیہ السلام آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بھیجے گئے تا کہ ان صحیفوں کا مطلب سمجھائیں، ان کے مطالب اور معانی دنیا کے آگے پیش کریں اور حق تعالیٰ کی جو مرادات ہیں کہ فلاں آیت کا یہ مطلب ہے، فلاں آیت کی یہ مراد ہے، اس مراد پر لوگوں کو مطلع فرمادیں۔ اگر تورات آئی تو موسیٰ علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔

انجیل آئی تو حضرت مسیح علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔ زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی بھیجے گئے۔ اور جب قرآن کریم نازل ہوا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس بھی دنیا میں بھیجی گئی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کریم کے حقائق سمجھائیں اور مراداتِ ربانی بتلائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار فریضے مقرر فرمائے گئے، جن کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ ہی وہ ذات بابرکات ہے کہ جس نے امیوں میں رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

تلامذۂ خدا اور اساتذۂ انسانیت ...... رسول ایسے جو خود بھی اُمّی، کسی مکتب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ انبیاء علیہم السلام کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھے ہوتے ...... اس لئے کہ وہ دنیا کو علم دینے کے لئے آتے ہیں، دنیا سے علم لینے کیلئے نہیں آتے۔ حق تعالیٰ براہ راست انکو علم دیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام براہ راست حق تعالیٰ شانہ کے تلمیذ اور شاگرد ہوتے ہیں تو جو اللہ سے فیضان حاصل کریں وہ دنیا سے علوم کا فیضان حاصل نہیں کر سکتے تو انبیاء علیہم السلام علم لینے کیلئے نہیں دینے کیلئے آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی انبیاء کی تعلیم کا ذکر ہے تو حق تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ ہم نے ان کو تعلیم دی ہے، آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ② اللہ نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی، تمام چیزوں کے نام سکھلائے۔ اسی طرح سے حضرت یوسف علیہ السلام کو خصوصیت سے تعبیر

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۱۔

خواب کا علم دیا گیا فرمایا ﴿ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ نے آپکو تاویلِ احادیث کی تعلیم دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ ﴾ ② ہم نے ہی تو زرہ سازی کا علم آپ کو دیا ہم نے ہی تو آپ کو سکھلایا تا کہ تم کو لڑائی (کے ضرر) سے بچائے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ﴿ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴾ ③ ہم نے خزانۂ غیب سے آپ کو علم عطا کیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا: ﴿ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴾ ④ اللہ نے آپکو تعلیم دی ان چیزوں کا علم دیا جن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ کا بہت بڑا فضل اور انعام ہوا جو اپنے خزانۂ غیب سے علم عطاء کیا اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَاالْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ ⑤ اے پیغمبر! ہم نے آپکی طرف اپنی روح کی وحی کی ہے، علم کو روحِ خداوندی کہا گیا ہے، اسی روح سے اقوام زندہ ہوتی ہیں، کوئی قوم جہالت سے زندگی حاصل نہیں کر سکتی، جس قوم نے زندگی پائی ہے دنیا کی زندگی دنیوی علوم سے اور آخرت کی زندگی اخروی علوم سے ہی پائی ہے۔ زندگی بہر حال علم کے تابع ہے، جہالت سے نہ دنیا چل سکتی ہے نہ آخرت چل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے علم کو روح بتلایا کہ اسی سے اقوام کی زندگی ہے۔

اور فرمایا ﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ ﴾ ⑥ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو جانتے ہی نہ تھے کہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے! آپ کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ ایمان کے معنیٰ کیا ہیں! ہم نے اپنی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب میں ایک نور ڈالا، علم کی روشنی ڈالی، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ تو ہر جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے اپنے کو ان کا استاذ ظاہر کیا اور انبیاءؑ کو شاگرد ظاہر کیا ہے۔ تو جو حضرات بلا واسطہ اللہ کے شاگرد ہیں وہ دنیا کے شاگرد کیسے بن سکیں گے! وہ تو دنیا کے استاذ بنیں گے۔

حضرت عیسیٰ مسیحؑ کا پانچ برس کی عمر میں استاذی کا واقعہ..... حضرت مسیح علیہ السلام کی عمر پانچ سال کی تھی ان کی والدہ ماجدہ نے پڑھنے کیلئے مکتب میں بھیجا۔ استاذ کے سامنے بیٹھے تو استاذ نے کہا کہ: کہو الف! فرمایا: الف کے کیا معنیٰ ہیں؟ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ: تُو پھر مہملات (بے معنی چیزوں) کی تعلیم دینے بیٹھا ہے؟ تو استاذ بنا ہے تو جو چیز بتلائی ہے اس کے معنی بھی بتلا اور جس چیز کے معنی نہیں اس کی تعلیم کیسی! وہ تو جاہلانہ تعلیم ہوگی۔ اب وہ استاذ بے چارہ حیران ہوا کہ یہ عجیب قسم کا شاگرد آیا ہے کہ اس نے میرے اوپر سوالات قائم کر دیئے ہیں! تو استاذ نے پوچھا کہ تم ہی بتاؤ الف کے کچھ معنی ہیں؟ فرمایا کہ: ہاں! معنیٰ ہیں۔

---

① پارہ: ۱۲ سورۃ یوسف، الآیۃ: ۶. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۰. ③ پارہ: ۱۵، سورۃ الکھف، الآیۃ: ۶۵.
④ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۱۳. ⑤ پارہ: ۲۵ سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲. ⑥ پارہ: ۲۵ سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

استاذ نے پوچھا تجھے معلوم ہیں؟ فرمایا کہ: ہاں معلوم ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا معنیٰ ہیں؟ فرمایا کہ اپنی استاذی کی جگہ چھوڑ! یہاں شاگردوں کی لائن میں بیٹھ تب بتلاؤں گا۔ استاذ جگہ چھوڑ کے آیا اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا پھر آپ نے الف کے معنیٰ بتلائے اور توحیدِ خداوندی، عظمتِ خداوندی اس طرح ثابت کی کہ استاذ حیران تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کے استاذ براہِ راست حق تعالیٰ شانہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اللہ سے علم حاصل کرتے ہیں اس لئے وہ عالَم کے استاذ ہیں اور وہ کسی کے شاگرد بننے کے لئے نہیں آتے۔

قانونِ ہدایت...... تو ہدایت کیلئے اللہ نے ایک قانون رکھا اور قانون کے ساتھ ایک شخصیت رکھی تاکہ اس قانون کے مطالب اور مراداتِ خداوندی لوگوں کو سمجھائیں۔ قرآن کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اسی اصول پر نازل کی گئیں۔ قرآن قانونِ حق بن کر آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات معلم بن کر آئی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی فرمایا: **اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا** حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دو جماعتیں بیٹھی ہوئی تھیں، ایک جماعت نوافل میں، تسبیح میں، تہلیل میں اور تکبیر میں یعنی ذکر و عبادت میں مصروف تھی اور ایک جماعت علمی مسائل کا تذکرہ کررہی تھی کہ یہ چیز جائز ہے، یہ ناجائز، یہ حلال، یہ حرام وغیرہ۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: **کِلَا کُمَا عَلَی الْخَیْرِ** دونوں جماعتیں خیر پر ہیں، جو عبادت اور زہد میں مصروف ہے وہ بھی خیر پر ہے، جو علمی مسائل میں مصروف ہے وہ بھی خیر پر ہے مگر فرمایا کہ: **اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا** میں تو دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، یہ فرما کر اس جماعت میں بیٹھ گئے جہاں مسائل کا تذکرہ ہورہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری حیثیت معلم کی ہے تاکہ دنیا کو علم سے آشنا کروں اور دنیا میں علم کی روشنی پھیلاؤں تاکہ جہالت ختم ہو تو ایک طرف ذاتِ اقدس آئی اور ایک طرف قرآن کریم آیا۔

قرآن کریم واحد اللہ کا کلام ہے...... اسکے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے اتارے گئے یعنی اور کتابوں کو ہم مجازاً ''کلام اللہ'' کہہ سکتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں کلام اللہ صرف قرآن کریم ہے اس لئے کہ کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے، اس کا تکلم کرے...... تو تورات کا تکلم نہیں ہوا بلکہ تورات کو الواح پر لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا گیا تو اسے کتابِ خداوندی تو کہیں گے کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے، مجازاً کلام اللہ کہہ سکتے ہیں، حقیقی معنوں میں نہیں۔ انجیل کو حق تعالیٰ نے لکھ کر بھی نہیں دیا، تکلم بھی نہیں فرمایا بلکہ حضرت مسیحؑ کے قلبِ مبارک پر اُتارا، اسے مضمونِ خداوندی تو کہیں گے، کلام خداوندی نہیں کہیں گے۔ کلام وہی ہے جس کا تکلم ہو۔

قرآن کریم وہ ہے جس کا اوّل سے لے کر آخر تک حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا ہے جبرئیل علیہ السلام کو سنایا اور جبرئیل علیہ السلام نے جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا تو اللہ تعالیٰ سے تکلم واقع ہوا۔ تو کلام وہ ہے جس کو متکلم بولے اور لکھ کر دیدے تو وہ مجازاً کلام ہے۔ اسی طرح دل میں کوئی چیز ڈال دے تو وہ بھی مجازاً کلام کہلائے

گا، اِس کو مضمون کہیں گے اور اُس کو کتاب کہیں گے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ قرآنِ کریم کا تکلم فرماتے تو اسکی عظمت سے ملائکہ پر بے ہوشی طاری ہوتی تھی..... جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوش میں رہتے تھے، مگر کچھ مدہوش سے اور بے خود سے وہ بھی ہو جاتے تھے، جب ہوش میں آتے تو ملائکہ ان سے پوچھتے ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ﴾ ① اب تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ تو وہ فرماتے: ﴿قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ ② حق فرمایا اور وہ بلند و بالا ہے عظمت والی ذات ہے۔ تو حق تعالیٰ نے ہر ہر آیت کا تکلم کیا ہے۔

اس واسطے کہ ''کلام اللہ'' اسے ہی کہتے ہیں کہ الفاظ بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں اور معانی بھی اللہ ہی کی جانب سے آئے ہوں۔ ہم نہ الفاظ میں مُوجد ہیں (اور نہ ہی معانی و مطالب میں اور) ہم تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مُوجد نہیں ہیں، آپ الفاظِ قرآن کے ناقل ہیں، اسی طرح سے معانی کے اندر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ناقل ہیں اور ہم سب بھی ناقل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر جو معانی ڈال دیئے انہیں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کے آگے پیش فرمایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الفاظ میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں۔ مدعی نہیں بلکہ امانت کے ساتھ ناقل ہیں۔ تو امانتِ کاملہ کے ساتھ الفاظِ الٰہی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچا دیئے اور معانیٔ خداوندی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچا دیئے۔

کتابِ قانون کے الفاظ و معانی کی حفاظت..... چنانچہ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا کہ جب وحی نازل ہوئی تو ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رٹنے لگتے اور بار بار اس کو پڑھتے تاکہ بھول نہ جائیں تو حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ③ زبان کو حرکت نہ دیں، جلدی نہ کریں، یہ جو خطرہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھول جائیں گے اس کے لیے فرمایا: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ④ ہم گارنٹی دیتے ہیں ہمارے ذمہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں اس کو جمع بھی کر دیں گے اور آپ سے پڑھوا بھی دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا فکر نہ کریں..... جمع کرنا، محفوظ کرنا، پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔

حق تعالیٰ نے وہ ذمہ پورا فرمایا۔ یہ الفاظ کا ذکر ہے اس لئے کہ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ﴾ فرمایا ہے تو قرأت لفظوں کی ہوتی ہے، معنی کی نہیں ہوتی، معنی کی تفہیم کی جاتی ہے قرأت نہیں کی جاتی۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ⑤ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے تو یہاں تک الفاظ کی حفاظت کی گارنٹی دی، معلوم ہوا کہ الفاظ خداوندی محفوظ ہیں ان میں کوئی ردّ و بدل ممکن نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔ ② پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۲۳۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔
④ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ⑤ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

آگے معانی کا قصہ تھا تو معانی کے بارے میں بھی فرمایا ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ ① پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا بیان کرنا تو بیان لفظوں کا نہیں ہوا کرتا معانی کا ہوا کرتا ہے، کھول کھول کر معانی بیان کئے جاتے ہیں، پڑھوانے کو بیان نہیں کہتے قرأت کہتے ہیں۔ تو الفاظ کی گارنٹی بھی دی گئی معانی کی گارنٹی بھی دی گئی۔ ان میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوسکتا۔

کتاب کے ساتھ استاذ کی ضرورت کی وجہ...... تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی کے بارے میں بھی امین ہیں، بلا کم وکاست آپ نے وہ معانی بیان فرما دیئے۔ الفاظ کو اس لئے نازل کیا گیا کہ حقائق الفاظ ہی میں چھپے ہوتے ہیں۔ لفظ کا ذرا ردوبدل ہو جائے...... معنیٰ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ الفاظ تو بعد کی چیز ہیں ایک لفظ ہو لب ولہجہ بدل جائے تو معانی بدل جاتے ہیں اور کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر کہا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان میں ایک جملہ ہے "کیا بات ہے" یہ معمولی سا جملہ ہے ہر شخص بولتا ہے، اس کے کئی معنی آتے ہیں اور ہر معنیٰ کا تعلق لب ولہجہ اور طرز ادا سے ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ بھئی کیا بات ہے؟ سب سمجھیں گے کہ میں نے سوال کیا ہے کہ بھئی کیا بات ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ کیا قصہ ہے؟ اور اگر میں یوں کہوں کہ (واہ!) کیا بات ہے...... اب آپ کیا سمجھے؟ قطعاً یہ نہیں سمجھے کہ میں نے سوال کیا ہے، بلکہ یہ سمجھے ہوں گے کہ میں نے بڑائی بیان کی ہے، تفخیم شان بیان کی ہے کہ فلاں چیز تو بہت بڑی ہے، کیا بات ہے اور اگر لہجہ بدل کے (حقارت آمیز انداز میں) یوں کہوں کہ کیا! بات ہے! اب آپ کیا سمجھے؟ بڑائی نہیں سمجھے ہونگے! بلکہ یہ سمجھے ہوں گے کہ میں حقارت بیان کر رہا ہوں، یہ تحقیر کیلئے ہے اور اگر لب ولہجہ بدل کے (تعجب خیز لہجے میں) یوں کہوں کہ کیا بات ہے! اب آپ کیا سمجھے؟ نہ سوال سمجھے، نہ تفخیم شان سمجھے اور نہ تحقیر شان! بلکہ آپ تعجب اور حیرت سمجھے۔ ایک ہی جملہ ہے اور کئی معنیٰ پر دلالت کی۔ بس لب ولہجہ کے بدلنے سے معانی بدل گئے۔

اب فرض کیجئے اگر میں یہ جملہ خط میں لکھ کر آپ کو بھیج دوں تو لفظ تو خط میں آ جائیں گے مگر لب ولہجہ اور طرز ادا تو کاغذ میں نہیں آئے گا یا تو متکلم خود آ کے لب ولہجہ سے سمجھائے یا اپنا کوئی قاصد بھیجے کہ وہ ادا کر کے بتلائے کہ یہ مراد ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز نہ ہوئی فقط کاغذ سامنے ہوا تو آپ کے نفس پر جو کیفیت غالب ہوئی وہ معنیٰ آپ سمجھ لیں گے، اور وہ متکلم کی مراد نہیں ہوگی آپ کی مراد ہوگی۔ لفظ آپ متکلم کے لیں گے معنی اس میں اپنے ڈالیں گے۔ یہ تلبیس ہو جائے گی، التباس ہو جائے گا کہ لفظ اللہ کے لے لیے اور معانی اپنے ڈال دیئے۔ تو جس طرح سے ہر زبان میں عرف اور طرز ادا سے معانی بدل جاتے ہیں، قرآن کا بھی تو ایک عرف ہے اس میں بھی لب ولہجے اور طرز ادا سے معانی بدل جاتے ہیں، ذرا لہجہ بدل دو معانی کچھ کے کچھ ہو گئے۔ ذرا لفظوں کی مراد میں فرق سمجھ میں آ گیا معانی بدل گئے۔

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔

مرادِ باری تعالیٰ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نہ سمجھ پائے ...... حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ابتدائے اسلام میں حکم یہ تھا کہ روزہ افطار کر کے پھر رات بھر کھانے کی اجازت نہیں تھی گویا سحری نہیں کھاتے تھے بلکہ رات اور دن کا بھی روزہ تھا، بس ایک دفعہ کھانا پینا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگوں پر بھاری گزرا، تحمل نہیں ہوسکا، برداشت سے باہر ہوگیا تو حق تعالیٰ نے تخفیف فرمائی اور فرمایا: کہ اللہ نے تمہارے ضعف کو دیکھ لیا ہے اب نیا حکم ہے: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تم تحمل نہیں کرسکتے لہٰذا رات بھر کھاؤ پیو آرام کرو...... یہاں تک کہ کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان لیا جائے اور ممتاز ہوجائے...... اس وقت روزے کی نیت کرو۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دو ڈورے لئے ایک کالا اور ایک سفید اور تکیہ کے نیچے رکھ لئے۔ اب اس کو دیکھتے رہتے تھے جب تک اندھیرا رہتا کھاتے پیتے رہتے حالانکہ صبح صادق گزرے ہوئے تیس منٹ گزر چکے ہوتے، صبح صادق کے بعد کچھ نہ کچھ تاریکی رہتی ہے، کچھ اندھیرا ہوتا تھا، کالے اور سفید ڈورے میں تمیز نہیں ہوتی تھی، لہٰذا تکیہ اٹھایا دیکھ لیا، ابھی دونوں میں تمیز نہیں...... بس پھر کھا رہے ہیں حالانکہ صبح صادق ہوچکی ہوتی۔

یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو فرمایا کہ اے عدی! تم کیا کرتے ہو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ تو میں نے دو ڈورے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں دیکھتا رہتا ہوں (اور کھاتا رہتا ہوں)۔ فرمایا کہ: اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ رات دن دونوں اس کے اندر سما گئے! بندہ خدا! خیطِ ابیض سے مراد صبح صادق کی سفیدی اور خیطِ اسود سے مراد رات کی تاریکی ہے، یہ روئی کا ڈورا مراد نہیں ہے۔ ② تو لغت کے لحاظ سے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ غلط نہیں سمجھے تھے لغۃً تو خیط روئی کے دھاگے کو کہتے ہیں، لغت کے لحاظ سے صحیح سمجھے اور عمل بھی صحیح کیا مگر حق تعالیٰ کی وہ مراد نہیں تھی، اس سے مراد رات اور دن ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مراد بتلائی تب ان کے روزے صحیح سمجھے گئے۔

قرآن کا اپنا عرف...... اس سے اندازہ ہوا کہ قرآن کریم کو محض لغت اور عرف کے بل بوتے پر نہیں سمجھا جاتا قرآن کریم لغتِ عرب میں نازل ہوا ہے، لیکن بہت سے الفاظ میں قرآن کریم نے اپنے معانی ڈالے ہیں، لغوی معنی مراد نہیں بلکہ وہ معنی مراد ہیں جو عرفِ شریعت میں ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے اس کے معنی رحمت اور دعاء کے تھے بس گھر میں بیٹھے آدمی پانچ وقت دعاء کرلے مسجد میں حاضری کی کیا ضرورت ہے! بس نمازی ہوگیا لیکن اس

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصوم، باب بیان الدخول فی الصوم...... ص: ۸۵۲ رقم: ۲۵۳۳.

طرح نماز نہیں ہوگی۔ لغۃً تو صحیح ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعاء مانگنے کے ہیں مگر مرادِ متکلم وہ نہیں تھی بلکہ مراد افعالِ خاصہ ہیں کہ یوں نیت باندھو، یوں ہاتھ اٹھاؤ، یوں رکوع کرو، یوں سجدہ کرو تو اس مجموعے کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ یا مثلاً حج کا لفظ ہے، حج کے معنیٰ لغت میں قصد کرنے کے ہیں تو گھر میں بیٹھ کے قصد کرلیا اور حاجی ہو گئے! کیا ضرورت ہے کہ ڈیڑھ دو اور چار ہزار روپے خرچ کر کے حجاز پہنچے! لغت کے لحاظ سے تو ''حج'' ہو گیا اور حاجی بن گئے۔ مگر لغوی معنی مراد نہیں، مرادی معنی دوسرے ہیں۔ تو قرآن میں لفظ لغتِ عرب کا ہے معنی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے ڈالے ہیں کہ چند مخصوص افعال کا نام حج ہے، صرف قصد کرنے کا نام حج نہیں ہے۔ ہم لغت کو رد نہیں کرتے مگر اصطلاح یہی ہے گویا عرفی اصطلاح ہے اور اس کو منقول اصطلاحی کہتے ہیں کہ لفظ تو لغتِ عرب کا ہے مگر کسی اپنے معنی کی طرف منقول کرلیا ہے۔ اگر استاذ بتلانے والا نہ آئے تو آدمی وہی سمجھے گا جو لغت کے معنی ہیں..... جب تک معلم آکر تعلیم نہ دے مرادِ ربانی سامنے نہیں آئے گی۔

ضرورتِ مُعلّم ...... یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا گیا کہ قرآن کے معنی سمجھائیں محض لغوی معنی مراد ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت نہیں تھی حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم بیت اللہ کی چھت پر رکھ جاتے اور اعلان کردیتے کہ اے لوگو! تم مریضانِ نفوس ہو اور یہ نسخۂ شفاء ہے اپنا علاج خود کرلیا کرو مگر دنیا میں یہ اصول نہیں ہے کہ طب کی کتابیں دیکھ کر آدمی علاج کرے، جب تک طبیب اور معالج نہ ہو کتاب اصول بتلا دے گی، موازین بتلا دے گی، مقداریں بتلا دے گی نفسیات کو تو نہیں پہچانے گی، موسم کو نہیں پہچانے گی یہ تو طبیب ہی نبض پر ہاتھ رکھ کر پہچانے گا کہ مرض ٹھنڈا ہے یا گرم ہے، مرض ٹھنڈا ہوا تو گرم دوائیں دے گا مرض گرم ہوگا تو ٹھنڈی دوائیں دے گا۔ تو بغیر طبیب کے معالجہ ناممکن ہے یہ بدنی معالجہ ہے وہ روحانی معالجہ ہے، وہاں بدنی اطباء کی ضرورت ہے یہاں روحانی اطباء کی ضرورت ہے۔ بغیر طبیب کے نہ بدن اچھا رہ سکتا ہے اور نہ بغیر طبیب کے آدمی کی روح اچھی رہ سکتی ہے دونوں جگہ معالج کی ضرورت ہے تو قرآن نسخۂ شفاء ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام حکماء بنا کر بھیجے گئے ہیں وہ اطباءِ روح ہیں جو روح کے نشیب و فراز جان کر نسخہ تجویز فرماتے ہیں اور علاج کرتے ہیں۔

صحیح عنوان اور الفاظ کی ضرورت، عرفی شاعر کا واقعہ ...... بہرحال الفاظ کی ضرورت اس لئے تھی کہ الفاظ ہی کے اندر معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ لفظ اور لہجہ بدل جائے تو معانی ختم ہو جاتے ہیں، عنوان میں معانی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ عنوان کا لفظ ذرا بدل دیں معانی بدل جائیں گے۔

آپ نے نام سُنا ہوگا عرفی انوری ایران کا بہت بڑا شاعر گزرا ہے۔ اس نے بادشاہ کی شان میں قصیدہ پڑھا تو بادشاہ نے خوش ہو کر ایک نہایت اعلیٰ عربی گھوڑا انعام میں اسکو دیا، زین، لگام وغیرہ سونے چاندی سے مرصع اور گھوڑا بھی بڑی اعلیٰ نسل کا تھا۔ انوری گھوڑا لیکر گھر آیا، بے چارہ غریب آدمی تھا گھوڑے کو یہاں گھاس بھی میسر نہ آئی، شاہی اصطبل میں ہوگا تو معلوم نہیں دودھ جلیبیاں کھاتا ہوگا، دانے کہاں کھاتا ہوگا نتیجہ یہ ہوا کہ رات ہی رات گھوڑے

بیچارے کا انتقال ہو گیا۔ اب انوری کو فکر ہوئی کہ بادشاہ کو اطلاع تو ہو جائے گی۔ اگر کل اطلاع ہوئی (اور آج میں نے ازخود نہ بتلایا) تو بادشاہ بلا کے کہے گا کہ اس نے شاہی عطیہ کی قدر نہیں کی، لہٰذا اس کی گردن اڑا دی جائے تو میں بھی گیا گھوڑا تو گیا ہی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں خود ہی جا کے کیوں نہ اطلاع کر دوں تو گھوڑے کے مرنے کی اطلاع دی مگر ایسے اچھے عنوان سے کہ ایک گھوڑا اور انعام میں لیکر آیا۔ کس خوبصورتی سے اطلاع دی اور کہا کہ:

شاہ اسپے بانوری بخشید　　　　بادِ صرصر بہ گرد اونہ رسید

بادشاہ نے انوری کو ایک گھوڑا انعام میں دیا وہ گھوڑا ایسا تھا کہ ہوائیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں اتنا تیز دوڑتا تھا کہ آندھی پیچھے رہ جاتی تھی اور گھوڑا آگے نکل جاتا تھا اتنا تیز رفتار تھا، آگے رفتار کی تیزی کو بیان کیا ہے:

ایں چنیں تیز بود در رفتار　　　　درشباشب بعاقبت می رسید

اتنا تیز رفتار تھا کہ رات کے رات ہی دنیا کا عالم طے کر کے آخرت میں جا پہنچا، اس کی تیز رفتاری کی کوئی انتہا ہے!۔ بادشاہ کو ہنسی آ گئی اور کہا کہ اس کو ایک گھوڑا اور دیدو اور اگر یوں کہتا کہ حضور جو مجھے گھوڑا دیا تھا وہ مر گیا تو حکم یہ ہوتا کہ اسے بھی مار دو کمبخت نے شاہی عطیہ کی ناقدری کی ہے۔ تو عنوان کا فرق ہے کسی اچھے اسلوب سے خبر دی تو انعام پایا، برے اسلوب سے خبر دیتا تو اس سے انتقام لیا جاتا ہے۔

اگر کوئی اپنے باپ کا تعارف یہ کہہ کر کرائے کہ یہ قبلہ میرے والدِ بزرگوار ہیں، باپ خوش ہوگا کہ بیٹا سعادت مند ہے، باپ کی عظمت کو برقرار رکھتا ہے اور اگر یوں کہے کہ یہ میرا باپ ہے تو باپ اگر کچھ ناخوش نہیں ہوگا تو خوش بھی نہیں ہوگا، یوں سمجھے گا کہ بھدّا ہے، بے وقوف ہے، اس کو تمیز نہیں ہے، باپ کی عظمت کو کچھ جانتا ہی نہیں اور اگر یوں کہہ کر تعارف کرائے کہ یہ میری ماں کا خصم ہے تو باپ اس کے منہ پر طمانچہ رسید کرے گا۔ حالانکہ بات غلط تو نہیں کہی، ماں کا خصم تھا تب تو صاحبزادے پیدا ہوئے، خصم نہ بنتا تو صاحبزادے کہاں سے پیدا ہوتے؟ تو بات صحیح کہی مگر عنوان بھدّا تھا اور غلط تھا اس واسطے زجر و توبیخ اور سزا کا مستحق ہوا۔

اسلوبِ بیان..... تو عنوان کے اندر مضامین چھپے ہوتے ہیں، الفاظ کا تو اسلوبِ بیان ہوتا ہی ہے اور شاعر تو واقعی اسلوبِ بیان ہی کی روٹی کھاتے ہیں، وہ اشعار کو نظم کرتے ہیں تو اعلیٰ مضمون کو اچھی تمثیل و تشبیہ میں ذکر کرتے ہیں۔ لوگ واہ! واہ! کرتے ہیں، داد دیتے ہیں۔ ایک ہی مضمون ایک شاعر بیان کرتا ہے اور اسی مضمون کو دوسرے درجے کا شاعر بیان کرے تو وہ زیادہ انعام لے جائے گا اور یہ کم لے گا۔ حالانکہ بات دونوں نے ایک ہی کہی تو شاعر تو طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کا کھاتے ہیں۔ مجھے اس پر یاد آیا، ہماری اردو زبان کا محاورہ ہے "آنکھ سے آنکھ لڑ جانا" یہ محبت ہو جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو کہتے ہیں کہ آنکھ سے آنکھ لڑ گئی یعنی محبت قائم ہو گئی تو استاذ ذوق نے جو مانا ہوا شاعر ہے اس محاورہ کو ایک شعر میں نظم کیا ہے، کہتا ہے کہ:

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا　　　　کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

یہ آنکھیں تو لڑنے میں مصروف ہیں مجھے اپنے دل کا خوف ہے۔ آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی! مجھے ڈر ہے دل کا! کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا۔ آنکھیں تو لڑیں گی اور یہ مارا جائے گا گرفتار ہو جائے گا۔ اس واسطے مجھے دل کا فکر ہے تو بڑی خوبصورتی سے آنکھ لڑنے کے محاورے کو اس نے نظم کر دیا اور اس شعر کو لوگ واقعی ضرب المثل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک ہندو شاعر نے ادا کیا ہے مکندرام اس کا نام ہے، اس نے اس مضمون کو بڑھا دیا اور بہت نازک خیالی دکھلائی وہ کہتا ہے کہ:

دل کی نہیں تقصیر مکند! آنکھیں ہیں ظالم یہ جاکے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

دل کا بالکل کوئی قصور نہیں ہے یہ تو آنکھیں ظالم ہیں، یہ سارا قصور ان آنکھوں کا ہے کہ یہ جاکے لڑیں اور دل گرفتار ہوا تو محاورہ ایک تھا، ایک شاعر نے ایک انداز سے ادا کیا، ایک نے ایک انداز سے، ذرا سا عنوان بدلا مضمون کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام کو اپنے ہی الفاظ میں نازل کیا ہے کیوں کہ اگر بندے اپنے اپنے الفاظ میں ادا کریں گے تو تغیر وتبدل لازمی ہے اور جب الفاظ میں تغیر ہوگا معانی کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے حالانکہ معانی میں بھی اُمت امین ہے، لفظوں میں بھی امین ہے اپنی طرف سے ایجاد نہیں کر سکتی۔

معانیٔ قرآن...... بہر حال حق تعالیٰ نے الفاظ میں بھی حفاظت کی گارنٹی دی کہ ہم اس کو محفوظ رکھیں گے اور معانی میں بھی اس کی گارنٹی دی اور معانی...... ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ① وہ بیان ہیں کہ اللہ کی مرادات کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ادا فرمایا، وہ بھی وحی ہے، جس کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ تو حدیث قرآن کا بیان ہے، قرآن کی اولین تفسیر حدیث مبارک ہے، اگر حدیث پر اطلاع نہ ہو آدمی کبھی مفسر نہیں بن سکتا۔ حدیث نبوی اوّلین تفسیر ہے جو قرآن کا بیان ہے، فرمایا گیا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ۔ ②

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا ہے تا کہ آپ کھول کھول کر اس کی مرادات اور معانی بیان کریں۔ تو ذکر کو نازل کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبین قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر جو معانی اترتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ بیان کرتے تھے، تو بیانِ مراد درحقیقت حدیث رسول سے نکلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال سے قرآن کے معنی متعین ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلے کیلئے بھیجا کہ ان سے جا کر مناظرہ کریں تو ایک وصیت کی، فرمایا: کہ خوارج کے سامنے قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا، سنت سے دلیل پیش کرنا (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال واعمال اور احوال سے)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو تعجب ہوا عرض کیا امیر المؤمنین! قرآن تو وہ ہے جس کے بارے میں اللہ کے رسول نے مجھے دعا دی ہے، فرمایا: اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ③

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباسؓ ج: ۱۲ ص: ۱۰۰۔

اے اللہ! ابن عباسؓ کو کتاب اللہ کی تعلیم دے اور اس کی حکمت ان کے قلب میں ڈال دے، تو میں تو حکمتِ قرآن کا حامل ہوں اور اسی سے آپ روک رہے ہیں کہ اس سے استدلال نہ کروں، اس کی کیا مصلحت ہے؟ فرمایا قرآن کے جملے ذی وجوہ ہیں، اصولی جملے ہیں، آپ اپنے طور سے آیت کے ایک معنیٰ بیان کریں گے، فریق مخالف اسی آیت کا دوسرا معنیٰ بیان کردے گا۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق واضح نہیں ہوگا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول اور فعل سے جب آپ دلیل پکڑیں گے اس میں بولنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

قرآن کے معانی میں خود رائی ...... تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کر کے دکھلایا اور جو ارشاد فرمایا وہ بیانِ قرآن ہے اور بیانِ قرآن ہی حدیث ہے۔ انکار حدیث کر کے کبھی بھی آدمی قرآن کی مراد نہیں سمجھ سکتا۔ منکرینِ حدیث اسی لئے حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن سے اپنی من مانی مرادیں نکالتے رہیں، حدیث بریک لگاتی ہے کہ یہ مراد نہیں ہوسکتی یہ مراد ہے۔ وہ آزادی چاہتے ہیں...... جو چاہیں مطلب لے لیں، جو چاہیں مراد لے لیں۔ حدیث ان کا راستہ روکتی ہے اس لئے وہ انکار کر گزرتے ہیں۔ ان کا انکار حدیث خود غرضی پر مبنی ہے...... جب تک حدیث موجود ہے قرآن میں اپنی من مانی کاروائیاں نہیں کر سکتے۔ حدیث کا انکار کر کے جو چاہے کرلیں پھر وہ دین نہیں رہے گا...... وہ تو آراء کا مجموعہ ہو جائے گا، وہ قیاسات اور آراء ہوں گی اور رائے قرآن میں معتبر نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَاْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ ① جو قرآن میں رائے زنی کر کے معانی نکالے اُسے جہنم میں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ سے ہم اپنے اپنے مطالب نکالیں، میں کہتا ہوں ان کو تو اپنے ایجاد کردہ مطالب نکالنے کا کیا حق ہوگا! خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہ نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کبھی نہیں کیا کہ جب قرآن کی کوئی آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ بھائی! اس کے ایک معنیٰ تو یہ ہوسکتے ہیں، ایک یہ بھی اور ایک یہ بھی اور زمانے کے مناسب یہ معنی ہیں، لہٰذا یہ معنیٰ لے لو۔ ایسا نہیں کیا، الفاظ آگئے تو اس کے بعد آپ منتظر رہتے کہ اللہ اس کی مراد بیان فرمادیں وہ امت کے سامنے بیان کردوں۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کسی آیت کا معنیٰ پوچھا تو فرمایا: حق تعالیٰ نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھایا جب وحی آگئی بیان ہوگیا تب فرمایا اللہ نے یہ فرمایا ہے اور اس کی یہ مراد ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کو رائے زنی کا حق نہیں تو زید، عمرو اور بکر کو قرآن میں رائے زنی کا کیا حق ہوگا! اور وہ کیا رائے دیں گے اور اس کا اعتبار اور وقار کیا ہوگا! وہ تو دیوار پر ماردینے کے قابل ہوگی۔ تو اصل چیز قرآن کے الفاظ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے معانی اور مرادات ہیں۔ ان مرادات کو سمجھانے کیلئے انبیاءؑ آئے، اسی کا نام تعلیم ہے۔ تو دو چیزیں ہوئیں: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِہٖ﴾ اور ﴿وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم میں الفاظ بھی بیان کردیئے اور ان کی مرادات بھی

① السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب من قال فی القرآن... ص: ۱۹۴۸۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

بیان فرمادیں۔ تو تلاوت بھی ہوگئی اور تعلیم بھی ہوگئی یہاں تک کہ لوگ سمجھ گئے کہ مراد یہ ہے۔

تعلیمِ حکمت ...... یہ ٹھیک ہے کہ مراداتِ خداوندی سمجھ گئے، مگر انسان کے ساتھ نفس بھی لگا ہوا ہے اور عقلی احتمالات بھی لگے ہوئے ہیں، کل کو یہ احتمال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یہ معنیٰ بھی اس آیت کے اندر داخل ہوں اگر چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ معنی بیان کئے ہیں مگر آیت کے عموم میں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں تو یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے، تو ممکن تھا کہ احتمالات میں الجھ کر اصل مرادات بھی کھو دیں۔ اس لئے ایک تیسری چیز اور فرمائی کہ پیغمبر تلاوتِ آیات، تعلیمِ مرادات کے بعد حکمت کی بھی تعلیم دیں (اور حکمت کی دو قسمیں ہیں) حکمتِ نظری تو یہ ہے کہ مراد سمجھا دو اور حکمت عملی یہ ہے کہ عمل کا نمونہ کر کے دکھلایا جائے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط حکم ہی نہیں دیا مراد بھی سمجھائی اور عمل بھی کر کے دکھلایا کہ عمل کا نمونہ یہ ہوتا ہے۔ جب نمونہ سامنے آیا تو سارے احتمالات ختم ہو گئے تو یہ بات متعین ہوگئی کہ یہی معنیٰ ہیں اور یہی مراد ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کر کے دکھلایا ہے۔

اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط یہ نہیں فرمایا کہ " صلوا کیف ما اتفق "لوگو! نماز پڑھ لیا کرو جس طرح تمہارا جی چاہے۔ بلکہ فرمایا: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ "اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو۔ ① حج کا حکم دیا تو خود حج کر کے دکھلایا کہ یوں حج کرو اسی طرح سے تمام چیزیں ہیں۔ دوستوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو...... اس کے نمونے دکھلائے، دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہو...... اس کے عملاً نمونے دکھلائے، شادی میں کیا کرو...... اس کے عملی نمونے دکھلائے، غمی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آئی اس کا بھی نمونہ پیش فرمایا، گھریلو زندگی کا نمونہ پیش فرمایا، اجتماعی زندگی کا نمونہ پیش فرمایا...... تو کوئی عملی اُسوہ ایسا نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش نہ کر دیا ہو۔

تو قرآن پاک علوم کا جامع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اعمال کی جامع ہے۔ جو قرآن کہتا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کر کے دکھلاتے ہیں وہی قرآن کہتا ہے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن اتارے ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن جو ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ وہ قرآن علم کا مجموعہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات عمل کا، اخلاق کا اور کمالات کا مجموعہ ہے۔

اس لئے اگر فقط قرآن سامنے ہوتا تو دس احتمالات نکلتے لیکن جب عمل کا نمونہ سامنے آ گیا اور سندِ صحیح کے ساتھ ہم تک پہنچ گیا اب کسی کو دوسرا احتمال پیدا کرنے کی مجال نہ رہی۔ آیت کا مفہوم علمی اور عملی طور پر متعین ہوگیا۔ تین باتیں ہوئیں آیات کی تلاوت یہ تو قانون کے الفاظ محفوظ کر دیئے کیونکہ الفاظ پر ہی معانی کا مدار ہوتا ہے، قانون ساز مجلسیں دنیا میں بیٹھتی ہیں تو ایک ایک لفظ پر ایک ایک ہفتہ لڑائی ہوتی ہے کہ یہ لفظ رکھا جائے تا کہ یہ مفہوم ادا ہو کیونکہ

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة. ج:٣ ص:٧ رقم:٥٩٥.

ذرا لفظ بدل گیا تو مفہوم بدل جائے گا تو ایک ایک لفظ پر قانون ساز مجلسیں بحثیں کرتی ہیں، ہفتہ ہفتہ لگ جاتا ہے ، برسہا برس میں قانون کی کتاب تیار ہوتی ہے، بہت سے دماغ آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں جو چیز نکھر کر سامنے آتی ہے پھر وہ لفظوں میں بند کی جاتی ہے تاکہ ان لفظوں کے اندر وہی معنی آئیں جو مراد ہیں۔ قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے وہ ہماری کسی مجلس کا بنایا ہوا تو ہے نہیں کہ ریزولیشن پاس کر لیا کہ اس کو آیت سمجھ لیا کرو کہ یہ آیت ہے، وہ بندوں کی تجاویز نہیں ہیں، وہ اللہ کا کلام ہے تو لفظ بھی اترے اور وہی لفظ اترے جن میں اللہ کی مرادات چھپی ہوئی ہیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظ بھی تلاوت کئے اور دوسری چیز معانی الگ سمجھائے، عمل کر کے بھی دکھلایا لیکن ایک بات اور باقی تھی کہ آیت کے لفظ بھی آ گئے معانی بھی آ گئے، مراد بھی سامنے آ گئی لیکن اگر دل میں کجی اور ٹیڑھا پن باقی ہے تو ہر چیز آدمی غلط سمجھے گا۔ جب دل میں زیغ اور الٹا پن ہے تو کتنا ہی صحیح معنی بیان کرو اُوندھا ہی سمجھے گا، اس لئے کہ اس کی سمجھ ہی اُوندھی ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن میں نصرانی زیغ لیکر اُترے تو ہر لفظ سے نصرانیت کا طریق معلوم ہوگا کہ سارے قرآن میں نصرانیت ہی بھری ہوئی ہے، ہر لفظ سے وہی نکلتی ہوئی نظر آئیگی اگر یہودی ذہنیت لیکر آئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر آیت میں سے یہودیت نکل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس کے عموم سے وہ وہی فائدہ اٹھائے گا جو اس کے دل کے اندر ہے اور دل ٹیڑھا ہے تو تیسری چیز ہے تربیت۔

تزکیۂ قلوب اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ تربیت...... اس لئے ضرورت تھی کہ جہاں الفاظ پیش کئے جائیں معانی پیش کئے جائیں عمل کا نمونہ دکھایا جائے، وہاں دلوں کو بھی مانجھا جائے تاکہ ٹیڑھ بالکل نکل جائے اور قلب کے اندر استقامت پیدا ہو۔ اس کیلئے مجاہدے کی، ریاضت کی، کثرتِ ذکر کی اور کثرتِ نوافل کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ قلب کا تعلق اللہ سے صحیح قائم ہو اور جو چیز اُتر کر آئے وہ صحیح طور پر آدمی کے دل میں آئے، دل اُلٹا نہ ہو کہ اوندھی چیز سمجھ میں آئے...... اسی کو ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ① میں بیان فرمایا گیا کہ نفوس کا تزکیہ کرو اور نفوس کو مانجھو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نفوس کو مانجھا بھی اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا تزکیہ کیا۔ مکہ کی زندگی درحقیقت تزکیہ کی زندگی تھی مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تیرہ برس گزرے ہیں۔ اس میں یہ حکم تھا کہ اگر تم پر کوئی سختی بھی کرے تو جواب مت دو، کوئی مارے تو چپ رہو، کوئی گالیاں دے تو جواب مت دو، بس اتنا کام ہے کہ کلمۂ حق کہتے رہو...... باقی مقابلہ، مناظرہ اور مجادلہ مت کرو۔ قرآن میں فرمایا گیا: ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾ ② درگذر کرو، مقابلہ مت کرو دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ③ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوتوال بنا کے نہیں بھیجا گیا داعی اور مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے اگر حق کے راستہ میں سختی آئے تو اُسے آپ جھیلیں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ④ آپ صبر کریں جس طرح اولوالعزم انبیاء نے

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۱۴ سورۃ الحجر، الآیۃ: ۸۵۔

③ پارہ: ۳۰ سورۃ الغاشیۃ: الآیۃ: ۲۲۔ ④ پارہ: ۲۶ سورۃ الاحقاف، الآیۃ: ۳۵۔

صبر کیا ہے۔ مار کا جواب مار سے، لاٹھی کا جواب لاٹھی سے اور گالی کا جواب گالی سے نہ دیں، صبر وتحمل اختیار کریں۔

تو پہلا مجاہدہ تو یہی تھا کہ اڑی کڑی جھیلو! سختیاں سہو! اور اُف تک نہ کرو۔ اولاً اس سے قلوب منجھے، پھر انہی حضرات کو ریاضتیں کرائیں، رات کو نوافل میں مصروف، دن کو تسبیح وتہلیل میں مصروف اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس کی نگرانی فرماتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی رات کی زندگی کیسی ہے! دن کی زندگی کیسی ہے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں کو گھومتے تھے کہ کسی گھر کے اندر سے کوئی بُری آواز تو نہیں آرہی! ان کی گھریلو زندگی صحیح ہے یا غلط ہے!۔

حضور کا شیخین کو اعتدال کا حکم...... حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو ترقُّب کے طور پر (گویا نگرانی کے طور پر) اُٹھے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر سے گزر ہُوا تو وہ قرآن کریم اتنا آہستہ پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کے سننا بھی مشکل تھا گویا بہت ہی آہستہ آہستہ۔ آگے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکان آیا تو وہ اتنے زور سے پڑھ رہے تھے کہ سارا محلّہ گونج رہا تھا گویا بہت زور سے۔ صبح کو دونوں دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ فرمایا: اے ابوبکر! تم اتنا آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! "لَا اَدْعُوْ اَصَمَّ وَلَا غَائِبَ" میں اُسے پکار رہا تھا جو غائب بھی نہیں ہے اور بہرہ بھی نہیں ہے۔ میں تو پروردگار کو سُنا رہا تھا جو ہر وقت حاضر وناظر ہے مجھے چلّانے کی کیا ضرورت ہے! ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ ① میں آہستہ ہی تو پڑھ رہا تھا اور اللہ تو دل کی کھٹک کو بھی سنتا ہے، مجھے چلانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم اتنا چلّا کے کیوں پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے اپنی شان کے مطابق جواب دیا کہ: اُطْرِدُ الشَّيْطَانَ وَاُوْقِظُ الْوَسْنَانَ سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ چونکہ وہ أَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ ہیں تو وہی شدت ان کے عمل میں بھی ہے۔ یہ اَرْحَمُ اُمَّتِيْ بِاُمَّتِيْ اَبُوْ بَكْرٍ ہیں ان کے ہاں رحمت، دھیما پن اور نرمی چھپی ہوتی ہے تو انہوں نے اپنی شان کا جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تم ذرا آواز کو کچھ بلند کردو اور اے عمر! تم ذرا پست کرو تا کہ اعتدال قائم ہو جائے، افراط تفریط سے عمل بچ جائے۔ ② یہ جائز ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا زور سے پڑھنا بھی جائز ہے اور آہستہ بھی۔ یہ دلوں کی کَلیں درست کرنے کا مسئلہ تھا کہ دل کی رفتار اعتدال پر آجائے نہ افراط ہو نہ تفریط، نہ زیادتی ہو نہ کمی۔ اس لئے کہ اسلام کا اصول ہی یہ ہے کہ اخلاق میں اعتدال، اعمال میں اعتدال، عقائد میں اعتدال...... الغرض ہر چیز میں اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے۔

ہر عمل میں اعتدال...... اعمال کے بارے میں فرمایا: لَاتُشَدِّدُوْا فَيُشَدِّدَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ③ اعمال میں شدت مت اختیار کرو کہ اللہ بھی تم پر شدت کرنے لگے۔ اور پھر کسی شدت کا مطالبہ ہو اور نباہ نہ سکو اور گناہگار بنو تو تشدد

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۵۵۔ ② مسند احمد، ومن مسند علی ابن ابی طالب ج: ۲ ص: ۳۲۹، رقم: ۸۲۳.

③ السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد، ج: ۱۳ ص: ۵۷۷ رقم: ۴۲۵۸، ولفظه: فیشدد علیکم.

مت کرو، اطمینان اور درمیانہ چال کے ساتھ عمل کرو۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا مسجد میں عبادت کیا کرتی تھیں تو ایک رسی چھت میں لٹکا دی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے فرمایا یہ کیسی ہے؟ عرض کیا گیا: اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا عبادت کرتی ہیں جب نیند آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا پکڑ لیتی ہیں تا کہ نیند میں جھونکے نہ کھائیں۔ اور عبادت میں مصروف رہیں فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب نیند آئے پڑ کے سو رہو: لَاتَفْرِيْطَ فِي النَّوْمِ نیند میں کمی مت کرو جتنی عادتِ طبعی ہے اسے پورا کرو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال میں اعتدال رکھو اتنا دوڑ کے مت چلو کہ آگے جا کر ٹھوکر لگے اور گر جاؤ اور پھر چلنے کے قابل نہ رہو۔ دوسری جگہ فرمایا: ''سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَيْئٌ مِّنَ الدُّلْجَةِ'' ① نرمی سے چلتے رہو۔ درمیانی چال چلتے رہو کچھ دن میں اللہ کی عبادت کرو، کچھ رات میں اللہ کا نام لے لیا کرو مگر اتنا جس کو نباہ سکو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصول بیان فرمایا: ''خَيْرُ الْاَعْمَالِ مَادِيْمَ عَلَيْهِ وَاِنْ قَلَّ'' ② بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی ہو چاہے وہ تھوڑا ہو۔ بہت سا عمل کیا اور تھک کر مہینہ بھر بیٹھ گیا تو وہ غلط ہے اور تھوڑا کیا اور اتنا سست کیا کہ اصل مقصد بھی ادا نہ ہوا...... دونوں چیزیں افراط ہیں یا تفریط ہیں۔ اسی لئے حکم ہے درمیانی چال چلو۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر نیند آئی ہے تو اسکی کیا ضرورت ہے کہ رسی تھام کر عبادت کرو، رہبانیت اختیار کرو بلکہ اعتدال کے ساتھ چلو، نیند آئے تو پڑ کے سو رہو، جب آنکھ کھلے پھر اللہ کا ذکر کرو، یادِ خداوندی کرو۔ تو بہر حال اسلام میں اعتدال ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگرانی فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ ذرا آواز پست کرلو، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ذرا اونچی کرو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے۔ یہ جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا جو شرع کا موضوع ہے یہ دل کی کلیں درست کرنے کی بات تھی۔

دردِ دل کا علاج...... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دل کی تربیت اور تزکیہ بھی فرماتے تھے۔ دلوں میں کھٹک پیدا ہوتی تو فوراً علاج فرماتے تھے، اس کا جائز و ناجائز سے تعلق نہیں تھا، قلب کی کیفیات سے تعلق تھا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ہم میں ایمان باقی نہیں ہے اور جب ایمان نہیں تو عمل معتبر نہیں تو ایمان اور عمل دونوں کا خانہ درہم برہم ہو گیا ہے تو عمل مقبول نہیں ہوگا (اس لئے عمل کرنے کا کیا فائدہ! گویا عمل میں تعطّل پیدا ہوا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کیا ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ایمان باقی نہیں رہ سکتا؟ فرمایا: کیا وسوسہ ہے؟ عرض کیا دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ؟ زمین کس نے بنائی؟ جواب ملتا ہے: اللہ نے بنائی۔ سوال ہوتا ہے کہ آسمان کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے: اللہ نے بنایا۔ چاند اور سورج کس نے بنائے؟ کہ اللہ نے بنائے۔ ان سارے جوابات سے دل میں ایک

① الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب القصد والمدومة على العمل، ص: ٥٣٣ رقم: ٦٤٦٣.

② الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ص: ٥٤٣ رقم: ٦٤٦٢.

اصول پیدا ہوتا ہے کہ ہر موجود کیلئے مُوجد کی ضرورت ہے، ہر بنی ہوئی چیز کیلئے کوئی بنانے والا ہونا چاہیے۔ بغیر بنانے والے کے شئی نہیں بنے گی تو ہمارے دل میں یہ خطرہ آتا ہے کہ اللہ بھی تو موجود ہے پھر اس کو کس نے بنایا؟ (نعوذ باللہ منہ) اور جب یہ دل میں وسوسہ آ گیا تو کہاں ایمان باقی رہا!۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علاج فرمایا اور ایک منٹ میں علاج ہو گیا فرمایا کہ: یہ جو وسوسہ آتا ہے اسے اچھا سمجھتے ہو یا بُرا؟ عرض کیا کہ اتنا برا جانتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے، یہ وسوسہ گوارا نہیں ہے۔ فرمایا: ذَاکَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ یہی تو کھلا ایمان ہے۔ ① وہ ایمان ہی تو بتلا رہا ہے کہ یہ وسوسہ بُرا ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو دل وسوسوں کو قبول کرتے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ایمان نہیں رہا...... حالآنکہ ایمان تھا تو اس وسوسہ کو بُرا جانا، ایمان نہ ہوتا تو کبھی بھی بُرا نہ جانتے۔ یہی ایمان کی علامت ہے جیسے کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ ② نیکی کر کے دل میں خوشی ہو اور بدی کر کے طبیعت میں انقباض پیدا ہو تو تم مؤمن ہو۔ اگر نیکی کر کے خوشی نہ ہو اور بدی کر کے کدورت نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان نہیں ہے، عادت پڑی ہوئی ایک رسم ہے، وہ عملِ صالح نہیں ہے۔ تو اصل چیز یہی ہے کہ قلب درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جائے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا: وَفِی الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ ③ انسان کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا (گاجر اور صنوبری شکل کا) ہے اگر وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے اور وہ دل ہے اور وہ غلط ہے تو نیت بھی غلط، عمل بھی غلط، ارادہ بھی غلط، جذبات بھی غلط...... ہر چیز اول سے لے کر آخر تک غلط ہوتی چلی جائے گی۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا موضوع دل اور فلاسفہ کا موضوع دماغ تھا...... اس واسطے انبیاء علیہم السلام نے قلبِ انسانی کو اپنا موضوع ٹھہرایا ہے کہ قلب کو درست کر لو تاکہ سارا انسان درست ہو جائے جیسا کہ فلسفیوں نے اپنا موضوع دماغ ٹھہرایا ہے کہ عقل درست کر دو تو دنیا کی زندگی بن جائے گی۔ آدمی چاہے برباد ہو جائے وہ عقل سے کام لیتے ہوئے محض اسی کو درست کرتے ہیں تو عقل سے آدمی کچھ آرائش اور کچھ زینت کر لے گا لیکن عقل سے قلوب سنور جائیں یہ ممکن نہیں قلوب تو ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے سنبھلیں گے، قلوب کو سنوارنا عقل کا کام نہیں ہے۔

فلسفیوں نے عقل کو موضوع ٹھہرایا اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دل کو موضوع ٹھہرایا۔ وہ دل درست کرتے ہیں تاکہ سارا انسان درست ہو جائے اور فلاسفہ دماغ درست کرتے ہیں۔ اس سے دماغ درست ہو جاتا ہے قلب

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الوسوسة فی الایمان، ص: ۳۵۲۵.

② مسند احمد، حدیث ابی امامة الباهلیؓ ج:۴۵ ص: ۱۳۰ رقم: ۲۱۱۴۵.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه، ص: ۲، رقم: ۵۲.

چاہے برباد ہو، قلب کے اخلاق چاہے تباہ ہو جائیں، اعمال برباد ہو جائیں، اس سے انہیں غرض نہیں بس عقل کی سوچی ہوئی زینتیں اور آرائشیں باقی رہ جائیں، لیکن ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا نہ دنیا بنتی ہے نہ آخرت بنتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے ہر اگلے نے پچھلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی ہے اور کہا کہ میرے اوپر اس وقت تک ایمان نہیں بنے گا جب تک موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے، حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لاؤ گے بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر تمام انبیاء پر جب تک ایمان نہ ہو..... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں تو مجھ پر بھی ایمان نہیں۔ چنانچہ اعلان فرمایا کہ: ﴿قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ② کہہ دو اور علی الاعلان پکار کر کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اللہ نے جو ہم پر نازل کیا اس پر اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل کیا گیا اس پر اور جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لائے۔ تو سارے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا اور فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ③ ہم ان میں تفریق نہیں کرتے یکساں طور پر سب کو اللہ کا حقانی فرستادہ جانتے ہیں۔ تو ہر نبی نے اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق لازمی قرار دی اور پھر ہر آنے والے نے اپنے بعد آنے والے کی پیشین گوئی کی کہ اس کی بات ماننا ورنہ مجھے بھی نہیں مانا۔ تو یہ ایک عجیب سلسلہ ہے کہ اگلے پچھلوں کی تصدیق کر رہے ہیں اور پچھلے اگلوں کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اور اس کے بالکل برعکس فلاسفہ میں سے جو اگلا آتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا نظریہ درست ہے پچھلے سارے احمق تھے، انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ ایک نے کہا کہ زمین حرکت کرتی ہے، سورج حرکت نہیں کرتا، پچھلے لوگوں نے کہا تھا کہ زمین ساکن ہے، وہ غلط کہتے تھے وہ احمق تھے، تو انکی تحمیق کی اور اپنا نظریہ ثابت کیا۔ کسی نے کہا کہ عالم قدیم ہے اور جس نے کہا کہ حادث ہے وہ احمق تھا۔ کسی نے کہا کہ حادث ہے اور قدیم کہنے والا احمق تھا۔ تو ہر ایک دوسرے کی تحمیق اور تجہیل کرتا ہے اس کے معنیٰ ہیں کہ سارے احمق ہیں اور سارے جاہل ہوں گے۔

جب ہر ایک دوسرے کو احمق بتلا رہا ہے تو دانش مند کون باقی رہا؟ اُس کے نزدیک یہ احمق، اِس کے نزدیک وہ احمق۔ تو فلسفہ کیا ہوا یہ تو حماقتوں کا مجموعہ ہو گیا گویا ہر ایک دوسرے کو جھٹلا رہا ہے تو ایک مسلمان کا مدار تصدیق پر ہے تکذیب پر نہیں ہے اور تصدیق ہی ایمان کا نام ہے گویا ایمان ماننے کا نام ہے، نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، نہ ماننے کو تو کفر کہتے ہیں اور ماننے کا تعلق قلب سے ہے، اسی واسطے حضرات انبیاء علیہم السلام نے قلوب کا سلسلہ اختیار کیا کہ قلب کو درست کیا جائے۔

اُمت کے فرائض...... بہر حال عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر چار فریضے عائد کئے گئے: تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب، تعلیم اسوہ اور تزکیہ نفوس۔ یہ پوری اُمت بحیثیت مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۶۔ ② ایضاً

ہے۔ یہی چاروں فریضے ان پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ اس کا فریضہ ہے کہ پہلے تلاوتِ آیات کرے، قرآن کی آیات کے الفاظ پڑھ کر سنائے، ایسے مدارس ہوں جن میں قرآن کے الفاظ سکھلائے جائیں، خواہ ناظرہ پڑھائیں یا حفظ پڑھائیں مگر قرآن کے الفاظ محفوظ رہیں کیونکہ انہی الفاظ میں معانی ہیں۔

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ امت میں معلمین بھی ہوں تاکہ وہ تعلیم دیں۔ اس واسطے کہ دین کے بارے میں رائے معتبر نہیں۔ قرآن ہو یا حدیث...... وہ نقل کی جائے گی اور سلف کے دائرے میں محدود رہ کر قرآن کے معنی متعین کئے جائیں گے۔ اگر سلف کا دامن چھوٹ گیا اور رائے زنی آ گئی تو ہوائے نفس پیدا ہوگی۔ نفس میں آزادی پیدا ہوگی تو آدمی دین کا متبع نہیں رہے گا نفس کا متبع بن جائے گا۔ اس واسطے ہوائے نفس سے روکنے کیلئے اس کی ضرورت ہے کہ تعلیم مراد بیان کی جائے کہ اللہ کی یہ مراد ہے اور یہ بغیر تعلیم کے نہیں حاصل ہو سکتی۔ معلم کہتے ہی اس کو ہیں جو مرادات اور مطالبِ خداوندی کو بیان کر دے۔

اسی کے ساتھ اس کی بھی ضرورت ہے کہ عمل کا نمونہ بھی کر کے بتلائے۔ ہم آج جو نماز پڑھتے ہیں محض اس لئے صحیح نماز پڑھتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو دیکھتے ہیں اگر پڑھنے والوں کا نمونہ سامنے نہ ہوتا کبھی نماز صحیح نہ پڑھتے فقہ کی آپ ساری کتابیں دیکھ لیں رکوع سجدے کے معنیٰ معلوم کر لیں اس وقت تک نماز پڑھنی نہیں آئے گی جب تک نمازیوں کی ہیئت سامنے نہیں ہوگی، اس ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز ہے۔ اگر آپ محض کاغذوں سے نماز اخذ کریں گے تو دس ہزار قسم کی نماز ہو جائے گی کیونکہ عقلیں مختلف ہیں، اپنی اپنی عقل سے جو جس کی سمجھ میں آ گیا اسی پر عمل کرے گا۔ تو نماز کے ہزاروں ڈھنگ بن جائیں گے۔ ایک دین کے لاکھوں دین بن جائیں گے۔ اس لئے ان بیانات کا پابند ہونا پڑے گا جن سے اسوہ اور عمل نبوی متعین ہو، اسی کی پیروی کرنا پڑے گی۔ اسی طرح مرادات میں پیروی کرنی پڑے گی۔ رائے کا دخل نہیں ہوگا۔ اگر قرآن کے محض الفاظ کو سامنے رکھ لیں اور کوئی معلم و مربی نہ ہو تو ضروری نہیں کہ ہم مرادِ ربانی سمجھ جائیں بلکہ آپ کے نفس میں جو کیفیت غالب ہوگی وہی معنیٰ آپ سمجھیں گے تو لازمی ہے کہ آپ متعین طریق پر وہی سمجھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو سمجھایا ہے...... وہ وہ ہے جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو سلف اور آئمہ کو سمجھایا...... آپ بھی وہی سمجھیں گے تو ٹھیک، ورنہ اس کے بغیر آپ مراداتِ ربانی تک نہیں پہنچ سکتے۔

کتاب اور شخصیت دونوں ضروری ہیں...... تو کتاب کی بھی ضرورت ہے، لیکن نہ محض کتاب کافی ہے نہ محض شخصیت کافی۔ اگر شخصیت تنہا ہو اور کتاب اللہ سامنے نہ ہو تو شخصیتوں پر ذاتی احوال بھی تو گزرتے ہیں، ان ذاتی احوال میں کچھ ان سے دائرۂ قانون سے باہر افعال بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے سارے افعال کو ہم شریعت تسلیم کر لیں تو شریعت اور غیر شریعت مخلوط ہو کر رہ جائے گی، اصلی دین باقی نہیں رہے گا۔ اسی طرح غلط اقوال اور احوال ہیں مثلاً ایک شخص صاحبِ حال ہے، اس حال میں اس نے ایک وجد یہ کلمہ کہا اپنے نزدیک وہ سچا

ہے، حال بھی درست ہے مگر وہ قانون نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو تلقین کریں۔ قانون وہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے۔

اگر منصور رحمۃ اللہ علیہ نے اَنَا الْحَقُّ کہا تو یہ کوئی قانون نہیں کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہا جائے کہ لوگو! تم بھی "اَنَا الْحَقُّ" کہا کرو حالانکہ ہم یہ کہیں گے کہ منصور کا دعویٰ حق ہے کیونکہ وہ فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچے ہوئے تھے اور فنا کے مقام پر پہنچ کر اپنا نفس اوجھل ہوتا ہے اپنے نفس میں بھی نگاہ کرتے ہیں تو جلوۂ خداوندی ہی نظر آتا ہے ایسے میں کوئی اَنَا الْحَقُّ کہے تو اس کے سامنے اس کا نفس ہی نہیں۔ اَنَا تو وہاں ہے ہی نہیں وہاں تو انت ہی انت ہے آپ ہی ہیں جہاں کہیں ہیں۔

ہر چہ دیدم در جہاں غیرِ تو نیست — یا توئی ، یا خوئے تو یا بوئے تو

میں دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہوں تیرے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی یا تیری ذات ہے یا "خوئے تو" تیری صفات ہیں یا بوئے تو تیرے افعال ہیں، ان سے دنیا آباد ہے۔ تو اس مقام پر جو پہنچ جائے اس کا نفس بھی ختم ہو جاتا ہے دنیا بھی ختم ہو جاتی ہے اور جلوہ حق ہی بس سامنے رہ جائے گا۔ وہ باہر دیکھے گا تو کہے گا: اَنْتَ الْحَقُّ اپنے اندر دیکھے گا تو اَنَا الْحَقُّ کہے گا تو وہاں (منصور کے ہاں) "اَنَا" اپنے لئے نہیں ہے، نہ "اَنْتَ" دوسروں کیلئے ہے۔ وہ تو حق کا اظہار کرتا ہے تو منصور کی زندگی کو ہم بھی سچی سمجھتے ہیں، لیکن وہ قانون نہیں ہے کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر آپ تلقین کریں۔ قانون تو صرف شریعت ہے جس کی تلقین کی جائے گی۔ تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے اور شریعت قانونِ عام کا نام ہے۔ ہر کس و ناکس کیلئے جو پیغام ہے وہ شریعت ہے۔ شخصی احوال میں جب آپ اس حال میں پہنچ جائیں گے تو ہم آپ کو سچا جانیں گے، آپ کی عظمت کریں گے اس حال کو بھی سچا جانیں گے مگر اسے قانون بنا کے پیش نہیں کریں گے، ہر شخص کا حال الگ الگ ہے، ایک کا حال دوسرے کیلئے حجت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال قانونِ عام شریعت ہے، اسٹیج پر اسی کو پیش کیا جائے گا۔ زید، عمرو، بکر اپنے حال کو پیش نہیں کر سکتے ...... صرف قولِ پیغمبر پیش ہوگا اور افعالِ پیغمبر پیش ہونگے، وہی شریعت ہیں، کسی اور کا قول و فعل شریعت نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی میرا حال ہے اور صحیح ہے تو اللہ کے ہاں مقبول ہوں، حال غلط ہے اللہ کے ہاں نامقبول۔ بہر حال وہ پھر بھی شخصی بات ہوتی ہے قانونی بات نہیں ہوتی۔ اس واسطے قانون کی ضرورت پڑی اور قانون کے ساتھ شخصیت کی بھی۔ تو محض شخصیت ہو تو شخصیتوں کا مذاق ہو جائے، خاندان پرستی اور شخصیت پرستی شروع ہو جائے گی اور شخصیت سے جو سرزد ہو جائے وہ شریعت بن جائے گا، شریعت غیر شریعت مخلوط ہو جائے گی۔ اس لئے شخصیتوں کے حال کیلئے "کتاب اللہ" کسوٹی ہے اس پر پرکھ لو، اگر اس کے مطابق ہے تو صحیح ہے مطابق نہیں ہے تو سکوت اختیار کرو۔

تو شخصیت اور کتاب دونوں کی ضرورت ہے پیغمبر کی بھی ضرورت ہے اور قانونِ الٰہی کی بھی ضرورت ہے۔ نہ

محض قانون کافی، نہ محض ذات کافی ہے۔ پیغمبر کی ذات تو معصوم ہے لیکن بعد میں جو ذوات آئیں گی وہ تو معصوم نہیں ہیں، غلط فہمی بھی لگی ہوتی ہے، غلط احوال بھی لگے ہوتے ہیں...... جب یہ ساری چیزیں شریعت بن جائیں گی تو شریعت اور غیر شریعت خلط ملط ہو جائے گی، دین کے اوپر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اس لئے شخصیتوں کو کتاب کے معیار پر پرکھیں گے اور کتاب کے معانی شخصیتوں سے سمجھیں گے اسی طرح سے دین چلے گا۔ اور صحیح ہدایت پر لوگ پہنچیں گے۔

کیا صحابہ کرام اور اولیاء اللہ معیارِ حق ہیں...... تو میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیکر قیامت تک ہدایت کے یہی دو طریقے مقرر کئے ہیں ایک قانون خداوندی اور ایک شخصیت جو کہ مقبول شخصیت ہو اور وہ انبیاء کی شخصیتیں ہیں جو کہ معصوم ہیں ۔ اولیائے کرام کی عظمت واجب ہے، گو وہ معصوم نہیں مگر خاص مقربین اور اولیاء اللہ محفوظ ضرور ہوتے ہیں، من جانب اللہ ان کی حفاظت کی جاتی ہے، ان کو من جانب اللہ برائی سے روکا جاتا ہے، اگر نفس لے بھی چلے تو اللہ تعالیٰ اس طرف انہیں جانے نہیں دیتے، حفاظت خداوندی شامل حال ہوتی ہے..... مگر اس کے باوجود امکان ہے کہ ان کا عمل غلط ہو جائے اور جب امکان آ گیا تو قطعیت نہ رہی اور دین قطعی حکم کا نام ہے، ظنی اور امکانی چیز کا نہیں۔ اس لئے انبیاءؑ کی حد تک تو بات صحیح ہے کہ ان کا جو قول و فعل ہے وہ شریعت ہے لیکن دوسرے لوگوں کے حق میں یہ بات نہیں ہے کہ ان کا ہر قول و فعل شریعت بنا دیا جائے۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریعت کا معیار تو نہیں ہیں کہ وہ شریعت بنا دیں، وہ شریعت بنائیں گے تو نہیں، البتہ شریعت کے متبع ہیں تو شریعت کے حق میں تو معیار نہیں کہ وہ شریعت بننے لگیں۔ لیکن فرقوں کے حق میں اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں معیار قرار دیا ہے، فرقوں کا حق و باطل صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ پرکھا جائے گا، حدیث میں فرمایا گیا: ''اِفْتَرَقَتْ بَنُوْ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی ثِنْتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ فِرْقَةً '' بنی اسرائیل بہتر فرقوں پر بٹ گئے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹے گی، کُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً سب کے سب عقائد کی وجہ سے اہل جہنم بنیں گے، صرف ایک ہی فرقہ حق پر رہے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: مَنْ هُمْ یَا رَسُوْلَ اللهِ ؟ وہ کون ہوں گے؟ فرمایا: مَاۤ اَنَا عَلَیْهِ الْیَوْمَ وَاَصْحَابِیْ ① جس طریقہ پر آج میں ہوں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم قائم ہیں وہی فرقوں کے حق و باطل پہچاننے کا معیار ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے ساتھ شامل کیا یعنی جس سے فرقوں کے حق میں معلوم ہو کہ کون سا فرقہ باطل ہے یا حق ہے؟ اس کیلئے نبی کریم کی ذات بھی معیار ہے اور آپ کی ذاتِ عالی کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم بھی معیار ہیں۔

① السنن للترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ ج: ۹ ص: ۲۳۵ رقم: ۲۵۶۵.

اس لئے پہلی چیز ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی فرقے کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت بھی ہے یا نہیں! اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے تو یقیناً وہ باطل ہے لہٰذا پہلی بات تو یہ ہوئی اس لئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''مَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ '' ① جو میرے ساتھ محبت کرے گا اس محبت کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت آئے گی جو میرے ساتھ بغض رکھے گا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی اُسے بغض پیدا ہوگا اور عام لفظوں میں فرمایا کہ ''حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِيْمَانِ وَبُغْضُ الْعَرَبِ مِنَ النِّفَاقِ '' ② نسبت کی وجہ سے عربوں کی محبت ایمان کی علامت ہے اور ان کا بغض نفاق کی علامت ہے۔ بہر حال فرقوں کے حق میں پہلی بات یہ دیکھیں گے کہ ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت بھی ہے یا نہیں! اگر نہیں ہے تو کہیں گے یہی باطل ہونے کی علامت ہے تو محبت لازمی ہے، اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے تو وہ فرقہ حق نہیں بن سکتا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہمارا تعلق محض تاریخی نہیں ہے کہ انہوں نے سنداً دین کی روایتیں ہم تک پہنچا دیں اور ہم نے قبول کر لیں۔ گویا وہ محض چٹھی رساں نہیں ہیں کہ انہوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے وہ پوری امانت اور دیانت سے پہنچا دیا اور اس سے زیادہ کوئی کام نہیں کیا، ایسا نہیں! یہ تو تاریخی واسطہ ہوا، صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہمارا تعلق عشقی اور محبتی ہے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم عاشق ہیں اور عاشق کا کام یہ ہے کہ اپنے محبوب کے اندر محو ہو، وہ محبوب کے اوپر تنقید نہیں کرے گا کہ یہ کام غلط کیا! یہ حسن و جمال غلط ہے! یہ چیز اس کی صحیح نہیں ہے!...... وہ عاشق ہی کیا ہوا جو ایسا ہو! صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عشقی تعلق ہے، محض تاریخی تعلق نہیں ہے۔

اس واسطے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرقوں کے حق و باطل کے پہچاننے میں معیار بنیں گے پھر دیکھا جائے گا کہ ان کے عقائد صحابہ رضی اللہ عنہم کے عقائد کی مانند ہیں کہ نہیں! مطابق ہیں تو حق پر ہیں، اگر نہیں ہیں تو باطل پر ہیں۔ اس حد تک صحابہ رضی اللہ عنہم معیار ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے شریعت تو نہیں بنتی کہ وہ بنا دیں کہ یہ شریعت ہے البتہ فرقوں کے حق میں صحابہ رضی اللہ عنہم کسوٹی ہیں۔ اس پر نقد اور تبصرہ کر کے ہم پہچان لیں گے کہ یہ حق ہے یا باطل ہے۔ تو جو صحابہ سے عداوت رکھے گا وہ بھی باطل، جو بغض رکھے گا وہ بھی باطل، جو گالم گلوچ کرے گا وہ بھی باطل ہے، تو ایسے تمام فرقے باطل پرست ہوں گے اور جو عشق و محبت کرے اور عظمت کرے...... وہی فرقہ حق پر ہوگا۔

صحابہ کا کمال تقویٰ...... اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ ③ تمام صحابہ

---

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی من سب اصحاب النبی ﷺ ج: ۱۴ ص: ۱۶.

② الحدیث اخرجه البیهقی فی الشعب ولفظه: حب العرب ایمان وبغضهم نفاق، ج: ۴ ص: ۱۴۲.

③ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، ج: ۱ ص: ۲۴۷.

رضی اللہ عنہم متقن اور عادل ہیں۔ قرآن کریم نے من حیث الطبقہ جس طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، کہیں فرمایا: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، کہیں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى﴾ ② اللہ نے پہلے ہی جانچ لیا تھا انکے دلوں کو کہ یہ تقویٰ شعار ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمال تقویٰ کی شہادت قرآن نے دی ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کسی صحابی سے کوئی غلطی ہو جائے ...... حتیٰ کہ عوام صحابہ رضی اللہ عنہم سے معصیت بھی ہو سکتی ہے مگر یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔ ایک متقی آدمی بھی گناہ کر سکتا ہے، وہ گناہ تقویٰ کے خلاف ہے جس کی جڑیں دل میں جمی ہوئی ہوں، دل میں تقویٰ جما ہوا ہو...... باہر سے یا گردوپیش کے حالات میں مبتلا ہو کر گناہ کر گزرے اور اندر سے دل میں نفرت کی اور توبہ کی، دل سے نادم ہوا تو یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقویٰ باطن کی شہادت قرآن نے دی ہے، اگر کوئی عملی غلطی ہو جائے تو ان کے تقویٰ میں ذرہ برابر فرق نہیں پائیں گے ،قرآن کریم میں خود فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ ③ وہ لوگ متقی ہیں اگر شیطان کا کوئی گروہ انہیں چھوجاتا ہے اور کسی گناہ پر مائل کرتا ہے تو فوراً متنبہ ہوتے ہیں کہ یہ شیطان کہاں آگیا، لاحول پڑھتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان چھو تو سکتا ہے اور اپنا اثر بھی ڈال سکتا ہے مگر پھر بھی کہا گیا کہ یہ لوگ متقی ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے تقویٰ باطن کی شہادت اللہ نے قرآن میں دی ہے، عمل میں کوئی غلطی ہو تو اس کا امکان ہے لیکن کوئی بُرا عمل بدنیتی سے کریں یہ نہیں ہے، تقویٰ موجود ہے لہٰذا خطاء اجتہادی ہوگی۔

صحابہ کی باہمی جنگیں باعثِ اجر و ثواب ہیں ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں جو جنگ ہوئی ہم کہتے ہیں خطاءِ اجتہادی تھی اور اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَيُصِيْبُ مجتہد خطاء بھی کر سکتا ہے صواب بھی کر سکتا ہے۔ خطاء کرے تو ایک اجر ملے گا اور صواب کرے گا تو دوہرا اجر ملے گا۔ تو معصیت پہ تھوڑا ہی اجر ملتا ہے، معلوم ہوا کہ خطاءِ اجتہادی معصیت نہیں ہے ورنہ اجر نہ دیا جاتا۔ تو مجتہد ہر صورت میں اجر کا مستحق ہے۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہ سے مسائل میں خطاءِ اجتہادی واقع ہوئی ہے۔ جنگیں بھی ہوئی ہیں، مناظرے بھی ہوئے، مباحثے بھی ہوئے...... مگر تقویٰ باطن دونوں جگہ قائم ہے۔ خطاءِ فکری اور خطاءِ اجتہادی ہوگی۔ اور خطاءِ اجتہادی پر بھی اجر ملتا ہے تو ان کی خطاء کو معصیت کہنا یہ ضال اور گمراہ ہونے کی علامت ہے۔

بہر حال بات دور چلی گئی میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ یہ امت بحیثیت مجموعی اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے۔ پیغمبر کے جو چار کام تھے وہی کام امت کو کرنا چاہئیں؛ تعلیم کتاب (بمعنی تلاوتِ آیات)، تزکیۂ نفوس، تعلیم

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ البینۃ، الآیۃ: ۸. ② پارہ ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۰۱.

عمل، تعلیم اسوہ۔ اور تلاوت آیات یہ ساری امت کا فرض ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کرے اور کرائے، ناظرہ ہو یا حفظ مگر الفاظِ قرآن سامنے رہیں۔ اور معانی ومضامین اس حد تک ضروری ہیں جس سے ہم دین سمجھ کر دیندار بن سکیں۔ سب کا عالم بننا ضروری نہیں ہے وہ فرض کفایہ ہے ہزار دو ہزار میں ایک بھی عالم بن جائے وہ کافی ہے۔ ہاں ساری امت عالم سے خالی ہو جائے ایک بھی عالم نہ ہو پھر سارے گنہگار ہوں گے تو سب کا عالم بننا ضروری نہیں مگر سب کا دیندار بننا ضروری ہے اور دیندار بننے کیلئے اتنی معلومات لازمی ہیں جس سے ہم روزمرہ کے عمل کو درست کر سکیں۔ ہم نماز کیسے پڑھیں! زکوٰۃ کس طرح ادا کریں! روزہ کس طرح رکھیں! حج کے کیا فرائض ہیں! کیا واجبات ہیں! کیا سنتیں ہیں...... اتنی معلومات لازمی ہیں، بچوں کیلئے بھی تعلیم کا اتنا اہتمام ضروری ہے، خواہ وہ مدرسہ کی صورت میں ہو یا سوسائٹی کی صورت میں ہو یا خود تلقین کی صورت میں ہو۔

تعلیم وتربیت کے درجات...... تو اعلیٰ ترین صورت تو تعلیم ہے کہ معلم اپنی صحبت اور معیت میں رکھ کر اُسے سمجھائے اور اس کو اپنے رنگ میں رنگے تا کہ وہ تقویٰ شعار بنیں، اعلیٰ طریق یہی ہے اور یہی طریق انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ صحابی کو صحابی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ صحبت یافتہ ہے اور اسی لئے استاذ شاگرد کی اصطلاح سلف صالحین میں یہی تھی؛ اصحابِ ابی حنیفہؒ، اصحابِ محمدؒ، اصحابِ شافعیؒ...... یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ صحبت یافتہ بھی ہیں انہوں نے محض کتاب نہیں پڑھی بلکہ معیت سے قلب کا رنگ قلب تک بھی پہنچا ہے۔

کتابِ الٰہی قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ ①

تو اعلیٰ طریق تعلیم وتدریس ہے، اس سے ادنیٰ درجہ لٹریچر ہے، بشرطیکہ اسکا سمجھانے والا بھی کوئی ہو، لٹریچر میں آزادمت ہو کہ جس کا جو جی چاہے سمجھ لے، اس کو بھی سمجھانا پڑے گا اگر وہ اردو یا انگریزی میں ہوگا آپ کے ہاں انگریزی میں نہیں ہے مگر اردو میں بہت سے ایسے رسالے چھپ گئے ہیں جن میں عقائد کے، اخلاق کے، ایمان کے ابواب کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس زبان میں تراجم ہیں ان کا مطالعہ ہو اور ان کی تفہیم بھی ہو۔ اس سے بھی نیچا درجہ گو وہ بھی ضروری ہے ماں باپ کی تلقین ہے۔ اس لئے کہ بچے کو جو ابتداً تلقین کریں گے وہ پتھر کی لکیر بنے گی، بڑھاپے تک اس عمل کی عادت باقی رہے گی، تو ماں باپ کی تلقین اصل ہے۔ ماں کی گود تو بچہ کیلئے پہلا مدرسہ ہے، اگر ماں ہی کی گود علم سے خالی ہے تو بچے تک کیا چیز پہنچے گی؟ باپ خود بھی مسائل سے خالی ہے تو بچے تک کیا علم پہنچے گا؟

نئی نسل کی تربیت کا راز...... اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ فکر آپ کی بجا ہے کہ ہماری نسلیں خراب نہ ہوں، ان میں ایمان باقی رہے...... یہاں (پاکستان میں) ہر جگہ میں نے یہ فکر دیکھا اور اس سے بڑی خوشی ہوئی، امریکہ میں جگہ جگہ شہروں میں جہاں جانا ہوا یہ فکر ہر ایک کے دل میں ہے کہ میری نسل کسی طرح دین پر باقی رہے، کوئی ایسی تدبیر ہو...... تو میں نے کہا یہ بہت بڑا انعام خداوندی ہے کہ دلوں کے اندر یہ فکر ہے اور اس فکر کا ہونا بڑی نعمت

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۸۔

ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ فقط اولاد کا فکر نہ ہونا چاہیے اپنی بھی تو فکر ہو جو حرکتیں تمہاری ہوں گی اس کی بچے نقل اتاریں گے۔ بچے میں بالطبع نقالی کی عادت ہے آپ نمازیں پڑھیں گے وہ بھی رکوع سجدے کرنے لگے گا، آپ بولیں گے وہ بھی اسی طرح بولنے کی مشق کرے گا، گالی والی دیں گے تو وہ آپ کو بھی گالی دینے لگے گا۔ دیہات میں ہم کبھی جاتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ بھئی بچہ کیسا ہے؟ تو دیہاتی کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے! اب گالی والی دینے لگا ہے!۔ تو ان کے ہاں دیہات میں گویا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ بچہ گالی دینے لگے۔ اس لئے کہ ماں باپ کو گالی دینے کی عادت ہے تو اولاد میں بھی وہی عادت آئے گی۔ تو یہ فکر بالکل صحیح ہے کہ اولاد درست رہے، مگر یہ فکر جب مکمل ہوگی کہ اپنی بھی تو فکر کریں، ہم بھی تو درست رہیں۔ ہماری درستی سے اولاد درست ہوگی، ہم خراب ہیں تو اولاد بھی خراب رہے گی: ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ''لوگ اپنے بادشاہوں کا طریق اپناتے ہیں تو گھر کے ملوک و بادشاہ تو یہی ماں باپ ہی ہیں، جو ان کی پرورش ہوگی وہ اولاد کی پرورش ہوگی : اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کے قاعدہ کے بموجب جتنی رعایا ہے وہ تو بادشاہ کے طریق پہ چلتی ہے حکومت میں جو چیز پسندیدہ ہے عوام بھی اسے پسند کریں گے، تو گھر کی حکومت ماں اور باپ کے ہاتھ میں ہے جو انہیں پسند ہوگا بچے بھی وہی پسند کریں گے۔ تو یہ فکر صحیح ہے کہ بچے دین پر قائم رہیں، اس کیلئے لازمی ہے کہ کچھ تلاوت ہو اور کچھ تعلیم مقاصد بھی ہو، کچھ عملی نمونے بھی ہوں اور کچھ دلوں کا مانجھنا بھی ہو، رات دن کی تلقین بھی ہو روک ٹوک بھی ہونی چاہیے تو تب کہیں کچھ بات بنتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ لَا تَرْفَعْ عَصَا اپنی اولاد سے کبھی لاٹھی مت اٹھاؤ، مطلب یہ کہ وہ تمہاری نگرانی میں رہیں چاہے وہ بڈھے بھی ہو جائیں تب بھی تلقین جاری رکھو۔ ﴿وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ①

اس واسطے میں نے یہ چند جملے عرض کیے۔ آیت جو میں نے پڑھی تھی اس آیت میں بہت سے علوم اور مضامین ہیں مگر نہ تو میں سارے مضامین ایک مجلس میں بیان کرسکتا ہوں اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ سارے مضامین مجھے معلوم بھی ہوں یہ بڑے علماء کا کام ہے، مگر جتنے مضامین ہیں میں وہ بھی نہیں ادا کرسکتا۔ اس لئے میں نے اجمالی طور پر آیت کی ایک سرسری تفسیر کردی اور راستہ بتادیا کہ اس راستہ پر آپ کو چلنا ہوگا۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطاء فرماوے، حق تعالیٰ ہمارے دین اور دنیا دونوں کو درست فرمائے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستہ پر قائم رکھے۔

''وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵.

معجزۂ علمی

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

تمہید...... بزرگانِ محترم! اس جلسہ کا موضوع جیسا کہ ابھی آپ کے سامنے عملاً بھی ظاہر ہوگیا یہ ہے کہ دارالعلوم اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلباءِ کرام کو سندری جائے اور انعام تقسیم کیا جائے تا کہ دارالعلوم کی کارگزاری سامنے آجائے اور اس دارالعلوم کے معاون جو تعاون کر رہے ہیں اس تعاون کا نیک ثمرہ آپ کے سامنے آجائے۔ ذوسرے لفظوں میں جلسہ کا موضوع قرآن کریم نکلتا ہے کہ قرآن عظیم کے سلسلہ میں اس کی برکات وثمرات سامنے بھی آئیں اور انہیں بیان بھی کیا جائے۔ اس لئے میں اس سلسلہ میں چند گزارشات قرآن کریم کے بارے میں اور اس کی نسبت سے دارالعلوم اسلامیہ کے بارے میں کرنا چاہتا ہوں، حق تعالیٰ مدد فرمائے! اس لئے کہ میں بہت زیادہ کمزور بھی ہوں، ضعیف بھی ہوں، کچھ علیل بھی ہوں اور علم کے لحاظ سے بے حد قلیل بھی ہوں...... مگر عِلّت اور قِلّت کے باوجود جتنا کچھ حق تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور جتنا کچھ آپ حضرات کی توجہات کی برکت شامل حال ہوگی تو ممکن ہے کہ چند کلمات گزارش کرسکوں۔

کلام کی عظمت کے چار معیار...... پہلے اتنی بات سمجھ لیجیے کہ کسی بھی کلام کی عظمت یاؤقعت اس کے متکلم سے پیدا ہوتی ہے جس درجے کا متکلم ہوگا کلام کرنے والا ہوگا اسی درجہ...... کلام کی عظمت اور کلام کی وُقعت بھی آپ کے سامنے آئے گی۔ عربی کی ایک مثل مشہور ہے "قَدْرُ الشَّهَادَةِ بِقَدْرِ الشُّهُوْدِ" "شہادت کی عظمت شاہدوں سے قائم ہوتی ہے۔ اگر شاہد عادل ہے، سچا اور صحیح ہے تو اس کی شہادت بھی سچی۔ اور شاہد میں اگر کھوٹ ہے تو اس کی شہادت کا بھی وہی درجہ ہوگا۔ تو کلام کی عظمت اور وُقعت بھی متکلم ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ جس درجے کا متکلم ہوتا

① پارہ ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔

ہے اسی درجے کا اس کا کلام بھی سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اگر دو کلام کرنے والوں کا کلام مشترک ہو تو مگر ایک متکلم گھٹیا درجے کا آدمی ہے تو اس کے کلام کی وقعت بھی کچھ گھٹ جاتی ہے اور اسی کلام کو کوئی بڑا آدمی کہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ کلام کی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے چند چیزیں طبعی طور پر ضروری ہیں جن سے کلام عظیم ہوتا ہے۔

سب سے پہلی چیز علم اور فضل ہے۔ اگر کلام کرنے والا عالم اور باخبر ہے تو اس کے کلام میں علم ہوگا اور اس کی خبر سے اس کے علم کی وسعت واضح ہو جائے گی تو پہلی چیز کلام کے لئے علم اور خبر ہے، یہ ضروری ہے۔ جاہل آدمی اگر کلام کرے تو اس کے کلام سے وہی جاہلانہ کلمات اور وہی جاہلانہ حرکات سرزد ہوں گی، لوگ پہچان جائیں گے کہ بولنے والا کوئی جاہل ہے جسے بولنے کا طریقہ نہیں آتا، بھدّا کلام کرتا ہے۔ تو کلام کی وقعت کے لئے سب سے پہلی چیز جو ضروری ہے وہ علم اور خبر ہے۔ دوسری چیز دانش اور فہم ہے کہ کلام کرنے والے میں عقل بھی ہو، فہم بھی ہو، دانش مندی بھی ہو۔ اگر بے وقوف آدمی کلام کرے اور کلام ہو وہی جس میں علم اور خبر ہے مگر اس کی بے وقوفی کی وجہ سے کلام بھدّا بن جاتا ہے، مؤثر نہیں رہتا...... تو قلوب پر بھی اثر نہیں کرتا۔ تیسری چیز منصب اور مقام ہے کہ کلام کرنے والا اگر صاحبِ حیثیت ہے، اس کی عرفی حیثیت اونچی ہے تو کلام بھی اونچا ہو جائے گا۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ وہ کلام اگر نقل ہو کر پہنچے تو اس کی سند اور تاریخی حیثیت مضبوط ہو، اگر سند نہ ہو، راوی صحیح نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کلام کا پہنچنا مشکل ہو جائے گا، پہنچے گا تو ناتمام پہنچے گا۔ تو بہرحال طبعی طور پر چار چیزیں ضروری ہیں؛ علم وخبر، دانش وفہم، منصب ومقام اور صحتِ سند اور استناد۔ اسی لئے کم علموں کے کلام کی طرف لوگ کم توجہ کرتے ہیں مثلاً اگر کوئی بچہ بولے تو اس کے کلام میں تھرتھراہٹ بھی ہوگی، لفظ بھی ناتمام ہوں گے اور سننے والے ہنسیں گے مگر کہیں گے کہ بھئی بچہ ہے! بے چارہ بولنا نہیں جانتا۔ نہ اسے علم ہے، نہ اسے خبر ہے تو کلام بھی اسی درجہ کا بے وقعت ہو جائے گا۔ چاہے بچے کو آپ شاباشی دیدیں گے اور آپ اس کے توتلانے کو کہیں گے کہ ماشاء اللہ خوب بولتا ہے! وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ہوگا، یہ نہیں کہ کلام کی کوئی عظمت آپ کے دل میں بیٹھ رہی ہے۔

اگر علم ہو مگر ناقص ہو تب بھی کلام ناقص ہو جاتا ہے عورتوں کا کلام عموماً بے ربط سا ہوتا ہے اس لئے کہ ان کے اندر نقصانِ علم بھی ہے اور نقصانِ عقل بھی ہے اِلَّا مَاشَاءَ اللہُ، اگر کوئی عورت عالم بنے فاضل بنے تو اور بات ہے جیسے کہ اسلام میں بہت سی عورتیں عالم وفاضل ہوئی ہیں، محدث بھی گذری ہیں، ادیب بھی گذری ہیں مگر وہ ہزاروں میں ایک دو ہوتی ہیں، عام طور سے ان میں نقصانِ علم، نقصانِ دین اور نقصانِ عقل ہوتا ہے اسی لئے کلام میں بھی نقص آتا ہے۔

عورتوں کا کلام بے وقعت ہونے کی وجہ...... یہی وجہ ہے کہ خاوند بیوی میں جب لڑائی ہوتی ہے بیوی بھی مقابلہ پر بولتی ہے اور خاوند بھی بولتا ہے، مگر بیوی مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جاتی ہے اور خاوند حجتیں پیش کرتا ہے، دلیلیں پیش کرتا ہے مگر اُس کی وہی ایک رٹ ہوتی ہے، جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی

الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① جو بچپن سے زیورات کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے تو اس کے قلب کے اندر سونا چاندی زیادہ گھسا ہوتا ہے، علم اور خبر اس کے اندر زیادہ نہیں ہوتی۔ ذرا سی بچی ہے اس کے کان چھید دیئے اس کو بالیاں پہنا دی جاتی ہیں اور ذرا بڑی ہو تو ناک چھید دیئے تو اس میں ''سونے کی لونگ'' اور ''کیل'' ٹھونک دی جاتی ہے اور ذرا بڑی ہوئی تو گلے میں چاندی کا طوق ڈال دیا جاتا ہے اور ذرا بڑی ہوئی اور شادی ہوئی تو ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کی بیڑیاں پڑ جاتی ہیں، چھلّے ڈال دیے جاتے ہیں، گلے میں ہنسی ڈال دی جاتی ہے...... غرض سر سے پیر تک سونے اور چاندی میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے! اس لئے اس کی تمام تر ہمت اور تمام تر شوق اور رغبت سونے اور چاندی کی طرف ہوتا ہے۔ مردوں کو تو یہ روگ عورتوں ہی سے لگتا ہے۔ اگر مرد مجرد (غیر شادی شدہ) ہو وہ سونے چاندی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ بہر حال جب دل میں سونا چاندی گھس جائے تو اس میں علم کی گنجائش کم ہوتی ہے اور عقل کی گنجائش بھی کم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ...... جن کا ذکرِ خیر آپ سنتے رہتے ہونگے، ایک جملہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو روپے پیسے کے دلدادہ تھے تو فرمایا کہ: ''دست زرآلود ایں قدر بد بوی کند'' جس ہاتھ کو سونا چاندی لگتا ہے تو اس میں کچھ سیاہی بھی آجاتی ہے اور کچھ بو بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں یہ چاندی کا روپیہ چلتا تھا اور سونے کی گنیاں چلتی تھیں جب گننے بیٹھتے تھے تو دس بیس گننے کے بعد انگلیوں پر سیاہی آجاتی تھی اور اس میں پھر بو بھی پیدا ہو جاتی تھی تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''دست زرآلود ایں قدر بد بوی کند قلب زرآلود چہ قدر بد بو خواہد کرد'' ہاتھ کو سونا لگ جاتا ہے تو اتنی بد بو ہو جاتی ہے اور جس دل میں یہ سونا لگ جائے تو کس قدر بد بو پیدا ہو جائے گی!۔ تو حقیقتاً عورتوں کے دلوں میں سونا اور چاندی گھس جاتا ہے اس لئے کہ شروع سے اخیر تک اسی کی جھنکار میں پرورش پاتی ہیں تو علم اور دانش کی طرف قدرتاً ان کی توجہ کم ہوتی ہے۔ وہ کلام کریں گی اس میں روپے پیسے کا ذکر زیادہ ہوگا۔ اس میں قرآن کا تو ذکر ہی نہیں ہوگا اس لئے کلام بھی ناتمام ہوگا مؤثر بھی نہیں رہے گا۔ تو کلام کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ علم بھی صحیح ہو اور...... کامل ہو تو سبحان اللہ! اس کی خبر اور نصیحت بھی صحیح ہو اور کامل ہو تو کلام میں بھی اسی درجہ کمال پیدا ہو جائے گا۔

کلام کے اندر حقیقتِ متکلم جلوہ گر ہوتی ہے...... حقیقت یہ ہے کہ کلام کے اندر خود متکلم جلوہ گر ہوتا ہے اگر متکلم کے اوصاف دیکھنے ہوں تو اس کا کلام سن لیا جائے، کوئی شاعر شعر خوانی کرے گا ہر شخص پہچان لے گا کہ شاعر آدمی ہے، اس کے کلام سے علم، ادب اور لغت یہ چیزیں سرزد ہوں گی، کوئی شیخ کلام کرے گا تو اس سے معرفت، علم اور عرفانِ الٰہی سرزد ہوگا اور سب پہچان لیں گے کہ کلام کرنے والا عارف ہے، اسی طرح اگر کوئی عالم کلام کرے گا تو کلام سے پہچان لیا جائے گا کہ اس کے قلب کے اندر علم ہے، اس کے لفظ لفظ سے علم ٹپکتا ہے تو کلام میں دراصل

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

خود متکلم جلوہ گر ہوتا ہے، جسے متکلم کو دیکھنا ہو اس کے کلام کو دیکھ لے اس سے وہ نمایاں ہو جائے گا۔

زیب النساء شہزادی...... اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء بہت بڑی شاعرہ تھی، ذہین اور ذکی بھی تھی، جب شاہی دربار میں مشاعرے ہوتے اور شعراء اپنا کلام سناتے تو زیب النساء کا کلام بھی سنایا جاتا تھا اور وہ عموماً تمام شعراء کے کلام پر فائق ہو جاتا تھا، لوگ سر دھنتے تھے اور اس کی بڑی داد دیتے تھے۔ اورنگ زیب کا ایک درباری تھا، اس کی زبان سے نکلا کہ کاش! میں زیب النساء کو دیکھ لیتا! اس لئے کہ اچھا کلام سن کے قدرتاً جی چاہتا ہے کہ متکلم کو دیکھیں۔ اس کی زبان سے نکلا کہ کاش میں زیب النساء کو دیکھ لوں! مگر اول تو بادشاہی محل اور اوپر سے پردے کا رواج! کوئی آج کا دور تھوڑا ہی تھا کہ بے پردگی اور عریانی پھیلی ہوئی ہو، پردہ بھی تھا، عورتیں مخفی رہتی تھیں تو دیکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ درباری عاقل خان کا یہ مقولہ زیب النساء کو پہنچ گیا۔ اس نے کہا میرے دیکھنے کی بڑی آسان صورت ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا کہ:

در سخن مخفی منم، چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح چھپی ہوئی ہوں جس طرح گلاب کی پتیوں میں خوشبو چھپی ہوئی ہوتی ہے، اگر خوشبو کا ادراک کرنا ہے تو گلاب کی پتی کو دیکھ لو خوشبو خود بخود سامنے آ جائے گی تو میں اپنے کلام میں چھپی ہوئی ہوں جسے مجھے دیکھنا ہو میرے کلام کو دیکھ لے میں اس میں جلوہ گر ہو جاؤں گی۔ تو حقیقتاً دیکھنے کی چیز صورت نہیں ہوتی، حقیقت ہوتی ہے، صورت تو ایک عارضی چیز ہے، وہ محض تعارف کا ذریعہ بنتی ہے اصل چیز انسان کے لئے حقیقت ہے۔

سیرت سازی کی ضرورت ...... تو دانش مند کا کام یہی ہوگا کہ صورت کے سنوارنے کی بجائے سیرت کو سنوارے، وہی انسان کی حقیقت ہے اور رہ گئی صورت! وہ تو چند روزہ بہار ہے، آدمی جب بوڑھا ہوتا ہے تو ساری صورت بگڑ جاتی ہے، وہ رنگ و روغن ہی نہیں رہتا جو جوانی کے زمانے میں تھا، بڑھاپا ہی صورت کی رنگینی کو کھو دیتا ہے، بڑھاپا بھی نہ آئے کچھ غم لگ جائے، کچھ فکر لگ جائے یا کوئی بیماری لگ جائے اس سے بھی سارا رنگ روپ زائل ہو جاتا ہے، صورت باقی رہتی اور نہ رنگ رہتا ہے تو صورت حقیقت میں قابلِ التفات نہیں ہے اصل چیز سیرت ہے۔ ہمارے نوجوان بھائی خصوصی طور پر رات دن صورت کے سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں گو اس کو درست کریں، بنائیں، سنواریں لیکن حقیقت میں یہ اپنی کوتاہی ہے، جتنی محنت صورت کے سنوارنے پر کرتے ہیں اگر سیرت کے سنوارنے پر کریں تو کہاں سے کہاں پہنچیں! تو آپ صورت کو سنوارنے کی کیا فکر کرتے ہیں اور اس کو کیا سنواریں گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، جس کا کام ہی یہ ہے کہ بگڑے، اسے کہاں تک آپ سنواریں گے! روز گھنٹے دو گھنٹے صورت سنوارنے میں صرف کریں گے شام کو بگڑ جائے گی پھر اگلے روز بیٹھ کر کے گھنٹہ بھر صرف کریں پھر بگڑ جائے گی، اسے کہاں تک آپ سنواریں گے وہ تو پیدا ہی بگڑنے کے لئے ہوئی ہے۔

ایک شیخ کا اپنے صورت پرست مرید کا علاج کرنا...... وہ کسی بزرگ کا مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خانقاہ

میں لوگ اللہ اللہ اور ذکر اللہ کے لئے آیا کرتے تھے اور خانقاہ کا کام جاری تھا۔ ایک روز ایک صاحب داخل ہوئے، شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، مقصد یہ تھا کہ اپنے قلب کی اصلاح کریں تو شیخ کے ہاں کا طریقہ یہ تھا کہ عام مریدین کا کھانا ان کے گھر پکتا تھا ایک باندی متعین تھی، کھانا تیار ہونے کے بعد وہ حجرہ درحجرہ کھانا تقسیم کر جاتی تھی۔

وہ باندی حسب معمول آئی اور اس نے آکے کھانا بانٹنا شروع کیا، باندی جب نئے مُرید صاحب کے حجرے میں آئی تو باندی کچھ قبول صورت تھی، ان کی اس سے آنکھ لڑ گئی اور ان کے دل میں عشق پیدا ہو گیا۔ اب وہ جب آتی یہ اسے بیٹھ کے گھورتے، شیخ کو پتہ چل گیا کہ اس کی طبیعت باندی کی طرف مائل ہوئی ہے، رات دن اس کی فکر میں ہے وہ ذکر اللہ تو گیا اپنی جگہ! وہ صورت شکل میں اُلجھ کے رہ گئے ہیں۔ شیخ کو معلوم ہو گیا تھا مگر یہ حضرات اہل اللہ زبان سے زیادہ علاج نہیں کرتے، تدبیر سے علاج کرتے ہیں تو شیخ نے تدبیر کی کہ اُن کے دل سے اس صورت کی محبت نکل جائے۔ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ایک دست آور دوائی منگوائی، جمال گھوٹہ ہو گا یا املتاس وغیرہ وہ اس باندی کو کھلایا اور ایک جگہ متعین کردی کہ قضائے حاجت کے لئے وہاں جاکے بیٹھے، ایک کنڈا رکھ دیا اور ایک قدمچہ رکھ دیا۔ صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آئے وہ رنگ روغن ختم ہو گیا اور ہڈیاں اوپر نکل آئیں، بھیانک سی صورت بن گئی۔

شیخ نے فرمایا: کہ کھانا لے کے اس مرید کے پاس جا اور جو معاملہ وہ کرے اس کی مجھے اطلاع دینا وہ حسبِ معمول کھانا لے کر آئی، یا تو وہ انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ باندی آئے تو ذرا گھوریں، آنکھوں کو سینکیں...... اب جو آئی، صورت اس کی بھیانی، بجائے خوبصورتی کے زردی منہ پر چھائی ہوئی، ہڈیاں نکلی ہوئیں، اسے بڑی نفرت پیدا ہوئی اور اس نے منہ پھیر لیا اور کہا کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے! وہ بے چاری چلی گئی اور شیخ سے جا کر اس نے سارا حال عرض کیا کہ آج تو یہ معاملہ رہا۔ فرمایا کہ: الحمد للہ علاج ہو گیا، شیخ آئے اس مرید کی انگلی پکڑی کہ ذرا میرے ساتھ تشریف لے چلئے، وہ جو حجرے میں قدمچہ رکھا ہوا تھا جس میں وہ دستوں کی نجاست پڑی ہوئی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ نے کہا: یہ آپ کا معشوق ہے، اسے لے جایئے بڑی حفاظت سے اس نجاست کو رکھ لیجیے، اس لئے کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی آپکو تو اس سے محبت تھی، جب تک یہ اس کے پیٹ میں رہی آپ عاشق رہے، دلدادہ رہے، یہی تو نکل گئی اور کیا چیز نکلی! جو آپ کی محبت ختم ہو گئی تو آپ کو نجاست سے محبت ہے باندی سے محبت نہیں ہے، یہ ہے آپ کا محبوب، اسے اٹھا کر لے جایئے وہ شرمندہ ہوئے اور دل سے وہ ساری چیز نکل گئی۔

سیرت باقی اور صورت فانی ہے...... تو حقیقت یہ ہے کہ صورت کی محبت تو نجاست کی محبت ہے۔ محبت اصل میں سیرت کی ہوتی ہے کہ آدمی میں علم ہو، معرفت خداوندی ہو، تعلق مع اللہ قائم ہو جس سے سیرت بنتی ہے، وہ چیز محبت کے قابل ہے۔ یہ گوشت پوست کی محبت حقیقی محبت نہیں یہ تو نجاست کی محبت ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ محبت کے قابل سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو تو جتنا آپ سنواریں گے وہ تو بگڑ کر ہی رہے گی، سیرت البتہ ایسی چیز

ہے کہ جب حق تعالیٰ دیدیتے ہیں تو وہ اس دنیا میں بھی قائم ہے برزخ میں بھی قائم ہے آخرت میں جا کے بھی قائم رہے گی وہ بگڑنے والی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کہ سیرت کے اندر کمالاتِ خداوندی جلوہ گر ہوتے ہیں اور اللہ کا کمال زائل ہونے کے لئے نہیں ہے وہ تو ابدی ہے، برقرار رہے گا تو جس میں اللہ کا کمال آجائے تو وہ بھی پائیدار چیز ہے، صورت انسانی کی خصوصیت یہ ہے کہ انسان تغیر کا پتلا ہے تو صورت بھی متغیر ہوتی رہتی ہے۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ کلام کے اندر متکلم جلوہ گر ہوتا ہے تو...... متکلم کی صورت جلوہ گر نہیں ہوتی اس کی سیرت اور حقیقت جلوگر ہوتی ہے اس سے آدمی پہچان سکتا ہے کہ یہ متکلم کس درجے کا آدمی ہے۔

کلام کو چار چیزوں سے متصف ہونا چاہئے ...... تو سب سے پہلی چیز جو ہے وہ علم اور خبر ہے دوسری چیز دانش اور فہم کہ وہ ہو تو کلام میں عظمت پیدا ہوتی ہے اور تیسری چیز منصب اور مقام ہے اگر متکلم باحیثیت ہے تو کلام بھی باحیثیت ہوگا اگر اس کی حیثیت گری ہوئی ہو تو کلام کی کوئی وقعت نہیں ہوگی، ایک کلام میں کروں یا آپ کریں کوئی وقعت نہیں اور وہی بات ایک صدر جمہور یہ کہہ دے تو دنیا میں اس کا اثر ہوتا ہے، سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے ملکوں کے منصوبے بن جاتے ہیں۔ وہی جملہ آپ نے کہا اور وہی جملہ ملک کے وزیر اعظم نے کہا اس کے اثرات دوررس ہوتے ہیں، دنیا گیر ہوتے ہیں۔ یہ منصب اور مقام کا اثر ہے چونکہ منصب بڑا ہے اس لئے زبان سے نکلا ہوا کلام بھی بڑا ہو جاتا ہے اور منصب گھٹیا ہے یا بے منصب آدمی ہے تو کلام کی بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ کلام جب ہم تک پہنچے تو صحیح سند کے ساتھ پہنچے اشتباہ نہ رہے کہ معلوم نہیں متکلم نے کلام کیا ہے یا نہیں پورا کلام پہنچا ہے یا ادھورا پہنچا ہے، اس کی تاریخی حیثیت مضبوط ہونی چاہئے تو یہ اوصاف ہونے چاہئیں۔

کلام اللہ کی عظمت شان ...... جب یہ بات مسلم اور یہ اصول طے شدہ ہے کہ جس کا علم جتنا بڑا ہوگا کلام بھی اتنا بڑا ہوگا، جس کا منصب اور مقام بلند تر ہوگا کلام بھی اتنا ہی بلند ہوگا، جس میں عقل اور فہم رچا ہوا ہوگا اس کا کلام بھی اتنا ہی اُونچا ہوگا...... اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اللہ رب العزت کی ذات...... علم کے لحاظ سے دیکھی جائے تو علم اس کا لامحدود، کہیں اس کی حد نہیں ہے، آپ صرف سامنے کی چیز کو دیکھ سکتے ہیں اس کے سامنے حاضر غائب سب حاضر ہیں، وہ جس طرح سے ایک بادل کی گرج کو سنتا ہے اسی طرح سے زمین کی تہہ میں اگر چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چل رہی ہے تو اس کی کھسکھساہٹ بھی سنتا ہے، وہ سمیع و بصیر ہے، آپ زبان سے کوئی بات سن لیں گے جان لیں گے وہ دلوں کے مخفی رازوں کو جانتا ہے: ﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ① اسے دلوں کی کھٹک کا بھی علم ہے کہ آپ کے دل میں کیا خطرات گذر رہے ہیں تو اس کا علم لامحدود، وہ ظاہر اور باطن پر حاوی، اس لئے اس کا کلام بھی ظاہر و باطن پر حکمران ہوگا اور اتنا جامع کلام ہوگا کہ اس سے زیادہ جامعیت نہیں ہوسکتی، اس میں فصاحت بھی ہوگی بلاغت بھی اعجازی ہوگی، بداعت بھی اعجازی ہوگی، تو فصیح بھی اعلیٰ، بلیغ بھی اعلیٰ اور بداعت بھی اس میں

① پارہ: ۱۱، سورۃ ھود، الآیۃ: ۵.

اعلیٰ ترین ہوگی، اس کی کوئی حد ونہایت نہ ہوگی۔

فصاحت...... فصاحت کی مثال تو ایسی ہے جیسے آپ کپڑا سلوائیں تو سب سے پہلے تو کپڑے کو دیکھا جائے گا کہ اس کا مادہ بھی صحیح ہے یا نہیں، اگر کپڑے کا مادہ صحیح ہے، سوت نہایت عمدہ ہے، ریشم نہایت عمدہ ہے تو کہیں گے کہ کپڑا نہایت اعلیٰ ہے۔ یہ کپڑے کی ذات ہے اس کو کہنا چاہیے کہ یہ فصاحت ہے کہ کلام کے اندر الفاظ نہایت بامحاورہ ہوں، کلام کے اندر لفظوں میں کوئی منافرت نہ ہو کہ کان اس کے سننے سے اکتا جائیں، کانوں پر بار گذرے، بلکہ ایسا ہو کہ کان میں کلام پہنچا اور دل میں اتر گیا اور حقیقت منکشف ہوگئی۔ تو کلام کے اندر لفظ بھی اعلیٰ ہوں کہ کوئی پیچیدگی بھی نہ ہو اور سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو...... اتنا سلیس ہو کہ فوراً قلب میں اتر جائے اور اتنا جامع ہو کہ سارے حقائق اس میں چھپے ہوئے ہوں، یہ تو فصاحت ہے۔

بلاغت...... ایک یہ کہ کپڑا بدن کے مطابق سلا ہوا ہے، کپڑا تو بہت اعلیٰ ہے مگر درزی بھدّا تھا، اس نے نہایت غلط سیا، جب آدمی پہن کر نکلتا ہے تو لوگ کپڑوں کو تو دیکھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ وضع قطع نہایت بھدّی ہے تو اس سے کپڑے کی خوبیاں بھی غلط ہو جاتی ہیں تو کپڑے کا بدن کے مطابق ہونا یہ بمنزلہ بلاغت کے ہے۔

بداعت...... پھر اس کپڑے کے اوپر کوئی رنگ، کوئی نقش ونگار اور رنگینی اعلیٰ ترین ہو تو اسے کلام بدیع کہتے ہیں یعنی اس کی بداعت بھی اعلیٰ ہے تو کلام اپنی ذات سے بھی اعلیٰ، سننے والے اور مخاطبین کے مزاج کے بھی مطابق اور اس کے اندر مرصّع ومسجّع اور مقفّٰی ہونا یہ بھی داخل ہے تو فصیح بھی ہوا، بلیغ بھی ہوا اور بدیع بھی ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ کا کلام...... جب کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال کے منبع ہیں تو ان کے کلام کے اندر یہ ساری چیزیں انتہائی طور پر جمع ہونی چاہیے، ایسا اعجازی ہو کہ کوئی بشر ایسا کلام نہ کر سکے۔ اس لئے کہ بشر کا علم محدود ہے تو کلام کی بھی جامعیت کم ہوگی، اللہ کا علم لامحدود ہے تو کلام بھی اتنا جامع ہوگا کہ قیامت آجائے مگر اس کے نیچے سے علم ختم نہیں ہوسکتا۔ ہر چیز کا حکم اس میں موجود تو حق تعالیٰ کا کلام جامع ترین ہوگا، فصیح ترین ہوگا، بلیغ ترین ہوگا، بدیع ترین ہوگا اور اعجازی بھی ہوگا۔

معجزہ کی حقیقت...... تو قرآن کریم حقیقت میں معجزہ ہے۔ معجزے کے معنی یہی ہیں کہ تمام دنیا عاجز آجائے مگر اس جیسی چیز نہ لا سکے۔ حق تعالیٰ میں جتنی صفتیں ہیں وہ سب اعجازی ہیں کہ کوئی غیر خدا انہیں نہیں لا سکتا اور نہ بنا سکتا ہے۔ اللہ نے آسمان بنایا، زمین بنائی، چاند سورج بنائے وغیرہ وغیرہ۔ چاند سورج تو چاند سورج ہیں آپ اس کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی بنائی ہوئی نہیں ہے، یہ کسی ایسے حکیم کی بنائی ہوئی ہے کہ اس کی حکمت کی کوئی انتہا نہ ہو۔ آسمان اور چاند سورج تو اپنی جگہ ہیں یہ زمین ہے جو رات دن آپ کے قدموں میں پامال ہے۔ اس کا ایک ذرہ آپ پیدا نہیں کر سکتے اس زمین سے کام تو لے سکتے ہیں کہ ذروں کو جوڑ کر آپ چیزیں بنالیں اور ایجادات کرلیں لیکن ایک ذرہ پیدا کرلیں...... یہ آپ کے بس میں نہیں ہے تو جو زمین آپ کی اصل ہے

ہر وقت آپکے سامنے ہے، ہر وقت اس پر آپ چلتے پھرتے ہیں، اس کا ایک ذرہ نہیں بنا سکتے، یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے اور اس ذات کا بنایا ہوا ہے جس کا علم لامحدود ہے، قدرت لامحدود ہے، اقتدار لامحدود ہے۔ تو جتنی چیزیں اللہ کی صنعتیں ہیں وہ سب معجزات ہیں ساری دنیا ان کے بنانے سے عاجز ہے۔

تمام تر تخلیقات معجزاتِ خداوندی ہیں...... ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے تو کیا ماں بناتی ہے اس کو؟ ماں کو تو یہ خبر نہیں کہ ہو کیا رہا ہے! باپ بناتا ہے! تو باپ کو کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کارخانہ قدرت کا کام جاری ہے، بچہ بن رہا ہے اور صورت بنائی جارہی ہے، یہ اسی کی صنعت ہے کہ پانی کے قطرے پر نقاشی کردے۔ آپ پانی پر تصویر نہیں کھینچ سکتے لیکن اللہ کی یہ قدرت ہے کہ ایک قطرۂ ماء کے اوپر تصویر کھینچ دیں۔ اس نے صورت بنائی اور نقش بنائے، نہ ماں کچھ کرسکتی ہے نہ باپ۔ اس واسطے کہا جائے گا کہ خالق حق تعالیٰ ہیں، لیکن سببِ تخلیق یہ مرد اور عورت ہیں۔ تو باپ بھی خالق نہیں، ماں بھی خالق نہیں، خالق صرف ایک اللہ ہے لیکن اس نے اپنی تخلیق کو دنیا میں اسباب کے ذریعے نمایاں کیا۔

مرد و عورت کو سبب بنایا جس سے بچہ پیدا ہوا تو وہ خالق نہیں ہیں، سبب تخلیق ہیں۔ اسی واسطے ایک موقع پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ﴿ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ﴾ ① یہ ان کو تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں، تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں، یک زمیندار ہے زمین میں منوں مٹی کے نیچے دانہ ڈال دیتا ہے، اس منوں مٹی کے اندر اس بیج کو پھاڑنا اور اس میں سے کونپل نکالنا یہ کس کا کام ہے، یہ کاشتکار کرسکتا ہے؟ کاشتکار کو کچھ پتہ نہیں وہ تو دانہ ڈال کر الگ ہوگیا اور دانہ بھی اس کا بنایا ہوا نہیں ہے، وہ بھی اللہ ہی کا بنایا ہوا ہے، اس کا کام اتنا ہے کہ زمین میں ڈال دے، اب زمین کے اندر قدرت کی جو مشینیں چل رہی ہیں کہ وہ دانہ پھٹتا ہے، اس میں سے کونپل نکلتی ہے، درخت بنتا ہے...... یہ صرف اسی اللہ کا کام ہے۔ تو کہا جائے گا کہ درخت کے خالق حق تعالیٰ ہیں کاشت کار نہیں ہے، اسے اپنی تخلیق کے ظاہر کرنے کا سبب بنایا ہے۔

منوں مٹی کے نیچے سے ایک کونپل اوپر کی طرف چلتی ہے وہ اتنی نرم و نازک ہے کہ آپ اس کو دو انگلیوں میں مسل دیں لیکن وہی بڑھتے بڑھتے اتنا عظیم تناور درخت ہو جاتا ہے کہ کسی پر گر پڑے تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔ اس میں غور یہ کرنا ہے کہ درخت کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ وہ نیچے کی طرف جائے، پتے کو آپ چھوڑ دیں تو وہ نیچے کو جائے گا، شاخ کو آپ چھوڑ دیں تو اوپر کی طرف نہیں جائے گی وہ نیچے کی طرف آئے گی۔ یہ اس کی قدرت نہیں تو اور کیا ہے کہ کونپل نکلی اور اوپر کی طرف جارہی ہے، اس کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے مگر یہ اوپر کی طرف جارہی ہے اور ایک عظیم درخت بن جاتا ہے۔ تو طبیعت کے خلاف مجبور کردینا یہ بندے کے بس کی بات نہیں ہے خالق ہی کے بس میں ہے۔ تو یہ دلیل ہوگی کہ اس کو پیدا کرنے والے حق تعالیٰ شانہ ہیں کاشتکار اور انسان پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

① پارہ: ۲۷، سورة الواقعة، الآية: ۵۹.

اس کی طبیعت کے اوپر حق تعالیٰ حکمرانی کر رہے ہیں، چاہے نیچے کی طرف لے جائیں، چاہے اوپر کی طرف۔ بہر حال جاندار پیدا ہو یا درخت پیدا ہو یا پتھر پیدا ہو...... پیدا کرنا اسی کا کام ہے۔بندہ سبب بن جاتا ہے اور سبب تخلیق خود خالق نہیں ہوتا، خالق وہی ہے۔تو حق تعالیٰ شانہ نے جتنے عجائبات پیدا فرمائے ہیں ان کے خالق وہی ہیں۔ان میں سے آپ صنعت سے اور ایجاد سے تصرفات کر کے چیزیں نکالتے رہیں اس کی قدرت آپ کو اللہ نے دی ہے، مگر یہ قدرت بھی اسی کی بخشی ہوئی ہے، خود آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی ۔ اگر آپ نے عقل سے کچھ چیزیں ایجاد کر لیں تو سوال یہ ہے کہ عقل کہاں سے آئی! آپ نے خود تو اپنے اندر نہیں ڈال لی! وہ بھی اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے، پھر اس عقل کو وہاں تک پہنچا دینا کہ یوں چیز بن جائے! یوں ایجاد ہو جائے! یہ بھی آپ کا کام نہیں۔

تمام امور کا انجام اللہ کی ذات ہے...... آپ جب ایجاد کرتے ہیں تو جو ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے دل میں ارادہ کس نے ڈالا؟ پھر اللہ ہی کی طرف آپ کو رجوع کرنا پڑے گا تو ارادہ، قدرت اور اختیار اگر انسان دکھلاتا ہے تو وہ اللہ ہی کا بخشا ہوا ہوتا ہے۔اسی لئے فرمایا کہ: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ① اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے افعال کو بھی وہی پیدا کرتا ہے تمہارے اندر قدرت نہیں ہے کہ اپنے افعال کو خود پیدا کر لو اور خالق افعال کہلاؤ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے بندے کو اپنی خبر نہیں اسے اپنے افعال کی کیا خبر ہوگی؟ تو ہر چیز کی انتہاء حق تعالیٰ شانہ پر ہوتی ہے۔

اگر آپ یوں کہیں کہ فلاں مکان میں آگ لگ گئی! کہیں گے کہ کیوں لگ گئی؟ آپ کہیں گے کہ چراغ جل رہا تھا اور چوہے نے بتی کھینچ لی اور وہ بتی سامان کے اوپر آ کر گر پڑی وہ بھی جل گیا۔وہ سوال کریگا کہ بتی نیچے کیوں آئی کہ چوہے نے سامان پر ڈال دی! چوہے نے کیوں ڈالی...... اسکے دل میں ایک خیال آیا، کیوں آیا خیال؟ آگے کہیں گے کہ بھائی قدرتی بات ہے، اللہ نے خیال ڈال دیا تو انتہاء...... اللہ پر جا کر ہوگئی اور سب وسائل ختم ہو گئے

آپ کہیں گے کہ فلاں شخص بڑا اچھا عالم ہے کیوں عالم ہے؟ اس کے استاذ قابل تھے انہوں نے پڑھایا لکھایا، بھائی استاذوں کے پڑھانے لکھانے سے یہ کیسے عالم بن گیا! انہوں نے محنت کی، تربیت کی، برسہا برس لگائے عالم بن گیا، اس نے محنت کیوں کی؟ اس کے دل میں یہی جذبہ آیا، کیوں یہ جذبہ آیا؟ بھائی اللہ نے پیدا کر دیا۔پھر انتہاء جاکے اللہ پر ہوگئی۔کہیں سے چلو، اخیر میں جاکے حق تعالیٰ شانہ پر انتہاء ہوتی ہے۔قرآن کریم نے اس حقیقت کو ایک لفظ میں ظاہر کر دیا کہ ﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ ② ہر چیز کی انتہاء تیرے پروردگار پر ہوگی ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾ ③ ہر جاندار چیز اللہ کی طرف رجوع کرے گی۔

① پارہ: ۲۳ سورۃ الصّٰفّٰت، الآیۃ: ۹۶۔

② پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۴۲۔

③ پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۸۔

سارے امور کو سمیٹو جا کے حق تعالیٰ کے اوپر انتہاء ہو جائے گی۔ آپ اور ہم موجود ہیں، کیوں موجود ہیں؟ اس لئے کہ دو موجودات (ماں باپ) ملے تو پیدا ہو گئے، بھائی! کیوں ملے؟ ان کے دل میں جذبہ آیا، کیوں جذبہ آیا؟ کہ اللہ نے ان کے دل میں ڈال دیا، پھر آخر اللہ ہی کی طرف انتہاء ہو گئی تو کہیں سے آپ چلیں جا کر انتہاء حق تعالیٰ کے اوپر ہو گی۔ تو جتنے بھی کمالات دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں، جتنی بھی ایجادات ہیں خواہ انسان کرے یا کوئی کرے، انتہاء جا کے اللہ کے اوپر ہو گی کہ وہیں سے یہ خیر چلی اور دنیا کے اندر پھیل گئی تو تمام چیزوں کے مرجع الامور اللہ ہی کی ذات بابرکات ہیں۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ خواہ تخلیق ہو، خواہ تصدیق ہو، خواہ ہدایت ہو اور خواہ کوئی استاذ کسی کو پڑھائے انجام کار یہی نکلے گا کہ اللہ نے ہدایت دے دی۔

ہدایت بھی اس کی طرف سے آئے گی، تخلیق بھی اس کی طرف سے آئے گی، اس لئے کہ کمالات کا منشاء تو وہی ہے۔ تو کلامِ خداوندی جامع ہے، اس لئے کہ وہ معجزہ ہے۔ دنیا سپر ڈال دے گی لیکن اس کی ثانی نہیں لا سکے گی، جیسا کہ دنیا عاجز ہو کر سپر ڈال دے گی مگر زمین کا ذرہ نہیں بنا سکتی، دنیا عاجز آ جائے گی آفتاب کی ایک کرن نہیں بنا سکتی، ستارے کا ایک جز نہیں بنا سکتی، آسمان کا ایک جز نہیں بنا سکتی...... اس لئے کہ یہ سب معجزہ ہے اور اللہ کا فعل ہے تو یہ افعال کے معجزے ہیں اور اسی طرح قرآن کریم کلام کا معجزہ ہے۔ تو جیسے وہاں دنیا عاجز ہے...... یونہی کلام لانے سے بھی عاجز ہے کہ کوئی ایسا جامع کلام جو قیامت تک کی جزئیات پر حاوی ہو، وہی کر سکتا ہے جس کا علم قیامت تک حاوی ہو اور ہر چیز اس کے سامنے مستحضر اور حاضر ہو تو قرآن کریم صرف کلام نہیں بلکہ معجزہ بھی ہے یعنی دنیا اس کے سامنے عاجز ہے اور اس کی کوئی نظیر نہیں لا سکتا۔

کلامِ خداوندی صرف قرآن پاک ہے دوسری سماوی کتب نہیں...... اور ظاہر بات ہے اگر غور کیا جائے تو کلام صرف قرآن مجید ہی ہے۔ یعنی اور کتابیں بھی آسمان سے آئیں، توراۃ بھی آئی، زبور بھی آئی، انجیل بھی آئی اور قرآن کریم بھی آیا لیکن کلامِ خداوندی اگر کہا جائے گا تو وہ صرف قرآن پاک کو کہا جائے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کہتے ہیں "مَا يَتَكَلَّمُ بِهٖ" کو کہ کلام کرنے والا جس کا تکلم کرے وہ کلام ہے، اگر آپ لکھ کر بھیج دیں اسے مجازی طور پر کلام کہیں گے، بولے نہیں لکھ کر دے دیا اسے متکلم کی کتاب تو کہا جائے گا کلام نہیں کہا جائے گا، کلام مجازاً کہیں گے تو توراۃ حق تعالیٰ نے نازل کی، اس کے ساتھ کلام نہیں فرمایا، تختیاں لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئیں...... تو توراۃ کو کتابِ خداوندی تو کہیں گے، کلام مجازاً کہیں گے حقیقی معنی میں کلام نہیں گے اس لئے کہ تکلم نہیں فرمایا۔

انجیل کو حضرت مسیح علیہ السلام کے قلبِ مبارک پر بطور مضمون کے القاء فرمایا، تکلم نہیں فرمایا، اسے مضمون خداوندی کہیں گے، کلامِ خداوندی نہیں کہیں گے، کلام اگر کہا جائے گا تو مجازاً کہا جائے گا۔ تو کلام وہ ہے جس کے ساتھ بولنے والا بولے۔ قرآن کریم وہ ہے جس کے ساتھ حق تعالیٰ نے تکلم کیا ہے، اس کو بولے ہیں۔ قرآن کریم

میں خود فرمایا گیا کہ ﴿نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی﴾ ① اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم تلاوت کرتے ہیں تم پر فرعون کے واقعہ کی خبر۔ دوسری جگہ فرمایا گیا کہ: ﴿تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ﴾ ② یہ اللہ کی آیتیں ہیں جس کی ہم تلاوت کر رہے ہیں تمہارے سامنے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب حق تعالیٰ کوئی آیت بھیجتے تھے کلام فرماتے تھے تو وہ کلام سب سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام سنتے تھے اور اس کی عظمت سے بے ہوش ہو جاتے تھے یعنی اپنے آپے میں نہیں رہتے تھے، تمام آسمان والے فرشتے اس کی عظمت سے مغلوب اور مدہوش ہو جاتے تھے اور بعد میں پوچھتے تھے کہ ﴿مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ﴾ ③ تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا؟ اس وقت جبریل کہتے تھے کہ ﴿قَالُوا الْحَقَّ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ﴾ ④ اللہ نے یہ فرمایا تو قرآن کریم کا حق تعالیٰ نے تکلم فرمایا اس لئے صحیح معنی میں کلام اللہ وہی ہے جس کا تکلم کیا جائے اور وہ قرآن کریم ہے۔

قرآن کریم کتابِ خداوندی بھی ہے...... اور ساتھ میں وہ کتاب بھی ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اسے لوح محفوظ میں لکھ بھی دیا ہے۔ تو کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی ہے۔ لوحِ محفوظ میں تو بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہے، جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک حرف ''کوہِ قاف'' کے برابر تھا۔ تو جیسا کلام کرنے والا اور جیسا کاتب ہوگا ویسی کتابت بھی ہوگی۔ اللہ کی ذات لامحدود تو قلم بھی اس کا اعلیٰ ہوگا۔ حروف بھی اس کے اتنے چوڑے ہوں گے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تو بڑے بڑے موٹے موٹے حرفوں میں لوح محفوظ پہ لکھا گیا۔ اور احادیث میں فرمایا گیا کہ باریک حرفوں میں بھی اس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا ہے تو وہ باریک حرفوں میں بھی لکھا ہوا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آپ کلام کو موٹے حرفوں میں چھاپیں تو بھی آپ حق تعالیٰ شانہٗ کا اتباع کر رہے ہیں کہ انہوں نے بھی بڑے اور موٹے حرفوں میں لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے اور اگر آپ نے چھوٹے حرفوں میں چھاپا تو حمائل بن گئی اور اس کی بھی نظیر ہے کہ اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر باریک باریک حرفوں سے اس طرح لکھا گیا کہ وہ حمائل ہی تھی۔ اور آپ لوگوں نے اس کو عکسی قرآن میں اور زیادہ باریک کر دیا اور وہ اتنی سی ڈبیا میں آ جاتا ہے کہ جیب میں رکھ لو، بہت ہی چھوٹی قسم کی حمائل۔ تو مسلمانوں نے کلام خداوندی کے جتنے نقشے ہو سکتے ہیں وہ سارے تیار کر دیئے...... موٹے حرفوں میں بھی اور باریک حرفوں میں بھی۔

ایک عجیب نمونۂ قرآن...... بڑودہ میں میں نے ایک قرآن شریف دیکھا ہے، وہاں کی جامع مسجد میں وہ محفوظ ہے، اس کے اوراق کی لمبائی تقریباً ساڑھے تین گز ہے اور چوڑائی دو گز ہے۔ ایک بڑی میز پر پندرہ سپارے رکھے ہوئے ہیں جو چھت تک پہنچ گئے ہیں اور دوسری میز پر پندرہ سپارے دوسرے رکھے ہوئے ہیں۔ خدا جانے کاتب

---

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۲۔
③ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳۔ ④ پارہ: ۲۲، سورۃ السبأ، الآیۃ: ۲۳۔

کو کیا سوجھی ہوگی! کونسا قلم لیا ہوگا! یعنی تقریباً چار چار انگشت چوڑے اس کے حروف ہیں تو چھت تک وہ قرآن شریف آ گیا۔ تو مسلمانوں نے قرآن کریم کے لکھنے میں کوئی نمونہ نہ چھوڑا، چوڑے حروف، باریک حروف، پتلے حروف، عکسی حروف ہر قسم کے نمونے مہیا کر دیئے۔ تو قرآن کریم کو حق تعالیٰ شانہ نے لکھا بھی ہے کلام بھی فرمایا۔

کلماتِ قرآن کی طرح مُرادِ ربانی بھی من جانب اللہ متعین ہے...... قرآن کے حروف کے اندر جو معانی اور مضامین ہیں وہ بھی حق تعالیٰ نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر القاء فرمائے ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ظاہر آیت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس آیت کے نیچے یہ معنی کھپ سکتے ہیں اور زمانے کے مطابق اس آیت سے یہ مضمون نکل سکتا ہے لہٰذا مرادُاللہ یہی ہے! یہ نہیں ہوتا، کلماتِ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اترے تو لغوی معنی تو آپ سمجھتے ہی تھے لیکن ''مرادِ ربانی'' کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتظار فرماتے رہتے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے مطلع فرمادیں کہ میرا مقصد اس آیت سے یہ ہے، پھر اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کلام میں ارشاد فرماتے تھے کہ یہ قرآن ہے اور یہ اس کی تفسیر ہے، اپنے ذہن سے غور نہیں فرماتے تھے کہ اس آیت کے نیچے کتنے مضامین کھپ سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے، مراد بتلانا بھی اللہ کا کام ہے کہ اس کلمہ سے میرا یہ مطلب ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم لغتِ عرب پر اترا، لغوی طور پر تو ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ظاہر الفاظ کا یہ مطلب ہے لیکن مرادِ ربانی کیا ہے! تو وہ بالکل الگ چیز ہے۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ قرآن نے لغت سے لئے ہیں لیکن معنی اس میں اپنے ڈالے ہیں، مراد اس کی اپنی ہے، مثلاً لفظ ''صلوٰۃ'' ہے تو صلوٰۃ کے لغوی معنی دعاء کرنے کے ہیں، قرآن کریم نے صلوٰۃ کا لفظ لیا لیکن اس میں معنی اپنے ڈالے ہیں یعنی افعالِ خاصّہ کہ یوں نیت باندھو، یوں ہاتھ باندھو، یوں رکوع کرو، یوں سجدہ کرو یہ مرادِ ربانی ہے۔ لفظِ صلوٰۃ سے دعاء مانگنا مراد نہیں ہے جو کہ لغوی معنی ہیں۔ تو لغوی معنی اگرچہ اپنی جگہ ہیں لیکن عرفی معنی اپنی جگہ ہیں جو مرادی معنی ہے۔

یا مثلاً حج کا لفظ ہے، لغتِ عرب میں حج کے معنی قصد کرنے کے ہیں تو آدمی نے گھر بیٹھ کے قصد کر لیا، بس حاجی ہوگیا! کیا ضرورت پڑی کہ ایک کثیر مقدار روپیہ خرچ کر کے پاکستان سے عربستان جائے، ملک سے بے ملک ہوتا پھرے! گھر میں بیٹھ کر قصد کر کے حاجی بن جائے گا!۔ تو لغوی معنی مراد نہیں بلکہ مرادی معنی مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں تو حج سے عباداتِ خاصّہ مراد ہے، صرف قصد کرنا مراد نہیں۔ تو لغت کو قرآن نے لیا ہے مگر عربی زبان میں اپنا مضمون اس کے اندر ڈالا ہے۔ اس کو منقولِ لغوی یا منقولِ اصطلاحی کہتے ہیں، اس طرح کی اصطلاحات ہیں۔ بہرحال قرآن کریم محض لغت پر نہیں اترا بلکہ اس کے ''معنیٔ مرادی'' وہ ہیں جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر القاء فرمائے ہیں۔ اگر محض لغوی معنی مراد ہوتے تو پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ حق تعالیٰ قرآن کریم کو بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دیتے اور اعلان حضرت جبریل کر دیتے کہ ''تم سب لوگ مریضانِ نفوس ہو اور یہ نسخۂ شفاء ہے، لے جاؤ اپنا اپنا علاج خود کر لیا کرو! جس طرح تمہیں سمجھ میں آ جائے''

یوں نہیں کیا بلکہ قرآن اتارا اور پیغمبر کو بھیجا تاکہ وہ اس کی مراد بتلائیں، اس کے معانی اور مطالب سمجھائیں تو لغت اور چیز ہے، ادیب ہونا اور چیز ہے اور علم دوسری چیز ہے۔ محض ادب دانی کے بل بوتے پر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک قرآن دانوں کے پاس بیٹھ کر روایات واحادیث سے وہ معانی نہ سمجھ لئے جائیں جو سندِ متصل کے ساتھ ان تک پہنچے ہیں تب تک مرادِ ربانی معلوم نہیں ہوسکتی ہے۔

لغتِ عرب سے بدرجۂ کمال واقفیت کے باوجود مرادِ ربّانی از خود متعین نہیں کی جاسکتی...... حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، جب قرآن کریم کی یہ آیت روزہ کے بارے میں نازل ہوئی: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① کہ رات کو کھاتے پیتے رہو جب تک کہ سیاہ ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ لیا جائے، یعنی رات کی تاریکی ختم ہو کر صبح صادق نمایاں نہ ہو جائے اس وقت تک کھاتے پیتے رہو۔ جب صبح صادق نمایاں ہو کر پو پھٹے کھانا پینا بند کر دو اور روزے کی نیت کرلو۔ تو صبح صادق کو خیطِ ابیض سے تعبیر کیا اور خیطِ اسود سے رات کی تاریکی کو تعبیر کیا۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جب یہ آیت آئی تو انہوں نے خیط کے لغوی معنی لیے جو ڈورے کے ہیں، لہٰذا انہوں نے دو ڈورے ایک کالا اور ایک سفید لے کر دونوں تکیے کے نیچے رکھ لیے اور پھر انہیں دیکھتے رہتے ...... جب تک اتنا چاندنا نہ ہو جاتا کہ الگ الگ ان کی پہچان ہو جائے کھاتے پیتے رہتے حالانکہ صبح صادق ہوئے تیس منٹ، آدھ گھنٹہ ہو چکا ہوتا، اس لئے کہ صبح صادق کے بعد بھی بہت دیر تک اندھیرا رہتا ہے، صورت بھی نہیں پہچانی جاتی، تو انہوں نے دونوں ڈورے رکھ لئے اور دیکھتے رہتے جب پوری طرح سے دونوں ممتاز ہو جاتے تب کھانا پینا بند کرتے اور روزے کی نیت کرتے حالانکہ صبح صادق کو گذرے تیس منٹ ہو چکے ہوتے۔

یہ خبر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: عدی! تم روزے کے لئے سحری کے بارے میں کیا کام کرتے ہو؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ② کھاتے پیتے رہو جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے الگ پہچان نہ لیا جائے تو میں نے تکیے کے نیچے دو ڈورے رکھوا دیے ہیں اور دیکھتا ہوں جب اتنا چاندنا ہو جائے کہ دونوں ڈورے الگ نمایاں ہوں تو روزے کی نیت کرلیتا ہوں! حضور نے فرمایا: اِنَّ وِسَادَتَكَ لَعَرِيْضٌ! کہ تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ خیطِ ابیض اور خیطِ اسود اس کے نیچے آگئے۔ بندۂ خدا! خیطِ ابیض سے مراد صبح صادق ہے اور خیطِ اسود سے مراد رات کی تاریکی ہے تو تیرا تکیہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ دن اور رات دونوں اس کے نیچے سما گئے ③ تب انہیں معلوم ہوا کہ لغوی معنی مراد نہیں، اصطلاحی معنی مراد ہیں، شریعت کی مراد

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان ان الدخول فی الصلوم یحصل..... ص: ۸۵۲۔

لغوی دھاگہ نہیں بلکہ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے۔ تو لغوی معنی اور ہیں۔ ایک لغت دان قرآن کو لغت کے بل بوتے پر حل کرے گا تو دونوں دھاگوں کو اٹھا کے رکھ لے گا چاہے روزہ ہو قبول کہ نہ ہو، لیکن جس نے علمِ قرآن حاصل کیا، مرادِ ربانی کو ان احادیث کے ذریعے، جو مستند علماء کے ذریعے منتقل ہوئی ہوں، سمجھا...... اسے معلوم ہو جائے گا کہ مراد یہ ہے وہ مراد نہیں ہے۔ ہر زبان میں کچھ لغت ہوتی ہے، کچھ عرف ہوتا ہے، لغوی معنی اور ہوتے ہیں اور عرفی معنی اور ہوتے ہیں۔ اگر آدمی اہلِ عرف میں نہ رہے تو نہ زبان کا لطف حاصل ہوگا نہ زبان کے محاورے معلوم ہوں گے بس ڈکشنری سے دیکھ کر پتہ چلا لیا کرے گا اس سے زبان نہیں آتی۔

اردو دانی میں مولانا غلام رسول کا ایک لطیفہ...... ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے ''کریلا اور نیم چڑھا'' تو ہمارے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ صوبہ سرحد (کے علاقہ) بفہ کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے جلیل القدر عالم اور دارالعلوم (دیوبند) میں تمام بڑے علماء مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ یہ سارے بزرگ اُن کے شاگرد اور وہ سب کے استاذ تھے اور تھے صوبہ سرحد کے، لہٰذا اردو بولنا زیادہ نہیں آتی تھی، بس ایسے ہی بولتے تھے جیسے سرحدی لوگ بولا کرتے ہیں۔ ایک دعوت میں ان سب بزرگوں کا اجتماع ہوا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے ان کے بڑے بھائی حکیم مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ صاحب بھی تھے۔ تو مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میاں مولوی غلام رسول! چالیس برس ہو گئے تمہیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے، مگر تمہیں اردو بولنا نہ آئی! مولانا کو آیا غصہ، کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں مگر اس زبان کو میں لغو بے کار سمجھتا ہوں، اس لئے بولتا نہیں ہوں۔ خیر وہ سب ہنس پڑے تو حکیم محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اچھا بتلاؤ اس کے کیا معنی ہیں ''کریلا اور نیم چڑھا'' اب مولانا سوچ میں پڑ گئے! کہنے لگے کہ: عطف نے کام خراب کر دیا، یہ جو ''اور'' بیچ میں ہے، اگر یہ نہ ہو تو معنی ظاہر ہیں۔ کہا: کہ اچھا تم عطف نکال دو ''کریلا نیم چڑھا''۔ کہنے لگے: معنی ظاہر ہے: کریلا آدھا کچا آدھا پکا، یہ معنی ہیں۔ یعنی کریلا اردو کا لیا، نیم فارسی کا لیا، چڑھا ہندی کا لیا۔ تینوں کو ملا کے انہوں نے ایک مضمون بنا لیا کہ کریلا آدھا کچا آدھا پکا۔ سارے ہنس پڑے تو مولانا کو بڑی حیرت ہوئی کہ ہنستے کیوں ہیں میں نے مضمون بیان کر دیا ہے۔ تب عرض کیا گیا کہ حضرت لغوی مطلب مراد نہیں، عرفی مطلب مراد ہے۔ عرف میں ہے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی برائی میں مبالغہ کرنا ہوتا ہے کہ کریلا اپنی ذات سے کڑوا تھا ہی، نیم پر چڑھ گیا تو کڑواہٹ اور بڑھ گئی۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ چیز اپنی ذات سے بھی بری اور احوال بھی بُرے پیش آ گئے، تو برائی در برائی جمع ہو گئی، یہ مطلب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ کریلے کو نیم پر ٹانگ دو آدھا کچا رہ جائے آدھا پکا رہ جائے۔ یہ آپ نے لغت کے بل بوتے پر مضمون گھڑ دیا یہ مراد نہیں ہے۔ تب مولانا کو واضح ہوا کہ واقعی میں پوری طرح اردو نہیں جانتا۔

یا جیسا کہ ہمارے ہاں لغت میں محاورہ ہے کہ ''سونے پر سہاگہ'' سونے پر سہاگہ کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ ''سہاگے کو بیٹھ کر سونے پر چھڑک دو'' بس سونے پر سہاگہ ہوگیا۔لیکن مراد یہ نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب کسی خیر کے اندر مبالغہ کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ ''سونے پر سہاگہ'' یعنی سونا تو اپنی ذات سے اعلیٰ ہی تھا،سہاگہ چھڑکنے سے اور زیادہ کندن بن گیا اور زیادہ چمک پیدا ہوگئی۔تو مبالغہ فی الخیر مقصود ہوتا ہے،یہ ہیں مرادی معنی۔لغوی معنی تو یہ ہیں کہ سونے کے اوپر سہاگہ چھڑک دیا جائے یہ مراد نہیں۔ہر زبان میں ایسے محاورے ہوتے ہیں،فارسی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ ''شخص آب در سوار کرد'' فلاں شخص ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے۔لغوی معنی یہ ہیں کہ ٹوکری رکھ کے لوٹے سے اوپر پانی ڈال رہا ہے۔مراد یہ نہیں ہے،مراد یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی عبث کام ہوتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نہیں تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ ٹوکری میں پانی ڈال رہا ہے،گھڑے میں ڈالتا تو کوئی بات ہوتی،یہ بے کار اور بے نتیجہ ہے،ٹوکری کے نیچے سے نکل جائے گا۔تو مرادی معنی اور ہیں اور لغوی معنی اور ہیں۔

ایک انگریز کا اردو میں مہارت کے دعویٰ کی قلعی کھلنا......ہمارے ہاں ضلع سہارن پور میں ایک یورپین کلکٹر تھا اور اردو اچھی جانتا تھا اردو میں ہی کچھ شاعری بھی کرتا تھا اس کے ذہن میں یہ تخیل پیدا ہوگیا کہ میں اردو پر پورا قادر ہوگیا ہوں اور ہندوستانی بھی ایسی اردو نہیں بول سکتے جیسی میں بولتا ہوں۔ان کے ہاں میر منشی اور پیش کار منشی نہال احمد صاحب تھے،ادیب بھی تھے،شاعر بھی تھے،وہ یورپین ان کے آگے دعوے کیا کرتا تھا کہ ''ویل تم اردو نہیں جانتا ہم جانتا ہے'' یہ خون کے گھونٹ پی کے بیچارے چپکے ہو جاتے،پیش کار تھے کچھ کہیں تو ممکن ہے ملازمت سے برخواست کردے۔فرمانے لگے: میں خاموش رہتا،اگلے دن صاحب نے پھر کسی بات پر دعویٰ کیا کہ میں ہندوستانیوں سے زیادہ اچھی اُردو جانتا ہوں اور میز پر مکہ مار کے کہا کہ میں تم سے زیادہ بہتر اردو جانتا ہوں۔

انہیں بڑا غصہ آیا،انگریز نے ایک مکہ مارا تھا انہوں نے میز پر دو مکے مارے اور کہا کہ صاحب بہادر!تم جاہل مطلق ہو!تم کیا جانو اردو کیا چیز ہوتی ہے؟ سات سمندر پار سے آئے ہو،ہماری مادری زبان ہے ہم جانتے ہیں۔ صاحب کو بڑا غصہ آیا اس نے کہا کہ کونسی چیز ایسی ہے جو میں نہیں جانتا؟ انہوں نے کہا کہ اچھا اس محاورے کے معنی بتلایئے کہ ''اگر میں صاحب بہادر سے فلاں بات پوچھوں تو ''بغلیں جھانکتے رہ جائیں'' ؟ صاحب تو واقعی بغلیں جھانکتے رہ گئے۔کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے یوں جھانک لیا!یوں جھانک لیا!بس ختم۔انہوں نے کہا کہ بس یہی آپ کی اردو دانی ہے!یہ مطلب نہیں۔

کہنے لگا:اور کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ اردو جانتے ہیں،خود سمجھئے اس کا کیا مطلب؟ صاحب بولے: کہ اچھا ہم تین دن میں ڈکشنری دیکھ کے آپ کو بتلائیں گے۔انہوں نے کہا کہ تین دن نہیں آپ کو سات دن کی مہلت ہے آپ دیکھ لیں۔صاحب بہادر نے ڈکشنریاں کھنگالنا شروع کیں،لغت کی

کتابیں دیکھنا شروع کیں، مگر وہ تو محاورہ تھا تو ساتویں دن آ کر کہا کہ: ویل پیش کار! ہمیں تو کسی ڈکشنری میں اس کے معنی نہیں ملے، کیا ہیں اس کے معنی؟ کہا کہ پہلے اقرار کیجیے کہ آپ جاہل مطلق ہیں! آپ اردو نہیں جانتے تب میں بتلاؤں گا۔ اب یہ کہنا پرسنالٹی (وقار) کے خلاف تھا کہ صاحب میں جاہل مطلق ہوں! خیر انہوں نے دبے لفظوں میں کہا کہ اچھا ہم لاعلم ہیں، تم بتلاؤ! تب انہوں نے کہا کہ بغلیں جھانکنا تحیُّر کی طرف اشارہ ہے۔ جب آدمی حیرت زدہ ہوتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ یہ معنی نہیں کہ ادھر کو جھانک لیا ادھر کو جھانک لیا، یہ لغت ہے۔ محاورہ میں وہ معنی ہیں۔ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زبان میں بہت سے محاورات ہیں کہ ان کا مطلب لغت کچھ بتلاتی ہے عرف کچھ اور بتلاتا ہے تو جب تک آدمی اہل عرف میں نہ رہے اس زبان کے محاورات کو نہیں سمجھ سکتا نہ زبان کی لطافت کو سمجھ سکتا ہے۔

مرادِ ربانی کا تعین کس طرح ہوسکتا ہے...... تو قرآن کریم بھی بہرحال اللہ کا ایک خاص کلام ہے، خاص زبان ہے، اس کا بھی ایک عرف ہے، اسے لغت کے پیمانے سے ناپنا اور ڈکشنریاں دیکھ کر اس کے مضامین کو پھاڑنا...... اس سے مرادِ ربانی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مراد جبھی سمجھ میں آئے گی جب متکلم خود ہی بتلائے کہ یہ میری مراد ہے۔ آپ اندازہ تو کیجیے کہ دو آدمی ہیں ایک ماں کے پیٹ میں انہوں نے پیر پھیلائے (ایک ماں سے پیدا ہوئے)، حقیقی بھائی ہیں، سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی، جب تک وہ اظہار نہ کرے کہ میں یہ چاہتا ہوں۔ تو دو انسان جو ایک جنس کے ہیں ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہیں۔ ایک کا مافی الضمیر دوسرا نہیں سمجھتا جب تک دوسرا اظہار نہ کرے تو اللہ رب العزت جو نورِ مطلق ہیں اور بندہ ظلمِ مطلق ہے۔ یہ بلا اللہ کے بتلائے کیسے اللہ کی مراوات کو سمجھ لے گا جب تک کہ حق تعالیٰ خود نہ فرمائیں کہ میری مراد یہ ہے۔

اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا، اس پر اپنا کلام اتارا، الفاظ بھی اتارے، معانی بھی اتارے تو آپ قرآن پاک کے الفاظ کے بارے میں بھی امین ہیں اور معانی میں بھی امین ہیں۔ آپ موجد اور مخترع نہیں ہیں جیسا کہ الفاظ...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود نہیں بنائے، اللہ کے نازل کردہ ہیں اسی طرح ان الفاظ کے معانی بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اختراع نہیں فرمائے۔ بلکہ اللہ نے القاء کئے ہیں تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سمجھ میں مرادِ ربانی آئی تو مرادات کو بتلانے والی چیز حدیث ہے اور حدیث کو جب تک قرآن سے نہ ملایا جائے قرآن کے معانی اور مطالب نہیں سمجھے جاسکتے۔ جب تک اللہ کی بتلائی ہوئی مراد پیغمبر کی زبان سے ادا نہ ہو اور پیغمبر کے قول وفعل سے نمایاں نہ ہو مرادِ ربانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلقہ فرائض...... تو حدیث درحقیقت قرآن کا بیان ہے، جب تک اسے نہ ملاؤ مرادات ربانی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اس لئے اللہ نے اپنے پیغمبر کو بھیجا تو چار فرائض نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمائے۔

فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ﴾ ① ہم نے امیوں میں رسول بھیجا جوامی ہے اس کا پہلا کام یہ ہے کہ اللہ کی آیات کوتلاوت کرے، یہ تو آپ نے الفاظ پہنچا دیئے، من وعن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امانت کے ساتھ وہ الفاظ جو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی کے ذریعے اتارے وہ پہنچادیئے تو ایک فریضہ تو ادا ہو گیا جو تلاوتِ آیات ہے گویا قانونِ خداوندی کی نص آپ نے پہنچادی۔

اب اس لفظ کے معنی کیا ہیں! تو دوسرا لفظ فرمایا گیا: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم بھی دے۔ تو تعلیم میں استاذ الفاظ نہیں رٹایا کرتا، الفاظ کے معانی بیان کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا کام یہ ہے کہ معانی اور مرادات سمجھائیں، یہ تعلیم میں آتا ہے۔

تیسری چیز فرمائی: ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ حکمت کی تعلیم دیں اور حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمتِ نظری اور ایک حکمتِ عملی۔ ایک فکری حکمت کہ حقائق بیان کئے جائیں ایک عملی حکمت کہ عمل کا نمونہ پیش کیا جائے تو تعلیم میں حکمت نظری تو آ گئی، مرادات ربانی سمجھادی گئیں اب آگے عمل کا نمونہ رہ جاتا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف معانی نہیں سمجھائے بلکہ عمل کر کے بھی دکھلایا تا کہ دوسری کسی چیز کی گنجائش نہ رہے اور متعین ہو جائے کہ اللہ کی مراد یہی ہے۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کر کے بھی دکھلا دیا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمل کرتے ہیں وہ قرآن کے اندر ہوتا ہے۔ تو قرآن میں قال ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حال ہے، وہ جو کہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر کے دکھلاتے ہیں اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے ہیں وہ قرآن کہتا ہے۔ تو قول وعمل میں پوری مطابقت ہے جو اللہ کا قول ہے اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہے۔

اگر ہم یوں کہہ دیں تفنن کے طور پر کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن نازل کئے تھے، ایک علمی قرآن جو کاغذوں میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن ہے جو ذات بابرکات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ تو قرآن درجۂ قال میں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل درجۂ حال میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی کچھ کرتے ہیں جو قرآن میں ہوتا ہے تو عمل سے مراد متعین ہو جاتی ہے پھر جانبِ مخالف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

قرآن کی بجائے حدیث سے مناظرہ کرنے کی حضرت علیؓ کی ابن عباسؓ کو تاکید ...... یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کے مقابلہ کے لئے بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی کہ قرآن سے دلیل پیش نہ کرنا سنت سے دلیل پیش کرنا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وعمل سے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ: امیر المؤمنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن فہمی کی دعاء دی

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ② ایضاً ③ ایضاً۔

ہے اور فرمایا ہے کہ: اَللّٰھُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ① اے اللہ! ابن عباس کو اس کتاب کا علم بھی دے اور اس کی حکمت بھی اس کے قلب میں ڈال دے، تو جو میرا اصل مضمون ہے اسی سے آپ مجھے روک رہے ہیں کہ اس سے دلیل نہ پکڑوں اور عوام کے سامنے قرآن سے حجت نہ پیش کروں، سُنت سے پیش کروں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ اَلْقُرْاٰنُ ذُو الْوُجُوہِ ② قرآن چونکہ دستورِ اساسی ہے اس کی ایک ایک آیت بڑی جامع اور کئی کئی معنی پر ڈھل سکتی ہے، کئی کئی معنی لغت کے اندر سے آسکتے ہیں، تم اگر قرآن سے حجت پیش کرو گے تو فریق مخالف اس آیت سے ایک دوسرا مضمون لیکر پیش کردے گا کہ اس کا یہ مطلب ہے، تو عوام پر حق و باطل واضح نہیں ہوگا وہ کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں۔ تو دونوں کا حق مشتبہ ہوگا حق و باطل کا فیصلہ نہیں ہوگا لیکن اگر سنت سے دلیل پیش کرو گے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وعمل سے، اس میں جانبِ مخالف کی گنجائش نہیں ہے تو حق واضح ہوجائے گا کہ حق یہی ہے، اس لئے سنت سے دلیل پیش کرنا۔ تو قرآن کریم ذی وجوہ ہے ایک ایک آیت کئی کئی معنی پر ڈھل سکتی ہے، لغت اس کا انکار نہیں کرتی لیکن مرادی معنی وہ ہیں جو حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارے ہیں کہ اس آیت سے ہمارا مطلب یہ ہے۔

جب وہ مراد سامنے آئے گی مطلب متعین ہوجائے گا اور وہ مراد بغیر حدیث کے پیش کئے نہیں آسکتی، بغیر سنت کے معلوم نہیں ہوسکتی۔ تو سنت قرآن کریم کا بیان ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ حدیث کا انکار کردیتے ہیں! کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں...... تو حدیث کا انکار کر کے وہ قرآن کو کیسے مانتے ہیں؟ قرآن کے لفظ ہی تو مطلوب نہیں معانی بھی تو مطلوب ہیں اور معانی حدیث بیان کرے گی۔ (لہٰذا انکارِ حدیث سے معانیٔ قرآن سمجھ نہیں آسکتے۔)

ایک منکرِ حدیث کے ساتھ کچھ لمحاتِ سفر...... میں ایک دفعہ یہیں پاکستان میں کراچی سے لاہور آرہا تھا، ریل کا سفر تھا۔ اسی گاڑی میں ایک صاحب سوار ہوئے جو اَپ ٹو ڈیٹ (ماڈرن) قسم کے آدمی تھے، انہوں نے اس قدر نیازمندی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا اور اتنی خدمت کی کہ ذرا میں لوٹے کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو فوراً پانی بھر کے لائیں اور کسی چیز کا اشارہ بھی کروں سمجھ جائیں اور وہ لاکر رکھ دیں، بہت بڑی خدمت کی، خیر کئی گھنٹے تک وہ بے چارے محبت سے خدمت کرتے رہے۔

میرے دل میں قدر ہوئی کہ بھئی بالکل ہی جدید تعلیم یافتہ اور نوفکر آدمی اور اس طالب علم کے آگے اس قدر محبت سے پیش آئے، بڑی دل میں قدر ہوئی، وہ تھے اصل میں منکرِ حدیث۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے انکارِ حدیث (کی بحث وتمحیص) کے اوپر لائیں۔ اس لئے خدمت کو انہوں نے پیش خیمہ بنایا اخیر میں انہوں نے اپنا مقصد ظاہر کیا اور احادیث پر کچھ اعتراضات کرنے شروع کئے کہ وہ قابل اعتبار نہیں، ایک تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔

تو میں نے کہا: آپ کسی چیز کو مانتے بھی ہیں؟ کہنے لگے قرآن کو۔ میں نے کہا قرآن کا قرآن ہونا آپ کو کیسے

① الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباسؓ ج:۲۲ ص:۲۳۷ رقم: ۶۷۲۸. ② کنز العمال، ج:۱، ص:۵۵۱.

معلوم ہوا؟ کیا آپ پر وحی آ گئی تھی کہ یہ قرآن ہے، کیسے پتہ چلا؟ کہنے لگے اللہ کے رسول کے ارشاد سے۔ میں نے کہا: وہ ارشاد ہی تو حدیث ہے، تو قرآن کا قرآن ہونا تو حدیث پر موقوف، حدیث کا آپ انکار کر دیں گے تو کونسی شرط ہے قرآن کے قرآن ہونے کی؟ کیسے آپ انکار کرتے ہیں؟ تو وہ چپ ہو گئے۔

کہنے لگے کہ دل سے تو حدیث کا انکار واقعی مشکل ہے، باقی حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ بعض قابل اعتبار نہیں، تو میں نے کہا: جنس کو تو آپ نے مان لیا، آپ مُصِر کیوں ہیں کہ حدیث کی قسمیں ہیں، میں نے کہا: جہاں تک حدیث کی قسمیں ہیں، محدثین نے خود ان کی صراحت کی ہے کہ ہر حدیث کا ایک درجہ نہیں ہے، جو حدیث متواتر ہے اور تواتر سے ثابت ہے وہ مورثِ یقین ہے، اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا انکار۔ قرآن کی ایک آیت کا آدمی انکار کر دے تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، حدیث متواتر کے انکار سے بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ دوسرے درجہ کی حدیث حدیثِ مشہور ہے وہ اگر مورثِ یقین نہیں تو ظن غالب کی مورث تو ہے ہی، ظن غالب تو پیدا ہوگا۔ اور ظن غالب پر ہزاروں احکام کا مدار ہے تو وہ بھی حجت ہوگی۔ تیسرا درجہ خبرِ واحد کا ہے وہ اگر ظن غالب نہیں تو مطلق ظن تو پیدا کرتی ہے اور ظن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے احکام ظن اور گمان پر مبنی ہیں جیسے بعض جگہ آدمی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا لیکن حکم دیکھنے جیسا لگا تا ہے، وضو میں پیروں کا دھونا ضروری ہے اور ذرا بھی جگہ خشک رہ جائے وضو نہیں ہوگا، لیکن کیا آپ ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایڑی ڈھل گئی ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ ہی نہیں سکتے، بس ظن غالب ہی تو ہوتا ہے کہ پیر دھل گیا، اس ظن غالب پر شریعت بھی حکم دیتی ہے کہ ہاں دھل گیا وضو ہو گیا تو بہت سے احکام کا مدار ظن پر بھی ہوتا ہے تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کر دے تو وہ بھی حجت کی شان رکھتی ہے۔ آپ کا گمان جب فعل کے جائز ہونے پر حجت بن جاتا ہے تو حدیث اگر ظن پیدا کرے تو وہ کیوں حجت نہیں بنے گی! تو میں نے کہا یہ تو خود محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ہر حدیث ایک درجے کی نہیں ہے تو جنسِ حدیث کو آپ نے مان لیا، اقسام حدیث وہ قابل اعتراض ہیں! تو خود محدثین ہی ان کی تقسیم کرتے ہیں، اب آپ کو اعتراض کیا ہے؟ کہنے لگے: اب تو کچھ اعتراض نہیں، میں نے کہا: اب تو حدیث کا انکار نہیں کر دیں گے؟ کہنے لگے: نہیں اب نہیں کروں گا تو الحمد للہ لاہور آتے آتے ان کا خیال درست ہو گیا۔

قرآن کا قرآن ہونا حدیث کے اُوپر موقوف ہے...... بہرحال قرآن پاک کا ماننا حدیث کے ماننے پر موقوف ہے، حدیث کا انکار کرنا یہ خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔ قرآن کے لفظ آپ مان لیں گے مگر معانی میں حدیث کو ماننا پڑے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ لفظوں میں بھی آپ کو ماننا پڑے گا اللہ کے رسول ہی کا تو ارشاد ہے کہ یہ آیت خدا کی بھیجی ہوئی ہے تو لفظِ قرآن بھی حدیث سے ہی آپ نے مانے۔ آخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی ارشاد فرمایا ہمیں کیا خبر تھی کہ قرآن کے یہ لفظ ہیں اور یہ معانی ہیں تو لفظوں کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف، معانی کا ماننا بھی حدیث پہ موقوف، مرادِ ربانی کا سمجھنا بھی حدیث پر موقوف۔ تو منکرِ حدیث سب سے پہلے منکرِ قرآن ہے وہ قرآن

ہی کو نہیں مانتا اس لئے قرآن کے نہ ماننے پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ حدیث کا انکار کردو۔ درحقیقت قرآن کا انکار مقصود ہے کہ یہ دنیا سے اٹھ جائے۔

حجیتِ فقہ..... تو مقصد یہ تھا کہ قرآن اصل ہے اور اس کا بیان حدیث ہے۔ پھر اس بیان کی تشریحات اور معارف ہیں جو فقہ میں مدون ہوگئے ہیں۔ تو بنیادی طور پر حجت قرآن ہے، دوسرے درجہ پر حجت حدیث ہے جو قرآن کو قرآن ثابت کرتی ہے، بہت سے احکام بلاواسطہ قرآن سے نکل رہے ہیں بہت سے وہ ہیں جو اس کی کلیات سے نکلتے ہیں، مجتہدین ان کلیات میں چھپے ہوئے مضامین کو نکال کر اپنے اجتہاد و بیان سے باہر پیش کردیتے ہیں تو بالواسطہ وہ چیز قرآن سے ثابت ہوتی ہیں۔ فقہ کے مسائل بھی درحقیقت قرآن ہی کے مسائل ہیں فرق اتنا ہے کہ ان مسائل کے نکالنے پر ہم اور آپ قادر نہیں ہیں جن کو اللہ نے اجتہاد کا ملکہ دیا ہے وہ قادر ہیں وہ نکال کے ہمارے آگے پیش کردیتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا واقعہ...... امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ حرم شریف میں بیٹھے ہوئے تھے، بیت اللہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، تو قلب میں علم کا ایک جوش پیدا ہوا، علم کا دریا امڈا، فرمایا کہ: آج جو مسئلہ پوچھو گے میں قرآن سے جواب دوں گا ایک شخص نے آکے عرض کیا کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ حرم میں جیسے سانپ بچھو کو پناہ نہیں ہے ،تتیات بھڑ وغیرہ کو بھی قتل کرسکتے ہیں، تتیات کو بھی پناہ نہیں ہے وہ بھی قتل کئے جاسکتے ہیں۔ جبکہ امام اعظم حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو یہ کہتے ہیں کہ سانپ اور بچھو کو تو حرم میں مار سکتے ہیں لیکن بھڑ اور تتیات کو نہیں مار سکتے انہیں بھی حرم کے اندر امن دیا گیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ تتیات اور بھڑ حرم کے اندر ماری جاسکتی ہیں، تو ایک شخص نے سوال کیا کہ قرآن میں کہاں ہے کہ تتیات اور بھڑ کا قتل حرم میں جائز ہے؟

فرمایا تو نے قرآن نہیں پڑھا! قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ: ﴿وَمَآ اٰتٰـكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْـهُ فَـانْتَهُوْا﴾ ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو لا کے دیں اسے قبول کرو جس کو روک دیں اس سے رک جاؤ، کیا یہ آیت ہے؟ کہا: جی ہاں! آیت ہے۔ فرمایا: قرآن نے جو فرمایا: وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ رسول لا کے دے اسے قبول کرلو اور جس سے رسول روک دیں اس سے رک جاؤ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد قرآن کی اس آیت سے حجت ثابت ہوا کہ جو رسول فرمادیں اس کو مان لیں تو قرآن کی رو سے حدیث حجت ہوئی اور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اِقْتَـدُوْا اِهْتَدَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِىْ اَبَا بَكْرٍ وَّعُمَرَ میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کرو ② تو قرآن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ماننا واجب ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کا حکم ماننا واجب ٹھہرا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: يُقْتَلُ الزَّنْبُوْرُ فِى الْحَرَمِ تتیات بھڑ حرم کے اندر ماری جاسکتی ہیں تو بواسطۂ قرآن یہ حکم ثابت ہوگیا۔

---

① پارہ:۲۸ سورۃ الحشر، الآية: ۷. ② السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر و عمرؓ ج:۱۲ ص:۱۲۱.

تو بعض احکام قرآن سے بلاواسطہ نکلتے ہیں، بعض بواسطۂ حدیث نکلتے ہیں، بعض احکام بواسطۂ اجتہاد و بیان نکلتے ہیں۔ انجام کار یہ سب احکام قرآن ہی کے سمجھے جائیں گے واسطہ بلاواسطہ کا فرق ہوگا۔ تو فقہ و حدیث وغیرہ کا انکار کر کے آدمی فی الحقیقت قرآن کا بھی انکار کرنا چاہتا ہے۔ قرآن کو وہ ہی مان سکتا ہے جو پہلے سنت کو مانے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل کو مانے۔

تو بہرحال بات اس پر چلی تھی میں دور چلا گیا کہ قرآن کریم حق تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام ہے اور مکتوب بھی ہے۔ حق تعالیٰ نے لکھا بھی ہے تکلم بھی فرمایا ہے۔ حقیقی معنوں میں کلام ہے تو...... وہ قرآن ہے۔ تورات کتاب اللہ ہے کلام اللہ اسے مجازاً کہیں گے اور انجیل وہ مضمونِ خداوندی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون القاء کر دیا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اسے ادا کر دیا تو اس کی شان ایسی ہے جیسی حدیث۔ تو حدیث بھی تو وحی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر القاء کی گئی لیکن الفاظ آپ کے ہوتے ہیں اور مضمون حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، تو انجیل بمنزلۂ مضمون خداوندی کے ہے اور تورات بمنزلہ کتاب اللہ کے ہے، تکلم ان کے ساتھ نہیں ہوا۔

کلام خداوندی انمٹ کیوں ہے؟...... قرآن وہ ہے کہ محض کتاب کے طور پر نہیں اُتارا گیا، بلکہ حق تعالیٰ نے کلام بھی کیا ہے تو صحیح معنی میں اگر کلام ہے تو وہ قرآن کریم ہے اور ظاہر یات ہے کہ کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹتا نہیں، وہ قائم رہ جاتا ہے۔ اللہ کا کلام تو اللہ ہی کا کلام ہے...... آپ جو بولتے ہیں وہ بھی نہیں مٹے گا وہ جم کر محفوظ ہو گیا اور قیامت کے روز ایک ایک لفظ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس فضا میں کلام محفوظ ہوگا فضا میں کلام محفوظ ہوتا ہے۔ اسی پر ریڈیو کی ایجاد بنی ہے۔ اگر فضا کے اندر کلام محفوظ نہ ہو تو ریڈیو کے ذریعے کس چیز کو پکڑ کر آپ تک پہنچاتے ہیں، مشینوں کے ذریعہ آپ اس کلام کو کھینچتے ہیں جو فضا کے اندر محفوظ ہے اور لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں، تو اگر کلام زبان سے نکل کر فنا ہو جایا کرتا تو ریڈیو کی ایجاد نہ ہوتی، اور کلام آپ تک نہ پہنچتا، تو وہ فضا میں محفوظ ہو جاتا ہے، فضا سے مشینوں کے ذریعے منتقل کر لیتے ہیں، تو کلام بندہ کرے تو مٹنے والا نہیں ہے ایک ایک لفظ اس کا محفوظ ہے ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ ① کوئی ایک لفظ کوئی ایک قول جو زبان سے نہیں نکالتے مگر تا کنے والا اس کو تاک لیتا ہے، محفوظ کرنے والا محفوظ کر لیتا ہے۔ تو فضا کے اندر یہ سارے کلام محفوظ ہیں۔

حتیٰ کہ سائنس دانوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم ریڈیو اور سائنسی ترقی کے ذریعے ایک نہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ کلام سنوا دیں گے جو انہوں نے حواریوں کے سامنے بطور خطبہ دیا ہے" وہ کہتے ہیں کہ جتنے کلام اب تک انسانوں نے کئے ہیں وہ سب فضا میں محفوظ ہیں، ہم امتیاز نہیں کر سکتے، شور کی صورت میں اس کلام کو سنتے ہیں مگر ہے محفوظ، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ مشینوں کے ذریعے کلاموں کو متمیز کر دیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام

① پارہ: ۲۶، سورۃ ق، الآیۃ: ۱۸۔

ہے، یہ فلاں کا کلام ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہم تمہیں حضرت مسیح علیہ السلام کا خطبہ ایجادات کے ذریعہ سے سنادیں گے۔ تو بہر حال کلام محفوظ ہے مٹنے والا نہیں تو بندے کا کلام جو بولنے کے بعد مٹ نہیں سکتا تو خدا جس کلام کا تکلم کرے وہ کیسے مٹے گا؟

آپ کے کلام کو تو فضا گھیر لیتی ہے لیکن اللہ کا کلام جب چلتا ہے تو فضا کو گھیر لیتا ہے، فضا خود اس کلام میں محفوظ ہے، وہ مٹنے والا نہیں ہے، حتی کہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر یہ لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کرو تو تصور یہ باندھا کرو کہ یہ میں نہیں بول رہا، کلام حق تعالیٰ کا ہے زبان میری حرکت کر رہی ہے، لیکن یہ صوتیہ لفظ اللہ کی طرف سے اُتر رہے ہیں۔ تو فرمایا کہ اس کی مشق کرتے رہو، پڑھتے ہوئے ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارے کان میں آواز آئے گی کہ تم نہیں پڑھ رہے ہو حق تعالیٰ کی آواز ہے، وہ پڑھ رہے ہیں اور جب یہ مشق ہو جائے گی تو: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ① ہمارا نبی ہوائے نفس سے کلام نہیں کرتا ہم وحی کرتے ہیں، تو بولتا ہے تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے، کلام اللہ کا ہوتا ہے، اترتا ہے زبان کے اوپر الفاظ کے واسطہ سے۔ تو اگر کوئی بندہ متبع رسول ہو فنائیت کا مرتبہ اختیار کرے اور اس تصور میں غرق ہو جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کی برکت سے امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں کہ وہ تلاوت خود کر رہے ہیں مگر ان کے کان میں آواز آرہی ہے کہ اوپر سے پڑھا جا رہا ہے، محض زبان میری ہے جو حرکت کر رہی ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ ② تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے جب بندہ کا کلام زبان سے نکل کر نہیں مٹ سکتا وہ برقرار ہے اور باقی رہے گا تو اس کی حفاظت گویا طبعی اور قدرتی ہے تو حق تعالیٰ نے بھی فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ③ ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو یہ محفوظ رہنے والی چیز ہے، کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔

سابقہ کتب کیوں مٹ گئیں اور قرآن کیوں مٹنے والا نہیں؟...... فرق اتنا ہے کہ سابقہ کتب کی حفاظت کا ذمہ دار امتوں کو قرار دیا گیا تھا کہ تورات کی حفاظت تم کرو، انجیل کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اور زبور کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اور وہ انجام نہیں دے سکیں، لفظوں میں بھی فرق کر دیا، معانی میں بھی فرق کر دیا، تحریف لفظی اور تحریف معنوی سب کچھ کر دیا جس سے کلام متغیر ہو گیا تو ضرورت پڑی کہ کوئی مستند کلام بھیجا جائے، سابقہ کتب کو تو ان امتوں نے ضائع کر دیا...... اس لئے کہ حفاظت ان کے ذمہ تھی اور وہ نبھا نہیں سکے جبکہ قرآن آخری کتاب ہے قیامت تک اب کوئی نیا کلام دنیا میں آنے والا نہیں ہے تو اگر وہ بھی آپ کے سپرد کر دیا جاتا اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو تورات وانجیل کا حشر ہوا کہ وہ بدل گئیں اور یہ قیامت تک رکھنا تھا۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳-۴. ② پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳.
③ پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.

اس کے علاوہ اس لئے بھی حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے کہ ہم نے یہ کلام اتارا ہے ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں تو اول تو فطری طور پر کلام ضائع نہیں ہوسکتا ہے مگر آپ کے قلوب سے ضائع ہوسکتا تھا تو حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے لے لیا، سینکڑوں بچے آپ کے مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ میں تعلیم پا رہے ہیں، قرآن حفظ کر رہے ہیں، انہیں کچھ خبر نہیں کہ قرآن کیا چیز ہے! کچھ پتہ نہیں اس کے اثرات کیا ہیں! بس حفظ کر رہے ہیں تو حق تعالیٰ ہی تو حفاظت کر رہے ہیں، ان بچوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں، اگر بوڑھے حفظ کیا کرتے تو وہ حفاظت بوڑھوں کی طرف منسوب ہو جاتی کہ بھائی! بوڑھے آدمی سمجھدار ہیں۔ قرآن کی حفاظت کے لئے یاد کر رہے ہیں لیکن بچوں میں تو یہ جذبہ نہیں، یہاں محض حفاظت خداوندی ظاہر ہو رہی ہے کہ ہم حفاظت کر رہے ہیں جو بچوں کے ذریعے سے قرآن کو محفوظ رکھا ہے۔ اور معانی کی حفاظت علماء کے ذریعے کی اور فرمایا کہ:

﴿بَلْ هُوَ ايٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ① یہ آیات بینات ہیں جن کے حقائق اور مضامین اہل علم کے سینوں میں ڈالے گئے ہیں۔ وہ وہاں محفوظ ہیں، مٹ نہیں سکتے، حفاظت گاہ ایسی چیز کو قرار دیا گیا کہ نہ وہاں چور پہنچ سکتے، نہ ڈاکو پہنچ سکتے، نہ کوئی خائن پہنچ سکتے، وہ دلوں میں محفوظ ہیں، وہاں چوروں کی رسائی ہی نہیں ہے، اگر لوہے کے صندوقوں میں معانی محفوظ کئے جاتے تو ممکن تھا کہ لوگ صندوقوں کو دریا برد کر دیں، ممکن تھا زمین میں دفن کر دیں، ممکن تھا کہ زمین صندوقوں کو بھی گلا دے اور اوراق بھی گلا دے، کوئی چور چوری کر کے لے جائے تو قرآن ضائع ہو جاتا۔ تو نہ صندوق میں حفاظت کی، نہ الماریوں میں، بلکہ اہل علم کے سینوں میں حفاظت کی، جہاں نہ چور پہنچ سکتا ہے نہ ڈاکو۔ یہ حفاظت خداوندی ہے کہ بچوں اور علماء کے ذریعے سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا ہے تو یہ اسباب حفاظت ہیں، حفاظت کرنے والے وہی ہیں، جیسے خالق وہ اللہ ہیں سبب تخلیق آپ ہیں، درخت بنانے والے وہ ہیں سبب کاشتکار کو بنا دیا۔ تو حفاظت کرنے والے قرآن کے وہ ہیں سبب حفاظت آپ کو بنا دیا۔ یہ آپ کی سعادت ہے جو بھی سبب بن جائے۔ یہ انگلی کاٹ کے شہیدوں میں داخل ہونا ہے، محفوظ تو رہنا ہی ہے یہ کلام، مٹنے والا تو ہے نہیں، آپ ذریعہ بن جائیں تو ہماری سعادت ہے ورنہ رہے گا محفوظ، تو بہر حال کلام خداوندی معجزہ ہے نہ اس کی کوئی مثل لا سکتا ہے نہ اسے کوئی ضائع کر سکتا ہے۔

قرآن کی دو سندیں، سند باطنی...... جہاں تک اس کی سند کا تعلق ہے وہ بھی حق تعالیٰ نے ایسی مستحکم بنائی ہے کہ اس میں خلل اندازی ممکن نہیں۔ قرآن کی سند کے دو درجے ہیں ایک اللہ سے نبی تک اور ایک نبی سے ہم تک۔ ایک باطنی سند ہے اور ایک ظاہری سند ہے۔ باطنی سند تو یہ ہے کہ اللہ نے کلام کیا جبریل علیہ السلام نے سنا اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کو سنایا اور ان) کے قلب مبارک پر لا کے اتار دیا تو جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کا تعلق ہے وہ تو بنائے اخلاص ہے، کمالات کا منبع و مخزن ہے، وہاں سے ہر چیز انتہائی امانت کے

① پارہ: ۲۱، سورة العنكبوت، الآية: ۴۹.

ساتھ سرزد ہوگی، اس میں معاذ اللہ کوئی غلط چیز شامل نہیں ہو سکتی۔ تو حق تعالیٰ شانہ تو امین ہی ہیں، اب بیچ میں نازل فرشتہ ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ بے چارہ معصوم ہے، لہٰذا ہمارا کلام تمہیں قبول کرنا پڑے گا، دباؤ سے نہیں منوایا بلکہ جبریل کے اوصاف بیان کئے جو ناقلوں کے اوصاف ہوتے ہیں، تاکہ تم عقلی اور فنی طور پر یہ سمجھ سکو کہ یہ راوی غلط قسم کا راوی نہیں ہے بلکہ جتنے اصول روایت ہیں وہ سب اس کے اندر پائے جاتے ہیں، ورنہ یہ فرما دیتے کہ کلام ہمارا ہے اور ہمارا فرشتہ لے کر آتا ہے جب آئے گا ماننا پڑے گا کوئی وجہ نہیں کہ انکار کرو، یہ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا کہ راوی کو پرکھ لو، اس کے اوصاف کو دیکھ لو، راویوں کے اوصاف اس میں پائے جائیں تو قبول کرو، نہ پائے جائیں تو نہ قبول کرو تو جبریلؑ کے اوصاف بیان کئے ہیں، سورہ ''اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ'' میں یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ﴾ ① یہ ایک رسول کا قول ہے یعنی حضرت جبریل کا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک لے کر آئے تو اول تو رسول کہنے سے جبریلؑ کی امانت ظاہر ہوتی ہے اس لئے کہ اللہ نے انہیں قاصد بنایا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت اپنا قاصد، اپنا سفیر اسے نہیں بنا سکتی جس میں ذرہ برابر بغاوت کا کوئی شائبہ ہو۔ حکومت اپنا سفیر اسی کو بنائے گی جو حکومت کی پالیسی کا محافظ ہو، حکومت کے قانون کا دل وجان سے دلدادہ ہو، ذرّہ برابر خیانت نہ کرے، حکومت کا جو منشا ہے اس کو دنیا کے آگے پیش کر دے، تو اوّل تو کسی کو قاصد بنا دینا، یا سفیر بنانا یہ خود قابل اعتماد ہونے کی دلیل ہے۔ جب حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہمارا قاصد ہے، ہمارا رسول ہے، تو قاصد کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو اس کے اوپر اعتماد ہے۔ تو پہلی چیز تو یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں قابل اعتماد شخصیت ہیں جنہیں سفیر کے درجے کا اعتماد حاصل ہے۔

سندِ قرآن پر اعتراضات کے جوابات...... لیکن آدمی کہہ سکتا تھا کہ قاصد تو بنایا مگر قاصدوں میں بعض دفعہ کھوٹ ہوتا ہے، کچھ بدل بھی جاتے ہیں ممکن ہے کلام کو بدل دیں یا اس کے منشاء کو بدل دیں۔ تو ایک جملہ آگے فرمایا کہ: ﴿اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ﴾ ② وہ فقط رسول ہی نہیں ہیں بلکہ کریم النفس بھی ہیں، بزرگی کے آثار ان میں رچے ہوئے ہیں تو بزرگ آدمی کیسے جھوٹ بولے گا! ایک ادنیٰ صالح کو جسے آپ بزرگ کہتے ہیں کبھی آپ کو شبہ بھی نہیں گزرتا کہ یہ جھوٹ بولے گا تو فرشتہ معصوم ہو کر جھوٹ بول دے وہ بھی اللہ کے اوپر بزرگ بن کر یہ ناممکن ہے تو فرمایا کہ رسول کا قول ہے، رسول بھی کریم ہے، کرامت والا ہے جس میں بزرگیاں رچی ہوئی ہیں۔

مگر کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی، کریم النفس بھی سہی لیکن بے چارہ ضعیف ہے، دبّو قسم کا آدمی ہے، جہاں کسی نے تلوار دکھائی بدل گیا کہ یہ نہیں یہ مطلب تھا، جان بچانے کے لئے جھٹ مطلب کو بدل دیا تو اگر کوئی بزرگ ہو، ہو بے چارہ ضعیف النفس، تو اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دباؤ سے کلام بدل دے یا مضمون کو بدل دے تو جبریلؑ میں بھی ممکن ہے ضعف ہو جو ایسے کلام کو بدل دیں۔ اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿اِنَّهٗ

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹۔

﴿لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ﴾ ① طاقتور ہے، دَبُّو قسم کا آدمی نہیں کہ کسی کے دباؤ ڈالنے سے بات بدل دے۔ تو حضرت جبریلؑ کی طاقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کی قوم کی جب بستیاں اٹھا کر آسمان پہ لے جا کے پٹخ دیں تو اتنا طاقت ور کسی سے دب کر غلط بات کہہ سکتا ہے! کون اس کے اوپر دباؤ ڈال سکتا ہے! تو فرمایا گیا کہ رسول بھی ہے، بزرگ بھی ہے، کریم النفس بھی ہے اور طاقت ور بھی ہے، دَبُّو قسم کا آدمی نہیں ہے کہ دباؤ ڈالنے سے کسی کی بات مان لے یا بات کو بدل دے۔

لیکن اس پر بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! رسول بھی سہی، کریم النفس بھی سہی اور طاقتور بھی سہی مگر سننے میں بھی تو غلطی ہو سکتی ہے، دور سے آواز آ رہی ہے، معلوم نہیں کیا سن لیا ہو؟ کہا کچھ تھا..... اور سننے میں آ گیا کچھ، کوئی پاس اور قریب ہو تو بے شک یہ ممکن نہیں ہے کہ غلطی ہو، مگر ایک شخص نے دور سے سنا ہے تو کتنا ہی نیک نیت ہو سماعت میں تو فرق آ سکتا ہے، کچھ کا کچھ سن لے! اس لئے ایک جملہ اور بڑھایا کہ: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ﴾ ② کہ مقام عرش کے پاس مقیم ہے کہیں دور نہیں ہے اس لئے ممکن نہیں ہے کہ سماعت میں غلطی ہو وہیں تو اس کا مقام ہے وہ تو ہمارے ہاں کا حاضر باش ہے جو ہم کہتے ہیں بلا واسطہ وہ سنتا ہے، ممکن نہیں کہ غلطی کرے۔ تو اتنے اوصاف بیان فرما دیئے۔

اس کے بعد یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ کہیں کہ صاحب! بے شک رسول بھی ہے، کریم النفس بھی ہے، طاقت ور بھی ہے، عرش کے پاس مقیم بھی ہے، لیکن پوزیشن کچھ معمولی قسم کی ہے لوگ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے، کوئی باحیثیت ہو، کوئی منصب اور مقام اس کے پاس ہو تب تو بات قابل اعتبار ہوتی، ایک بات کہہ دے ایرا غیرا نتھو خیرا تو اس کی کیا وقعت ہوگی؟ کوئی پوزیشن، منصب اور حیثیت ہونی چاہیے۔ تو ایک جملہ اور بڑھایا کہ مُطَاعٍ سید الملائکہ ہیں، سارے ملائکہ سلام اللہ علیہم کے سردار ہیں۔ تو جو سارے معصوموں کے سردار ہوں اور ان کے اوپر انہیں والی بنایا گیا ہو ان کی عصمت میں کیا کمی رہ سکتی ہے! جو سارے فرشتوں کے مخدوم و مطاع ہوں ان کے کلام میں غلطی کیسے ممکن ہے! تو رسول بھی ہے، کریم النفس بھی ہے، طاقتور بھی ہے، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہے، سننے میں بھی غلطی نہیں ہے اور مُطاع وسید الملائکہ بھی ہیں۔

لیکن اس کے بعد پھر ایک شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ سارے اوصاف سہی مگر نسیان اور بھول چوک ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے، ممکن ہے بھول کے کچھ کا کچھ کہہ دیا ہو، یا ارادتاً کچھ کمی بیشی کر دی ہو کہ بھئی وقت کے مناسب یہ ہے، لہٰذا اس کی یہ تاویل کر دو، زمانہ حال کے لوگ ہیں، پرانے زمانے کے لوگوں کے محاوروں کو سمجھیں گے نہیں کوئی محاورہ ہی بدل دو تو آگے ایک اور جملہ بڑھایا کہ: ﴿ثَمَّ أَمِيْنٍ﴾ ③ وہ نہایت امانتدار ہے، ممکن نہیں کہ لب و لہجے میں بھی

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۰۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۱۹-۲۰۔
③ پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۱۔

کوئی فرق کرے، ممکن نہیں ہے کہ الفاظ میں فرق کرے یا معانی میں فرق کرے۔ اب یہ سارے اوصاف ظاہر ہے کہ راویوں کے ہیں۔ تو حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجبور ہو کر اور دب کر مانو کہ یہ قرآن ہے بلکہ بصیرت سے اسے قبول کرو کہ اس کے راوی کیسے ہیں سند میں تو کوئی غلطی نہیں۔

پیغام رسانی میں جھوٹ اہل کفر بھی عیب سمجھتے ہیں چہ جائیکہ اہل ایمان......سند میں کوئی غلطی ممکن نہیں

اوّل تو یہ ہمارا قاصد ہے جو کہ خود معتمد علیہ ہونے کی دلیل ہے پھر اپنی ذات سے بزرگ اور کریم النفس بھی ہے تو کریم النفس لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ یہ تو کمال ایمان کی بات ہے میں تو کہتا ہوں کفار بھی اپنی حیثیت عرفی سنبھالنے کے لئے اس کی رعایت کرتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں چاہے دنیاداری کے مجمع میں ہوں۔

ابوسفیان ہرقل کے دربار میں...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام جب عظیم روم کے نام پہنچا ہے تو ہرقل نے کہا کہ عرب کے کچھ لوگ آئے ہوں تو ان کو ذرا جمع کر دو، میں ان کے حالات پوچھوں جنہوں نے دعوائے نبوت کیا ہے۔ تو اس کے سامنے عربوں کا وفد پیش ہوا اس وفد کی قیادت ابوسفیان کر رہے تھے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ انہیں آگے کھڑا کیا باقی جو عرب تھے انہیں پیچھے کھڑا کیا گیا اور ہرقل نے کہا کہ میں تمہارے قائد سے سوال کروں گا اگر یہ صحیح کہے گا تو تم سب کی طرف سے صحیح تسلیم ہوگا اگر غلط کہے تو تم لوگ ٹوک دینا۔

ابوسفیان سے ہرقل نے چند سوالات کئے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ کبھی اس (مدعیِ نبوت) شخص کا تم پر جھوٹ ثابت ہوا؟ کبھی عمر بھر میں کوئی غلط بات کہی ہو؟ اگر کبھی ایک جھوٹ بھی ثابت ہو تو یہ کہہ سکیں گے کہ دعویٰ نبوت میں وہ غلط ہے۔ تو ابوسفیان کہتے ہیں کہ اب مجھ کو کشمکش و پیچ ہوئی اس لئے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانتے تو تھے نہیں، ہو سکتا تھا کہ دُور کا فاصلہ ہے، شام میں بات چیت ہو رہی ہے کوئی غلط بات منسوب کر دیتے کہ ہاں صاحب! فلاں بات غلط ثابت ہوئی ہے، لیکن انہوں نے دل میں کہا: اگر میں نے ایک جھوٹ بول دیا تو میری جو حیثیت عرفی ہے وہ ختم ہو جائے گی، اس لئے مجھے سچ بولنا چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ: ہم نے کبھی جھوٹ کے اوپر تجربہ نہیں کیا۔ گنجائش اتنی نکلی کہ اکثر کی تو بات یہی ہے باقی میرے آنے کے بعد جھوٹ بول دیا ہو تو یہ الگ بات ہے، اس کے سوا کوئی جملہ نہیں کہہ سکے۔ ① تو ابوسفیان کو کفر کے باوجود اس کی رعایت ان کے ذہن میں تھی کہ کوئی جھوٹ کا کلمہ نہ نکلے ورنہ میری حیثیتِ عرفی بگڑ جائے گی۔

تو ایک کافر جب پیغام رسانی میں جھوٹ بولنے کو عیب سمجھتا ہے تو ایک مؤمن کیسے عیب نہیں سمجھے گا اور مؤمن بھی فرشتہ جو ایمان کی حدِ کمال کے اوپر ہو، وہ کیسے جھوٹ بولے گا! وہ کیسے امانت میں خیانت کرے گا! تو حق تعالیٰ نے دباؤ نہیں ڈالا کہ چونکہ ہم بھیجتے ہیں لہٰذا ماننا پڑے گا، نہیں! بلکہ جسے بھیج رہے ہیں اس کے احوال کو دیکھو، اس کے اوصاف کو دیکھو، وہ اوصاف پر پورا اترتا بھی ہے کہ نہیں تو اللہ تعالیٰ تو بے عیب ہے، منبع کمال ہے، وہاں تو غلطی

① الصحیح للبخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم، ص: ۱ رقم: ۷.

کا امکان ہی نہیں، بیچ میں امکان تھا تو فرشتے کے اوصاف بیان کئے کہ وہ راوی غلط نہیں ہوسکتا۔

کلام اللہ کو تین امانتوں نے گھیر رکھا ہے...... اب تیسری ذات وہ ہے جس پر کلام اترا وہ پیغمبر ہیں۔ پیغمبر حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو سارے انبیاء کے کمالات کا نچوڑ اور سارے کمالات کا منتہاء ہیں، کوئی کمال ایسا باقی نہیں ہے کہ کسی اور نبی کو لاکر اسے پورا کرایا جائے۔ ایک نبی میں وہ سارے کمالات جمع کر دیے گئے اور قیامت تک ایک ہی آفتاب کی روشنی باقی رہے گی، ان پر وہ کلام اُترا تو نبی معصوم، فرشتہ معصوم، اور حق تعالیٰ منبع کمالات۔ تو مروی عنہ جس سے روایت چلی (اللہ تعالیٰ) وہ بے عیب، فرشتہ جو کلام لے کر آیا وہ بھی معصوم وامانت دار اور جس پیغمبر پر لے کر آیا وہ سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جن کی عظمت میں کلام نہیں۔ اللہ کے ناموں میں ایک نام امین ہے تو اللہ الامین کی طرف سے کلام اترا اور جبریل کا لقب بھی امین ہے، کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امین کہتے ہیں۔ تو امین نے کلام کیا، امین لے کر آیا اور امین کے اوپر اترا۔ تین (اعلیٰ درجے کی) امانتوں میں اوپر سے نیچے تک گھرا ہوا ہے، پھر اس میں غلطی کا احتمال کیا ہے! پھر بھی اگر آدمی نہ مانے تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ نے کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا، اوصاف بیان کر دیے ہیں کہ ان اوصاف کا راوی غلط نہیں ہوسکتا، اس لئے ماننا چاہیے، آدمی کے دل میں انصاف ہو تو مانے گا۔

سندِ کلام اللہ میں ذاتِ نبوت کا مقام...... اب آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی ہے تو آپ کے اوصاف شروع کئے۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ نبی ہیں مان لو۔ بے شک اگر نبی کہہ کر منواتے تو ماننا پڑتا کیونکہ نبی کے معنی ہی یہ ہیں کہ جھوٹ سے بری اور بالا ہو۔ مگر آپ کے بھی اوصاف بیان کئے فرمایا: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ﴾ ① جن پر یہ کلام اترا ہے کوئی جنونی تھوڑے ہی ہیں، یہ تو خود سرچشمۂ عقل ہیں اور یوں جنون کی نفی کر دی۔ اب رہا یہ کہ عقلمند کیوں نہ کہہ دیا، بجائے اس کے کہ جنون کی نفی کر دی جائے...... یوں کہہ دیا جاتا کہ آپ بہت بڑے عقل مند ہیں، یہ نہیں فرمایا؟ اس لئے کہ عقل مند کہنے سے شبہ ہوتا: آیا فلسفیوں میں سے کوئی فلسفی ہیں؟ جب کہ نبی اور فلسفی میں بونِ بعید ہے، عقل مند ثابت کرنے کے معنی یہ تھے کہ آپ کو فلسفی ثابت کیا جائے اور نبوت وفلسفہ میں بُعد ہے، اس لئے جنون کی نفی کر دی یہ کہ کوئی مجنون تھوڑا ہی ہیں! باقی یہ ہے...... عَلٰى سَبِيْلِ التَّنَزُّلِ جب کسی بڑے آدمی کا کلام منوایا کرتے ہیں جس کے سب اوصاف مسلّم ہوں تو یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کام کرنے والا کوئی دیوانہ تھوڑا ہی ہے، اس کی بات ماننا کیوں نہیں! تو جنون کی نفی درحقیقت ساری برائیوں کی نفی ہے تو آپ کی یہی شان بیان فرمائی کہ: ﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ﴾ ② اب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے جو روایت سنی ہے وہ انہی سے سنی بھی ہے یا محض اپنے تخیل سے معاذ اللہ کچھ کہہ دیا ہے! تو فرمایا کہ: صرف سنی ہی نہیں ہے بلکہ راوی کو دیکھا بھی ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ﴾ ③ تو صرف سماع ہی نہیں

① پارہ: ۳۰، سورۃ التكوير، الآية: ۲۲. ② ③ ايضاً الآية: ۲۳.

دیدار بھی ثابت ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ نے اصلی صورت میں دیکھا ہے تو اب جب راوی کو دیکھا بھی ہو، اس کی بات سنی بھی ہو اور پاس بیٹھ کر سنی ہو...... تو سنانے والا بھی امین، سننے والا بھی امین، بھیجنے والا بھی امین، امانتوں میں گھرا ہوا کلام اور راوی اور مروی عنہ دونوں صاحب کمالات، تو اب خطاء کا احتمال کیسے ہوسکتا ہے! اب خواہ مخواہ عناد سے کوئی انکار کرے تو کرے! لیکن اصول کی رُو سے انکار جائز نہیں ہے۔ تو جبریل کو دیکھا بھی ہے، اس سے کلام سُنا بھی ہے تو سماع و دیدار کے ساتھ روایت کر رہے ہیں۔

اب یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ بات تو ساری سچی سنی اور واقعی پورا کلام لے لیا مگر آگے کہنے میں ذرا بخل ہے کہ بھئی! ہر ایک کو میں اپنا علم کیوں دوں! بہت سے صاحب کمال ہوتے ہیں کہ فن آتا ہے مگر سکھلاتے نہیں کہ کہیں دوسرا میرا ہمسر نہ ہو جائے! میں ہی تنہا اور یکتا رہوں! ہزاروں آدمی اپنے اپنے کمالات کو قبر میں لے گئے اور دنیا میں ان کا نشان بھی نہیں۔ بڑے بڑے اطباء بہترین نسخے اپنے سینے میں رکھ کر لے گئے! کسی کو نہیں بتلائے...... تو گویا صاحبِ فن نے بخل برتا، ممکن ہے یہاں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہو تو فرمایا گیا: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ ① غیب کی چیزیں پہنچانے میں وہ بخیل نہیں۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ غائب کی چیزوں کو آگے پہنچایا جائے تا کہ ہر چیز کی تمہیں ہدایت ملے۔ اب یہ ممکن تھا کہ کوئی یوں کہتا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درست سنا تھا مگر ممکن ہے کہ شیطان نے بیچ میں کوئی کلمہ ملا دیا ہو تو وہ خلط ملط ہو گیا ہو آگے اس کی بھی نفی فرما دی کہ: ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيمٍ﴾ ② تو شیطان کا کیا دخل! جب قرآن کی وحیِ خداوندی چلنی شروع ہوئی تو شیطان کے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ شیاطین آسمانوں کے دروازوں تک جاتے تھے، ملائکہ کی کبھی کبھار کوئی بات سن کر اس میں سو جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو پیش کر دیتے تھے، کوئی ایک آدھ بات سچی بھی نکل آتی تھی تو لوگ معتقد ہو جاتے تھے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے کہ شیطان آسمان پر اس طرح جاتے تھے اور کچھ جھوٹ ملا کے دعویٰ کیا کرتے تھے لیکن ان کے راستے بند کر دیے گئے کہ اب تک تو آسمانوں کے دروازوں سے چڑھتے تھے اب چڑھ بھی نہیں سکتے خلط ملط تو وہ کیا کرتے، تو شیطان کا دخل بھی نہیں ہے۔

کلام بھی امین کا ہے اور پہنچانے والا بھی امین، امین بھی ایسا کہ کلام کے پہنچانے میں بخیل بھی نہیں بلکہ پہنچانے کا خود اس نے حکم دیا ہے: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً" ③ ایک جملہ، ایک بات اور ایک آیت بھی میں کہہ دوں تو دوسروں تک پہنچا دو۔ بخل مت کرو اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو نصائح ارشاد فرمائیں اس میں صاف واضح طور پر فرمایا کہ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ ④ جو حاضر ہے وہ غائبین کو میرا پیغام پہنچا دے تو

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۴۔ ② ایضاً، الآیۃ: ۲۵۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ذکر عن بنی اسرائیل، ص: ۵۸۲ رقم: ۳۴۶۱۔

④ الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب الخطبۃ فی ایام منیٰ، ص: ۱۳۶ رقم: ۱۷۳۹۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا اہتمام کیا اور ایک ایک روایت حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی...... امت تک پہنچائی۔تو بہرحال قرآن پاک کی سند کا ایک باطنی درجہ ہے کہ وہ اللہ سے چلی فرشتہ پر آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچی، وہ سند بے عیب اور بے غبار ہے۔

سندِ ظاہری...... اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کس طرح پہنچائیں؟ اُمت کو تو آپ نے پہنچایا اور انتہائی امانت، دیانت اور سخاوت کے ساتھ پہنچایا کہ ایک ایک لفظ، زبر، زیر حتیٰ کہ صوت اور آواز تک بھی پہنچا دی، پھر صحابہ رضی اللہ عنہ نے اسی اہتمام سے تابعین کو پہنچایا، تابعین نے اسی اہتمام سے تبع تابعین کو پہنچایا، انہوں نے اپنے اَتباع کو پہنچایا...... یہاں تک کہ وہ کلام ہم تک پہنچ گیا۔تو خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن میں (روایت کرنے والا طبقہ) تَوَاتُر طبقہ ہے، ایک ایک آدمی روایت نہیں کرتا بلکہ ہر زمانے میں لاکھوں لاکھوں آدمی روایت کرتے آ رہے ہیں اور محض روایت نہیں بلکہ ان کے سینوں میں بھی محفوظ ہے اور صرف سینوں میں محفوظ نہیں بلکہ وہ قرآن کے ساتھ حمائل بنے ہوئے ہیں کہ جو ذوق قرآن کا ہے وہ اہل علم نے اپنا ذوق بنالیا ہے۔تو قرآن کا ذوق بھی پیدا کیا اس لئے کھوٹ کی، غلطی کی، خیانت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سندِ قرآن پر قانوناً بھی اعتراض نہیں کیا جاسکتا...... تین چار آدمی مل کر اگر کوئی بات کہیں تو ہم قانوناً ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ لاکھوں کروڑوں ہر زمانے میں جو قرآن پڑھ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو، وہ تو سینوں میں محفوظ ہے اور حفاظت کا یہ حال ہے کہ اس کی سورتیں گنی ہوئی ہیں، نہ زیادتی ممکن نہ کمی ممکن، علامات اور آیات بھی اس کی گنی ہوئی کہ قرآن میں کتنی آیتیں ہیں۔ان آیتوں کے حروف الگ گنے ہوئے ہیں کہ اتنے حروف ہیں، کل آیتوں کے اعراب تک گنے ہوئے ہیں کہ اتنے زبر، اتنے زیر، اتنے پیش، اتنے تشدید اور اتنے جزم۔اس حفاظت کیساتھ کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر کمی بیشی ہو یا کوئی جرأت کرے کہ ایک آدھ لفظ بڑھا دے یا اس میں سے گھٹا دے، کوئی ایک آدھ ہی ایسا احمق اور بے وقوف ہوگا جو تبدیلی کرے، مگر امت اسے نہیں مانے گی اور اس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔

جیسے ایک صاحب کاتب تھے۔ان کی عادت تھی کہ جو چیز ان سے نقل کروائی جاتی اس میں اپنی طرف سے کچھ گھٹاتے بڑھاتے ضرور تھے، لوگ سمجھتے تھے کہ فلاں کاتب کو کوئی مسودہ وغیرہ مت دینا، وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دیتا ہے۔تو قرآن شریف انہیں لکھنے کو دیا گیا کہ بھئی! اس کی نقل کر دو اور یہ کہہ دیا گیا کہ دیکھو یہ اللہ کا کلام ہے اس میں کمی بیشی ممکن نہیں، کوئی لفظ گھٹانا بڑھانا نہیں، اگر تم نے گھٹایا بڑھایا تو تم جہنمی بن جاؤ گے۔قرآن تو غلط نہیں ہوگا پھر صحیح ہو جائے گا مگر تمہاری عاقبت خراب ہو جائے گی وہ کہنے لگے: صاحب! یہ کلام خداوندی ہے، اس میں کمی بیشی کیسے کر سکتا ہوں، یہ تو لوگوں کے کلام میں...... میں اپنی مرضی سے کچھ گھٹا بڑھا دیتا ہوں۔خیر انہوں نے لکھا، لکھ کر لائے تو بہت خوش قلم، پوچھا: کہ بھئی! گھٹایا بڑھایا تو نہیں؟ کہا: نہیں بالکل نہیں! بھلا خدا کا کلام ہے، اس

میں کیسے کمی زیادتی کرسکتا ہوں، ہاں تھوڑی سی کمی بیشی میں نے کر دی ہے وہ یہ کہ قرآن کے اندر کہیں فرعون کا نام کہیں ہامان کا نام اور کہیں قارون کا نام تھا، یہ نام کیسے؟ یہ بڑے بڑے فُسّاق! بھلا قرآن اور اس میں کافروں کا ذکر، ہاں بس میں نے ان کے نام مٹا کے کہیں آپ کا نام، کہیں آپ کے والد ماجد کا نام لکھ دیا اور کہیں آپ کے دادا کا نام۔ بس اتنا تو کیا اور کچھ نہیں کیا۔ تو ایسا کوئی احمق ہو تو کچھ گھٹا بڑھا دے وہ اپنی عاقبت خراب کرتا ہے کوئی مانتا نہیں ہے۔ ہزاروں پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے تحریف کرنا چاہی ہوگی مگر وہ مٹ چکے ہیں ان کا نام ونشان تک نہیں قرآن اسی طرح اپنی جگہ ہے۔

حدیث ازروئے قرآن محفوظ ہے...... حدیث کے انکار کرنے والے بہت سے پیدا ہوئے۔ پہلے وضّاعین (احادیث کو وضع کرنے والے) پیدا ہوئے۔ انہوں گھڑ گھڑ کے حدیثیں ملائیں تاکہ اصل حدیث پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔ محدّثین کرام کو اللہ جزائے خیر دے! انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا اور ایسے اصول وضع کردیے، ایسے کانٹے ہاتھ میں دے دیئے کہ ممکن نہیں غلط روایت صحیح حدیث میں مل جائے۔ کانٹے سے پہچان سکتے ہیں۔ تو قرآن بھی محفوظ اور حدیث بھی محفوظ۔ اور اللہ نے اس کا وعدہ دے دیا ہے ایک تو یہ فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ ① ہم نے قرآن اتارا اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ حدیث بھی محفوظ ہے کیونکہ وحی جب اترتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے جلدی جلدی رٹنا شروع کرتے تاکہ بھول نہ جائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی لفظ رہ جائے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ﴾ ② اے پیغمبر! اپنی زبان کو حرکت مت دو! جلدی مت کرو! یہ جو آپ کو خطرہ ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں تو اس کا وعدہ دیا کہ: ﴿اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ﴾ ③ یہ ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کے سینے میں جمع بھی کردیں گے اور پڑھوا بھی دیں گے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں بلکہ آپ سنتے رہیں۔ ﴿فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ﴾ ④ جب ہم (بواسطہ فرشتہ روح الامین) قرآت کیا کریں آپ سنتے رہیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کے قلبِ مبارک میں جمع کردیں۔ کوئی غلطی ممکن نہیں اور نہ صرف جمع کردیں گے بلکہ آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں گے، اُسی طرح سے ادا بھی کرادیں گے۔ تو قرآن ظاہر بات ہے کہ اپنے لفظوں کے لحاظ سے محفوظ ہوگیا، ﴿اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ﴾ ⑤ سے اللہ نے گارنٹی دے دی، جَمۡعَهٗ کے لفظ سے یہی مراد ہے کہ جمع بھی کردیں گے۔ تو جمع تو لفظ ہی کئے جاتے ہیں۔ وَقُرۡاٰنَهٗ اور پڑھوا بھی دیں گے۔ تو لفظ ہی پڑھے جاتے ہیں معنی پڑھے نہیں جاتے تو لفظوں کے جمع ہونے کی گارنٹی دی اور یہ کہ آپ کی زبان سے ادا بھی کرادیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے میں جمع بھی کردینگے۔ اب رہ گئے آگے معانی! کہ اس کا مطلب کیا؟ اس سے مراد کیا؟

---

① پارہ: ۱۴، سورة الحجر، الآية: ۹. ② پارہ: ۲۹ سورة القيامة، الآية: ۱۶. ③ ايضاً، الآية: ۱۷.
④ ايضاً، الآية: ۱۸. ⑤ ايضاً، الآية: ۱۷.

اس کی بھی گارنٹی دی، فرمایا: ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ① پھر ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کر دینا بھی ہے کہ مراد کیا ہے اور مطلب کیا ہے! ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی، اس کے معانی کی ذمہ داری بھی حق تعالٰی نے لی تو لاکھ کوئی تحریف معنوی کرے، جاہلانہ تاویلات کرے لیکن وہ چلنے والی نہیں ہیں۔اس لئے کہ خدا کی حفاظت شامل حال ہے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ'' ② آپ نے وعدہ دیا کہ امت کے اندر سلف کے بعد خلف پیدا ہوتے رہیں گے، وہ کیا کریں گے؟ وہ علمِ خداوندی اور جو آیت وروایت ان تک پہنچی ہیں ان میں غلو کرنے والوں کے غلو کا پردہ چاک کر دیں گے کہ یہ معنی محبت وعداوت اور غلو کی وجہ سے لیے گئے ہیں، باطل پسندوں اور باطل پرستوں کی جو دروغ باطنیاں ہیں انہیں وہ کھول کر رکھ دیں گے، وہ اغلاط عیاں ہو کر دنیا کے آگے آجائیں گی۔ یہ ممکن نہیں کہ قرآن کے معانی میں خلط ملط کر دیں۔لوگ جاہلانہ تاویلات کتنی کریں لیکن پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا ،لفظوں اور معانی دونوں میں کوئی تحریف ممکن نہیں، دونوں کی ذمہ داری حق تعالٰی نے لی ہے۔

قرآن علمی معجزہ ہے.....تو قرآن کریم کا ایک وصف تو ثابت ہوا کہ وہ معجزہ ہے، اس کی کوئی نظیر نہیں لاسکتا، اس کی کوئی مثل نہیں بنا سکتا، وہ جامعیت کوئی پیدا نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ جامعیت علم سے متعلق ہے اور بندے کا علم جامع تو کیا ہوگا! پورا علم بھی نہیں: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ ③ لوگ اس کے علم کو نہیں لا سکتے مگر وہ جتنا چاہے دے دے اتنا لے لیں گے۔تو اوّل تو وہ علم عطائی اور پھر وہ بھی قلیل۔سب سے زیادہ علم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے کہ آپ اعلم الخلائق ہیں، اعلم البشر ہیں دنیا میں علم کے اندر آپ کا کوئی مثل نہیں ہے لیکن آپ خود فرماتے ہیں کہ اللہ کے علم کے سامنے میرے علم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اتھاہ سمندر کے کنارے پر ایک چڑیا چونچ ڈالے اور اس کو کچھ تری لگ جائے !وہ نسبت ہے میرے علم کو اللہ کے علم سے۔تو جب علمِ خداوندی کے سامنے اعلم الخلائق کے علم کا یہ حال ہے تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ تو جس کا علم اتنا جامع ہوگا اس کا کلام معجزہ ہی ہوگا دوسرے کا کلام معجزہ نہیں ہو سکتا کہ اس جیسا کلام نہ لاسکے تو پہلی چیز تو یہ ثابت ہوئی کہ وہ معجزہ ہے۔

قرآن دلیل ختم نبوت بھی ہے.....دوسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ وہ فطرتاً محفوظ ہے کیونکہ کلام وہی ہے دوسری کتابیں کلام نہیں اور کلام جب متکلم کی زبان سے نکل جاتا ہے تو پھر مٹ نہیں سکتا۔وہ خلا (فضاء) کے اوپر حاوی ہے، خلا کے اندر محفوظ ہے۔تو محفوظ ہونا بھی معجزہ ہے، دنیا کی کسی قوم کے ہاتھ کسی پیغمبر کا کوئی معجزہ موجود نہیں ہے۔ایک امت اسلامیہ ہے جس کے ہاتھ میں معجزہ موجود ہے اور معجزہ نبوت کی دلیل ہوتی ہے، معجزے سے ہی

---

① پارہ: ۲۹ سورۃ القیامۃ،الآیۃ: ۱۹ ۔ ② السنن الکبریٰ للبیھقی، کتاب الشھادات، باب الرجل من اھل الفقہ ج: ۱۰ ص: ۲۰۹ . مشکوۃ المصابیح، کتاب العلم،الفصل الاول ج: ۱ ص: ۵۳ رقم: ۲۴۸ . ③ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵ .

پہچانا جاتا ہے کہ یہ نبی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاند کے دوٹکڑے کر دیئے تو پہچانا گیا کہ آپ پیغمبر ہیں، خلاف عادت جو کام آپ کے ہاتھ پر ہوا دنیا وہ کام نہیں کرسکتی۔ ہزاروں معجزات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ظاہر ہوئے۔ تو معجزہ دلیل نبوت ہوتی ہے جس سے نبی کو پہچانا جاتا ہے لیکن پچھلے انبیاء علیہم السلام کو جتنے معجزات دیئے گئے اس سے ہزاروں گنا زائد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیئے گئے مگر وہ عملی معجزات تھے اور عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب عامل دنیا سے رخصت ہوتا ہے اس کا عمل بھی ختم ہو جاتا ہے تو پچھلے انبیاء کرام کو معجزات عملی دیے گئے تھے تو جب وہ دنیا سے پردہ کر کے چلے گئے ان کے معجزات بھی ختم ہوگئے۔ تو نبوت کی دلیل باقی نہ رہی عصاءِ موسیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی دلیل تھی، آج نہ عصاء موسیٰ موجود ہے نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت، عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، ان کی نبوت کی یہ دلیل تھی آج نہ مسیح علیہ السلام ہیں اور نہ احیاءِ موتیٰ موجود، دلیل نبوت موجود نہیں۔ یوسف علیہ السلام نے قمیص بھجوادیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دو، بینائی واپس آجائے گی! آج نہ قمیص یوسف ہے نہ حضرت بینا ہو سکتے ہیں، گویا وہ معجزہ موجود نہیں جو ان کی نبوت کی دلیل تھی۔ جتنے معجزات تھے وہ سب انبیاء کے ساتھ رخصت ہوگئے کیونکہ وہ عملی تھے اور عامل کے جانے سے عمل ختم ہو جاتا ہے لیکن اگر علم ہے تو عالم کے دنیا سے اٹھنے سے اس کا علم ختم نہیں ہوتا، ہزاروں علماء چلے گئے مگر ان کا علم محفوظ ہے۔ اپنے علم کے پردے میں آج بھی وہ علماء زندہ موجود ہیں اور ان کے علم کی دلیل موجود ہے کیونکہ ان کا علم کتابوں میں مدوّن ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاں ہزاروں علمی معجزات دیے گئے ان میں سب سے بڑا معجزہ کلامی وعلمی ہے جو قرآن مجید ہے اور اس کی حفاظت کی گارنٹی دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی دلیل آج بھی دنیا میں موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی طرف دنیا کو دعوت دی جاسکتی ہے، اس لئے کہ نبوت کی دلیل موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرف دنیا کو دعوت نہیں دی جاسکتی کیونکہ ہمارے ہاتھ میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرف نہیں بلایا جاسکتا اس لئے کہ ہمارے سامنے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ سب معجزات ختم ہو چکے، لیکن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ اور نبوت کی دلیل معجزہ قرآنی ہے، یہ محفوظ ہے اور بحفاظتِ خداوندی محفوظ ہے تو وہ دعوت بھی محفوظ ہے۔ آج اگر دعوت دی جائے گی تو قرآن کی طرف دی جائے گی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی طرف دی جائے گی، اسلامی شریعت کی طرف دی جائے گی کیونکہ اس کی دلیل موجود ہے۔ اگر کوئی شبہ کرے گا! اعتراض پیش کرے گا! تو قرآن نے سب چیزوں کی کفالت دی ہے، دلائل موجود ہیں، ہر شبہ کو رفع کیا ہے، ہر اعتراض کا جواب اس میں موجود ہے، ہر مُفسِدہ کی اصلاح کی ہے، گویا مکمل طور پر شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے۔

نفاق کے سوا حجت و برہان سے مسلمانوں میں اختلاف ڈالنا ممکن نہیں ...... یہی وجہ ہے کہ یہود ونصاریٰ نے مقابلے کیے، تیغ وسنان سے مقابلے کیے، جنگیں لڑیں، مشرکین کو کھڑا کیا مگر غالب نہیں آئے۔

مسلمانوں سے نہ صرف تیغ وسنان سے مقابلے کئے بلکہ حجت وبرہان سے بھی مقابلے کئے تو قرآنی حجتوں کے مقابلے میں کوئی حجت نہیں پیش کر سکے، عاجز آ گئے اور اخیر میں پھر نفاق کا طرز اختیار کیا کہ مسلمان بن کر مسلمانوں میں نفاق پھیلاؤ۔ یہ تدبیران کی البتہ کارگر ہوئی۔ پھر دو پارٹیاں بن گئیں اور مسلمانوں کی جو وحدت تھی وہ پارہ پارہ ہو گئی۔ تو منافق بن کر مسلمانوں میں نفاق ڈالا جا سکتا ہے لیکن حجت وبرہان اور دلیل کی رُو سے کوئی چاہے کہ اختلاف ڈلوا دے..... ممکن ہی نہیں ہے۔ حجت قوی موجود ہے، ہر باطل دلیل رد کی جا سکتی ہے دلیل وبرہان سے۔ مختلف قوموں نے مقابلے کئے مگر عاجز آ گئیں! نہیں چل سکیں۔ تب یہ اختیار کیا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی بھی حجت وبرہان سے عاجز نہیں ہو گا خواہ دنیا کی اقوام کیوں نہ جمع ہو جائیں۔

آج بھی ایک اور دس کی نسبت ہے بلکہ ایک آتا ہے تو سو کو سبق دیتا ہے، آج تک یہ چیز موجود ہے۔ تو تیغ وسنان سے مقابلہ کیا مگر نفاق کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس امت میں بہت سے منافق ہوں گے جو واقع میں ایمان نہیں رکھتے ہوں گے دعوئ ایمان کا کریں گے جیسے واقع میں نبوت ناممکن ہے مگر اس امت میں تیس دجال کذاب پیدا ہوں گے جو نبوت کا دعوی کریں گے تو نفاق سے ممکن ہے پارٹی بنا دی جائے مگر حقائق اور حجت وبرہان سے نہیں ہو سکتی، تیغ وسنان سے نہیں ہو سکتی۔ تو قرآن کریم معجزہ بھی ہے اور دلیلِ نبوت بھی ہے۔ کلام خداوندی بھی ہے جو اٹل اور محفوظ ہے تو اعجازی کلام خود معجزہ اور دلیل نبوت ہے، اس لئے قیامت تک اس کی دعوت جاری رہے گی اور محفوظ بھی ہے کہ حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے بچوں کے ذریعے اور بوڑھوں کے ذریعے حفاظت کرائی، امت میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے کہ بچوں کو تو خیر حفظ کرایا خود بڑھاپے میں بھی حفظ کیا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا حفظِ قرآن کا واقعہ..... حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب پہلا حج کیا تو کراچی کے راستہ سے کیا تھا۔ اس زمانے میں اسٹیمر نہیں تھی، بادبانی جہاز تھے۔ بادبان باندھ دیا گیا تو کشتی چل رہی ہے، ہوا جب مخالف چلی لنگر ڈال دیے، جس سے کشتی کھڑی ہو جاتی تھی۔ پانچ پانچ چھ چھ مہینے میں جدہ پہنچتے تھے۔ تو حضرت بھی بادبانی جہاز میں سوار ہوئے اور رمضان شریف آ گیا۔ گویا شعبان میں چلے تھے، کشتی کے اندر رمضان آ گیا اور اتفاق سے کوئی حافظ نہیں! تراویح: اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے ہوئی تو حضرت کو بڑی غیرت آئی کہ اڑھائی تین سو آدمی جہاز میں موجود اور تراویح میں قرآن کریم نہ سنایا جائے! ایک بھی حافظ نہیں! بس اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے سورتیں یاد ہیں۔ اسی دن قرآن یاد کرنے بیٹھے، روز ایک سپارہ حفظ کرتے، رات کو تراویح میں سنا دیتے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ اس طرح سے محفوظ ہو جانا کہ بوڑھے بوڑھے بھی اس کو یاد کر لیں اور ذہن کے اندر اتر جائے، یہ بھی معجزہ ہے۔ آپ کسی کتاب کو جو لمبی چوڑی کتاب ہو، دلچسپ بھی ہو، کوئی پانچ سو ہزار صفحات کا ناول ہو، بیس دفعہ بھی رٹیں گے تو نہ اس کے الفاظ یاد ہیں نہ اس کے معانی، قصے کہانیاں بھی یاد نہیں رہیں گے۔ روز کا مشاہدہ ہے: قرآن یاد کرتے ہیں تو سینوں میں اترتا جاتا ہے، یہ

بھی معجزہ ہے۔ یہ اس کے اندر طاقت ہے کہ وہ قلوب میں محفوظ ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عینِ فطرت کے مطابق ہے۔ فطری چیزوں کو فطرت خود جذب کرتی ہے۔ تو قرآن کریم جب پہنچتا ہے تو فطرتیں قبول کر لیتی ہیں چاہے شعور بھی نہ ہو تب بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ تو امت میں بچے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں اربوں پیدا ہوں گے جو حافظ ہوں گے اور واقعۂ ہوئے ہیں اور بعد میں جواں ہو کر بھی حافظ رہے، بوڑھے بوڑھوں نے بھی قرآن یاد کیا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حفظِ قرآن کا واقعہ..... حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو انگریزوں نے ۱۳۶۲ھ میں گرفتار کیا تو جیل میں کوئی اور مشغلہ نہیں تھا قرآن کریم یاد کرنا شروع کر دیا اور تقریباً دو ثلث یا ایک پارہ یاد کیا اور روزا سے تراویح میں پڑھا کرتے تھے۔ تو مولانا مرحوم کی عمر ستر پچھتر سال کی تھی اور اس عمر میں یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ جو اس کی طرف متوجہ ہو وہ خود اس کے قلب کے اندر آ جاتا ہے اگر خود بے اعتنائی کرے تو وہ ایک طرف ہو جاتا ہے۔

قرآن بے اعتنائی سے جاتا رہتا ہے..... حدیث میں قرآن کو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ رسیاں باندھ کے رکھو گے تو چلے گا، ذرا ڈھیل دو گے تو وہ تمہارے پاس سے چلا جائیگا۔ اس لئے کہ غنی کا کلام ہے محتاج تم ہو۔ تمہیں ہزار دفعہ اس کی ضرورت پڑے تو پڑے۔ وہ محتاج نہیں کہ خواہ مخواہ تمہاری طرف آئے۔ اگر ذرا تم نے ڈھیل کی تو تمہارے دل سے نکل جائے گا۔ تو قرآن کریم کلام خداوندی ہے اس میں خود غناء (بے پرواہی) موجود ہے۔ ہم محنت کریں۔ یہ اس کا فضل ہے کہ وہ ہمارے اندر آ جاتا ہے اور پیوست ہو جاتا ہے، جزوِ نفس بن جاتا ہے اور بے دلی کریں تو بھاگ جاتا ہے۔ تو بھگوڑے اونٹ سے تشبیہ دی گئی۔ بہر حال اس کے اندر احکام بھی ہیں معانی بھی ہیں معارف بھی ہیں علل بھی ہیں، یہ اسی اعجاز کا ثمرہ ہے کہ امت پوری کی پوری محافظِ قرآن بن گئی۔

کثرتِ تصنیف اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے..... قرآن کا یہ اعجاز بھی ہے کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کی خاصیت ہے۔ اتنی تصانیف دنیا کی کسی امت میں نہیں ہوئیں جتنی اس میں ہیں ملکوں میں کتب خانے بھرے پڑے تھے۔ اور ہر کتاب کو دیکھو وہ قرآن کی کسی ایک ایک آیت کی تشریح و تفسیر ہے۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں کتابیں ہیں، مصر کے کتب خانوں کو دیکھو..... سو برس سے مصری حکومت چھاپتے چھاپتے عاجز ہو گئی مگر مصر شہر کی کتابوں کا عشرِ عشیر بھی ابھی نہیں چھپ سکا۔

تاتار نے جب مسلمانوں پر قبضہ کیا اور بغداد کی خلافت کو تہ و بالا کیا ہے تو مسلمانوں نے پل توڑ دیا تھا تا کہ دشمن دریا عبور نہ کر سکے تو صرف ایک کتب خانہ جو دریا کے قریب تھا۔ تاتاریوں نے اس پر قبضہ کیا اور اس کی کتابیں دریا میں ڈال کر اُس پار تک اتنی چوڑی سڑک بنائی کہ تین گاڑی برابر گذاری جا سکتی تھیں اور پھر روشنائی جو گھلی ہے تو ایک مہینہ تک دجلہ کا پانی 'سیاہ چلتا رہا۔ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں علماء کو دوات میں روشنائی ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی دجلہ کا پانی دوات میں بھرتے تھے اور اس سے قلم چلتا تھا، اتنی سیاہی پھیل گئی تھی۔ یہ ایک کتب خانے کا

حال ہے کہ جس سے تاتاریوں نے پل بنادیا اور ایسے ہزاروں کتب خانے بغداد میں موجود تھے۔

اندلس کے اتنے کتب خانے تھے کہ جب مسلمانوں کا قبضہ اٹھا اور پھر عیسائیوں نے قبضہ کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کے لٹریچر کو تباہ کرو، جب تک یہ لٹریچر باقی ہے ان میں روح ایمان باقی رہے گی تو عیسائی حکومت نے مستقلاً ارادہ کیا کہ مسلمانوں کے کتب خانے تباہ کئے جائیں۔ اس کے لئے ایک مستقل عملہ بنایا گیا جو سارے کتب خانوں کو آگ لگادے، جلادے اور تلف کردے۔ اس کا ایک انچارج آفیسر مقرر کیا تو لکھتے ہیں پچاس برس میں اندلس کے کتب خانے کہیں مٹ سکے ہیں۔ حکومت نے زور لگا کے پورے پچاس برس میں جاکے اندلس کے کتب خانوں کو ختم کیا ہے۔

یہ صرف قرآن کے طفیل تھا۔ ہر ایک کتاب کسی آیت کی شرح تھی، ہر کتاب کسی آیت کی تفسیر تھی تو کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے۔ اس کی تصنیف کو دیکھ کر دنیا کی امتیں آج مصنف بنی ہیں ورنہ اگر وہ اپنی ذات سے مصنف تھیں تو تورات اور انجیل کے شباب کے زمانے میں کتنی کتابیں تصنیف ہوئیں، زبور کے شباب کے زمانے میں کتنے کتب خانے بھرے گئے، کوئی نشان نہیں۔ یہ قرآن ہی کے زمانے میں کیوں مصنف بنے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہی طفیل ہے کہ مسلمانوں کے مواعظ، ان کی تقریریں، ان کی شعلہ بیانی غیر شعوری طور پر اقوام عالم میں اثر کرتی رہی اور ان میں اتنی طاقت پیدا کی۔ اس لئے آج وہ مصنف بنے اور تصنیفیں کیں اور امت محمدیہ (علیٰ صاحبھا الف الف تحیۃ وسلام) کے مصنف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کو کتب خانوں سے بھر دیا۔

قرآن کو چھوڑنے کا نتیجہ اعجازی قوت سے محرومی ...... تو قرآن کریم کلامی معجزہ ہے اس کے اعجازی اثرات ظاہر ہو رہے ہیں اور یہ صرف معجزہ نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی بہت سے معجزات اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ آج امت کے اندر اس تیرہ سو برس میں بہت سے اکابر پیدا ہوئے، ہر طبقے میں اہل علم پیدا ہوئے، صوفیاء میں دیکھو تو جنید وشبلی اور سری سقطی رحمہم اللہ وغیرہ ہزار ہا اہل تصوف گزرے ہیں، محدثین میں دیکھو تو امام بخاری ومسلم رحمہما اللہ اور اسی طرح سے کتنے محدث گذرے ہیں، فقہاء میں دیکھو تو امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ کتنے آئمہ گذرے، متکلمین میں دیکھو تو کتنے آئمہ گذرے ہیں، ہر فن کے اندر اہل علم اور اہل کمال پیدا ہوئے اور ان کے ذریعے سے علماء کے کمالات ظاہر ہوئے، وہ علوم لا کے رکھے کہ دنیا کی عقلیں عاجز آگئیں۔ یہ قرآن ہی کا فیض تو تھا کہ خود بھی معجزہ ہے اور معجزہ گر بھی ہے۔ جس نے لوگوں کے اندر اعجازی قوت پیدا کی۔ اس کو چھوڑ کر ہم اعجازی قوت سے محروم ہو جائیں گے، امت کی طاقت ختم ہو جائے گی...... اسی کی طرف لوٹیں گے تبھی جاکر امت کی شوکت بازیاب ہوگی۔ تو قرآن کریم محفوظ اور معصوم ہے اور حق تعالیٰ نے اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کی صورتیں ...... جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہو گیا، اس نے الفاظ کو محفوظ کیا، ہر دور میں لاکھوں حافظ تھے۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے، علماء کا طبقہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے معانی کو

محفوظ کیا اور کتابیں لکھیں۔ کتابوں سے لاکھوں کتب خانے بھر دیے۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے صوفیاءِ کرام کا طبقہ کھڑا ہوگیا، انہوں نے وہ وہ حقائق اور معارف بیان کئے کہ دنیا ان کے معارف کو دیکھ کر حیران ہوگئی گویا ایک مستقل طبقے نے اس کے معارف کی حفاظت کی، قرآن کریم کے رسم الخط کے لئے بھی ایک مستقل طبقہ علماءِ رسم الخط کھڑا ہوگیا کہ ایک ہی طریقے سے قرآن لکھا جائے دوسرے طریقے سے نہیں۔

مثلاً رحمٰن کا لفظ ہے رحمٰن کا لفظ اس طرح بھی لکھا جاتا ہے کہ میم کے ساتھ الف ملاؤ اور نون الگ لکھو جیسے ''رحمان''، لیکن قرآنی رسم الخط یہ ہے کہ میم کے ساتھ نون ملا کے میم کے اوپر کھڑا زبر لکھے جیسے ''رحمٰن''۔ تو اس کے خلاف لکھنا جائز نہیں، وہی لکھنا پڑے گا۔ تو علماء رسم الخط کھڑے ہوگئے جنہوں نے قرآنی رسم الخط کی حفاظت کی۔ اب اس کی طرزِ ادا کا مسئلہ تھا تو قراء اور مجوّدین کو اللہ نے کھڑا کر دیا کہ اسی لب و لہجے کو یعنی جس انداز سے عرب پڑھتے ہیں وہی انداز اختیار کرو۔ تو انہوں نے تصحیحِ مخارج، ادائِ کلمات حتیٰ کہ صوت (آواز) تک محفوظ کرنے کی کوشش کی کہ عجمی انداز سے قرآن کو نہ پڑھا جائے، مزامیر کے انداز سے نہ پڑھا جائے بلکہ اسی انداز سے پڑھا جائے جس انداز سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پڑھا، تابعین نے پڑھا اور آج تک پڑھا جاتا آرہا ہے: ''اِقْرَؤُوا الْقُرْاٰنَ بِلُحُوْنِ الْعَرَبِ''① کہ قرآن کو عرب لہجے میں پڑھو، فرمایا گیا نیز فرمایا گیا کہ: ''حسنوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ يَزِيْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا''② خوش آمیزی اور درد آمیز آواز سے قرآن کو پڑھو اس سے قرآن کا حُسن بڑھتا ہے۔

قرآن سے غیر مسلم بھی متاثر ہوتے ہیں...... واقعی یہ بات ہے کہ اگر صحیح انداز پر صحیح دردِ دل سے پڑھنے والا ہو، کفار تک متاثر ہوتے ہیں، جو سمجھتے تک نہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں! اس انقلاب سے پہلے انڈیا میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس کے صدر تھے تو مولانا محمد علی (مرحوم) فطرتاً جری انسان تھے اور ان میں بہادری کی ایک شان تھی، لاکھ دو لاکھ آدمی کا مجمع تھا تو مولانا نے کھڑے ہو کر کہا کہ جلسہ کی ابتداء قرآن شریف سے ہوگی۔ تو لوگوں نے کہا صاحب! سیاسی جلسہ ہے وہ بھی کانگریس کا! ہندو مسلم سب جمع ہیں، یہاں قرآن کا کیا کام! اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو پنڈت کہیں گے کہ ہم بھی آسوب پڑھیں گے، پادری صاحب کہیں گے کہ میں بھی انجیل پڑھوں گا، یہودی کوئی کھڑا ہوگا تو کہے گا میں بھی تورات پڑھوں گا۔ فرمانے لگے سب کو اجازت دوں گا کہ سب پڑھیں مگر شروعات آیتِ قرآن کریم سے ہوگی۔ وہ سب چپکے ہوگئے۔ قاری ابراہیم رشید عرب تھے مولانا نے انہیں آواز دی، انہیں بلایا، حیدر آباد میں جو جامع مسجد ہے جس کا نام مکہ مسجد ہے اس کے وہ خطیب تھے۔ تو اوّل تو عرب پھر بڑے جہری الصوت، بڑے خوش آواز، عربی انداز سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔

---

① شعب الايمان، فصل في ترک التعمق في القرآن، التاسع عشر من شعب الايمان ج:٦ ص:١٧٥. ② شعب الايمان للبيهقي، التاسع عشر من شعب الايمان، فصل في تحسين الصوت بالقرائة ج:٥ ص:١٥٧ رقم:٢٠٧٤.

مولانا مرحوم نے فرمایا: کہ آپ پڑھو! قاری ابراہیم صاحب نے سورۃ الصّف کے دونوں رکوع کوئی آدھ گھنٹہ سے زیادہ میں تلاوت کیے۔ وہ تلاوت کررہے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا لوگوں کے سروں کے اوپر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اوران میں حس وحرکت ہی نہیں۔ بہت سے غیر مسلم ہندوؤں کی بھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کچھ نہیں سمجھتے تھے مگر آنسو جاری تھے۔ تو قرآن کریم صحیح طور پر کوئی پڑھنے والا ہو، مجوّد ہو، اچھی تجوید سے پڑھے تو کفار تک متاثر ہوتے ہیں، مؤمن کا تو کہنا ہی کیا ہے! تو قرآن کی طرزِ اداء کے لئے بھی مستقل طبقہ کھڑا ہوگیا جس کا نام مجوّدین اور قراء ہے، وہ اسی انداز سے آج تک چل رہے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ ہمیں حضرت قاری سراج احمد صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ اللہ نے ان کے ذریعے دارالعلوم الاسلامیہ کو قائم کیا جہاں سینکڑوں قاری پیدا ہوئے۔ اس مدرسہ کے قائم ہونے سے پہلے پنجاب بہت دفعہ میری حاضری ہوئی تو امام (مسجدوں) میں کچھ صحیح نہیں تھے، بس پنجابی انداز میں قرآن کریم پڑھتے تھے وہی لب ولہجہ تھا تو اس میں وہ لطف نہیں ہوتا تھا لیکن اس مدرسہ کے قائم ہونے کے بعد دیکھا جگہ جگہ مدارس میں بہترین قاری پیدا ہونے لگے ہیں اور ہر جگہ عمدہ قرآت موجود ہے، گویا ایک فیض عام ہوگیا۔

اور قاری عبدالمالک صاحب کا بالآخر فیضانِ عام ہوا، ہندوستان میں بھی ان کا فیضان عام تھا اور یہاں آکر بھی ان کا فیضان عام ہوا، آج پاکستان میں سینکڑوں قراء موجود ہیں بلکہ قرأت کے مقابلے ہونے لگے ہیں کہ کون زیادہ اعلیٰ درجے کا پڑھتا ہے اور بین الاقوامی مقابلوں میں بھی یہاں کے قراء جانے لگے اور یہاں سے باہر جاکر وہ اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوئے۔ یہ انہی مدارس کا طفیل ہے تو ہمیں حضرت قاری صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک مینار قائم کیا کہ آج سینکڑوں قاری اور مجوّد پیدا ہوگئے اور آپ نے یہ جو پچاس ساٹھ آدمیوں میں سندیں تقسیم کیں یہ قاری ہوکر نکلے تو ایک ایک آدمی اگر دس دس کو بھی تیار کرے تو پانچ سو ہزار آدمی تو انہی سے تیار ہوجائیں گے۔ دِیا یوں ہی جلتا رہے گا۔ تو قرآن کا فیضان الفاظ کا الگ ہے، لب ولہجے کا الگ ہے، معانی کا الگ ہے، حقائق کا الگ ہے، تفسیرات کا الگ ہے، حکمتوں کا الگ ہے اور ہر پہلو کی حفاظت کے لئے اللہ نے ایک طبقہ کھڑا کردیا۔ اسی کو فرمایا کہ: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ ① کہ ہم نے ہی قرآن اتارا ہے ہم ہی اسکی حفاظت کرینگے تو انہوں نے جو قرآن اتارا ہے تو فقط مضمون نہیں اتارا الفاظ بھی اتارے ہیں اور لفظ ہی نہیں بلکہ آواز بھی اُتاری ہے۔

خلفائے خداوندی محافظین قرآن کے القابات...... حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ایسی آواز سنتا ہوں کہ کَاَنَّهَا صَلۡصَلَةٌ عَلٰی صَفۡوَانٍ ②

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹.

② الصحیح للبخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ ج: ۱ ص: ۱ رقم: ۲.

جیسے چکنے پتھر پر لوہے کی زنجیر کھینچو تو اس سے ایک جھنجھناہٹ اور گونج کی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس قسم کی آواز سنتا ہوں۔ اس سے پھر الفاظ بنتے ہیں اس سے پھر معانی القاء ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن میں صوت کا بھی دخل ہے، فقط لفظ ہی نہیں کہ قلب کے اوپر آ گئے بلکہ سنائے گئے اور جب سنائے جائیں گے تو بہر حال لب ولہجہ بھی ہوگا، اس لب ولہجے کی حفاظت کے لئے اللہ نے مستقل طبقہ کھڑا کر دیا، وہ مجودین کا طبقہ ہے تو حقیقت میں یہ خلفائے خداوندی ہیں۔ اصل پڑھنے والے حق تعالیٰ ہیں تلاوت کرنے والے وہ ہیں، حافظ قرآن وہ ہیں۔ قرآن میں خود فرمایا گیا کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ہم نے اتارا ہم ہی حافظ ہیں تو اپنے کو حافظ کہا۔ نیز فرمایا: ﴿نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ﴾ ② اے پیغمبر! ہم آپ پر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا اصل میں تلاوت کنندہ حق تعالیٰ ہیں اور فرمایا ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ ③ اے پیغمبر! جب ہم قرأت کریں تو سنتے رہا کریں۔ معلوم ہوا کہ قاری بھی حق تعالیٰ ہیں تو قاری بھی وہ، تلاوت کنندہ بھی وہ، حافظ بھی وہ۔ یہ اس کا فضل ہے کہ جو حفظ کر لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ آج سے جو لقب ہمارا تھا تمہارا بھی ہے، کوئی قرأت سیکھ لیتا ہے تو فرماتے ہیں کہ قاری تو ہم ہیں لیکن آج سے ہم نے اپنا لقب تجھے دے دیا، اسی طرح تلاوت کرنے والے ہم ہیں مگر جب تم تلاوت کر رہے ہو تو تم بھی یہ لقب استعمال کر سکتے ہو۔

اہل جنت کے خدائی القابات ...... تو سرکاری القاب آپ کو دے دیئے، خود وہ حافظ تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حافظ کہا، خود تالی تھے آپ کو بھی تالی کہا، خود قاری تھے آپ کو بھی قاری کہا، یہ اس کا فضل ہے کہ اپنے القاب بندے کو عطا کر دیے ورنہ بندوں کے الفاظ ممتاز ہوتے ہیں، مثلاً پریذیڈنٹ یا صدرِ جمہوریہ یا وزیر اعظم کا اگر کوئی دعویٰ کرنے لگے کہ میں وزیر اعظم ہوں مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ تو کدھر سے وزیر اعظم ہے! تجھے قانون کی رو سے لفظ بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہیں، کوئی کہے کہ میں صدرِ جمہوریہ ہوں تو مقدمہ قائم ہو جائے گا کہ صدرِ جمہوریہ ایک ہی تو ہے تو کدھر سے ہو گیا! تو سرکاری القاب کوئی اختیار نہیں کر سکتا جب تک سرکار ہی لقب یا خطاب نہ دے دے۔ پھر یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ لقب تو اپنے سرکاری ہیں اور تمہیں دے دیے گئے کہ جب تم اس مقام پر پہنچو تو تم بھی حافظ، تم بھی قاری، تم تالی، تم سب کو وہ لقب دیں گے یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے، جنتوں میں پہنچ کر ہر جنتی کو القاب دیئے جائیں گے جو اللہ ہی کے نام سے ہوں گے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنت والوں کو نشاط میں لانے کے لئے حق تعالیٰ خط وکتابت کریں گے ملائکہ خطوط لے کر آئیں گے، جس میں مزاج پرسی حالات کا پوچھنا اور حالات کا بتلانا بھی ہوگا۔ اگر کسی کے پاس وزیر اعظم کا خط پہنچ جائے تو اپنی پوزیشن بڑھانے کے لئے اخبارات میں چھاپے گا کہ میرے نام وزیر اعظم کا خط آیا ہے، پریذیڈنٹ کا خط آئے تو اخبارات میں چھاپ دے گا تا کہ میری عزت دوبالا ہو کہ پریذیڈنٹ نے مجھے خط لکھا ہے

① پارہ: ۱۴، الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۳۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

اگر قدیم زمانے کے شاہی فرامین کسی کے گھر میں ہوں تو وہ آج تک فخراً کہتا پھرتا ہے کہ میرے خاندان میں شاہی فرمان چلا آرہا ہے، ان کا خط موجود ہے، تو بادشاہوں کے یہ خطوط آئیں تو فخر کا یہ عالم ہے اور اللہ میاں کا خط آئے تو فخر ومباہات کی کیا انتہا ہوگی، اور اس نشاط کی کیا انتہا ہوگی جو اہلِ جنت محسوس کریں گے تو حق تعالیٰ خطوط بھیجیں گے۔ ملائکہ علیہم السلام چٹھی رساں (ڈاکیے) کے طور پر خطوط لے کر آئیں گے۔ ان خطوط کے لفافے کے الفاظ کیا لکھے ہوں گے؟ لکھا ہوا ہوگا کہ: مِنَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ اِلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے۔ تو عزیز رحیم اللہ کا لقب ہے اور اہل جنت کو دے دیں گے مگر یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے کہ اس کو پڑھنے والے کو دنیا میں ہی وہ لقب دیدیں گے جو اُن کا اپنا لقب ہے کہ ہم حافظ تو تم بھی حافظ، ہم قاری تو تم بھی قاری، ہم تالی (تلاوت کنندہ) تو تم بھی تالی۔ تو حقیقت میں مجودین خلفائے خداوندی ہیں، ان کو خلافت عطا کی گئی ہے، کسی کو علم کی خلافت ملی، کسی کو اخلاق کی خلافت ملی، انہیں کلام خداوندی کی خلافت ملی کہ اللہ متکلم ہیں تو یہ بھی متکلم تو اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہوسکتا ہے۔

حافظوں کا عنداللہ مقام...... حدیث میں فرمایا گیا کہ جو شخص اپنے بچے کو قرآن حفظ کرائے گا تو قیامت کے اولین وآخرین کے مجمع میں اس کے باپ کو تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سے سارا عالَمِ محشر منور ہو جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس نے اپنے بچے کو قرآن یاد کرایا اور کلامِ خداوندی کو اس کے سینے میں ڈالا، گویا اس کی تاج پوشی ہوگی۔ ①

دنیا میں کسی بادشاہ کی تاج پوشی ہوتی ہے تو اہل شہر جمع ہو جاتے ہیں، معززین شہر اکٹھے ہو جاتے ہیں بہت سے بہت...... صوبے کے افراد جمع ہو جاتے ہیں اور بہت ہوئے تو ملک کے افراد اور اگر بہت ہی بڑا بادشاہ ہے تو بین الاقوامی طور پر وہ دعوت دے گا کہ تاج پوشی کا اعزاز ہے آپ سب آجائیں۔

تو دوسرے ممالک کے سربراہ بھی شریک ہوں گے، بڑا جلسہ ہوگا لیکن ایک ہی زمانے میں ہوگا اور قیامت میں وہاں اولین وآخرین، آدم علیہ السلام کی ساری اولاد...... اتنا بڑا جلسہ ہوگا کہ دنیا میں تو ممکن ہی نہیں تو ساری اولادِ آدم ہوگی اور تاج پہنانے والے حق تعالیٰ ہیں جو اس باپ کو تاج پہنائیں گے جس نے اپنے بچے کو حفظ کرایا تھا جس کی روشنی سے پورا عالَم محشر منور ہوگا گویا بتلایا جائے گا کہ اس نے دنیا میں قرآن کریم کی روشنی پھیلائی تو اب تاج بھی وہ دیا جا رہا ہے جس کی روشنی پورے عالَمِ محشر میں پھیلے گی۔ تو دنیا میں یہ خلفائے خداوندی ہیں اور آخرت میں یہ تاج پوش بادشاہ بنیں گے۔ جس کو حفظ کرادیا اس سے زیادہ اس کی فضیلت اور اس کی بڑائی اور کیا ہوسکتی ہے!۔

اور حفظ کرنے والے جب کہ ان کی ادا بھی صحیح ہو اور اسی لب ولہجے سے ہو جو عربوں کا لب ولہجہ ہے پڑھیں تو

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاة، باب ثواب تلاوة القرآن، ج:۴ ص:۲۴۶ رقم:۱۲۴۱۔

اس سے قرآن کریم کا اور زیادہ حسن بڑھ جاتا ہے: فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَةَ يَزِيْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا ① تو بہر حال ہمارے قاری صاحب، قاری صاحب نے جن مجودین کو رکھا وہ مجودین، اس کی اعانت کرنے والے، تمام معاونین اور انتظام کرنے والے سارے منتظمین ...... یہ سب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی محنتوں کا نچوڑ آج ان کے سامنے آیا ہے۔ جن بچوں پر ان حضرات نے محنت کی آج وہ قابل بن کر اور مجود بن کر آپ کے سامنے آئے اب وہ تجوید و قرآن کو دنیا میں پھیلائیں گے تو نور پھیلے گا اور روشنی پھیلے گی، یہی ذریعۂ ہدایت بنے گی۔

دین و دنیا کی ترقی کا داعی قرآن کریم ...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے: لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا اس امت کے اوّل طبقے کی اصلاح جس چیز سے ہوئی تھی، اسی سے اس امت کے آخری طبقے کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے، اور وہ ہے قرآن۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے کتب خانے میں قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں تھی، اسی نے ان کی اصلاح کی، اسی سے وہ اونچے بھی ہوئے اور بالا بھی۔ آج بھی مسلمان اگر بالا ہونا چاہتے ہیں تو اسی کو پکڑیں! اس کے پکڑنے کو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ "مُلّاں" بن جائیں گے، ترقی کے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔ یہ محض ایک مہمل خیال ہے۔ ترقی کا داعی تو قرآن کریم ہی ہے۔ اس نے دین اور دنیا دونوں سکھلائے، اس نے علم و کمال کے ساتھ شوکت دینا، حکومتیں قائم کرنا، نظامِ مملکت چلانا بھی سکھایا، قوت عسکری بھی قائم کی، جا بجا احکام ہیں کہ مسلمان عسکری قوت پیدا کریں، مسلمان سپاہی بنیں، مسلمان عالم بنیں اور علم اور معرفت کیساتھ سپاہیانہ زندگی، سیاسی زندگی، شوکت کی زندگی، اقتدار کی زندگی بھی سکھلائی تو یہ غلط خیال ہے کہ قرآن کریم سیکھیں گے تو ترقی سے رہ جائیں گے۔ اصل ترقی تو یہی ہے۔ نیز دیکھا جائے تو اصل حکومت اللہ کی ہے۔ اس لئے اصل حکومت قرآن کی ہے۔ یہ قانون فطری ہے، اس کی حکومت ہوگی تو فطرت کے مطابق ہوگی۔ اس کے خلاف ہوگی تو وہ غیر فطری ہوگی اور اس میں نقصانات، فسادات اور ہنگامے پیدا ہوں گے۔ اس لئے جتنا اس کی حکومت کو رائج کیا جائے ...... رائج کرنے والے بھی خدا کے ہاں محترم بنیں گے، جو اس قانون کو لائیں گے ان کی عظمت بھی اس دنیا میں بڑھ جائے گی اور وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے تو قرآن کریم تنزل نہیں سکھلاتا، پستی نہیں سکھلاتا بلکہ ترفع سکھاتا ہے اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔

جب تک یہ (قرآنی) ہوا قلوب میں بھری رہی مسلمان بلند و بالا رہے۔ جب یہ نکل گئی مسلمان پست ہو گئے۔ بالکل ایسے ہی مثال ہے جیسے گیند کے اندر ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے۔ تو اگر آپ اسے زمین پر دے کر ماریں تو دس گنا اوپر کو اچھلے گی، اوپر کو جائے گی، نیچے نہیں رہے گی، اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے، وہ نیچے نہیں ٹکنے دے گی اور اگر سوئی گھسا کے ہوا نکال دو تو جہاں ڈال دو گے بھس سے پڑی رہ جائے گی، پھر اس میں اٹھنے کی سکت نہیں۔

---

① شعب الایمان للبیهقی، التاسع عشر من شعب الایمان، فصل فی تحسین الصوت بالقرآن ج:۵ ص:۱۵۷ رقم:۲۰۷۴.

تو قرآن کریم نے جو ہوا اور شوکت بھری تھی جب تک بھری رہی...... اقوام نے انکو دبانا چاہا، زمین پر پٹخنا چاہا، جتنا پٹختے گئے، مسلمان اتنا ہی اوپر کو اُٹھے۔ نہ صرف خود اٹھے بلکہ دنیا کو بلند کر دیا۔ لیکن جب ہوا نکال دی، کسی نے سوئی ماردی وہیں پھس سے ہو کے رہ گئے۔ تو مسلمان دنیا کی اصلاح کے لئے آیا ہے اور اصلاح جبھی کرے گا جب اصلاحیت ان کے اندر رچی ہوئی ہو۔ یہ بھک بھکا بن کر نہیں آیا کہ دنیا کی اقوام سے بھیک مانگے کہ ہمیں تمدن کی بھیک دے دو، معاشرت اور رہن سہن کی بھیک دے دو۔ یہ تو دنیا کو سچا رہن سہن سکھلانے کے لئے آیا ہے۔ تو مسلمان سائل نہیں بلکہ مُعطی ہے۔ اگر یہ دنیا سے تمدن و معاشرت کی بھیک مانگے تو یہ اپنی توہین کرتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اس معاشرت کو جو فطری ہے اور اس سیاست کو جو فطری ہے دنیا کے اوپر لاگو کرے، دنیا کو اس کی طرف لائے رکھے۔ مسلمان یوں کہیں کہ ہم اسلام کو چلانا چاہتے ہیں اور اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت کو چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ مبارک باد کے بھی مستحق ہیں اور سب کا فرض ہے کہ ان کا احترام کریں، اس لئے کہ اصل احترام اللہ کا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے، اس سے جو تمسک کرے گا (اس کا ساتھ لے گا) وہ بھی قابلِ احترام بن جائے گا۔

اختتام......! بہر حال اس مدرسہ نے بحمد اللہ اس بیس پچیس سال کے اندر جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ثمرہ ہے کہ آج اتنے لوگ جمع ہیں اور قرآن کریم کے پروانے بنے ہوئے ہیں اور اس کے نمونے سامنے آرہے ہیں۔ تو حق تعالیٰ بانی کو بھی اور منتظمین کو بھی اور معاونین کو بھی جزائے خیر نصیب فرمائے! تو میں ان بچوں کے لئے مبارک باد پیش کرنے بیٹھا تھا...... یہ میرے اور آپ کے بچے ہیں۔ ان الفاظ سے میری مبارکباد پیش ہے۔ حق تعالیٰ اس مدرسہ کو قائم و دائم رکھے اور پاکستان نیز باہر کے لوگوں کو اس سے متوثر فرمائے آمین! ان الفاظ پر میں ختم کرتا ہوں۔

ایک درخواست آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں، اُمید ہے کہ قبول کی جائے گی بیان ہوا...... بہر حال آپ نے توجہ سے سنا اور میں معمولی طالب علم کہہ ہی کیا سکتا تھا! جو طالب علمانہ باتیں آئیں آپ نے بہر حال سنیں اب اخیر میں درخواست یہ ہے کہ اس عرض معروض سے بہر حال آپ کے اور ہمارے قلوب مل گئے ہیں، ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں، قلوب مل گئے ہیں اس لئے مصافحہ کی تکلیف نہ فرمادیں۔ میں اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا تحمل نہیں کر پاتا، اس لئے کہ آپ ایک ایک دفعہ ہاتھ ملائیں گے تو مجھے بیس ہزار دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا۔ میرے اندر اتنی طاقت نہیں، اس واسطے مصافحے کی تکلیف گوارانہ فرمائیں، بس دعائے خیر سے یاد رکھیں، یہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اب جلسہ کی بقیہ کاروائی ان شاء اللہ پوری ہوگی۔

''وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''

جُہلائے عرب سے مقامِ صحابیت تک

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا، يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ [1]

مقصد بعثتِ انبیاء علیہم السلام...... بزرگانِ محترم! دنیا کی اقوام جب مشکلات اور پریشانی میں مبتلا ہوتی ہیں اور ایسی مصیبتیں انہیں گھیر لیتی ہیں، کہ نہ جانے کا راستہ باقی رہتا ہے نہ ٹھہرنے کا، دلوں میں بھی امن باقی نہیں رہتا اور دلوں کا سکھ اور چین اٹھ جاتا ہے رات دن پریشانی اور آفات کا سامنا رہتا ہے، اس سے عیش میں بھی خلل اور زندگی کے اندر سکون بھی ندارد...... جب ایسے حالات میں اقوام مبتلا ہوئی ہیں، تبھی اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے، انہوں نے آ کر اقوام کو مشکلات سے نجات دلائی۔ دنیا میں انبیاءؑ کا آنا محض اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ مسجدوں میں نماز پڑھوا دیں، یا سفرِ حج پڑھا دیں یا اور عبادات ادا کروادیں، یہ مقصودِ اصلی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیوی مشکلات اور مصائب کا خاتمہ کرنا، انسانوں میں امن وسکون پیدا کرنا، حقوق کی ادائیگی کرانا...... یہ سب انبیاء علیہم السلام کے فرائض میں سے ہے، جہاں وہ آخرت کی مشکلات سے نجات دلاتے ہیں وہیں دنیا کی مشکلات سے بھی نجات دلاتے ہیں اور اقوام نجات پاتی ہیں، جو ان کے نقشِ قدم پر چل پڑا اس نے نجات پالی، جو نہ چلا وہ مشکلات میں گھر گیا اس نے دنیا وآخرت دونوں کھودی۔

بنی اسرائیل کی ذلت...... بہر حال انبیاء علیہم السلام کا آنا دنیا اور آخرت دونوں کیلئے ہوتا ہے، فقط آخرت کیلئے نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل جب فرعون کی ڈالی ہوئی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی اور اس

[1] پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۵۵.

درجہ اس نے بنی اسرائیل کو پریشان کر دیا کہ بالکل اچھوت بنا کے چھوڑا، نہ دنیوی عزت رہی نہ دینی، ذلیل ذلیل خدمات پر انکو مامور کیا جاتا تھا۔ وہ قوم جو انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھی وہ پس ماندہ قوم بن گئی جن کے بارے میں فرمایا گیا تھا: ﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① دنیا جہانوں پر ہم نے ان کو برگزیدہ بنایا، وہ قوم اس درجہ مبتلائے مشکلات اور پریشان حال ہوئی کہ نہ اس کا دنیوی چین باقی رہا نہ آخرت اسکے سامنے رہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو خدا کے راستہ پر ڈالا اور ہدایت کی، پھر ایک وقت آیا کہ فرعون کے مصائب سے نجات ہوئی، فرعون خود غرق ہوا، بنی اسرائیل برسرِ اقتدار آئے اور دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی بن گئی۔

پھر بنی اسرائیل پر ایک دور آیا جس میں یہ قوم پھر مبتلائے مصائب ہوئی۔ یہ حضرت دانیال علیہ السلام کا زمانہ تھا انہوں نے نصیحت کی، راہِ حق بتلائی اور فرمایا اگر تم راہِ حق پر نہیں چلو گے پھر مشکلات میں مبتلا ہو گے، انجام بخیر نہیں ہوگا۔ قوم نے تسلیم نہیں کیا، رات دن کا عیش و تعیش اور رات دن کی عیاشی میں مبتلا رہے۔ دانیال علیہ السلام نے نصیحت کی، راہِ حق دکھلائی، قوم نے نہیں مانا تو بخت نصر ان پر مسلط ہوا اور اس نے پوری قوم کو تاخت و تاراج کیا، پوری قوم کو تباہ و برباد کیا، ستر ہزار کے قریب بنی اسرائیل قتل ہوئے اور ستر ہزار کے قریب بنی اسرائیل کو مشکیں باندھ کر غلام بنا کر لے گیا، بیت المقدس کو بھی تباہ و برباد کیا۔ اس طرح ایک بڑی عظیم الشان قوم اپنی بدعملی کی وجہ سے دنیا ہی میں تباہ و برباد ہوگئی، آخرت کی خبر تو خدا جانے، بخت نصر گرفتار کر کے ساتھ لے گیا۔ حضرت دانیال علیہ السلام بھی گرفتار ہوئے، جب قوم کی مشکیں کسی گئیں تو حضرت دانیال علیہ السلام جو پیغمبر تھے انکی بھی مشکیں کسی گئیں ان کو بھی قید کیا گیا۔ دانیال علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اسی دن سے تمہیں ڈراتا تھا...... تم بھی مبتلا ہوئے مجھے بھی مبتلا کیا۔ قوم نے اس وقت ندامت کا اظہار کیا اور کہا کہ بے شک ہم سے غلطی ہوئی، اب آپ ہمارے لئے دعا فرمادیں! انبیاء علیہم السلام کی شفقت تو بے پایاں ہوتی ہے باوجودیکہ قوم کی وجہ سے وہ خود بھی مشکلات میں مبتلا ہوئے مگر پھر بھی تسلی دی اور فرمایا کہ تم اللہ کے راستہ پر آجاؤ تمہیں نجات مل جائے گی۔

بالآخر قوم جیل خانوں میں ڈالدی گئی بخت نصر کا یہ واقعہ لانبا ہے وہ مجھے سنانا نہیں ہے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ دانیال علیہ السلام بھی جیل خانے میں ڈالے گئے؛ اگرچہ ان کی بزرگی، تقدس اور خداترسی کو دیکھ کر جیل کے حکام بھی متاثر ہوئے، جیلر بھی معتقد ہوگئے، ہزاروں قیدیوں کی جیل کے اندر اصلاح ہوگئی۔ بالآخر چند سال گزرنے کے بعد وقت آیا کہ بنی اسرائیل کا اقتدار پھر لوٹا، بیت المقدس میں بھی دوبارہ ان کی حکومت قائم ہوئی، پھر وہ دوبارہ برگزیدہ قوم بن گئی۔ غرض ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصائب و مشکلات سے چھڑوایا، دوسری دفعہ حضرت دانیال علیہ السلام نے چھڑوایا اور مصائب و مشکلات سے نجات دلائی۔

دورِ جاہلیت کا اجمالی خاکہ...... یہی صورت آخر میں آ کر عرب کے لوگوں کی ہوئی۔ اسلام سے قبل ہر قسم کی

① پارہ: ۲۵، سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ: ۱۶۔

مصیبتوں میں یہ قوم مبتلا تھی۔ جہالت کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز کو جانتے تھے، مگر خدا کو نہ جانتے تھے، ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، مگر خدا کی عبادت سے محروم تھے، خانہ کعبہ کے اردگرد مطاف میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے، طواف کرتے جاتے تھے اور تین سو ساٹھ بُتوں کی پوجا کرتے جاتے تھے۔ دو بڑے بڑے بُت خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے تھے اندر جاتے تھے تو ان دو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ مسجد بیت الحرام سے باہر نکلتے تھے تو ہر شخص کے گھر میں ایک ایک بُت رکھا ہوا تھا، اسکی پوجا کرتے تھے، گھر سے سفر میں جاتے تھے تو بت کو جیب میں ڈال کر لیجاتے تھے کہ ممکن ہے خدا راستے میں نہ ملے پوجا کس کی کریں گے تو اسے جیب میں ڈال کر لیجاتے تھے، وہاں اس کی پوجا کرتے اور اگر کسی جگہ بیٹھ گئے اور کوئی زیادہ خوشنما پتھر نظر آ گیا تو پہلے کو جیب میں سے پھینک دیا اور دوسرے کو سامنے رکھ کر اسکی عبادت شروع کر دی۔ غرض ہر خاندان کے ہر فرد کا خدا اجُدا اجُدا تھا اور سفر کا الگ، حضر کا الگ تھا، پوجنے والے تعداد میں اتنے نہ تھے جتنی خداؤں کی تعداد تھی، پوجنے والے تو چند لاکھ تھے جبکہ خدا کروڑوں بنا رکھے تھے۔ ان کی یہ حالت تو جہالت کی تھی، بداخلاقی کا یہ عالم تھا کہ زنا کاری، ڈکیتی رات دن کا مشغلہ تھا۔ مختلف قسم کے نکاح تجویز کر رکھے تھے، ہوسناکی کے بہت سے طریقے تجویز کر رکھے تھے، نام ان کا نکاح تھا۔ اگر کسی عورت کا خاوند بدصورت ہوتا تو قانوناً اسے اجازت تھی کہ وہ کسی حسین وجمیل مرد کے پاس چلی جائے۔ اگر اس سے اولاد ہوگئی تو اُسی کالے بدصورت ہی کی اولاد ہوگی کسی دوسرے کی اولاد نہیں ہوگی، ایک عورت بے محابا گورے آدمی کے پاس چلی جاتی تھی کہ میرا خاوند کالا اور بدصورت ہے۔ زنا کاری الگ تھی اور نکاح کے نام سے الگ زنا کاری ہوتی تھی، شراب انکی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور پیدا ہوتے ہی بچے کے حلق میں ٹپکائی جاتی تھی، ڈکیتی، زنا کاری اور شراب کاری بھی تھی۔ پھر لڑائی جھگڑے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناچاقی ہو جاتی تھی، پھر اسمیں قومی اور خاندانی عصبیت نے اثر کیا، اگر دو خاندانوں میں جنگ چھڑ گئی تو مرنے والے نصیحت اور وصیت کر کے جاتے تھے کہ لڑائی بند مت کرنا...... کبھی خاندان کی ناک کٹ جائے۔ ایک ایک لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس چلتی تھی۔ بے دردی اور قساوتِ قلبی کا یہ عالم تھا کہ سب سے زیادہ محبوب اولاد ہوتی ہے، لیکن ان کے ہاں یہ صورت ہوتی تھی کہ اگر لڑکی پیدا ہوتی تو باپ اپنے ہاتھ سے اسے زمین میں زندہ دفن کر دیتا تھا، اسے عار آتا تھا کہ میرا کوئی داماد کہلائے، میرے گھر میں کوئی دوسرا آدمی آئے، بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اگر چار بیٹے ہیں اور رزق کی تنگی ہے تو باپ دو جوان جوان بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا کہ میرے پاس چار آدمیوں کے کھلانے کو نہیں ہے دو کو روٹی دے سکتا ہوں۔ تو قساوتِ قلبی کا یہ عالم تھا جس کو قرآن کریم نے فرمایا کہ ﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ﴾ ① اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے مت قتل کرو، رزّاق تو ہم کرتے ہیں تم کہاں سے دنیا کے رزّاق بنے ہو؟ رزق کی ذمہ داری تو ہم پر ہے۔ تو بے رحمی کا یہ عالم تھا کہ جو اپنی اولاد کو ذبح کرتے تھے دوسرے

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۳۱۔

خاندان والوں پر وہ کیا رحم کر سکتے تھے؟ اور دوسرے ملک کے مسافروں پر تو وہ کیا ہی رحم کر سکتے ؟ تو ڈکیتی، مار دھاڑ، قتل و غارت اور بدامنی پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی ، نہ ان کا کوئی نظام تھا ، نہ ان کا کوئی بادشاہ اور امیر مقرر تھا ، دنیا کی قومیں ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں ، کوئی کہتا تھا: اونٹوں کے چرانے والے ، کوئی کہتا تھا: مینگنی میں کھیلنے والے ، کوئی کہتا تھا: گندگیوں میں بسر کرنے والے ، یہ اس قوم کے القاب تھے ۔ تو عرب کی قوم دنیا کی متمدن قوموں میں سب سے زیادہ ذلیل قوم سمجھی جاتی تھی ۔ ان کے اندرونی اخلاق بھی بُرے ، اعمال بھی بُرے ، توحید بھی ندارد ، شرک میں مبتلا ، غیر منظم ، رات دن کے مصائب میں بھی مبتلا ، دنیا کی قومیں ان پر چھاپہ مارتی رہیں ، کبھی رومیوں نے چھاپہ مارا تو کبھی فارسیوں نے ، ہر ایک کی غلامی انہیں قبول کرنی پڑتی تھی اور وہ جھکنے پر مجبور تھے ۔ تو گویا حقیقی معنی میں نہ دن میں چین تھا ، نہ رات میں ، دلوں کے اندر بھی کوئی سکھ اور آرام نہیں تھا ، ایک بدیشی قوم تھی اور یہ مجموعی کیفیت تھی ۔ تو دنیا کے اعتبار سے بھی مشکلات میں مبتلا اور آخرت کے اعتبار سے بھی کھوئی ہوئی قوم تھی ۔

مقصدِ بعثتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)...... اس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی ، ان ظلمتوں میں فاران کی چوٹیوں سے آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور اس کی لمبی لمبی کرنیں پڑیں ، حجاز پر ہی نہیں بلکہ حجاز کے پورے ماحول اور دنیا کے سارے ممالک پر پڑیں ۔ آپ نے تشریف لا کر پروگرام بتلایا کہ یہ قوم مشکلات سے کیسے نکلے ! آپ نے اپنی بعثت کی غرض و غایت کیا ظاہر فرمائی ؟ دو باتیں جو دو حدیثوں میں بتائی گئی ہیں ظاہر فرمائیں ، فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ① میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ تمہیں تعلیم دوں اور علم سکھاؤں ، تمہاری جہالت دور کروں ۔ دوسری حدیث میں یہ فرمایا کہ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ② میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تا کہ تمہارے اخلاق کو پاکیزہ بناؤں ، تمہارے سامنے پاک اخلاق کا نمونہ پیش کروں اور اعلیٰ ترین اخلاق پر تمہیں لا کر کامل مکمل قوم بناؤں ۔ گویا دو اغراض ظاہر فرمائیں انہی دو چیزوں کے اندر قوم کا علاج پوشیدہ تھا ساری مشکلات اور مصائب کا ذریعہ دو چیزیں بنی ہوئی تھیں: ایک قوم کی جہالت دوسرے قوم کی بداخلاقی ، یعنی ان میں علمی قوت فنا ہو گئی تھی ، تعلیم ندارد کے طور پر تھی ، علمی قوت بھی فنا ہو گئی تھی کیونکہ اخلاق ندارد تھے ۔

عرب کی پس ماندہ قوم کو عروج کیسے ملا؟...... جب دنیا کی کوئی قوم برباد ہوتی ہے تو انہی دو قوتوں کی بنا پر تباہ ہوتی ہے کہ علم نکل کر اس میں جہالت آ جائے اور پاکیزہ اخلاق نکل کر اس میں بداخلاقی پیدا ہو جائے ۔ جب یہ دو عنصر جہل اور ظلم کسی قوم میں آئیں گے ، تو وہ قوم کبھی پنپ نہیں سکتی ۔ اور جب کسی قوم میں علم اور عدل آئے گا تو وہ قوم کبھی پست نہیں رہ سکتی ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض و غایت یہ دو چیزیں ظاہر فرمائیں

---

① السنن لابن ماجة، كتاب السنة ،باب فضل العلماء ...... ص: ۲۴۹۱ رقم: ۲۲۹.

② السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها. ج: ۱۰ ص: ۱۹۱ . حدیث صحیح ہے دیکھئے: المقاصد الحسنة، حرف الهمزه ج: ۱ ص: ۵۸.

کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ میں بھیجا گیا ہوں تا کہ اخلاق کے اعلیٰ ترین نمونے تمہارے سامنے رکھوں اور تمہیں ایک اخلاقی قوم بنادوں۔ اسی واسطے قرآن کریم کی جو سب سے پہلی آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ یہ تھی: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ ①
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا میں عبادت میں مشغول تھے، حضرت جبرائیل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ اِقْرَاْ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو پڑھا ہوا نہیں کہ کچھ پڑھ سکوں۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنے سینے سے چمٹایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اور اتنے زور سے دبایا کہ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَھْدُ میرے اوپر مشقت گزرنے لگی، یوں معلوم ہوا جیسے ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی، اس طرح سے مجھے دبایا اور پھر فرمایا اِقْرَاْ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا کہ مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں کس طرح پڑھوں؟ پھر دوبارہ انہوں نے سینے سے لگ کر دبایا پھر میرے اوپر مشقت گزری یوں معلوم ہوا جیسے پسلیاں ٹوٹ جائیں گی، اس کے بعد الگ کر کے فرمایا اِقْرَاْ، تین دفعہ اِقْرَاْ فرمایا اور آپ نے تین دفعہ ہی فرمایا: مَآ اَنَا بِقَارِیٍٔ میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن تیسری دفعہ دبانے کے بعد اِقْرَاْ کہا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o﴾ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ گویا سب سے پہلا اسلام کا حکم یہ تھا کہ پڑھو پڑھنے لکھنے کا حکم تھا اور اس کے بعد فرمایا کہ ﴿اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o﴾ اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے قلم سے تعلیم دی ہے ② یہ لکھنا تھا، تو پڑھنا اور لکھنا دو چیزوں کا حکم کیا گیا یہ دونوں بنیادیں ہیں قوموں کی ترقی کے لئے۔
مگر کونسا علم پڑھو ایک تو دنیوی علوم ہیں جن سے آدمی روٹی پکانا، مکان بنانا، کرسیاں بنانا، بہتر سامان بنانا سیکھ جائے، معاشرتی چیزیں ہیں، علم اس کا نام نہیں، اس کا نام تجربات، صنعت وحرفت اور دستکاری ہے۔ انبیاء علیہم السلام دستکاری یا صنعت وحرفت سکھلانے کے لئے نہیں آتے۔ یہ تو انسان کی طبعی صفت ہے دنیا میں کوئی نبی نہ آئے تب بھی انسان مکان بنا سکتا ہے روٹی پکا سکتا ہے کپڑا بنا سکتا ہے پہن سکتا ہے تو نبوت کا مقصد معاشرتی چیزوں کی تدابیر سکھلانا نہیں ہے، یہ تو انسان کی طبیعت ہے خود بخود کرتا ہے اور جتنا کرتا ہے بڑھتا چلا جاتا ہے بہتر سے بہتر چیز بننے لگتی ہے، خوشنما نمونے اور ڈیزائن اپنے تجربے اور طبیعت سے پیدا کرتا رہتا ہے اس کا نام علم نہیں اس کا نام صنعت وحرفت، دستکاری اور صناعی ہے اس کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے، اس کے ضروری ہونے سے انکار نہیں ہے۔

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱-۵. ② الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص: ۱ رقم: ۳.

علومِ طبعیہ کمالِ انسان نہیں ...... لیکن یہ چیزیں انسان کے طبعی علوم ہیں اور طبعیاتی علوم انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، ہر جاندار میں ہیں دنیا کا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جو اپنے رہن سہن کا ڈھنگ نہ جانتا ہو۔ ایک چڑیا گھونسلہ بناتی ہے اس کا وہی مکان ہے، ایک درندہ بھٹ بنا کے رہے گا اس کا وہی مکان ہے۔ تو پرندے چرندے اور درندے سب ہی رہتے ہیں (تو اپنے لئے موزوں مکان ہر جاندار بنا ہی لیتا ہے) کھانا ہے ظاہر بات ہے کہ سب جانوروں میں مشترک ہے، ہر ایک نے اپنی اپنی غذا کو پہچان رکھا ہے، اپنی اپنی غذا استعمال کرتے ہیں اور اس کے لئے کمانے کو بھی جاتے ہیں۔ چڑیا اپنے گھونسلے سے نکل کر کھیتوں میں جاتی ہے، دانہ چگتی ہے اس کے دل میں اللہ کی طرف سے الہام ہوتا ہے کہ گھر بیٹھے کچھ نہیں ملے گا، محنت کرنی پڑے گی تب چار دانے ہاتھ آئیں گے۔ شیر اپنے بھٹ سے نکلتا ہے اپنی غذا تلاش کرتا ہے اور خون پیتا ہے اس کے دل میں یہی الہام ہوتا ہے کہ تیری غذا بکری میں ہے یا ہرن میں ہے۔ تو کوئی جانور خون پیتا ہے، کوئی جانور گوشت کھاتا ہے کوئی دانہ چگتا ہے، ہر جانور کے دل میں اللہ نے ایک الہام ڈالا ہے اور اس کی طبیعت کے مناسب غذا مہیا کی ہے وہ جاتا ہے محنت کرتا ہے کھاتا ہے۔

اگر انسان بھی محنت کرے کھائے پیئے تو زیادہ سے زیادہ اس نے حیوانیت کا حق ادا کر دیا۔ اگر اسی کا نام علم ہے تو پرندے بھی عالم، درندے چرندے بھی علماء، سب کے سب ان چیزوں کو جانتے ہیں، سب کے سب عالم ہوتے تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو علم کہا جائے اور انسان یوں کہے کہ میں اشرف المخلوقات ہوں اور میں عالم ہوں اور میرا علم یہ ہے۔ یہ علم تو جانوروں کے پاس بھی ہے، شہد کی مکھی کتنا عمدہ مکان بناتی ہے، ہر پہلو سوراخ بناتی ہے۔ آپ پرکار سے بھی مشکل سے بنا سکیں گے وہ اپنے منہ سے بے تکلف بناتی ہے کہ ہر ہر سوراخ برابر ہے۔

پھر اس میں تنظیم کیسی ہے کہ بعض خانوں میں شہد بھرا ہوا ہے، یہ گویا قوم کی غذا ہے، بعض میں بچے پرورش پا رہے ہیں، بعض میں ماں باپ رہتے ہیں۔ ان کا ایک امیر مقرر ہے جس کا نام یعسوب ہے، ساری مکھیاں اس کی اطاعت کرتی ہیں جہاں وہ بیٹھتا ہے وہیں بیٹھتی ہیں اور شہد کا چھتہ لگاتی ہیں غرض ان کے اندر سیاست اور تنظیم بھی ہے اور امیر کا انتخاب و تقرر بھی ہے، امیر کی اطاعت اور تقسیمِ عمل بھی ہے کہ اتنے حصے میں غذا، اتنے حصے میں قوم اور اولاد، اتنے حصہ میں ماں باپ رہیں گے۔ تو اگر آپ نے ملت کی تنظیم ہی کر لی ہے، اچھا گھر بنا لیا اور نظامِ عمل سے کھانے پینے کے تمام معاملات درست کر لئے تب بھی زیادہ سے زیادہ وہ کام کر سکے جو شہد کی مکھی بھی کر لیتی ہے۔ اس کا نام نہ علم ہے نہ کمال ہے یہ تو ایک تجرباتی اور طبعی چیز ہے جو ہر انسان اور حیوان کرتا ہے تو حاصل یہ ہے کہ طبعیاتی علوم اپنے اپنے درجہ کے مطابق حیوانات میں بھی موجود ہیں اگر انسان میں بھی آ جائیں تو یہ ایسے بڑے کمال کی بات نہیں کہ انسان اپنے کو اشرف المخلوقات کہے۔

حیوانات میں دفعیہ امراض کا شعور ...... آپ کہیں گے ہم بیمار ہوتے ہیں ہمارے پاس علم طب ہے، ہم مطب کرتے ہیں، دوائیں تجویز کر کے علاج کرتے ہیں (یہ صرف انسان ہی کر سکتے ہیں ہر جاندار تو ایسا نہیں کر سکتا

اس لئے انسان اشرف المخلوقات ہوا) میں کہتا ہوں کہ حیوانات میں بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق علم طلب موجود ہے، اگر چہ حیوان ہے مگر بیدار ہوتا ہے اور دفعیہ کرتا ہے۔

بندروں کی چالاکی کا واقعہ...... مجھے یاد آیا کہ میں راجپوتانے گیا میرے بعض عزیز وہاں ملازم تھے ہندوؤں کی ریاست تھی۔ بندر چونکہ ان کے ہاں مقدس جانور سمجھا جاتا ہے اس لئے اس کو مارنے کی ممانعت تھی۔ جانور یہ ایسا ہے کہ نقصان بہت زیادہ کرتا ہے، ہمارا مکان ذرا کھلا رہ جاتا تو کہیں کپڑا لے گیا کہیں برتن لے گیا۔ اور کمبخت یہ ایسا موذی جانور ہے کہ اس میں یہ نہیں ہے کہ کپڑا لے جائے پھینک دے بلکہ مُنڈیر پر سامنے بیٹھ کر دکھا دکھا کے پھاڑے گا جیسے کسی کو چڑا رہا ہو، ایذاء رسانی بھی اس کے اندر عجیب ہے کہ طبیعت میں کوفت ہوتی تھی، جلن بھی پیدا ہوتی تھی مگر مارنے کی ممانعت تھی۔ چھپ چھپ کر ہم نے دس بیس بندر مار بھی دیئے، مگر وہ تو ہزاروں کا کنبہ تھا پہاڑی مقامات ہیں، ہزاروں بندر تھے تو ہم نے یہ ارادہ کیا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ سو پچاس بندر یکدم مریں تا کہ ان کو کچھ تو عبرت ہو اور ہمارے نقصان میں کچھ کمی کریں۔ ہم نے کچھ پیسوں کا زہر سنکھیاں خریدا اور آٹے میں ملا کر اس کی روٹیاں پکوائیں اور ایک ٹوکرا بھر کے چھت کے اوپر روٹیوں کا پھیلا دیا اور خیال یہ تھا کہ بندر آتے ہی وہ روٹیاں کھانا شروع کریں گے اور زہر چڑھے گا تو مرتے جائیں گے اور ہم بہت خوش ہوں گے کہ ہم نے انتقام لے لیا۔

مگر بڑا چالاک بہت ہی سیانا جانور ہے کچھ بندر آئے انہوں نے دیکھا کہ چھت کے اوپر روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں تو انہیں حیرت ہوئی کہ روٹیاں بکھری تو رہتی نہیں اس کے اندر کوئی بات ہے اور بجائے اس کے کہ وہ روٹیوں پر ٹوٹ پڑتے انہیں کھاتے...... وہ اُسے دیکھتا ہے وہ اُسے دیکھتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر روٹیوں کو دیکھتے ہیں گویا زبانِ حال سے یہ سوال تھا کہ یہ بات کیا ہے؟ روٹیاں پھیلی ہوئی کیوں پڑی ہیں؟ یہ عادت کے خلاف ہے دو چار منٹ کے بعد تین چار بندر چلے گئے ہم سمجھے کہ ہماری تدبیر فیل ہوگئی انہوں نے جا کر اپنے قبیلے اور خاندان میں کوئی اطلاع کی ہوگی تو دس بیس بندر بہت موٹے موٹے آئے اور آ کر بیٹھ گئے انہوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا روٹی کو کوئی ہاتھ نہیں لگا تا وہ اُسے دیکھتا ہے وہ اُسے دیکھتا ہے ہم سمجھ گئے کہ ہماری تدبیر دھری رہ گئی۔ یہ کمبخت کچھ سمجھ گئے کہ ان روٹیوں میں کچھ ہے اس کے تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ سوڈیڑھ سو کے قریب بندروں کی ایک قطار...... اس میں بڑے موٹے موٹے بندر جیسے قوم کے چوہدری ہوتے ہیں وہ جمع ہوئے اور روٹیوں کے ارد گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے، گویا گول میز کانفرس منعقد ہوئی کہ اس میں غور کیا جائے کہ روٹیاں کیوں پڑی ہیں، اس میں بھید کیا ہے؟ یہ عادت کے خلاف ہے، ایک آگے بڑھا اس نے روٹی کو توڑا اور سونگھا پھر دوسرا آگے بڑھا اس نے بھی روٹی کو توڑا اور سونگھا چار پانچ نے اسی طرح کیا انہوں نے اشاروں میں کچھ کہا ہو گا تو وہ سمجھ گئے اور دوسرے سب بھی وہاں سے بھاگ گئے۔ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ ہماری تدبیر فیل ہوگئی اور یہ سمجھ گئے ہیں تو ارادہ کیا کہ روٹیاں وہاں سے اٹھوالیں، وہ روٹیاں کسی کام کی بھی نہیں تھیں، ان میں تو زہر ملا ہوا تھا سوائے اس کے

کہ انہیں دفن کیا جاتا اس کے علاوہ وہ نہ کھانے کی نہ کھلانے کی تھی۔

اس کے بعد کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے تو دواڑھائی سو بندروں کی قطار دوڑی ہوئی چلی آرہی ہے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ہرے ہرے پتوں کی ایک ایک ٹہنی ہے، آئے آکر انہوں نے روٹیوں کے اردگرد بیٹھ کر روٹیوں کے ٹکڑے کئے اور قریب قریب اتنے ہی ٹکڑے کئے جتنی بندروں کی تعداد تھی۔ روٹیاں پچاس تھیں بندر دوسو کے قریب تھے تو اتنے ٹکڑے کردیئے کہ ہر ایک بندر کو ایک ٹکڑا آسکے۔''بندر بانٹ'' عرف میں مشہور ہے۔ سب نے مل کر ایک ایک ٹکڑا کھایا اور اوپر سے وہ پتے چبالئے اور دندناتے ہوتے چلے گئے، نہ کمبخت کوئی گرا، نہ مرا اور نہ بے ہوش ہوا۔

تو جنس کے اعتبار سے اگر آپ اطباء ہیں تو ان میں بھی اطباء ہیں، آپ جڑی بوٹی جاننے والے ہیں تو وہ بھی جاننے والے ہیں تو طبیب ہونا یا علم طب حاصل کرنا یہ بدن کی اصلاح کا علم ہے بدنی اصلاح جانور بھی کرتے ہیں یہ تو کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کہا جائے۔

ایک شبہ کا جواب...... اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! ہم تو بہت اعلیٰ اعلیٰ نہایت بہترین کپڑے پہنتے ہیں پچاس پچاس روپے گز کے، باریک میں باریک کپڑا اور موٹے میں موٹا کپڑا...... تو میں کہتا ہوں کہ خدا نے جانوروں کے بدن پر ایسی کھالیں پیدا کردی ہیں، شیر کو دیکھو وہ زرد رنگ کے بوٹوں کا کمبل اوڑھے ہوئے ہے، میلا بھی نہیں ہوتا، آپ کا کپڑا تو ہر دوسرے ہفتے میلا ہوگا، دھلنے جائے گا اسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں تو پھر آپکے کپڑوں میں کیا کمال باقی رہ گیا! یہ بھی دیکھئے مکڑی جال بناتی ہے گویا سفید سا ایک خیمہ تانتی ہے، پھر اسمیں بیٹھتی ہے وہ اتنا چکنا ہوتا ہے کہ آپ کے مانچسٹر کی ململ اتنی صاف اور چکنی نہیں ہوتی جتنا اس کا خیمہ صاف ہوتا ہے۔ بُنتی کہاں سے ہے؟ کوئی مشین اس کے پاس نہیں ہے، محض اپنے منہ اور ہاتھ سے بُنتی ہے اور اتنا صاف بُنتی ہے کہ آپ اس سے بہتر بناوٹ نہیں کرسکتے اور خیمہ بنا کر اس میں رہتی ہے۔ تو آپ کو خواہ مخواہ دعویٰ ہوگیا کہ ہم کپڑا بُننے والے ہیں، ہمارے پاس بہترین مشینیں ہیں، وہ بلا مشین کے بہترین بُن کر خیمہ لگالیتی ہے۔ تو کوئی چیز طبعیاتی امور میں ایسی نہیں ہے جو جانوروں کے اندر نہ ہو۔ تو میرا مطلب یہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام یہ علوم لیکر نہیں آئے، یہ علوم تو طبعیاتی ہیں، رہن سہن کھانے پینے، پہننے وغیرہ کے جتنے بھی علوم ہیں یہ اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر حیوان میں موجود ہیں، یہ انسان کی خصوصیت نہیں کہ وہ ان پر فخر کرسکے۔

باعث فخر علم کونسا ہے؟ ...... پھر آخر خصوصیت کیا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کاہے کیلئے آتے ہیں؟ خیمہ بُننا بتلانا یا تعمیریں سکھلانا یہ ان کا کام نہیں ہے، ان کا کام روحوں کی اصلاح کرنا، مخلوق کو سچے راستہ پر ڈالنا اور بچھڑے ہوئے بندوں کو خدا سے ملانا ہے تاکہ علم آنے لگے اور ان کے اندر اخلاق ربانی پیدا ہوں، صحیح معنی میں انسانیت آئے۔ تو انبیاء علیہم السلام آدمی بنانے کیلئے آتے ہیں، اس کے لئے اس علم کی ضرورت ہے جس سے روح اور قلب درست ہو۔ جس سے بدن سنور جائے وہ علم تو حیوانات میں بھی ہے، اسمیں انبیاءؑ کی ضرورت نہیں ہے، انبیاء کے علم کا

موضوع وہ علم ہے جو اللہ کی طرف سے آتا ہے، جس سے انسان کی روح میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، اللہ کی ذات وصفات کا علم، اس کے احکام کا علم، اس کی شریعتوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا علم ہے جس سے آدمی آدمی بنتا ہے۔ یہی علم ہے جو انبیاء علیہم السلام لیکر آتے ہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِقْـرَأْ بِـاسْـمِ رَبِّـکَ الَّذِیْ خَلَقَ o﴾ ① کہ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ یہ قرآن پاک کی پہلی آیت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرو جس میں رب کا نام پہلے آئے، رب کا تعارف ہو اگر آپ نے پہاڑوں کا، زمینوں کا، درختوں کا اور جانوروں کا تعارف حاصل کرلیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، تعارف تو اپنے خدا کا کرنا چاہیے کہ خدا کی ذات کیسی ہے، اس کی صفات کیسی ہیں، اس کی شانیں کیسی ہیں، اس کے احکام کیسے ہیں، اس کا دیا ہوا قانون کیسا ہے، یہ چیزیں جانوروں کو نہیں انسانوں کو دی گئی ہیں، اسی علم کی بناء پر اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور اپنا نائب بنایا ہے کہ وہ میرا علم لے کر آرہا ہے محض علم نہیں بلکہ وہ علم عقلوں سے بھی بالاتر ہے اور عقلیں بھی اسی سے درست ہوتی ہیں، یہ علم دے کر انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا۔ تو نبی آکر انسان کو انسان بناتے ہیں ان میں علم اور اخلاق پیدا کر کے انسانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

عرب قوم پر علومِ ربانی کا اثر...... عرب کے لوگوں میں جتنی بد اخلاقی اور جہالت پھیلی ہوئی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطاب کے بعد جب قوم نے آپ کی بات پر لبیک کہا اور علم حاصل کرنا شروع کیا، قرآن کریم نور بن کران کے دلوں میں سما گیا اور انکے اخلاق کو اونچا بنادیا اس وقت جوان کی حالت پلٹی ہے تو تیرہ برس کے اندر وہ کیفیت ہوئی کہ انہوں نے بڑے بڑے سلاطین کے تخت الٹ دیئے، دنیا میں انقلاب بپا کر دیئے، حکومتیں تہہ وبالا ہوگئیں ان کا عروج واقتدار پوری دنیا کے اندر پھیل گیا، آدھی دنیا پران کا پرچم لہرانے لگا، پچاس سال کے اندر نصف دنیا کے اوپر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، محض اس قرآن اور اخلاق کی بدولت اور محض ان علوم ربانی کی بدولت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیکر تشریف لائے تھے، آپ نے اس درجہ ان کے قلوب کو مصفّٰی کیا کہ وہ لوگ جو ایک ایک پیسے کے اوپر جان دیتے تھے لوگوں کا مال لوٹنے کیلئے ڈکیتیاں کرتے تھے، وہ اتنے غنی بنے کہ دنیا کے خزانے ان کے قدموں پر گرے، خود رکھنے کی بجائے وہ اسے لٹاتے تھے ان کا دل غنا سے بھر چکا تھا، تو وہ مال کو خادم جان کر استعمال کرتے تھے مال کو مخدوم نہیں جانتے تھے، انہوں نے مال و دولت کو قبلہ نہیں بنایا تھا دولت کو اپنا خادم جانتے تھے اتنا دلوں کے اندر غنا پیدا ہو چکا تھا۔

علی و جابر رضی اللہ عنہما کی دنیا سے بے رغبتی...... حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیت المال میں گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے فرمایا کہ یَادُنْیَا غِرِّیْ غَیْرِیْ ② اے دنیا دھوکہ کسی اور کو دیجیو، ہم تیرے دھوکے اور فریب میں آنے والے نہیں ہیں، ہم تجھے چاہنے والے نہیں ہیں۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۔ ② حلیۃ الاولیاء، علی بن ابی طالبؓ ج: ۱ ص: ۸۱۔ الشریعۃ للآجری، ج: ۳ ص: ۱۱۹۶۔

تقسیم شروع کر دو، لاکھوں روپیہ رات بھر میں غرباء اور مساکین کو لٹایا گیا یہ تو بیت المال کا قصہ تھا۔

لیکن کیفیت یہ تھی کہ غالباً حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں یہ لکھ پتی صحابہ میں سے تھے، امراء صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہے ایک دن حضرت گھر تشریف لائے تو طبیعت اداس اور منقبض تھی بیوی نے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے؟ فرمایا اداس اور بے چین ہو رہی ہے، بیوی نے کہا کیا بات ایسی پیش آئی؟ فرمایا خزانے میں روپیہ زیادہ جمع ہو گیا ہے، طبیعت پر بوجھ بڑھ رہا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں پریشانی ہو رہی ہے، ہمارا تو خزانہ خالی ہو تو تب پریشانی ہوتی ہے ان کا زیادہ بھر گیا تھا اس لئے پریشانی تھی۔ بیوی بھی صحابیہ تھی انہوں نے کہا کہ پھر اس میں بے چین ہونے کی کونسی بات ہے، غرباء میں تقسیم کرنا شروع کر دیں، کہنے لگے بات تو ٹھیک ہے، اسی وقت خزانچی کو حکم دیا تقسیم شروع کرو، رات بھر مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم ہوتا رہا غریبوں، بیواؤں، یتیموں، مسافروں اور مسکینوں کو دیا گیا صبح کو جو حساب لگایا گیا تو چھ لاکھ روپیہ رات بھر میں تقسیم ہوا۔ صبح آ کے بیوی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کیسی عمدہ تدبیر بتلائی، میری طبیعت ہلکی ہو گئی یہ وہ لوگ تھے جو ایک ایک پیسے کے اوپر جان لیتے اور جان دیتے تھے آج ان میں یہ غناء پیدا ہوا کہ ایک آدمی ایک رات میں چھ چھ لاکھ روپیہ لٹاتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے۔ یہ غناء کہاں سے پیدا ہوا؟ اخلاق کے اندر یہ بلندی کیسے آئی؟ یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض صحبت تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم اور قرآنی تعلیم کا اثر تھا جو روح بن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر رچ گیا تھا یہ کیفیت تو مردوں میں تھی۔

مال سے متعلق عورتوں کی فطری طبیعت ...... مردوں میں تو پھر بھی منہ دیکھے سخاوت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کو فطری اور طبعی طور پر دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اس واسطے کہ عورت تو زیوروں کے جھنکار میں پرورش پاتی ہے، اسی میں اس کی زندگی گزرتی ہے، بچی ہوتی ہے تو پیدا ہوتے ہی چھ مہینے کے بعد اس کے کانوں میں سوراخ کر کے سونا ٹھونس دیا جاتا ہے، ناک میں سوراخ کیا اس میں (سونے کی) کیلیں ٹھونک دیں اور عورت ہے کہ خوش ہے۔ اگر اس کے بدن کو چھلنی کر دیا جائے اور وعدہ دیدیا جائے کہ سونے کی کیلیں ٹھونکیں گے تو بلاشبہ تیار ہو جائے گی کہ بدن چھلنی کر دیا جائے اور سونے کی کیلیں ٹھونک دی جائیں۔ تو طبعی طور پر محبت ہوتی ہے اس لئے کہ بچپن سے زیورات کی جھنکار میں رہتی ہے جس کو قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ① فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ وہ تو زیوروں کی جھنکار میں پرورش پاتی ہے صبح و شام اس کو زیور کا شغل ہے تو سونے اور چاندی کی محبت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب خاوند کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے تو خاوند تو حجت پیش کرتا ہے دلیلیں پیش کرتا ہے، وہ مرغے کی ایک ٹانگ ہانکے جاتی ہے بیان میں چل نہیں سکتی، اس لئے کہ جس قلب کے اندر سونا چاندی رچ جائے وہاں علم کا رہنا مشکل ہے تو بیان اور علم کے اندر کمزور ہوتی ہے۔

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۱۸۔

بہرحال عورتوں کے اندر مال، زیور اور سونے چاندی کی طمع زیادہ ہوتی ہے مردوں میں اتنی نہیں ہوتی، مرد تو عورتوں کے مبتلا کرنے سے مبتلا ہوتا ہے۔ شادی کرنے سے پہلے مرد کے وہ جذبات نہیں ہوتے جو شادی کرنے کے بعد ہوتے ہیں وہ آتی ہیں اور راستہ بدل دیتی ہیں مرد میں ایک قسم کا غناء ہوتا ہے مگر عورت میں نہیں ہوتا۔

کسی ساہوکار کا قصہ مشہور...... وہ کسی ساہوکار کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے بیوی سے یہ کہا کہ وہ ذرا سل کا بٹہ میرے پاس اٹھالا (سل کا بٹہ جس سے مصالحہ پیسا جاتا ہے) تو اس نے اپنی نزاکت دکھلائی کہ میرے سے کیسے اٹھے گا؟ میں نازک اندام ٹھہری اور یہ سل کا بھاری پتھر اتنے وزن کا، مجھ سے کیسے اٹھے گا؟ وہ ساہوکار بڑا گھبرایا کہ اس نزاکت کے ساتھ میرا گزر کیسے ہوگا، میں تو کسان آدمی ہوں میری بیوی تو ایسی ہونی چاہیے جو محنت مزدوری کر سکے، کچھ بوجھ اٹھا سکے، یہ دو سیر سل کا بٹہ اٹھانا اسے بھاری ہو رہا ہے میرے گھر میں اس کا کیسے گزر ہوگا؟ مگر تھا وہ بھی ہوشیار، شام کو وہ آیا اور چپکے سے سل کا بٹہ اٹھا کے لے گیا اور اس کے اوپر سونے کا پتر چڑھوا کے ایسا کرادیا جیسے وہ سونے کا بنا ہوا ہے، گھر آیا اور بیوی سے کہا کہ میں اڑھائی سیر کا بڑا عمدہ زیور بنوا کر تیرے واسطے لایا ہوں اور مضبوط ایسا کہ دادا برتے، تو پوتا بھی برتے اس کے گھسنے کو کوئی صورت نہیں اور وہ میرے پاس ہے وہ اب شوق میں بے تاب ہے کہ جلدی سے اسے کھولے اور وہ ساہوکار ہے کہ شوق تو اسے دلا رہا ہے مگر کھولتا نہیں ہے کہنے لگا تو اسے پہنے گی؟ کہنے لگی یقیناً پہنوں گی، تھا تو وہ سل کا بٹہ لیکن اس پر پتر چڑھوایا اور سونے کی زنجیر بھی اس میں ڈلوا کے لایا تھا اس نے نکالا تو بڑی بے تابی سے اس نے گلے میں ڈالا اور دن بھر پہنے ہوئے پھر رہی ہے، کام کاج بھی کر رہی ہے، ساہوکار نے کہا کہ یہ زیور اچھا ہے؟ بوجھ تو نہیں لگتا؟ کہنے لگی کہ نہیں بالکل بوجھ نہیں لگتا، کہنے لگا کمبخت یہ وہی پتھر تو ہے جو تجھ سے کل نہیں اٹھتا تھا اور آج گلے میں ڈالے ہوئے پھر رہی ہے، محض اس لئے کہ اس پر سونے کا نام آگیا ہے۔

تو سونے اور چاندی کی محبت میں عورت غرق ہوتی ہے اور وہ مرد کو بھی مبتلا کرتی ہے، مگر یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض صحبت تھا کہ عورتوں کو بھی آپ نے اتنا غنی بنا دیا تھا کہ ان کے قلوب سونے اور چاندی سے بالاتر ہو گئے تھے۔

عائشہؓ کی سخاوت...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں، ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مکہ مکرمہ کے حاکم بنائے گئے خزانے کی بوری بھر کر اسمیں سونا چاندی، اشرفیاں اور روپوں سے اچھی طرح بھر کے اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بطور ہدیہ بھیجی، صدیقہ عائشہؓ نے باندی سے فرمایا کہ میں اتنی دولت کیا کروں گی غریبوں میں تقسیم کردو باندی نے تقسیم کرنی شروع کردی۔ دن بھر میں وہ ساری بوری ختم ہوگئی لاکھوں روپے کا سونا چاندی تھا وہ سب ختم ہوگیا شام کو باندی نے کہا: ام المومنین تین دن سے آپکے اوپر فاقہ ہے آپ نے بھی اس میں سے کچھ روپے

رکھ لئے ہوتے! فرمایا: اری جا بے وقوف! پہلے سے نہ کہا کہ میں بھی دو چار روپے رکھ لیتی جب بوری ختم ہوگئی جب تو نے کہا۔ تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر تین دن سے فاقہ ہے اسی کو یاد کر کے دو چار روپے رکھ لیتیں گویا اتنا استغناء قلب میں پیدا ہو چکا تھا کہ بوری رکھی ہے اور تین دن سے فاقہ ہے مگر دھیان نہیں جاتا کہ اسمیں سے کچھ اپنے لئے رکھ لیں۔ تو جب عورتوں کے قلوب ایسے بن گئے تھے تو اندازہ کیجئے مردوں کے قلوب کیسے ہوں گے!۔

نجومِ ہدایت کی دنیا و آخرت...... دنیا کی اقوام اگر نمونہ بھی پیش کرتی ہیں تو انہی بزرگوں کا نمونہ پیش کرتی ہیں آپ نے اخبارات میں دیکھا ہوگا غالباً جب ہندوستان میں کانگریس کی عارضی گورنمنٹ بنی ہے تو گاندھی جی نے اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا کہ اگر ہمارے کانگریسی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں ان کا سر اونچا رہے تو وہ صدیق رضی اللہ عنہ وعمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نمونہ اختیار کریں، جن کے قدموں میں دنیا کے خزانے ڈالے گئے، ملکوں کی دولتیں آئیں اس کے باوجود نہ ان کے پیوند لگے کپڑے چھوٹے اور نہ جو کی روٹی چھوٹی، نہ زیتون کا تیل چھوٹا، نہ ان کے ہاں بہت زیادہ مرغن کھانے تھے، نہ اعلیٰ ترین فرنیچر تھے، نہ لباس تھے تو اگر ہمارے کانگریسی وزراء عالمی وقار چاہتے ہیں تو وہ صدیق رضی اللہ عنہ وعمر و فاروق رضی اللہ عنہ کا نمونہ اختیار کریں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضِ صحبت کا ایسا اثر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ایسی معیاری زندگیاں بنا دیں کہ دنیا کی دوسری اقوام بھی ان کو نمونہ بنا کر پیش کریں۔ یہ صرف تعلیم قرآن کا اور اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا اثر تھا تو علم اور اخلاق کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ جو قوم دنیا کی ساری قوموں میں پس ماندہ اور پست تھی وہ اتنی اونچی بنی کہ ساری دنیا کی قومیں ان کے سامنے نیچی بن گئیں وہی زمانہ تھا جس کو زمانۂ جاہلیت کہا جاتا تھا۔ وہی زمانہ ہے اس کو تعلیم قرآن کی بدولت خیر القرون کہا جانے لگا جن لوگوں کو جہلائے عرب کہا جاتا تھا ان کی بداخلاقیاں بیان کر کے لوگ ملامت کرتے تھے اب تعلیم قرآن کی بدولت جب صحابہ کا ذکر آتا ہے تو لوگ رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ کہتے ہیں۔ یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا یہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم، تربیتِ اخلاق اور فیضِ صحبت کا ہی اثر تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو قوم کو اتنا اعلیٰ بنا دیا کہ جو قوم کی مشکلات تھیں سب ختم ہوگئیں، جو پس ماندگی تھی وہ ساری ختم ہوگئی، جس قصے میں قوم مبتلا تھی وہ قصہ سارے کا سارا ختم ہوگیا دنیا میں برسر اقتدار آگئی اور آخرت تو ان کی بنی ہوئی ہی تھی آخرت ان کی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرماتے ہیں: اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ ① میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں

① مسند عبد بن حمید، احادیث ابن عمرؓ، ج:۲ ص:۴۰۲. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ البیھقی واسندہ الدیلمی عن ابن عباسؓ بلفظ: اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء بأیهم اقتدیتم اهتدیتم. دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۱۳۲. اس حدیث کے بارے میں نہایت عادلانہ کلام حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف "التلخیص الحبیر" میں کیا ہے دیکھئے: التلخیص الحبیر، باب ادب القضاء ج:۵ ص:۴۹۸.

جس ستارے کی روشنی میں چل پڑو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ جس صحابی کا دامن تھام لو گے ہدایت پا جاؤ گے تو ایک ایک صحابی معیار بن گیا یا تو وہ جہلائے عرب تھے یا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بنے۔ یا ان کا راستہ قابل نفرت تھا یا ایسا بنا کہ عالم کیلئے باعث ہدایت بن گیا۔ اور فرمایا: لَا تَسُبُّوا اَصْحَابِیْ ① میرے صحابہ کی شان میں کوئی گستاخی مت کرو، کوئی کلمۂ توہین مت کہو اس لئے کہ ان کا ایک (مُدّ) صدقہ کرنا تمہارے اس صدقے سے بہتر ہے جو جبل اُحد کے برابر سونا دو، وہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے، ان کا سیر ڈیڑھ سیر جو کا صدقہ کرنا تمہارے پہاڑ برابر سونا صدقہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

اس لئے کہ ان کے قلوب میں للّٰہیت واخلاص ہے جو ان کے قلوب میں پیدا کیا گیا وہ بعد والوں کو میسر آنا مشکل ہے غرض سارے صحابہ کو ستاروں کے مانند فرمایا یہ تو صحابہ کرام ہیں خلفائے راشدین کے بارے میں فرمایا کہ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ② میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنتوں کو لازم پکڑو۔ دس صحابہ کا نام لے کر مُبَشَّرٌ بِالْجَنَّةِ فرمایا اور جنت کی بشارتیں دیں فرمایا: اَبُوْبَكْرٍ فِي الْجَنَّةِ وَعُمَرُ فِي الْجَنَّةِ وَعُثْمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَعَلِيٌّ فِي الْجَنَّةِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِي الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِي الْجَنَّةِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ۔ ③

تو دس صحابہ کرام کا نام لے کر نام بنام فرمایا کہ یہ جنتی ہیں تو آخرت ان کی یہ ہے اور دنیا کے لئے مقتداء اور نمونہ ہیں۔ دنیا میں جنت کی بشارت دے دی گئی اور دنیا کے اعتبار سے ان کی حکومت کا یہ عروج ہے کہ ان کا اقتدار قائم ہوا تو ان کا نام سن کر ان کی ہیبت اور ان کے رعب وجلال سے سلاطین دنیا کے پتے پانی ہوتے تھے۔

اس وقت آپ اور ہم جس حالت میں اب ہیں اسلام لانے سے پہلے وہ لوگ اس سے بدرجہا بری حالت میں تھے لیکن انہیں انقلاب بپا ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر ان کی دین دنیا کی مشکلات کو ختم کر دیا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا ④ اس امت کے اخیر کی اصلاح اسی چیز سے ہوگی جس چیز سے اس امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی تو امت کے اول طبقے کی اصلاح قرآن کریم، اس کی تعلیم اور اسی کے دیئے ہوئے اخلاق سے ہوئی تھی انہی چیزوں سے آج بھی امت کی اصلاح ہو سکتی ہے جس چیز سے امت کے اول حصہ کی مشکلات ختم ہوئیں تھیں اسی چیز سے امت کے آخر کی مشکلات بھی ختم ہو سکتی ہیں خواہ وہ کسی خطے کے رہنے والوں ہوں، ہند میں یا سندھ میں یا امریکہ وافریقہ اور ایشیا میں ہوں، جہاں مشکلات ہیں وہ ختم جبھی ہوں گی جب ان کا راستہ صحیح ہو جائے گا اور اسی لائن پر آ جائیں گے جس لائن پر جناب

---

① الصحيح للبخاري، كتاب المناقب، باب قول النبي ﷺ لو كنت متخذا خليلاً......، ص: ٢٩٩ رقم: ٣٦٧٣۔ ② السنن لابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين ج: ١ ص: ٤٩ رقم: ٤٢۔ ③ السنن للترمذي، ابواب المناقب، باب مناقب عبدالرحمن بن عوف رضي الله عنه ص: ٢٠٣٧ رقم: ٣٧٤٧۔ ④ شرح العقيدة الطحاوية، مقدمة ج: ١ ص: ٩۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ڈالا تھا۔

پاکیزہ اخلاق سے پاکیزہ اعمال واحوال سرزد ہوتے ہیں......تو انبیاء علیہم السلام، خصوصیت سے سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی مشکلات کو ختم کرنے کے لئے تشریف لائے اور اس کے لئے دو ہی طریقے اختیار فرمائے ایک تعلیم اور ایک تربیت، تعلیم کے ذریعہ علم پہنچایا تا کہ لوگوں کے دلوں میں روشنی پیدا ہو، اندھیرے ختم ہو جائیں اندھیروں میں کوئی قوم ترقی کی طرف نہیں چل سکتی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے علم کی روشنی بہم پہنچائی۔

دوسری چیز تھی قوتِ عمل، وہ اخلاق سے پیدا ہوتی ہے ان کے اخلاق درست کئے، قلب کے اندر جو مادے ہیں جب تک وہ درست نہیں ہوتے عمل درست نہیں ہوسکتا۔ ہر عمل پر قلب کے اندر ایک مادہ ہے اگر وہ مادہ سامنے نہ ہوتا وہ عمل سامنے نہ آتا مثلاً دادودہش اور فقیر کو دینا ہے، جب تک قلب کے اندر سخاوت کا مادہ نہیں ہوگا دادودہش کے افعال ظاہر نہیں ہوں گے۔ یہی حملہ آوری ہے دوسروں کے اوپر ہجوم کر کے جانا ہے جب تک شجاعت کا مادہ نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ مصائب کے اندر ضبط نفس ہے، واویلے سے بچنا، جب تک صبر کا مادہ نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ برائی کو دیکھ کر آدمی شرما کر بیٹھ جائے بُرائی کے پاس نہ جائے جب تک حیا کا مادہ اور خلق نہیں ہوگا یہ افعال ظاہر نہیں ہونگے۔ تو قلب کے اندر اخلاق کی مثال ایسی ہے کہ جیسا بیج ہوتا ہے ویسی شاخ نکلتی ہے ویسا ہی پھل لگتا ہے تو جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اعمال ہوتے ہیں اور جیسے اعمال ہوتے ہیں پھر ویسے ہی احوال وانجام اور ثمرات بھی نکلتے ہیں اسلام سے پہلے چونکہ اخلاق بُرے تھے تو بُرے افعال سرزد ہوتے تھے بُرے احوال سامنے آتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر قلب کو درست کیا اخلاق کو صحیح کر دیا تو پاکیزہ اخلاق سے پاکیزہ افعال سرزد ہونے لگے، پاکیزہ اعمال سے پھر پاکیزہ نتائج اور ثمرات بھی سامنے آنے لگے۔

حصولِ منزل کیلئے شریعت وطریقت دونوں ضروری ہیں......آدمی کے جب تک اخلاق درست نہ ہوں اعمال صحیح نہیں ہوسکتے، اور اخلاق درست ہوں لیکن علم نہ ہو تو عمل کا راستہ نظر نہیں آسکتا تو دونوں چیزیں لازمی ہیں کہ علم کا راستہ بھی سامنے ہو منزل بھی سامنے ہو اور چلنے کی طاقت بھی ہو جب تک دونوں چیزیں جمع نہیں ہوں گی نہ آدمی چل سکے گا نہ منزل مقصود تک پہنچ سکے گا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ریل گاڑی دیکھی ہوگی کہ انجن کے پیچھے جب ڈبے جوڑ دیئے جاتے ہیں تو وہ انہیں لیکر چلتا ہے لیکن انجن چلتا کیوں ہے؟ دو باتیں ہیں جن سے وہ چلتا ہے اور منزل مقصود پہنچتا ہے۔ پہلی چیز تو اس کے سامنے لائن بچھی ہوئی ہونی چاہیے اگر لائن نہیں ہوگی تو انجن چل ہی نہیں سکتا، تو سب سے پہلی چیز تو لوہے کی لائن ہے تا کہ وہ اس پر دوڑ کر چلے، دوسری چیز انجن کے اندر اسٹیم بھری ہوئی ہونی چاہیے اس کے اندر آگ پانی بھی ہو۔ آگ پانی نہ ہو تو کم سے کم کوئی بجلی پاور ہو جس سے اسٹیم اور گیس بنے تا کہ وہ چلے۔ تو ایک اندر اسٹیم اور آگ ہونی چاہیے اور دوسرے سامنے لائن بچھی ہوئی ہونی چاہیے جب دونوں چیزیں جمع ہوں گی تو انجن

چلے گا اور اتنی زور سے چلے گا کہ مہینوں کی مسافت دنوں میں طے کریگا اور دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرے گا۔ نہ صرف خود چلتا ہے بلکہ اس کے پیچھے جتنی گاڑیاں جوڑ دی جائیں منوں وزن کا لوہا جوڑ دیں سب کو گھسیٹ کر لے جائے گا اور منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔ یہ کب؟ کہ لائن بھی ہے اور اسٹیم بھی ہے، لیکن اگر آپ لائن ہی نہ بچھائیں تو اگر چہ اندر اسٹیم بھر دیں اسے چھوڑ دیں گے تو جتنا چلے گا زمین میں دھنستا چلا جائے گا منزل مقصود تک نہیں پہنچے گا اور اگر اسٹیم بھری ہوئی نہ ہوا اور لائن بچھی ہوئی ہو تو دھکیل دھکیل کے آپ اس کو کہاں تک چلائیں گے قریب تک چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا۔ پھر ہزاروں آدمی دھکیلیں گے تھوڑا چلے گا پھر کھڑا ہو جائے گا منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے گا تو منزل مقصود تک پہنچنے کی شرط یہی ہے کہ اندر آگ بھی بھری ہوئی ہو اور لائن بھی ہو وہ اندرونی طاقت ہے جس سے وہ دوڑتا ہے اور وہ سامنے راستہ ہے جس کے اوپر دوڑے گا۔ تو دونوں چیزیں ہونی چاہیے ایک راہ ہو، دوسرے چلنے کی قوت بھی ہو۔

ٹھیک اسی طرح ہر مؤمن و مسلم کو سمجھ لیجئے کہ وہ ایک انجن کی مانند ہے اس کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے لائن بھی سیدھی ہو اور اندر آگ بھی پڑی ہوئی ہو۔ جو سیدھی لائن ہے اس کا نام شریعت ہے ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ ① سیدھا راستہ جو اللہ تک پہنچانے والا ہے، اخلاق ربانی اور اعمال صالحہ تک پہنچانے والا ہے، انجام درست کرنے والا ہے اسی کو صراطِ مستقیم کہا گیا ہے یہ تو راستہ ہوا اور اندر عشق محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آگ ہونی چاہیے، اللہ کی محبت کی آگ اندر بھری ہوئی ہو کہ جس کے جذبے میں آدمی دوڑتا ہوا جائے۔ یہ دونوں چیزیں ہوں گی تو ایک مؤمن مسلم منزل مقصود تک پہنچے گا اگر اس کے سامنے شریعت کا راستہ ہی کھلا ہوا نہیں تو اللہ تک کیسے پہنچے گا؟ اور اگر راستہ سیدھا ہے مگر محبت کی آگ اندر بھری ہوئی نہیں ہے تو پھر چلے گا کیسے؟ اگر محبت کی آگ اندر بھری ہوئی ہو اور راہِ شریعت سامنے نہ ہو تو جتنا چلے گا زمین میں دھنستا ہوا چلا جائے گا اور اگر اندر آگ نہ ہو اور شریعت کی لائن بچھی ہوئی ہے مگر چلنے کا جذبہ نہیں، عمل کا کوئی داعیہ نہیں ہے تو وعظ کہہ کہہ کر منت کر کر کے آپ کہاں تک چلائیں گے، آج کسی نے وعظ کہہ دیا نماز پڑھ لی پھر بیٹھ رہے برسوں کو پھر کسی نے تقریر کی دو تین دن نماز پڑھ لی پھر سُست ہو گئے، اس طرح منزل مقصود تک تھوڑا ہی پہنچے گا وہ تو اندر داعیہ اور جذبہ ہونا چاہیے کہ ہزاروں روکنے والے ہوں پھر بھی نہ رُکے۔ تو دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک سیدھی لائن وہ شریعت ہے اور ایک اندر آگ وہ اخلاق ہیں تو اخلاقی قوت چلنے پر آمادہ کرتی ہے اور راہ کی قوت سیدھے راستہ پر چلاتی ہے علم سیدھا راستہ ہے اور اخلاق یہ چلنے کی قوت ہے۔ محض علم منزل مقصود تک چلا سکتا تو بڑے سے بڑا عالم بن جائے مگر اندر اخلاق ہی درست نہ ہوں کبھی راہ شریعت پر نہیں چل سکتا اور اخلاق درست ہو جائیں مگر راستہ معلوم نہ ہو تو من گھڑت طریق پر چلے گا خود گمراہ ہوتا جائے گا اور لوگوں کو بھی گمراہی پہ ڈالتا جائے

① پارہ:۸،سورۃ الانعام،الآیۃ:۱۵۳ .

گا اس لئے شریعت کی بھی ضرورت ہے اور طریقت کی بھی ضرورت ہے شریعت راہ بتلائے گی اور طریقت اخلاق وقوت پیدا کرے گی۔

تعلیم وتربیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ......اسی کیلئے اسلام میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں: ایک تعلیم جو علماء کرام مدارس میں بیٹھ کے سکھلاتے ہیں حلال وحرام یا جائز وناجائز بتلاتے ہیں۔ گویا راستہ دکھلاتے ہیں اور دوسرے تربیت جو صوفیائے کرام کرتے ہیں وہ قلب کے اندر قوت پیدا کرتے ہیں اور آگ لگاتے ہیں تاکہ اس کے زور سے آدمی آگے چلا جائے گویا قلب میں اتباع شریعت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

تو اگر آدمی نے پڑھ لکھ تو لیا مدرسہ میں جا کر تعلیم پائی مگر اخلاق درست نہ کئے، حرص وتکبر ایذا رسانی اسمیں موجود ہے تو وہ علم اور زیادہ وبال بن جائے گا وہی علم مخلوق کو ستانے اور پریشان کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ اور اگر اخلاق درست ہوگئے کہ نہ ایذاء رسانی کا جذبہ ہے نہ حرص وتکبر ہے، اچھے اخلاق ہیں مگر ان کو نمایاں کرنے کا راستہ سامنے نہیں ہے تو پھر بدعات میں گرفتار ہوگا، من گھڑت راہیں تجویز کرے گا، بناوٹی راہ ہوگی تو پھر بھی منزل مقصود تک نہ پہنچے گا۔ تو علم اور تصوف دونوں کی ضرورت ہے۔ شریعت کی بھی ضرورت ہے اور طریقت کی بھی، تعلیم کی بھی ضرورت ہے اور تزکیۂ نفس کی بھی، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں چیزیں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیلئے کیں، ایک طرف تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنی آیات کی تعلیم دیتے تھے آیات کے مطالب بیان فرماتے تھے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ حلال اور یہ حرام ہے اور دوسرے تربیت کی، صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال کی نگرانی کی کہ یہ کرتے کیا ہیں، راتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاگ جاگ کر دیکھتے تھے کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کیا عمل کر رہے ہیں دن کو دیکھتے تھے اور روک ٹوک ہوتی تھی۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگرانی شروع فرمائی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم عمل کیسے کرتے ہیں تو آپ نے دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں مگر اتنا آہستہ کہ کوئی کان لگا کے سنے تو مشکل سے سننے میں آئے ورنہ تلاوت کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مکان میں زور زور سے تلاوت کر رہے ہیں، سارا محلہ ان کی آواز سے گونج رہا ہے۔ صبح کو جب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر! آپ اتنا آہستہ قرآن شریف کیوں پڑھ رہے تھے کہ کان لگا کر بھی مشکل سے سنائی دیتا تھا؟ عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو اسے سنا رہا تھا جو نہ بہرہ ہے نہ مجھ سے غائب، ہر وقت حاضر وناظر ہے اور ہر وقت سننے والا ہے یعنی اللہ رب العزت، تو مجھے زیادہ شور مچانے کی کیا ضرورت تھی! میں غائب کو تھوڑا ہی سنا رہا تھا میں تو شنوا اور دیدہ کو سنا رہا تھا، بہرے کو نہیں سنا رہا تھا تو مجھے چیخنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے عمر آپ اتنا چلا چلا کر قرآن کو کیوں پڑھ رہے تھے؟ عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاُطْرِدُ

الشَّیْطَانَ. میں اس لئے زور سے پڑھ رہا تھا کہ شیطان کو بھگا رہا تھا اور سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا کہ تم بھی قرآن شریف پڑھو اور نماز ادا کرو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر! آپ آواز کو کچھ اونچا کرو اور اے عمر! آپ آواز کو ذرا دھیما کرو تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے ① تو یہ جائز و ناجائز کا مسئلہ نہیں تھا یہ قلب کی تربیت تھی اور قلب کا راستہ صحیح کرنا تھا کہ اعتدال کے ساتھ چلو تو جہاں آپ حلال و حرام بتلاتے تھے وہیں آپ قلوب کی راہ بھی درست فرماتے تھے تو جہاں آپ یہ فرماتے تھے کہ اس طرح نماز پڑھو، اس طرح روزہ رکھو، اس طرح حسن معاشرت سرانجام دو وہاں قلوب کی اصلاح بھی فرماتے تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے وساوس کا علاج...... ان عملوں کے کرنے میں اگر وسوسے آنے لگیں اور اس سے عمل خراب ہونے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسوسوں کا علاج بھی فرماتے۔ حدیث میں ہے ایک دفعہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ہمیں وسوسے بہت آتے ہیں اور اتنے آتے ہیں کہ بس انتہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وسوسے آتے ہیں؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا بیان کریں ایسے برے وسوسے آتے ہیں کہ زبان پر ہی لانے کو جی نہیں چاہتا! وسوسے یہ آتے ہیں کہ دل میں سوالات کا ایک سلسلہ پیدا ہوتا ہے دل میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین کو کس نے بنایا؟ جواب ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنایا آسمان کس نے بنایا؟ جواب دل سے یہ ملتا ہے کہ اللہ نے بنایا ہے چاند، سورج ستارے انسان اور حیوان کس نے بنائے؟ جواب ملتا ہے اللہ نے بنائے ہیں۔ ان سارے جوابات سے ہمارے ذہن میں ایک کلیہ بنتا ہے کہ ہر موجود کے لئے موجد کی ضرورت ہے ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کسی بنانے والے کی ضرورت ہے جو موجود ہوگا اس کا بنانے والا کوئی تو ضرور ہوگا۔ یہ سلسلہ جب دل میں آتا ہے تو دل میں یہ سوال بھی آتا ہے کہ اللہ بھی تو موجود ہے اس کو کس نے بنایا؟ اللہ میاں کا خالق کون ہے؟ اسے کس نے پیدا کیا؟ وہ بھی موجود ہے تو جب ہمارے دل میں یہ وسوسہ آ گیا کہ اللہ کا خالق کون ہے؟ تو ہمارا ایمان کہاں رہا؟ اور جب ایمان نہیں تو عمل معتبر نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل سے معطل ہو گئے، بعضوں نے عمل ترک کر دیا، کہ عمل کیا کریں جب ہمارے اندر ایمان ہی موجود نہیں، اس لئے کہ جب ہمیں یہ خیال آ گیا کہ اللہ کا بھی کوئی بنانے والا ہے، خالق کا بھی کوئی خالق ہے، اب ایمان کہاں رہا؟ ایمان تو جب ہے جب یوں سمجھے کہ وہ سب کا خالق ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے وہ خود بخود ہے یہ ایک وسوسہ تھا اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یا یہ سمجھے کہ ہمارے اندر ایمان نہیں رہا اور جب ایمان نہیں رہا تو عمل معطل ہو گیا تو عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو ایک روگ ہے کہ قلب کے اندر ایمان ہے ہی نہیں جب ایمان نہیں تو عمل بے کار ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلا دیا کہ ایمان موجود ہے اور اس کے موجود ہونے کی وجہ سے ہی تم وسوسوں کو برا جان رہے ہو۔ ②

① مسند احمد، ومن مسند علي بن ابي طالب ج: ۲ ص: ۳۲۹ رقم: ۸۲۳.

② الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب الوسوسة في الايمان، ج: ۱ ص: ۳۲۵ ومسند احمد، مسند ابي هريرة ج: ۱۷ ص: ۶۸.

اگر ایمان نہ ہو تو ہزاروں وسوسے آتے ہیں آدمی کبھی ان کو برا نہیں سمجھتا بلکہ ان تخیلات کو یوں سمجھتا ہے کہ بڑی حکمت کی بات ہے جو میرے ذہن میں آئی، اس پر غرور اور گھمنڈ کرتا ہے کہ میرا خیال تو ایسا ہے کہ دنیا سے گزر کر خدا تک بھی پہنچ جاتا ہے آسمانوں تک بھی جاتا ہے تو وہ فخر کرتا ہے اس لئے کہ ایمان ندارد ہے مگر چونکہ ایمان ہے اس لئے تم ان وسوسوں کو برا جان رہے ہو یہ کیسے خیال گزرا کہ ایمان نہیں رہا یہ سن کر ایسا ہو گیا جیسے پردہ اٹھ جاتا ہے اور معلوم ہوا کہ ایمان ہے ہمارا خیال غلط تھا۔

لہٰذا ہمیں عمل کرنا چاہیے عملی زندگی پھر ویسی بن گئی جیسے پہلی تھی ظاہر بات ہے کہ یہ کوئی حلال وحرام یا جائز وناجائز کا مسئلہ نہیں تھا یہ تو دل کی کلیں درست کرنے کی بات تھی، دل کی راہ درست کردی وسوسے نکال کر آپ نے ایک سیدھی راہ دکھلادی۔ اصطلاحِ شریعت میں اسی کا نام "تزکیۂ نفس" ہے یعنی نفس کو مانجھ کر برے تخیلات اور برے وسوسوں سے صاف کرنا بعضے وسوسے ایمان کو کھو دیتے ہیں بعضے آدمی کو اعمال سے بیکار بنا دیتے ہیں بعضے نیکی سے ہٹا دیتے ہیں ان وسوسوں کا قلب سے نکالنا یہ محض علم کا کام نہیں ہے کہ جائز وناجائز بتلا دیا جائے بلکہ یہ تربیت کا کام ہے صرف ہمت کا کام ہے کہ دلوں کو صحیح راستوں کے اوپر لگانا، زبان سے، اعمال سے، دعا سے اور ہمتیں باندھنے سے۔ یہ چیز تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔

تعلیمِ خداوندی کے بغیر خدا تک رسائی ممکن نہیں ...... تو دو چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تھیں ایک تعلیم اور دوسرے تربیت، تعلیم سے علم پہنچایا، تربیت سے قلوب کے اندر قوت پیدا کی۔ اس قوت سے جب صحابہ رضی اللہ عنہم چلتے تھے اور صحیح لائن پر چلتے تھے تو منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے اب ظاہر بات ہے کہ جب قوم میں علم نہ رہے تزکیہ نفس نہ رہے، تربیت اخلاق نہ رہے، علم کا نام بھی صفر ہو جائے کہ مسائل کا علم نہ ہو اخلاقی راہیں بھی بند ہو جائیں، یہ الگ چیز ہے کہ اپنی نیکی یا سلامت روی سے آدمی گناہوں میں مبتلا نہ ہو، مگر جب تک تعلیم نہ پائیں راستہ تو نہیں کھل سکتا، اور اللہ تک پہنچنے کا راستہ تو جب تک اللہ ہی کی طرف سے تعلیم نہ ہو جب تک انسان خدا تک کیسے پہنچے گا؟ اور جب اس راستہ پر چلنے کی قوت جو کہ اخلاقی قوت ہے وہی نہ ہو تو آدمی چلے گا کیسے؟ اگر ہر آدمی ایسا بن جائے دوسرے لفظوں میں قوم کی قوم ہی ایسی ہو جائے۔ تو اندازہ کیجئے کہ قوم کتنا گرے گی کتنا پست ہو گی اور اس پر اغیار کس طرح سے مسلط ہوں گے اور کس طرح سے وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو گی تو پریشانیوں کا ایک علاج تو مادی ہے جو کہ اسباب کے درجہ کی چیز ہے اس سے انکار نہیں وہ اپنی جگہ ہونا چاہیے وقتی تدبیریں ہونی چاہئیں انسان کرتا ہے لیکن بڑی تدبیر، ان چھوٹی تدبیروں کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ نگاہ خدا پر رہے، توکل اور بھروسہ اسی پر ہو تو پھر اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے اگر انسان اپنے بل بوتے پر تدبیر کرے اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع نہ ہو تو مدد نہیں آئے گی فرمائیں گے حق تعالیٰ تو ذمہ دار ہے جو تیرا جی چاہے کرتا رہ لیکن اگر آدمی ساری تدابیر کرنے کے بعد اللہ پر معاملہ کو چھوڑ دے کہ اے اللہ! میرے کرنے کا کام اتنا تھا میں نے کرلیا اب آگے آپ

جائیں آپ کا کام جانے تو پھر غیب سے مدد شروع ہوگی کہ جتنا انسان کی استطاعت اور قدرت ہے وہ تدبیر کر کے بالآخر اللہ کی طرف رجوع کرے، تبھی حق تعالیٰ سے معاملہ صاف ہوتا ہے تدبیر تو اتنی ہی کرے گا جتنی اس کی قوت ہے لامحدود قوت تو نہیں ہے کہ ساری تدبیریں کر جائے جتنی بساط ہے اسی قدر تدبیر کر کے بالآخر اسے اللہ کے حوالہ کرے گا جس کی قوت لامحدود ہے اور اخیر تک کی بات کو جانتا ہے اس کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔

بساط کے مطابق جدوجہد ضروری ہے...... حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کو بادشاہ وقت نے اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے بادشاہِ وقت کی مرضی کے خلاف (اور مرضی الٰہی کے مطابق) فتویٰ دیا تھا تو حکم دیا کہ شیخ کو جیل بھیج دو۔ جیل میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ جہاں جمعہ کا دن آیا تو صبح سے غسل کی تیاری کرتے تھے غسل کیا اور جیل میں جو بھی ان کے کپڑے تھے خود دھو کے صاف کر لیتے اور جب جمعہ کی اذان ہوئی تو جمعہ کی نماز کیلئے چلتے، مگر جیل کا دروازہ بند ہے، دروازہ کے قریب پہنچ کے واپس آتے اور آ کے ظہر کی نماز پڑھ لیتے۔ ہر جمعہ کو حضرت شیخ کا یہی معمول تھا لوگوں نے عرض کیا جب آپ کو معلوم ہے کہ آپ باہر نکل نہیں سکتے آپ کی قید کی مدت ختم نہیں ہوئی تو آپ پر جمعہ واجب ہی نہیں پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ آپ جمعہ کی نیت سے کپڑے بدلیں اور پھر جمعہ کے قصد سے چلیں دروازہ پر پہنچیں تالے کو ہاتھ لگا کے واپس آئیں اور آ کر ظہر پڑھیں آپ پہلے ہی نماز ظہر کیوں نہیں پڑھ لیتے؟ فرمایا کہ میں بھی یہ جانتا ہوں کہ میں تالا نہیں کھول سکتا، جیل سے باہر جا کر جمعہ کی نماز ادا نہیں کر سکتا مگر جمعہ کی ادائیگی میں جتنا میرے امکان اور قوت میں ہے اتنا تو فعل ادا کر دوں، اور جہاں میری قوت سے خارج ہو میں اللہ کے حوالہ کر کے چلا آؤں اور یہ عرض کر دوں کہ یا اللہ جیل کے دروازے تک آ جانا تو میری قوت میں تھا وہ میں نے کر لیا اب آگے میری قوت سے خارج ہے آگے آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ آپ کر دیں میری نیت تو یہی ہے کہ میں آپکے حکم کی تعمیل کروں میں آپ کے حکم پر راضی ہوں۔

شیخ الہندؒ کا جذبہ...... تو یہ صورت ہونی چاہیے کہ جتنی تدبیر بس میں ہو اتنی کر لینی چاہیے اس سے آگے اللہ پر چھوڑ دے کہ یہ آپ ہی کے قبضہ میں ہے آپ ہی کرنے والے ہیں۔ حضرت شیخ الھند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ مجھے یوں حکم دیں کہ! اے محمود حسن! تم آسمان پہ چلے آؤ تو ظاہر بات ہے کہ انسان تو آسمان پر نہیں پہنچ سکتا لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں نہیں پہنچ سکتا میں کہوں گا حاضر ہو رہا ہوں اور آسمان پر پہنچنے کیلئے یہ تجویز کروں گا کہ جو دنیا میں سب سے اونچا پہاڑ ہے اس پر جا کے چڑھوں، چاہے مجھے دس مہینے کا سفر کرنا پڑے، اور اس کی سب سے اونچی چوٹی پر جو سب سے اونچا درخت ہوگا اس پر چڑھوں گا اس کے اوپر چڑھ کے عرض کروں گا یہاں تک تو میرے قبضہ میں تھا آگے میرے بس میں نہیں اب آپ مجھے آسمان پر پہنچا دیں تو فرمایا کہ گھر بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ میں آسمان پر کیسے پہنچوں گا جتنا آدمی کے بس میں ہو اتنا کرے آگے اللہ کے حوالے کرے۔

تو یہی صورت دین اور دنیا کی تدبیروں میں ہوتی ہے کہ جتنا انسان کے بس میں ہے وہ تدبیر کرے اور اس کے

بعد اللہ کے حوالہ کرے اپنے کو اپنا ذمہ دار نہ سمجھے کہ سارے کام میں اپنی تدبیر سے نکال لوں گا ہر جگہ انسان کی تدبیر نہیں چلتی جہاں چلتی ہے انجام دے لے۔ نماز کا حکم ہے فرض کیجئے آپ خدانخواستہ مسجد میں جانے سے معذور ہیں تو دروازے تک چلیں آگے چلنے سے معذوری کا اظہار کر دیں کہ یا اللہ آگے نہیں چل سکتا تو جتنی قوت تھی وہ تو آپ نے صرف کر دی لیکن اگر چارپائی پر بیٹھ کر ہی کہہ دیں کہ میں تو مسجد تک نہیں جا سکتا، یہ معتبر نہیں ہوگا۔ اپنی بساط کے مطابق جدوجہد ضروری ہے۔ تو دین کی پیچیدگیاں ہوں یا دنیا کی مشکلات جتنی جدوجہد اپنے سے بن پڑے اجتماعی طور پر یا انفرادی طور پر اسکو انجام دیا جائے ازاں بعد اللہ کو برتر سمجھا جائے اور ان کے سامنے عرض کر دے کہ میں تو اتنا کر سکتا تھا، آگے آپکے بس میں ہے آپ کو قدرت ہے۔

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ سکھلایا جہاں تک ان کے بس میں تھا وہ جدوجہد کرتے تھے، جان تک دینے میں دریغ نہیں کرتے تھے غرض قوم جب بھی دینی اور دنیوی مشکلات میں مبتلا ہو تو سب سے پہلے قرآنی تعلیمات کی روشنی کی طرف رجوع کیا جائے قرآن حکیم ایسی مشکلات میں کیا حکم دیتا ہے؟ اس کو پڑھا جائے، پڑھنے والوں سے سنا جائے، ان کے سامنے معاملے کو رکھا جائے، دنیوی معاملہ ہو یا اخروی۔ آخر حضرات صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کس طرح کامیاب ہوئے؟ تو تدبیریں تو لکھی پڑی (موجود) ہیں وہی ہمیں حاصل کرنی چاہئیں، اگر دل کے اندر الجھن ہے عبادت کا راستہ اختیار کرے، اگر دنیا کی الجھن ہے صحیح معاشرت کا راستہ اختیار کرے، روحی الجھن ہے تو اخلاق کی پاکیزگی کا راستہ اختیار کرے مگر ہر ایک کی کچھ تدبیریں ہیں نہ گھر بیٹھے اخلاق درست ہوتے ہیں اس کیلئے بھی کچھ محنت کرنی پڑتی ہے نہ گھر بیٹھے عبادات ہوتی ہیں ان کے لئے بھی کچھ تدبیریں کرنی پڑتی ہیں نہ گھر بیٹھے معاشرت درست ہوتی ہے اس کیلئے بھی کچھ تدبیریں کرنی پڑتی ہیں تو ساری تدبیریں قرآن کریم میں بتلا دی گئی ہیں اور جامع تعلیم دی گئی ہے۔

غیر مسلم اقوام کا اعتراض...... اسلام پر تو دشمنوں کا الزام ہی یہ تھا کہ یہ بہت بڑا جامع مذہب ہے اسمیں ہر قسم کی ہدایت موجود ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر مکہ کے ایک مشرک نے طعن کیا اور کہا کہ تمہارا نبی تمھیں ہر قسم کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ ہگنا اور موتنا بھی سکھاتا ہے گویا تحقیر کے ساتھ کہا کہ دین میں تو بڑی بڑی باتیں ہونی چاہیے تمہارے دین میں تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہیں۔ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر تعجب کیا ہے بے شک ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں ہر ہر چیز سکھلاتے ہیں حتیٰ کہ استنجاء کے آداب تک ہمیں بتلاتے ہیں جو بہت حقیر چیز ہے مگر اس کی بھی تعلیم دی ہے، نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ وَلَا بِبَوْلٍ ① ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ہم استنجاء کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت کر کے بیٹھیں وَنَهَانَا اَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلٰثَةِ اَحْجَارٍ ② اور استنجاء کیلئے ہم تین ڈھیلے

① الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب الاستطابة، ص: ۲۲۳ رقم: ۶۰۶. ② ايضاً.

لیں سنت طریق یہی ہے اس سے کم نہ لیں، جس ملک میں ڈھیلا نہ ہو انہیں جو چیز بھی استعمال میں آسکتی ہے وہی استعمال کی جائے، بعض جگہ کاغذ استعمال کیا جاتا ہے، یہ بھی زیر بحث ایک مسئلہ ہے کہ کاغذ سے استنجاء کیا جائے یا نہیں جائز ہے یا ناجائز منشاءِ سوال یہ ہے کہ کاغذ کے اوپر تو علم کی باتیں، قرآن اور حدیث بھی لکھا جاتا ہے، کیا اس کو آلودہ کیا جائے؟

کاغذ بھی مختلف طریقوں سے بنتے ہیں، بعض کاغذ بنائے ہی اس مقصد کیلئے جاتے ہیں کہ وہ استنجاء کرنے میں کام آئیں اور جن جگہوں یا مواقع پر پانی بھی موجود نہ ہو مٹی بھی موجود نہ ہو تو اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہوتی۔ تو جو کاغذ ہی اسی کیلئے مخصوص ہوں انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے کپڑے ہیں بعضے کپڑے پہننے کے ہیں، بعضے اوڑھنے کے لئے ہیں، بعض بچھانے کے لئے ہیں جو بچھانے کیلئے ہیں انہیں پہن نہیں سکتے! جو پہننے کے لئے ہیں انہیں بچھا نہیں سکتے، اپنے اپنے موقع پر انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے تو غرض سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا بے شک ہمارے نبی کریم ہمیں ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ استنجاء کے آداب بھی بتلاتے ہیں تو دین اسلام پر تو اعتراض ہی یہ تھا کہ وہ بڑا جامع مذہب ہے ہر چیز کی تعلیم اس میں موجود ہے تو ایسے جامع دین کی قوم ہو اور وہ عاجز آئی ہوئی ہو کہ ہم کیسے راستہ طے کریں حالانکہ سارے راستے بتادیئے گئے ہیں، وجہ یہ ہے کہ تعلیم پاتے ہیں اور نہ علم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اسلام کو مٹانے کے ذمہ دار مسلمان خود ہیں...... دنیا میں کوئی مذہب باقی نہیں رہ سکتا جب تک اس کی تعلیم باقی نہ رکھی جائے جس مذہب کی تعلیم مٹ جاتی ہے وہ مذہب بھی باقی نہیں رہتا یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اسلام کو ابدی مذہب بنایا ہے جو قیامت تک مٹنے والا نہیں ہے لیکن ہم نے اس کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اس لئے کہ جب اسکی تعلیم کو سرے سے ختم کر دیا جائے اور مذہب کی بقاء تعلیم پر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں اُسے ختم کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ طبقات ایسے ضرور رہیں گے جو علم اور اخلاق کو محفوظ رکھیں گے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **لَاتَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَّنْ خَاذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰهِ** ① میری امت میں ہمیشہ ایک طبقہ رہیگا ایک جماعت حقہ رہے گی جو وہی کہتی رہے گی جو میں کہہ رہا ہوں، اور وہی کام کریگی جو میں کر رہا ہوں، وہی عقیدہ رکھے گی جو میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ تو قیامت تک ایک جماعت ضرور قائم رہے گی جو امر حق کو پہچانتی رہے گی یہ بھی فرمایا کہ فرقے پیدا ہونگے اور اختلافات بھی پیدا ہونگے متعدد جماعتیں بھی ہوں گی، مگر ساتھ ساتھ ایک حق کا طبقہ بھی رہیگا تو دین نہیں مٹے گا اصلیت ہمیشہ قائم رہے گی جہاں گمراہ کرنیوالے ہوں گے وہاں ہدایت بخشنے والے بھی ہوں گے۔ تو یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دین ختم نہیں ہوگا مگر اسباب کے درجہ میں ہم نے اس کے ختم کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تو یہ ہماری کوتاہی ہے حق تعالیٰ شانہ نے جو وعدہ دیا ہے کہ ایک جماعت حقہ قائم رہے گی تو پھر ہمارا فرض ہے کہ اسی

---

① السنن للترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء في الئمة المضلين ج:٨ ص:١٧٢.

جماعت حقہ کی پیروی میں ہم بھی قرآن وحدیث اور فقہ کی صحیح تعلیم حاصل کریں تاکہ امت مسلمہ اپنے مزاج کے مطابق آگے بڑھ سکے۔

مسلم اقوام اپنے مزاج پر چل کر ترقی کر سکتی ہیں...... دنیا کی ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے یہود ونصاریٰ کا ایک مزاج ہے، مشرکین کا ایک مزاج ہے، مسلمانوں کا بھی ایک مزاج ہے یہ جب بھی ترقی کریں گے اپنے مزاج کے مطابق چل کے کریں گے۔ اگر ایک قوم دوسری قوم کی نقالی کرنے لگے کہ جیسے آج کا مزاج ہے میں بھی اس طریق پہ چلوں وہ نہیں چل سکے گی، اس لئے کہ طبعی طور پر اس کا مزاج یہ نہیں ہے تو ہر ایک قوم کو اپنی بنیاد پر اپنی عمارت اٹھانی چاہیے اگر دوسرے کی بنیاد پر آپ نے تعمیر اٹھائی تو وہ کل کو کہہ سکتا ہے کہ اپنا ملبہ اٹھا کے لے جاؤ زمین میری ہے بنیاد میری ہے اس لئے اپنی بنیاد پر اپنی عمارت اٹھانی چاہیے اپنی قومی تعمیر اپنی ہی خصوصیات پر ہو جو اسلام نے بتلائی ہیں اور وہ بغیر علم کے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ تو دنیا میں جامع ترین مذہب اسلام ہے زندگی کے ہر شعبہ میں اس نے مکمل تعلیم دی ہے کھانے، پہننے اور سونے کے اس نے طریقے بتلائے ہیں رہن سہن کے ڈھنگ بتلائے ہیں، صلح وجنگ کے طریقے بتلائے ہیں، حکومت کرنے کے طریقے بتلائے ہیں، نظام ملت کے طریقے بتلائے ہیں مگر وہ جبھی تو سامنے آئیں گے جب آدمی علم حاصل کرے۔ حدیث کے ہزاروں ابواب ہیں، فقہ کے ہزاروں ابواب ہیں، ہر باب میں زندگی کے موڑوں کا تذکرہ ہے، عبادت معاشرت اور سیاست کے الگ الگ باب ہیں، مقدموں کے فیصلہ کرنے کا باب الگ ہے، جنگ وجہاد کا الگ ہے، کھیل کا باب الگ ہے جس باب کو آپ کھولیں گے اسمیں مفصل احکام نکلیں گے، تو جامعیت جبھی پیدا ہوگی، جب آدمی اس کی تعلیم پائے، تربیت حاصل کرے۔

حصول تعلیم وتربیت کا سہل طریقہ...... اور تعلیم پانے کا طریقہ ظاہر بات ہے کہ علماء کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس عالم نہیں ہے تو آپ کہیں سے بلائیں اور اس سے تعلیم حاصل کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم میں سے چند افراد دوسری جگہ بھیجیں تاکہ وہ علم حاصل کر کے آئیں اور آ کر اپنی قوم کی اصلاح کریں تو خواہ باہر سے کوئی عالم آئے یا اپنے میں سے بھیج کر اسکو عالم بنوائیں دونوں صورتوں میں ایک صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ میں تو کہتا ہوں ہر خاندان اور گھر میں اگر پانچ بچے ہوں تو آپ چار کو دنیوی تعلیم پڑھوائیں اور کم از کم ایک کو دینی تعلیم کیلئے وقف کر دیں اگر گھر میں ایک بھی دین کا جاننے والا ہوگا وہ سب کی اصلاح کر دیگا اور راہ درست کر دے گا، لیکن اگر گھر کا گھر ہی غلط راستہ پر پڑ گیا تو پھر اصلاح کی توقع مشکل ہوگی، تو ایک کو کم از کم ایسا ضرور رکھیں جو دینی تعلیم کا حامل ہو یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر ہر شخص عالم بنے لیکن "ضروریاتِ دین" کا علم حاصل کرنا تو ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، روزمرہ کے دینی اعمال، فرائض پنجگانہ، زکوٰۃ، حج اور روزہ یہ فرائض ہیں ان کا علم ہونا فرض ہے اسی طرح یہ کہ میں مسلمان کیوں ہوں؟ مسلمان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اسلام وایمان کے معنی کیا ہیں؟ نیکی اور اخلاق کے کیا معنی ہیں؟ یہ اجمالی باتیں تو ہر ایک پر فرض ہیں لیکن تفصیلی طور پر عالم

بننا یہ ہر ایک پر فرض نہیں ہے یہ تو سو میں ایک بھی بن گیا تو انشاء اللہ وہ سب کی اصلاح کردے گا پانچ سو میں سے ایک ہی ہو جائے تو کافی ہے ایک خاندان میں ایک عالم بھی ہو جائے تو سب کی اصلاح کر سکے گا۔

قومی مشکلات کا اجمالی حل...... تو جناب رسول اللہ نے اپنا وظیفہ یہی بتلایا کہ "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور "بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ" میں اخلاق کی تکمیل کیلئے آیا ہوں۔ تو یہی فریضہ اُمت کا بھی ہونا چاہیے کہ امت معلم بنے، اپنے لئے بھی اور غیروں کے لئے بھی، مربیِّ اخلاق بھی ہو، اپنے لئے بھی اور غیروں کیلئے بھی۔ اس کے ہاں مدارس بھی ہونے چاہئیں اور اس کے ہاں تربیت گاہیں بھی ہونی چاہئیں، مدارس کے ذریعہ سے علم پھیلے گا اور تربیت گاہوں کے ذریعہ اخلاق درست ہوں گے۔ تو پوری قوم کے لئے یہ ضروری ہے کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کرے جن کے ذریعہ دینی معلومات حاصل ہوں اور وہ پڑھیں اس انداز پر کہ قوم کے ایک ایک بچے کو ضروریاتِ دین کا علم ہو جائے برس دن میں ہو، چھ مہینے میں ہو، دو برس میں ہو مگر وہ لگیں اور اتنا علم ضرور حاصل کرلیں۔ اور بڑا علم حاصل کرنے کے لئے بڑے مدارس ہیں وہاں بھیج دیا جائے پوری بستی میں سے، پورے گاؤں میں سے ایک آدھ چلا جائے کافی ہے اور وہ یہاں آکر اصلاح کرے، تو اسکے بغیر قوم کی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں، یہ گویا ایک اجمالی تدبیر ہے، تفصیلات تو اسکی زیادہ ہیں کہ مشکلات کی نوعیت کیا ہے اس کا علاج کیا ہونا چاہیے؟ جس قسم کی مشکل ہے تو اسی قسم کا علاج پوچھا جائے وہ تو ہے لمبا قصہ وہ تو جبھی ہو گا جب کوئی معلم و مربی سامنے ہو اور وہ مشکلات اس کے سامنے پیش کی جائیں، وہ اس کا حل بتائے، جزوی طور پر بالا جمال یہی ہے کہ تعلیم سے علم ہو اور تربیت سے اخلاق ہوں تو قوم پلٹ جائے گی بہت سی مشکلات کا حل تعلیم سے ہوتا ہے بہت سی مشکلات کا حل نیکی تقویٰ اور نیک اخلاقی سے ہوتا ہے تو حل ہو جائے گا۔

تو میں نے اس لئے یہ دو حدیثیں پڑھی تھیں کہ انبیاء قوموں کی مشکلات رفع کرنے کے لئے آتے ہیں اور سید الانبیاء بھی اپنی قوم کی اور اپنی امت کی مشکلات ہی رفع کرنے کے لئے تشریف لائے، اور تشریف لانے کی غرض وغایت دو باتیں ظاہر کیں تعلیم دینا اور تربیت کرنا، اس سے خود بخود نکل آیا کہ مشکلات کا حل انہی دو چیزوں کے اندر ہے تعلیم و تربیت میں۔ آپ نے تعلیم و تربیت کی تو اس قوم کیلئے حل نکل آیا جو صدیوں سے مشکلات میں مبتلا تھی اور اس کے بعد بھی یہی ہوتا رہا کہ جب امت پر مصائب پڑے جبھی کوئی اہل علم کھڑا ہوا جبھی علم نے راہنمائی کی جبھی اخلاق نے راستہ دکھایا اور چلایا تو قوم کی مشکل حل ہوگئی آج بھی اسی طرح مشکل حل ہوگی۔

یہ چند باتیں تھیں جو اس وقت ذہن میں تھیں وہ میں نے عرض کیں ان دو حدیثوں کو پیش نظر رکھا جائے جتنا آپ سوچیں گے، انشاء اللہ اس میں سے مشکلات کا حل نکلے گا اللہ تعالیٰ ہماری ساری مشکلات کو رفع فرمائے اور حق تعالیٰ شانہ ہمارا راستہ درست فرمائے، علم وعمل کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمارے اخلاق درست فرمائے، آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

قرآن حکیم کی عملی تفسیر

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــا بَعْـــدُ!

جہانوں کا دستورِحیات...... بزرگانِ محترم! سرکارِ دوعالم فخرِ بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدسہ اپنی ظاہری وباطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں، وہ کسی شخص واحد کا دستورِ زندگی نہیں، بلکہ جہانوں کے لئے ایک مکمل دستور حیات ہے۔جوں جوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا انسانی زندگی کی دشواری اور ہمواری کے لئے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اس کا تمدن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نا معلوم کہاں تک جا پہنچے اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیل جائیں اور پھیل کر زمین وآسمان اور فضاء وخلاء سب ہی کو ڈھانپ لیں پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اس کے تدین کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی تقویم واصلاح کے لئے شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوتے رہیں گے جیسا کہ وہ اب تک زمانہ کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے اور ان میں سکون واطمینان کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

ذاتِ نبوی میں علوم قرآنی کا ظہور...... اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ ① کے بارے میں جب حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ علیہ السلام کی اس خلق عظیم کی سیرت واخلاق کے سلسلہ میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ وَکَانَ خُلُقَہُ الْقُرْاٰنَ ② آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق وسیرت قرآن ہی تو ہے اور قرآن کے بارے میں خود حضرت صاحب سیرت علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ: وَلَا تَنْقَضِیْ

① پارہ: ۲۹، سورۃ: القلم، الآیۃ: ۴. ② مسند احمد، حدیث السیدۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا ج: ۵۰ ص: ۱۱۶.

عَجَائِبُهُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ ① اس قرآن کے عجائبات (علوم ومعارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پرانا نہیں ہوگا (کہ اس سے دل اکتا جائیں)۔

اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منتہی ہونے والے نہیں فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں لامحدود عجائبات علمی ہیں اور ذات بابرکات نبوی کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں گویا ایک علمی قرآن ہے اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں محفوظ ہے اور دونوں آپس میں ایک دوسرے پر من وعن منطبق ہیں پس قرآن کا کہا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے، اس لئے قرآن حکیم کی یہ ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرتِ مقدسہ کے عملی پہلو ہیں۔ پس قرآن میں جو چیز ''قال'' ہے وہی ذات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ''حال'' ہے اور جو قرآن میں نقوش ودال ہیں وہی ذات اقدس میں سیرت واعمال ہیں، اسی لئے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں مشخص ہوتی ہیں اور قرآن سے سیرت کی علمی ہیئتیں کھلتی ہیں۔

اس لئے قرآن حکیم کے مختلف مضامین سے اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن میں ذات وصفات کی آیتیں آپ علیہ السلام کے عقائد ہیں۔ اور احکام کی آیتیں آپ علیہ السلام کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا استدلال ہیں۔ اور تشریح کی آیتیں آپ کا حال، قصص وامثال کی آیتیں آپ کی عبدیت ہیں۔ اور کبریائے حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی نیابت۔ اخلاق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی حسن معیشت ہیں۔ اور معاملات کی آیتیں آپ علیہ السلام کا حسن معاشرت۔ توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی خلوت ہیں۔ اور تربیتِ خلق اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی جلوت۔ قہر وغضب کی آیتیں آپ علیہ السلام کا جلال ہیں۔ اور مہر ورحمت کی آیتیں آپ علیہ السلام کا جمال، تجلیاتِ حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کا مشاہدہ ہیں۔ اور ابتغاءِ وجہ اللہ کی آیتیں آپ علیہ السلام کا مراقبہ۔ ترکِ دنیا آپ علیہ السلام کا مشاہدہ ہیں۔ احوالِ محشر کی آیتیں آپ علیہ السلام کا محاسبہ۔ نفیٔ غیر کی آیتیں آپ علیہ السلام کی فنائیت ہیں۔ اور اثبات حق کی آیتیں آپ علیہ السلام کی بقائیت۔ انا اورانت کی آیتیں آپ کا شہود ہیں۔ اور ھُــوَ کی آیتیں آپ علیہ السلام کی غیوبت۔ نعیمِ جنت کی آیتیں آپ علیہ السلام کا شوق۔ اور جحیم نار کی آیتیں آپ علیہ السلام کا ھم وغم۔ رحمت کی آیتیں آپ علیہ السلام کی رجاء ہیں۔ اور عذاب کی آیتیں آپ علیہ السلام کا خوف، انعام کی آیتیں آپ علیہ السلام کا سکون واُنس ہیں۔ اور انتقام کی آیتیں آپ علیہ السلام کا حزن، حدود وجہاد کی آیتیں آپ علیہ السلام کا بغض فی اللہ۔ نزول

---

① شعب الایمان للبیهقی، ج:۴، ص: ۴۹۸. علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الطبرانی وفیه مسلم بن ابراهیم الهجری وهو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۷ ص: ۱۶۴. امام حاکم فرماتے ہیں: هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه لصالح بن عمر دیکھئے: المستدرک للحاکم، کتاب فضائل القرآن، باب اخبار فی فضائل القرآن جملة ج:۵ ص: ۱۰۴.

وحی کی آیتیں آپ علیہ السلام کا عروج ہیں۔ اور تعلیم وتبلیغ کی آیتیں آپ کا نزول، تنفیذِ اوامر کی آیتیں آپ علیہ السلام کی خلافت ہیں۔ اور خطاب کی آیتیں آپ علیہ السلام کی عبادات ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کسی بھی نوع کی آیت ہو وہ آپ علیہ السلام کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقامِ نبوت کی تعبیر ہے اور آپ علیہ السلام کی سیرت اس کی تفسیر، جس سے صدیقہؓ کے اس زریں مقولہ وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ ① سے قرآن اور ذاتِ اقدس کی کامل تطبیق اور صدیقہ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے۔ اس لئے یہ دعویٰ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے اگر قرآن کے علمی عجائبات بھی کبھی ختم نہیں ہوسکتے تو سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اگر قرآن علمی طور پر تا قیامت اپنے شاخ درشاخ علوم سے بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرت جامع بھی تا یوم حشر اپنے شاخ درشاخ عملی اسوؤں سے اقوامِ عالم کی تکمیل وتسکین کی کفیل رہے گی۔

سیرت کی بنیاد...... اس توجیہ واستدلال کے سلسلہ میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے، جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور پر کھلتے ہیں اور مطالبِ خداوندی نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اس لئے اگر قرآن حضور علیہ السلام کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے اور اس لئے کتبِ حدیث کے ہزاروں ابواب وفصول درحقیقت سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب وفصول ہیں جن میں سے گزر کر ہی آدمی اقلیمِ سیرت میں داخل ہوسکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن وحدیث سیرتِ مقدسہ کی تعبیر ہیں۔ اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن وحدیث کے مضامین کی ترتیب میں اولیت ایمان وعقائد کو اور پھر عبادات کو دی گئی ہے۔ فاتحۂ قرآن کو بھی اولاً ذاتِ حق، پھر اس کی ربوبیتِ عامہ، پھر رحمتِ عامہ، اور پھر مالکیتِ عامہ اور پھر عبادت واستقامت سے شروع کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کو لو تو اس کی ابتداء بھی ایمان بالغیب اور نماز وانفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے۔ بہر حال قرآن میں اولیت عقائد اور عبادات کو دی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے ابواب میں دین کی تفصیل ہے اسی طرح عموماً کتب حدیث میں اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب وفصول کی ابتداء ہے کتاب الایمان، پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، اور کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد اخلاق، معاملات، نکاح، طلاق، میراث، ہبہ، اوقاف پھر مسائلِ معاش، زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، ملازمت اور پھر ان معاملات کے نفاذ کے لئے قضا، تعزیرات وکفارات وغیرہ اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لئے آخر میں خلافت وامارت اور جہاد وسیاست کے ابواب لائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب ہیں۔ لیکن اس ترتیبِ نبوی اور اس کی متابعت میں ان ترتیبات

① مسند احمد، حدیث السیدۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا ج: ٥٠ ص: ١١٦۔

نا ئبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیغمبرانہ سیرت کی اساس وبنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہیں۔ خود حضور علیہ السلام نے بھی اسلام کی اساس وبنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے، فرمایا: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ، شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ وَحَجِّ الْبَيْتِ اِنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ①

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر استطاعت ہو۔ جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ سیرۃ نبوی میں عبادت اور دیانت اصل سیرت ہیں اور انتظامی اور سیاسی ابواب اس کے محافظ ہیں جو بعدیت کا درجہ رکھتے ہیں کہ یہ بر وتقویٰ اور دیارِ خداوندی کا کارخانہ خلل اور زلل سے محفوظ رہے اور دنیا میں کسی فتنہ پرور کو اس نظامِ سیرتِ نبوی میں رخنہ ڈالنے کی جرآت نہ ہو۔ قرآن کریم نے اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں اقامت عبادت ودیانت کو اصل مقصود ٹھہراتے ہوئے تمکین وسیاست اور فتوح ممالک کو اس کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی سلطنت دیدیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، پاکیزہ امور کا امر کریں گے اور منکرات سے باز رہیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ دین ودیانت تو تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا لیکن قہر وسیاست اور جہاد وجنگ سب کو نہیں دی گئی جہاں ضرورت سمجھی ...... دی گئی ورنہ نہیں دی گئی۔ حضور پاک علیہ السلام نے بھی اعلان نبوت کے ساتھ سب سے پہلے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی اور جس پر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تربیت دی، وہ یہی ایمان باللہ، مبداومعاد، توحید ورسالت اور سزاء وجزا کے عقیدے تھے اور پھر خدا سے رشتہ جوڑنے کیلئے عبادت وریاضت اور زہد وتقوی کی تعلیم فرمائی گئی جس سے مکی آیتیں بھری ہوئی ہیں۔

سیرتِ مقدسہ کا اساسی رنگ ...... اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرتِ مقدسہ کا اساسی اور غالب رنگ عبادات اور تقدس ہے اور وہ دنیا کے سارے معاملات کو اسی عباداتی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے یعنی اس کا طبعی رخ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنی ساری دنیا اور دنیا کے ایک ایک کام کو مقدس بن کر برنگِ عبادت انجام دیں جن میں رضائے الٰہی ویادِ خداوندی کی روح کارفرما ہو وہ کچھ بھی کریں اللہ کے لئے کریں، نفسانی انداز اختیار کرنے کی بجائے ربانی راہ اختیار کریں اور ان کا ہر عمل مجاہدہ وجہاد یعنی عبادت ہو، عادت نہ ہو جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ بنی الاسلام علیٰ خمس، ص: ۲ رقم: ۷.

② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱.

اعلائے نفس نہ ہو، حق تعالیٰ نے یہی حقیقت جس کا نام تفویض ہے اپنے خلیل پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام سے طلب فرمائی جسے اسلام کا نام دیا، فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ① کہہ دو ابراہیم کہ میری نماز اور عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العٰلمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس کا امر کیا گیا ہے اور میں ہی (اس امت میں) پہلا مسلم ہوں۔ یہی تفویض مطلق اور عبدیت کاملہ کی بلند پایہ کیفیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت تھی جسے آپ علیہ السلام نے اپنی دعاء میں کھولا ہے، فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ وَاِلَیْکَ حَاکَمْتُ وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ② اے اللہ میں تیرے ہی لئے اسلام لایا اور تیرے اوپر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تجھے ہی میں نے حَکَم مانا اور تیری ہی طرف میں جھگڑا لے گیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا اور تیری ہی طرف جانا ہے۔

یہی حال جب اہل اللہ پر طاری ہوتا ہے تو تفویض کے عجیب عجیب عنوانات ان کی زبانوں پر جاری ہوتے ہیں حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہٗ پر یہ کیفیت غلبہ کے ساتھ وارد ہوئی تو وہ بار بار ذیل کی رباعی پڑھتے تھے اور سجدہ میں گر جاتے تھے پھر وہی پڑھ کر سجدہ میں جا پڑتے جس کے راوی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی قدس سرہ ہیں:۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم	خاکے شوم و بہ زیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ، نہ کونین توئی	از بہر تو میرم واز برائے تو زیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اسوے ہمہ وقت جس روح سے زندہ و پائندہ تھے وہ یہی ذکر الٰہی تفویض مطلق اور عباداتِ خداوندی کی روح تھی، گویا اسی کے لئے اس پاک زندگی کا لمبا چوڑا ڈھانچہ بنایا گیا تھا کہ اس میں یہ ذکر وفکر کی روح پھونکی جائے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام کی پاک زندگی کا ہر لمحہ ذکر اللہ سے معمور اور فکرِ آخرت سے بھرپور تھا۔ ذکر عام کے بارے میں حدیث ہے کہ ’’کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ‘‘ ③ آپ علیہ السلام ہر لمحہ ذکرِ الٰہی میں لگے رہتے تھے اور فکرِ دائمی کے بارے میں ارشاد حدیث ہے کہ کَانَ دَائِمَ الْفِکْرَۃِ حَزِیْنًا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ متفکر اور غمزدہ سے رہتے تھے۔ ④

سیرتِ طیبہ کی روح...... پس آپ علیہ السلام کی زندگی اور زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست، نہ

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۳۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الجمعۃ، باب التھجد باللیل ص: ۸۷ رقم: ۱۱۲۰۔ ③ السنن لابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی الرجل یذکر اللہ تعالیٰ علی غیر طھر ج: ۱ ص: ۲۷۔
④ الشمائل للترمذی، باب کان رسول اللہ ﷺ متواصل الاحزان، ج: ۱ ص: ۲۵۵ رقم: ۲۲۳۔

غلبہ وقہر تھی نہ تسلط و استیلا، نہ تعیش تھی نہ تزئین، نہ آرائش تھی نہ زیبائش، نہ راحت طلبی و آسائش...... بلکہ سرافگندگی، نیازکیشی، عبودیت اور طاعت وعبادت تھی جس میں خوئے ذکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی اور جو کچھ بھی زندگی کی نقل وحرکت تھی وہ اسی فکرِ دائمی اور ذکرِ دوامی کے رنگ میں تھی۔ قرآن حکیم نے اسی ذکر وفکر کے مجموعہ کو دانائی کہا اور ''اولوالالباب'' یعنی عقلمندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ① (دانشمند) وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت اور بناوٹ میں۔

پس قرآن حکیم کی رو سے محض مفکر بھی دانش مند نہیں جب کہ وہ ذاکر نہ ہو اور محض ذاکر بھی پورا دانشمند نہیں جب کہ وہ مفکر اور متفکر نہ ہو حقیقی دانشمندی وہی ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی عقل بھی ہو، اور عشق بھی ہو محبت بھی ہو اور ہوش بھی۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت اسی ذکر وفکر کا مجموعہ اور ان دونوں مقاموں کا کامل امتزاج تھی جہاں آپ کی عبادت ان دونوں روحوں کا مظہر تھی، وہیں آپ علیہ السلام کی سیاست بھی ان دونوں روحوں سے عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلیفہ خداوندی بھی ہیں، معاملات کے فیصلے بھی کر رہے ہیں، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی فیصلہ فرما رہے ہیں، جہاد کے لشکر بھی بھیج رہے ہیں، غنائم کی تقسیم بھی کر رہے ہیں، حدود وقصاص کا اجراء بھی ہو رہا ہے، فتوحاتِ ممالک کا سلسلہ بھی جاری ہے، صوبوں اور نئی حکومتوں میں گورنر بھی مقرر کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر صحنِ مسجد میں ذکر اللہ اور فکرِ آخرت کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ تھا مگر عبادت الٰہی کے رنگ میں تھا، ڈھانچہ اگرچہ سیاست کا تھا مگر روح عبادت کی اس میں کارفرما تھی اور روح اور ڈھانچہ میں کامل مناسبت کے ساتھ ڈھانچہ اس روح کے حسب حال تھا اور روح ڈھانچہ کی مثال۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ سیرت کا امتیازی اور غالب پہلو یہی ایمان وعبادت اور ذکر وفکر تھا جس میں عقل وعشق، محبت وبصیرت، مادیت اور ملکیت، امارت ومسکنت، خلافت وعبادت کا کامل اجتماع اور امتزاج تھا کہ ایک سے دوسری متقابل صفت کسی حالت میں بھی بے فکر نہیں بنا سکتی تھی حتیٰ کہ آپ علیہ السلام غزوات اور جنگوں میں بہ نفسِ نفیس خود بھی شرکت فرماتے اور نہ صرف شرکت بلکہ قیادت بھی فرماتے لیکن یادِ الٰہی اور عبودیت سے یہ ہنگامہ خیزی بھی بھرپور رہ کر عبادت ہی کے رنگ میں ادا ہوتی تھی۔ عین جہاد میں بھی ذکر اللہ اور متعلقہ دعائیں پڑھتے ہوئے آپ علیہ السلام لشکروں کی قیادت فرماتے جس سے یہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت بن جاتا اور عین لڑائی میں جب کہ نماز کا وقت آتا تو یہ اضافی عبادت اس حقیقی عبادت میں حارج نہیں بن سکتی تھی بلکہ اس کی مدت متعین ہوتی تھی۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹۱۔

آ گیا عین لڑائی میں گر وقتِ نماز ۔ قبلہ رو ہو کے زمین بوس ہوئی قومِ حجاز

جس سے نمایاں ہے کہ آپ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت کا بنیادی پہلو ایمان وعبادت تھا جس کے لئے دوسرے شعبہ ہائے زندگی بطور خادم اور بطور وسائل کے کام کرتے تھے پس زندگی کے عام شعبوں کی عبادتیں وقتی تھیں اور یہ اصل عبادت ہمہ وقتی ہوتی تھی۔

سیرت جامعہ کا عجیب خلاصہ...... اب اس سیرت جامع کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ یہ سیرتِ مقدسہ اصولاً زندگی کے تین شعبوں پر مبنی ہے ❶ تعلق مع اللہ ❷ تعلق مع الخلق ❸ تعلق مع النفس۔

تعلق مع النفس کے سلسلہ میں پاکدامنی وپاک نفسی، عفت وعصمت، حیاء وانکساری، غیرت وحمیت، ہمت وشجاعت، صبر وسماحت، حلم وضبط، اعتماد وتوکل، زہد وقناعت، مجاہدہ وریاضت، تحمل شدائد ومصائب اور خداترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاق حمیدہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فطرتِ صالحہ کا خمیرہ تھے۔

اور تعلق مع الخلق کے سلسلے میں خدمتِ خلق اللہ، صلہ رحمی، نصرت، اعانت، جود وسخا، ایثار وعفو، راحت رسانی اور کف اذیٰ (ایذاء رسانی سے بچنا)، عفو ودرگذر، محبت وشفقت وسوزی وہمدردی، تعلیم وتربیت، ارشاد وتزکیہ وغیرہ آپ علیہ السلام کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔

اور تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت وریاضت، مجاہدہ ومراقبہ، کسرِ شہوت ولذت، تقرب وانابت، توبہ واستغفار، تہجد وشب بیداری، ذکر وفکر وغیرہ آپ علیہ السلام کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔ لیکن ان تینوں تعلقات میں ''تعلق مع اللہ'' ہی دونوں تعلقات کی استواری کی روح تھی جو نفس وخلق کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے اگر نفس انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے تو تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔

از روئے مشاہدہ سیرت طیبہ کی ضرورت...... آج بھی جو اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں تو طرح طرح کی مہلک لغزشوں سے دنیا فتنہ وفساد کا گھرانہ بنی ہوئی ہے۔ آج یورپ میں عقل وفہم کی کمی نہیں، روابط اور بین الاقوامی علائق کی کمی نہیں، سیاسی تعلقات کی ہمہ گیری اور ان کی تدابیر کی کمی نہیں حتیٰ کہ صرف انہی بین الاقوامی تعلقات کے لئے متحدہ کونسل یو، این، او (U.N.O) بھی قائم ہے جس میں رات دن ممالک کے باہمی معاملات زیرغور آتے رہتے ہیں، خانگی زندگی کے لئے تربیتوں کے بے انتہاء ڈھنگ اور گھریلو زندگی کی خوشگواریوں کے لئے بے شمار لٹریچر وغیرہ سب ہی کچھ مہیا ہیں لیکن اس کے باوجود انہی کے اقراروں اور اعلانوں سے یہ ہی واضح ہوا ہے کہ گھر اور باہر سے سکھ اور چین مفقود ہے۔ یہی نفوس کہ جن کی طمانیت کی خاطر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، امن واطمینان کی ہوا تک سے کوسوں دور ہوتے چلے جا رہے ہیں اس لئے نہیں کہ فقدانِ اسباب ہے۔ اسباب تو سب مہیا ہیں بلکہ مسبب الاسباب سے ربط کا فقدان ہے، خدا پرستی، خوفِ آخرت اور مالک

الملک کے سامنے جوابدہی کا فکر معدوم ہے۔ اعتقاداً یا عملاً جوان تعلقات کو صحیح نہج پر نہیں آنے دیتا جس سے ان نفوس میں یہ جذبۂ انقیاد واتباعِ حق کے بجائے خودرائی اور خود بینی کے جراثیم پرورش پائے ہوئے ہیں۔ مدار کار غرورِ نفس ہے، یقینِ حق نہیں جس کے تحت خود غرضیوں اور قومی، نسلی اور وطنی تعصبات کی آگ سلگ رہی ہے اور اس سے تمدنی، سیاسی اور اقتصادی اونچ نیچ کی مہلک وباء سکون وامن کی جان لیوا بنی ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا ان کے تمدنی وسائل اور ایجادات سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے لیکن دلوں میں ان سے تنفر کے جذبات لئے ہوئے اور ان کی جبری قیادت کا جواء بھی سروں سے اتار پھینکنا چاہتی ہے یہ محبوبیت کا فقدان اسی خدا پرستی کے نہ ہونے سے رونما ہوا جس سے واضح ہے کہ کوئی بھی انسانی تعلق خواہ اپنے نفس سے ہو یا مخلوق سے بغیر خدائی تعلق کی ہمواری کے رہنا ممکن نہیں۔

اسی لئے حضرت صاحبِ سیرت علیہ السلام نے اپنی سیرتِ مبارکہ کی روشنی میں بطور ضابطۂ حیات ارشاد فرمایا ہے کہ: مَنْ اَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللهِ اَصْلَحَ اللهُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ ① جس نے اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ درست کرلیا اس کے درمیان اور خلق کے درمیان خود اللہ تعالیٰ معاملہ درست فرما دیتا ہے۔ اس لئے اگر آج ہم اس سیرتِ پاک کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں تو اس میں سیرتِ مقدسہ کی روشنی میں ان تینوں تعلقات کو عملی صورت دیتے ہوئے ان کی روح اور بنیاد تعلق مع اللہ ہی کو بنانا ہوگا جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ مقدسہ کا اساسی پہلو یہی تعلق ہے۔

سیرتِ طیبہ سے بیگانگی کا نتیجہ...... اب اگر ہم سیرت، عبادت واخلاق اور تعلق مع اللہ سے کنارہ کش ہوکر مثلاً محض قہر وسیاست اور اقتدار وغلبہ کی سیرت کو مطمع نظر بنالیں جس میں یہ اخلاقی روح نہ ہو تو یہ کوری سیاست ملک عضوض ''کٹکھنی بادشاہی'' ہوکر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت ظلم وستم، زبردستی اور زبردستی آزادی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی اور اگر محض قومی خدمت اور رفاہ عامہ کو مقصدِ زندگی ٹھہرا لیں جس میں خدا ترسی اور اخلاقی قدریں نہ ہوں تو وہ کوری خود غرضی، نمود ونمائش اور شہرت پسندی ہوکر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی قلبی یکسوئی اور مخلوق کی مدح وذم سے بالاتر ہوکر غنا واستغناء کی دولت نصیب نہ ہو سکے گی۔

پھر اس کے ساتھ اگر ہم تمام طبعی اور اجتماعی تعلقات سے الگ ہوکر محض عبادت اور خلوت گزینی اختیار کریں گے تو نہ صرف ہم تعاون باہمی کی ان تمام قوتوں سے محروم ہو جائیں گے جو مدنیت کی روح اور اجتماعیت کی اساس ہیں اور جن کے بغیر وہ عالمگیر خدمت نہیں انجام پا سکتی جو سیرتِ پاک اور طبیعت اسلام کے تقاضے ہیں بلکہ اس قید تنہائی میں گلے سے الگ ہوکر کسی وقت نفس وشیطان کی مکاری سے پناہ نہیں پاسکیں گے جنہوں نے خلوت گزیں اور راہبوں کو کتنی ہی بدکاریوں کا شکار بنایا ہے۔

① كنز العمال ج:١٥ ص:٧٩٨ (الديلمي عن قدامة بن عبدالله بن عمار له صحبة).

پس خدمتِ خلق بلا عبادت انانیت ہے، خدمت نفس بلا خدا ترسی نفسانیت ہے، انقطائی عبادت بلا خدمت خلق رہبانیت ہے اور ریاست بلا عبادت ملوکیت واستبدادیت ہے اور ظاہر ہے کہ رہبانیت حضور علیہ السلام کی سیرت ہے نہ ملوکیت نہ نفسانیت اور نہ ہی انانیت آپ علیہ السلام کی سیرت ہے۔ کیونکہ یہ اکہری چیزیں الگ رہ کر جیسے مجموعی سیرت نہیں بن سکتیں ایسے ہی اپنی روح سے الگ ہو کر اس روح کے خلاف خود رو نقشوں اور رسوم کے اجزائے سیرت بھی نہیں کہلائی جاسکتیں کہ انہیں جزوی سیرت ہی کہا جاسکے البتہ جب اس خدمت خلق اور خدمت نفس کے خانوں میں اخلاق وعبادت کا رنگ بھر دیا جائے اور سب اجزاء اپنے اپنے نقشوں کے ساتھ عبادت کے محور پر جمع ہو جائیں تو پھر اس جامع سیرت کا عکس پیدا ہو جائے گا جس کا نام لے کر ہم اس کا کام کرنا چاہتے ہیں اب اسے نہ نفسانیت کہیں گے نہ رہبانیت نہ ملوکیت کہیں گے نہ انانیت بلکہ ربانیت کہیں گے جس میں انسان اپنی نقل وحرکت کا مرجع ومحور اپنے رب کو بنا لے گا۔

پس ان تمام اجزاء کی پاک اور مطلوب صورتوں کا صحیح اور معقول امتزاج ہی سرکار دو عالم دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامع ترین سیرت ہے جس میں فرد کی رعایت الگ ہے اور قوم کی الگ، حکومت کی رعایت الگ اور محکوم کی الگ، اس میں دیانت بھی ہے خدمت بھی ہے اور عنایت بھی، اور ان سب عناصر کے امتزاج سے سیرت صالحہ کا یہ حاصل نکل آتا ہے کہ انسان میں طبعی جذبات باقی رہیں مگر ان پر عقل کی حکومت ہو عقلی نظریات بھی ہوں مگر ان پر وحی الٰہی کی نگرانی ہو آزادیٔ ضمیر بھی ہو مگر اس میں حق کے ساتھ تقلید ہو۔ غرض نفس، طبع، عقل، وجدان، ضمیر اور جذبات میں سے کوئی چیز پامال نہ ہو سکے، سب کے تقاضے کارفرما ہیں مگر ہر ایک کی نقل وحرکت کا محور طاعت الٰہی اور ذکرِ خداوندی ہو اور کسی وقت بھی یہ تقاضے پابندی حق سے آزاد نہ ہوں پس اسی جامعیت اور اعتدال کامل کا نام سیرتِ مقدسہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

سیرتِ جامعہ کی عملی پیروی کی ضرورت...... آج مگر ہم لوگ اپنے نونہالوں کے لئے سچے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ نہایت اونچے پیمانے کے دیندار اور خدا پرست ہوں جن میں رواداری، بے قاعدگی بداعتقادی اور اصولِ آزادی نہ ہو، ان کی نگاہ خدا پر ہو اور اسی پر بھروسہ اور اعتقاد رکھتے ہوں اور دوسری طرف وہ ملک کے سچے شہری اور متمدن ہوں جن کے حالات ومعاملات میں دیانت صداقت وراست گوئی وراست بازی ہو، شخصی مفاد کے غلبہ کے بجائے قومی اور جماعتی مفاد ان پر غالب ہو ایک طرف وہ مساجد ومدارس کی زینت ہوں اور دوسری طرف درباروں اور بازاروں کا نظم بھی ان کے ہاتھوں میں فروغ پا رہا ہو۔ ایک طرف ان کی خلوت گاہیں یاد الٰہی سے بھرپور ہوں اور دوسری طرف ان کی جلوتیں اور حکومت کے دفاتر ان کی عدل گستری سے معمور ہوں۔ ایک طرف وہ اپنے ملک میں خوشحال وخوش مال ہوں اور دوسری طرف اہلِ ملک ان کی طرف رجوع ہو کر نہ صرف ان سے عزت مندانہ تعلقات ومعاملات ہی کو اپنی آبرو سمجھے بلکہ ان کے مثالی معاملات سے بھی درس لیں۔

تو یہ جامع زندگی بجز اس سیرتِ جامع کی عملی پیروی کے اور کہیں بھی انہیں دستیاب نہیں ہو سکتی، حق تعالیٰ شانہ اپنے پیغمبر کی سیرتِ مقدسہ اور اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنانے اور اس کے بھرپور اتباع کرنے کی توفیق نصیب فرماوے آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حیاتِ طیّبہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـا وَسَنَدَنَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَاکَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ (1)

زندگی ایک مقدس امانت ...... بزرگانِ محترم! اس وقت قرآن شریف کی ایک آیت میں نے تلاوت کی ہے، جس میں حق تعالیٰ شانہٗ نے انسان کی سعادت اوراس کی ترقی کا ایک بنیادی اصول ارشادفرمایا ہے،جسکی کچھ تشریح اسوقت آپ کے سامنے عرض کروں گا۔ پہلے آیت کا ترجمہ سن لیجئے.....حق تعالیٰ فرماتے ہیں"جس نے بھی نیکی کی اور عمل صالح اختیار کیا، مرد ہو یا عورت، تو ہم اس کوایک نہایت ہی پاکیزہ زندگی عطاءفرمادیں گے جوحیات طیبہ ہوگی، صاف اوراعلیٰ ترین زندگی اوراس کی اس نیکی پرہم بہت اجروثواب بھی اس کوعطاءکریں گے"۔

نیکی کرنے پر دووعدے کئے گئے ہیں: ایک پاکیزہ زندگی کا اور ایک اجر کا۔ اسے یوں سمجھئے کہ مستعار زندگی جو چنددن کی ہمیں دی گئی ہے، حقیقت میں ہمارے پاس ایک امانت ہے، اس امانت کواگر نباہنا ہےتوایمانداری کے ساتھ اس کو مالک کے سپرد کردینا ہے، اس لئے کہ اس زندگی کے ہم خود مالک نہیں ہیں، نہ ہم نے بنائی، نہ پیدا کی، نہ ازخود اس کوختم کرسکتے ہیں۔ دینے والے بھی حق تعالیٰ ہیں اور لینے والے بھی وہی۔ تو جس کے ہاتھ میں لینااوردینا ہے وہی مالک قرار دیا جاسکتا ہے، ہمارے بلاارادہ زندگی آگئی، بلاارادہ ہم سے چھین لی جائے گی۔ لائی حیات آئے، قضالے چلی چلے، اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے چلے۔ تومحض ایک مستعارزندگی کوہم کس طرح گزاریں۔

زندگی کا مادہ ...... تو ہماری زندگی کا ایک مادہ ہے اور ایک اس کی صورت ہے۔ زندگی کے مادے کوبھی سمجھ لیا جائے اوراس کی صورت کوبھی۔ آگے اسی زندگی کے بارے میں بہت سی صورتیں آئیں گی مگر مادہ ایک ہی رہے گا

---

(1) پارہ:۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ:۹۷.

اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی مثلاً گارا ایک ہے اسی گارے سے برتن بھی اور دیگر سب سامان بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ سب گارے کی شکلیں ہیں، مادہ مشترک رہے گا، اینٹ میں بھی گارا، بلڈنگ میں بھی گارا اور برتنوں میں بھی گارا، ایک ہی مادہ پر مختلف شکلیں آتی ہیں۔اسی طرح زندگی جو ہمارے لئے ترقی یا تنزل کا باعث ہوتی ہے اخیر تک اس میں ایک ہی مادہ موجود رہتا ہے اور یہ مادہ دو چار چیزیں ہیں سب سے پہلی چیز کھانا پینا ہے اسی سے مدارِ زندگی ہے اگر نہ کھائے پئے تو اسے مردہ کہا جائے گا: ﴿جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ﴾ وہ بدن جو کھانا نہیں کھاتے.....اس کے بعد پہننا اور اوڑھنا ہے پھر رہنا سہنا یعنی مکان بنانا ہے جس میں ہم اپنی زندگی اور اپنے رشتے کو محفوظ کر سکیں، اس کے بعد موانست اور انس باہمی سے زندگی بڑھانا ہے جس کو تمدن، تعاون، توالد اور تناسل کہیں گے یہی چار چیزیں کھانا پینا، اوڑھنا، رہنا سہنا اور باہم مل جل کر رہنا یہ بنیادی چیزیں ہیں، جن سے ہماری زندگی بنتی ہے اور یہی چار چیزیں آئندہ لوٹ پوٹ کر آتی ہیں اس میں کچھ اسباب اور وسائل ہیں اصل میں چار ہی چیزیں ہیں۔

کھانے پینے کیلئے غلہ کی کاشتکاری وغیرہ کی ضرورت ہے الغرض ایک لمبا دھندا ہے جس سے ہمیں چار دانے سپرد ہوتے ہیں، اس کے لئے بازار بنتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں یہ خرچ کرتا اور کماتا ہے۔تو کھانا پینا اصل تھا اس کی ضرورت سے بازار قائم کئے جائیں گے اور اسی کی خاطر پیشہ حاصل کیا جائے گا تو زمین، بازار، پیسہ، کھانے، پینے، رہنے سہنے کے اسباب میں سے ہوئے۔اسی طرح آپ امن وسکون قائم کریں، باہمی لین دین کریں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ باہمی لین دین سے زندگی کے اسباب آسانی سے حاصل کئے جا سکیں اور کھانے پینے، رہن سہن کی ضرورت میں سے آسمان بھی ہے جس سے پانی برسے، آفتاب بھی ہے جو گرمی پہنچائے، ہوا بھی ہے جو زندگی قائم رکھے۔تو یہ لمبا چوڑا کارخانہ اس لئے ہے کہ چار دانے چار کپڑے اور مکان ہمیں میسر آجائے، تو پورا عالم ہمارے لئے خدمت کر رہا ہے۔

انسانی زندگی کا دورِ اوّل حیوانیت.....تو انسان کی زندگی کا پہلا دور یہ ہے کہ اس کا تمام تر مقصد کھانا پینا ہوتا ہے، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی کھانے پینے کے لئے چلاتا ہے، جہاں ماں نے اس کے منہ میں دودھ ڈالا وہ چپکا ہو گیا، معلوم ہوا اس کا شور مچانا غذا کیلئے تھا اگر وہ نہ چلاتا تو ماں کو خبر نہ ہوتی، اگر بچہ نہ روتا تو ماں کی چھاتی میں دودھ جوش نہیں مارتا بچہ کا رونا ایک فریاد ہے، ماں کی مامتا اور محبت جوش میں آتی ہے اور جوش سے دودھ جوش میں آتا ہے اور دھاریں پھوٹتی ہیں تو سب سے پہلے پیدا ہوتے ہی نہ کپڑا مانگتا ہے نہ مکان۔پھر گرمی سردی ستاتی ہے تو چلاتا ہے اور ماں کپڑا اوڑھاتی ہے، معلوم ہوا کہ سردی گرمی ستا رہی تھی۔زیادہ کپڑے لاد دیئے پسینہ آ گیا تو چلانے لگا تو ماں کے دل میں الہام ہوتا ہے کہ اب اسے گرمی ستا رہی ہے یہ کپڑے اتار دیتی ہے اور پنکھا جھلنے لگتی ہے تو پہلی ضرورت تھی کھانے کی، دوسری لباس، تیسری گرمی اور سردی اور دھوپ سے بچنے کیلئے مکان کی اور ذرا بڑا ہو گیا، کچھ ہوش آ گیا تو اس میں انس ومحبت کا مادہ بھی آ گیا اب چھوٹے بچوں کو اپنے لئے تلاش کرتا ہے، کسی بچے کو

آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ بڑے بوڑھوں کی صحبت میں بیٹھے گا یا وہ علماء وصلحاء کی مجلس کو تلاش کرے گا کہ وہاں جا کر بیٹھ جائے، نہیں بلکہ اپنے ہم عمروں سے کھیل میں لگے گا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

ہر چیز اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے جوان جوانوں کی طرف، بوڑھا بوڑھوں کی طرف مائل ہوگا، معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں اُنس موجود ہے، وہ جانوروں کی طرح بھٹوں اور گھونسلوں میں نہیں رہ سکتا، ایک آبادی بنا کر رہتا ہے، شہری زندگی قائم کرتا ہے تاکہ اُنس ومُوانست آتی رہے کیونکہ انسان انس سے مشتق ہے:

وَمَاسُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِهٖ　　　　وَمَا الْقَلْبُ اِلَّا لِاَ نَّهٗ يَتَقَلَّبُ

عربی کا شاعر کہتا ہے کہ انسان کا نام انسان اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں انس ہے اور قلب کے معنی لوٹ پوٹ کے ہیں۔ قلب ہر وقت متحرک رہتا ہے اس میں خیالات الٹتے پلٹتے رہتے ہیں اس تَقَلُّبْ کی وجہ سے اسے قلب کہنے لگے، اگر بچے کو آپ تنہائی میں ڈالیں تو چلائے گا اور اس کے ساتھ کوئی بیٹھ گیا اور کسی سے بولنے لگا تو چپکا ہو جائے گا، معلوم ہوا کہ اس میں انس کا جذبہ ہے وہ ابھر رہا تھا، اس کا علاج مل گیا تو خاموش ہو گیا۔

یہ چار چیزیں ہی زندگی کا مادہ ہیں اور لوگوں کا یہ مقصودِ زندگی ہے اس زندگی کا نام ہم حیوانی زندگی رکھیں گے یعنی حیوانیت کا تقاضا ہے کہ کھائے پیئے۔ آپ نے چوپایوں کو دیکھا ہوگا کہ جب بھی آپ گائے بھینس کو دیکھیں گے چررہی ہیں یا پھر ہگ رہی ہیں اور پھر کھانے لگی ہیں اس کے سوا کوئی کام نہیں ۲۴ گھنٹے جانور کا کام کھانے کا ہے بھینس کو آپ پالیں گے تو ایک مستقل آدمی رکھنا پڑے گا کہ اس کی پرورش کرے رات بھر کھڑے کھائے گی کچھ آنکھ لگ گئی پھر جب جاگی تو کھانے لگی تو حیوان کا طبعی تقاضا کھانا پینا ہے، گرمی میں سردی اور سردی میں گرمی حاصل کرنا یہ حیوانیت کا تقاضا ہے تو معلوم ہوا کہ انسان کی وہ زندگی جس میں کھانا پینا، رہنا سہنا ہی مقصد ہو وہ حیوانیت کی زندگی ہے۔ آپ جتنا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کھائیں گے، بہترین بلڈنگ بنائیں گے یہ سب حیوانیت کا تقاضا ہے۔ سانپ اپنے لئے بھٹ بنالیتا ہے، شیر اپنا ٹھکانہ اور چڑیا اپنا گھونسلہ بنالیتی ہے، چونٹیاں سوراخ تلاش کر لیتی ہیں، انسان بلڈنگ بنالیتا ہے کتنی اعلیٰ بلڈنگ کیوں نہ ہو حیوانیت کے دائرے سے نہیں نکلے گا تو بچہ ابتداء سے ہی ان چیزوں کو چاہتا تھا، یہ حیوانی زندگی تھی۔

انسانی زندگی کا دورِ ثانی عقل وشعور...... اب ذرا شعور آیا، دس برس کے بعد اس میں عقل کے مادے نے آنا شروع کر دیا ابھی تک اس کی زندگی طبیعت کے نیچے تھی اور طبعِ بشری جو چاہتی تھی وہی ہم کرتے تھے تو ہماری طبیعت حاکم اور ہم اس کے غلام اور محکوم تھے۔ فلاسفہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور واقع ہوتی ہے، اس کے اندر جذبات ہوتے ہیں شعور اور سمجھ نہیں ہوتی تو ایک جاہل بادشاہ طبیعت حکم دیتی ہے کہ کھاؤ، بھوک لگی ہم نے کھانا شروع کر دیا، چاہا پانی پینے کو ہم نے کہا: بہت اچھا، چاہا مکان بنالو ہم نے تعمیل شروع کر دی، تو ایک بے شعور حاکم کے

احکام کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے کیوں کہ یہ سب طبیعت کے تقاضے تھے چودہ پندرہ برس بعد اب انسان کو شعور آنا شروع ہوا اور ہر چیز میں عقل سے غور کرنا شروع کیا اس میں سمجھ آئی۔ تو اس شعور و عقل کے بعد مادہ زندگی بدلتا رہے گا کل تک طبعی جذبہ سے کھا رہا تھا آج عقل نے اس میں لطافت پیدا کر دی۔

ایک اجتماعیت کا مادہ ہے اور ایک ظرافت کا جس کو ''جمال پسندی'' کہتے ہیں یعنی کھائے مگر ذرا خوشنما بنا کر کھائے، پہنے مگر ذرا عمدہ کر کے پہنے، رہے مگر ذرا بلڈنگ کو اچھا بنا کر رہے، اس کی طبیعت جب عقل کے نیچے آ جائے تو عقل پورا زور لگا کر مکان بنائے گی، ڈیزائن بھی اچھا ہو، گویا فن انجینئری پیدا ہوگا۔ کہ عمدہ عمدہ نمونے بنائے جائیں، کھانا طبعی تقاضا تھا مگر عقل نے چاہا کہ برتن بھی خوشنما ہوں کھانے کا رنگ بھی ذرا عمدہ ہو، نگاہوں کا سینکنا بھی مقصود ہو جاتا ہے، آج نوع بنوع کھانے بنتے ہیں۔ یہ سب عقل کا تقاضا ہے، طبیعت اس کے اندر کام کرتی ہے، عقل اس کو ذرا درست کر لیتی ہے کہ اس کی شکل بھی عمدہ بنے۔ آپ کیک بنائیں گے تو اس کا مادہ ایک ہی ہے مگر شکل الگ الگ بناتے ہیں، کسی کی چڑیا کی شکل بنا دی، کسی کی پھول جیسی، اس میں رنگ بھر دیئے، موتی لگا دیئے کہ آنکھیں بھی دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔

اگر یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو مزہ پھر بھی پیٹ کا وہی رہتا۔ اگر آپ نے سردی سے بچنے کے لئے ایک موٹا سا کمبل اوڑھ لیا تو طبیعت کا تقاضا پورا ہو جائے گا مگر عقل کہتی ہے کہ اس کا رنگ بھی عمدہ ہو، اون بھی ذرا ملائم ہو، ذرا قیمتی ہو کہ دیکھنے والا کہے کہ بڑا آدمی ہے تو محض طبع بشری کا تقاضا تو ڈھانپنا تھا مگر عقل کا تقاضا اسے خوشنما بنانا ہے تو آج دنیا میں جو ڈیزائنوں کی افراط ہے کہ آپ کوٹھیاں نئی نئی طرز کی بنائیں، چھت بھی ایسی ہو، دیواریں ایسی ہوں پلاستر اور دیگر آلات ایسے ہوں، یہ ظرافت پسندی اور جمال ہے جو انسان میں رکھی گئی ہے، آج جو کپڑوں کے ہم نمونے دیکھتے ہیں کوئی مادہ نہیں چھوڑا جس سے کپڑے نہیں بنائے، روئی کے کپڑے تو خیر ہیں ہی، اون اور درختوں کی چھال، گتوں اور کاغذ کے کپڑے بنتے ہیں اور اب کانچ کے کپڑے بنانے پر غور ہو رہا ہے، جتنی جڑی بوٹیاں جنگل میں ممکن ہیں انسان نے غور کر کے سب کے مطابق طرز اور نقش و نگار بنالئے، جالدار کپڑے الگ، مشجر الگ، دنیا نے اتنے رنگ کے کپڑے کبھی نہیں دیکھے جتنے آج دیکھ رہے ہیں۔

یہ محض طبیعت کا تقاضا ہے جس میں عقل اور جمال پسندی کی آمیزش ہوگئی اگر نمونے کا حصہ چھوڑ دیا جائے تو گھونسلہ بنا کر جہاں چاہے رہ جائے، یہ سارے مسائل نمونہ کی خوشنمائی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں پینے کے لئے سوڈے کی دکان پر جائیں گے تو رنگ برنگ کا پانی دیکھیں گے کوئی سبز، کوئی سرخ، کوئی زرد، کوئی نارنجی، ذائقہ درست کرنے کے لئے تو سب ایک ہی ہیں مگر آدمی چاہتا ہے کہ جب میں پیوں تو آنکھوں کو بھی لذت ہو، ہاتھ کو بھی، زبان کو الگ لذت آ جائے اور سارے ذائقے جمع ہو جائیں، یہ چیز انسان میں ہے جانوروں میں نہیں رکھی گئی۔ جانور تو کھا پی کر ہضم کرے گا پیٹ میں بوجھ کر دے گا۔

حضرت آدمؑ کے زمانے میں گائے جس طرح کھاتی تھی آج دس ہزار سال بعد اسی طرح کھاتی ہے، جس طرح پہلے قضائے حاجت کر رہی تھی ایسے ہی اب کرتی ہے یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، تو جانوروں میں یہ مادہ ظرافت اور جمال پسندی کا نہیں ہے، جنات میں بھی نہیں ہے ویرانے میں رہتے ہیں، آج تک انکی کوئی بلڈنگ نہیں دیکھی گئی، چڑیا جانور کسی میں یہ مادہ نہیں، کسی نے درخت کو ٹھکانہ بنالیا کسی نے زمین کھود کر ڈیرہ بسالیا مگر یہ انسان ہے جو جمال پسندی میں دنیا بھر کے مادے خرچ کرتا ہے، مکان، کپڑا، کھانے کی شکلیں بھی عمدہ عمدہ تجویز کرتا ہے۔

مغل شاہِ ہند کا ایرانی شہزادے پر کھانے کے ذریعہ رعب ڈالنا...... ایران سے بادشاہِ ہندوستان کے پاس شہزادہ آیا مغلوں کی سلطنت کا زمانہ تھا تو شاہی باورچی کو حکم دیا گیا کہ کوئی نئی قسم کی چیز تیار کرو، تو ناشتے کیلئے ایک چیز تیار کی اور ایک بہت عمدہ خوانچہ میں رکھ کر لے آیا تو بہت عزت کے ساتھ بلا کر اسے حکم دیا کہ اسے دربار میں کھولدو...... کھولا تو معلوم ہوا کہ بھینسے کا کٹا ہوا سر رکھا ہے اور تازہ خون بہہ رہا ہے شہزادے کو بڑا تکدر ہوا اور حیرت زدہ ہوا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے، بادشاہوں کے پاس بھینسے کا سر لے آیا ہے اس نے کہا کہ صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ نے کبھی اچھی چیز نہیں کھائی، اسے ذرا اپنے بادشاہ کو رعب دکھانا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ ایک خاص قسم کی مٹھائی تیار کی گئی تھی، بھینسے کا سر تھا مگر اس کے اندر زبان ایک عجیب ذائقے کی مٹھائی تھی، دانت اور ذائقے کی مٹھائی تھی، اس کی کھال میں اور ذائقہ تھا، جب اس شہزادے نے چکھا تو حیران رہ گیا کہ عجب چیز ہے تو باورچی کو یہ حجت تمام کرنی تھی کہ تمہارے فرشتوں نے بھی کبھی اس قسم کے کھانے نہیں کھائے جو ہندوستان میں بنتے ہیں۔ یہ جمال پسندی تھی محض مٹھائی لاکے رکھ دیتے شہزادہ کھا پی لیتا اس مصیبت کی کیا ضرورت تھی کہ اس کو بھینس سے کی صورت دی، اس کا گلا کٹا ہوا دکھایا کہ خون اس میں بہتا رہے فن کا کمال دکھانا تھا۔

ان فنی کمالات کیلئے آج دنیا میں مستقل کمپنیاں ہیں جن کا کام یہ ہے کہ میزوں کو سجائیں، سینکڑوں روپے محض انکو سجانے کے لئے بطور اجرت دیئے جاتے ہیں۔ تو طبع بشری تو کھانا پینا چاہتی ہے، عقل بشری چاہتی ہی کہ اسکے اندر خوشنمائی پیدا کی جائے۔ طبع بشری چاہتی ہے کہ کوئی ہمجولی مل جائے تو اس سے انس ومحبت سے بات کی جائے اور عقل چاہتی ہے کہ بات کریں تو لہجہ بھی شائستہ ہو، کلام بھی مہذب ہو، بیٹھنے اٹھنے کا ڈھنگ بھی ذرا اچھا ہوا۔

انسانی زندگی کا باشعور حکمران...... جب زندگی اس نوبت پر پہنچے اور کھانے پینے کو آپ عقل کے نیچے لے جائیں تو ہم اسے انسانی زندگی کہیں گے، کل تک یہ چیزیں طبیعت کے حکم میں تھیں آج وہ عقل کی محکوم بن گئیں، پہلے ایک جاہل بادشاہ حکمرانی کر رہا تھا اور اب ایک باشعور حکمران کی حکمرانی کے نیچے آگئیں یعنی عقل کے، جس میں سوچ ہے اور سمجھ ہے۔

اس کے ساتھ ایک چیز اور بڑھ جاتی ہے وہ یہ کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ خودغرض بچہ یہ چاہے گا کہ میں کھالوں میرے بھائی بند کھا رہے ہیں یا نہیں، مثلاً اس کی بلا سے ایک کتا آجائے گا آپ ہڈی ڈالدیں گے وہ

کھائے گا دوسرے کتے کو ملے یا نہ ملے آپ سے کیا بلکہ دوسرا کتا تو لڑنے مرنے کو تیار ہوگا بلکہ سارے محلّہ کے کتوں سے لڑتا ہے، اسی طرح سے دیگر جانور بھی لڑتے ہیں کہ میری غذا دوسرے کے پاس نہ جائے۔ یہ حیوانیت کا تقاضا ہے کیونکہ طبع حیوانی بالطبع خودغرض واقع ہوتی ہے اپنا نفع چاہتی ہے دوسرے کا نفع نہیں لیکن جب عقل آجاتی ہے تو وہ چاہتی ہے کہ عمدگی کے ساتھ میں بھی کھاؤں اور میرے بھائی بند بھی کھائیں تو عقل نے آکر اجتماعی زندگی سکھلا دی۔ تو عقل نے دو باتوں کا اضافہ کیا ایک ظرافت یعنی جمال پسندی کا اور ایک اجتماعیت کا کہ جہاں ہمیں مل رہا ہے ہمارے بھائیوں کو بھی ملنا چاہیے، یہ بُری بات ہے کہ تنہا بیٹھ کر کھائیں اور دوسرے بھوکے رہیں۔ تو جب آدمی میں یہ جذبہ پیدا ہوگیا تو کہا جائے گا کہ یہ انسانی زندگی کے اندر آگیا، مگر اس کا مادہ بھی وہی چیز ہے جو حیوانی زندگی کا تھا وہاں خودغرضی کیلئے استعمال ہوتی تھی عقل کے نیچے آکر اجتماعی شان کیلئے استعمال ہونے لگی، اور سارے بنی نوع کا فائدہ ہونے لگا۔

اب اسی حالت میں انسانی تمدن لین دین تجارت اور زراعت قائم کرتا ہے تو اجتماعیت کی شان جمال پسندی اور بنی نوع کے فائدے کے لئے دیکھنا اور سوچنا، یہ بھی عقل کا کام ہے تو مادہ وہی رہا مگر اس کی شکل بدل جاتی ہے کیونکہ حکام بدلتے جاتے ہیں، اگر حاکم خودغرض ہے تو محکوم بھی خودغرض ہوگا اور اگر حاکم کے اندر جماعت پسندی اور جمال پسندی ہو تو محکوموں میں بھی یہی چیز آئے گی۔ جب عقل نے دائرۂ حکومت سنبھالا تو سارے افراد بنی آدم کا فائدہ اس میں ہوگا یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ میں بھی راضی رہوں میرے بھائی بند بھی راضی رہیں۔ مثل مشہور ہے ''نہ تنہا ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے نہ روتا ہوا'' کسی جماعت کے ساتھ مل کر ہنستا ہے تو ہنسی ہے اور جماعت کیساتھ ہی روتا ہے تو رونا بھی ہے۔

انسانی زندگی کا تیسرا دور ایمان کی حکومت...... اب انسانی زندگی کو ذرا ایک قدم اور بڑھا دیجئے کہ طبع بشری کھانے پینے سے محض نفس کی رضا چاہتی تھی جب عقل آگئی تو اب بنی نوع کی رضا سامنے آگئی کہ میرے سارے بھائی بند بھی راضی ہوں اگر کسی کے اندر ان تمام افعال میں یہ چیز بھی پیش نظر ہو جائے کہ تنہا میں راضی نہ ہوں نہ تنہا میرے بھائی بند راضی ہوں بلکہ میرا خدا بھی راضی ہو تو اب یہ ایمانی زندگی شروع ہوگئی، وہی چیزیں اب ایمان کی حکومت کے نیچے آگئیں جو اب تک عقل اور طبیعت کی حکومت میں تھیں۔

عقل انسانی جماعت پسندی اور مفادِ عامہ کی رہبری کرتی تھی لیکن جب ایمان کی روشنی آئی تو اب یہ فکر پڑی کہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو سوچے کہ کھانا اس طرح سے کھاؤں کہ میرا خدا بھی راضی ہو، لباس پہنوں تو اسے اس طرح سے پہنوں کہ میرا خدا بھی راضی رہے، ایسا لباس نہ پہنوں جو اس کی منشاء کے خلاف ہو۔ حدیث میں فرمایا کہ ''بنی آدم میں مردوں کے لئے ریشم کا کپڑا پہننا حرام ہے'' ① ریشم کا کپڑا پہننے سے نفس اور بھائی بند تو راضی

① السنن للترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الحریر والذھب ج:۲ ص:۳۲۵.

ہو جائیں گے کہ بڑا عمدہ لباس پہنا ہے مگر اللہ میاں راضی نہیں۔تو عقل اور نفس تو راضی ہو گئے مگر خدا راضی نہیں ہوئے۔تو ایمان کی حکومت میں آ کر آدمی سوچتا ہے کہ کون سا لباس جائز ہے کون سا نا جائز! کون سا حلال اور کون سا حرام!...... حدیث میں فرمایا کہ سونے کا استعمال مردوں کیلئے حرام ہے کسی نے سونے کی انگوٹھی پہن لی تو قطعاً نا جائز ہے، حرام ہے، فرمایا: حِلْيَةُ اَهْلِ النَّارِ ① اہل جہنم کا زیور ہے، یہ آگ کی طرف لے جائے گا، البتہ سونے کے بٹن کے بارے میں شریعت نے اجازت دی ہے لیکن اس وجہ سے کہ اس کو لباس کے تابع سمجھا گیا ہے جیسے لباس پر زری کا کام کیا جائے تو بٹنوں کو کپڑوں کے حکم میں پھول بوٹوں کی شکل میں سمجھا گیا ہے، مگر بٹن کی بھی ایک مقدار ہے کہ وہ تین ماشے سے زیادہ نہ ہو بہت زیادہ وزنی پہنے گا تو یہ ہوسنا کی ہوگی اس کے ساتھ فقہاء یہ بھی قید لگاتے ہیں کہ اگر بٹن کا استعمال ہو تو بدن سے نہیں لگانا چاہیے بلکہ کسی کپڑے سے سی کر پہنا جائے تا کہ براہ راست سونا بدن سے مس بھی نہ کرے، لباس کے اوپر سِلا ہوا ہو اتنی قیود کے ساتھ اجازت دی گئی ہے تو جب آدمی ایمانی زندگی اور ایمانی حکومت کے نیچے آئے گا تو ایک بٹن بھی سامنے آئے گا تو سوچے گا کہ کس طرح...... جائز ہے کس طرح نہیں؟ کتنا پہنوں کتنا نہ پہنوں؟ محض عقل تو اجازت دیدے گی کہ پانچ پانچ تولے کے بٹن پہن لو۔ چاہے تو ہار اور کنگن بھی پہن لو، عقل نہیں روکے گی اس لئے کہ عقل زیادہ سے زیادہ نفس کی رضا چاہتی ہے یا انسان کی رضا رہی خدا کی رضا! تو اس کا تعلق تو ایمانی زندگی سے ہے۔

اسی طرح کھانا کھانے کے لئے آدمی بیٹھے گا تو غور کریگا کہ یہ خنزیر تو نہیں جو حرام ہے یہ فلاں جانور کا گوشت نہیں ہونا چاہیے، حرام چیز سے اس طرح بھاگے گا جیسے سنکھیا سے بھاگتا ہے اس لئے کہ سنکھیا مادی موت کا سبب ہے اور حرام چیز کھانا روحانی موت کا سبب بن جاتا ہے لیکن محض عقل ....! وہ تو ممانعت نہیں کرے گی چاہے سانپ کھائے، خنزیر کھائے، لیکن ایمان اجازت نہیں دیگا۔ اس واسطے کہ ہر گوشت ہر پوست میں ایک خاصیت ہے تو جیسے اطباء بری خاصیت کی اشیاء کے کھانے سے ممانعت کرتے ہیں، اطبائے روحانی حضرات انبیاء علیہم السلام بھی بری اشیاء سے روکتے ہیں ہر گوشت کی ایک خاصیت ہے۔ خنزیر کی طبیعت میں بے حیائی اور بے غیرتی ہے نجاست خور ہے غلاظت خور ہے، ایک خنزیر دوسرے ہم جنسوں پر جست (مباشرت) کرتا ہے تو ویسی گندگی اور وہی صورت اس کے کھانے والوں میں بھی آئے گی۔ غلاظت، کدورت، بے حیائی اور بے غیرتی جیسے اوصاف پیدا ہوں گے۔ درندوں کا گوشت شیر، بھیڑیا وغیرہ کا حرام قرار دیا گیا، کیوں کہ ان کے گوشت کے اندر درندگی کی خاصیت ہے تو ان چیزوں کا کھانے والا انسان اعلیٰ جانور بن جائے گا اور انسانیت ختم ہو جائے گی اس لئے شارع علیہ السلام نے ممانعت کر دی........ اور ایسے جانوروں کی اجازت دی جو اعتدال کی شان رکھتے ہوں تا کہ عدل پیدا ہو یہ خاصیت اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے کس مخلوق کو کیسا بنایا اس کا حق ہے کہ وہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں

---

① السنن للترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی خاتم الحدید ج:٦ ص: ٤٣١.

جانور حلال کیا فلاں حرام کیا:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ﴾ ①

حرام کیا گیا تم پر خنزیر اور مردار جس کی روح نکل جانے پر اسمیں روحانیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالص مادیت رہ جاتی ہے اور خالص مادیت ایک تعفن ہے، گندی چیز ہے۔ روح آ کر اس سے گندگی دفع کرتی ہے تو حق تعالیٰ جو شریعتوں کے بھیجنے والے اور ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں نے کس چیز میں کیا خاصیت اور جوہر رکھا ہے اور کیا نہیں، اسے حق ہے کہ وہ کہے فلاں چیز استعمال کرو فلاں مت کرو، تو جب آدمی ایمان (کی حکومت) کے نیچے آ جاتا ہے تو پھر اس میں کھانے، پینے، رہنے سہنے، اوڑھنے میں رضائے خداوندی پیش نظر رہتی ہے کہ اگر مالک اور محسن ناراض ہوتا ہے تو مجھے حق نہیں کہ کوئی ایسا کام کروں۔

اسی طرح نسل بڑھانے میں بھی یہی خیال رہے گا زنا سے بچے گا نکاح کی طرف آئے گا۔ اگر ایمانی زندگی نہ ہو محض عقل ہو تو عقل محض میں زنا بھی حلال ہے اور نکاح بھی۔ اس میں اس کا کوئی امتیاز نہیں کہ یہ نکاح اور وہ سفاح! تو طبع بشری میں محض نفس کی رضا پیش نظر ہوتی ہے عقل آ جائے تو مفادِ عامہ سامنے آتا ہے جسے ہم جمہوریت کہیں گے اور جمہوریت میں یہی ہوتا ہے کہ سب کی رائے لے لو اور سب کی خوشی حاصل ہو جائے اور جب ایمانی زندگی آتی ہے تو جمہور سے بالاتر ہو کر خدا کی رضا کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ راضی ہو جمہور راضی ہوں یا نہ ہوں سارے انسان ملکر بھی ناراض ہو جائیں تو یہ اُسے گوارا کرے گا اللہ کو ناراض کرنا گوارا نہیں کرے گا، پروردگار کی رضا کو ہر چیز پر ترجیح دیگا تو ایمانی زندگی کے اندر وہی تمام چیزیں ہیں جو اب تک استعمال میں آ رہی تھیں صرف شکل بدل گئی رضائے خداوندی کی شکل آ گئی کہ کس طرح مجھے میرے مالک نے حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ پانی پیو تو دائیں ہاتھ سے پیو، بائیں ہاتھ سے پیو گے تو شیطان شامل ہو جائے گا اور جب شیطان کا حصہ کھانے پینے میں آ گیا تو نفس پر شیطنت کے اثرات پڑیں گے۔ اگر دایاں ہاتھ کھانے سے آلودہ ہو اور مجبور ہے کہ گلاس بائیں ہاتھ میں لے تو کم سے کم دائیں ہاتھ کا کوئی حصہ لگا لیا جائے تا کہ دائیں ہاتھ سے پینا ثابت ہو جائے۔ اس واسطے فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا شیاطین کا کام ہے اور دائیں ہاتھ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کا۔ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيَامُنَ ② جناب نبی کریم کو ہر شریف اور بہتر کام میں دایاں ہاتھ پسند تھا۔ لباس پہنتے تو پہلے دایاں ہاتھ دائیں آستین میں ڈالتے، پاجامہ پہنتے تو پہلے دایاں پیر دائیں پائچے میں، کنگھی کرتے تو پہلے دائیں جانب، دانت مانجھتے تو پہلے دائیں جانب۔ تو دائیں جانب سے ابتداء حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو پسند ہے بائیں جانب سے نہیں اور دائیں جانب شریف سمجھی جاتی

① پارہ: ۶، سورة المائدة، الآية: ۳.

② السنن للنسائي، كتاب الزينة، باب الترجل ص: ۲۴۲۳ رقم: ۵۲۴۲.

ہے۔تو کثافت اور ذلالت کے امور شیاطین کو پسندیدہ ہیں اور ہر چیز کی پاکی اور صفائی انبیاء کو پسند ہے۔اسی طرح ایمانی زندگی کی وجہ سے کھانے پینے میں غور کرے گا کہ کھانا حلال کا ہو حرام کا نہ ہو اس واسطے کہ دینی توفیق کا تعلق اکل حلال سے ہے، لقمہ حرام جب پیٹ میں پہنچتا ہے تو دینی جذبات کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، حلال پہنچتا ہے تو دین پر عمل اور محبت کے جذبات بھڑ کتے ہیں اس لئے کہ دین بہر حال صاف چیز ہے اگر کسی شخص کی طبیعت نہایت پاکیزہ اور ستھری ہے اس کے سامنے اگر غلیظ آدمی کو پیش کرو تو منہ پھیر لے گا اور اگر اس کی طبیعت گندی ہے تو جتنی غلیظ چیزیں سامنے آئیں گی اس کیلئے اتنا ہی خوشی کا موقع ہوگا۔

دکن کے بادشاہ کی نفاست کا حال...... دکن کے بادشاہ ''تاناشاہ'' تھے۔تاناشاہ تاناشاہی طبیعت کے تھے مشہور ہے طبیعت بہت زیادہ نفیس و نازک تھی۔جب دشمن نے دکن کے حملہ میں ان پر قبضہ کیا اور قیدی بنا کر فاتح کے سامنے پیش ہوئے تو تجویز ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے تو انہوں نے کہا کہ جب تم مجھے بہر حال واجب القتل سمجھتے ہو تو اس کیلئے تم زیادہ جد وجہد مت کرو میں آسان ترکیب بتائے دیتا ہوں، مزاج میں چونکہ حد درجہ لطافت تھی تو کہا کہ کسی غلیظ بھنگن عورت کو گندگی لیکر سامنے سے گزار دو تو میں ختم ہو جاؤں گا چنانچہ غلاظت کا ٹوکرا سامنے لایا گیا، بس وہیں دم نکل گیا تحمل نہیں کر سکے۔الغرض پاک وصاف اور نفیس طبیعت ستھری چیزوں سے خوش ہوتی ہے جو چیزیں پاخانہ میں پیدا ہوتی ہیں اگر انہیں باہر ڈال دو وہیں مر جائیں گی اس لئے کہ غلاظت ان کا طبعی تقاضا ہے اور صاف چیزوں پر ناپاک چیزوں سے مردنی چھا جاتی ہے تو ہر چیز میں اس کی طبیعت کے مناسب جو چیز ہے وہی آتی ہے اور جبھی وہ زندہ رہتی ہے۔اسی لئے ایمانی طبائع لقمہ حرام کو کبھی برداشت نہیں کرتی حتیٰ کہ مشتبہ لقمہ کو بھی۔

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کا تقویٰ...... ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے ان کا تقویٰ اور طہارت مشہور ہے، فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ کا میرے ساتھ معاملہ ہے کہ اگر نادانستگی میں بھی کوئی مشتبہ لقمہ پیٹ میں چلا جائے تو فوراً قے آجاتی ہے تو انتہائی تقویٰ اور پاکیزگی بڑھتے بڑھتے حق تعالیٰ کا ایسا معاملہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ آدمی متقی بننے کی مشق کرے جب تقویٰ باطن نصیب ہو جاتا ہے تو پھر حق تعالیٰ خود حفاظت فرماتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا تقویٰ...... حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنا ہی واقعہ بیان فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ اعظم گڑھ گیا، اس ضلع میں اسٹیشن سے چار میل چھوٹا سا گاؤں تھا، وہاں کے لوگوں نے مجھے بلایا، وہاں سے جب فارغ ہوا تو ریل رات کو گیارہ بجے جاتی تھی، سردی کا زمانہ تھا لوگوں نے کہا کہ سردی ہے اندھیری رات ہوگی بارشیں ہو رہی ہوں گی اس لئے رات کو جانے میں تکلیف ہوگی مناسب ہے کہ عصر کے وقت اسٹیشن پہنچا دیا جائے رات کو ٹرین آئے گی تو سوار ہو جائیں گے۔تو حضرت کو سوار کر کے اسٹیشن لائے جو بہت چھوٹا سا تھا، نہ ویٹنگ روم نہ مسافر خانہ۔دفتر کا ایک ہی کمرہ تھا اور اسی سے ملا ہوا مال گودام تھا، بوریاں وغیرہ وہاں بھرتے تھے۔اسٹیشن ماسٹر

تھا تو ہندو مگر بھلا آدمی تھا اس نے دو چار بوریاں ہٹائیں اور مصلی کی جگہ بنائی کچھ آرام کی جگہ ہوگئی۔

پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ آرام سے بیٹھیں۔ فرماتے تھے جب مغرب کا وقت ہوا تو میں نے نماز پڑھی اس کے بعد سنتیں اور اس کے بعد نفلوں کی نیت باندھ لی، وہ اسٹیشن ماسٹر ایک لیمپ لیکر آیا تا کہ روشنی ہو جائے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے معاً یہ خطرہ ہوا کہ مال گودام کیلئے گورنمنٹ نے کوئی لیمپ رکھا نہیں ہے، یہ محض ریلوے کا لیمپ میری وجہ سے لایا ہوگا تو میں گویا غاصب ٹھہرا، میرے لئے حق نہیں کہ اسے استعمال کروں، نماز میں ایک بے چینی شروع ہوگئی: کہ اے اللہ تو نے ہمیشہ مجھے مشتبہ چیزوں سے بچایا ہے۔ یہ مشتبہ چیز آرہی ہے جس کا مجھے حق نہیں، اس لئے تو ہی بچانے والا ہے، فرماتے تھے کہ بمشکل میں نے دو رکعتیں ختم کیں اور اس نے لیمپ رکھا نہیں بلکہ لئے ہوئے کھڑا رہا، جب میں نے سلام پھیرا تو اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں یہ لیمپ لیکر آیا ہوں اور یہ اسٹیشن کا نہیں میرا ذاتی ہے، لایا اس لئے کہ اندھیرے کی تکلیف نہ ہو..... فرماتے تھے کہ میں نے اتنی دعائیں کیں اس کے حق میں کہ اتنی رعایت ہے، اس لئے اس نے خود محسوس کیا کہ مجھے (ریلوے کی لالٹین کا) حق نہیں تو اپنے گھر سے لایا۔ تو طبیعت میں جب سلامتی ہو تو کافر کی بھی قدرت رہنمائی کرتی ہے بشرطیکہ مذہب کا جذبہ موجود ہو، اخلاقی قدریں اس کے اندر ہوں۔ الغرض متقی جب تقویٰ تک پہنچ جائے تو

می دہد یزداں مراد متقین

والا معاملہ ہوتا ہے حق تعالیٰ ایسے راستے پیدا فرما دیتے ہیں کہ مشتبہات سے بچ جائے مگر یہ جب ہی ہوتا ہے کہ تقویٰ باطنی کی عادت ڈالے، جو تقویٰ ظاہر کا ہے وہ تو یہ ہے کہ برا عمل نہ کرے، ناجائز نہ کرے ہر عمل جواز کی حد میں کرے اور ایک تقویٰ باطن ہے وہ زیادہ دقیق ہوتا ہے وہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی، جب تک کہ اعلیٰ درجہ کا متقی نہ ہو۔

اپنی بیوی میں دوسری عورت کا خیال حرام ہے..... فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کوئی خوش رنگ شربت پینے بیٹھا ہے اور تصور یہ باندھا ہے کہ میں شراب پی رہا ہوں تو فرماتے ہیں کہ یہ گنہگار ہے اور اگر اس کی نیت کھل جائے تو حاکمِ وقت اسے سزا دے گا وہ شربت بھی اس کے حق میں مکروہِ تحریمی بن جاتا ہے، اس نے زبان سے اگر چہ شراب نہ پی مگر خیال سے پی لی، دل سے پی لی۔ اسی طرح فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے اس کے ہاتھ تھامے ہوئے ہے اور دل میں دھیان ہے کہ فلاں اجنبیہ عورت جس سے مجھے عشق ہے یہ وہی اجنبیہ عورت ہے اس کا فقط تصور باندھ لیا تو فرماتے ہیں کہ یہ باطنی طور پر حکم میں زانی کے ہو جائے گا۔ اس کے حق میں تب جائز ہوگا کہ تصور بدل کر توبہ کرے۔ تو دل میں تصورات بھی غلط طرح کے نہ ہوں برا تصور آئے گا تو آگے عمل شروع ہوتا ہے، برے جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں تو عمل بھی ناپاک ہو جائے گا اسے کہتے ہیں تقویٰ باطن کہ جذباتِ قلب بھی مصفی و مزکی ہوں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ

الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا......﴾ ① جولوگ تقویٰ کی عادت ڈالتے ہیں اگرنا گہانی طور پر کسی غلطی میں پڑ جاتے ہیں تو فوراً ان کی طبیعت میں روشنی پیدا ہوجاتی ہے اورتوبہ کر کے سنبھل جاتے ہیں ،اس خیال سے بھی توبہ کرتے ہیں اس لئے کہ خیال سے ہی تو عمل پیدا ہوتا ہے اگر خیالات نہ روکے اوراجازت دیدے کہ جیسی رَوْ آئے تو چلتے رہو تو آدمی بہت سی بدعملیوں میں مبتلا ہوجائے گا۔اب یہ کتنی دقیق بات ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ اجنبیہ عورت کے بچے ہوئے پانی سے اجنبی مرد کے لئے وضوکرنا مکروہ ہے۔اس لئے کہ اسے خیال آئے گا فلاں عورت کا بچا ہوا پانی ہے اگر یہ دھیان بڑھ گیا تو ممکن ہے آگے بہت سے فسادات پیدا ہوں۔حدیث میں فرمایا گیا:اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا وَاَشَارَ اِلٰی صَدْرِہٖ ② تقویٰ قلب کے اندر ہوتا ہے جب قلب کے اندر آجائے گا تب عمل کے اندر پیدا ہوگا جب قلب میں ہی نہیں ہوگا تو قالب میں بھی نہیں ہے وہ کیسے متقی بن جائے گا! تو بہرحال جب ایمانی زندگی آجاتی ہے تو خیالات پر بھی کنٹرول کرنا ہوتا ہے کہ خیالات بھی ایسے نہ ہوں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجائے اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ جیسے آپ کے ہاتھ پیر کو دیکھتے ہیں ایسے ہی اللہ دلوں کو بھی دیکھتے ہیں ﴿وَاللهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ③ اِنَّ اللهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَنِیَّاتِکُمْ ④ تمہارے عملوں کو نہیں دیکھتا،دلوں کو دیکھتا ہے کہ ان کے اندر نیت کیا ہے۔

قانونِ الٰہی کی منشاء......تو دنیوی بادشاہوں کا قانون صرف بدن پر لاگو ہوتا ہے لیکن خدائی قانون تو قلب پر بھی لاگو ہوتا ہے دنیوی سلطنتیں بدعملی سے روک سکتی ہیں کہ چور نے چوری کی اسے جیل بھیج دیا۔ڈکیت نے ڈکیتی کی اُسے جیل بھیج دیا لیکن قلب تو نہیں بدل سکتا وہ تو خدا کی حکومت سے بدلے گا دنیوی حکومتیں افعال سے روکتی ہیں اور خدائی حکومت و قانون ان برے افعال کی نفرت دل میں ڈالتی ہے تو جب تک اخلاقی حالت درست نہ ہو آدمی صحیح معنوں میں آدمی نہیں بن سکتا۔اس کے لئے یہ بھی ضروری اور لازمی چیز ہے کہ اخلاقی حیثیت سے اس کے اندر بدعملی سے نفرت پیدا ہوجائے۔تو شریعت یہ بھی چاہتی ہے کہ برے افعال پر پابندی عائد کی جائے تا کہ لوگ بدعمل نہ بنیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے اخلاق درست کئے جائیں تا کہ بدعملی سے لذت حاصل نہ ہو بلکہ نفرت پیدا ہوجائے۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کھانا، پینا ،وہی سونا جاگنا وہی اٹھنا بیٹھنا ،وہی مکان بنانا ان افعال پر طبیعت حکومت کررہی تھی تو حیوانی زندگی بنی جب عقل حکومت کرنے لگی تو انسانی زندگی بنی اور خدا کی وحی حکومت کرنے لگی تو ایمانی زندگی بنی۔انسانی زندگی کا جو مادہ تھا انہی افعال کو شائستہ اور بہتر بنادیا۔تو شریعت اسلام آپ کو کھانے پینے ،تجارت وزراعت سے نہیں روکتی ،حکمرانی کو نہیں روکتی مگر ان ساری چیزوں کو شائستہ بنا کر

---

① پارہ:۹،سورۃ الاعراف،الآیۃ:۲۰۱. ② الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ ودمہ وعرضہ ومالہ ج:۴ ص:۱۹۸۶. ③ پارہ:۴،سورۃ آل عمران،الآیۃ:۱۵۴. ④ الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ ودمہ وعرضہ ومالہ. ج:۴ ص:۱۹۸۶.

رضائے خداوندی کا ذریعہ بنادے گی، تاکہ آپ کے قلب میں شائستگی پیدا ہوجائے تو اسلام جامع مذہب ہے، فقط نماز روزہ نہیں سکھلاتا بلکہ اس کا تعلق تختِ سلطنت سے بھی ہے، گھریلو زندگی سے بھی، میدانی اور جنگی زندگی سے بھی، صلح سے بھی اور جنگ سے بھی۔ کام وہی کرے گا جو انسانی زندگی میں ہوں مگر اس کا رخ دین کی طرف بدل دیتا ہے، قلب کا رخ ذرا سیدھا کر دو تو دین بن جائے گا۔

شیرِ خدا علی رضی اللہ عنہ کا اخلاص...... غزوۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہنے ابو جہل کو پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے، خنجر اٹھایا تو ابو جہل نے نیچے سے حضرت علی رضی اللہ عنہکے مُنہ پر تھوک دیا حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً خنجر چھوڑ کر کھڑے ہوگئے ابو جہل نے کہا: اے علی! میں تو تجھے بڑا دانشمند سمجھتا تھا اب تم دشمن پر قابو پاچکے تھے اور دشمن بھی ایسا جو نہ صرف تمہارا بلکہ تمہارے پیغمبر اور دین کا بھی دشمن ہے تو جو تمہارے نزدیک بدترین دشمن تھا، تمنے اس پر قابو پا کر چھوڑ دیا، اس سے بڑھ کر غیر دانشمندی کیا ہوگی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہنے جواب دیا کہ میں تجھ سے خدا کیلئے لڑنے آیا تھا جذباتِ نفسانی کی وجہ سے نہیں، تو نے جب منہ پر تھوکا تو نفس میں غیظ پیدا ہوا اب اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبہ سے قتل کرتا اور میری عبادت تباہ ہوجاتی، میں تو اللہ کیلئے لڑتا ہوں کہ تو اللہ کے دین کا دشمن ہے، اس کے کلمہ کو نیچا دیکھنا چاہتا ہے اگر میں اپنی ذات کیلئے قتل کرتا تو نفسانیت کا قتل کرتا للّٰہیت باقی نہ ہوتی۔

تو قتل وہی تھا، طبعی جذبے سے قتل کرتے تو نفسانی جذبہ ہوتا اور یہ ہوتا کہ محفوظ ہوجاتے لیکن ایمانی جذبے سے قتل کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خدا راضی ہو اور مجھے آخرت میں اجر ملے۔ پس جو کام انسان کرتا ہے تو وہ ہر کوئی کرتا ہے کافر کھاتا پیتا ہے، مؤمن بھی کھاتا پیتا ہے، وہ لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے یہ بھی لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے، فرق کیا ہے! وہ بحیثیت مؤمن کے ہر کام کرے گا، لوجہ اللہ کرے گا، کافر وہی کام اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے کرے گا، مؤمن میں نفسانیت ختم ہوجاتی ہے وہ تو للہ فی اللہ کام کرتا ہے تو عمل میں فرق نہیں ہوتا نیت اور روح میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کا رخ زمین کی طرف ہے اور دوسرے کا عرش کی طرف۔ تو ایمانی زندگی فقط رخ بدلتی ہے، اعمال کو تبدیل نہیں کرتی، نفس مہذب ہوجائے، تہذیبِ نفس اصل ہے تو یہ ایمانی زندگی کہلاتی ہے۔ تو اگر ہم کھانے پینے میں لگے رہیں اوڑھنے پہننے اور سنوارنے میں لگے رہیں تو حیوانیت سے آگے نہیں بڑھیں گے اور اگر قومی خدمت اور مفادِ عامہ کیلئے کچھ کیا تو زیادہ سے زیادہ انسان بن گئے لیکن مؤمن نہیں بنیں گے اور جب مؤمن بنیں گے تو ان سب چیزوں کو لوجہ اللہ کریں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَـهٗ رَبُّـهٗۤ اَسْلِمْ﴾ ① اے ابراہیم مسلم بن جاؤ، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ اب تک کفر میں تھے اب اسلام قبول کرلیں، وہ تو پیغمبر اور ایمان کا سرچشمہ ہیں تو مسلم بننے کے معنی ہیں گردن نہاد ہونے کے یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو کہ جو کام کرو اپنے نفس کی رضا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱۔

کیلئے نہ کرو۔ ﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ① ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! میں مسلم بن گیا، فرمایا گیا مسلم بن گئے تو اعلان کرو: ﴿قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ② کہہ دے ابراہیم کہ میری نماز اور حج میرا مرنا جینا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ تو میں ان اعمال میں کسی کو شریک نہیں کرتا محض اللہ کی رضا کیلئے کرتا ہوں۔ مسلم بننے کے معنی یہی ہیں کہ کھانا پینا مرنا جینا لوجہ اللہ بن جائے تو ایمان آ کر اور زندگی نہیں سکھلاتا اسی انسانی زندگی کو مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

عرفانی زندگی، منشاء خداوندی کی حکومت...... اور جب یہ مکمل ہو جاتی ہے تو اب اللہ کی رضا کیلئے لڑنا، مرنا اور جینا بھی ہے۔ اب جتنا بھی اللہ کے لئے کام کرے گا حق تعالیٰ کی معرفت اور پہچان بڑھ جائے گی اور جتنی پہچان بڑھتی جائے گی قرب خداوندی نصیب ہوتا ہو جائے گا، ایمانی زندگی میں فقط عقیدہ تھا کہ مالک الملک ایک ہے اور اللہ کی رضا کیلئے کام کرتے ہیں اب فقط علم نہیں رہے گا جان پہچان ہو جائیگی اور اب منشاء کی پابندی کرنے لگے گا، اب تک تو قانون کی پابندی کر رہا تھا حکم ہوا نماز پڑھ لے کہا بہت اچھا! حلال اختیار کرو حرام چھوڑ دو، کہا: بہت اچھا! رشوت مت لو، بہت اچھا! جھوٹ مت بولو، کہا: بہت اچھا! تو جتنے احکام تھے ان کی پابندی کا نام ایمان اور اسلام ہے کہ خدا کے قانون کے نیچے زندگی بسر کرے۔ یہ ایمانی زندگی تھی لیکن ایک مرتبہ زندگی کا اس سے بھی اوپر تھا وہ یہ کہ...... قانون کی پابندی کرتے کرتے آخر میں قانون ساز کے منشاء کی پابندی کرنے لگتا ہے اور قانون سے بالاتر ہو کر عمل کرتا ہے۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ کسی محبوب نے حکم دیا کہ بھئی اپنے باغ سے ہمیں پھول دیدو اور تم نے انکو پھول پہنچا دیا اور قانون سے بالاتر منشاء کی پابندی یہ ہے کہ سارا باغ ہی اس کے سپرد کر دیا کہ پھول کیا ہے سارا باغ ہی حاضر ہے! اللہ نے مانگا کہ جو روٹی کھاتے ہو اس میں سے تھوڑا حصہ اللہ کے نام پر بھی دیدو تو منشاء کی پابندی یہ ہے کہ سارا کھانا ہی اٹھا کر اللہ کے نام پر دیدیا یا خود روزہ رکھ لیا تو انسان ایسا جب کرے گا جبکہ حاکم سامنے موجود ہو جب سامنے موجود ہوگا تو حکم کا انتظار نہ ہوگا بلکہ وہ تو اسکی نگاہ و آبرو کو پہچان کر عمل کرے گا، اس کی منشاء اسکی پیشانی سے معلوم ہو جائے گی کہ یہ چاہتا ہے یہ نہیں۔

شاہوں کی مزاج شناسی...... اورنگ زیبؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ان کا جو کمانڈر انچیف تھا اس نے فوجی سامان اسلحہ کی تیاری شروع کر دی اور فوج کے کانوں میں پھونک دیا کہ دکن پر جانا ہے تیار رہو تو کسی نے کمانڈر سے کہا کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے؟ کہا نہیں، بلکہ ایک دفعہ اورنگ زیب تخت پر بیٹھے ہوئے تھے میں کھڑا تھا تو مجلس میں دکن کا جوذکر آیا تو بادشاہ نے نہایت تیز نگاہوں سے دکن کی طرف دیکھا! میں سمجھ گیا کہ دکن سے ان کے دل میں زنگ ہے تو ابھی تو حکم نہیں، ضابطہ میں تو پھر ہی ہوگا مگر میں نے اورنگ زیب کا منشاء پالیا تھا تو اگر یہ عالمگیر سے

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۱۔ ② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۶۳-۱۶۴۔

دور ہوتا تب تو انتظار کرتا کہ قانونی حکم پہنچے لیکن چونکہ سامنے کھڑا تھا تو اس کی نگاہ اور پیشانی سے پہچان گیا تو منشاء کی پابندی کرتا گویا پہچان پر عمل کرنا ہے اسکو معرفت اور عرفان کہتے ہیں۔ ایک علم اور اعتقاد ہے جو غائبانہ ہوتا ہے اور ایک یہ کہ اللہ کو رسول، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا اب قانون کا انتظار نہیں اب تو نگاہ وآبرو ہی مقصد بتلا دے گی، اس کو معرفت کی زندگی کہتے ہیں اور اس کا نام ہم عرفانی زندگی رکھیں گے۔

ایرانی شہزادے کا ایک واقعہ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس بادشاہ ہندوستان مہمان ہوا، انہیں لیموں کی ضرورت پڑی شہزادہ ایران کے باغ میں کھٹے لیموں تھے، خادم اجازت لینے آیا وہ سن کر منقبض ہوئے اور ترشروئی سے دیکھا اس نے باہر آکر کہا کہ اجازت مل گئی لیموں توڑو کہا کہ بے وقوف اجازت کہاں ملی وہ تو کچھ بولے ہی نہیں اس نے کہا کہ جب شہزادے نے ترش نگاہوں سے دیکھا تو ہم سمجھ گئے کہ کھٹے لیموں کی اجازت دیدی گئی ہے تو پاس رہنے والے منشاء اور طبیعت میں اتنا دخل پالیتے ہیں خواہ لفظ سامنے نہ ہوں۔

تو انبیاء علیہم السلام واولیاءِ عظام جو معرفتِ خداوندی حاصل کر لیتے ہیں وہ اپنے ذوق سے ان چیزوں کو پالیتے ہیں، جو منشاء خداوندی ہوتی ہیں، حالانکہ حکم ابھی نہیں ہوتا اور بہت سے اہل اللہ اور اولیاء کاملین کے قلب پر جو واردات ہوتے ہیں ان واردات سے ان کو منشاءِ خداوندی معلوم ہو جاتا ہے وہ شریعت کا قانون نہیں ہوتا تو اسکی تبلیغ نہیں کرتے مگر وہ خود کرنے پر پابند ہیں کیونکہ انہوں نے منشاء کو دیکھ لیا۔

حاجی امداد اللہؒ کا ادبِ غلافِ کعبہ ...... حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جو دار العلوم کی جماعت کے شیخ ہیں وہ مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تو عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہ پہنا، لوگوں نے کہا کہ شرعاً ناجائز ہے؟ فرمایا نہیں، پوچھا کیوں نہیں پہنتے؟ فرمایا: بیت اللہ کا غلاف سیاہ رنگ کا ہے، مجھے بے ادبی معلوم ہوتی ہے کہ اس رنگ کو قدموں میں استعمال کیا جائے یہ محض ایک ذوق اور منشاء کی بات تھی تو ادبی ذوق کے اندر بعض دفعہ آدمی وہ چیزیں کرتا ہے کہ قانون میں نہیں ہوتیں مگر اس کا ذوق کہتا ہے کہ مجھے اس طرزِ عمل پر جانا ہے، اسکو عرفانی زندگی کہتے ہیں۔ تو اولیاءِ کاملین کی زندگی عرفانی ہوتی ہے کہ محض جائز و ناجائز ہی نہیں بلکہ جائز کے اندر بھی دیکھتے ہیں کہ منشاء اگر یہ ہو کہ کم سے کم کھاؤں تو ایسا کروں اور اگر یہ ہو کہ بالکل نہ کھاؤں تو میں فاقہ کروں۔

حضراتِ اولیاء کے مزاج ...... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرات اہل اللہ جو فقر و فاقہ کو پسند کرتے ہیں تو شریعت نے یہ حکم نہیں دیا مگر بہت سے اولیاء کی زندگی ہے، جیسے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کہ ایک ایک ہفتہ فاقہ کا گزارتے تو یہ شرعی حکم نہیں تھا مگر شریعت بھیجنے والے کا منشاء ان کے حق میں یہی تھا کہ جب زیادہ سے زیادہ زہد بڑھ جائے تو زیادہ سے زیادہ درجات بلند ہوں گے۔ حضرت شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ کو فاقہ سے بڑی محبت تھی اور دو دو ہفتے فاقے ہوتے تھے اور وہ ارادی فاقے ہوتے تھے یہ نہیں کہ مفلس اور تنگدست تھے، دولت تو ایسے لوگوں کے قدموں میں آکر گرتی ہے۔ تو شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر اُن کے گھر آئے، شاہ صاحب موجود

نہیں تھے تو گھر والوں کو پریشانی ہوئی کہ ہمارے گھر کے جو بڑے ہیں شاہ ابوالمعالی ان کے شیخ کی کس طرح خاطر مدارات کریں۔ شیخ سمجھ گئے کہ نہ دانہ ہے، نہ پانی تو ایک روپے کا غلہ منگوایا اور ایک تعویذ لکھ کر دیا اور فرمایا کہ اسے غلہ میں ڈال دو اللہ برکت دے گا۔ شیخ ایک ہفتہ ٹھہرے اور روزانہ کھایا جب چلے گئے تو وہ غلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا دو تین ہفتے کے بعد شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو دیکھا کہ دو دو وقت روٹی پک رہی ہے انہیں فقر وفاقہ سے محبت تھی تو فرمایا کہ کیا بات ہے فاقہ نہیں ہوتا، ہمارے پاس تو کچھ تھا نہیں دو وقت کی روٹی کہاں سے آ گئی تو بتلایا گیا کہ آپکے شیخ آئے تھے گھر میں فاقہ تھا تو انہوں نے خود ایک روپے کا غلہ منگوایا اور تعویذ لکھ اسمیں ڈالا، اس کی برکت ہے۔ کہا: اچھا تم بڑے گستاخ ہو میرے شیخ کے تعویذ کو غلہ میں ڈال دیا ہے، نکال کر لاؤ! میں اسے اپنے سر پر رکھوں اسے لیکر پگڑی میں باندھ لیا اور وہ غلہ اسی دن ختم ہو گیا۔ اب پھر فقر وفاقہ شروع ہو گیا۔

تو یہ کہیں شریعت کا حکم تھا کہ ہفتہ ہفتہ فاقہ کرو! مگر قانون بنانے والے کا منشاء محسوس کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ فقر وفاقہ کی زندگی ہو تاکہ درجات بلند ہوں، روحانیت ترقی کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ میں آتا ہے کہ دو دو مہینے گزرتے تھے کہ بیتِ نبوت میں دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ (اسودین) کھانے کو ایک ٹکڑا کھجور اور پانی پر گذر ہوتی تھی۔ تو قرآن کریم میں تو یہ حکم موجود نہیں تھا کہ آپ دو مہینے بالکل فقر وفاقہ سے رہیں، مگر قانون سے بالاتر ہو کر قانون بھیجنے والے کا منشاء آپ کے قلب مبارک پر روشن تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ کھانے پینے اور لذاتِ دنیا کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ دیں، وہ توجہ کریں تو حق تعالیٰ کی ذات کی طرف، علم وعرفان کی طرف۔ تو قانون ساز کے منشاء کو پا کر عمل کرنا اسے معرفت یا عرفانی زندگی کہتے ہیں۔ مگر اس عرفانی زندگی کا مادہ بھی وہی ہے جو حیوانی زندگی کا تھا وہی کھانا پینا، رہنا سہنا وہی سب کچھ اب منشاء خداوندی حاکم بن گیا۔ تو حیوانی زندگی میں طبیعت حاکم ہوتی ہے، جو ایک جاہل بادشاہ ہے جس کے تحت آدمی جانوروں کی طرح کھاتا پیتا ہے انسانی زندگی آتی ہے تو عقل حاکم ہو جاتی ہے اور عقل میں شعور ہوتا ہے تو ذرا سوچ سمجھ کے کھاتا پیتا ہے ایمانی زندگی آتی ہے تو وحی کی رہنمائی ہوتی ہے تو عفت اور پاکدامنی پیدا ہو جاتی ہے اور عرفانی زندگی جب آجاتی ہے تو منشاء الٰہی انسان کے اوپر حکومت کرتی ہے اس وقت انسان کی زندگی نہایت بلند وبالا ہوتی ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام، اولیائے کاملین اور علماءِ ربانیین کی زندگی جس کے اندر دنیا ساری موجود ہے مگر حظِ نفس کا کوئی گذر نہیں، نفسانیت کا کوئی شائبہ نہیں، للّٰہیت کے جذبات کام کرتے ہیں، عداوت اور دوستی سب کچھ اللہ کیلئے ہوتی ہے نفسانی جذبات سے کچھ نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے **مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ فِی اللّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ**۔ ① جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے، کسی کو دیا تو اللہ کیلئے، ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے منشاءِ خداوندی اور اس کی

① السنن لابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه ج: ۱۲ ص: ۲۹۱.

رضا حاصل کرنے کیلئے گھر بار لٹا دیا، قانون شریعت سے آگے ہوکر ساری چیزیں وقف کیں ورنہ حق تو صدقات واجبہ ادا کرنے سے بھی ادا ہوجاتا تو گویا عرفانی زندگی بسر کرنے والا اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے، اسے عرفانی زندگی بھی کہیں گے اور احسانی بھی: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ① اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اس مقام تک نہ پہنچ سکو تو کم از کم یہ کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے، یہ اکمل زندگی ہے۔

وحدانی زندگی مقامِ فنائیت...... اور جب اتنا قریب ہوجائے کہ گویا تمام اعمال محبوب کو دیکھ کر کر رہا ہے تو اب یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف دیکھنے پر قناعت کرے، بلکہ چاہتا ہے کہ نہ صرف دیکھوں بلکہ معانقہ کروں، گلے لگوں۔ تو ایک وقت یہ بھی آتا ہے کہ اس معرفت واحسان کے بعد جی چاہتا ہے کہ مصافحہ کروں، حق تعالیٰ سے مل لوں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: لَا یَزَالُ یَتَقَرَّبُ عَبْدِیْ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی کُنْتُ سَمْعَہُ الَّتِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا ② بندہ نوافل پڑھتے پڑھتے مجھ سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ یعنی ظاہری اعضاء اس کے ہوتے ہیں قوتیں میری کام کرتی ہیں یہ گویا وہ مقام ہے کہ اپنے نفس کو مٹا کر ختم کردیا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کردیا اور حق تعالیٰ کی ذات اور تجلیات کے اندر غرق ہوگیا لَا یَزَالُ یَتَقَرَّبُ عَبْدِیْ ... الخ جس کو یوں کہنا چاہئے، جو کسی شاعر نے کہا:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی　　تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو میری جان بن گیا کہ میرے اندر سرایت کئے ہوئے، تُو میں بن گیا اور میں تو، وحدت پیدا ہوگئی تاکہ کہنے والا نہ کہے کہ میں کوئی اور ہوں اور تو کوئی اور، اس زندگی کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے کہ وحدت پیدا ہوگئی، اور یہ مطلب نہیں کہ بندہ خدا میں غرق ہوکر اس کا جُز بن گیا، اللہ تعالیٰ جزئیت سے پاک ہے بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنی نفسانی شہوات کو ختم کر کے مناسبت مع اللہ کے جذبات پیدا کردیئے کہ جو وہ کرتا ہے میں بھی کروں گا وہ جو چاہے گا میں بھی چاہوں گا۔ کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ فرمایا: اس شخص کا کیا حال ہوسکتا ہے کہ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چلتے ہوں! تو پوچھنے والے نے کہا اچھا آپ اس درجہ کے ہیں؟ فرمایا: ہاں الحمد للہ! میں تو اس مقام پر ہوں۔ اس نے کہا آخر کس طرح؟ تو فرمایا: اس طرح کہ دونوں جہاں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چلتے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کردیا ہے جو وہ چاہتا ہے وہ میں چاہتا ہوں اگر کوئی پیدا ہوتا ہے تو کہتا ہوں کہ الحمد للہ یہی بہتر تھا، اگر کوئی مرتا ہے تو کہتا ہوں الحمد للہ یہی مناسب تھا۔ میں کون ہوں اللہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام والاحسان، ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۹۔
② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ص: ۱۵۸ رقم: ۶۰۲۱۔

کے خلاف رائے دینے والا کہ وہ تو مارے میں کہوں یہ زندہ رہے! تو سارا عالم میری مرضی پر چلنے لگا۔

ایک بزرگ شاہ دولہ کی رضا بر قضائے الٰہی...... ضلع انبالہ کے ایک بزرگ شاہ دولہ گزرے ہیں سائیں توکل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں تھے گاؤں میں بارش ہوئی جمنا چڑھ گئی کنارے پر گاؤں پڑتا تھا۔ طوفان آیا ایک دیوار تھی جس کی وجہ سے پانی کچھ رکا ہوا تھا اگر وہ دیوار نہ ہوتی تو سارا گاؤں غرق ہو جاتا، لوگ بیچارے پریشان ہو کر شاہ دولہ کی خدمت میں آئے کہ حضرت اللہ کے واسطے دعاء کریں طوفان سے گاؤں غرق ہو رہا ہے فرمایا: اچھا طوفان آ گیا چلو! پھاوڑا لیکر چلے، گاؤں والوں کا مجمع ساتھ تھا تو جو دیوار تھی (وقایہ یعنی محافظ) تھی شاہ دولہ نے وہ دیوار ڈھانا شروع کر دی۔ اب تو لوگ چلانے لگے کہ حضرت سارا گاؤں غرق ہوگا۔ فرمایا: ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' بھلا میں خدا سے مقابلہ کرنے آ سکتا ہوں؟...... تو یہ مقام جب نصیب ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپکو اللہ کی رضا میں فنا کر دے: ﴿وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① بس جو اللہ چاہتا ہے، وہی تم بھی چاہو اس کے خلاف چاہ نہیں سکتے جس کو وہ مرضی اور پسندیدہ قرار دیں ہم بھی اُسے پسندیدہ قرار دیں تو کہا جائے گا کہ یہ شخص فنائیت کے مقام پر پہنچ گیا۔ فانی فی اللہ ہو گیا یہ نہیں کہ ایک جز بن گیا، یہ جزئیت اور بعضیت سے اللہ کی ذات پاک ہے، فنائیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے تقاضوں کو ختم کر دے، خدا کی مشیت میں اپنے آپ کو غرق کر دے کہ جو...... ان کا منشاء وہ میرا منشاء، ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' اس کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے۔

یہاں بھی زندگی کا مادہ وہی ہے کھانا پینا، چلنا پھرنا، اوڑھنا پہننا لیکن وہ اس درجہ پر آ گیا کہ قانون سے بالاتر ہو کر محض منشاء کی پابندی میں غرق اور اس کی مرضی کے اندر فانی ہو جاتا ہے اسی موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے فرمایا گیا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ ② غزوہ بدر کے اندر آپ نے کنکریاں پھینک کر ماریں تو جس کے دماغ پر کنکر پڑی وہ دماغ کو تو کیا پورے بدن کو، قلب وجگر کو پھاڑ کر رکھ دیتی تھی اور سارے بدن سے پار ہو کر گذرتی تھی تو کنکری میں اتنی طاقت تو نہیں ہوتی لیکن نبی کے اندر جذباتِ حق موجود ہیں ان کی طاقت سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے، نبی آلہ کار ہوتا ہے اور خدائی قوتیں اس کے اندر کارفرما ہوتی ہیں۔ اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ﴾ وہ تو اللہ میاں مار رہا تھا اور جیسے فرمایا گیا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ③ ہمارا پیغمبر ہوائے نفس سے نہیں بولتا وحی سے بولتا ہے تو وحی تو کلام خداوندی ہے مطلب یہ ہے کہ زبان تمہاری کلام ہمارا ہوتا ہے، تمہارا ذاتی کلام بھی تمہارا نہیں زبان تمہاری روشنی ہماری ہے اور چراغ تمہارا ہے جس سے گھر روشن ہو جاتا ہے اور جیسے کہ دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ④ اے نبی! جو تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ تمہارے ہاتھ پر نہیں، اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے

① پارہ: ۳۰، سورۃ التکویر، الآیۃ: ۲۹۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۱۷۔

③ پارہ: ۲۷، سورۃ النجم، الآیۃ: ۳-۴۔ ④ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۰۔

ہیں: ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾ ① اللہ کا ہاتھ سب ہاتھوں کے اوپر ہے تو اس میں وحدت بیان کی گئی ہے، نبی کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ کہا، نبی کے کلام کو اپنا کلام کہا، نبی کے منشاء کو اپنا منشاء کہا یہ جب پیدا ہوتا ہے کہ وحدانی زندگی آ جائے۔

اہل اللہ کی زندگی کی جھلک...... تو میں نے پانچ زندگیاں آپ کے سامنے پیش کیں، ایک حیوانی زندگی، ایک انسانی زندگی، ایک ایمانی زندگی، ایک عرفانی زندگی اور ایک وحدانی زندگی۔ مگر ان پانچ زندگیوں میں جو دو ابتدائی زندگیاں ہیں وہ مبادی اور سبب کے درجے میں ہیں اور آخر کی دو زندگی ثمرہ کے درجے میں ہے اور بیچ کی زندگی جس کو میں نے ایمانی زندگی کہا وہ اصل مقصود ہے۔ زندگی بنانے کے لئے حیوانی بھی ضروری ہے مگر یہ زندگی اصل مقصود نہیں۔ ان ساری زندگیوں سے مقصود یہ ہے کہ یہ سارے کام رضائے خداوندی کیلئے ہوں اور یہ جو احسانی زندگی ہے کہ منشاء کو پالیا اور وحدانی زندگی یعنی فانی فی اللہ ہو گیا، یہ ثمرات کے درجے ہیں اور نتیجہ ہے۔ تو بیچ کی زندگی کیلئے دو نتیجے اور دو سبب ہیں، مقصود اصل بیچ کی زندگی یعنی ایمانی زندگی ہے جس کا نام شریعت اور اتباع شریعت ہے۔ اور قانون شریعت کی پابندی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسانی زندگی اور حیوانی زندگی ہم میں نہ ہوں۔ اس واسطے اصل مقصود ایمانی زندگی رہ گئی کہ میرا مرنا جینا اللہ رب العزت کیلئے ہو اس قانون کے تحت ہی ہو اسکو قرآن نے حیاتِ طیبہ قرار دیا ہے کہ جو شخص ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا مرد ہو یا عورت اسے ہم پاکیزہ زندگی عطاء کریں گے، یہ کیا ہوگی! اکلِ حلال کا جذبہ پیدا ہوگا، حرام خوری سے بچے گا، جتنا اس سے بچے گا حق تلفی سے بچے گا جتنا حق تلفی سے بچے گا امن کا ذریعہ بنے گا، محبوب القلب بنے گا، مبغوض نہ ہوگا۔ اگر ایک شہر میں سب کے سب حرام چیزوں کو چھوڑ کر خالص اپنے حق پر آ جائیں غیر کی حق تلفی نہ کریں تو باہمی محبت اور حسن سلوک پیدا ہوگا اور شریعتِ اسلام کے اتباع ہی میں درحقیقت امن ہے جتنا اس سے ہٹو گے برائی پیدا ہوگی کیوں کہ حق تلفیوں سے نفرت اور برائی پیدا ہوتی ہے تو اصل بنیادی چیز جس سے کسی مملکت میں امن و سکون ہو وہ انبیاء علیہم السلام کا اتباع ہے اور ان کی لائی ہوئی زندگی کی پیروی ہے ان کی سنتوں کا اتباع ہے۔ تو اس طرح اکلِ حلال کی عادت پیدا ہوگی پھر عبادت میں لذت پیدا ہوگی، محبت خداوندی کا ذائقہ انسان میں آ جائے گا اور اس میں سرشار ہو کر دنیا و مافیہا کی دولتیں ہیچ نظر آئیں گی، جب باطن کی دولت انسان کو میسر آ جائے تو سب دولتیں ہیچ بن جاتی ہیں۔

عبدالقادر جیلانیؒ کی ولایت...... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک ایک دن میں تین تین ہزار مہمان ہوتے تھے، بڑے بڑے ہال بھر جاتے تھے تو سنجر کے بادشاہ نے یہ پوچھا کہ شیخ کے ہاں مہمان داری زیادہ ہے، اس نے اپنے اوپر قیاس کیا حالانکہ وہ اللہ پر بھروسہ کر چکے تھے پریشانی کی کیا ضرورت تھی، تو ایک پورا صوبہ جسکا نام نیمروز تھا شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نام وقف کیا، شیخ کی ملکیت قرار دیکر پیپل کے پتے پر لکھ دیا کہ پورا صوبہ نیمروز آپکے نام کرتا ہوں، جسکی سالانہ آمدنی لاکھوں روپے ہوتی ہے۔ شیخ نے اس کا جواب فارسی کے دو شعر میں لکھا:

① پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۱۰۔

قرآن حکیم کی عملی تفسیر

چوں چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد | دردل بود اگر ہوسے ملک سنجرے

سنجر کے بادشاہ کا جو چتر ہے اسی طرح میرا منہ سیاہ ہو جائے اور میں بدبخت بن جاؤں اگر اس میں ذرا بھی ہوس آ جائے، تو میں سیاہ بخت بن جاؤں گا مجھے تمہارے صوبے کی ضرورت نہیں کیوں آگے اس کی وجہ بیان کی:

زآنگہ کہ یافتم خبراز ملکِ نیم شب | من ملکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک ہاتھ آیا ہے یعنی آدھی رات کی عبادت اور نفلوں کی وہ لذت جو حق تعالیٰ کے جلال و جمال کے مشاہدے ہوتے ہیں تو نیمروز کے ملک کی جو کے برابر بھی وقعت نہیں رہی۔ تو اہل اللہ ساری دنیا پر لات مار دیتے ہیں، اہل اللہ کو یہ لذتیں ملتی ہیں تو وہ ان وقتی لذتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ①

(اللہ تعالیٰ ہم سب کو حیوۃ طیبہ کی سعادت سے نوازے اور اتباع سنت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توفیق نصیب فرمائے اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے، آمین!)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

① یہ کیسٹ بھی یہاں آ کر ختم ہو گئی الحمد للہ اس تقـ[illegible] جس پر مرتب معذرت خواہ ہے۔

فلسفۂ علم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

تمہید...... بزرگانِ محترم! مجھے واقعی شرم محسوس ہورہی ہے کہ فضلاء علماء اور طلباء کے مجمع میں مجھ جیسا قلیل البضاعۃ آدمی کھڑے ہوکر خطاب کرے اور بیان کرے جہاں بحمد اللہ ایسے فضلاء موجود ہیں جن کو بلحاظ رتبے کے اپنے اساتذہ کرام کے درجے میں سمجھتا ہوں تو اس قسم کے مواقع پر لب کشائی کرنا کچھ بے ادبی معلوم ہوتی ہے اور شرم بھی محسوس ہوتی ہے لیکن امر مجبور بھی کرتا ہے تو میرا خطاب جس قدر بھی ہوگا وہ طلبہ سے ہوگا گو علم کے لحاظ سے آپ مجھ سے زیادہ ہیں آپ کا علم تازہ ہے تاہم ایک درجہ میں طالب علم ہونے کا نام ہے اور میں بھی طالب علم ہوں، اس واسطے خطاب کا حقیقی رخ طلباء کی طرف ہوگا اساتذہ کرام اس سے بالاتر ہیں۔ کس چیز میں خطاب ہوگا ظاہر ہے کہ خطاب کا موضوع خود ہی درس گاہ متعین کردیتی ہے یہ دارالعلوم ہے علم کا مرکز ہے اس لئے علم وتعلیم ہی کے سلسلہ میں چند کلمات گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

طلبِ علم طبعی جذبہ ہے...... پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان میں علم کا ذوق اور جذبہ فطری ہے یعنی پیدا کرائے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ انسان علم کو طبعًا مطلوب سمجھے ہوئے ہے ہروقت اس کا جی چاہتا ہے کہ میرا علم بڑھتا رہے، علم کی زیادتی سے کبھی بھی وہ تھکتا نہیں ہے ہروقت آپ کا جی چاہتا رہتا ہے کہ اچھی سے اچھی چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے اور آپ دیکھیں...... یہ طلب علم نہیں تو اور کیا ہے! جی چاہتا ہے کہ اچھے سے اچھے کلمات کان میں پڑتے رہیں...... یہ علم کی طلب نہیں تو اور کیا ہے کسی کا اخبار دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو کسی کا رسالہ دیکھنے کو صبح اٹھتے

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸.

ہی ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ دیکھے اخبار کیا لکھتا ہے، یہ علم ہی کی طلب ہے، بازار میں کوئی جھگڑا ہو جائے، ہر طرف سے لوگ سڑک پر جمع ہو جاتے ہیں، جھگڑے میں شریک ہونے کے لئے نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے کے لئے کہ کیا قصہ ہے، کیوں ہوا ہے، بہرحال علم کی طلب طبعی ہے اور طبعیات کیلئے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، انسان کو بھوک لگتی ہے تو دلیل کے زور سے نہیں لگتی کہ آپ استدلالی قوتوں سے بھوک لگائیں بلکہ جب لگی ہوئی ہو تو لاکھ استدلال کریں وہ کبھی نہیں مٹ سکتی، پیاس دلیل سے نہیں لگائی جاتی طبعی طور پر لگتی ہے۔ انسان میں ایک جذبہ ہے اور اس جذبے کے اُبھرنے کے بعد اگر خلاف میں بھی دلائل قائم ہوں تو بھوک نہیں رکے گی.. تو علم کی طلب بھی انسان میں طبعی ہے اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے سر سے لیکر پیر تک مجسم علم کی طلب بنا دیا، انسان کے ہر ہر ذرہ میں شعور موجود ہے پورے بشرے اور پوری جلد میں احساس موجود ہے، چھونے کی قوت موجود ہے جو سختی نرمی کا اور گرمی سردی کا علم حاصل کرتی ہے، تو سر سے پیر تک گویا انسان متعلم ہے، آنکھیں صورتوں کا علم حاصل کرتی ہیں، کان آوازوں کا علم حاصل کرتے ہیں، ناک خوشبو بدبو کا علم حاصل کرتی ہے، زبان ذائقوں کا علم حاصل کرتی ہے۔ تو مختلف قسم کے علوم اور مشاعرِ ادراک انسان کے اندر موجود ہیں اور وہ ہر وقت ان اشیاء کی تسکین کا طالب رہتا ہے، آنکھ والا کبھی یہ نہ چاہے گا کہ میں نہ دیکھوں، کان والا کبھی یہ نہ چاہے گا کہ میں نہ سُنوں، یہی طلب ہوگی کہ سنوں بھی، دیکھوں بھی اور چکھوں بھی، تو ہر وقت علم کی طلب انسان کے اندر موجود ہے۔

انسان میں طلبِ علم کے آلات جن کو نمایاں تر رکھا گیا ہے...... اور علم حاصل کرنے کے آلات اس کے اندر موجود ہیں، قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ① ماں کے پیٹ سے تو آدمی ہنر لیکر نہیں آتا۔ استعدادیں لیکر آتا ہے جوان مشاعر ادراک سے بڑھتا رہتا ہے، استعداد ابھرتی رہتی ہے، فعلیت میں آتی رہتی ہے اور ایک وقت میں جاکے انسان کامل عالم بن جاتا ہے بہرحال انسان مختلف قسم کے علوم کا مجموعہ ہے لیکن ان علوم کے مشاعر اور ان ادراکات کے مخزن زیادہ تر چہرے کے اندر موجود ہیں بینائی کی قوت آنکھ میں ہے، سماعت کی قوت کان میں ہے، شم کی قوت ناک میں ہے گویا علم کے سب بڑے بڑے مشاعر چہرے کے اندر موجود ہیں صرف ''قوتِ حس'' چھونے کی قوت سارے بدن میں پھیلی ہوئی ہے لیکن وہ اتنی یُعْبَأُ بِہٖ (قابل شمار) نہیں ہے جتنا کہ یہ دوسری طاقتیں ہیں..... یعنی چھونے کی قوت ایک تو بلید قوت (موٹی اور ظاہر) ہے وہ علم حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اس ملموس (چھوئے جانے والی شیء) کو معلوم کر کے سر پر پٹخ نہ دیا جائے، آپ جب تک کسی چیز کو چھو نہیں لیں گے اس کی سختی نرمی معلوم نہیں ہو سکے گی کیوں کہ اتنی بلید قوت ہے کہ دور سے علم نہیں حاصل کر سکتی جب تک کہ معلوم کو سر پر نہ چڑھا دیا جائے اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے۔

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۷۸.

اسی لئے شاید حق تعالیٰ شانہٗ نے کفار کی بلادت کو ہدایت کے سلسلہ میں یوں واضح فرمایا ہے کہ ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ ① اگر کاغذوں میں بھی کتاب لکھ کر دے دیں اور وہ ہاتھوں سے چھو بھی لیں تب بھی یہی کہیں گے کہ یہ سحر ہے یہ تو جادو ہے، پھر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یعنی ماسہ (چھونے والی) جیسی بلید قوت اس سے بھی یہ نابلد ہیں جاہل ہیں، اس سے بھی انہیں ادراک حاصل نہیں ہوتا جس کو قوت ماسہ سے بھی علم حاصل نہ ہو وہ باصرہ سے کیا علم حاصل کرے گا، وہ فؤاد (دل) سے کیا علم حاصل کرے گا! وہ سماعت سے کیا علم حاصل کرے گا تو سب سے زیادہ بلید قوت انسان کے اندر لمس و مس کی قوت ہے کہ جب تک معلوم سے ٹکرا نہ دیا جائے اس وقت تک اسے علم حاصل نہیں ہوتا، اس لئے اُونچی قوتیں یہی دو تین نکلتی ہیں ایک سننے کی قوت، ایک دیکھنے کی، ایک سمجھنے کی۔ اسی واسطے قرآن کریم میں اکثر مواقع پر ان ہی تین قوتوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَآ ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ ② جہنم کیلئے ہم نے تیار کر رکھے ہیں بہت سے لوگ، وہ کیسے ہیں! ان کیلئے دل ہیں مگر سمجھنے کی طاقت نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھنے کی ان میں ہمت نہیں کہ کلمہ حق کو اور کلامِ حق کو یا معاملۂ حق کو دیکھیں، کان ہیں مگر سن نہیں سکتے۔ تو تین چیزیں ذکر کیں ایک کان، ایک آنکھ اور ایک قلب تو گویا قابل شمار اور قابل اعتداد یہی تین قوتیں ہیں، یہاں ماسہ کا ذکر نہیں کیا سمع بصر اور فؤاد سننا دیکھنا اور سمجھنا ذکر کیا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ ③ تو سمع، بصر اور فواد کو جواب دہ قرار دیا گیا۔ یہ نہیں کہا کہ ہاتھ سے جواب طلب کیا جائے گا اگر طلب کیا بھی جائے گا تو ان کے واسطے سے۔ تو اکثر جگہ انہیں تین طاقتوں کو جمع کیا گیا ہے۔

اعضائے علم کی اعضائے عمل پر فضیلت ...... یہ تینوں چاروں طاقتیں انسان کے چہرے میں جمع ہیں اور چہرہ سب سے بلند اور بالا چیز ہے گویا اس طرف اشارہ ہے کہ قوتِ علمیہ قوت عملیہ سے افضل ہے، جو علم کا مقام ہے وہ حسی طور پر بھی بلند رکھا گیا ہے، آنکھ کی طاقت پیروں میں نہیں رکھی گئی، سننے کی طاقت ہاتھ کی انگلیوں میں نہیں رکھی گئی، اللہ پاک قدرت دکھلانے کے لئے قیامت کے دن یہ ساری طاقتیں بدن میں بانٹ دیں گے مگر ان طاقتوں کا اصل موضوع چہرہ قرار دیا گیا ہے جو اتنا باعزت ہے کہ احترام کے وقت اسے چوما جاتا ہے، پیشانی چومتے ہیں، سامنے جھکتے ہیں، اسی لئے چہرے پر مارنے کی ممانعت ہے کہ چہرے پر مت مارو، حرمت کے خلاف ہے، بہر حال ایک معظم اور محترم ظرف ان کیلئے تجویز کیا گیا ہے، اس سے علم کی عظمت اور بزرگی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے

① پارہ:۷، سورۃ الانعام، الآیۃ:۷. ② پارہ:۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ:۱۷۹. ③ پارہ:۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۳۶.

کہ جب علم عظمت والی چیز ہے تو عالم عظمت والی چیز کیوں نہ ہوگی! اس لئے آنکھ عالم ہے وہ اوپر رکھی گئی، کان عالم ہے تو اوپر رکھا گیا، ناک عالم ہے تو اوپر رکھی گئی گویا یہ چہرہ یوں سمجھئے علماء کی ایک بستی اور دارالعلوم ہے جس میں مختلف علوم رکھے ہوئے علماء جمع ہیں، کوئی صورتوں کا عالم، کوئی آوازوں کا عالم، کوئی ذائقے کا عالم، کوئی خوشبو کا عالم..... تو مختلف قسم کے علوم کے علماء جمع ہیں، جنہیں اوپر جگہ دی گئی ہے۔

انسان میں دوسرے اعضاء بھی ہیں مگر وہ مزدور قسم کے اعضاء ہیں ہاتھ پیر سے علم کا تعلق نہیں عمل کا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ آخرت میں جب کوئی عذاب دیا جائے گا تو یہ کہا جائے گا: ذٰلِکَ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ ۔ تو کسب اور عمل ہاتھوں پیروں کی طرف منسوب کیا گیا تو ہاتھ اور پیر یہ مزدور قسم کے اعضاء ہیں، عالم قسم کے اعضاء نہیں گو مزدور میں بھی تھوڑا بہت علم تو ہوتا ہے بالکل پتھر تو وہ بھی نہیں ہوتا تو کچھ چھو لے وغیرہ (لمس) کا علم ان کے اندر ہے، ہاتھ چھو کر کچھ پتہ چلا لیتا ہے، پیر چھو کر پتہ چلا لیتے ہیں مگر ان کی قوت ایسی معتدبہ قوت نہیں کہ اسکو مستقل علم والا شمار کیا جائے، تو مزدور کو بلکہ ہر کس و ناکس کو تھوڑا بہت تو علم ہوتا ہی ہے۔ اعلیٰ ترین علم جو قابل اعتداد اور قابلِ شمار ہو وہ وہی علم ہے جس کے علماء چہرے میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ تو مزدور طبقہ نیچے ہے اور عالم طبقہ اوپر، اس کو فضیلت دی گئی اور اس کو مفضول قرار دیا گیا تا کہ اہلِ علم یہ سمجھ لیں کہ ہمارے پاس جو چیز ہے وہ انتہائی شرف کی چیز ہے وہ انتہائی عزت کی چیز ہے۔

علم کی عزت استغناء میں ہے..... اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی عزت کریں اور جتنی علم کی عزت کریں گے اتنا عالم کی عزت ہوگی جتنا وہ اپنے علم کی بے حرمتی کرے گا خود عالم کی بے حرمتی پیدا ہوتی جائے گی۔ اگر ایک عالم خود اپنے علم کی عظمت نہ کرے تو دوسروں کو کیا مصیبت پڑی کہ اس کے علم کی عزت کریں۔ پہلے اسے اپنے وقار کو سنبھالنا ہے جب وہ اپنے وقار کو محسوس کرے گا تو دنیا اس کے وقار کے آگے جھکنے کے لئے مجبور ہوگی۔ اور اگر وہ خود ہی علم کو ذلیل کرے تو پھر اس کی عزت کرنیوالا کوئی نہیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ہارون الرشید نے فرمائش کی کہ امین اور مامون کو مؤطا پڑھا دی جائے اس کے لیے کب تشریف لائیں گے؟ فرمایا کہ علم کا یہ کام نہیں کہ وہ در بدر پھرے، علم کے طالب کا کام ہے کہ وہ اس کے پیچھے پھرے اور فرمایا کہ یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے، اگر تم ہی اس کا احترام نہیں کرو گے تو دنیا میں کوئی اس کا احترام کرنے والا نہیں ہوگا۔

تو عالم کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے علم کی عزت کو باقی رکھے اور وہ عزت استغناء ہے جتنا دوسروں کی طرف حاجت مندی اپنے اندر بڑھائے گا اتنا ہی علم کو بھی ذلیل کرے گا خود بھی ذلیل ہوگا اس کے اندر اگر طلب ہو تو صرف آخرت کی ہو دنیا کی نہ ہو۔

طالبِ دنیا کو دنیا بھی نہیں اور طالب دین کو دونوں ملتی ہیں..... دنیا طلب سے نہیں آتی بلکہ استغناء سے آتی ہے یہ سمجھ کا کھیل ہے لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ جتنا طالب بنیں گے اتنی ہی دنیا آئے گی، اس کے اگر آپ

طالب بن گئے تو اس کے سامنے ذلیل ہو گئے دنیا آئی تو کیا ہوا آپ کو ذلیل کر کے آئی۔عزت داری یہ ہے کہ استغناء ہو پھر دنیا آئے اَتَتِ الدُّنیَا وَھِیَ رَاغِمَةٌ ① دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں پر آئے۔

مجھے حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بانی دارالعلوم دیو بند ہیں کا واقعہ یاد آیا حضرت رحمۃ اللہ علیہ چھتہ کی مسجد میں تشریف رکھتے تھے، شیخ الٰہی بخش صاحب میرٹھی جو لکھ پتی لوگوں میں سے تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد تھے ملنے کیلئے آئے۔اور بہت بڑا ہدیہ لیکر آئے دو تھیلیاں جس میں اشرفیاں اور ہزاروں روپے کا مال تھا مگر دل میں یہ سوچتے ہوئے آئے کہ حضرت کو آج اتنا بڑا ہدیہ دوں گا کہ اب تک کسی نے نہیں دیا ہوگا۔تو اپنے ہدیہ کے اوپر ایک فخر کی کیفیت موجود تھی:۔

مگر پیش اہل دل نگہ دارند دل تا نہ باشد از گماں بہ تجل

اہل اللہ کے سامنے دل تھام کے جانا چاہیے اللہ تعالیٰ ان کے دل میں احساس پیدا کر دیتا ہے کہ فلاں کے دل میں کیا چیزیں کھٹک رہی ہیں وہ علاج بھی کرنا جانتے ہیں۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اسکا ادراک ہوا کہ انکے دل میں فخر و ناز کی کیفیت ہے، یہ بڑی چیز سمجھ رہے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجامت بنوا رہے تھے اب وہ بیٹھ تو سکتے نہیں تھے، جب تک کہ حضرت اجازت نہ دیدیں تو کھڑے رہے اور ہاتھ میں دونوں تھیلیاں ہیں، ان میں وزن تھا، کھڑا ہوا نہیں جاتا اور کپکپا رہے ہیں۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔تو حجامت بنواتے ہوئے چہرہ کو نیچے کر دیا، دیکھا ہی نہیں کون آیا! تجاہل عارفانہ کے طور پر، پھر دائیں طرف کو منہ پھیرا تو وہ پشت کی طرف سے چکر کھا کر دائیں طرف آئے تو آہستہ سے بائیں طرف منہ پھیر لیا، پھر وہ ادھر کو آئے تو ادھر کو منہ پھیر لیا۔غرض انکو اسی طرح چکر دیئے یہاں تک کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجامت سے فارغ ہو گئے، تب ان کی طرف دیکھا، انہوں نے سلام عرض کیا حضرت نے معمولی جواب دیا، رسمی مزاج پرسی کے بعد بیٹھ گئے اور وہ ہدیہ پیش کیا۔حضرت نے فرمایا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔انہوں نے کہا حضرت آپ کو ضرورت نہیں، ہمیں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔اگر حضرت قبول نہ فرمائیں یا حاجت مند نہ ہوں تو طلبہ کو تقسیم کر دیں۔فرمایا: کہ الحمد للہ! میری آمدنی ساڑھے سات روپے مہینے کی ہے اور میرے گھر کی ساری ضروریات اس میں پوری ہو جاتی ہیں۔اگر کبھی روپیہ آٹھ آنہ بچ جاتا ہے تو میں پریشان رہتا ہوں کہ کہاں رکھوں گا، کس طرح حفاظت کروں گا، کسے بانٹوں گا! میں حاجت مند نہیں ہوں آپ واپس لے جائیں۔انہوں نے کہا کہ حضرت طلباء کو تقسیم کر دیں، فرمایا کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ میں طلبہ کو بانٹوں! آپ ہی جا کر تقسیم کر دیں۔غرض انہوں نے مختلف عنوانوں سے چاہا کہ قبول فرمالیں مگر حضرت نے قبول نہیں فرمایا.......لیکن اس زمانے کے رئیس غیرت دار تھے تو یہ غیرت آئی کہ یہ مال پھر اپنے گھر کو واپس کیسے لے جاؤں! تو وہاں سے اٹھے، مسجد کی سیڑھیوں پر حضرت کی جوتیاں پڑی ہوئی تھیں ان

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب الهم بالدنيا، ص: ۱۲۸ ا رقم: ۴۰۹۵.

جوتیوں میں وہ روپیہ بھر کر روانہ ہو گئے۔ (غالباً جوتیوں کے اوپر نیچے روپے ڈال دیئے ہوں گے) حضرت اٹھے اور جوتیوں کی تلاش ہوئی، جوتے نہیں ملتے ادھر ادھر سب جگہ دیکھا، حافظ انوار الحق صاحب حضرت کے خادم تھے انہوں نے دیکھا اور عرض کیا کہ حضرت جوتیاں تو روپیوں میں دبی ہوئی یہاں پڑی ہیں۔ فرمایا: لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ! آئے اور آکر ان جوتیوں کو جھاڑا جیسے مٹی جھاڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد جوتے پہن کر روانہ ہو گئے۔ وہ روپیہ مسجد کی سیڑھیوں پر پڑا رہا۔ حافظ انوار الحق مرحوم ساتھ ساتھ تھے تھوڑی دور آگے جا کر مسکرا کر دیکھا تو حافظ جی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا حافظ جی دیکھا آپ نے! دنیا ہم بھی کماتے ہیں دنیا دار بھی کماتے ہیں فرق اتنا ہے کہ دنیا ہماری جوتیوں میں آکر گرتی ہے، ہم ٹھوکریں مارتے ہیں اور دنیا دار دنیا کی جوتیوں میں جا کے سر رگڑتے ہیں، وہ ان کو ٹھوکریں مارتی ہے۔ تو کماتے ہم بھی ہیں دنیا دار بھی، فرق اگر ہے تو عزت اور ذلت کا فرق ہے، ''غناء'' اور ''احتیاج'' کا فرق ہے۔

دُنیا استغناء اور توکل علی اللہ سے ملتی ہے..... میں تو اس سے بھی زیادہ کہا کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دنیا طلب کرے تو طالب نہ بنے تارک بن جائے تو دنیا آئے گی، طالب کے پاس مشکل سے آتی ہے بلکہ اس کو اور زیادہ ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو آدمی مستغنی ہو تو دنیا ذلیل ہو کر آئے گی، محتاج بنے گا تو خود ذلیل ہوگا۔ تو علم جیسی دولت ملنے کے بعد بھی اگر آدمی جھکے اور یہ خیال کرے کہ کل کیا کماؤں گا؟ کہاں سے آئے گا؟ کیا صورت ہوگی؟ تو اس نے تو انتہائی طور پر اپنے علم کو ذلیل کر دیا۔ اللہ نے دو کام رکھے ہیں: ایک اپنے ذمہ لیا ہے اور ایک آپ کے ذمہ ڈالا ہے، فرمایا کہ: ﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى﴾ ① آپ کے ذمہ یہ کام ہے کہ اپنے اہل وعیال کو دین کا امر کرو اور تم خود بھی اس کے اوپر جم جاؤ اور ہمارے ذمہ یہ ہے کہ تمہیں روٹی دیں گے محتاج نہیں رکھیں گے۔ عزت وشرف بھی دیں گے رزق میں ہر چیز آجاتی ہے، ہر چیز تمہیں دیں گے۔ تو ایک کام اپنے ذمہ لیا اور ایک آپکے ذمہ کیا، آپ نے تو اپنی ذمہ داری کی چیز چھوڑ دی اور اللہ نے جو اپنے ذمہ لی تھی اسے اختیار کر لیا کہ روٹی کہاں سے کھائیں گے، عزت کہاں سے ملے گی، تو اپنا فریضہ تو چھوڑ دیا اس سے تو یوں محروم ہوئے اور جو اللہ نے اپنے ذمہ لیا تھا اسے اختیار کر لیا۔ اللہ کے کام کو آپ نبھا نہیں سکے، نتیجہ یہ نکلا کہ نہ وہ چیز رہی اور نہ یہ چیز رہی۔ تو طالب علم کے ساتھ اگر آدمی طالب دنیا بھی ہو تو نہ علم رہتا ہے نہ دنیا آتی ہے اور اگر علم محض کا طالب بن جائے تو دنیا ذلیل ہو کر آئے گی۔ آپ کے سامنے آپ کے سینکڑوں بزرگوں کی نظیریں موجود ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا مشکل وقت اور توکل علی اللہ..... دارالعلوم دیوبند قائم ہوا کس شان سے! ایک پائی ہاتھ میں نہیں۔ اہل اللہ کے قلب میں دیانۃً ایک جذبہ پیدا ہوا کہ دارالعلوم قائم کیا جائے۔ وہیں چھتے کی مسجد میں ہی

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۳۲۔

بیٹھے بیٹھے مدرسہ قائم ہوگیا۔انار کے درخت کے نیچے ایک استاذ اور ایک شاگرد بیٹھے ہوئے تھے،تو وہ مدرسہ ایک استاذ اور ایک شاگرد سے شروع ہوا تھا آج بڑھتے بڑھتے اس میں ڈیڑھ ہزار طلبہ رہتے ہیں، پچاس ساٹھ استاذ رہتے ہیں ،اصول میں یہ شرط رکھی ہے کہ مدرسہ کی مستقل آمدنی نہ بنائی جائے۔ نیز گورنمنٹ سے کبھی امداد نہ لی جائے۔امداد کی طرف رجوع نہ کیا جائے، جب کہ ساڑھے چھ سات لاکھ روپے کا سالانہ خرچ ہے،حکومت کے اکاؤنٹنٹ دار العلوم آئے،انہوں نے پوچھا کہ دار العلوم کا کیا خرچ ہے؟ میں نے کہا پچاس ہزار روپے ماہوار۔کہا کہ:خزانے میں کتنا ہے؟اس وقت کل پندرہ ہزار تھا میں نے بتایا: تو کہنے لگے اس ماہ کا خرچ کیسے چلے گا؟ میں نے کہا کہ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ کیسے چلے گا: یہ بتا سکتا ہوں کہ ضرور چلے گا۔اس نے کہا: یہ کیا بات ہوئی ؟ یہ تو کوئی اصول کی بات نہیں؟ میں نے کہا: یہ تو اصول سے بالاتر بات ہے، اصول کی بات نہیں۔اب اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ میں نے کہا: اسے ہمارے یہاں توکل کہتے ہیں، کہنے لگے توکل کیا چیز ہے؟ تجارت ہے کوئی زراعت ہے؟ میں نے کہا: توکل یہ ہے کہ اللہ میاں دلوں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ تم فلاں جگہ دو، میرا کام ہو رہا ہے تمہیں دینا پڑے گا۔وہ جھک ماریں گے اور آ کے دیں گے،ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم خوشامد کرتے پھریں تو مال عزت سے بھی حاصل کیا جاتا ہے اور ذلت سے بھی۔ایک فقیر اگر بھیک مانگنے جائے،اسے آپ ذلیل سمجھیں گے کہ میرے پاس سے مال لیتا ہے۔اور ایک بادشاہ بھی قوم کے پاس سے مال لیتا ہے،لیکن اسے کوئی ذلیل نہیں سمجھتا۔وہ بھی تو چندہ ہی لیتا ہے اسے کوئی ذلیل نہیں سمجھتا۔اس لئے کہ وہ استغناء کے ساتھ لیتا ہے، یہ احتیاج کے ساتھ لیتا ہے خود حضرات انبیاء علیہم السلام تبلیغی کاموں اور خیر میں ترغیب سے چندہ لیتے اور خرچ کرتے ہیں لیکن ان کی عزت اور شرف میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ حالانکہ (بظاہر وہ بھی) قوم سے مانگتے ہیں تو مانگنا مانگنا بھی برابر نہیں ایک حاجت مند اور ذلیل بن کر مانگنا ہے ایک غنی بن کر اور اپنے نفس کو بالاتر کر کے مانگنا اس میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔

رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے بندہ پر نہیں ......تو حق تعالیٰ نے علم کی عزت اور شرف کو قائم رکھنے کے لئے ایک حسی صورت اختیار فرمائی کہ علماء کی بستی چہرے کو بنایا جو سب سے اونچی ہے تاکہ اہل علم کا شرف واضح ہو جائے جو علم کی طرف منسوب ہیں وہ بالاتر ہیں ،ان کا کام جھکنا نہیں ہے۔اور اس کے امر کی یہ صورت اختیار فرمائی: ﴿وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوةِ الخ﴾ ① ہمارے ذمہ ہے ہم رزق دیں گے تمہارا کام یہ ہے کہ تم علم کے طالب بنے رہو علم کے اندر لگے رہو۔تو میں نے دار العلوم دیوبند کی نظیر پیش کی تھی تو آپ کا یہ مدرسہ (عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی ۵) بھی تو اسی کی نظیر ہے مولانا محمد یوسف بنوری (نور اللہ مرقدہٗ) کھڑے ہوئے، وہ کوئی جاگیردار نہیں ہیں۔ان کے پاس کوئی ریاست نہیں تھی اسی طرح آ کے بیٹھ گئے ایک پائی ہاتھ میں نہیں ہے، رہنے کو حجرہ نہیں، کتاب رکھنے کو جگہ نہیں لیکن بیٹھ گئے محض خدا کے بھروسہ پر، دنیا پر بھروسہ نہیں کیا تو اَتَتِ الدُّنْیَا وَهِیَ

① پارہ: ۱۶،سورۃ طٰہٰ،الآیۃ: ۱۳۲.

رَاغِمَۃً ① تو ناک رگڑتی ہوئی دنیا آنی شروع ہوئی۔ آج لاکھوں کی عمارتیں بھی کھڑی ہیں، کتب خانہ بھی بن گیا کیا کہیں جا کے بھیک مانگی! انہیں اللہ سے بھیک مانگی، اللہ میاں نے اپنی مخلوق کو متوجہ کر دیا۔ انہوں نے مجبور ہو کر جھک مار کر دیا...... اور دینا پڑے گا۔

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شکایت کی گئی کہ یہ خانقاہ گنگوہ میں بغاوت کا مرکز ہے اور یہ مولوی خانقاہ میں جمع ہو کر حکومت برطانیہ کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور افغانی حکومت کو ہندوستان پر چڑھانا چاہتے ہیں تاکہ برطانیہ حکومت کا تختہ الٹ جائے۔ سی، آئی، ڈی کا انسپکٹر مقرر ہوا اور وہ بھی ہندو مقرر کیا گیا تاکہ وہ بے لاگ بات کرے۔ وہ آیا اس نے خانقاہ کو دیکھا کہ اینٹ اینٹ سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے، ان لوگوں کو سازش سے کیا کام! انہیں مکر و فریب سے کیا کام! یہ تو رات دن اللہ کے بندے بنے ہوئے ہیں۔ وہ حیران تھا کہ مخبر نے یہ رپورٹ کیسے کی کہ یہ سازشی لوگ ہیں کیونکہ یہاں چوبیس گھنٹے سوائے ذکر اللہ کے کوئی کام نہیں، بہرحال وہ دیکھتا رہا سوچتا رہا، آخر کار ظاہر ہوا اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آکر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کس مقصد کے لئے یہاں آیا ہے! فرمایا بھائی! دیکھ لو ہمارے ہاں کوئی چھپی ہوئی بات تو ہے نہیں، کوئی سازش نہیں جو بھی ہے وہ تمہارے سامنے ہے، اس پر اس نے مختلف سوالات کئے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کے گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے؟ فرمایا: توکل! اس نے کہا: توکل کیا چیز ہے؟ فرمایا: توکل یہ چیز ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے، وہ خدمت کرتے ہیں تو یہ خانقاہ کا کام چل رہا ہے۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیسے چل رہا ہے، کوئی جاگیر نہیں، کوئی وقف نہیں، کوئی تجارت نہیں، آخر یہ چل کیسے رہا ہے، محض یہ خیال کر کے بیٹھ گئے کہ لوگوں کے دلوں میں آئے گا تو کام چلے گا لوگوں کے دلوں میں نہ آئے تو کیا ہوگا! غرض اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ توکل کیا چیز ہے ایک ہفتہ کے بعد جب وہ جانے لگا تو نہایت عقیدت مندی سے آکر اس نے حضرت سے دعائیں چاہیں اور دس روپے نکال کر ہدیہ کے طور پر پیش کئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میرا دل مجبور کر رہا ہے آپ اسے واپس نہ کریں۔ اگر آپ واپس کریں گے تو میرا دل دُکھے گا۔ میری نیاز مندی کا تقاضا ہے کہ آپ قبول فرما لیں! فرمایا: آخر آپ سے کس نے کہا؟ کہنے لگا: کہا تو کسی نے نہیں، بس دل میں یہ آیا، فرمایا: یہی ہے وہ توکل جو کل تک آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تو توکل سب سے بڑی جاگیر ہے۔ مگر اسکا حاصل یہ ہے کہ احتیاج صرف اللہ کی طرف ہو۔ غیر اللہ کی طرف نہ ہو تو غیر اللہ خود بخود آ کے جھکے گا۔

علم کی ناقدری کرنیوالے سے اسلام کا شرف بھی چھن سکتا ہے...... ایک طالب علم کے ذہن میں یہ آنا کل کیا کریں گے، علم پڑھکر ہم روٹی کہاں سے کمائیں گے پیسہ کہاں سے ملے گا؟ یہ انتہائی احتیاج مندی اور ذلت نفس کی بات ہے جس کو اللہ علم کی دولت دے اور اس کی سوچ یہ ہو کہ روٹی کہاں سے آئے گی۔ ﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

﴿الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ﴾ ① کا مصداق ہے کہ اعلیٰ اور شرف کی چیز پاس ہے پھر ادنیٰ کی طرف توجہ کر رہا ہے میں کہتا ہوں کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دنیا ملے گی۔ لیکن اگر وعدہ نہ ہوتا اور نہ کبھی ملتی صرف علم مل جاتا تو دنیا ومافیہا کی دولت میسر آ گئی تھی، کسی دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ انتہائی ناقدر انسان ہے کہ اللہ اعظم ترین شرف دے اور پھر وہ ارذل ترین چیز کو اس کے مقابلہ میں چاہے یہ تو یہود کا سا قصہ ہو گیا کہ اللہ نے ''من وسلویٰ'' دیا انہوں نے کہا کہ ہمیں تو لعبل و پیاز چاہیے اس کے مقابلہ میں ذلیل چیزیں چاہئیں.....ایک عالم یا مطیع یا طالب حق کی یہ شان نہ ہونی چاہیے کہ اللہ تو اس کے اوپر شرف وکمال خالص کرے اور وہ اس کے مقابلہ میں نقص وعیب اور بری اور گندی چیزوں کا طالب بن جائے.....یہ انتہائی بے قدری ہوتی ہے اس میں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں مسلم کا شرف بھی نہ چھن جائے۔ اس لئے کہ علم پاک چیز ہے پاک ہی ظرف میں بھرا جائے گا۔ جس ظرف کے اندر گندگی موجود ہو اور وہ غیر اللہ اور دنیا کا طالب بنا ہوا ہے تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے سونے کے ظرف میں نجاست بھر دی ہو.....تو محبت صرف ایک چیز کی رہے دنیا استعمال کی چیز ہے محبت کی چیز نہیں استعمال جتنا چاہے کرو محبت ایک ذات سے رہنی چاہیے جس کا آدمی طالب ہے تو علم کے شرف کے بعد کسی غیر علم کی طلب کرنا ایسا ہے جیسے ایک عالم طلب کرے کہ میں تو جاہل بن جاؤں تو بہتر ہے یہ کوئی دانش ہوگی؟ خدا علم دے اور وہ جہالت کو چاہے۔

تو بہر حال حق تعالیٰ شانہ نے اس چہرے کے اندر مشاعر ادراک رکھکر گویا اس طرف ایماء (اشارہ) کیا ہے کہ علم اونچی چیز ہے اور جو علم کی طرف منسوب ہوں وہ بھی اونچے بن کر رہیں (اور ان کے اونچے ہونے کا راز استغناء میں ہے دنیا طلبی میں نہیں) وہ نیچے بن کر نہیں رہ سکتے اس لئے کہ اللہ نے ان کو یہ شرف دیا ہے اور پھر علم، عمل سے کہیں زیادہ افضل ہے اسی لئے جو عملی اعضاء ہیں ان کو پست رکھا گیا یعنی ہاتھ کا رخ نیچے کی طرف ہے پیر کا رخ نیچے کی طرف ہے اور ناک کان کا رخ اوپر کی طرف جاتا ہے تو عمل والی چیزوں کو حسی طور پر بھی پست رکھا گیا۔ اور ان کی وضع بھی ایسی جیسے وہ پستی کی طرف جا رہے ہوں اور کان ناک آنکھ کو اونچا بنایا۔ کیوں کہ یہ علم کی طرف منسوب ہیں۔

اعضائے عمل اعضائے دولت سے افضل اور نمایاں ہیں......اور عمل سے بھی زیادہ ادنیٰ درجہ کی چیز مال ہے یعنی علم عمل سے افضل ہے عمل دولت سے افضل ہے تو دولت سب سے زیادہ گری ہوئی چیز ہے اس واسطے کچھ اعضاء ایسے ہیں جو دولت کو جمع کرتے ہیں......وہ معدہ اور جگر ہیں وہاں نجاست بھری رہتی ہے تو گویا ایک اعضاء ہیں اور ایک اعضائے عمل، یہ پھر بھی بہ نسبت معدے امعا (انتڑیاں) اور بنسبت مثانے وغیرہ کے عزت دار ہیں کیوں کہ معدے وغیرہ کے اندر تو نجاست اور گندگی بھری ہوئی ہوتی ہے اور یہ ان کے لئے لازمی ہے اگر یہ اعضاء (دولت) بھرے ہوئے نہ ہوں تو زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اگر معدے کے اندر سے یہ سب کچھ نکال لیا جائے تو آدمی ختم ہو جائیگا اس کی بھی (بقائے حیات کی خاطر) ضرورت ہے لیکن حق تعالیٰ نے اس کو مخفی رکھا۔ کیوں کہ گندی

① پارہ: ١، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ٦١.

چیز ہے لوگوں کے سامنے نہ آنی چاہیے، اس کو اندر رکھا۔

اعضائے دولت انکی حقیقت اور انکو مخفی رکھنے کی حکمت ...... ہاں البتہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ناک، کان اور آنکھ تو علماء ہیں اور ہاتھ پیر مزدور ہیں۔ اور وہ سرمایہ دار ہیں جو اندر چھپے ہوئے ہیں بحیثیت سرمایہ دار کے..... اللہ کسی اور سبب سے سرمایہ دار کو عزت دے وہ اور چیز ہے لیکن "مِنْ حَیْثُ اَنَّہٗ" (صرف اسی بنیاد پر کہ) سرمایہ دار بحیثیت سرمایہ دار ہونے کے وہ نجاست کا محل ہے گندگی کا محل ہے کوئی بڑی چیز نہیں ہے باقی طہارت کا طریقہ بتلا دیا گیا کہ خود بھی پاک بنو اس مال کو بھی پاک کرو مثلاً زکوٰۃ رکھ دی۔ صدقات رکھ دیئے کہ مال کو پاک بناؤ... تو معدے میں سب کچھ بھرا ہوا ہے لیکن فضلات نکالے جاتے ہیں۔ اب اگر فضلات نہ نکلیں تو معدہ بھی بگڑ جائے گا۔ تو اگر مال میں سے کچھ نہیں نکلے گا اور صرف سرمایہ دار کے پاس رہ جائے گا گویا وہ نجاست معدے میں ہی بھری رہے گی۔ تو معدہ بھی گیا انسان بھی گیا، سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اس واسطے ضرورت سمجھی گئی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس میں سے کچھ فضلات بھی نکلتے رہیں...... (یعنی ایک معینہ مدت کے اندر جو علامت صحت ہے۔ بصورۃ دیگر علامت مرض) تا کہ اس کے اندر پاکی پیدا ہو۔ یہ نہیں ہوگا تو سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ چھڑ جائے گی۔ معدہ الگ لڑے گا اور ہاتھ پاؤں الگ لڑیں گے (اور دماغ بھی، تو علماء علم بھی اس سرمایہ دار کی حرکت "دولت کا ناجائز اجتماع" کے الگ خلاف ہوں گے) اس لئے کہ جب فضلات کو نہیں نکالے گا تو بیماریاں پیدا ہوں گی تو ہاتھ بھی، پاؤں بھی اور دماغ بھی سب ہی چیزیں بیماری کا شکار ہوں گے۔ اس لئے ہاتھ بھی چاہتا کہ معدے میں سے کچھ نکلتا رہے، پیر بھی چاہتا ہے کہ معدے میں سے کچھ نکلتا رہے تو گویا یہ ایسی مثال ہے کہ زکوٰۃ دے دی گئی تو میل کچیل نکال دیا گیا، مال پاک ہو گیا۔

تو تین قسم کے اعضاء رکھے گئے۔ ایک اعضاء العلم، ایک اعضاء العمل اور ایک اعضاء الدولۃ، یا اعضاء المال، جن کے اندر سرمایہ جمع رہتا ہے سرمایہ دار کا کام یہ ہے کہ وہ زائد حصہ نکالتا ہے اور باقی حصہ جمع کرتا ہے۔ مزید زیادہ نکال دے تو طبیعت ہلکی رہے گی، لیکن فرض اتنا کیا گیا کہ موقع بموقع نکالے، ایک حد اعتدال کے اندر خارج کرے بالکل معدہ خالی کر دیا تو خالی خولی ہو کے کہیں ختم نہ ہو جائے۔ لیکن اگر تمہارے اندر کوئی دوسری قوت بھر دی جائے تو بے شک سب کچھ نکال دو وہ الگ چیز ہے کہ آدمی روحانی قوت سے زندہ رہنے لگے اور کھانا پینا ترک کر دے مگر یہ چیزیں ہیں۔

اصول اور قاعدے کی بات یہی ہے کہ بقدر ضرورت جمع رہے بقدر ضرورت نکلتا رہے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے جب یہ بند ہو جائے گا تو معدہ بگڑ جائے گا خلو محض ہوگا تو فنا طاری ہوگی، تو کچھ جمع رہے کچھ خلا رہے، دونوں چیزیں ہوں تب ہی صحت برقرار رہ سکتی ہے تو اعضاء العلم کو اونچا رکھا گیا اعضاء العمل کو پست رکھا گیا۔ اور اعضاء المال کو مخفی رکھا گیا کیونکہ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو نمایاں کیا جائے۔

''علم'' اللہ کی اور ''مال'' معدے کی صفت ہے......اب اگر ایک عالم کی آنکھ گندگی کو پسند کرنے لگے تو کیا یہ دانش کی بات ہوگی؟ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ آنکھ یوں چاہے کہ میں معدہ بن جاؤں میرے اندر نجاست بھر دی جائے۔ تو اللہ نے اس کو لطافت دی اور اس کو کمال دیا۔ اور وہ چاہتی ہے کہ میرے اندر عیب بھر جائے میرے اندر نقص بھر جائے......تو اللہ نے پاکی بھری ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میرے اندر گندگی بھر جائے۔ یہ تو عقل و دانش کے خلاف اور علم کے بھی خلاف ہے مودت کے بھی خلاف ہے اخلاقی طور پر بھی بری چیز ہے اور علمی طور پر تو ہے ہی۔

بہر حال حق تعالیٰ شانہ نے اہل علم کو عزت و عظمت بخشی ہے.....اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ''علم'' اللہ کی صفت ہے اور مال معدے کی صفت ہے تو اللہ کی ذات عالی اور صفات کمال......ظاہر ہے کہ ان سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوسکتی ساری بھلائیاں انہی کیلئے ہیں اور مال و دولت یہ معدے کی صفت ہے یہ روز انہ متغیر ہونیوالی چیزیں ہیں۔ نہ ان کیلئے بقاء ہے اور نہ ان کیلئے دوام ہے یہ ہمہ وقت علی شرف السقوط اور علی شرف الزوال رہتی ہیں ہر وقت افتاد کا شکار ہونے والی ہیں۔

اگر اللہ کی صفت کسی بندے کے اندر آئے گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنا نمائندہ بناتے ہیں کہ تو میری صفت کا حامل ہے اس کو دنیا کے اندر پھیلا اور وہ کہے کہ میں تو معدے کی صفت کا حامل بننا چاہتا ہوں میں تو گندگی حاصل کرنا چاہتا ہوں اور اسے ہی پھیلانا چاہتا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ یہ عقل کا کھوٹ ہوگا اور یہ گویا اس منصب کو بٹا لگانے کا باعث ہوگا کہ جس منصب کے لئے اللہ نے اسے دار العلوم میں جمع کیا کہ یہ طالب علم ہے اس کی سعادت اس کو کھینچ کر لائی ہے کہ ایک مرکز علم میں اس کو پہنچادیا، کیا اس کے لئے یہ شکر کا مقام نہیں ہے کہ اسے کسی سینما کا ملازم نہیں بنایا کسی تھیٹر کا کارکن نہیں بنایا، اپنی صفت اور اپنی اونچی صفات میں بھی جو اونچی صفت تھی یعنی علم کی صفت اس کا حامل بنا کر ایسی فکیٹری میں لاکر بیٹھادیا۔ جہاں علم کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ علم ہی کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کتنا بڑا شکر کا مقام ہے کہ اللہ نے آپ کو اپنے (علم کے) لئے منتخب کرلیا۔ اور ان کاموں کے لئے منتخب نہیں کیا جو گندگی کے کام ہیں۔ پاک کام کیلئے منتخب کیا۔ اس لئے اس شرف پر انسان جتنا بھی ناز کرے، شکر کرے اتنا ہی کم ہے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ طَالِبُ الْعِلْمِ وَطَالِبُ الدُّنْيَا. اَمَّا طَالِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضَى الرَّحْمٰنِ ، وَاَمَّا طَالِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ''. [1]

''تو ایک علم ہے جو رضائے رحمٰن کی طرف لے جاتا ہے اور ایک مال ہے جو طغیان کی طرف لے جاتا ہے''

[1] المعجم الكبير للطبراني، باب العين، عبدالله بن مسعود الهدبي ج: ۹ ص: ۲۶. علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ امام بیہقی نے یہ روایت حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرنے کے بعد فرمایا ہے: انه موقوف منقطع اور پھر حضرت انسؓ سے مرفوعاً یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے: منهومان لايشبعان منهوم في العلم لايشبع منه ومنهوم في الدنيا لايشبع منها دیکھئے: المقاصد الحسنة حرف الميم ج: ۱ ص: ۲۲۷:

حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ دو چیزیں ہیں جنہوں نے ایک چھاتی سے دودھ پیا ہے کہ ایک سے دوسری جدا نہیں ہوسکتی اور وہ کونسی چیزیں ہیں ایک حکمت اور تقویٰ۔ اس لئے جب علم آئے گا تو خشیۃ اللہ بھی آئے گا خوف خداوندی بھی آئے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ علم ہو اور اللہ کا خوف نہ ہو تو علم آیا اس کے ساتھ تقویٰ بھی آیا۔ تقویٰ آیا تو اس کے ساتھ علم ہونا لازمی ہے اور فرمایا کہ مال و دولت اور طغیان یہ بھی ایک وطن کے دو باشندے ہیں جب دولت آئے گی تو سرکشی بھی بڑھے گی۔ بغاوت بھی بڑھے گی۔ الا یہ کہ آدمی مال کو شرعی طریق پر کمائے حلال طریق پر کمائے اور حلال طریق پر خرچ کرے، اس کے اندر سے انفاق فی سبیل اللہ کرتا رہے تو وہ تمرد اور طغیانی سے بچ جائے گا اس طریق پر بچ جائے تو بچ جائے لیکن مال میں اپنی ذات کے لحاظ سے تو طغیان و تمرد ہی ہے باقی شریعت نے ایسے اصول بتلا دیئے ہیں کہ عوارض کے طور پر اس میں پاکی پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی جب کوئی پاک کرنا چاہے...... تو ایک اونچی چیز ہے ایک پست چیز ہے اللہ نے جس قوم کو اونچی چیز کیلئے منتخب کیا اسے تو اپنی قسمت کے اوپر ناز کرنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی صفت کے لئے اور اپنے کمال کے پھیلانے کے لئے ہمیں منتخب کر لیا۔

تحصیل علم اعجاز قرآن کے سبب سے اور طالب علم آلات خداوندی ہیں ...... یہ بھی درحقیقت قرآن کا اعجاز اور معجزہ ہے قرآن کریم کی شانیں بھی درحقیقت معجزہ ہیں یعنی اس کی حفاظت کے طریقے بھی معجزہ نما ہیں۔ اعجازی شانوں سے اس کی حفاظت کی جارہی ہے آج دنیا میں اس علم دین کے اوپر کوئی وعدہ نہیں نہ دولت کا نہ عزت کا، نہ کسی مرتبہ اور عزت و جاہ کا۔ اگر قرآن و حدیث کا بڑے سے بڑا عالم ہو تو کوئی وعدہ نہیں کہ اُسے ملک کا گورنر نیا دیا جائے گا یا پریزیڈنٹ بنا دیا جائے گا۔ بلکہ لوگ اس کو عیب لگاتے ہیں کیوں کہ اس علم کے پڑھے ہوئے نہ اس قابل ہیں کہ وہ ''مسٹر'' بنیں نہ ہی کسی اور دینوی صنعت و حرفت کا کام انہیں آئے۔ یہ انہیں (بطور طعنہ) کہا جاتا ہے یہ غلط ہو یا صحیح ہو یہ تو بات الگ ہے مگر کہا جاتا ہے تو اس علم کی تحصیل پر کوئی دنیوی وعدہ نہیں....... بلکہ اگر وعدہ ہے تو اس کا ہے کہ عزت کی بجائے کچھ لوگ طعن کریں گے۔ آپ کے اوپر مذاق کریں گے اگر وعدہ ہے تو اسکا تو ہے کہ آپ دولتمند ہونے کی بجائے کہیں مفلس نہ ہو جائیں اس کا تھوڑا بہت خطرہ ہے تو کسی دنیوی انعام کا خدائی وعدہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یہاں آئے۔

تو کیوں تشریف لائے جبکہ کوئی وعدہ بھی نہیں۔ تو یہ آپ کو حفاظت قرآن کی سعادت کھینچ کر لائی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [1] ''ہم نے قرآن اتارا، اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ یہ حفاظت خداوندی ہے کہ دلوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ جاؤ اور جا کر پڑھو چاہے دنیا نہ ملے تو دنیا نہ ملنا اس کی طرف التفات نہیں ہے ملنے کی چیز تو وہ ہے جس کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی کہ ہم اس کی

حفاظت کریں گے تو آپ لوگ (طلباء کرام) گویا جارحہ حق ہیں۔ اور حق تعالیٰ شانہ کے گویا آلات کار ہیں آپ کے واسطے سے ان کے کلام کی دنیا میں حفاظت ہو رہی ہے یہ بھی درحقیقت (قرآن کریم کا) معجزہ ہی ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور پھر بھی (بے لوث فوج در فوج) لوگ چلے آرہے ہیں تو قرآن بھی معجزہ ہے اور اس کی حفاظت کے طرق بھی (ہمہ پہلو) معجزہ ہیں۔

اشاعت قرآن بغیر وسائل زیادہ ہوتی ہے...... بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اسلامی حکومتوں کا بعض اوقات ختم ہونا یہ قرآن حکیم کی حفاظت کی دلیل ہے اگر مسلسل اور مستمر اسلامی دولتیں قائم رہتیں اور قرآن حکیم محفوظ رہتا تو لوگ طعن کر سکتے تھے کہ یہ سلطنت کی وجہ سے قائم ہوا ہے یہ شوکت کی وجہ سے قائم ہوا ہے یہ تلواروں کے زور سے قائم ہوا ہے لیکن عجب بات یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے ہاتھ میں تلواریں نہیں ہوتیں تو اسلام زیادہ پھیلتا ہے اور جب تلوار آجاتی ہے تو کم پھیلنے لگتا ہے اس سے یہ بتلانا منظور ہے کہ اسکی اشاعت، اسکی حفاظت نہ تلوار پر موقوف ہے نہ حکومت پر موقوف نہ جاہ و عزت پر موقوف یہ ہماری حفاظت پر موقوف ہے چاہے عزت کے ذریعے حفاظت کرائیں چاہے دولت مندی کے ذریعے سے حفاظت کرائیں دولت کا یہ خاصہ نہیں کہ وہ قرآن کی حفاظت کرے۔

یہ تو ہماری حفاظت کا اثر ہے اس حفاظت کیلئے جس قوم کو ذریعہ بنا دیا جائے وسیلہ بنا دیا جائے (جس کے حصہ میں یہ سعادت بغیر زور بازو آئے تو) اُسے اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے مگر ناز کے معنی فخر کے نہیں ناز کے معنی شکر کرنے کے ہیں کہ جتنا بھی شکر کرے کم ہے باقی فخر کی تو ممانعت کی گئی ہے اس لئے کہ فخر تو اپنی ذاتی چیز پر آدمی کر سکتا ہے تو یہ ہماری ذاتی ملک تھوڑا ہی ہے ہم تو خادم اور غلام بنائے گئے ہیں، تو امین کیلئے فخر زیبا نہیں ہے نہ تکبر انکے لئے سزاوار ہے ہم تو امانت دار بنائے گئے ہیں۔ فقط مالک ہی کیلئے فخر زیبا ہے، اگر خزانچی کو کروڑوں اور لاکھوں روپیہ پر بٹھلا دیا جائے تو وہ کبھی فخر نہیں کریگا اسلئے کہ یہ اسکا تھوڑا ہی ہے الغرض فخر کرنے کی اجازت نہیں ہے بڑی سے بڑی دولت دنیوی ہو یا دینی...... یعنی ایمان سے بڑھکر کوئی دولت نہیں مگر اس پر بھی فخر کی اجازت نہیں، اسلام سے بڑھکر کوئی دولت نہیں، مگر تفاخر کی اس پر بھی اجازت نہیں۔

قرآن حکیم میں ہے کہ ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ① بہر حال اس کی اجازت نہیں کہ آپ اسلام و ایمان پر فخر کریں۔ اللہ میاں پر احسان رکھیں کہ ہم آپ کے قرآن کی حفاظت کر رہے ہیں اللہ کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے حفاظت کیلئے آپ کو ذریعہ بنا دیا۔ اس کے پاس کروڑوں ذرائع موجود ہیں۔ ان میں آپ کو منتخب کیا تو شکر کا مقام ہے فخر کا موقع نہیں۔

تو بہر حال میں یہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جس علم کو آپ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں وہ علم فی نفسہ

① پارہ: ٢٦، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ١٧۔

شرف کی چیز ہے لیکن میں ابھی تک جتنی بات عرض کر سکا ہوں کہ یہ علم آنکھ کا ہو، یا کان کا ہو یا ناک کا ہو یا زبان کا ہو یہ سب محسوسات کے علم ہیں اس کو بھی اللہ نے عزت دی ہے لیکن محسوسات کا علم پھر بیچ ہے اس کے اوپر ایک اور علم ہے (جس کو علم الٰہی کہا جاتا ہے جس طرح قلب محسوسات کا ادراک کرتا ہے اسی طرح علوم الٰہیہ کا بھی ادراک کرتا ہے)

قلب علوم حسیہ اور غیبیہ دونوں کا مدرک ہے......تو قلب فی الحقیقت علوم الٰہیہ غیبیہ اور حسیہ دونوں کا حامل ہے آنکھ، ناک کان یہ حسی علوم کے علماء ہیں۔اور قلب میں دونوں شانیں رکھی گئی ہیں محسوسات کو بھی جانتا ہے اور مغیبات کو بھی جانتا ہے اس میں ایک دریچہ عالم غیب کی طرف کھلا ہوا ہے تو وہاں سے (علوم غیبیہ) اخذ کرتا ہے اور ایک دریچہ عالم شاہد کی طرف کھلا ہوا ہے تو وہاں سے بھی اخذ کرتا ہے تو قلب ایک جامع ترین چیز ہے محسوسات کا بھی عالم ہے اور مغیبات کا بھی بلکہ اگر غور کیا جائے تو ان محسوسات کے علم میں بھی اصل قلب ہے یعنی آنکھ ناک کان حقیقتاً عالم نہیں ہیں ان چیزوں کا عالم بھی قلب ہی ہے یہ سب آلات کار ہیں کبھی آپ نے دیکھا ہوگا۔آپ بازار میں چلے جا رہے ہیں اور بڑے کھیل تماشے نکل رہے ہوں جب گھر آئے تو دوسرے شخص نے آپ سے کہا کہ آج تو بڑے بڑے تماشے بازار سے گزرے، آپ نے کہا کیسے تماشے؟ اس نے کہا میاں وہ ڈھول ڈھمکے بجتے جا رہے تھے جلوس نکل رہا تھا۔آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کوئی خبر نہیں کہ بندۂ خدا تمہاری آنکھ کھلی ہوئی تھی یا نہیں؟ آپ کہتے ہیں اُفّو! میں اپنے فلاں دھیان میں مشغول تھا مجھے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا تماشہ نکل رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آنکھ نہیں دیکھتی بلکہ دھیان دیکھتا ہے اگر دھیان متوجہ نہیں ہے تو آنکھ کھلی ہوگی تب بھی کچھ نظر نہیں آئے گا۔اور دھیان یہ قوت خیالیہ ہے یہی قوت متخیلہ وہ اندرونی قوت ہے جس کا حاصل یہ کہ اگر قلب دیکھنے کی طرف متوجہ ہوا تو آنکھیں دیکھیں گی۔وہ متوجہ نہیں ہے تو کھلی رہیں گی لیکن کچھ نہیں دیکھ سکیں گی بعض اوقات آپ کسی مسئلہ کے اندر مطالعہ میں منہمک رہتے ہیں اور گھنٹہ بج جائے۔گھنٹہ بھی گزر گیا۔آپ کو خبر ہی نہیں کہ گھنٹہ بجا دوسرا طالب علم کہتا ہے کہ بھائی گھنٹہ بج گیا ہے سبق کا وقت آگیا ہے تو آپ جلدی سے اٹھتے ہیں کہ اچھا گھنٹہ بج گیا کہ جی ہاں اُفّو! میں اس وقت اس مسئلہ میں منہمک تھا مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ گھنٹہ بجا بھی ہے یا نہیں کوئی کان روئی تو نہیں دی ہوئی تھی مگر نہیں آواز اس لئے نہیں آئی کہ قلب ادھر متوجہ نہیں تھا۔

تو سننے والی چیز کان نہیں ہے بلکہ قلب ہے دیکھنے والی چیز آنکھ نہیں بلکہ قلب ہے اسی واسطے قرآن کریم میں کفار کی نسبت ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ ① انکی آنکھیں اندھی نہیں ہیں۔بلکہ انکے دل مسخ ہو چکے ہیں، انکے دلوں کے اندر بوجھنے کی طاقت نہیں رہی ہے تو آنکھ تو کھلی ہوئی ہے پھر نہیں دیکھتی کان کھلے ہیں پھر نہیں سنتے اسلئے کہ وہ قلب کو متوجہ ہی نہیں کرتے ،تو محسوسات کا عالم بھی فی الحقیقت قلب ہے مگر شرف اسمیں یہ ہے کہ جیسے وہ محسوسات کا عالم ہے ویسے ہی مغیبات

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۶۔

کا بھی عالم ہے ویسے ہی الٰہیات کا بھی عالم ہے جیسے وہ فرش کی چیزیں لیتا ہے ویسے ہی وہ عرش کی چیزیں بھی لیتا ہے جیسے وہ شہود سے اخذ کرتا ہے ویسے ہی وہ غیب سے بھی اخذ کرتا ہے۔

قلب ''صفت کن'' کا بھی حامل ہے......تو جامع ترین عالم انسان کے اندر قلب ہے اس کو اللہ نے ساری کائنات کا بادشاہ بنایا۔ یہ ہاتھ اور پیر یہ سب اس کے خدام اور لشکر ہیں خدام کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے اگر ہے تو قلب کے اندر ہے اگر قلب یہ چاہتا ہے کہ میں فلاں جگہ چلوں۔ دل کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پیرو چلو! بس قلب میں آیا اور پیروں نے حرکت کرنی شروع کر دی قلب اگر چاہتا ہے کہ میں کسی چیز کو دیکھوں تو امر کرنے کی ضرورت نہیں قلب نے دیکھنے کا ارادہ کیا ملک اٹھ جاتی ہے اور آنکھ دیکھنا شروع کر دیتی ہے تو آنکھ، کان، ناک اس درجہ تابع فرمان ہیں کہ قلب میں تخیل پیدا ہوا اور انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا گویا قلب کے اندر'' کن فیکون'' کی طاقت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہو جاوہ ہوگئی کہنے کی ضرورت نہیں محض منشاء ہوا کہ ہو جائیں دیکھنے لگوں بس آنکھوں نے دیکھنا شروع کر دیا۔ تو اس درجہ تابع فرمان بنائے گئے ہیں۔

نظام دنیا کو فساد سے بچانا ہے تو علماء محسوسات کیلئے علماء مغیبات کا اتباع ضروری ہے......اس سے ایک نتیجہ یہ نکل آیا کہ علماء محسوسات جب تک علماء مغیبات کے تابع ہو کر نہیں رہیں گے دنیا کا نظام نہیں چل سکتا۔ اگر محض کان آنکھ ناک کو حاکم مطلق بنا دیا جائے اور قلب کو ان سے منقطع کر لیں تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس لئے آنکھ کان کا علم جب ہی صحیح اور برقرار رہے گا کہ قلب کا علم آگے آگے ہو اور قلب کی حکومت ہو تو جو علماء غیبی علوم کے عالم ہیں جو علماء الہامات ربانی کے عالم ہیں اور جو علماء شرائع خداوندی کے عالم ہیں ان کو علماء محسوس کے اوپر حکومت کا مقام دیا جائے۔ تب ہی یہ علماء محسوس صحیح طور پر چل سکتے ہیں اس واسطے کہ محسوسات اسی قلب کے تابع ہیں تو حق تعالیٰ شانہ نے اگر آپ کو منتخب کیا تو مبصرات کے علم کیلئے نہیں کیا، مسموعات کے علم کے لئے منتخب نہیں کیا بلکہ علوم خداوندی اور قلبی علم کے لئے منتخب کیا جو تمام علوم کا حاکم ہے اور سب کے اوپر سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے اگر قلب یہ چاہنے لگے کہ میں آنکھ بن جاؤں تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ حاکم یہ چاہتا ہے کہ میں محکوم بن جاؤں۔ مخدوم یہ چاہتا ہے کہ میں خادم بن جاؤں۔ یہ تو قلب موضوع ہے معاملہ برعکس ہوگیا اس کو منصب تو اونچا دیا گیا اور وہ نیچا بننے لگا۔ اس کا کام یہ ہے کہ اونچائی کو برقرار رکھے۔

تو اللہ نے آپ کو قلب بنایا ہے تو قلب کا جو مقام ہے اس کو جب تک آپ محفوظ نہیں رکھیں گے کام نہیں چل سکتا۔ اگر آپ نے اس مقام کو محفوظ رکھا تو کان ناک آنکھ سب آپ کے تابع ہو کر چلیں گے اور اگر آپ کے دل میں یہ لالچ ہوا کہ میں آنکھ بن جاؤں تو آنکھ فرمانبرداری چھوڑ دے گی وہ کہے گی کہ میں خود مستقل ہوں کہ قلب میری طرف جھکنے لگا غلام محتاج بن کے میری طرف متوجہ ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ اصل میں ہوں۔ تو علماء مغیبات اور علماء شرائع اگر ان علوم اور ان علماء کے سامنے جو محض محسوسات کے عالم ہیں جھکنے لگیں۔ خواہ وہ سائنس ہو یا فلسفہ خواہ مبصرات

ہوں یا مسموعات ہوں خواہ وہ نئی نئی ایجادات کی چیزیں ہوں مگر لالچ کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں تو انہوں نے علم دین کو بٹا لگا دیا کہ اسی علم کا توفیض ہے کہ محسوسات سامنے آ رہی ہیں اگر مغیبات کا علم منقطع ہو جائے تو محسوسات دنیا سے منقطع ہو جائیں یہ باقی نہیں رہ سکتیں۔اس لئے اہل علم کو ناز بھی کرنا چاہیے اور شکر بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں منتخب کیا اول تو علم کے دائرے میں لے آئے مزدور نہیں بنایا کہ ہم ٹوکری اٹھائیں، معدہ نہیں بنایا کہ نجاست جمع کریں بلکہ عالم بنایا کہ ہم دیکھیں، سنیں اور چکھیں اور محسوسات کے علم آگے بڑھائیں۔اس سے بڑھکر ہمیں ان علماء میں داخل کیا جو الٰہیات کے عالم ہیں۔خود محسوسات کے اوپر حاکم ہیں تو جو انتہائی مقام ہے وہ آپ کو مل گیا۔

اہل علم کی اصلاح کے بغیر عوام الناس کی اصلاح ممکن نہیں......اس کائنات بدن میں انتہائی مقام قلب کا ہے اور اس کائنات آفاق میں اہل علم کا ہے گویا وہ بمنزلہ قلب کے ہیں تو قلب اگر فاسد ہو جائے تو ساری کائنات فاسد ہو جاتی ہے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ’’**اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَاصَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَافَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ**‘‘① تو قلب اگر ٹھیک رہے گا تو تمام اعضاء ٹھیک رہیں گے اگر قلب میں فساد آ گیا۔تمام اعضاء میں فساد آ جائے گا.....تو اہل علم کا کام یہ ہے کہ وہ فساد سے دور بھاگنے کی کوشش کریں۔ان کا کام صلح پھیلانا ہے اور پھیلا کر دنیا کو رشد و ہدایت اور بھلائی کی طرف اور بزرگی کی طرف لانا ہے اگر وہ بھی عوام الناس کی طرح چند چیزوں، چند ٹھیکروں یا چند محسوس چیزوں کے طالب بننے لگیں تو انہوں نے اپنے وقار کو کھو دیا اور (انہوں نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں) ان کا کام یہ ہے کہ وہ قلب کے مقام کو باقی رکھیں اور سمجھیں کہ ہم کائنات کے قلب ہیں۔اس لئے اپنے کو فساد سے بچائیں اور اپنے کو صالح بنائیں۔ان کو دنیا کا امام بنایا گیا ہے اگر سارے مقتدی وضو کر آئیں اور امام کا وضو نہ ہو یا ٹوٹ جائے، کسی کی نماز نہ ہوگی۔سب کی نماز جبھی ہوگی جب امام بھی طاہر ہو۔امام پارسا اور پاک ہو۔جب اس کی پاکی ختم ہوگی تو دوسرے پاک بھی رہیں گے تو بھی ناپاک بن جائیں گے۔ان کی پاکی نامقبول ہوگی۔

آپ اس کائنات کے قلب ہیں۔اگر اسمیں طہارۃ ہے تو دنیا میں طہارۃ موجو ہے اگر اس میں خباثت آ گئی تو دنیا میں خباثت پھیل جائے گی۔دنیا میں نجاست عام ہو جائے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بچہ کو دیکھا کہ دوڑتا جا رہا ہے آپ نے فرمایا کہ: میاں آہستہ چلو گر جاؤ گے۔ تو اس لڑکے نے جواب دیا کہ: آپ آہستہ (اور دیکھ کر) چلیں، اس لئے کہ اگر آپ گر گئے تو ساری قوم گر جائے گی۔ میرے گرنے سے تو صرف میں ہی گروں گا۔

تو یہاں عوام سے خوف نہیں خواص سے خوف ہے کہ ان کے فساد پر عوام کا فساد اور انکی اصلاح پر عوام کی اصلاح موقوف ہے اس واسطے اگر یہ صالح اور ٹھیک ہیں تو عوام بھی ٹھیک ہیں جب کبھی فتنہ پھیلا ہے عوام سے کبھی

① الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرالدینہ ج: ۱ ص: ۵.

نہیں پھیلا۔عوام تو بیچارے متبع ہیں۔ان کے سامنے اللہ ورسول کا نام لوگے تو گردن جھکا دیں گے۔اب نام لینے والا ہی خیانت کرے کہ اللہ ورسول کے نام سے اپنے ہی تخیلات پیش کرنے لگے۔اس پردے میں اپنے دل کی اغراض پیش کرنے لگے تو یہ بیچارے عوام کا قصور نہیں اگر چہ ان کی تباہی کا وبال اس شخص کی گردن پر ہوگا۔

تو خواص کی اصلاح پر عوام کی اصلاح موقوف ہے اور خواص میں ناک کان آنکھ نہیں بلکہ قلب ہے تو جب اللہ نے آپ کو قلب بنایا آپ کو عالم کی اصلاح وفساد کا مدار ٹھہرایا تو بڑی ہی ناقص بات ہوگی کہ آپ ہی فساد کی طرف آنے لگیں۔اور فساد کی طرف آنا یہی ہے کہ ایک عالی چیز کو چھوڑ کر سافل چیز کی طرف آپ کا ذہن جانے لگے۔کہ پیسہ کس طرح آئے؟ راحت کس طرح ملے؟ یہ تو خود بخو ملے گی وعدۂ خداوندی ہے، کچھ تو اپنے اللہ کے وعدے پر اعتماد کرو۔اس مقام پر بھی آ کر اگر آپ ایسا آدمی اللہ کے وعدوں پر بھروسہ نہ کرے تو عوام الناس سے کیا امید رکھی جائے کہ وہ اللہ کی ذات عالی کے فرسودہ وعدوں پر بھروسہ کریں۔

توکل علی اللہ سے ہر چیز ملتی ہے......تو آپ کا سب سے بڑا کام توکل اور استغناء ہے اسی میں سب کچھ ہے۔آپ کے لئے دین بھی ہے دنیا بھی چاہے تھوڑی ملے مگر ضرور ملے گی، ممکن ہے کہ آپ لکھ پتی یا کروڑ پتی نہ ہوسکیں لیکن سینکڑوں کروڑ پتی آپ کے قدموں کے سامنے سر جھکائیں گے۔اگر چہ آپ کروڑ پتی نہیں تو کروڑ پتی بن جانا کوئی کمال کی چیز بھی تو نہیں کروڑ پتی کو اپنے سامنے جھکانا یہ کمال کی چیز ہے، اگر آپ کے پاس کار نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ساری دنیا کی کاریں آپ کی کاریں ہیں۔جہاں گئے کار حاضر ہے پھر ہمیں کار کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

جب ساری دنیا کی کاریں ہماری، ساری دنیا کی دولت ہماری، جہاں ضرورت ہے اللہ خود پوری کرتے ہیں۔اس واسطے اس مقام پہ آ کے تو آدمی اللہ پر بھروسہ کرے، اس مقام پر آ کے بھی بھروسہ نہ کیا تو پھر اللہ پر بھروسہ کرنے مقام کون سا آئے گا؟

تو یہ مقام مقتضی ہے کہ اللہ پر پورا اعتماد کرے حق تعالیٰ کے اوپر پورا بھروسہ کرے، اور اپنے کو سونپ دے، کہ جب آپ نے مجھے اپنے کام میں لگا دیا ہے تو میرا نفس آپ کے حوالے ہے۔﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ﴾ [1] تو اللہ تعالیٰ اس لئے بندے کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔اگر دنیا میں بھی آپ اپنے کو کسی شخص کے حوالے کر دیں کہ میں تم پر اعتماد کرتا ہوں بس میں آپکے حوالے ہوں جو آپ کا جی چاہے کریں، سیاہ وسفید کے آپ مالک ہیں۔تو اس شخص کو کبھی جرأت نہیں ہوگی۔کہ آپ کے معاملہ میں خیانت کرے، مثل مشہور ہے کہ ''قدموں میں آکے گرے ہوئے سانپ کو بھی آدمی نہیں مارتا'' جب وہ آ کے جھک جائے جو اتنا جھکنے والا ہو اس کے ساتھ احسان کرے، تو اللہ کے سامنے آپ جھکیں گے۔اور وہ ضائع کر دیں یہ کبھی ممکن نہیں۔

[1] پارہ: ۲۴، سورۃ المؤمن، الآیۃ: ۴۴.

یہی تو وہ چیز ہے جس کو حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس وقت فرمایا تھا جب وحی آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر فرمایا: ''زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ'' مجھے کمبل اوڑھا دو، ''اِنِّیْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ'' مجھے اپنے نفس کے اوپر ہلاک ہو جانے کا ڈر ہے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ''کَلَّا وَاللہِ لَا یُخْزِیْکَ اللہُ اَبَدًا، اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ'' ① اس قسم کے جملے فرمائے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ اس وقت تک تو اسلام بھی پورا سامنے نہیں آیا تھا۔ مگر سلامتی فطرت سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایسا آدمی ضائع ہونے کے لئے پیدا نہیں ہو سکتا۔ تو آپ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلیں اور اللہ آپ کو ضائع کر دے یہ کیسے ممکن ہے؟ نہیں ہو سکتا۔ ہاں کوئی بھروسہ نہ کرے تو اس کا کوئی علاج نہیں تو یہ بھروسہ اور اعتماد کا مقام ہے کہ جب اس لائن میں پڑ گئے تو پھر خدا پر بھروسہ کیجئے۔ غناء نفس پیدا کیجئے، ذلت نفس اس مقام کا خاصہ نہیں ہے ذلیل النفس وہ ہوتا ہے جس کے پاس عزت کی چیز نہ ہو۔ جس کے پاس علم جیسی عزت کی چیز ہے وہ کبھی ذلیل نہیں ہو سکتا۔

علم مع العبدیت کا خاصہ ارتقا ہے.....تو علم بلند ہونے کیلئے ہے پست ہونے کے لئے نہیں۔ آدمی میں علم کی ہوا بھری ہوئی ہو پھر پست ہو جائے یہ ناممکن ہے اگر لطیف چیز کثیف میں بھر دی جائے تو وہ پست نہیں ہوتی آپ گیند کے اندر ہوا بھر دیجئے پھر زمین پر دے ماریئے تو زمین سے کتنا زیادہ اوپر جائے گی۔ اور اگر ہوا نکال کر زمین پر ماریں گے تو وہ بیچاری پھس کر کے رہ جائے گی۔ اس کے اندر اٹھنے کی جرأت نہیں معلوم ہوا لطیف چیز کی طاقت ہوتی ہے تو طاقت تو علم ہے یہ جب بھری ہوئی ہو اور پھر آدمی زمین کی طرف جائے اور پٹخا رہے۔ معلوم ہوتا ہے یا تو وہ علم نہیں ہے یا وہ علم کو سمجھا ہوا نہیں اگر علم نہیں تو بے شک پٹخا جائے گا اور اگر علم ہے تو وہ اس کی قدر و قیمت کو نہیں جانتا۔ نہ اس کے استعمال کو جانتا ہے نہ اس کی عزت و آبرو کی۔ اس کو قدر و منزلت ہے.....اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو وہ علم پست ہونے کے لئے نہیں ہو سکتا۔

علم کا خاصہ ترقی، اونچائی اور بڑھائی ہے بلکہ اسی وجہ سے انسان کے لئے عبدیت لازم کی گئی ہے اس لئے کہ محض علم اسے متکبر بنا دے گا علم نیچا دیکھنا نہیں چاہتا۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک عالم میں غرور بھی آجائے، تکبر بھی آجائے۔ بڑائی بھی آجائے اس لئے اس کا علاج عبدیت میں رکھا گیا ہے۔ اور عبدیت کسی مرد کامل کے سامنے خود کو پامال کئے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ تو عبدیت ضروری ہوئی تاکہ علم کا غرور یا اشکبار نہ رہے وقار کے درجہ میں علم رہ جائے اور عبدیت کے مواقع پر آکے تواضع للہ پیدا ہو جائے۔ تو کبر کا علاج تواضع سے کیا گیا ہے اور ذلت نفس کا علاج وقار اور خودداری سے کیا گیا ہے۔ تو جب علم کے ساتھ عبدیت جمع ہوتی ہے تو علم کے آثار میں استکبار کے بجائے وقار پیدا ہوتا ہے اور عبدیت سے ذلت نفس کے بجائے تواضع للہ پیدا ہو جاتی ہے تو عالم حقیقی وہ ہے جو متکبر نہ ہو بلکہ باوقار

① الصحیح للبخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ص: ۱ رقم: ۳.

ہو۔ جو ذلیل النفس نہ ہو بلکہ متواضع ہو ایک طرف تواضع للہ ہو تو علم کے اندر توازن قائم ہو جائے گا اور اگر عالم کے اندر استکبار ہے تو عالم کیلئے فساد ہے اور اگر اسمیں تواضع کے بجائے ذلت نفس ہے تو بھی عالم کیلئے فساد ہے صاحب ہدایہ نے ایک موقع پر (جس کا ترجمہ یہ ہے) لکھا ہے کہ وہ عالم جس میں غرور نفس ہو متکبر ہو وہ عالم کیلئے فتنہ ہے اگر وہ اس علم سے جاہل رہتا تو بہتر رہتا۔ لیکن علم آیا اور اس کے ساتھ کبر ہے تو اس نے علم کو بٹہ لگایا۔ علم عالم میں فساد پھیلانے کا ذریعہ بن جائے گا اور اگر وہ جاہل ہے عامل بے علم ہے وہ بدعات و منکرات میں مبتلا ہوگا۔ وہ بھی فساد کبیر ہے تو علم کیلئے بھی ایک فتنہ ہے اس کا علاج عبدیت میں ہے اور عبدیت کیلئے بھی ایک فتنہ ہے اس کا علاج علم ہے جب تک یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوتیں کام نہیں چلتا۔

علم بلا عبدیت اور عبدیت بلا علم کا نتیجہ...... اس کی نظیر دو امتیں موجود ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے اللہ نے دو امتیں پیدا کیں۔ ایک یہود اور ایک نصاریٰ یہود کو علم دیا گیا۔ علم بھی تفصیلی۔ تورات کی شان بیان فرمائی گئی ہے کہ ﴿تَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ﴾ ① ''اسمیں ہر چیز کی تفصیل ہے'' نہایت واضح شریعت ہے نہایت مفصل شریعت ہے تو تفصیلی شریعت دی گئی یعنی علم تفصیلی دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ لازم کیا گیا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شخصیتوں کے آگے جھکتے رہنا۔ ان سے تمسک کرتے رہنا یہود نے کہا کہ: ''نَحْنُ رِجَالٌ وَّھُمْ رِجَالٌ'' یہ انبیاء بھی انسان ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم ان کی اتباع کریں ہم میں تورات بھی موجود ہے عقل بھی موجود ہے۔ اپنی عقل کے ذریعہ تورات سے اخذ کریں گے اتباع کی ضرورت نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ جب عبدیت نکل گئی جو شخصیتوں کے آگے جھکنے سے پیدا ہوتی ہے تو خالص علم رہا تو اس سے کبر اور غرور پیدا ہو گیا، کبر اور غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ظنون اور اوھام کا مجموعہ ہو کر رہ گئے علم قطعی باقی نہیں رہا۔ تو یہود علم کے فتنے میں گرفتار ہوئے جن میں تکبر پیدا ہوا جس کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ﴾ ②

تو یہود علمی فتنے میں مبتلا ہوئے تو شکوک و شبہات میں ان کا علم رہ گیا۔ ان کا فہم درحقیقت وہم ہے جس کا نام انہوں نے فہم رکھ لیا۔ اس جہل کا نام انہوں نے علم رکھ لیا۔ اس لئے کہ منافع علم جب ان سے منقطع ہو گئے تو علم کہاں سے آتا۔ ﴿بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ③ علم تو اہل علم کے سینوں سے نکل کر ملتا ہے کاغذوں اور اوراق میں تو رسوم اور دوال ہوتے ہیں، ان رسوم اور دوال کے مدلولات اہل علم کے سینوں میں ہوتے ہیں جب وہ نفع بھی ان سے ختم ہو گیا تو علم کی صورت رہ گئی، اور محض صورت جس سے روح نکل جائے

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۵۵۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۴۶۔
③ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۹۔

وہ لاشئی ہے چند دن کے بعد وہ گلتی ہے، پھٹتی ہے سڑتی ہے، نہ صورت رہتی ہے نہ حقیقت رہتی ہے تو یہود استکبار کے فتنے میں تباہ ہوئے ہیں ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ ① جحود اور استکبار ان کی شان رہ گئی... لہٰذا تباہ و برباد ہوئے۔

نصاریٰ عملی اُمت تھی۔ ان کو انجیل کے اندر عمل کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ تصوف کے زیادہ تر احکام تھے ترک لذت، زہد کامل وہ تصوف کی کتاب ہے وہ اس کتاب پر چلے، تو تصوف کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی شخصیتوں کی طرف جھکتا ہے تو نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام، احبار اور رہبان کی طرف جھکے اور اتنا جھکے کہ انہوں نے انجیل سے قطع نظر کر کے کہا کہ کتاب ناطق تو یہ بزرگان دین ہیں۔ اس کتاب ساکت کی اب ہمیں کیا ضرورت ہے جو یہ کہیں وہ شریعت، جو یہ کریں وہ شریعت اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوگوں کے افعال و اعمال ان کے حق میں گویا شریعت بن گئے کتاب خداوندی سے منقطع ہو گئے اور ان لوگوں کے آگے اتنا جھکے تو اضع نہیں بلکہ ذلت نفس میں مبتلا ہو گئے اور جب ان لوگوں کے اعمال کو ہی شریعت سمجھا تو طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہو گئے، منکرات میں مبتلا ہو گئے کوئی مغلوب الحال ہو تو اس کے عمل کو بھی شریعت سمجھا جو مغلوب عن الحال ہو اس کو بھی شریعت سمجھا۔ تو ان کیلئے غیر شریعت شریعت بن گئی۔ اور منکر و بدعت کا حاصل غیر شریعت کو شریعت بنانا ہی ہے تو نصاریٰ کی امت گویا بدعتی امت ہے حق تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ② تو وہ رہبانیت کا شکار ہو کر بدعات میں مبتلا ہوئے اور یہود علمی فتنہ کا شکار ہو کر استکبار میں مبتلا ہوئے تو ایک امت جحود اور استکبار میں ماری گئی اور ایک امت ذلت نفس میں ماری گئی۔

﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْآ اِلَّا لِيَعْبُدُوْآ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ ③ تو یہ عملی فتنے میں گرفتار ہوئے اور وہ علمی فتنے میں مارے گئے۔

اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سابقہ اُمتوں کے اتباع کا جذبہ اور اس کے نتائج...... حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: تم یہود و نصاریٰ کی ہو بہو پیروی کرو گے چھوٹی بات میں اور بڑی سے بڑی بات میں، ④ عقائد میں، عمل میں، معاشرت اور معیشت میں حتیٰ کہ اگر وہ کوئی فعل منکر بھی کریں گے اور عبث کام کریں گے۔ اس میں بھی ان کا ساتھ دو گے۔ تو نصاریٰ اور یہود اہل کتاب کے یہ جو دو طبقے ہیں انمیں بھی فساد ہونا لازمی ہے تو امت میں دو طبقے پیدا ہو گئے، ایک طبقہ ہمارے اندر وہ ہے جو غرور نفس اور غرور علم میں مبتلا ہے اس کو اپنے علم کے اوپر گھمنڈ ہے وہ کہتا ہے ''سلف کا اتباع کریں'' اس کی ضرورت نہیں ہے قرآن و حدیث موجود ہے ہمارے اندر عقل بھی موجود ہے بلکہ ایک قدم اس سے بھی آگے کہ حدیث کی بھی ضرورت نہیں کہ بالآخر

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۴۔ ② پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۷۔ ③ پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۳۱۔ ④ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل ج: ۱۱ ص: ۲۷۲۔

وہ ایک انسان کا ہی قول ہے، بس خدا کا قول ہمارے سامنے ہو اور ہماری عقل سامنے ہو (ہدایت کیلئے کافی ہے) یہ طبقہ یہود کے نقش قدم پر چل پڑا تو جمود واستکبار اور غرور نفس میں مبتلا ہوا۔ ان کا علم وہم کے درجے میں ہے ظنون اوہام اور تخیلات فاسدہ کا نام انہوں علم رکھ لیا (وہ اسی پر خوش ہیں) اور ایک جماعت وہ ہے جو یہ کہتی ہے کہ یہ بزرگان دین شیخ جنید رحمۃ اللہ علیہ وشبلی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بھی کتاب ناطق ہیں۔ اب کتاب ساکت کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں جو یہ کہیں وہ شریعت، جو یہ کریں وہ شریعت، اس قسم کے لوگ اکثر وبیشتر بدعات میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ اہل اللہ کے بہت سے اعمال غلبہ حال میں سرزد ہوتے ہیں جو خلاف شرع تو نہیں ہوتے لیکن وہ دقیق ہوتے ہیں جن کا رابطہ شریعت سے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے وہ سطح کو دیکھ کر عمل کرتا ہے تو بدعات کا شکار ہوتا ہے اسی واسطے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''مَنْ فَسَدَ مِنْ عُلَمَآئِنَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِنَ الْيَهُودِ وَمَنْ فَسَدَ مِنْ عُبَّادِنَا فَفِيهِ شِبْهٌ مِنَ النَّصَارٰی'' [1] علماء میں بگاڑ آتا ہے تو وہ یہود کے نقش قدم پر جاتے ہیں۔ جمود واستکبار میں مبتلا ہوتے ہیں اور عبّاد وزہاد میں بگاڑ آتا ہے تو وہ نصاریٰ کے نقش قدم پر چلتے ہیں تو وہ بدعات اور منکرات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اہل حق کی پہچان...... اہل حق کون ہیں؟ وہ ہیں جو نہ متکبر ہیں نہ ذلیل النفس ہیں۔ بلکہ وقور النفس اور متواضع النفس ہیں۔ وہ درمیان میں ہیں۔ جو کہ اہل سنت والجماعت ہیں جن کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ کا دامن ہے اور ایک ہاتھ میں اہل اللہ کا دامن ہے، نہ وہ کتاب اللہ کو تھام کر اہل اللہ سے مستغنی بنتے ہیں اور نہ اہل اللہ کا دامن سنبھال کر کتاب اللہ سے مستغنی بنتے ہیں علم وہاں سے حاصل کرتے ہیں، عمل اور عمل کے نمونے یہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ تو وہ ٹھیک صراط مستقیم پر قائم ہیں نہ افراط میں مبتلا میں نہ تفریط میں۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قلب سلیم وہ ہے جو نہ افراط میں ہو نہ تفریط میں قلب سلیم وہ ہے جس میں نہ غرور ہو نہ ذلت نفس ہو۔ وہ قلب صحیح معنوں میں بدن کے اوپر حکومت کریگا اور تمام اعضاء کو سیدھا چلائے گا۔ تو آپ جب کہ پورے عالم کا قلب ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے آپکو علم بھی دیا ہے اور علم کے ساتھ تواضع بھی دی ہے نیک مزاج شخصیتیں بھی دیں کہ آپ ان کا دامن پکڑیں۔ اپنی پاک کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہ اس کا دامن سنبھالیں تو اس دولت عظیم کے آجانے کے بعد پھر غیر کی دولت کی طرف متوجہ ہو کر آپ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھیں کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہمارے پاس یہ نہیں ہمارے پاس وہ نہیں، کل کو کیا کریں گے یہ علم کی انتہائی توہین ہے مقام علم کی بھی انتہائی توہین ہے۔ آپ کو اپنا مقام سمجھ لینا چاہیے اور یہ بھی کہ آپکی حیثیت دنیا میں ہاتھ پیر کی نہیں اور نہ ہی آپ دنیا کے کان، ناک آنکھ ہیں بلکہ پورے عالم کے قلب ہیں۔

تھوڑا علم ''عبدیت کے'' ساتھ دوگنا اور مقبول ہو جاتا ہے...... اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ پورے وقار

[1] فیض القدیر، ج: ۵ ص: ۳۳۳.

کے ساتھ پوری ریاضت کے ساتھ اور پوری محنت کے ساتھ اپنے علم کے اندر متوجہ رہیں پورے ادب کیساتھ اپنے علم کو سیکھیں، اس واسطے کہ بے ادب آدمی کو علم حاصل نہیں ہوتا، طالب کو علم حاصل ہوتا ہے جو استاذ کی شان میں گستاخ ہوگا ہمیشہ علم سے محروم رہے گا جو متواضع رہے گا اگر چہ محنت بھی نہ کرے، محروم نہیں جا سکتا۔ دار العلوم میں بہت سی نظیریں ہمارے سامنے ہیں۔ خود ہمارے ہم جماعت ہیں کوئی محنت نہیں کی ہمیشہ امتحانات میں فیل رہے مگر عقیدت و نیاز مندی سے اساتذہ کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے اچھے ذی استعداد طالب علم وہ کام نہیں کر رہے جو وہ قلیل الاستعداد مخلوق کی اصلاح کر رہے ہیں۔ کچھ دعائیں ساتھ ہو جاتی ہیں۔ کچھ برکتیں ساتھ ہو جاتی ہیں تھوڑا علم بھی بہت ہو جاتا ہے تو عبدیت کے ساتھ وہ دگنا نظر آتا ہے اس کا کام دگنا ہو جاتا ہے اس سے نفع زیادہ ہو جاتا ہے۔

اس لئے کہ دنیا میں کام قابلیت سے نہیں چلتا بلکہ مقبولیت سے چلتا ہے آپ اگر سرے سے قابلیت کے پیچھے لگ جائیں اور مقبولیت کے اسباب ترک کر دیں گے کبھی دنیا میں نتیجہ خیز کام نہیں کریں گے، قابلیت زیادہ سے زیادہ کتابیں دیکھنے سے آجائے گی اور مقبولیت اخلاق کی اصلاح اعمال کی اصلاح توجہ الی اللہ اور انابت الی اللہ سے پیدا ہوگی اور مقبول بن کر آدمی جو کام کریگا وہ مقبول بنے گا جو نقل و حرکت کرے گا مقبول ہوگی۔ خاصان حق کی سب چیزیں مقبول ہوتی ہیں اور وہ ہزاروں برکات کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

مقربین کی لغزش بھی ہزاروں برکات کا پیش خیمہ ہوتی ہے...... حضرت آدم علیہ السلام کو آپ کہتے ہیں کہ ذرا سی لغزش ہوگئی مگر وہ لغزش اور وہی غلطی ہزاروں برکات کا پیش خیمہ بن گئی تو۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر

اہل اللہ کی غلطی اور لغزش بھی ہماری ہزاروں طاعات سے کہیں بہتر اور افضل ہوتی ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لیلۃ التعریس میں آنکھ نہ کھلی اور نماز قضا ہوگئی تو نظر بظاہر ادا کے مقابلہ میں قضاء لغزش معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یہ نہ سرزد ہوتی تو قضا کے سینکڑوں علوم و احکام اور قضاء کی برکات مخفی رہ جاتے ہمارے سامنے کوئی اسوہ نہ آتا۔ تو بہر حال اہل اللہ کاملین مقبولین بارگاہ خداوندی ہیں ان کی اگر لغزش بھی ہو۔ وہ بھی ہزاروں برکتوں کا پیش خیمہ ہے تو آدمی خود مقبول بن جائے، ایک ایک فعل کو مقبول بنانیکی کوشش نہ کرے، خود مقبول بننے کی کوشش کرے۔

اسباب مقبولیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے...... تو زیادہ تر طلبہ قابلیت کے پیدا کرنے میں مبتلا رہتے ہیں میں اس سے انکار نہیں کرتا میں یہ نہیں کہتا کہ آج سے آپ مطالعے چھوڑ دیجئے، کتابیں نہ دیکھئے، تکرار ختم کر دیجئے، یہ سب کچھ ہو مگر یہ اسباب قابلیت پیدا کرنے کے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اسباب بھی پیدا کیجئے جن سے مقبولیت بھی پیدا ہو، تادب اور اپنے اخلاق کی درستگی، اپنے اساتذہ کی اطاعت اور ساتھ ساتھ اپنے قلب کے اندر غناء اور استغناء جو علم کا خاص وصف ہے وہ پیدا کرنا ہوگا۔ اس صورت کے پیدا ہو جانے کے بعد اگر من بھر علم

ہوگا تو دس من ہو کے نمایاں ہوگا۔

اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص شان استغناء ہے تبلیغ کیلئے جاتے ہیں تو فرماتے ہیں بلکہ عمل ہی نہیں حکم بھی ہے کہ آپ کہہ دیجئے۔ ﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

آپ تو اس پر عمل کرتے ہی ہیں کہنے کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی کہلایا گیا کہ اس مقام کا تقاضا یہ ہے اور اس مقام کی معرفت اور پہچان یہی ہے کہ اعلان کیا جائے کہ ہم تم سے پیسے کے طالب نہیں ہیں۔ ہم تم سے محنت اور خدمت کے طالب نہیں ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیسہ بھی آتا ہے اور خدمت بھی ہو جاتی ہے تو اپنے اندر استغناء پیدا کیا جائے، تادب پیدا کیا جائے اور اطاعت کی خو ڈالی جائے سرکشی نہ پیدا کیجائے، سرنگونی پیدا کی جائے اسلئے کہ جب ہم خاک میں سب خاکی النسل ہیں خاک کا کام یہ نہیں ہے کہ آسمان میں جا کے اڑے۔ وہ تو پامال رہے گی تب ہی اچھی رہے گی اگر خاک اڑ کے چلی تو جس پہ گرے گی لوگ دامن جھڑک دیں گے جس آنکھ پہ گرے گی لوگ لعنت بھیجیں گے۔

لیکن اگر جوتوں میں پامال رہے گی تو اس کے اوپر تیمم کریں گے، طاہر ہی نہیں بلکہ مطہر بھی سمجھیں گے، تو خاک کا کام یہ ہے کہ وہ خاک بن کر رہے۔ اگر آتشی بن کر رہے گی تو اس نے اپنا نسب نامہ ابلیس سے ملا دیا ابلیس کو کہا گیا ہے کہ ﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ ② تو ہم تو اولاد آدم ہیں، ابلیس کی اولاد نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ابلیس کے خصائل اختیار کریں آگ بن کے رہیں، خاک بن کے نہ رہیں اور جب خاک بنکے رہیں گے تو خاک وہ چیز ہے کہ پھول پھل اسی سے اُگتے ہیں۔ دنیا میں باغ و بہار کی رونق اسی سے ہے آج تک آگ نے کسی درخت کو نہیں اگایا۔ آج تک کسی آگ کے اندر سے کوئی دریا نہیں نکلا یہ کام مٹی کا ہے کہ خنکی بھی پیدا کرتی ہے پھول پھل پیدا کرتی ہے سکون بھی پیدا کرتی ہے ہاں آگ کو خادم کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً تاپ لیتے ہیں۔ لیکن اگر حدود سے گزرتی ہے تو لوگ اس کو بجھانے کی فکر کرتے ہیں کہ اس کمبخت کے اوپر پانی ڈالو ورنہ یہ تو جلا ڈالے گی۔ تو بہر حال جب ہم خاکی الاصل ہیں تو ہمارا کام خاک بن کے رہنا ہے اور خاک بن کر رہنے کے معنی تادب اور ادب مع اللہ ہی ہیں۔

ادب ہی گوہر علم ہے..... قرآن مجید میں جگہ جگہ ادب کو تعلیم دی گئی ہے فرمایا گیا ہے ﴿لَاتَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَاتَشْعُرُوْنَ﴾ ③

بہر حال اس کا امر کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی آواز پست رکھو، حدیث میں آتا ہے

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۲۷۔ ② پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۷۶۔

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۲۔

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہری الصوت تھے اور فطرتاً بلند آواز تھی لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو اتنے آہستہ بولتے تھے کہ بعض دفعہ کان لگا کر سننا پڑتا تھا کہ کیا فرما رہے ہیں اور فرماتے تھے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں زور کی آواز نہ نکل جائے اور میرے اعمال حبط ہو جائیں۔ تو اہل اللہ بعید سے بعید احتمالات کو زیر عمل لانا چاہتے ہیں۔ محض مدلولات کی فکر میں نہیں رہتے۔ بعید سے بعید محتمل ہوا سے بھی اپنے تقویٰ باطن کے تحت عمل میں لانا چاہتے ہیں بہر حال ادب سکھایا گیا کہ مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آواز بھی بلند نہ کرو بے ادبی سے مت بیٹھو بے وضو مت بیٹھو۔ قرآن کریم کو بے وضو ہاتھ نہ لگاؤ ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ ① تو مساجد کا ادب الگ کعبۃ اللہ کا ادب الگ، شعائر اللہ کا ادب الگ ہے غرض جس چیز کو اللہ سے نسبت ہو جائے اسی کا ادب کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ واجب اطاعت ہے اور واجب التادب ہے اس واسطے جو بھی اس کی طرف منسوب ہو گئے درجہ بدرجہ سب میں ادب آتا چلا جائے گا تو ہماری تادب کی بنیاد ادب کے اوپر ہے بے ادبی کے اوپر نہیں۔ ہے ہماری بنیاد اطاعت پر ہے بغاوت پر نہیں ہے ہماری بنیاد درحقیقت اعتراف قصور پر ہے کہ غلطی بھی کریں تو اس کو سنبھالنے کی کوشش اور فکر کریں کیونکہ ہم بڑے مقدس تو ہیں نہیں کہ کبھی غلطی ہمارے سے ہو ہی نہیں سکتی تو جب ادب تادب کی اطاعت اور سرنگونی کی خو پیدا ہو جائے گی تو اس وقت علم کا گوہر چمک کر نمایاں ہوگا۔ اور اگر گستاخی، بے ادبی اور بے تمیزی باقی ہی رہی تو علم ایسا رہے گا جیسے ایک چنگاری ہو اور اس پر راکھ پڑی ہوئی ہو کہ نہ اس کی چمک نمایاں ہوگی نہ اس سے کسی کو روشنی کی توقع ہوگی۔

اہل علم اور ان کی ذمہ داریاں ...... تو یہ چند کلمات آپ حضرات کے سامنے جرأت کر کے میں نے اس لئے عرض کر دیئے کہ آپ حضرات کا مقام بہت بلند و بالا اور بہت ہی اونچا ہے آپ اللہ کا جتنا شکر کریں کم ہے کہ آپ کو ایسا رفیع مقام عطاء کیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ جتنا اعلیٰ اور رفیع مقام ہوتا ہے اس کے حقوق بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں اس کے واجبات بھی اتنے ہی ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے یا تو آپ اس میدان پڑے نہ ہوتے لیکن جب آ گئے ہیں تو حق ادا کرنا پڑے گا۔

حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر میں سے ہیں اور شاملی کے میدان میں امیر جہاد تھے اور جھنڈا بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان سے کسی نے کہا کہ: حضرت ہیں اپنے بچے کو قرآن حفظ کرانا چاہتا ہوں تو ہنس کہ فرمایا کہ کیوں؟ یعنی عمر بھر کی بیماری اس کو کیوں لگاتا ہے اس لئے کہ قرآن یاد کرائے گا تو عمر بھر لازم ہو جائے گا کہ یہ اس کو پڑھتا رہے یاد کرتا رہے بھولا تو آخرت میں اس پر مصیبت آئے گی۔ تو یہ مطلب نہیں تھا کہ قرآن حفظ نہ کرو۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ جب قرآن حفظ کر کے میدان میں آ و گے تو اس کے حقوق بھی لازم ہو جائیں گے اس کی تلاوۃ بھی لازمی ہوگی اور اس کا تحفظ بھی۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۷۹.

اس بناء پر یا تو آپ اس میدان میں نہ آئے ہوتے اور جب آ گئے تو پھر اخلاقی جرأت سے کام لیکر اس مقام کے حقوق ادا کیجئے مقام تو یہ ہے اور حالت یہ ہے کہ بعض طلباء کے سامنے تو اگر کوئی امیر آ گیا تو وہ اپنی نگاہوں میں اپنے آپکو ضعیف اور ہیچ سمجھتے ہیں اور خود منفعل ہو جاتے ہیں تو گویا ان کے دل میں اپنی وضع قطع کی کوئی عظمت نہیں ہے اس شخص کی وضع قطع کی عظمت ہے جو سامنے ہے جھینپ کے یہی تو معنی ہیں کہ میں ہیچ ہوں اور دوسرا مجھ سے بلند ہے اگر طالب علم کا مقام رکھتے ہوئے دوسرے کے آگے جھینپیں اور سمجھیں کہ یہ مقام اونچا ہے تو اس نے سارے حقوق کو تلف کر دیا اس کا تو یہ کام ہے نہ ملامت گر کی ملامت کی پرواہ کرے نہ ناصح کی بے جا نصیحتوں کی پرواہ کرے۔ اس مقام کی عزت اور شرف کو سنبھالے۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ جب ایران فتح ہوا۔ تو بغداد تشریف لائے تو کھانا کھا رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ تو ہاتھ سے لقمہ زمین پر گر پڑا تو آپ نے لقمہ اٹھا کے مٹی جھاڑی اور صاف کر کے تناول فرمالیا۔ اس غلام نے کہا کہ: یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ متمدن ملک ہے فارسیوں کا ملک ہے یہ ایک لقمہ جو کہ گندہ ہو چکا تھا اور آپ نے اسکو اٹھا کر کھالیا......؟ تو حضرت حذیفہؓ نے جواب دیتے ہوئی کوئی دلیل بیان نہیں فرمائی...... بلکہ فرمایا: ''ءَاَتْرُکُ سُنَّةَ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ'' کیا میں اپنے حبیب پاک کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں...... تو اس ایک سنت کی وہ عظمت تھی کہ پورے تمدن کی وہ عظمت ان کے ذہن میں نہیں تھی۔ اس سنت کا وہ وقار ذہن میں تھا کہ پورے ایران اور خراسان کے تمدن کی کوئی پرواہ نہیں کی یعنی ملامت کرنیوالے ملامت کریں ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہمیں اپنے حبیب پاک کی سنت درکار ہے۔

تو جب تک یہ طمانیت اور اتنا اعتماد اور اتنا اطمینان سنت نبوی کے اوپر نہ ہو اس وقت تک ایک عالم نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں۔ اور نہ ہی وہ اپنے مقام کو برقرار رکھ سکا اس کا فرض ہے کہ ایک ایک سنت کی اتنی عظمت کرے کہ پوری دنیا و مافیہا کی اس کے قلب کے اندر وہ عظمت نہ ہو۔ پھر جا کے اس مقام کا حق ادا ہوگا۔

تو آپ ماشاء اللہ ان حقوق کو خوب سمجھتے ہیں۔ سب سے زیادہ سمجھتے ہیں، اساتذہ سامنے ہیں کتب سامنے ہیں۔ میری یہ ضرورت نہ تھی کہ میں اہل علم میں کھڑے ہو کر کچھ کہوں، لیکن بہر حال کہنے سننے کیلئے کوئی بڑا ہونا ضروری نہیں چھوٹا بھی اپنے بڑوں سے کہہ سکتا ہے ایک ناقص بھی تو ایک کامل کے سامنے کہہ سکتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تو عالم بشریت اور عالم کائنات میں کوئی نہیں لیکن آپ مشورہ اپنے چھوٹوں سے بھی فرماتے ہیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعض دفعہ رائے قبول بھی فرمالیتے ہیں۔ بعض دفعہ اس رائے کی توقیر بھی فرماتے ہیں۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی ہیں۔ اگر کسی سے مشورہ بھی نہ فرماتے تو کوئی ادنی نقص اور کمی نہ رہتی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب وحی ہیں اور ملھم من اللہ ہیں۔ مگر تعلیم اور اُسوہ حسنہ کے طور پر آپ نے چھوٹوں کو بھی موقع دیا کہ وہ بات کریں۔ ایک ناقص الاستعداد کو بھی علم دیا ہے کہ وہ ایک کامل الاستعداد

کے سامنے اپنا خیال ظاہر کرے، قابل قبول ہو تو قبول کیا جائے۔ نا قابل قبول ہو تو منہ پر مارا جائے۔

لیکن اگر وہ ناقل ہو تو ناقل کی بات تو ماننا ہی پڑے گی، ہاں اگر اپنی رائے ظاہر کرے تو حق ہے کہ آپ دیوار پہ دے ماریں۔ لیکن اگر وہ نقل کرے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا پھر تو اگر دیوار بھی نقل کرے گی تو اس کی بھی توقیر کرنے پڑے گی اگر چہ دیوار جمادات میں سے ہے اور آپ ماشاء اللہ انسانات میں سے ہیں۔ اشرف المخلوقات میں سے ہیں لیکن اگر دیوار پر بھی نصیحت لکھی ہوئی ہو تو قبول کرنی پڑے گی جبکہ وہ نصیحت حق ہو......تو آپ مجھے ایک دیوار ہی سمجھ لیجئے اور دیوار کیا سمجھ لیجئے ہم سب ہی واقعہ میں دیوار ہیں کیا ہمارا علم؟ کیا ہمارا فہم؟ کیا ہمارا عرفان؟ کوئی کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اپنے بزرگوں کا نام لیتے ہیں ان کے کچھ مقولے یاد ہیں وہ نقل کر لیتے ہیں ایک دفعہ ہمارے شیخ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کی مسجد میں وعظ فرما رہے ہیں تو محبت پیار میں طلبہ کو اکثر جاھلین فرمایا کرتے تھے۔ فرمایا کہ: جاہلین ہمیں تو روٹیاں بھی اس لئے ملتی ہیں کہ پیغمبر کے چند نام ہم نے یاد کر لئے ہیں۔ انہیں کہتے رہتے ہیں اس کے طفیل میں ہمیں بھی روٹی ملتی رہتی ہے......

تو کیا ہمارا علم؟ کیا ہمارا فہم صرف یہ کہ بزرگوں کے سُنے سُنائے کچھ مقالات یاد کر لئے کچھ انہوں نے کتابوں میں پڑھا دیا۔ تو کچھ کلمات یاد ہو گئے، تو ہم ناقل محض ہیں۔ ہماری ذات کا کیا کمال ہے؟ ذات جب آئے گی تو وہ قابل نفرت ہوگی۔ لیکن اگر نقل کے ساتھ کلام آئے گا تو وہ قابل عظمت ہوگا۔ اس لئے نصیحت کے قبول کرنے میں بڑے چھوٹے کا فرق نہیں سمجھنا چاہئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ اتنا بڑا علم آپ نے کہاں سے حاصل کیا فرمایا کہ: ''لِسَانٌ سَئُوْلٌ وَّقَلْبٌ عَقُوْلٌ'' ① بہت زیادہ پوچھ گچھ کرنے والی زبان کی بدولت اور بہت زیادہ سمجھنے والے دل کی بدولت مجھے یہ علم حاصل ہوا۔

تو علم کے میدان میں اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہئے کہ کہنے والا چھوٹا ہے یا ناقص الاستعداد ہے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس کا ذاتی قول ہے یا منقول ہے اگر منقول ہے تو واجب القبول ہے غیر منقول ہے تو پھر وہ غیر معقول بھی ہے اور اسکو قبول کرنا کوئی ضروری بھی نہیں ہے تو پھر جو اس میں غلطی ہے وہ اپنے نفس کی ہے اور جو خیر ہے وہ اللہ اور اسی کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور اہل اللہ کی طرف سے ہے اس واسطے اس کے قبول کرنے کی ہمیں توقع رکھنی چاہیے، حق تعالیٰ شانہ آپ کو اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور مقبولیت کے راستے عنایت فرمائے۔ اور انجام بخیر فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

① فیض القدیر، ج: ۲، ص: ۲۲۷.

وعظِ یوسفی

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ﴾o صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی اپنا وعظ سنانا مقصود نہیں ہے، بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کا وعظ آپ کے سامنے نقل کرنا ہے اور وہ وعظ بھی گویا نقل در نقل ہے، یعنی اس وعظ کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنی کتاب مبین میں نقل فرمایا ہے، اس سے نقل کر کے میں آپ کو سناؤں گا تو وہ وعظ میرا نہیں ہوگا بلکہ پیغمبر کا وعظ ہوگا، جس کے ناقل حق تعالیٰ شانہ ہیں تو نقل بھی اعلیٰ ترین اور اعلیٰ پیمانے کی سچی، وعظ کہنے والے بھی پیغمبر، اس واسطے نقل بھی مکمل اور وعظ بھی مکمل، تو ایسی چیز کے نقل کرنے سے خود ہمارے لئے بھی برکت اور سعادت ہوگی بنسبت اس کے کہ ہم اپنے افکار و خیالات پیش کریں وہ چیز کیوں نہ پیش کریں جو اللہ کے ایک رسول نے ارشاد فرمائی ہے اور حق تعالیٰ نے اس کو نقل فرمایا ہے۔

یہ جلیل القدر پیغمبر جن کا وعظ مجھے اس وقت نقل کرنا ہے، کون ہیں؟ یہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، جن کی بہت سی بالکل امتیازی خصوصیات ہیں، ویسے تو سارے انبیاء علیہم السلام کامل اور مکمل ہوئے ہیں ان میں ادنیٰ کی یا ذرہ برابر نقص نہیں ہوتا لیکن ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ② بعض رسولوں کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے تو ان میں تفاضل ہے، ایک سے ایک بڑھ کر ہے بڑھیا تو سبھی ہیں مگر ایک سے ایک بڑھ کر بھی ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خصوصیات ...... تو یوسف علیہ السلام بھی انہیں انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں جن کو اللہ نے کچھ امتیازی خصوصیات دی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں سب سے پہلی خصوصیت تو اعلیٰ ترین نسب کی ہے اور وہ بھی سلسلہ وار، یعنی خود بھی جلیل القدر پیغمبر، ان کے والد بزرگوار بھی پیغمبر یعنی حضرت یعقوب

علیہ اسلام یعقوب علیہ السلام کے والد بزرگوار بھی پیغمبر، یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام کے والد بزرگوار بھی پیغمبر، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تو نسلاً بعد نسل چوتھی پشت تک پیغمبری کا سلسلہ چلا آیا تو ظاہر بات ہے کہ یہ خود مستقل ایک برکت ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث شریف میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی بندہ صلاح اور نیکی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی پشتوں میں نیکی ڈال دیتا ہے سات پشتوں تک نیک پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں تو جب اُمتیوں کا یہ عالم ہے کہ نیکی میں کوئی جم جائے تو اس کی سات پشتوں تک نیکی کا اثر جاتا ہے تو انبیاء علیہم السلام کی بڑائی اور بزرگی کا کیا ٹھکانہ ہے؟ ان سے بڑھ کر دنیا کے اندر نیکی کرنے والا کون ہے؟

اور یہ بھی فرمایا گیا: اگر کوئی مسلم، مومن امت کا کوئی آدمی بدعمل ہوتا ہے تو اس کی نحوست ساتوں پشتوں تک جاتی ہے اور پھیلتی چلی جاتی ہے اس لئے مسلمان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اگر خدانخواستہ بدعملی برت رہا ہے تو سات پشت کو تباہ کر رہا ہے اگر خود تباہ ہو جائے تو چلو ایک برباد ہے لیکن ایسی بربادی کہ ساتویں پشت تک اولاد کو تباہ اور برباد کر دے۔ اس شخص پر کتنی بڑی ذمہ داری اور کتنا بڑا وبال ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: بدعمل پر میں لعنت کرتا ہوں اور اس لعنت کا اثر ساتویں پشت تک جاتا ہے۔ تو یہی صورت نیکی کی ہے، ایک صالح نیک آدمی دیانت، امانت، عبادت اور معاشرۂ صالحہ کا پابند ہے اس کی اولاد میں نیکی کا اثر آئے گا کہ اولاد در اولاد یہ سلسلہ چلے گا اگر خدانخواستہ بدی (کا ارتکاب) بھی ہوا، اولاد سدھر جائے گی، انجام پھر بھی آبائی نیکی کی وجہ سے صحیح ہو جائے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خاندانی کرامت ...... تو انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی نیک ہے نہ کوئی صالح ہے نہ کوئی پارسا ہے، تو ان کی پشتہا پشت تک نیکی کا اثر جانا قدرتی بات ہے تو یوسف علیہ السلام خود بھی پیغمبر، ان کے والد پیغمبر، ان کے دادا پیغمبر ان کے پردادا پیغمبر گویا چاروں پشتوں تک پیغمبری چلی آئی ہے جو نیکی کی جڑ بنیاد ہے۔

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت میں بیان فرماتے ہیں کہ: ''اَلْكَرِيْمُ ابْنُ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ'' ① خود بھی کریم باپ بھی کریم دادا بھی کریم، پردادا بھی کریم۔ کرامت آبائی طور پر چلی آ رہی ہے تو وعظ کہنے والی وہ شخصیت ہے کہ جس کی خاندانی کرامت اور بزرگی پشتہا پشت سے چلی آ رہی ہے اور آگے بھی پشتہا پشت تک چلی، تو وعظ میں بھی کتنی نیکی، کتنی تاثیر ہوگی، اس لئے میں نے اس وعظ کا انتخاب کیا۔

پھر یہ کہ نسب ہی نہیں بلکہ نسبت بھی جو بڑوں کی نسبت ہے، وہ بھی آئی، پردادا پیغمبر تو پیغمبری کی نسبت ان کی اولاد میں آنی چاہیے، پھر ان کی اولاد میں، پھر ان کی اولاد میں، پھر ان کی اولاد میں تو جیسے نسب آیا ہے، ویسے نسبت

① السنن للترمذي، كتاب التفسير، باب تفسير سورة يوسف ج: ١٠ ص: ٣٨٥.

بھی آتی ہے.....اور سیرت کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا کیا پوچھنا، انبیاء تو وہ ہیں کوئی بُرائی ان سے سرزد نہیں ہوتی یہ اجماع ہے اور اہلسنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبیرہ اور صغیرہ گناہ سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔ پیغمبری کے بعد اور پہلے بھی تو گویا نیک ہی پیدا کئے جاتے ہیں ان کی طبیعت کی اُفتاد ہی نیک اور صحیح ہوتی ہے مخلی بالطبع ہو کر ان کو کدھر بھی چھوڑ دو، وہ نیکی ہی کی طرف جائے گی، بدی کی طرف مائل نہیں ہوگی تو انبیاء کی فطرت میں صلاح ہوتی ہے، ان کی طبیعتوں کے اندر رشد، بزرگی اور بڑائی ہوتی ہے۔

حالانکہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ طبیعت ہر انسان کی بے شعور ہے، طبیعت میں محض جذبات ہوتے ہیں۔ سمجھ نہیں ہوتی.....بھوک لگتی ہے، طبعی جذبہ ہے سمجھ کے بھوک نہیں لگتی، یہ نہیں ہے کہ آپ دلائل سے بھوک لگوائیں، بلا دلیل لگے گی، یہ طبعی جذبہ ہے بلکہ اگر اس کے خلاف دلیلیں قائم کریں گے جب بھی بھوک نہیں رکے گی، آپ طبیعت کو سمجھائیں کہ اس وقت کھانا بہت مضر ہے بہت برا ہے ہرگز مت کھاؤ، یہ دلیل اور یہ دلیل طبیعت کسی کی نہیں مانے گی وہ تو یکلخت لگ جائے گی پیاس لگے گی تو لگے گی، دلائل سے نہیں لگتی بلکہ دلائل سے مٹتی بھی نہیں اور رکتی بھی نہیں، تو طبیعت میں جذبات ہوتے ہیں شعور نہیں ہوتا جیسے میں نے عرض کیا کہ: بھوک سمجھ کے تھوڑا لگتی ہے سمجھدار کو بھی لگے گی ناسمجھ کو بھی، حکیم کو بھی بے وقوف کو بھی جو بالکل ایک حرف بھی نہیں جانتا اس کو بھی.....اگر سمجھ کر دلائل سے بھوک لگا کرتی تو جاہل کو کبھی بھوک نہ لگتی، اس لئے کہ وہ بے چارہ دلیلیں نہیں جانتا مگر اُسے بھی لگتی ہے تو بھوک پیاس اور جذبات طبعی سمجھ بوجھ کے محتاج نہیں ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی طبیعت اس رفتار سے پیدا کی جاتی ہے کہ وہ چلتی ہی نیکی کی طرف ہے کبھی بدی کی طرف نہیں جاتی۔ نبی کی طبیعت میں جب جذبہ اُٹھے گا خیر کا اُٹھے گا شر اور برائی کا کبھی نہیں اُٹھے گا تو تین اشخاص ہوتی ہیں انبیاء علیہم السلام کی، نسب ونسبت اعلیٰ اور پاک طبیعت)

یہی وجہ ہے کہ شریعت تو انبیاء کی طبیعت کے اوپر چلتی ہے جو وہ کہہ دیں وہ شریعت ہے جو کر گذریں وہ شریعت ہے، شریعت کے یہی تو معنی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کیا۔ لہٰذا اُمت بھی یہ کرے، وہ شریعت بن گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اس طرح پڑھی لہٰذا وہ شریعت ہے، آپ نے حج اس طرح کیا لہٰذا وہ شریعت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے یہ ارشاد فرمایا: وہی شریعت ہے تو نبی کا قول، فعل اور عمل شریعت بنتا ہے، اگر خدانخواستہ طبیعت میں کھوٹ ہو اور غلطی بھی سرزد ہو تو شریعت پر عمل باقی نہیں رہ سکتا، نبی کا کیا ہوا اور کہا ہوا شریعت ہوتی ہے اگر اس میں غلطی ہو جائے تو پھر دنیا کے انسانوں کا کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، ان کی طبیعت پاک ہوتی ہے وہ جب چلے گی بزرگی اور خیر و برکت کی طرف چلے گی، برائی کی طرف نہیں جائے گی، تو تمام ہی انبیاء کی یہ فطرت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں، صالح، مقدس اور برتر ہیں، کوئی ادنیٰ تصور بھی گناہ کا نہیں ہے تو جیسے نسب اعلیٰ ہے، نسبت اعلیٰ ہے ویسے سیرت بھی اعلیٰ ہے اس لئے کہ سیرت کہتے ہیں پاکیزہ اخلاق، پاکیزہ عادات، پاکیزہ عمل کو تو نبی سے بڑھ کر

کس کی پاک ہوسکتی ہے؟ نبی سے بڑھ کر کس کے اونچے اخلاق ہوسکتے ہیں؟ نبی سے بڑھ کر کس میں صلاح ہوسکتا ہے؟ تو سیرت بھی مقدس اور نسب ونسبت میں بھی اعلیٰ......

حضرت یوسف علیہ السلام کا خلقی حسن اور سیرت باطن...... اور خصوصیت سے یہ بات ہے کہ صورت بھی اعلیٰ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جوحسن وجمال دیا گیا، اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: جب اللہ نے دنیا کو حسن تقسیم کیا تو آدھا حسن وجمال تو کل عالم کو دیا آدھا حسن وجمال تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا[1] تو حسن وجمال وہ تھا کہ لوگ دیکھ کر مبہوت ہو جاتے، اپنے آپے میں نہ رہتے تھے یہ کیفیت طاری ہوتی تھی آپ نے تو سُنا ہی ہوگا مشہور قصہ ہے۔

عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام...... قرآن کریم میں بھی ہے کہ زلیخا عاشق ہوگئی تھی حضرت یوسف علیہ السلام پر، اور تھے آپ زرخرید غلام۔ ان کو مصر کے بازار میں خرید لیا تھا، بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا، کنوئیں والوں نے نکال کے کنعان کے بازار میں بیچ دیا، عزیز مصر نے خرید لیا تو گویا زرخرید غلام تھے مگر حسن وجمال غیر معمولی تھا اور بزرگی وتقدس نے اس پر اور بھی نورانیت پیدا کر دی تھی، تو ایک تو خلقی اور صورت کا حسن وجمال پھر سیرت کی نورانیت، وہ بھی اس جمال میں چمکتی تھی تو وہ اور بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بن گیا، ہزاروں عشاق تھے مگر زلیخا بالکل فنا ہو چکی تھی مصر کے امراء وزراء کی جتنی بیگمات، بی بیاں اور بیٹیاں تھیں، انہیں زلیخا کے اوپر رشک اور حسد تھا وہ یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح سے زلیخا یوسف کو چھوڑ دے اور ہم اس پر قبضہ ئیں یوں تو کہہ نہ سکتی تھیں کہ تو چھوڑ ہم قبضہ ئیں۔ یہ تو بے عزتی کی بات ہوئی زلیخا کو طعنے دیتی تھیں کہ بڑی بدعمل ہے غلام پر عاشق ہوگئی اسطرح ملامتیں کر کے چاہتی تھیں کہ کسی طرح یوسف علیہ السلام اس کے دل سے اُتر جائیں اور جب اس کا دل ہٹ جائے تو ہم قبضہ لیں تو ظاہر میں تو ملامت کرتی تھیں کہ بڑی بے وقوف ہے غلام پر عاشق ہوگئی اور عاشق درحقیقت خود تھیں، یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام ہمارے قبضے میں آجائیں۔

زلیخا جب طعنے سُنتے سُنتے تنگ آگئی تو اس نے ارادہ کیا کہ میں ایک دن فیصلہ کر دوں تاکہ یہ طعنہ زنی کسی طرح بند ہو، تو اس نے بیگمات مصر کو پارٹی دی اور پارٹی بھی ''ٹی پارٹی''...... چائے ممکن ہے اس زمانے میں نہ ہو مگر چائے کے لوازم میں فروٹ میوے اور پھل ہیں وہ سب جمع تھے بادشاہ کی بیوی تھی دسترخوان سجایا..... جب ہمارے آپ کے دسترخوان پر اتنے کھانے ہوتے ہیں کہ دیکھتے ہی بھوک لگ جاتی ہے وہ تو بادشاہ کی ملکہ کا دسترخوان تھا، تو پھل پھول اور فروٹ بہت سجائے گئے کہ دسترخوان خود ایک زینت بن گیا۔

دسترخوان سجانے پر ایک حکایت...... جیسے آج کے زمانے میں دسترخوان کا سجانا یہ بھی ایک مستقل فن ہے، یورپ میں مستقل کمپنیاں ہیں جو دسترخوان سجاتی ہیں ان کی فیس مقرر ہوتی ہے، ہزاروں روپے فیس کے دیے

[1] الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الی السماوات، ج:۵، رقم: ۴۱۱۔

جاتے ہیں کافی پہلے کی بات ہے کہ وائسرائے کی ہندوستان میں بمبئی کے سیٹھ نے دعوت کی تھی۔ لندن کی ایک کمپنی کو یہ آرڈر دیا گیا کہ وہ میز سجائے اور چائے کا سامان لگائے، تو اس نے کیک اور پیسٹریاں اس انداز کی بنائیں کہ ہندوستان بھر کی جتنی مشہور عمارتیں تھیں ان سب کے نقشے بنائے۔ دہلی کی جامع مسجد مجسم بنا کے کھڑی کر دی۔ مینار بھی بنے ہوئے ہیں گنبد بھی بنے ہوئے ہیں مصلے بھی بچھے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قمقمے لگا کے ان کے اندر بجلی کی روشنی بھی دوڑائی۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ دلی کی جامع مسجد کھڑی ہوئی ہے بس نمازیوں کے آنے کی دیر ہے آگرہ کا تاج محل اس کا کیک بنایا۔ وہی چار مینار، وہی گنبد، وہی نقش ونگار، وہی اس میں رنگ بھرے ہوئے ہیں۔ مقبرہ آصف الدولہ، مقبرہ ہمایوں، ان سب کے مجسمے بنائے جو کہ وہ کیک پیسٹری تھے اور میز کے اوپر جو کہ دسترخوان تھا، وہ بھی عجیب گل کاری کی ہوئی تھی، غرض جب وائسرائے نے دیکھا کہ میز کیا ہے گویا ہندوستان جمع ہے اس کے اوپر ساری مشہور عمارتیں ہیں وائسرائے حیران ہو گیا۔ اس میز کے سجانے پر ہزار ہا روپیہ خرچ ہوا۔ وائسرائے آ کے بیٹھ گئے۔ اس غریب کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ کھانا رکھا ہوا ہے وہ سمجھے عمارتوں کی شکل میں میز سجائی ہے کھانا اب تھوڑی دیر میں آئے گا، جب دس پندرہ منٹ ہو گئے جتنا وقت دیا تھا وہ گذرنے لگا تو وائسرائے نے اپنے سیکرٹری کی طرف دیکھا کہ سیٹھ سے کہو کھانا منگوائیں سیکرٹری نے اشارہ کیا کہ دیر ہو رہی ہے میز تو بہت عمدہ سجی ہوئی ہے مگر کھانا بھی تو آنا چاہیے۔ اس نے کہا، یہی تو کھانا رکھا ہے جو عمارتیں ہیں وائسرائے حیران ہوا اور کھانا شروع کر دیا۔ اب مینار کو کھائیں تو اور ذائقہ، گنبد توڑ کے کھائیں تو اور ذائقہ مصلے توڑ کے کھائیں تو اور ذائقہ غرض تھوڑی دیر میں وائسرائے اور اُن کے اسٹاف نے ہندوستان کی ساری عمارتیں ختم کر دیں، اب ان کو یہ فکر تھی کہ یہ تو سب چیزیں میٹھی تھیں کوئی سلونی نمکین چیز بھی تو آئے، تو سیکرٹری کی طرف دیکھا، اس نے سیٹھ کی طرف دیکھا تو سیٹھ نے کہا یہ جو دسترخوان بچھا ہوا ہے یہ نمکین کھانا ہے اسے توڑ توڑ کے کھایا تو اس میں نمکینی کا ذائقہ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ: کچھ ایسا ذائقہ بھی ہو جو نمک اور مرچ کے ذائقہ کو نیچا کر کے ہضم کر دے جیسے چٹنی اچار ہوتا ہے تو اس نے کہا یہ میز جو رکھی ہوئی ہے چٹنی ہے تو میز کے پائے تختے سب توڑ کے کھا گئے۔

زلیخا کی دعوت ...... تو انسان کی فطرت میں جمال پسندی ہے کہ چیز کو استعمال کرے اور خوبصورت بنا کے استعمال کرے۔ تو یہ اس زمانے میں بھی تھی تو زلیخا نے دسترخوان سجایا اور اس میں رنگ برنگ کے پھل اور قسم قسم کے فروٹ یہ سب چیزیں رکھیں اور چھریاں بھی رکھیں کہ کاٹ کاٹ کر لوگ کھائیں اور استعمال کریں، تمام کھانے جمع کئے اور جتنی وہاں مصر کے وزراء کی بیبیاں، امراء کی بیبیاں اور بیٹیاں تھیں سب کی سب جمع تھیں۔ زرق برق لباس پہن کر اور سنگھار کر کے آئیں مقصد یہ تھا کہ یوسف ہمیں پسند کر کے زلیخا کو چھوڑ دے۔

دسترخوان سجایا پھل پھول چھریاں رکھیں اور کہا بسم اللہ کرو، کھانا شروع کرو، چھریاں لے کے انہوں نے پھلوں کو کاٹنا شروع کیا حضرت یوسف علیہ السلام کو چھپا رکھا تھا اور کہا جب تک میں اجازت نہ دوں تو آپ باہر نہ

نکلیں جب انہوں نے کاٹ کر کھانا شروع کیا تو یوسف علیہ السلام کو اشارہ کیا کہ باہر آجاؤ۔ باہر آنا تھا کہ ان کا جمال دیکھ کر ہر عورت اتنی مبتلا ہوئی کہ ہوش حواس کھودیے اور بجائے پھلوں کے کاٹنے کے کسی نے اپنی انگلی کاٹ لی، کسی نے انگوٹھا کاٹ لیا، کسی نے بازو کاٹ لیا سب عورتیں لہولہان اور زخمی ہوگئیں۔ اور یہ کہا کہ۔ ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا ط اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ ① خدا کی قسم یہ کوئی انسان اور بشر نہیں معلوم ہوتا یہ تو کوئی فرشتہ ہے اللہ کا جو آسمان سے اتر آیا۔ اس لئے کہ ملکیت کی نورانیت بھی موجود حسن و جمال بھی موجود، جمال میں نورانیت اور چمک بھی موجود تو کہا واللہ یہ انسان معلوم نہیں ہوتا کوئی فرشتہ ہے۔ ان کی صورت اور جمال میں مائل ہو کر ہوش، حواس بھی گم ہوگئے اور بجائے پھلوں کے کاٹنے کے ہاتھ کی انگلیاں اور کھونچیں کاٹ لیں، کپڑے بھی خراب ہوگئے تو اس وقت زلیخا نے کہا کہ ﴿فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ﴾ ② یہی ہے وہ جس کے بارے میں مجھے ملامت کیا کرتی تھیں، تم نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لئے؟ اپنی انگلیاں کیوں کاٹ لیں؟ میں نے تو آج تک ایک انگلی نہیں کاٹی تم نے انگلیاں تک کیوں قلم کر دیں؟ یہ وہی تو غلام ہے جس کے بارے میں تم مجھکو طعنہ دیتی تھیں تمہیں شرم نہیں آتی۔ اب توبہ کر کے واپس ہوئیں کہ اب کچھ نہیں کہیں گی، زلیخا ہم پر غالب ہے، یہ تو ایسا محبوب ہے کہ سارے عالم کو عاشق بننا چاہیے، زلیخا بے چاری کا کیا قصور ہے؟ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نسب وہ اعلیٰ تھا، نسبت وہ اعلیٰ تھی، سیرت وہ اعلیٰ تھی، صورت بھی اعلیٰ تھی تو ایسی ذات مقدس جس کا نسب نسبت، سیرت اور صورت سب اُونچا ہو، اس کا وعظ جب پیش کیا جائے گا۔

تو وعظ بھی تو اونچا ہوگا کتنا عالی مقام ہوگا وہ کلام جو ایسی برگزیدہ شخصیت کی زبان سے نکلا ہو اور حق تعالیٰ شانہ حکایت فرمائیں کہ یوسف نے یہ وعظ کہا تھا تو اللہ میاں کو بھی پسند آیا۔ تو جو پیغمبر کہے۔ اللہ میاں پسند کرے اس کی نقل کیجائے تو اس سے بہتر وعظ نہیں ہوسکتا، اس واسطے مجھے کوئی اپنا وعظ کہنا نہیں ہے بلکہ ایسے جلیل القدر پیغمبر کا وعظ سنانا ہے جس کی شخصیت یہ ہے جو میں نے عرض کی ہے یہ وعظ کون سے موقع پر کہا گیا؟ یوسف علیہ السلام نے کب فرمایا؟ تو قرآن نے اس کا واقعہ بیان کیا ہے اسی وجہ سے مجھے یہ رکوع پڑھنا پڑا۔ ورنہ ایک دو آیت کافی تھیں مگر چونکہ واقعہ متعلق ہے اس واسطے میں نے کئی آیتیں پڑھیں۔

زلیخا کی آخری تدبیر...... اس کا واقعہ یہ ہوا کہ عزیز مصر بادشاہ مصر کے دو خادم تھے، ایک شراب پلانے والا، اور ایک دستر خوان بچھانے والا باورچی، گویا ایک مطبخ کا انچارج آفیسر تھا اور ایک شراب پلانے کا انچارج آفیسر تھا ان پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے کھانے میں زہر ملایا۔ بادشاہ کو یہ قتل کرنا چاہتے تھے ادھر حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب زلیخا عاشق ہوچکی زلیخا نے ہر چند چاہا کہ میری طرف حضرت یوسف علیہ السلام مائل ہوں مگر مائل نہیں ہوئے، وہ تو پیغمبر اور مقدس تھے تب اس نے یہ کیا کہ ایک بڑا عالیشان

① پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۱. ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۲.

مکان بنوایا اوراس کوفرنیچر سے آراستہ کیا اس میں زرق برق لباس پہن کرخود بیٹھی ، اس کے اردگرد ایک اور مکان اس کے آگے ایک اور کمرہ سات کمروں کے اندر جوساتواں کمرہ تھا ، اس کوسجایا اورنہایت ہی فاخرہ لباس پہن کر وہاں بیٹھی اور یوسف علیہ السلام کووہاں بلوایا مقصد یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام پیغمبر سہی مگر ہیں توانسان اورانسان میں جنسی جذبات ہوتے ہیں تو جب میرا حسن وجمال دیکھیں گے خلوت اور تنہائی میسر ہوگی تو طبعاً میلان ہو جائے گا اور تدبیریں تو بیکار ہوگئی تھیں یہ تدبیر آخری تھی کہ جذبات کو ابھاڑ جائے تو جھکنے پر مجبور ہو جائیں ۔ یوسف علیہ السلام کواس کی اطلاع نہیں دی ۔ آپ کوحکم پہنچا کہ اندر پہنچو ، وہ پہنچ گئے اور ملازموں کو یہ حکم دیا تھا کہ جب ایک کمرے میں داخل ہوں تو اس کا اندر سے تالا بند کردو دوسرے میں داخل ہوں تو اسکا بھی تالا بند کردو اور تیسرے میں بھی اور ساتویں کمرے میں خود بیٹھی جب آپ اس میں پہنچے تو اس کا بھی تالا بند ہوگیا اب تو بھاگنے کی جگہ بھی نہیں تو خلوت ، زلیخا کا حسن وجمال ، آرائش اور پھر بہرحال بشریت بھی ہے یہ ایسی تدبیر تھی اگر پیغمبر اور معصوم نہ ہوں تو پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی ۔

یوسف علیہ السلام پہنچے تو دوسرا حال دیکھا کہ بڑی زرق برق بیٹھی ہے زلیخا نے اپنا مطلب پیش کیا ، قرآن کریم میں اس کوفرمایا گیا ۔ ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ ① تو ممکن تھا کہ بشریت اکھڑی جاتی لیکن چونکہ اللہ کی حجتیں اور پیغمبر کی برکت کے آثار سامنے تھے اس لئے بچ گئے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی منجانب اللہ حفاظت ...... بعض احادیث میں ہے کہ : حضرت یوسف علیہ السلام نے نگاہ اٹھا کے دیکھا تو چھت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا جو دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ہیں ② تو اللہ کی طرف سے حفاظت ہوتی ہے پیغمبروں کی طبیعت بھی پاک ہوتی ہے اور من جانب اللہ حفاظت بھی کیجاتی ہے ۔

تو اس آیت کو دیکھ کر یوسف علیہ السلام وہاں سے بھاگے ۔ اب تالے لگے ہوئے تھے مگر یہ پیغمبر کا معجزہ تھا کہ جس تالے پر ہاتھ ڈالا وہ کھل کر گر پڑا ۔ آگے گئے دوسرے تالے پہ ہاتھ ڈالا ، وہ گرا ، ساتوں تالے کھل کر گر پڑے اور آپ باہر آ گئے ۔

اب زلیخا کو فکر ہوئی کہ یہ باہر جا کر سارا قصہ سنائیں گے تو میں بادشاہ کی بیوی بدنام ہوں گی ...... تو پھر عورتوں میں مکاری تو ہوتی ہے ﴿اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴾ ③ شیطان کے لئے کہا گیا ۔ ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ ④ شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے اور عورت کا مکر بہت قوی اور مضبوط ہے شیطان تو چھپ کر کرتا ہے یہ سامنے آکے کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ اتار چڑھاؤں کی باتیں اس طرح کرتی ہیں کہ بڑے بڑے عقلمند بھی بے وقوف بن جاتے ہیں ...... شادی غمی کی جتنی رسوم ہیں جب یہ مرد کرتے ہیں تو انہیں ملامت کی جاتی ہے کہ یہ

---

① پارہ : ۱۲ ، سورۃ یوسف ، الآیۃ : ۲۴ . ② تفسیر الطبری ، سورۃ یوسف ، ج : ۱۲ ص : ۲۳۷ .

③ پارہ : ۱۲ ، سورۃ یوسف ، الآیۃ : ۲۸ . ④ پارہ : ۵ ، سورۃ النساء ، الآیۃ : ۷۶ .

حرکتیں کیوں کرتے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ عورتیں نہیں مانتیں عورتیں ان کے اوپر حکام ہیں کہ آرڈر وہاں سے ہوتا ہے تعمیل کرنے والے یہ ہیں، یہ انہیں چلاتی ہیں بے چاروں کے پاس گنجائش نہیں ہوتی۔ آدمی مبتلا ہو جاتا ہے جیسے حدیث میں فرمایا گیا:

''مَارَاَیْتُ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ'' ① کہ یہ عورتیں کیا ہیں....؟ ہیں تو ناقص العقل مگر بڑے بڑے عقلمندوں کی عقل اُچک لیتی ہیں۔

زلیخا نے دیکھا کہ اب میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میں بدنام ہو جاؤں گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام اصلیت کھول دیں گے تو دوڑ کر خود بھی باہر آئی اور شور مچایا کہ یوسف علیہ السلام بہت برے ارادے سے آئے تھے۔ میں اگر نہ بچتی تو مجھے خراب کر دیا ہوتا۔ لوگ جمع ہو گئے اور اس نے شور مچایا کہ مجھے خدا نے بچایا ان کا ارادہ تو غلط تھا۔ معاذ اللہ، زلیخا کا خاوند بادشاہ مصر نے دیکھا میری بیوی شور مچاتی ہے اور الزام ان پر رکھتی ہے، اس کے دل میں نہیں بیٹھتی تھی مگر اس نے کچھ ایسے اتار چڑھاؤ سے تقریر کی کہ خود بادشاہ کے دل میں بھی آ گئی کہ ممکن ہے یوسف علیہ السلام نے بُرا ارادہ کر لیا ہو! بادشاہ کے حشم و خدم بھی جمع ہو گئے۔ غرض زلیخا کا مقصد یہ تھا کہ میں تو بری ثابت ہوں۔ سارا الزام یوسف علیہ السلام پر آ جائے۔

حق تعالیٰ کو اپنے پیغمبر کی برأت کرنی مقصود تھی، تو ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا﴾ ② ایک چھوٹا سا بچہ جسے کوئی عقل نہ شعور، اس نے کہا کہ دیکھو فیصلہ کی ایک صورت ہے بات کھل جائے گی کہ قصور یوسفؑ کا ہے یا زلیخا کا یوسف کا کرتہ دیکھو اگر آگے سے پھٹا ہوا ہے تو سمجھو کہ یوسف کا قصور ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو زلیخا کا قصور ہے یوسف جب بھاگے تو زلیخا نے کرتہ پکڑا تو وہ پیچھے سے پھٹ گیا تھا دیکھا گیا تو کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا تھا بات کھل گئی کہ قصور زلیخا کا ہے یہ محض مبتلا کرنے کو اور اپنے کو بری ثابت کرنے کے لئے مکر و فریب کر رہی ہے ﴿اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ﴾ ③ جب دیکھا گیا تو کرتہ پیچھے سے پھٹ رہا تھا۔

تو انہوں نے کہا یہ تو زلیخا کی حرکت معلوم ہوتی ہے یوسف سچے معلوم ہوتے ہیں تب عزیز مصر نے معذرت کی کہ ﴿يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۔ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ﴾ ④ ''اے یوسف! درگذر کرو، شرارت زلیخا کی ہے معاف کرو، بات صاف ہو گئی''۔

حضرت یوسف علیہ السلام جیل کیوں کر گئے؟ ......عزیز مصر نے یہ سوچا اگر یونہی کہہ دیا تو میری بیوی تو بدنام ہو گئی، اس واسطے بدنامی سے بچنے کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل خانے میں بھیج دیا کہ دنیا پر واضح ہو کہ قصور

① الصحيح للبخاری، کتاب الحيض، باب ترک الحائض الصوم ج: ۲ ص: ۳. ② پاره: ۱۲، سورة يوسف، الآية: ۲۶. ③ پاره: ۱۲، سورة يوسف، الآية: ۲۷، ۲۸. ④ پاره: ۱۲، سورة يوسف، الآية: ۲۹.

یوسف علیہ السلام ہی کا ہے گھر میں اعتراف کر لیا کہ آپ کا کچھ قصور نہیں مگر پبلک کو دکھانے کے لئے جیل بھیج دیا تا کہ بادشاہ کی بیوی کے بارے میں پروپیگنڈہ غلط نہ ہو۔

جیل پہنچے تو دونو جوان بھی جیل پہنچے جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے، ایک بادشاہ کا باورچی تھا جو کھانا پکاتا تھا اور ایک شراب پلانے والا اس کا انچارج آفیسر تھا ان دونوں پر الزام یہ تھا کہ بادشاہ کو انہوں نے زہر دیا، وہ دونوں بھی جیل خانے میں آئے، یوسف علیہ السلام پہلے سے موجود تھے جیل پہنچ کر ان دونوں ملازموں نے خواب دیکھے جس کا قرآن حکیم نے تذکرہ کیا ہے ﴿قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا﴾ ① ایک نے دیکھا کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں ﴿وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ﴾ ② دوسرے نے دیکھا کہ میرے سر پر ایک ٹوکرا ہے اس میں روٹیاں رکھی ہوئی ہیں اور چیل کوے ان روٹیوں کو کھا کر جا رہے ہیں دونوں ملازم یہ دونوں خواب لے کر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے اور کہا۔

تعبیر خواب ایک مستقل فن...... ﴿نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ﴾ ③ اے یوسفؑ آپ ہمیں خواب کی تعبیر دیں ﴿اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ ④ ہم آپ کو محسن جانتے ہیں آپ علیہ السلام کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ آپ عارف باللہ بھی ہیں کامل بھی ہیں بزرگ بھی ہیں اور عالم غیب سے آپ کا رشتہ بھی ہے خواب غیب کی چیز ہوتی ہے تو جس کا تعلق امور غیبیہ سے ہو وہی خواب کی تعبیر بہتر دے سکتا ہے اس پر غیب کے عالم منکشف ہوتے ہیں حدیث میں فرمایا گیا ہے "لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ" ⑤

دنیا میں نبوت ختم ہوگئی۔ میرے آنے کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ہاں مبشرات باقی رہیں گی یعنی سچے خواب باقی رہیں گے جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں سچے خواب نبوت کا ایک حصہ ہیں جو اکثر و بیشتر ایمان والوں کو نصیب ہوتے ہیں گویا وہ عالم غیب سے ایک رشتہ ہوتا ہے تو خواب چونکہ رموز میں ہوتی ہے، اشارے ہوتے ہیں اور ان اشاروں کو وہ لوگ زیادہ پہچانتے ہیں جن کو غیبی عالم اور معاملات سے مناسبت ہوتی ہے وہ بتلا دیتے ہیں کہ اس اشارہ کا یہ مطلب ہے۔ اس سے یہ واقعہ مراد ہے تو قرآن و حدیث میں اس کے اصول قائم کر دیے گئے تعبیر خواب کی ایک مستقل فن کی صورت اسلام میں ہوگئی۔ بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوئیں جس میں تعبیر خواب کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ بڑے بڑے امام پیدا ہوئے جنہوں نے خواب کی اعلیٰ ترین تعبیریں دی ہیں۔

ایک خواب اور اُس کی تعبیر...... ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ مشہور امام ہیں خواب کی تعبیر دینے کے امام سمجھے گئے ہیں ان کی کتاب "تَاْثِیْرُ الْاَنَامِ فِیْ تَعْبِیْرِ الْمَنَامِ" دو جلدوں میں بڑی ضخیم ہے اس میں اصول اور قواعد خواب کی تعبیر نکالنے کے بیان کئے گئے ہیں اس میں بڑے عجائبات ہیں۔

---

①②③④ پاره: ۱۲، سورة يوسف، الآية: ۳۶.

⑤ الصحيح للبخاری، كتاب التعبير، باب المبشرات، ص: ۵۸۳ رقم: ۶۹۹۰.

بات یاد آ گئی۔ بات تو ذرا طویل ہو رہی ہے لیکن جب پر زبان پر آجائے تو رُکنا بھی مشکل ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک شخص ابن سیرین کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ: حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے آگ کے انگارے دھک رہے ہیں کیا تعبیر ہے؟ فرمایا جلدی جاؤ اور گھر سے بیوی بچوں کو نکال دو... تیرا گھر گرنے والا ہے وہ دوڑا ہوا آیا گھر سے بیوی بچوں اور سامان کو نکالا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد پوری بلڈنگ آپڑی خواب کی تعبیر ہو بہو پوری ہوگئی چار پانچ مہینے کے بعد پھر ایک شخص آیا کہ حضرت میں نے خواب دیکھا ہے، فرمایا کہ: میری چار پائی کے نیچے انگارے دہک رہے ہیں وہی خواب جو پہلے نے بیان کیا تھا فرمایا جا کر کھدائی شروع کر خزانہ نکلے گا چار پائی کے نیچے سے لاکھوں روپے کی تعداد کا سرخ سونا نکلے گا، اس نے آکر کھدائی شروع کی تو بڑی بھاری دیگ نکلی جس میں زرِ خالص اور سونے کے ٹکے بھرے ہوئے تھے لوگوں نے ابن سیرین سے عرض کیا کہ: خواب دونوں نے ایک دیکھا ہے ایک کا آپ نے گھر گروا دیا اور ایک کو لاکھوں روپے دلوا دیے، کیا بات ہے؟ فرمایا کہ: پہلے شخص نے جو خواب دیکھا تھا، وہ موسم گرما تھا۔ گرمی کے موسم میں چار پائی کے نیچے آگ ہونا یہ بنیاد کا منہدم ہونا ہے اس لئے میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر پڑے گا اور دوسرے نے یہ خواب سردی کے موسم میں دیکھا اور سردی میں چار پائی کے نیچے انگاروں کا ہونا یہ عظیم ترین نعمت ہے اور آگ کی صورت خالص سونے کی ہے تو میں نے یہ تعبیر دی کہ سونا نکلے گا تو خواب یکساں مگر تعبیر الگ الگ اس سے معلوم ہوا کہ خواب دیکھنے میں موسموں کو بھی دخل ہے یہ نہیں کہ خواب کے لفظ سُن کے جس طرح چاہیں تعبیر دیں، یہ تو ایک مستقل فن ہے اس میں موسموں کی بھی رعایت ہوتی ہے اور اصول کی بھی......

دوسرا خواب اور اس کی تعبیر...... حضرت قاضی محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قاضی القضاۃ تھے بھوپال میں اور نواب صدیق حسن خان (مرحوم) کا زمانہ تھا یہ اہل حدیث تھے اور بڑے عالم تھے ان کی بہت سی بڑی بڑی کتابیں اور تصانیف ہیں قاضی صاحب تعبیر میں بڑے مشہور تھے بڑے اعلیٰ درجہ کے معبر تھے، خواب کی جو تعبیر دیتے وہ ہاتھ واقعہ کی صورت میں آجاتی۔

ایک نوجوان نے یہ خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑی جماعت نماز کے لئے کھڑی ہوئی ہے اور صفِ اولیٰ میں ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام ہیں نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ ہزاروں لاکھوں آدمی شریک ہیں اس کے ذہن میں یہ تھا کہ اس میں کوئی نواب صاحب کی فضیلت نکلے گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کریں۔

قاضی صاحب نے فرمایا کیا واقعی تو نے یہ خواب دیکھا ہے؟ بناوٹی تو نہیں؟ اس نے کہا نہیں حضرت واللہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے فرمایا کہ: اگر تو نے یہ خواب دیکھا ہے تو نواب صدیق حسن خان کا انتقال ہو چکا ہے، یہ اس کی تعبیر ہے، یہ کہہ رہے ہیں تھوڑی دیر میں سرکاری طور پر اطلاع آئی کہ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا ہے عرصہ سے بیمار چلے آرہے تھے ہاتھ کے ہاتھ تعبیر صحیح ہوگئی۔ اس پر ماتمی طریق سے جتنے سرکاری لوگ تھے، بھوپال کی

طرف دوڑ گئے کفن دفن میں شریک ہوئے تین دن رسمی طور پر ماتم رہا..... دفاتر بند رہے بہرحال ایک والی ملک تھے جب تین دن گذر گئے تو وہ نوجوان اہل حدیث خواب دیکھنے والا قاضی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت تعبیر تو ہوبہو سامنے آگئی، مگر اس خواب سے آپ نے یہ تعبیر کیسے سمجھی؟ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ نواب صاحب کی اس میں بزرگی سامنے آگئی۔ یہ کیسے آپ سمجھے کہ نواب صاحب کا انتقال ہوگیا.......؟ تو کیا عجیب بات فرمائی، فرمایا کہ: نبی کی موجودگی میں کسی کو امام بننے کا حق حاصل نہیں ہے کہ آگے بڑھے، یہ نبی کا حق ہے، پھر بھی نبی کی موجودگی میں جو آگے ہوگا وہ جنازہ تو ہوسکتا ہے زندہ کو حق نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھے اس لئے میں نے یہ تعبیر دی کہ ان کا انتقال ہوگیا، زندہ ہوکر وہ نبی کے سامنے نہیں آسکتے، مردہ ہوکر جنازہ کی صورت میں آسکتے ہیں تو قواعد شرعیہ بھی خواب کی تعبیر دینے میں (ملحوظ) ہوتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا کہ: ہرکس وناکس کے سامنے خواب کا ذکر مت کرو، جو زبان سے نکلے گا وہی اس کی تعبیر ہوجاتی ہے ایسے شخص کے سامنے ذکر کرو جو اصول کے مطابق قواعد کے مطابق صحیح تعبیر دے، اور خواب دیکھنے والے کے حق میں بہتری ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر کیوں چاہی؟......تو یہ بات ان دونوں ملازموں نے سمجھی کہ خواب ہم جیلر کے سامنے ذکر نہیں کرتے یہ جیل حکام خواب کی تعبیر کیا جانیں؟ ان کے سامنے ذکر نہیں کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے پر انوار نبوت برستے رہتے تھے، سب جانتے تھے کہ یہ مقدس ہیں وہ سمجھ گئے کہ یہی تعبیر دے سکتے ہیں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے نہ کسی اور کا ذہن جا سکتا ہے اس لئے کہا کہ: ﴿نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ إِنَّا نَرٰكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ① آپ ہی تعبیر دیں اس لئے کہ آپ کی صورت پر ''احسان'' جھلک رہا ہے احسان کہتے ہیں اس طرح سے اللہ کی عبادت کرو گویا اللہ کو اپنی آنکھوں سے آدمی دیکھ رہا ہے یہ احسان ہے، ہم آپ کو محسن جانتے ہیں آپ ایسے عابد ہیں کہ عبادت میں گویا اللہ آپ کے سامنے ہوتا ہے اتنا حضور قلب کیساتھ آپ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو جو ایسا بڑا عابد زاہد اور متقی ہو وہی خواب کی تعبیر دے سکتا ہے اس لئے آپ ہمیں تعبیر دیں۔

حکمت نبوت اور طریق تبلیغ......اب آگے حکمت نبوت کا ذکر ہے تعبیر دینے بیٹھے مگر یہ نہیں کہا یہ تعبیر ہے، اس پر غور کیا کہ ان دونوں کے دل میں میری کچھ عقیدت پیدا ہوئی اور میرے ساتھ حسن ظن پیدا ہوا جبھی تو خواب کی تعبیر مانگنے آئے، اس عقیدت سے مجھے فائدہ اٹھانا چاہیے، کہ ان کے سامنے دین پیش کروں (ممکن ہے) یہ اس عقیدت مندی میں اسلام قبول کرلیں۔ تو نبی کو طمع یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح لوگ حق پر آجائیں ذرا سی گنجائش دیکھی تو فوراً تبلیغ کرنے کی نیت کی انہیں تبلیغ کرنے کے لئے حیلہ چاہیے۔ اس لئے کہ انہیں بے انتہاء شفقت ہوتی ہے جذبہ یہ ہوتا ہے کہ سارا عالم کسی طرح سے حق کے راستہ پر آجائے۔ تو دیکھا کہ ان دونوں کے دل میں میرا اعتقاد جم گیا ہے اس سے میں تھوڑا بہت فائدہ اٹھاؤں کیوں نہ تبلیغ کروں؟ تو خواب کی تعبیر دینے کی بجائے پہلا جملہ یہ

ارشادفرمایا: ﴿قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا﴾ ① میں تمہارے خواب کی تعبیر دوں گا اور دیر بھی نہیں لگاؤں گا اتنی جلدی تعبیر دوں گا کہ دوپہر کا کھانا نہیں آنے پائیگا......تو فرمایا: دل میں اشتیاق بڑھکر عقیدت بڑھ جائے تو جو میں کہنے والا ہوں دل میں اثر کرے گا یہ قاعدہ کی بات ہوتی ہے اگر کوئی شخص بے پرواہ ہو تو اس کے سامنے وعظ نہیں کرنا چاہیے اس کو فائدہ نہیں ہوگا جو دل سے سننے کیلئے آئے اس کے سامنے کہنا چاہیے وعظ اس کے دل میں اترے گا اثر کریگا تو انبیاء علیہم السلام جب یہ دیکھ لیتے ہیں کہ دل میں صلاحیت پیدا ہوگئی ہے قبول حق کی استعداد آگئی۔اس وقت وعظ کرتے ہیں تو کہا ان دونوں نوجوانوں میں استعداد ہے عقیدت ہے اس عقیدت کو اور زیادہ بڑھا دیا اور وعدہ کیا کہ میں ضرور تعبیر دوں گا۔اور دوں گا بھی جلدی کو دوپہر کا کھانا نہیں آنے پائے گا۔اب وہ مطمئن ہوگئے۔لیکن اب بھی تعبیر نہیں دی وعدہ تو دیدیا جس سے اشتیاق پیدا کر دیا۔

آگے فرمایا ﴿ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ﴾ ② یہ جو میں تعبیر دوں گا یہ محض میرا تخیل نہیں ہوگا کہ اختراع کر کے میں کچھ کہدوں بلکہ میرے پروردگار نے جو میرے اندر (تعبیر) خواب کا علم ڈالا ہے اس علم کی رو سے تعبیر دوں گا اس تعبیر کی رو سے خواب کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوگا۔اگر محض اپنے تخیل سے تعبیر دوں تو بہت ممکن ہے تعبیر واقع نہ ہو۔اس لئے یہ بھی اطمینان دلا دیا کہ تعبیر دوں گا جلدی دوں گا۔اور علم النبی سے دوں گا جس کے اندر کوئی تردد اور شک کی گنجائش نہیں۔تو یہ وہ تعبیر ہوگی جو پروردگار نے میرے قلب میں القاء فرمائی ہے وحی کے ذریعہ یہ واقعہ مجھے بتلا دیا ہے وہ واقعہ میں تمہارے سامنے پیش کردوں گا تو اور زیادہ شوق بڑھ گیا کہ بہترین جگہ ہم آئے ہیں سچے خواب کی سچی تعبیر مل جائے گی بات کھل جائے گی۔دل کی گرہیں کھل جائیں گی۔لیکن اب بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر نہیں دی اشتیاق اور شوق کو بڑھکا دیا تاکہ جو بات میں نے ان کو کہنی ہے اس کیلئے اور زیادہ شوق بڑھ جائے ،تعبیر بعد میں دیکھی جائے گی۔اب وہ سراسر اشتیاق بن گئے کہ کسی طرح ہے جلدی تعبیر دیدیں۔

اپنا تعارف اور فکر آخرت......اسکے بعد یہ فرمایا: ﴿اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ ③ میری شخصیت کو تم پہلے سمجھ لو میری پوزیشن جان لو کہ میں ہوں کون.........؟اس واسطے کہ کتنا بھی اعلیٰ کلام ہو لیکن شخصیت کا اثر پڑتا ہے وہی ایک بات میں کہوں تو اسکی کوئی وقعت نہیں اور وہی بات اگر حکومت کا سربراہ پریزیڈنٹ اور سیکرٹری کہے تو دنیا میں شور مچ جاتا ہے سیاست کی بساط الٹ جاتی ہے قیاس آرائیاں شروع ہوجاتی ہیں وہی جملہ اخبارات میں کہوں تو کوئی بھی نہیں سنتا۔اگر صدر جمہور یہ کہدیں تو دنیا میں پھیل جاتا ہے یہ شخصیت کی وجہ سے لوگ اثر لیتے ہیں،ایسے لوگ کم ہیں جو کلام کو دیکھ کر اثر لیتے ہیں کہ کلام حق ہے لہٰذا ہمیں متاثر ہونا چاہیے معمولی کلام بھی ہوگا تو شخصیت کی وجہ سے اعلیٰ کلام ہوجائے گا تو لوگ شخصیت کو دیکھتے ہیں اس لئے

① پارہ:۱۲،سورۃیوسف،الآیۃ:۳۷. ② پارہ:۱۲،سورۃیوسف،الآیۃ:۳۷. ③ پارہ:۱۲،سورۃیوسف،الآیۃ:۳۷.

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ چاہا کہ جب میں تعبیر دے رہا ہوں تو تعبیر سے پہلے اپنی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی پوزیشن بتلا دوں تا کہ تم سمجھ لو کہ میں کون ہوں۔ تو میرے کلام کا تم پر اثر ہو۔

تو میں وہ ہوں کہ اِنِّیْ تَرَکْتُ الخ کہ میں اس ملت اور قوم کو چھوڑے رہوں۔ اس قوم کے مسلک و مشرب کو چھوڑ دے رہوں جو اللہ و رسول پر ایمان نہیں لاتی۔ نہ آخرت کو مانتی ہے نہ اس کے دل میں کوئی ایمانی جذبہ موجود ہے میں تو اللہ اس کے رسولوں کو بھی مانتا ہوں آخرت کا بھی قائل ہوں کہ مجھے ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے اور دنیا کی زندگی سے ہر ہر فعل عمل اور قول کا جواب دینا ہے میری زندگی کا حساب ہونا ہے مجھے اپنی آخرت کی فکر ہے تو میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو بے فکری قوم ہے جسے آخرت کی کوئی پرواہ نہیں وہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں رہ لیا۔ کھالیا پی لیا عیش اڑالیا اور بات ختم ہوگئی۔

یہ جو کچھ عیش اڑایا جارہا ہے اس سے ایک دن سوال ہوتا ہے۔ ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ ① فرماتے ہیں حق تعالیٰ: ایک وقت آئیگا تم سے سوال کیا جائیگا کہ ان نعمتوں کا حساب دو جو دنیا میں استعمال کر کے آئے ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی اور گرمی کے زمانے میں ٹھنڈا پانی ''نعیم'' میں داخل ہے اس کا حساب ہوگا ② کہ تم نے اس نعمت کو استعمال کیا تو بدلے میں کتنے سجدے شکر کے ادا کئے، اتنے قطرے ٹھنڈے پانی کے استعمال کئے اس کے بدلے میں کتنا شکر ادا کیا ناشکری تو نہیں کی؟ کفران نعمت تو نہیں کیا تو گرمی میں ٹھنڈا پانی اور سردی میں گرم پانی بھی نعیم اور نعمت ہے تو اس سے اوپر کی نعمتوں، کا اندازہ کیجئے ان نعمتوں کے بارے میں کتنے سوالات ہوں گے؟ آخرت کی جب یہ فکر ہوتی ہے تو آدمی نعمتوں کے استعمال میں کچھ پابند ہو جاتا ہے کہ جو نعمتوں کا مالک ہے اس سے پوچھ کر کے استعمال کروں کہ کہاں تک جائز ہے اور کس حد تک نہیں ہے یہ فکر آخرت ہے۔

تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: میری پوزیشن تو یہ ہے میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو بے فکری قوم ہے جس کے سامنے نہ آخرت ہے نہ اللہ کی ذات نہ رسول کی ذات، نہ قیامت کی پیشی اور حاضری کا خطرہ، مجھے تو آخرت کی بھی فکر ہے، اللہ کا بھی معتقد ہوں اس کے رسولوں کا بھی البتہ اس قوم میں سے نہیں جو اللہ و رسول اور آخرت کی منکر ہے اعتقاداً منکر ہے جیسے دھریہ قسم کے لوگ جن کا عقیدہ ہے ﴿مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ③ یہ زندگی تو یونہی چلی آرہی ہے، ختم ہو جائے گی مرجائیں گے تو دوسرے پیدا ہو جائیں گے، اور پیدا ہو جائیں گے تو وہ بھی مرجائیں گے لہٰذا عیش اڑالو، پھر دنیا میں آنا تو ہے نہیں ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

تو یہ وہ کر سکتا ہے جو بے فکر ہو اور جسے یہ فکر ہو کہ میری پوری زندگی دھرائی جائے گی اور آخرت میں پائی

---

① پارہ: ۳۰، سورة التکاثر، الآیة: ۸. ② المعجم الكبير للطبراني، ج: ۱۳ ص: ۱۴۴، رقم: ۱۵۹۱۲.
③ پارہ: ۲۵، سورة الجاثیة، الآیة: ۲۴.

سامنے آجائے گی۔ ذرہ برابر نیکی کی ہے تو وہ بھی سامنے پیش کردی جائے گی ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ ① تو فرمایا کہ: میں تو ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آخرت کے منکر ہوں اعتقادی طور پر...... یا بعض لوگ آخرت پر اعتقاد رکھتے ہیں مگر عمل ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے، بہت سے مومن مسلم بھی ہوتے ہیں جو ایمان کے درجے میں جانتے ہیں کہ آخرت ہے گی مگر قلب پر اثر نہیں ہے، ان کی زندگیاں بتلائی ہیں کہ بے فکری زندگی ہے انہیں بھول کے بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں مرنا ہے قبر میں جانا ہے، حشر میں جانا ہے اللہ کے سامنے کھڑے ہونا ہے گو اعتقاداً وہ منکر نہیں مگر عملاً وہ معاملہ ہے جو منکر کا ہوتا ہے تو یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے نفی فرمادی کہ میں اس قوم میں سے نہیں ہوں جو منکر ہے آخرت کی خواہ اعتقاداً ہو یا عملاً...... میں عملاً بھی مان رہا ہوں اور اعتقاداً بھی تو اب تک خواب کی تعبیر نہیں دی یہ فرمایا کہ: خواب کی تعبیر دوں گا، جلد دوں گا، علم النبی سے دوں گا جو سچی بھی ہوگی اور میری پوزیشن کو سمجھ لو کہ میں اللہ، اس کے رسولوں اور یوم آخرت کا قائل ہوں منکرین میں سے نہیں ہوں۔ اب بھی خواب کی تعبیر نہیں دی بلکہ ایک اور جملہ ارشاد فرمایا......

فرمایا: ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ ② میری پوزیشن کو ذرا اور جان لو، یہ تو منفی بات تھی کہ ان میں سے تو میں نہیں ہوں، جو آخرت کے منکر ہیں تو پھر کن میں سے ہو...؟ اس پارٹی سے تو آپ کا تعلق نہیں لیکن کس پارٹی سے آپ کا تعلق ہے....؟ اب مثبت پہلو سے سمجھایا، فرمایا میں متبع، پیرو اور ماننے والا ہوں اپنے آباؤ اجداد کی بات کا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب علیہم السلام کی بات کا یہ میرے آباء پیغمبروں کی مسند پر تھے، ان کے پاس اللہ کی وحی آتی تھی، جو دین لیکر یہ آئے تھے اسی دین کے اوپر میں ہوں اور دین کا پہلا مطلب یہ ہے کہ مبداء اور معاد کو مانے، مبداء اللہ کی ذات ہے کہ ہماری ابتداء یہاں سے ہوتی ہے اور معاد یعنی لوٹ کے کہاں جانا ہے وہ آخرت ہے اس آنے اور جانے کے بیچ میں زندگی کس طرح گزارے یہ شریعت ہے، تو یہ تین بنیادیں ہیں، جن پر ایمان ہوتا ہے اللہ کی ذات، آخرت اور بیچ میں شریعت، اگر اللہ کو نہیں مانتا تو دین کی بنیاد ہی قائم نہیں ہوسکتی، اللہ کو مانتا ہے لیکن آخرت کو نہیں مانتا تو بے فکری زندگی ہوگی۔ جی ہوا نہ ہوا برابر ہوگیا دونوں کو مانتا ہے شریعت کا قائل نہیں تو عمل نہیں کرسکتا۔ تو تینوں چیزیں لازم ہیں اس کے بغیر آدمی متبع حق نہیں بن سکتا، حضرت یوسف علیہ السلام نے ارشاد کیا کہ: تم سمجھ لو کہ میں کس پارٹی سے متعلق ہوں، وہ جماعت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہے نسباً میں ان کی اولاد ہوں تو نسبۃً بھی ان کے راستہ پر ہوں۔

تین پیغمبروں کے اسمائے مبارکہ ذکر کرنیکی حکمت...... ایک پیغمبر کا ذکر نہیں کیا اکٹھے تین پیغمبروں کا ذکر کیا یعنی میرا راستہ وہ ہے جو نبیوں کے راستہ سے مسلسل چلا آرہا ہے اول تو ایک پیغمبر بھی غلطی پر نہیں ہوسکتا جب کہ

---

① پارہ: ۳۰، سورۃ الزلزال، الآیۃ ۷۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۸۔

دو کا عدد وہ ہے جو بڑے بڑے مقدمات میں بھی فیصلہ کر دیتا ہے۔ ﴿وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ ① شرعی اصول کے مطابق اگر آپ مدعی ہیں تو دو سچ گواہ پیش کر دیں، دعویٰ ڈگری ہو جائے گا قاضی فیصلہ دے دے گا۔ تو جب دو عادل گواہوں کی گواہی سے مقدمات کے فیصلے ہو سکتے ہیں تو دو پیغمبروں کی گواہی سے ایمان کا فیصلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور جب دو سے بھی زیادہ تین ہوں تو خبر متواتر ہو جائے گی۔ پھر تو ویسے ہی انکار کی وجہ باقی نہیں رہتی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بتلا دیا کہ میں اس پارٹی میں سے ہوں اور اس پارٹی میں داخل ہوں جو پیغمبروں کا طبقہ ہے اب گویا ان دو قیدیوں کے دل میں عظمت جم گئی...... پہلے سے عقیدت لے کر آئے۔ شوق دلانے سے شوق بڑھ گیا اور یہ کہنے سے کہ وحی الٰہی سے تعبیر دوں گا اور زیادہ عقیدت پیدا ہو گئی اور یہ بتلانے سے کہ منکروں سے میرا تعلق نہیں برگزیدگی واضح ہو گئی اور یہ کہنے سے کہ پیغمبروں سے میرا تعلق ہے اور زیادہ رشد و کمال اور برکت نمایاں ہو گئی تو کتنا زیادہ اعتقاد پیدا ہو گیا ہو گا۔ ان دونوں قیدیوں کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کو یہی اعتقاد پیدا کرنا مقصود تھا تاکہ آگے جو بات کہوں ان کے دل میں اترتی چلی جائے کوئی شک و شبہ نہ رہے یہ انبیاء علیہم السلام کا خاص طریقہ ہے کہ وہ اس طرح وعظ سے قبل دل میں صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں تاکہ ماننے میں رکاوٹ نہ رہے۔

نصیحت کے لئے متوجہ کرنا...... حدیث میں ایک واقعہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار تھے اور اس پر جو زین تھی اس زین پر میں بھی سوار تھا گویا ایک سواری پر دو سوار آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور میں اتنا قریب ہوں کہ بس بیچ میں ایک کھونٹی تھی جو زین پر لگی ہوئی ہوتی ہے، سواری پر آگے بیٹھنے والا تو لگام پکڑتا ہے اور پیچھے بیٹھنے والا اس کو تھام لیتا ہے تاکہ گرنے نہ پائے تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں زین پر اگلے حصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوار تھے اور پچھلے حصہ میں میں تھا۔ تو آپ نے آواز دی یَا مُعَاذُ! اے معاذ میں نے عرض کیا لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! یارسول اللہ میں حاضر ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یَا مُعَاذُ!'' میں نے عرض کیا: ''لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ!'' یارسول اللہ میں حاضر ہوں تو تیسری مرتبہ فرمایا: ''یَا مُعَاذُ!'' میں نے عرض کیا: ''لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ!'' یارسول اللہ میں حاضر ہوں، تب آپ نے وہ بات فرمائی جو ارشاد فرمائی تھی۔ ② یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت معاذ تو سواری پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہوئے بیٹھے تھے صرف ایک دفعہ آواز دیں تو بات تھی دوبارہ سہ بار کس طرح آواز دیں؟ حالانکہ انتہائی قرب میں ہیں ایک سواری پر سوار ہیں اس طرح سے تین دفعہ پکارنے کا کیا مطلب......؟

علماء یہی لکھتے ہیں کہ تین دفعہ پکارا تاکہ توجہ اور شوق ہو کہ حضور کیا فرمانا چاہتے ہیں تو اس طرح دل میں شوق

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم ص ۱۰

پیدا کر دیا پھر آپ نے وہ بات فرمائی جو کہنی تھی، وہ دل میں اتر تی چلی گئی تو یہ انبیاء علیہم السلام کی حکمت ہوتی ہے کہ دلوں کو ہموار کرنے کے لئے پہلے کچھ باتیں ایسی کرتے ہیں کہ دلوں میں شوق پیدا ہو تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ چار پانچ جملے کہہ کے شوق کو بڑھادیا، اعتقاد کو بھی اُونچا کر دیا۔ اس کے بعد وہ بات کہی جو کہنی تھی اور خواب کی تعبیر اب بھی ذکر نہیں کی...... تو وہ حیلے تلاش کرتے ہیں کہ کسی طرح حق بات ان تک پہنچادیں آگے وہ بات فرمائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا درسِ توحید...... ﴿مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللہِ مِنْ شَیْءٍ﴾ ① ہمارے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ شرک اختیار کریں۔ دو خدا مان لیں یا ایک ہی مان لیں مگر عملاً عبادت میں شریک کریں کہ کچھ خدا کی عبادت کریں اور کچھ غیر اللہ کی سامنے بت رکھے ہوں ان کے سامنے جھکیں اور یوں کہیں کہ یہ تو قبلہ کی مانند ہیں ہم تو اللہ کے آگے جھکے ہیں اور بیچ میں بتوں کا واسطہ ڈال لیں یا یہ کہ خدا ایک ہی مان لیں مگر بہت سے اعمال میں بہت سی چیزوں میں دوسرے خدا کو تسلیم کرلیں کہ چھوٹے موٹے خدا علم دیتے ہیں، اولاد دیتے ہیں بڑا خدا بڑے کام کرتا ہے، آسمان زمین بنانا بڑے خدا کا کام ہے یہ بھی توحید نہیں تو خدا کی ذات یا صفات یا افعال میں کسی کو شریک کرنا یہ توحید کے خلاف ہے انبیاء علیہم السلام جو دین لے کر آئے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ جس کی عبادت کر رہے ہیں اس کی ذات بھی یکتا ہے نہ اس کا شریک ہے نہ ہمسر نہ برابری ہے اس کی صفات بھی لاشریک ہیں اس کی رحیمی کریمی سمع، بصر، قدرت اور حیات ایسی ایسی صفات بھی لامثال ہیں ہم میں حیات عارضی ہے، اس میں حیات اصلی ہے، اس کا وجود ذاتی ہے ہمارا وجود اس کا دیا ہوا ہے ہم چھوٹے افعال کرتے ہیں وہ فعل کرے تو آسمان بنادے، زمینیں بنادے جہاں بنادے، ہم نہ زمین بنا سکیں نہ آسمان بنا سکیں، وہ چاہے چاند سورج ستارے بنادے ہم ایک سورج بھی نہیں بنا سکتے تو موجد وہ ہے ہم موجد نہیں ہیں مصور وہ ہے ہم مصور نہیں ہیں۔

ہماری ایجاد کا حاصل جوڑ اور توڑ ہے یعنی دنیا کے دو مادوں کو ملا کر تیسری چیز بنادی، ایجاد ہوگئی یا ایک چیز کی تحلیل اور تجزیہ کر کے صحیح اجزاء نکال دیے یہ ہماری ایجاد ہوگئی بنے بنائے مادوں کو جوڑتے رہنا توڑتے رہنا یہ ہماری ایجاد کا حاصل ہے انسان کوئی مادہ پیدا کر دیں آسمان و زمین بنادیں یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے تو انسانی ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل ہے دو چیزوں کو جوڑ کر چیز بنالینا یا جڑی ہوئی چیز کو کیمیائی طریق پر الگ کرلینا یہ ''ایجادِ بندہ'' ہے اللہ کی ایجاد ہے کہ شئی نہیں ہے اور از سرِ نو وجود دے دیا، زمین بنائی تو خود بخود بنادی۔

آسمان اعلیٰ مثال کھڑے کر دیے اس کی صفات اس کے افعال بھی بے مثل جن کی کوئی نظیر نہیں وہ جانداروں کو پیدا کرتا ہے، ہم پیدا نہیں کرتے، ہم پرندہ بنادیں گے اس میں پٹرول بھی بھر دیں گے اس کو اڑا دیں گے اس کے اندر حرکت بھی ہو جائے گی مگر حیات اور شعور اس میں نہیں ہوگا اور وہ حرکت بھی ہماری ہوتی ہے اس کی نہیں

ہوتی ہوائی جہاز کو ہم اڑاتے ہیں اور شکل ایسی بنادیتے ہیں جیسے مچھلی کی ہوتی ہے، وہ ہواؤں میں تیرتا ہوا جاتا ہے تو ہوائی جہاز بنایا اس میں پیڑول کی روح پھونک دی جس سے وہ حرکت کرنے لگا، مگر ہوائی جہاز میں کوئی عقل وشعور نہیں یہ حیات نہیں کہلائے گی اس سے زیادہ حیات تو ہم میں ہے وہ ہمارا بنایا ہوا ہے خود اس میں کوئی جان یا علم وادراک نہیں اور حق تعالیٰ جس کو بناتے ہیں اس میں شعور علم وادراک بھی دیتے ہیں تو اصل بنانے والے اللہ ہیں اور ہم نقل محض کرتے ہیں اور وہ بھی شکل کی ہم تصویر بناتے ہیں، صورت بناسکتے ، صورت بناتے ہیں تو اس میں حقیقت نہیں ڈال سکتے تو اصل میں یہ کام اللہ کا ہے۔

بہرحال اس کی صفات بھی بے مثل عقل بھی بے مثل۔ اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [1] فرماتے ہیں حق تعالیٰ: کہہ دو کہ وہ ایک ہے اور ایک کے معنی یہ نہیں کہ ایک تو دوسرا ہے ایسے تو ہم بھی ہیں اس لئے کہ ہم اپنی ذات میں ایک ہی ہیں اور ہمارے اندر تو کوئی دوسرا نہیں احد کے معنی ایک کے نہیں یکتا کے ہیں، اس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں بے مثال اور بے ضد ہے کوئی اس کا کنبہ نہیں کوئی شریک نہیں اللہ الصمد اس کی شان یہ ہے کہ وہ صمد ہے صمد اسے کہتے ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں بندہ صمد نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اسے ہر ہر چیز میں اللہ کی احتیاج ہے، زندہ رہنے میں کھانے میں ارادہ کرنے میں اس کا محتاج ہے دیکھنے میں محتاج، بینائی نہ دے تو دیکھیں کیسے؟ تو مہد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک ہر قدم پر اللہ کے محتاج ہیں اور وہ کسی ذرے کا بھی محتاج نہیں نہ انسان کا نہ کائنات کا وہ چاہے تو جہاں بنادے چاہے تو انہیں مٹادے تو صمد اسے کہتے ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں اور وہ از خود موجود ہو۔ کسی کے دیے سے اس کا وجود نہ ہو تو فرمایا کہ: "لَمْ يَلِدْ" وہ پیدا نہیں ہوا کہ اس کے ماں باپ ہوں "وَلَمْ يُوْلَدْ" نہ اس سے کوئی پیدا کیا گیا کہ اس کی کوئی اولاد ہو جائے اس لئے کہ اولاد ماں باپ کے مشابہ ہوتی ہے نمونہ ہوتی ہے اور جب نمونہ بن گیا تو خدائی باقی نہ رہی خدا وہ ہے جس کا کوئی نمونہ نہ ہو مثال نہ ہو وحدہ لاشریک اگر اس کے اولاد ہو جائے تو اس کی مثال پیدا ہوگئی اگر وہ کسی کی اولاد ہے تو وہ مثال ہے دوسرے کی تو یہ بھی خدائی نہیں ہے۔

تو فرمایا: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ اس لئے کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنے وجود میں اصل کا محتاج ہوتا ہے، ہم پیدا ہونے میں اپنے ماں باپ کے محتاج تھے ماں باپ نہ ہوتے تو ہم پیدا نہ ہوسکتے جو وجود میں دوسرے کا محتاج ہو گیا، وہ خدا کا کیا ہوگا؟ خدا تو کہتے ہیں اس کو جو ذرہ برابر محتاج نہ ہو، غنی مطلق ہو۔

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ نہ اس کا کوئی برابر ہے نہ اس کا کوئی کفو ہے یعنی اس کی بیوی اور رفیقہ حیات بھی نہیں ہے تو نہ بیوی نہ اولاد نہ اس کا باپ نہ وہ خود کسی کا باپ تو ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ میں توحید بتلائی جو ذات ایسی

[1] پارہ: ۳۰، سورۃ الاخلاص۔

خالص ہو کہ ذات میں بھی یکتا صفات میں بھی یکتا اس کے ساتھ شریک کرنا کتنی بڑی بدعقلی کی بات ہوگی تو (حضرت یوسف علیہ السلام) نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ① ہمارے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں جو بے مثال ہے، اس کا کہاں کوئی شریک کہ اس کے ساتھ اُسے شریک کریں۔

ردعیسائیت پر ایک دلچسپ واقعہ...... مجھے واقعہ یاد آیا۔ دارالعلوم دیوبند کا ابتدائی دور ہے دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم کامل عارف باللہ صاحب کشف وکرامت تھے بڑے اکابر اولیاء میں سے تھے ان کے دور میں دارالعلوم کا ایک طالبعلم تھا۔ وہ کوئی منتہی نہ تھا کہ حدیث قرآن پڑھ رہا ہو ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ وہ کہیں ڈیرہ دون چلا گیا وہاں وعظ کہنے لگا، وہاں پر عیسائیوں کے بڑے بڑے چرچ اور اسکول وکالج بھی ہیں وہاں ایک پادری صاحب وعظ کہہ رہے تھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے یہ طالب علم بھی شریک ہوگیا، پادری صاحب کہہ رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کو وہ اپنے طور پر ثابت کر رہا تھا، طالب علم اس سے الجھ پڑا۔ طالب علم نے کہا یہ بالکل غلط ہے خدا کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے؟ اس نے دلائل دینے شروع کئے، اس نے دلائل توڑنا شروع کر دیئے مگر وہ پادری بڑا سمجھدار تھا یہ بے چارہ مبتدی طالب علم تھا، پادری کے سامنے چل نہ سکا، عوام پر اس کا بڑا برا اثر پڑا، عوام کو کیا خبر تھی کہ یہ طالب علم ہے وہ تو یہ سمجھے کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک عالم ہے پادری نے اس کو ہرا دیا اور وہ پادری کے آگے بول نہ سکا۔ اب اس کی تحقیق کون کرتا کہ یہ شرح جامی پڑھتا ہے حدیث وقرآن پڑھا ہوا نہیں ہے۔

قریب میں ایک بھٹیارے کی دکان تھی وہ کھانا بیچتا تھا اس کو بڑی غیرت آئی اس نے کہا ہمارا دارالعلوم دیوبند اور بدنام ہو جائے، وہ دکان سے کود کے آگیا اور طالب علم کو ایک طرف کر دیا اور کہا مولوی صاحب یہاں سے ہٹ جاؤ یہ پادری جاہل ہے اور جاہل سے جاہل نمٹ سکتا ہے عالم کا کام نہیں، اسے میں سمجھتا ہوں اس طالب علم کو بھی غنیمت معلوم ہوا کہ جان چھوٹی آرام تو پایا، وہ بے چارہ پریشان ہو رہا تھا۔ بھٹیارہ آگے آیا اور کہا ہاں جی پادری صاحب! کیا کہتے ہو؟ کہا: ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اچھا آپ یہ کہتے ہو وہ اللہ کے بیٹے ہیں؟ اللہ میاں ان کے باپ ہیں (بھٹیارے نے پوچھا) اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی؟ پادری بولا، بے وقوف اللہ میاں کی عمر! اللہ میاں ازل ابد سے ہیں ان کی عمر کیسے معلوم ہو؟ عمر تو اس کی پوچھ جو پہلے نہ ہو بعد میں ہوگیا ہو اور پھر ختم ہو جائے فلاں تاریخ پیدا ہوا فلاں تاریخ انتقال ہوگیا یہ بیچ میں اس کی عمر ہے جو ازل سے ابدالآباد تک ہے اس کی عمر تھوڑی پوچھی جاتی ہے، یہ تو بڑی بے ادبی کی بات ہے بھٹیارہ نے کہا اتنی لمبی زندگی میں کتنی اولاد ہوئی؟ کہا: ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام، کہا: "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" ارے میں بھٹیارہ باون (۵۲) برس کی عمر میں بارہ بچوں کو جنوا چکا ہوں اور اللہ میاں کی لاکھوں کروڑوں اور اربوں کھربوں سال عمر اور ایک اولاد، بارہ

اولاد تو صرف میری ہوگئی، یہ ہٹے کٹے جوان سب سامنے پڑے ہوئے ہیں، اب پادری غریب کے پاس اس کا کیا جواب تھا، وہ کچھ کہنے لگا عوام نے کہا بھائی ٹھیک تو کہہ رہا ہے بھٹیارہ بے چارہ جب اتنی بڑی عمر ہے تو اربوں کھربوں سال اولاد ہونی چاہیے لے دے کے صرف ایک اولاد، یہ تو انسانوں میں بھی عیب کی بات سمجھی جاتی ہے کہ عمر تو ہو سو برس اور لے دے کے بچہ ایک پیدا ہو لوگ کہیں گے کس چکی کا کھایا تو نے؟ کوئی جان بھی ہے تیرے اندر یا نہیں؟ تو اتنی لمبی عمر ازل سے ابد تک، طاقت دیکھو تو لامحدود اور بیٹا کل ایک تو عوام پر اتنا اثر ہوا کہ لوگوں نے تالیاں پیٹ دیں کہ ہار گیا پادری اور وہ بے چارہ چلا رہا ہے کہ بات تو سنو لوگوں نے کہا تو جھوٹا ہے تیرے سے جواب نہیں بن رہا ہے غرض مسلمان مناظرہ جیت گئے اور اشتہار دے دیا کہ پادری صاحب ہار گئے اور مسلمان جیت گئے..... خیر مجھے بات یہ کہنی تھی کہ یہ واقعہ حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو مولانا نے فرمایا بیٹھیارے نے یہ جواب بڑا عالمانہ دیا مگر اس کے پاس علمی الفاظ نہ تھے بات جو کہی وہ بڑی علمی ہے۔

تو فرمایا کہ: اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر اللہ کے لئے اولاد ہونا کوئی کمال کی بات ہے تو اللہ پاک کا ہر کمال لامحدود ہوتا ہے تو اولاد بھی بے انتہا ہوتی کہ کوئی گنتی نہ ہوسکتی، اور اگر اللہ کے لئے اولاد کا ہونا کمال نہیں تو ایک بیٹا ہوگا وہ بھی عیب ہوگا تو ایک اولاد سے بھی بری ہے تو فرمایا یہ مطلب تھا بھٹیارے کا مگر اس کے پاس علم کے لفظ نہیں تھے بے چارہ نے اپنے جاہلانہ انداز میں بات کہی مگر بات سچی کہی۔

تو اس کو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ① کہ ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ جیسی برتر مقدس اور بے مثل ذات کے ساتھ شریک کریں، اعتقاد یا عبادت میں شریک کریں عبادت میں شریک نہ کریں تو افعال میں شریک کریں۔

آغازِ شرک...... یہی وجہ ہے کہ اسلام نے شرک کا انتہائی طور پر رد کیا ہے اور مذاہب جو حق ہیں ان میں بھی شرک کا رد ہے مگر اسلام نے فقط شرک کا ہی رد نہیں کیا بلکہ اسباب شرک کو بھی دفع کیا ہے تو اور مذاہب نے شرک کا مقابلہ کیا اسلام نے جتنے شرک کے اسباب تھے ان کا بھی مقابلہ کیا کہ شرک آنے ہی نہ پائے مثلاً تصویر ہے شرعاً اس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ شرک کی ابتداء تصویر سے ہوتی ہے تو ہر تصویر سے منع کیا گیا کہ تصویر مت لو اور مت بناؤ اپنی تصویر...... ایک تو مجبوری کی بات ہوتی ہے کہ جب آپ حج کو جا رہے ہیں، بغیر تصویر کے پاسپورٹ قابل قبول نہیں یہ آپ کا فعل نہیں آپ مجبور ہیں یا تو فرض ترک کر دیں یا فرض کی ادائیگی کرنی ہے تو تصویر کھینچوانی پڑے گی بعض باتیں ممنوع ہیں جیسے جہاد ہو اور مجاہدین میں کچھ جہلاء ہوں وہ باجے گانے بجائیں تو اس میں علماء کو بھی شامل ہونا پڑے گا جہاد کا فریضہ نہیں چھوڑیں گے تو بعض صورتیں ہوتی ہیں۔ مجبوری کی مگر اس میں بھی جنس ممنوع رہتی ہے صرف بعض مخصوص صورتوں میں فقہاء نے جواز کا فتوے دیا ہے وہ مجبوری کی شکلیں ہیں جو پیش آتی

ہیں غیر جاندار کی تصویر میں کوئی حرج نہیں جیسے سبزی ہے پہاڑ ہے دریا ہے لیکن بلاضرورت بلا مجبوری خود بخود تصویر کا شوق رکھنا یہ شرک کی عادت پیدا کرتا ہے۔

یہیں سے شرک کا آغاز ہوا ہے قرآن کریم نے بتلایا ہے کہ سب سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم سے شرک شروع ہوا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں ہابیل اور قابیل میں سے قابیل نے اپنے بھائی کو ناحق قتل کیا تھا قابیل کی ساتویں پشت سے کفر ظاہر ہوا، اس قتل، ناحق پر اللہ نے لعنت کی تو اس کی نحوست کا اثر ساتویں پشت تک گیا تو قابیل کی نسل میں ساتویں پشت میں جا کر شرک پیدا ہوا اور جتنی قاتل قومیں ہیں وہ اکثر وبیشتر قابیل کی اولاد میں سے ہیں حضرت نوح علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے اس قوم میں پانچ بزرگ تھے، جن کا نام قرآن میں ہے۔

وَدّ، سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر یہ پانچ صالح بندے تھے انکی مجالس میں بیٹھ کر قوم کا علم وایمان تازہ ہوتا تھا ان کی ہدایت سے نیکی کی طرف توجہ ہوتی تھی جب ان بزرگوں کا انتقال ہوا قوم نے ماتم منایا کہ صالحین اٹھ گئے، اب کن کی مجلس میں جائیں اور کن سے ہدایات حاصل کریں۔ شیطان نے دل میں یہ بات پھونک دی کہ وہ بزرگ تو چلے گئے اچھی صورت یہ ہے کہ ان کے بت بنا کر اپنی عبادت گاہوں میں رکھ لو، تا کہ ان کی شکلیں دیکھ کر تمہیں خدا یاد آئے اور دل میں ذکر اللہ پیدا ہوتا رہے، تو انہوں نے ان پانچوں بزرگوں کے بت تراشے اور مساجد وعبادت گاہوں میں رکھ دیئے مقصد یہ نہیں تھا کہ شرک کریں مقصد یہ تھا کہ ان کی صورتیں دیکھ کر وہ مجلس یاد آجائیں گی اور دل میں ایمان تازہ ہوگا تو ہم اچھی طرح عبادت کر سکیں گے۔

چنانچہ ابتداء کی نسل یہی کرتی رہی۔ اس نے قطعاً بت پرستی نہیں کی بتوں کو تذکیر اور یاد دہانی کا آلہ بنایا۔ دوسری نسل جب آئی اس کے ذہن میں یہ معرفت نہیں تھی جو پہلی میں تھی تو اس نے کچھ کچھ ان بتوں کی تعظیم کی اور عبادت اللہ کی کرتے رہے۔ تیسری نسل میں آکر ان بتوں ہی کے سامنے سجدہ شروع ہو گیا منتیں مانی جانے لگیں، نذر ونیاز ہونے لگے اب خدا کو تو بھول گئے اور ان پانچ بتوں کے بندے بن گئے عبادت نیاز ان بتوں کی، ان کے سامنے سجدہ کرنا، ان سے مرادیں مانگنا ان سے اولاد کی خواہش کرنا اب یہ شروع ہو گیا۔ یہی شرک کا آغاز ہے جس کی اصلاح کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا گیا تو بت پرستی کا آغاز تصویر سازی سے ہوئی! اس لئے اسلام نے سرے سے شرک کی جڑ اکھاڑ دی کہ مسلمان اس سے کوئی مناسبت پیدا نہ کرے کوئی مجبوری پیش آئے، عالم فتوے دے تو گنجائش ہے لیکن شوق اور شغف سے ممنوع ہے مکانات کی زینت تصویر بن جائے اور اخبارات کی بھی بن جائے اور اس درجے پر پہنچ جائے کہ چاقو پہ تصویر قلم پہ تصویر چمچے پر تصویر، لیٹر پر، تمغہ وسکہ پر تصویر یہ انتہائی طور پر تصویر سازی اور تصویر بازی ہے اس سے شریعت نے روک دیا اس لئے کہ یہ شرک کا سبب بنا ہے تو اسلام نے ان اسباب کو قطع کر دیا جن سے شرک کی طرف توجہ منعطف ہو۔

تصویر سازی پر ایک شبہ کا جواب ...... اب آپ یہ کہیں گے کہ مثلاً عیسائیوں میں تصویر سازی ہے مگر بت

پرستی نہیں ہے تو پھر تصویر سازی سے بت پرستی کہاں پیدا ہوئی؟ ہم بھی اگر گھر میں تصویریں ٹانگ لیں اور بت پرستی نہ کریں تو کیا حرج ہے...؟

اول تو یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ عیسائیوں میں بت پرستی نہیں حضرت عیسےٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصاویر گرجاؤں میں ہوتی ہے یہاں تو دیکھنے میں نہیں آئیں مگر ایسٹ افریقہ جانا ہوا، وہاں پر غالباً رومن کیتھولک پارٹی کے عیسائی زیادہ ہیں چرچ بھی بہت ہیں۔ ہر ہر گاؤں اور شہر میں چرچ ہے وہاں میں نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت جگہ جگہ بنا ہوا ہے تو جب وہاں سے گذرتے ہیں تو جھک کر گذرتے ہیں یہ عبادت نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر یہ کہ جو تصویر بنائی ہے یہ ضروری تو نہیں کہ بعینہ وہی صورت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تھی یہ تو فرضی طور پر بنالی کہ یہ بنا کے رکھ دو اور یہ فرض کرلو کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ورنہ اس کی کیا سند ہے کہ یہ بعینہ وہی شکل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت مریم علیہا السلام کی تھی اور جب نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صورت نہیں نام ہی نام ہے اسی کو قرآن نے فرمایا ہے۔

﴿اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ ① یہ بتوں پر نام رکھ لئے ہیں کہ یہ فلاں ہے حالانکہ یہ صورت ان فلاں کے مطابق نہیں ہے تو فرضی ناموں کی عبادت کر رہے ہو ہوائی عبادت ہے تمہارے سامنے نہ کوئی شخصیت ہے نہ کوئی معبود ہے اسماء اور نام رکھے ہوتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ ②

ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم شرک اختیار کریں اللہ کا سہیم اور شریک بنا کر اس کی عبادت کریں اور یہ بھی فرمایا کہ: یہ شرک سے بچنا عقل کا ثمرہ نہیں ہے یہ تو جب اللہ کا فضل ہوتا ہے تو آدمی اس برائی سے بچتا ہے محض عقل برائی سے نہیں بچا سکتی بڑے بڑے عقلمند بھی مشرک گزرے ہیں آج بھی شرک کرنے والے بڑے دانا بڑے عقلمند ہیں دنیا کی حکومتوں کے معاملات ان کی عقلوں پر طے ہوتے ہیں اور وہ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں بت پرستی میں مبتلا ہیں۔

توفیق خداوندی پر ایک واقعہ...... مجھے بات یاد آئی ایک صاحب کے ہاں ایک بوڑھا شخص ملازم تھا، اس کے آقا کی تو یہ حالت تھی کہ نہ کبھی مسجد میں گئے اور نہ کبھی کوئی سجدہ کیا۔ ایک دن آقا بازار گئے تو اس بوڑھے ملازم کو ساتھ لیا تاکہ جو سامان خریدیں وہ ملازم کے سر پر لادیں وہ گھر پہنچائے، راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت آ گیا، اذان ہوئی تو بوڑھے نے کہا، صاحب! میں تو نماز پڑھنے جاتا ہوں، وہ بڑے خفا ہوئے کہ یہ بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، نماز کے سوا اور بھی اسے کوئی کام رہ گیا ہے؟ وہ بے چارہ تلملایا اس نے کہا بہر حال صاحب آپ آقا ہیں جو چاہیں کہہ لیں مگر مجھے نماز تو پڑھنی ہے وہ نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوا، ا

در آقا مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوگئے، وہ مسجد کے اندر داخل نہیں ہوئے بوڑھے نے فرض ادا کئے اس کے بعد سنتوں کی نیت باندھی سنتوں کا سلام پھیرا تو آقا کو خیال آیا کہ اب آجائے گا اس نے اوابین کی نیت باندھ لی اب انہیں باہر کھڑے پریشانی بڑی مشکل سے صبر کیا جب دو رکعتوں پر سلام پھیرا تو زور سے کہا ارے بھائی جلدی سے آؤ اس نے کہا جی مجھے آنے نہیں دیتے یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی آقا پھر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

جب اس نے دوسری دو رکعتوں کا سلام پھیرا تو کہنے لگا جلدی کیوں نہیں آتا کہ ''جی مجھے آنے نہیں دیتے'' یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی، اب انہیں غصہ آرہا ہے کہ یہ عجیب بے ڈھنگا ملازم میرے کام کا حرج ہو رہا ہے، وقت ضائع ہو رہا ہے اور یہ کہے جا رہا ہے کہ آنے نہیں دیتے جب چھ رکعت پر سلام پھیرتو اس نے کہا ''کون نہیں آنے دیتے''؟ اس نے کہا جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے تو حقیقت یہ ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ اپنے جذبے سے نہیں وہ خدا کی توفیق سے پڑھتا ہے اگر توفیق نہ دیں تو لاکھوں عقلمند مارے مارے پھرتے ہیں انہیں سجدہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی، تو سجدہ نہ کرنے والا یہ نہ سمجھے کہ وہ سجدہ نہیں کر رہا بلکہ اس سے کرایا نہیں جاتا اور جو سجدہ کر رہا ہے وہ خود سے نہیں کر رہا ہے اسے قبول کرلیا گیا ہے اس سے سجدہ کرارہے ہیں عبادتیں کرارہے ہیں تو عبادت کا چھوڑنے والا یہ نہ کہے کہ میں نے عبادت چھوڑ دی، اس کی کیا مجال تھی کہ وہ چھوڑتا اسے قبول نہیں کیا گیا سے دھتکار دیا گیا اس واسطے وہ عبادت نہیں کرتا اور جو کر رہا ہے۔ وہ اپنی عقل اور جذبے کا ثمرہ نہ سمجھے یہ تو توفیق خداوندی ہے شکر کرے کہ وہ پکڑ نہیں کرتے تو اس بوڑھے نے ٹھیک کہا جو تجھ کو مسجد کے اندر نہیں آنے دیتے، وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتے۔ تو یہ اس کی توفیق ہے ایک کو دے دی اس نے نماز پڑھ لی اور جس کو نہیں دی وہ نماز کا تارک ہوگیا تو آدمی نیکی کر کے کبھی غرور نہ کرے کہ میں نے نیکی کی ہے۔

غرور اعمال کو ضائع کر دیتا ہے...... حدیث میں ہے اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی ہے میں نے روزہ رکھا ہے تو حق تعالیٰ فوراً جواب دیتے ہیں، نامعقول تو نے کیا کیا......؟ ارے جاہل قوت تو تجھے میں نے دی ارادہ تیرے اندر میں نے پیدا کیا طاقت تجھے میں نے بخشی تو نے کیا کیا....؟ اور اگر سب کچھ کر کے کوئی یوں کہتا ہے اے اللہ مجھ سے تو کچھ بھی نہ بن پڑا بس جو کچھ ہے تیرا فضل ہے اگر تو فضل نہ فرماتا میں نیت بھی نہ کر پاتا میں ارادہ و عمل بھی نہ کر سکتا۔ یہ تیرے کرائے کر رہا ہوں میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ تو اس کو سراہتے ہیں فرماتے ہیں ارادہ تو تو نے ہی کیا تھا نیت تو تو نے ہی کی تھی، مسجد تک تو تو ہی گیا تھا تو نے سب کچھ کرلیا تو جو خود کہتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہے اسے رد کر دیتے ہیں اور جو سب کچھ کر کے کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا میرے سے کچھ نہیں بن پڑا، فضل تھا...... حق تعالیٰ فرماتے ہیں بیشک فضل تو ہمارا تھا مگر کام تو نے کیا ارادہ تو نے کیا تو اس کی نیکی کو سراہتے ہیں تو اسلام میں جو کام چلتا ہے فضل خداوندی سے چلتا ہے عقل و جذبہ کام نہیں دیتا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لَنْ يُنْجِيَ اَحَدَكُمْ

عَمَلُهٗ‘‘ تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ آخرت میں نجات فضل خداوندی سے ہوگی اس پر حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ’’وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!‘‘ یارسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ پیغمبر کا عمل کتنا وزنی اور کتنا عظیم ہوتا ہے تو آپ کا عمل؟ فرمایا: ’’لَآ اِلَّآ اَنْ یَّتَغَمَّدَ نِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ‘‘ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا ① جب تک اللہ ہی کا فضل شامل حال نہ ہو تو حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ بھی نجات وتوفیق ہے فضل خداوندی سے ہے ہمارا عمل نجات نہیں دلائے گا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب..... مگر بھائی ایسا مت کی جیو کہ جب نجات فضل خداوندی سے ہوتی ہے تو پھر آج سے عمل چھوڑ دیں عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے جب فضل ہو جائے گا نجات ہو جائے گی عمل تو نجات نہیں دلائے گا۔

ایسا مت کرنا! بلاشبہ اللہ کے فضل سے نجات ہوگی ہمارے عمل سے نہیں مگر ہمارا عمل اللہ کے فضل کی علامت ہے عمل کرنے والا جب عمل کر رہا ہے تو یہ اللہ کا فضل متوجہ ہونے کی دلیل ہے عمل اگر چھوڑ دیا تو یہ علامت ہوگی کہ اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے تو نجات تو فضل سے ہوگی عمل سے نہیں ہوگی مگر عمل کا ہونا اللہ کے فضل کے متوجہ ہونے کی دلیل ہے بلا فضل ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے۔ ②

آدابِ دُعا..... اس کی حکمتوں اور اس کی شان کے پہچاننے والے انبیاء ہیں اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے توجہ دلائی کہ تمہارا کام یہ ہے کہ مانگو تو اللہ سے مانگو، حکمت اور ڈھنگ سے مانگو، اس طرح مت مانگو جو اس معبود کی شان کے مناسب نہ ہو۔ لاچی ماری بات وہاں نہیں چلتی، بے پرواہ کی بھی وہاں نہیں سنی جاتی ’’لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ‘‘ ③ دل کو متوجہ کر کے اللہ کو حاضر وناظر اور اپنے کو بے چارہ سمجھ کر اور اس یقین کے ساتھ کہ لے کے ہٹوں گا، ویسے نہیں جاؤں گا، اس سے مانگے یعنی استغنا کے ساتھ نہ مانگے، اس طرح مانگنے سے ممانعت کی گئی ہے۔

’’یَارَبِّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ‘‘ اللہ میاں! اگر آپ چاہیں تو میری مغفرت کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تو نہیں چاہتا آپ کا جی چاہے تو بخش دیجئے گا مجھے تو آپ کی مغفرت کی ضرورت نہیں ہے تو یہ مانگتا ہے یا اپنے استغناء کا اظہار کرتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ: ان شئت، اے اللہ اگر تو چاہے کا کیا مطلب؟ یوں کہو رَبِّ اغْفِرْلِیْ اے اللہ بخش دیجئے وہ تو جبھی بخشیں گے، جب چاہیں گے مگر تم کون ہو یہ کہنے والے کہ اگر آپ چاہیں اس کا مطلب تو یہ نکلا کہ میں تو نہیں چاہتا، آپ کا جی چاہے تو دے دیں نہیں تو میں مستغنی ہوں یہ مانگنے کا ڈھنگ نہیں اس سے تو

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ رقم: ۵۹۸۲. ② یہاں تقریر کا کچھ حصہ فنی خرابی کے باعث ریکارڈ نہ ہوسکا اس لئے وہ ضبط تحریر میں نہ آسکا ﴿مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ﴾ (پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۸) کا بیان ہو چکا ہے آگے ﴿ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ﴾ (پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۳۸) کا بیان ہے، درمیان میں رہ جانے والا حصہ زیادہ نہیں ہے، تاہم اس پر مرتب بھی معذرت خواہ ہے۔

③ السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۸۳.

غنا ملے گی مُراد تھوڑا ہی ملے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جیسے ایک اعرابی نے دعاء مانگی تھی "ارحمنی ومحمد او لاترحم معنا احداً" یا اللہ میری مغفرت کر دے اور کسی کو نہ کی جیو پورے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا" ① بندہ خدا یہ کوئی مانگنے کا ڈھنگ ہے لامحدود رحمت کو سمیٹ کر تو نے صرف اپنے لئے کر لیا اور ساری دنیا کو محروم کر دیا، اپنے لئے بھی مانگو مگر دوسروں کو کیوں محروم کرتے ہو......؟

یا جیسے ایک اور اعرابی نے دعا مانگی تھی "اَللّٰهُمَّ هَبْ لِيَ الْقَصْرَ الْاَبْيَضَ فِي الْجَنَّةِ" ② یا اللہ مجھے جنت میں سفید محل دیجیو وائٹ ہال مجھے عطا کر دیجئے یہ دعا مانگی آپ نے فرمایا کہ: یہ کیا دعا ہے کہ وہ اس رنگ کا ہو کرسیاں ایسی ہوں فرنیچر ایسا ہو گویا اللہ میاں کو مشورہ دے رہے ہو، یہ مانگنے کا ڈھنگ نہیں ہے بہرحال دعاء کے آداب سکھائے گئے، انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مانگنے کے ڈھنگ کون جانتا ہے اس واسطے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: جو خالق ہے وہ حاکم بھی ہے اسی کے حکم کا اتباع کرنا پڑے گا مانگنے میں، سوال میں، استعانت میں مدد چاہنے میں بھی، اب یہ وعظ جو حضرت یوسف علیہ السلام نے سنایا تو ان دونوں جوانوں کے دل میں اثر کر گیا اور انہوں نے ایمان قبول کر لیا، یہی مقصد وعظ تھا۔

خواب کی تعبیر...... جب مومن بن گئے تو اب تعبیر بتلا دی کہ یہ خواب کی تعبیر ہے اور فرمایا: جس نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اس کی خطا معاف کی جائے گی وہ بدستور بادشاہ کا شراب پلانے والا رہے گا اور جس نے یہ دیکھا ہے کہ سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے اور چیل کوے کھا کھا کے جا رہے ہیں وہ باورچی ہے اس کو پھانسی دیجائیگی، چنانچہ یہی ہوا جیل سے دونوں لیجائے گئے اور عدلیہ میں پیش ہوئے تو ایک کو بخش دیا گیا اور بخش کر اس کی ملازمت بحال کر دی گئی اور ایک کو پھانسی دے دی گئی مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصد حاصل ہو گیا تھا کہ دونوں مومن ہو گئے تھے اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا وَّاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ . قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ﴾ ③ ......ایک کی خطا معاف اور ملازمت بحال کر دی جائے گی اور ایک کو پھانسی ہو گی اور چیل، کوے اس کو نوچیں گے، بات پکی ہو گئی، اب ردّوبدل نہیں ہو گا جو تعبیر مانگتے تھے وہ ہو گئی۔

باہمی خیر خواہی میں آخرت کا تقدم...... تو تعبیر دی مگر درمیان میں اتنا وعظ اتنی نصیحت فرما دی کہ دلوں کا رشتہ

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب الارض يصيبها البول ج: ۱ ص: ۴۶۲.

② لم اجد هذه الرواية بهذا السياق الا ان الامام ابا داؤد اخرجه في سننه بلفظ: ان عبدالله بن مغفل سمع ابنه يقول: اللهم انی اسئلک القصر الابيض عن يمين الجنة، کتاب الطهارة، باب الاسراف فی الماء ج: ۱ ص: ۱۳۴.

③ پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۴۱.

درست فرمایا۔ دلوں میں ایمان پیدا کر دیا تو انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ وہ کلمۂ حق پہنچانے کے لئے حیلے تلاش کرتے ہیں..... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کی طرف مبعوث ہیں آپ اور ساری اُمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے آپ کو حرص تھی کہ ساری دنیا اسلام قبول کر لے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شفقت سے چاہتے تھے کہ ایک ایک آدمی کلمۂ حق کا تابع بن جائے تو جب یہ ساری امت مل کر قائم مقام، تابع اور خلیفہ ہے اپنے پیغمبر کی تو ہمارا فرض ہے کہ ایک دوسرے کی خیر خواہی میں ہر وقت مگن رہیں اور دنیا سے زیادہ ایک دوسرے کی آخرت کی خیر خواہی ہے کسی سے بُرائی سرزد ہوا سے پیار سے سمجھایا جائے، شفقت سے بتلایا جائے لڑائی کی صورت نہ پیدا کی جائے، سخت دلی سے نصیحت نہ کی جائے، وہ موثر نہیں ہوتی۔

طرزِ نصیحت کیسا ہو؟..... محبت اور اس جذبے سے نصیحت کی جائے کہ کسی طرح قبول کرلے بعض اس جذبے سے نصیحت کرتے ہیں کہ میرا فرض ادا ہو جائے یہ چاہے جہنم میں جائے یا جنت میں یہ نصیحت کا طرز نہیں انبیاء علیہم السلام اس طرح نصیحت نہیں کرتے وہ تو یہ چاہتے ہیں جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ کسی طرح مان جائے، کبھی لالچ دیتا ہے، کبھی گھورتا ہے، کبھی مارتا پیٹتا ہے، باپ کا یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ میں نصیحت کر دوں، اب یہ چاہے جنت میں جائے یا جہنم میں، چاہے بدنام ہو برباد ہو، مجھے پرواہ نہیں! وہ تو یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ سیدھے راستے پر آ جائے یہی انبیاء کی شان ہے وہ اپنے کو ذمہ سے بری کرنے کیلئے نہیں بلکہ مخلوق کو راہ ہدایت پر لانے کے لئے نصیحت کرتے ہیں تو کبھی ڈراتے ہیں کبھی پیار کرتے ہیں کبھی دنیا کا لالچ اور کبھی آخرت کی نعمتوں کا لالچ کہ کسی طرح بندہ مان جائے تو جو امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اس کا بھی یہی فرض ہے کہ ایک دوسرے کو نصیحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے تا کہ امت کا راستہ صحیح ہو جائے، یہ نہ ہو کہ ہم کسی کو برائی میں دیکھیں اور کسی وقت بھی اُسے متنبہ نہ کریں ایسا ہوگا تو ساری امت کے لئے تباہی اور بربادی کا باعث ہوگا، کسی نہ کسی وقت موقع پا کر شفقت سے سمجھا دیا جائے کہ بھائی تیرے اندر یہ برائی ہے اسے چھوڑ دو، وہ آج نہیں تو کل کل نہیں تو کبھی تو مانے گا تو مایوس بھی نہیں ہونا چاہیے اور سختی سے بھی پیش نہ آنا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ بڑے ولی کامل محدث اور عالم کبیر گزرے ہیں مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے ایک نوجوان آیا۔ جلدی جلدی وضو کی تو پاؤں کے ٹخنے خشک رہ گئے، پیر دھوئے مگر ایڑیاں خشک رہ گئیں اور حدیث میں ہے کہ۔

''وَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ'' (1) جو ایڑی خشک رہ جائے گی جہنم میں جلے گی......شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نصیحت کی مگر کس عجیب طریق سے نصیحت فرمائی.... یہ نہیں کہا او نوجوان! تیری وضو نہیں ہوئی، جا وضو کر اور

(1) الصحيح للبخارى، كتاب العلم، باب من رفع بالعلم صوتاً ج: ١ ص: ١٠٥ .

تیری ایڑیاں جہنم میں جلیں گی..... فرمایا: بیٹا! ذرا میرے پاس آنا وہ نوجوان آیا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھا، فرمایا بیٹا میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور وضو کرنے میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایڑیاں خشک رہ جاتی ہیں اور حدیث میں فرمایا گیا ہے جو ایڑی خشک رہ جائے گی جہنم میں جلائی جائے گی۔ تو ذرا میرا پیر دیکھنا کہیں ایڑی خشک تو نہیں رہ گئی وہ نوجوان رو پڑا اور اس نے کہا حضرت آپ کی ایڑی تو کیوں خشک ہو یہ گناہ تو مجھ سے سرزد ہوا ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ کبھی ایسا نہیں ہو گا وضو مکمل کیا کروں گا،...... پھر چپکا یا پیار کیا فرمایا: جزاک الله بارک الله سعادت مند نوجوانوں کا یہی کام ہوتا ہے اس کا دل بڑھ گیا...... اور اگر یوں فرماتے او نوجوانوں! جاؤ وضو کر تیری ایڑی جہنم میں جلے گی، وہ کہتا جناب، مجھے اپنی قبر میں سونا ہے تمہیں اپنی قبر میں اپنی فکر کریں میری فکر میں کیوں پڑے؟ میرے اوپر تو گذرے گی جلنے دو جہنم میں تمہیں کیوں درد اٹھ رہا ہے اس کا یہ جواب ہوتا۔ اور یہ شفقت کا جو طرز اختیار کیا تو اس کا جواب یہ تھا، رو کے ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا، تو نصیحت کرنے کا بھی ڈھنگ ہے محبت شفقت اور مخاطب کی ذہنیت پہچان کر اس کے مطابق بات کی جائے تو دل میں اثر ہو گا۔

تو حضرت یوسف علیہ السلام کے وعظ سے عبرت پکڑی جائے کہ ذرا سا موقع ملا تو فوراً نصیحت فرمائی اور دل میں ایمان اتار دیا یہی ہم سب کا فرض ہونا چاہیے کہ ذرا بھی ماننے کی استعداد اور صلاحیت دیکھیں تو کلمۂ حق کہنے سے نہ چوکیں مگر شفقت و حکمت کے ساتھ لاچی ماری والی بات نہ ہو، ورنہ اس کا برا اثر ہوتا ہے۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ طریقہ بتلا دیا اور اس کو اللہ نے نقل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی وحی آئی گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں تعلیم دے رہے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے ہمیں عبرت دلا رہے ہیں کہ دین کا پہنچانا فرض ہے مخلوق کے راستے کو درست کرنا فرض ہے جیسے جیل کے دو نوجوان بھٹکے ہوئے تھے۔

استعداد پیدا ہونے پر نصیحت کرنا...... بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں حافظ محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، ہمارے بھی عزیزوں میں سے تھے۔ نوجوانی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت ہو چکے تھے۔ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدن یہ تھا چوڑی دار پائنچوں کا پاجامہ ٹخنے ڈھکے ہوئے اور چست اچکن جو بالکل بدن کے اوپر چپکا ہوا ہو اور سر پر عمامہ اس پر گوٹا لگا ہوا اور ہاتھوں پر مہندی لگی ہوتی اور چاندی کے چھلے بھی پڑے ہوئے ڈاڑھی چڑھی ہوئی اور مونچھیں بڑی بڑی حافظ صاحب اسی لباس میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے اس میں بہت سی باتیں ناجائز ہیں ڈاڑھی چڑھانا ممنوع ہے ٹخنوں سے نیچا پائنچہ بھی شرعاً ممنوع ہے اور چوڑی دار پاجامہ تو بالکل عورتوں سے مشابہت پیدا کرتا ہے یہ بھی ممنوع ہے مگر حضرت فرماتے کچھ نہیں تھے اور علمی باتیں ہوتی رہتیں...... لوگوں کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ حافظ صاحب اتنے منکرات میں مبتلا ہیں حضرت سے بیعت بھی ہیں اور حضرت ان کو نصیحت نہیں کرتے ورنہ حکم تو یہ ہے کہ کسی منکر کو دیکھے تو نصیحت کرے، یہ تو معاذ اللہ مداہنت اور برائی پر سکوت ہے لیکن

حضرت اس کا انتظار کر رہے تھے کہ حافظ صاحب کے دل میں قبولیت کی صلاحیت پیدا ہو جائے تب نصیحت کروں گا، استعداد پیدا ہو جانے سے پہلے نصیحت رائیگاں جاتی ہے تو چار چھ مہینے کے بعد حضرت کو اندازہ ہوا کہ اب ان کے قلب میں رقت اور نرمی پیدا ہو چکی ہے اب عقیدت پوری طرح گھر کر چکی ہے اب نصیحت کرنے کا موقع آ گیا ہے۔

تو نصیحت بھی کس انداز سے کی یہ نہیں فرمایا کہ بھائی کس برائی میں مبتلا ہو چھوڑ دو بلکہ فرمایا، بھائی حافظ جی! ہمیں تم سے محبت اور تمہیں بھی ہم سے محبت ہے تو ہم میں اور تم میں دوستی ہے تو ہم دوست ہیں اور دو وضع میں رہیں۔ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا یا آج سے ہم بھی ڈاڑھی چڑھانا شروع کر دیں اور چوڑی دار پاجامے پہنیں یا تم چھوڑ دو جو دوست ہوں ان کو ایک وضع پہ رہنا چاہیے، یہ غلط ہے کہ ہم مشرق جا رہے ہیں تو تم مغرب کو دل کے اندر عقیدت آ چکی تھی محبت غالب آ چکی تھی بس دو جملے کہنے کی دیر تھی جیسے قلعی گر کے پاس آپ جب برتن لے جاتے ہیں تو برتن لاتے ہی اسی پر رانگ نہیں مل دیتا پہلے اسے آگ پر رکھ کے تپاتا ہے اور مانجھتا ہے جب یہ منجھ کر صاف ہو جاتا ہے آگ کی گرمی سرایت کر جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اب اس کو چمکدار کرنے کا موقع آ گیا تو اس وقت رانگ لگا کر ذرا روئی پھیر دی اور پھر برتن چاندی جیسا چمک گیا اور اگر تپانے سے پہلے ہی رانگ ملے، تو ساری رانگ ختم ہو جائے گی برتن میں چمک نہیں آئے گی، اسی طرح سے دل کا برتن جب زنگ آلود ہو، اسے تپایا جاتا ہے اسے مانجا جاتا ہے تب تپا کر جب محبت وعقیدت اثر کر جاتی ہے ایک آنچ کی دیر ہوتی ہے ذرا ایک رانگ لگائی ہاتھ پھیرا اور قلب کا برتن چمک گیا تو حضرت نے یہ دیکھا اور وہ دو منٹ بھر میں چمک گئے، حافظ محمد احسن رو پڑے اور مجلس سے اٹھ کر اپنے گھر گئے۔ جتنے چوڑی دار پاجامے تھے وہ تو بیوی کو دیے کہ یہ اب تو پہنتی رہو، میرے تو اب یہ کام کے نہیں رہے اور پندرہ دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے جب تک کہ وہ مہندی کا اثر ہاتھوں پر سے گیا نہیں اور مہندی کی سرخی جاتی نہ رہی، چھلے بھی بیوی کو دیئے اور وہ جو عمامہ تھا اس کا گوٹا اتار کر اس کی ٹوپی بنوائی۔ ڈاڑھی جو چڑھی ہوئی تھی پندرہ بیس دن کے بعد وہ مقطع ڈاڑھی ہوگئی چوکنی ٹوپی اوڑھی، کھلے پائنچوں کا پاجامہ پہنا۔ لانبہ کرتا پہن کر آئے اب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑے عالم خواجہ خضر آ گئے ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھ کر فرمایا بھائی سبحان اللہ! کیسی نورانی شکل ہے کیسی ایمان کی تازگی برس رہی ہے، معانقہ کیا اور لپٹ گئے تو اثر ہو گیا تھا۔ نصیحت قبول کر لی اور اگر پہلے ہی کہتے کہ بہت بری بات ہے یہ ہے اور وہ ہے، وہ آنا بھی چھوڑ دیتے ملنا بھی چھوڑ دیتے تو بعض دفعہ استعداد پیدا ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے جب صلاحیت آ جاتی ہے بس پھر ایک آنچ کی دیر ہوتی ہے یہی کام ہمارا بھی ہونا چاہیے جو ہمارا بھائی کسی برائی میں مبتلا ہے تو سب کے اوپر اس کی خیر خواہی فرض ہے یہ فقط کسی عالم یا مولوی کے ذمہ نہیں ہے۔ ہر شخص کو امر بالمعروف بنایا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر بھی کرے۔

نصیحت کی زینت ......اور نصیحت کی زینت یہ ہے کہ وہ تنہائی میں ہو بھرے مجمع میں کسی کو خطاب کر کے نصیحت کرنا اسے شرمندہ ورسوا کرنا ہے اس سے بچنے کی ضرورت ہے حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس

مبارک میں صحابہ کرام کا مجمع تھا۔ کسی کی وضوٹوٹ گئی، ریح خارج ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہماری مجلس میں کوئی بے وضونہ بیٹھے وہ شخص جاکے وضو کرے جس کی وضو نہ ہو، اب اس بیچارے کومجلس سے اٹھنا بھاری ہوگیا۔ اس لئے کہ اگر اٹھتا تو سب دیکھتے کہ جس کی وضوٹوٹی تھی وہ شرمندہ ہوتا اور نشانہ بنتا، اس سے نہ اٹھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: وہ شخص اٹھ جائے۔ اچھا یہ تھا جس کی وضونہیں ہے۔ ہماری مجلس میں بے وضونہ بیٹھے پھر بھی اٹھنے کی اس کو جرأت نہ ہوئی۔ پھر نہ اٹھا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اجازت دیجئے ہم سارے کے سارے وضو کرلیں۔ جن کی وضو ہے وہ دوبارہ کرلیں ان کی وضو تازہ ہوجائے گی اور جن کی نہیں ہے ان کی وضو ہوجائے گی تو آپ نے اجازت دی اور سب نے اٹھ کر وضو کرلیا تو سب کا پردہ رہ گیا۔ تو بھرے مجمع میں اگر خطاب کر کے نصیحت کی جائے تو رسوائی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے یا تو تنہائی میں نصیحت ہو، اور اگر مجمع میں ہوتو کسی کا نام لے کر نہ ہو، کسی کو خطاب کر کے نہ ہو۔

مجمع میں نصیحت کا طریقِ کار...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی اگر کسی سے کوئی برائی سرزد ہوجائے تو فرماتے کہ مسجد میں جمع ہوجاؤ لوگ مسجد میں جمع ہوجاتے، آپ اس طرح نہیں فرماتے کہ فلاں نے غلطی کی ہے فلاں سے یہ برائی سرزد ہوئی ہے بلکہ فرماتے "مَابَالُ اَقْوَامٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا وَ كَذَا" ① لوگوں کو کیا ہوا ایسی ایسی حرکت کر تے ہیں ایسی ایسی برائیاں کرتے ہیں۔ کسی کا نام نہیں لیتے تھے تاکہ اس کو شرمندگی نہ ہو تو نصیحت میں یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کو خجل نہ کیا جائے، شرمندہ ورسوا نہ کیا جائے۔ محبت وشفقت پیار اور حکمت سے نصیحت کی جائے۔

نصیحت کرنا صرف علما کا کام نہیں...... تو یوسف علیہ السلام کے وعظ کا واقعہ سنایا کہ یہ فریضہ ہم پر بھی عائد ہوتا ہے جسے ہم چھوڑ چکے ہیں اب عام طور پر یہ ماحول پیدا ہوگیا کہ نصیحت کرنا صرف علماء کا کام ہے عام لوگوں کا کام نہیں ہے، یہ غلط ہے علما اپنی جگہ نصیحت کریں، عام لوگ اپنی جگہ ہر ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی اپنی ذمہ داری پوری کرے اس کا ایک اثر تو یہ ہوگا کہ جب آدمی دوسرے کو برائی سے روکے گا تو کم ازکم خود اس برائی میں کبھی مبتلا نہ ہوگا ورنہ اس کے دل میں خیال ہوگا کہ میں دوسرے کو کس منہ سے نصیحت کروں گا وہ کہے گا بھائی تم بھی اسی برائی میں مبتلا ہو۔ اس لئے جب انسان نصیحت کرنے کھڑا ہوگا پہلے اپنی اصلاح کرے گا اسے ڈر ہوگا کہ میں رسوا نہ ہوں تو خود کی نصیحت سے خود کو بھی اور دوسروں کو بھی نفع پہنچتا ہے۔ تو امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تبلیغ حق مسائل کا پہنچانا اور اپنے بھائیوں کو سمجھانا یہ ضروریات دین میں سے ہے اور ہر مومن مرد وعورت کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا وعظ سنایا۔ میرا وعظ ہوتا، ممکن ہے آپ کہتے ہم تو آپ کا وعظ نہیں سننا چاہتے لیکن جب پیغمبر کا وعظ سنایا گیا تو وہ تو سننا ہی پڑے گا، ماننا ہی پڑے گا، اس واسطے میں نے یہ وعظ نقل کیا اور اس کی کچھ

① احیاء علوم الدین ج:۴ ص:۲۴۵. علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں: اخرجه ابو داؤد من حديث عائشةؓ دون قوله "و كان لايعيره" ورجاله رجال الصحيح

تشریح کی، اب میرے خیال میں وقت بھی کافی ہوگیا اوران آیات کی بقدرضرورت تشریح بھی ہوگئی۔

اور مقصد بھی سامنے آ گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دین کی نصیحت عام ہونی چاہیے۔اور یہ جب علم ہوگی جب علم ہوگا تعلیم عام ہوگی، تو اس وقت یہ چیز عام ہو جائے گی لیکن اس کا انتظار نہ کیا جائے۔کسی کو ایک مسئلہ معلوم ہو وہ ایک ہی بیان کرے۔کسی کو دو معلوم ہوں وہ دو ہی بیان کر دے۔کسی عالم کو پچاس معلوم ہوں وہ پچاس بیان کر دے۔مگر دین کا چرچا ہونا چاہیے جس کو آج کل کے زمانے میں پروپیگنڈہ کہا جاتا ہے۔مگر پروپیگنڈہ افواہی چیز کا بھی ہوتا اس لئے دین کے مسائل کا چرچا ہونا چاہیے۔اب میں ختم کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

جلد — ۲

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

معارف القرآن

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" أَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) ①......صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

بزرگانِ محترم!......جلسہ کی مناسبت سے میں نے جو حدیث تلاوت کی اس کا مفہوم اور ترجمہ یہ ہے:
"تم میں سے وہ شخص بہترین ہے جو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتا، یا دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ خود پڑھتا ہے یا دوسروں کو پڑھاتا ہے"۔

خیر کی دو بنیادیں......اس امت کے لئے سب سے پہلے جو چیز لازم کی گئی اور جس کو سراپا خیر قرار دیا گیا، وہ اللہ کی کتاب "قرآن مجید" ہے۔ جس کے متعلق احادیث میں: "اِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ" فرمایا گیا یعنی سراپا سچ، سراپا خیر اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت کے لئے: "وَاَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" ② کا اطلاق فرمایا گیا۔ یعنی بہترین سیرت، سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ دو بنیادیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، اول کتاب اللہ، دوم رسول اللہ۔ رسول تو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو وہ عنایت فرمایا جو خیر البشر ہیں، جو تمام بنی آدم اور تمام ملائکہ بلکہ پوری کائنات میں افضل ترین ہیں۔ اور کتاب اللہ قوانین خداوندی میں سب سے اعلیٰ ترین اور جامع و اکمل ترین قانون ہے۔ اس کی تعلیم و تعلّم کو بہترین مشغلہ قرار دیا گیا۔

بنیادوں کی خیر......اور یہ انہی بنیادوں کی خیر ہے جو امّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جاری ہوئی، اسی سبب سے یہ امّت، خیر امّت کے لقب سے سرفراز ہوئی......﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ③ تم ہی وہ بہترین امت ہو جس کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وجود بخشا گیا۔ گویا بنیادیں بھی خیر و برکت اور بنیادوں کے ذریعے

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمه...... ص: ۴۳۸.

② السنن للنسائی، کتاب الصلوة، باب کیف الخطبة، ج:۶ ص:۲۷. ③ پارہ:۴، سورة آل عمران، الآیة:۱۱۰.

تربیت یافتہ امّت بھی خیرِ اُمّت، پھر یہ خیرِ مطلق چند طبقات پر حاوی ہوئی۔ تو وہ طبقات بھی کامل و اکمل طریقہ پر باعثِ خیر بنے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ.'' ① زمانوں میں بہترین زمانہ میرا ہے، پھر اس سے ملا ہوا، پھر اس سے ملا ہوا۔

ان زمانوں کے اعتبار سے اعلیٰ ترین فضیلت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو نصیب ہوئی اور قرآن کریم نے من حیث الطّبقہ جس جماعت کو محترم اور مقدس قرار دیا وہ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا طبقہ ہے، جس میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ مطلق اس طبقہ کو ہی خیر فرمایا گیا۔ قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے اس طبقہ کی خیریت اور تقدس کو بیان فرمایا گیا، ارشاد ہوا: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ② جنہوں نے اسلام کی پہلی پکار پر لبیک کہا، وہ مہاجر ہوں یا انصار یا انکے سچے دل سے پیروی کرنے والے، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اس میں جانبین کی باہمی رضا و خوشی بتائی گئی۔ تو یہ طبقہ مطلقاً خیرِ مطلق قرار پایا۔ یہ اللہ سے راضی، اللہ ان سے خوش اور رضا و خوشی کا یہ اعلان چونکہ قرآن کریم کے ذریعے فرمایا گیا، جو دوامی کتاب ہے جس کا وجود قیامت تک باقی رہے گا بلکہ آگے جنت میں بھی جاری و ساری رہے گا اور ایک لحاظ سے یہ ابدی کتاب ہے لہٰذا اعلانِ رضامندی بھی ابدی ہے۔ اس کا اطلاق ہر دور و ہر زمانہ میں ہوتا رہے گا اور کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی خیر میں فرق پڑے، ورنہ ان سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا اعلان عام نہیں رہے گا۔ اعلان کی عمومیت ہی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ابد تک راضی ہے اور راضی رہے گا، اس کی رضا میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، وہ ہمیشہ ہمیشہ اللہ سے راضی رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے گا۔

مشیت الٰہی بندہ کے تابع...... صوفیاءِ کرام کی اصطلاح میں اسی تعلق رضا کو نسبت کہتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے تابع ہوجائے اور اللہ تعالیٰ بندہ کی جو مرضیات ہوں ان سے خوش ہو۔ جانبین کی یہی رضا ''نسبت'' کہلاتی ہے۔ جس بندہ کو یہ نسبت حاصل ہوجائے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے عافیت میں رکھے تب راضی، بیماری و دکھ میں رکھے تب خوش، جو بھی تقدیر خداوندی ہو، بندہ اس پر مطلقاً رضا کا اعلان بھی کردے اور دل سے بھی راضی رہے اور جب بندہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر راضی ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بھی بندہ کی ہر منشاء پر راضی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ بندہ کا جو منشا ہو وہ پورا فرماتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی شان

① الصحیح للبخاری، کتاب الشهادات، باب لايشهد على شهادة جور اذا اشهد، رقم: ۲۴۵۷.

② پاره: ۱۱، سورة التوبة، الآية: ۱۰۰.

بھی عجیب ہے اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں اس قدر جلدی فرماتے ہیں کہ ادھر آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی ادھر اللہ نے فوراً پورا فرما دیا۔

اس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ مشیتِ الٰہی بندہ کی مشیت کے تابع ہوگئی، جو بندہ چاہتا ہے وہی ہوجاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ آپ کی جو خواہش ہوتی پوری ہوجاتی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا خیر تھے اسی طرح آپ کی خواہش بھی خیرِ مطلق ہوتی تھی۔ غیرِ خیر یا شر کی خواہش نبی کے ذہن کو چھو بھی نہیں سکتی۔ انبیاء کرام کے قلوب اتنے پاکیزہ، مقدّس اور صاف ہوتے ہیں کہ ان میں جو ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے، جو خواہش بھی پیدا ہوتی ہے، خیر مطلق ہوتی ہے۔ جب وہ خیرِ محض ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پورا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہی چلتی ہے اور خیر ہی کی پذیرائی ہوتی ہے۔ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی اور اللہ بندہ کی ہر خواہش پر راضی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر جدھر گھومتے ہیں، حق بھی ادھر گھومتا ہے۔ بظاہر تو صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جدھر مشیتِ خداوندی اور حق ہوتا ہے ہم ادھر ہی چلتے ہیں، اور یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ جدھر عمر گھومتے ہیں حق بھی ادھر ہی گھومتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک مقام تو مبتدی کا ہوتا ہے کہ وہ تابعِ مطلق ہوتا ہے۔ جدھر حق ہو، ادھر ہی گھوم جائے۔ اور ایک مقامِ منتہی کا ہوتا ہے۔ یہ مقام جانبین کی رضائے کامل سے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ بندہ سے راضی اور بندہ اللہ سے راضی۔ اور یہ مقام پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہوا۔

خیرِ عمل...... اول پوری امت کو دیگر امم کے مقابلے میں خیر امت قرار دیا گیا، پھر اس خیریت کو "خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ" کے ذریعہ عہدِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا۔ اس کے بعد عہدِ صحابہ میں موجود مسلمانوں میں سے خیریت میں اس فرد کی ترجیح فرمائی گئی جو خود قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دے۔ یوں اس کی رغبت دلائی: "خَیْرُ کُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ" ① اس کو خیر العمل کہا گیا ہے۔ قرآن کریم خود بھی خیر، اس کو پڑھنے پڑھانے والے بھی خیر کے مستحق۔

حفاظتِ قرآن کریم...... ظاہر میں قرآن کریم دو چیزوں، الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے۔ اور یہ دونوں "مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰہِ" ہیں، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ الفاظِ قرآن جب نازل ہوتے تھے، اسے جوں کا توں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ و حاضرین کو سنا دیتے تھے، کوئی لفظ کم کرتے نہ زیادہ۔ اس معاملہ میں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین تھے اسی طرح معانی کے سلسلہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم امین تھے۔ الفاظ کی طرح معانی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کئے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت کا جو

① الصحیح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم من تعلم القرآن......ص: ۴۳۸.

مقصد، مطلب ومعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر القاء ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو روایت فرما دیتے، اپنی طرف سے کوئی معنی بیان نہیں فرماتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ میں بھی امین تھے اور معانی میں بھی امین۔ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے اور معانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اور دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ ان میں قیامت تک کوئی خلل نہیں پڑ سکتا۔ یہ الفاظ و معانی قیامت تک باقی رہیں گے۔ تحریف کرنے والے ہزار تحریف کریں مگر حق غالب ہی رہے گا الفاظ بھی باقی رہیں گے اور معانی بھی۔ خود قرآن کریم نے ہی اس کی گارنٹی دی ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ① ابتداءً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادتِ شریفہ تھی: جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی اس کو پڑھنے لگتے تاکہ الفاظ زبان پر چڑھ کر محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بھولنے کے خطرہ کے پیش نظر جلد جلد زبان کو حرکت نہ دیجیے! اس کے الفاظ آپ کے قلب میں جمانے اور زبان سے ادائیگی کا ہم ذمہ لیتے ہیں۔ گویا الفاظِ قرآن کی حفاظت اور یادداشت کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی کہ آپ کے قلب مبارک سے پڑھوا بھی دیں گے، نہ جمع میں کوئی غلطی ہوگی اور نہ پڑھنے میں کوئی چُوک ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ بھی تھا اور وعدہ بھی۔

عربی میں "عَلٰی" التزام کے لئے آتا ہے، جس چیز کو کوئی اپنے اوپر لازم کرتا اور اس کا ذمہ لیتا ہے، اس کی تعبیر عَلٰی سے کی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے: "عَلَيَّ اَلفُ دِرْهَمٍ" تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھ پر لازم ہے کہ تم کو ایک ہزار روپیہ دوں، یہ میری ذمہ داری ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ﴾ ② یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ الفاظِ قرآن آپ کے قلب میں جمع و محفوظ بھی کر دیں اور آپ کی زبان سے پڑھوا بھی دیں۔ گویا قرأت بھی دوامی ہے، جس میں کبھی کسی قسم کا خلل نہیں پڑ سکتا۔ اور جمع قرآن بھی دوامی ہے کہ اس میں تحریف ورد و بدل نہیں ہو سکتا۔ معانی پڑھے نہیں جاتے، سمجھے جاتے ہیں۔ تو یہاں "قُرْاٰنَهٗ" فرما کر الفاظ پڑھانے اور زبان پر جاری کرانے کی ذمہ داری لی گئی۔ معانی سے متعلق یہاں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ قرآن کے لفظی معنی "پڑھانا" کے ہیں۔ معانی کی ذمہ داری ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ③ میں لی گئی ہے۔ یعنی الفاظ کے معنی کھول کھول کر بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ پہلی آیت میں "قُرْاٰنَهٗ" فرما کر الفاظ کی ادائیگی اور قرأت کی ذمہ داری لی اور اس آیت میں "بَيَانَهٗ" فرما کر بیان کرنے اور سمجھانے کی ذمہ داری لی۔ خلاصۃً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے دونوں اجزاء الفاظ و معانی کی ذمہ داری لے لی ہے۔ یعنی قرآن پڑھوانا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کے معنی و مفہوم کو، جو قرآن کے موضوعات ہیں، سمجھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

قرآن اور بیانِ قرآن یعنی حدیث...... اور یہ بیان ہی دراصل حدیث کہلاتا ہے اور حدیث ہی کے ذریعہ

① پارہ: ۱۴، الحجر، الآیۃ: ۹. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷. ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹.

سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی مقاصد کو واضح فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ کیونکہ قرآن کے ساتھ بیانِ قرآن باقی نہ رہے تو لوگ کچھ کا کچھ مطلب لیں گے۔ ایک معنی کے ہزار معنی بنیں گے۔ قرآن کی اوّلین تفسیر حدیثِ نبوی ہے کہ قرآن مجید میں اس کو بیان بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ ① الفاظ جب آ چکتے ہیں تو اس کے معانی بیان ہوتے ہیں۔ اس لئے بیان معانی پر صادق آتا ہے۔ الفاظ بیان نہیں کہلاتے۔ وہ تلاوت کئے جاتے ہیں، پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کے جو الفاظ آ چکے ہیں اور ان کے جو معانی اور مرادات ربانی ہیں ان کو بیان کر دینے کا نام "تبیین" ہے، یعنی واضح کر دینا: ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ﴾ سے معلوم ہوا کہ حدیث، بیانِ قرآن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک متن اتارا، جس کا نام قرآن مجید ہے اور اس متن کی ایک شرح اتاری، جس کا نام حدیث ہے۔ اسکی تاکید، لفظِ بیان سے کی اور اس سلسلے میں خود ذمہ داری لی: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ﴾ ② کہ بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے کئی معنوں میں ڈھل سکتی ہوتی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس طرح نہیں فرمایا کہ اس آیت کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں، ایک یہ ہو سکتے ہیں اور زمانہ کے مطابق فلاں معنی ہیں، لہٰذا یہ معنی مراد ہیں۔ بلکہ اس آیت کی مراد بھی اللہ تعالیٰ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر القاء فرماتے تھے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم مراد پر غور نہ فرماتے کہ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے، یہ مراد بھی نکلتی ہے۔ مرادِ ربانی روایت اور نقل سے حاصل ہو سکتی ہے، عقل سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مراد کے دائرے میں رہ کر آپ عقل لڑائیں گے تو حکمتیں کھلیں گی اور وہ حکمتِ قرآن کہلائے گی۔ لیکن خود مراد کو عقل سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مراد اللہ تعالیٰ ہی بیان فرمائے گا کہ اس آیت سے میرا یہ مطلب تھا۔ اگر مرادِ آیت عقل سے ہی متعین کی جاتی تو قرآن کئی اقسام کے ہوتے۔

جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ جب روزہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ ابتداء میں یہ حکم تھا کہ رات کو سو کر جب بھی آنکھ کھلے، اس وقت سے اگلے افطار تک بیچ میں کھانا پینا منع ہے۔ پھر اس میں تخفیف فرمائی اور ارشاد فرمایا: ﴿وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ③ یعنی صبح کاذب کے بعد جب صبح صادق کا اجالا ظاہر ہو تو اب کھانے پینے سے رک جاؤ اور روزہ کی نیت کرو۔ اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے دو قسم کے دھاگے، کالے اور سفید تیار کرائے اور سرہانے رکھ لیے۔ جب سفید دھاگہ کالے سے تمیز ہو جاتا، تب کھانا پینا بند کرتے۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کے دھاگے تیار کرائے۔ اور تکیہ کے نیچے رکھ دیے۔ ان کو دیکھتے رہتے ...... جب کالا دھاگا سفید دھاگہ سے بالکل ممتاز نظر آتا تو روزہ کی نیت کرتے۔ حالانکہ اس وقت صبح ہوئے خاصا وقت پندرہ بیس منٹ گزر چکا ہوتا۔ ان حضرات نے باعتبار لغت یہ

① پارہ: ۱۴، النحل، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۹. ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

صورت اختیار کی تھی جو لغوی اعتبار سے غلط بھی نہ تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی چونکہ یہ مراد نہ تھی اس لئے سب کی دلجمعی نہ ہوئی اور معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: اے عدی! تم کیا صورت کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ ① کے نازل ہونے کے بعد دو ڈورے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لئے ہیں اور انہیں دیکھتا رہتا ہوں، جب تک کالا ڈورا سفید ڈورے سے ممتاز نہ ہو جائے کھاتا پیتا رہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عدی! تمہارا تکیہ بڑا وسیع ہے کہ اس میں دن رات چھپ گئے۔ کیونکہ کالے ڈورے سے رات مراد ہے اور سفید ڈورے سے مراد دن ہے۔ دھاگوں کے ڈورے مراد نہیں۔ ② اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہاں لغوی معنی مراد نہیں۔

مرادِ قرآنی اور لغت ...... یہیں سے معلوم ہوا کہ لفظ کے ایک لغوی معنی ہوتے ہیں اور ایک مرادی۔ قرآن مجید اترا تو لغت عربی میں ہے لیکن ہر جگہ لغت مراد نہیں۔ بعض جگہ قرآن کریم نے لغت تو زبان عرب سے لی مگر معنی اس کے اندر اپنے ڈالے اور وہی مرادی معنی کہلاتے ہیں۔

اب دیکھئے ''صلوٰۃ'' کا لفظ ہے۔ لغت عربی میں اس کے معنی دعا مانگنے کے ہیں۔ ایک آدمی دعا مانگ لیتا ہے تو لغت کے لحاظ سے اس نے ''صلوٰۃ'' ادا کر لی۔ یہاں باعتبار لغت رحمت بھیجنا اور دعا مانگنا تو صحیح ہے مگر اسے نماز پڑھ لینا کہنا صحیح نہیں، کیونکہ ''صلوٰۃ'' کے لفظ کی مراد یہ نہیں ہے۔ اس سے مراد کچھ خاص اعمال وافعال ہیں کہ یوں نیت باندھو، اس طرح قیام کرو، رکوع و سجود کرو، یوں قعدہ میں بیٹھو وغیرہ۔ اس مجموعہ کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ یہاں قرآن نے لفظ لغتِ عربی کا لیا ہے مگر معنی اپنے ڈالے کہ یہاں صلوٰۃ سے ہماری مراد یہ ہے۔ اس مراد کی وضاحت کے بعد صرف دعا مانگنے کو نماز نہیں کہا جا سکتا اور آدمی ادائیگی نماز سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح لغتِ عرب میں ''زکوٰۃ'' کے معنی پاک کر دینے کے ہیں۔ آپ ہاتھوں پر پانی ڈال کر دھو کر پاک کر لیں، زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ یہ ہزاروں روپیہ کی زکوٰۃ نکالنے کے معنی کہاں سے نکال لیے۔ لغت میں تو اس کا کہیں پتہ نہیں! یہاں بھی قرآن کریم نے زکوٰۃ کا لفظ تو لغتِ عرب سے لیا مگر اس کے معنی خود متعین کئے کہ اگر تمہارے پاس اتنا مال، اتنا روپیہ پیسہ ہو اور اس پر پورا سال بھی گزر جائے تو اس مال سے خاص مقدار کی رقم اللہ کی راہ میں نکالنا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ تو زکوٰۃ کے لغوی معنی جتنے بھی ہوں مگر مراد وہی عرفی معنی ہی ہیں، جو قرآن کریم نے مراد لئے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے بہت سے الفاظ لغتِ عرب کے لے کر ان میں اپنے معنی ڈالے ہیں، وہی مرادی معنی ہوتے ہیں۔ معلم ان ہی معانی کو سمجھاتا، بتاتا اور ان ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر مرادی معنی ضروری نہ ہوتے، لغوی معنی ہی کافی ہوتے تو اتنا کافی ہوتا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن مجید کا نسخہ لاتے، بیت اللہ کی چھت پر رکھ

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷۔

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب بیان ان الدخول فی الصوم یحصل ج: ۵ ص: ۳۷۵.

دیتے اور اعلان کر دیتے: اے لوگو! تم روحانی مریض ہو یہ تمہارے لئے نسخۂ شفاء ہے، تم زبان دان ہو، عربی سمجھتے ہو، اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر اپنا علاج کر لیا کرو۔ پھر پیغمبر مبعوث کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر مسائل کہیں بھی لغت سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، وہ لغت سے اللہ کی مراد کا تعیّن کر کے لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے اور اللہ کے نزدیک اس آیت کا کیا مطلب ہے۔

مقاصدِ بعثتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار وظیفے (چار کام) متعین ومقرر فرمائے۔ پہلا وظیفہ ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ ايٰتِهٖ﴾ ① یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اور امت تک ان کو پہنچائیں۔ آپ نے یہ وظیفہ پوری امانت کے ساتھ انجام دیا اور پورا قرآن امت کو سنایا، ان تک پہنچایا۔ اس کے بعد دوسرا وظیفہ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ② کتاب کی تعلیم دو! تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے جو مطلب اور مراد متعین کی ہے، وہ انہیں سمجھائیں۔ آپ نے وہ معانی سمجھائے اور مراداتِ ربانی بیان فرمائیں۔ یہ تعلیم کا وظیفہ ہوا۔ جب نبی خود کوئی مراد متعین فرما دے تو اس کے اندر کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔ پھر تیسرا وظیفہ تعلیم حکمت بیان فرمایا ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ③ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حکمتیں بھی سکھلائیں۔ حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ حکمتِ نظری، حکمتِ عملی۔ بقاعدۂ بلاغت حکمتِ نظری تعلیم کے اندر ہی آ گئی۔ اس کے بعد لفظِ حکمت کے ساتھ حکمت کی تعلیم کا حکم دینے سے یہ متعین ہو گیا کہ اس سے حکمتِ عملی مراد ہے۔ اور وہ ''اُسوۂ حسنہ'' ہے، آپ کی مقدس سیرت ہے۔ آپ نے مراداتِ ربانی نہ صرف سنائیں اور ان کی تعلیم پر اکتفا فرمایا بلکہ عملی طور پر بھی انکا نمونہ پیش فرمایا۔ اب نہ کوئی خطرہ باقی ہے نہ خدشہ اور نہ کوئی خامی باقی رہ جاتی ہے۔

اگر صرف لفظوں سے لوگوں کو عمل متعین کرنے کو کہا جاتا تو ہر ایک اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ متعین کر لیتا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ پر عمل بھی فرمایا اور ان مراداتِ ربانی کی ہیئت بھی دکھلا دی۔ اب اس میں کوئی خلجان باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کے متعلق جو عمل کر کے دکھلایا گیا، اسی کے مطابق عمل کرو: ''صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِي أُصَلِّيْ'' جس طرح مجھے نماز پڑھتے تم نے دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھو۔ میرا اسوہ وعمل تمہارے لئے نمونہ ہے۔ تم اپنی مرضی کے مطابق اس کی ہیئت متعین نہ کرو۔ میرا عمل اللہ کی مراد کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی ہیئت مطلوب ہے۔ اس کے بعد کوئی خدشہ، کوئی خلجان اس ہیئت کے متعلق کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد چوتھا وظیفہ یہ بھی فرما دیا کہ لفظ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنا دیں، معنی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھا دیں اور عمل کر کے بھی دکھلا دیں۔ مگر ان کے دلوں میں صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ ان معانی کو قبول

①②③ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعہ، الآیۃ: ۲۔

کرلیں، اس ہیئت پر اعتقاد جمالیں۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے قلب کی صلاحیت کی، کہ ذہن بھی صحیح ہو ذہن صحیح نہ ہو، اس میں ٹیڑھ پن اور کجی ہو تو اوندھے معنی سمجھتا ہے، اس لئے بطور وظیفۂ چہارم فرمایا: ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ① ان لوگوں کے دلوں کو بھی مانجھ دیجیے۔ ان کے دلوں میں استعداد اور صلاحیت بھی پیدا کیجیے کہ جب اللہ کا کلام ان کے کانوں میں پڑے تو اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک وہی سمجھیں جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور عمل کی ٹھیک وہی ہیئت اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ کا منشاء اور اس کا مطلوب ہے۔ محض لفظوں سے کوئی شخص عمل کا نمونہ اختیار نہیں کر سکتا، جب تک عملی نمونہ اس کے سامنے نہ ہو۔ اور عملی نمونہ کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک دل کی کدورات صاف کر کے، اس کو مانجھ کر پاک و مصفی نہ کر دیا گیا ہو۔

اسوۂ حسنہ کی ضرورت...... میں کہتا ہوں کہ روٹی پکانا بظاہر معمولی بات ہے۔ ہم اور آپ روزانہ گھروں میں روٹی پکتے دیکھتے ہیں۔ مگر آپ محض دیکھتے رہنے سے روٹی پکانے کا عمل نہیں کر سکتے، جب تک اس عمل کی مشق نہ کریں۔ پہلے آپ دیکھیں گے کہ پیڑا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس کو روٹی کی شکل کس طرح دی جاتی ہے، پھر اس کو توے پر کس طرح ڈالا جاتا ہے۔ جب آپ اپنے ہاتھ سے اس عمل کو دھرائیں گے، عملی طور پر اس کی مشق کریں گے، تب آپ کو روٹی پکانی آئے گی۔ محض بیٹھے دیکھتے رہنے سے آپ کبھی روٹی نہ پکا سکیں گے، روٹی پکانے کے عمل اور ہیئت کے دیکھنے سے۔ اوّل ہر عمل کی ہیئت دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ سے ہیئت ذہن نشین نہیں ہوا کرتی اور مشق کے بغیر عمل کی صورت ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ خیاطی ایک فن ہے۔ اس فن کی آپ ہزار کتابیں پڑھ ڈالیں، سوئی چلانی نہیں آئے گی۔ جب تک درزی کو سوئی چلاتے دیکھ نہ لیں، آپ سوئی نہ چلا سکیں گے۔ اسی طرح دنیا کی سب صنعتوں اور حرفتوں کا حال ہے کہ کوئی بھی صنعت بغیر سیکھے سکھائے نہیں آسکتی۔ جب تک سکھانے والا عملی نمونہ نہ دکھائے، محض الفاظ اسے صناع نہیں بنا سکتے۔

یہی حال دین کی صنعت کا بھی ہے کہ محض الفاظ اتار دینے اور ان کے معانی سمجھا دینے کے باوجود عمل کی ہیئت انسان کے ذہن نشین نہیں ہو سکتی، عملی نمونہ ضروری ہے تا کہ وہ الفاظ معانی کو صحیح عمل اور ہیئت پر منطبق کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو اسی لئے مبعوث فرمایا کہ وہ اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکامات کے الفاظ بھی سکھائیں، ان کے مفاہیم و معانی بھی بتائیں اور الفاظ و معانی سے جو عمل مطلوب ہے، اس کا نمونہ بھی انکے سامنے رکھیں اور اسی کے ساتھ ان کے ذہن کو بھی مصفّٰی اور منور کریں۔ اور ذہن سازی فرمائیں، تا کہ وہ کلام الٰہی کے اوندھے سیدھے معانی نہ سمجھیں اور پیغمبر نے جو نمونہ عمل ان کے سامنے پیش کیا ہے اس سے گریز اور بے رغبتی نہ برتیں، بلکہ ذوق وشوق اور کشادہ دلی کے ساتھ اس نمونہ کو حرزِ جان بنالیں۔ اگر ذہن کی صفائی کے لئے الفاظ و معانی کافی ہو جایا کرتے تو انبیاء علیہم السلام کے لئے ''وظیفۂ تزکیہ'' لازم نہ کیا جاتا۔ ذہن کی

صفائی کے لئے خاص طرح کی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدات وریاضات کے ذریعہ اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب کا تزکیہ فرمایا۔ ان کو مجلّٰی اور مزکّٰی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان کو اللہ کا کلام سنایا جاتا تو ان پر وہی اثرات ظاہر ہوتے جو کلام اللہ کے اثرات ہیں۔

اللہ کا یہی کلام آپ عام مسلمان کو سنائیں، تو عملی طور پر معتقد ہوگا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، اس کی بے ادبی نہیں ہونی چاہئے، مگر اس سے آگے کے اثرات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اسکے برخلاف اللہ کا یہی کلام کسی عارف باللہ کو آپ سنائیں تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ اسلئے کہ اس کا دل منجھا ہوا ہے۔ مجاہدات وریاضات سے اس کا قلب روشن ہے۔ اسی روشنی میں کلامِ الٰہی کے جو اثرات وہ مشاہدہ کرے گا، عام مسلمان ایسا نہیں کر سکے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر اللہ کی کثرت، نماز کی ادائیگی، جہاد اور دیگر مجاہدات کے ذریعہ اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت فرمائی، ان کے قلوب کو مانجھا، مصفّٰی ومزکّٰی کیا اور ان کا رُخ بدل دیا۔ پہلے ان کا رُخ دنیا کی طرف تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش کی طرف ان کا رُخ کر دیا۔ پہلے وہ فرشی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت نے عرشی بنا دیا۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک تو الفاظ ہیں، ایک معانی ہیں، جو الفاظ میں پوشیدہ ہیں پھر ان معانی کی تہہ میں حقائق ہیں، حقائق کے تحت معارف ہیں اور معارف میں کیفیات ہیں، جو قلوب پر طاری ہوتی ہیں۔ کتاب اللہ کے نزول کا مقصد محض الفاظ ومعانی کی سمجھ بوجھ ہی نہیں، بلکہ اس کا مقصد ایسے قلوب واذہان کی تربیت وتزکیہ بھی ہے، جو الفاظ ومعانی کی تہہ میں چھپے ہوئے حقائق ومعارف کے ادراک کے قابل ہوں اور ان معارف کی کیفیت کا محل بھی بن سکیں۔

قرآن کے ساتھ اجتماعِ خیر...... اس تربیت وتزکیہ کا مدار مُربّی ومُزکّی کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس لئے کلام اللہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی بعثت بھی ضروری گردانی گئی۔ جہاں بھی کسی صحیفۂ الٰہی، یا کتاب اللہ کے نزول کا ذکر ہوا اسی کے ساتھ ساتھ اس صحیفہ یا کتاب کے نزول کے مورد، پیغمبر ورسول کا ذکر بھی لازماً ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی چار مشہور کتابیں چار پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ تورات کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام، زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام، انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن مجید کے ساتھ ہمارے پیغمبر رسولِ مقبول حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ غرض کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ قانون تو آیا ہو مگر شخصیت نہ آئی ہو۔ اس لئے کہ دارومدار شخصیت پر ہوتا ہے، کاغذوں اور تختیوں یا ان پر کندہ حروف پر نہیں ہوتا۔ ان حروف والفاظ کی تلاوت شخصیت کرے گی اور ان کے معانی بھی شخصیت بتلائے گی اور نمونۂ عمل بھی شخصیت بنے گی۔ کسی کتاب کے اوراق تو نمونۂ عمل نہیں بنیں گے۔ دلوں کو مانجھنے، ان کو مصفّٰی ومزکّٰی کرنے کا کام بھی شخصیت انجام دے گی۔ کتابوں پر لکھے ہوئے یا تختیوں پر کندہ الفاظ تو دلوں کو نہیں مانجھیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر قانون

کے ساتھ شخصیت لازم اور ضروری ہوتی ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول رکھا۔

یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ جب قرآن کریم خیر الکتب ہے تو اس کے ساتھ مبعوث ہونے والی شخصیت بھی لازماً خیر البشر ہوگی۔ اور اس خیر البشر شخصیت کے شاگرد بھی خیر الناس ہوں گے۔ اور وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اسی قاعدہ کے مطابق خیر البشر کا قرن ''خیر القرون'' ہوگا۔ ایسی خیر در خیر کے اندر قرآن مجید کا نزول ایسا خیرِ مطلق تھا کہ اس کے ساتھ کئی طرح کی خیریں وابستہ تھیں۔ زمانہ کی خیر، مکان کی خیر، ذات اقدس کی خیر، شاگردوں کی خیر اور جب گونا گوں خیریں یکجا اور مجتمع ہوگئیں تو خیر الکتب کا نزول ہوا اور اس کے متعلق فرمایا گیا: ''خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ'' ① تم میں سے جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ بہترین لوگ ہیں۔ جس کتاب کے اندر باہر، اردگرد، اوپر نیچے اور ہر سمت خیر ہی خیر ہو تو اس کے پڑھنے پڑھانے والے اس خیر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں، وہ بھی خیر بن جائیں گے۔

کلام اللہ کے ذریعے باطنِ خداوندی سے وابستگی...... اسی لئے ایک حدیث اس مضمون کی مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن سے برکت حاصل کرو، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے''۔ (او کما قال علیه الصّلوٰة والسلام). ② کلام آدمی کے اندر سے نکلتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کلام کو تخلیق کرتا ہے، بلکہ کلام آدمی سے سرزد ہوتا ہے۔ آدمی اس کی تخلیق نہیں کرتا۔ جب کسی بولنے والے کو آپ بولتا سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کلام اس سے صادر ہو رہا ہے، سرزد ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص کلام پیدا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام آسمان و زمین اور پوری کائنات تخلیق فرمائی۔ تمام خیرات و برکات مخلوقِ خداوندی ہیں، مگر قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے صادر ہوا ہے۔ اسی لئے اس کلام پاک کو پڑھ کر بندہ کا تعلق باطن خداوندی سے قائم ہوتا ہے۔ دیگر نعمتوں کے ذریعہ ظاہر سے وابستگی اور تعلق قائم ہوتا ہے اور کلام خداوندی کے ذریعہ باطن سے وابستگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ③ اور حدیث شریف میں حبل اللہ کی تفسیر ''اَلْقُرْاٰنُ حَبْلُ اللّٰهِ'' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن اللہ کی رسی ہے، جو زمین پر اتاری گئی ہے۔ ④ اسے مجموعی طور پر مضبوطی سے تھامے رہو۔ کیونکہ یہ رسی قیامت کے دن کھینچی جائے گی، تو اس کو تھامنے والے بھی اسی کے ساتھ کھنچے آئیں گے اور جہاں قرآن پہنچے گا وہیں اس سے چمٹے رہنے والے، باطنِ حق

---

① الصحيح للبخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خيركم...... ص ۴۳۸.

② الجامع الكبير للسيوطی حديث رقم: ۳۳۸۶. كنز العمال، ج: ۱ ص: ۳۲۱.

③ پاره: ۴، سورة آل عمران، الآية: ۱۰۳.

④ الصحيح لمسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالبؓ ج: ۱۲ ص: ۱۳۴.

سے وابستہ ہو جائیں گے۔

الفاظ وحروفِ قرآن کی جنت میں گل وگلزار سے تبدیلی...... بعض احادیث کے مضمون میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی آیات ہیں جنت میں اتنے ہی درجے ہیں۔ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: "دَتِّـلْ وَارْتَقِ" ① پڑھتا جا اور درجے چڑھتا جا۔ اب جس کو جتنا قرآن یاد ہوگا وہ اسی کے مطابق درجات تک پہنچ جائے گا۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ آیتیں خود جنت کے درجات ہیں۔ یہاں آپ کو جو آیات، الفاظ کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ جنت میں یہی آیات باغ وبہار کی شکل میں ڈھل جائیں گی۔ چیز ایک ہی ہے۔ یہاں شکل اور ہے، جنت میں یہ شکل بدل جائے گی۔

ہمارے زمانے میں یورپ کا ایک کھلونا آتا تھا۔ پیکٹ میں غالباً ۱۲ گولیاں ہوتی تھیں۔ چار آنے میں ملتا تھا۔ بچے لاتے تھے۔ پانی کا پیالہ بھر کر گولی اس میں ڈالتے تھے تو پانی لگنے سے گولی چٹختی تھی اور وہ گولی پھیل کر کوئی انجن بن جاتی تھی، تو کوئی گھوڑا، کسی کا پھول بن گیا تو کسی کا بنگلا۔ کاریگر نے صناعی یہ کی تھی کہ کاغذ پر اس انداز میں مسالے لپیٹے تھے کہ جب وہ گولی پھٹتی تھی تو مختلف شکلوں کا ظہور ہوتا تھا، شرط پانی کا لگنا تھا۔ اسی طرح شادی بیاہ میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ ایک چکرا سا ہوتا ہے۔ اس میں مسالہ اس انداز اور کاریگری سے لپیٹا جاتا ہے کہ جب آگ لگا کر اسے چھوڑا جاتا ہے تو اس کے شراروں سے ایسا سماں بندھتا ہے کہ دیکھنے والوں کو گھوڑا اور اس پر سوار نظر آتا ہے، یا باغ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں اور خوب داد دیتے ہیں کہ کیا صناعی اور کاریگری ہے، اور مسالہ کو کس انداز سے لپیٹا ہے کہ کبھی گھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی بنگلا اور کبھی کوئی پھول۔ یہ ایک عجیب صناعی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی آیات میں یہ صناعی رکھی ہے کہ وہ جب تک عالم آب وگل میں موجود ہیں، خزانہ علم وعرفان ہے، پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے اور جب ان کو آخرت کا پانی لگے گا تو یہی حروف والفاظ، گل وگلزار میں تبدیل ہو جائیں گے۔ دنیا میں جو الفاظ اپنے تلاوت کرنے والوں کے لئے سرمایۂ سکون وراحت تھے اور انہیں علم وعرفان کی دنیا کی سیر کراتے تھے، وہی الفاظ اب ان کے لئے جنت نگاہ باغ وبہار اور لعل وجواہر کی صورت میں ظاہر ہو کر آخرت کی زندگی پُر بہار اور گہوارۂ شادمانی ومسرت بنا دیں گے۔ انہیں میں سے نہریں پھوٹیں گی۔ یہی حروف حور وقصور کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے نقطے ہی وہاں لعل وجواہر، موتی وغیرہ کی شکل اختیار کر لیں۔ یہاں ان کی شکل آیات کی ہے، وہاں باغ وبہار میں تبدیل ہو جائیں اور نعمتوں کے روپ میں ڈھل جائیں گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری قومیں جو اپنی کتابوں اور رسالوں پر ایمان لا کر قیامت کے بعد جس جنت میں داخلہ کی امید رکھتی ہیں، وہ جنت تو مسلمان اپنے دلوں میں یہیں دنیا میں سمیٹے بیٹھے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار کرنے

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ ج: ۴ ص: ۲۶۳۔

کی بجائے آج ایمان لاکر یہ جنت کیوں نہ حاصل کرلیں۔ جس مسلمان نے پورا قرآن حفظ کرلیا، اس نے گویا پوری جنت اپنے قلب میں سمیٹ لی۔ جب عالمِ آخرت میں حرفوں اور لفظوں میں سمٹی ہوئی یہ جنت کھلے گی اور پھیلے گی تو وہ دیکھے گا کہ یہ تو قرآن حکیم تھا، جو اَب جنت بن گیا ہے۔ اس دنیا میں مؤمن اپنے اندر جنت لئے بیٹھا ہے لیکن چونکہ اس کی اصل شکل سامنے نہیں ہے، اس لئے اسے پتہ نہیں کہ کتنی عظیم چیز وہ اپنے اندر لئے بیٹھا ہے۔ جب آیتوں کی حقیقت کھلے گی اور وہ اپنی اصل شکل بدل کر سامنے باغ و بہار بنی نظر آئیں گی تو اس نعمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مردِ مؤمن اپنی ذات میں جنت ہے۔ قیامت میں اس کو جو چیز جنت کے نام سے ملنے والی ہے۔ وہ یہیں قرآنی الفاظ کی شکل میں اس کو عنایت کردی گئی ہے۔ اب جو بھی یہاں قرآن پڑھ رہا ہے، وہ گویا جنت سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر ذخیرہ کررہا ہے، وہی جنت جب کھلے گی تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ تو مجھے دنیا ہی میں مرحمت فرمادی گئی تھی۔ بہر حال قرآن حکیم حق تعالیٰ شانہ کے باطن سے وابستہ ہونے کا ذریعہ بھی ہے۔ اجر وثواب کے حصول کا باعث بھی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کے بدلے دس دس نیکیاں نامۂ اعمال میں ذخیرہ ہو رہی ہیں اور یہی قرآن جنت کے محلات وقصور، گل وگلستان بھی ہیں۔

غرض قرآن شریف کی عجیب شان ہے اسے پڑھو تو اس سے بہتر وظیفہ نہیں، اس کا علم سیکھو تو اس سے بڑھ کر کوئی علم نہیں، اسے دستورِ زندگی بناؤ تو اس سے بڑھ کر کوئی قانون نہیں، اگر اس کے حقائق کھولو تو اس سے بہتر حکمتیں نہیں، اگر اس کی کیفیات اپنے اوپر طاری کرلو تو اس سے بڑھ کر سکونِ قلب کوئی نہیں، نعمتوں کا جو تصور بھی کوئی قائم کرے، وہ سب کا سب اس کے اندر جمع ہے۔ جو یہاں علمی شکل میں ہیں، عالمِ آخرت میں باغ و بہار کی شکل میں آجائیں گی اور یوں معلوم ہوگا کہ قرآن کریم ایک عظیم الشان اور حدِ نظر تک وسیع باغ ہے، جس میں ہزاروں لاکھوں پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہمہ اقسام خوشبوئیں موجود ہیں۔

تورات اور میدانِ حشر...... چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میدانِ حشر میں جب اقوامِ عالَم جمع ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ سے پوچھیں گے کہ وہ کتابِ تورات کہاں ہے جو ہم نے تیرے اندر رکھی تھی؟ وہ عرض کرے گی کہ: وہ تو جبرئیل علیہ السلام لے گئے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام سے سوال ہوگا: لوحِ محفوظ سے تم تورات لائے تھے؟ وہ عرض کریں گے: جی ہاں لایا تھا۔ پھر سوال ہوگا: اسے کہاں لے گئے؟ وہ کہیں گے "تورات" کو میں نے موسیٰ کے قلب پر نازل کیا تھا۔ موسیٰ سے سوال ہوگا کہ جبرئیل علیہ السلام سے تم نے تورات سنی؟ وہ عرض کریں گے جی ہاں! تورات سنی اور اس کے معنی سمجھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: پھر آپ نے کیا کیا؟ موسیٰ عرض کریں گے: میں نے وہ تورات اپنی امت کو پہنچادی۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہوگا: وہ "تورات" اب اپنی امت کو سنا کر دکھاؤ۔ آپ علیہ السلام پوری تورات وہاں تلاوت فرمائیں گے۔

دنیا میں تورات کے الفاظ پڑھے اور سنائے گئے، اس کے معنی سمجھائے گئے اور آج (قیامت) کی تلاوت

نے الفاظ ومعانی میں پوشیدہ حقائق مجسم شکل میں سامنے کردیئے ہیں، جس سے معلوم ہوا وہ ایک عظیم الشان باغ ہے۔ اور اس سے قلب پر عجیب وغریب کیفیات طاری ہورہی ہیں، حیرت انگیز انکشافات ہورہے ہیں۔ تو امت موسیٰ کے لوگ کہیں گے: یہ تورات تو ہم نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔ ہم وہاں الفاظ ومعانی کی افہام وتفہیم میں الجھے رہے۔ یہ حقیقت کہ تورات کیا ہے! آج ہم پر کھلی، پہلے یہ حقیقت ہمارے سامنے کبھی نہیں آئی۔

قرآنِ حکیم اور میدانِ حشر...... اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوگا کہ قرآن آپ تک پہنچا تو آپ نے اس کا کیا کیا؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم فرمائیں گے: جی ہاں! قرآن مجھ تک پہنچا اور اسے میں نے اپنی امت کو تلاوت وتعلیم کے ذریعہ پہنچادیا۔ ارشاد ربانی ہوگا: اب یہاں بھی اس کی تلاوت کیجیے۔ (تاکہ اقوام عالم کے سامنے قرآنی الفاظ ومعانی کی حقیقتیں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوجائیں اور سب دیکھ لیں کہ قرآن کریم نے کس طرح پورے عالم کا احاطہ کیا ہوا تھا)۔ حدیث شریف میں آتا ہے، تب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منبر بچھایا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما ہوکر قرآن کریم کی اول سے آخر تک تلاوت فرمائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کے۔ جن لوگوں کو قرآن نہیں پہنچا، بحسرت ویاس کہیں گے: کاش! دنیا میں ہم کو یہ کتاب ملی ہوتی یہ تو بہت ہی عجیب وغریب کتاب ہے۔ اس کے اندر عجیب خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ تو دنیا میں الفاظِ قرآنی کی تلاوت کرنے، اس کے معانی کو سمجھنے سے دل پر جو روحانی کیفیات واثرات طاری ہوتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سے سب مجسم شکل میں آجائیں گے اور معلوم ہوگا کہ قرآن تو اتنا بڑا اور عظیم الشان باغ ہے، جس نے پورے عالم اور کائنات کا احاطہ کررکھا ہے اور اس میں سدا بہار پھولوں اور رنگ برنگ بوٹوں کی دنیا آباد ہے، جن کی مہک بے مثال ہے۔

اس حقیقت کو عیاں دیکھ کر خود حضراتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حیران ہوں گے کہ قرآن حکیم کا یہ رُخ تو ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے تلاوتِ قرآن کی کیفیات سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب پُر رہتے تھے، لیکن ان کیفیات کو آج جس شکل میں وہ مجسم دیکھ رہے ہیں، اس سے تو دنیا میں وہ بھی واقف نہ ہوسکے تھے۔ جلوہ حق کی موجودگی کے ساتھ، تمام انبیاء وملائکہ علیہم السلام اور تمام امتوں کے اجتماع میں جب قرآنی حقائق مجسم ہوکر سامنے آئیں گے تو حیرانگی کا عجیب عالم ہوگا۔ سارے لوگ گنگ ہوں گے۔ جن کو یہ نعمت نہیں ملی، ان کو حسرت ہوگی اور جن کو یہ نعمت ملی، ان کو افسوس ہوگا کہ ہم کتنی بڑی نعمت سے بے خبر رہے اور اس کو پس پشت ڈال کر کتنا بڑا خسارہ اور محرومیاں سمیٹتے رہے۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کو بطور ورد پڑھو کہ اس سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں، اس کا علم سیکھو کہ اس سے بہتر کوئی علم نہیں، حکمتوں کی تلاش ہو تو اس میں غور وفکر کرو کہ حکمتوں سے بھرا ہوا، اس جیسا کوئی اور کلام نہیں، معارف کی جستجو ہو تو قرآن سے بہتر معارف کا ذخیرہ کہیں نہیں۔ انہی چیزوں کا یہ لفظی ومعنوی مجموعہ جب اپنی حقیقی

صورت میں مجسم ہوگا تو وہی جنت کہلائے گی۔ یہ وہی جنت ہوگی جسے قاریٔ قرآن نے اپنے دل میں سمیٹ کر محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہی جنت بالآخر اس کا مسکن و ماویٰ بنے گی۔ جب وہ اپنی جنت کو دیکھے گا اور پہچانے گا تو خود کہہ اٹھے گا کہ یہ جنت تو وہی جنت ہے جو میرے نہاں خانۂ قلب میں پوشیدہ تھی۔ البتہ دنیا میں وہ اس کے حقیقی ذائقوں اور لذتوں سے نا آشنا رہا تھا اب اس کے ذائقے بھی اس کی دسترس میں آگئے ہیں۔ اس کے انوار بھی اس پر ضَوفشاں ہیں اور اس کی خوشبوئیں بھی اس کو سرشار بنائے ہوئے ہیں۔ غرض قرآن اور اس کے متعلقات ہر حال و ہر آن خیرِ مطلق ہیں۔ دنیا میں بھی خیرِ مطلق، آخرت میں بھی خیرِ مطلق، اس کا پڑھنا بھی خیرِ مطلق اور اس کا پڑھانا بھی خیرِ مطلق۔ یہی بات اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد فرمائی گئی ہے: "خَیْرُ کُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ" "قرآن حکیم کا سیکھنا سکھانا جس کا وظیفہ ہو وہ تم میں بہترین آدمی ہے"۔

پیدائشی ولی شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ...... اب چند بزرگوں کے حالات سناتا ہوں، جن کو ہم نے دیکھا تو نہیں، البتہ اپنے بزرگوں سے ان کے متعلق سنا ہے۔ ہمارے استاذِ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاندان "اویسیہ خاندان" کہلاتا تھا۔ آپ کے خاندان میں کوئی نہ کوئی مادرزاد ولی ضرور پیدا ہوتا تھا۔ بلا مجاہدے اور ریاضت، من جانب اللہ وہبی طور پر ولایت عنایت ہوتی تھی۔ (خاندان اویسیہ میں ولایت عموماً وہبی طور پر مرحمت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان اویسیہ کہلاتا تھا ورنہ نسباً یہ خاندان سادات کا تھا)۔

میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نانا شاہ محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت پارسا اور نیک صفت انسان تھے۔ انکے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے "یہ وہ شخصیت ہیں کہ ان کے ذہن میں گناہِ صغیرہ کا خیال تک کبھی نہیں آیا یہ جانتے ہی نہیں کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔" تو انہی شاہ صاحب موصوف نے تعلیمِ قرآن کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ دن رات بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہتے تھے۔ آپ پر استغراقی کیفیت کا غلبہ تھا۔ اولاد کے نام بھی بھول جاتے تھے۔ انکے ایک داماد تھے، جن کا نام "اللہ بندہ" تھا، وہ آتے تو فوراً نام پوچھتے، وہ کہتے: "اللہ بندہ" فرماتے صحیح نام بتاؤ، وہ پھر کہتے: حضرت! میں اللہ بندہ ہوں۔ فرماتے بھئی! اللہ بندے تو ہم بھی ہیں۔ صحیح نام بتاؤ آخر میں وہ کہتے: حضرت! میں آپ کا داماد ہوں۔ تب پہچانتے۔ فرماتے: اچھا بیٹھ جاؤ! بات چیت کر کے چلے جاتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آتے تو وہی سوال و جواب ہوتے۔ اللہ سے ایسی لو لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ "دنیا و مافیہا" سے بے خبر رہتے تھے۔ اولاد تک کے نام یاد نہ رہتے تھے اور یہ کیفیات پیدائشی عطیہ تھیں۔ (کسی مجاہدہ و ریاضت کے نتیجہ میں نہ تھیں)۔

اس زمانہ میں گھڑی گھنٹے تو موجود نہیں تھے، نشانیوں سے وقت پہچانا جاتا تھا اور پہروں (ایک پہر دو پہر تین پہر وغیرہ) میں وقت تقسیم ہوتا تھا، ایک جگہ کوئی نشان لگا کر یا کوئی چیز رکھ کر کہہ دیتے کہ دھوپ یہاں تک پہنچ جائے تو چھٹی کا وقت ہو جائے گا بس دھوپ وہاں پہنچی اور چھٹی ہوگئی۔ بچے ہمیشہ کے شرارتی۔ کبھی شرارت کر کے نشان

آگے گاڑ دیتے تاکہ دھوپ وہاں جلدی پہنچ جائے۔ وہاں دھوپ پہنچی اور شور مچا: چھٹی کا وقت ہوگیا۔ آپ فرماتے: اچھا بھئی! چھٹی کرلو۔ لوگوں نے آپ کو بتایا: میاں جی! لڑکے شرارت کرتے ہیں اور جھوٹ بول کر وقت سے پہلے چھٹی کرا لیتے ہیں۔ فرماتے: بھائی! مسلمان بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ چھٹی کا وقت ہوگیا ہوگا، جاؤ بچو! چھٹی کرو۔ یہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کا پختہ عقیدہ وخیال تھا کہ مسلمان جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ عربی کا مقولہ ہے "اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ" ہر آدمی دوسرے کو اپنے ہی پر قیاس کرتا ہے۔ ان کے دل میں جھوٹ کا کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے دوسروں کے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس لئے جو لوگ ان سے واقف تھے، وہ خاموش رہتے تھے۔

اَوروں کے جھوٹ، حافظ محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی...... ہمارے زمانے میں حافظ محمد احسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک بزرگ تھے۔ کسی نے کسی کی زمین کے متعلق جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ یہ میری زمین ہے۔ مدعی دعویٰ کر کے میاں جی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت جی! میں نے زمین کی بازیابی کا دعویٰ کیا ہے، دعا کیجیے! زمین مجھے مل جائے۔ فرمایا: اچھا بھائی! دعا کرتا ہوں، زمین تمہیں مل جائے۔ ادھر حافظ محمد احسن صاحب کو اطلاع ہوئی کہ مدعی نے زمین پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل زمین فلاں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی میاں صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا: حضرت! میں بھی مسلمان ہوں، زمین میری ہے۔ فرمایا: اچھا تم اپیل کر دینا، زمین تمہیں واپس مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مرحلہ میں اس شخص کے حق میں دعویٰ فیصل ہوا۔ دوسرے نے اپیل کی اور اپیل میں وہ جیت گئے۔ حضرت کا دل یہ قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میاں جی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دُکھنے لگیں، دوا دارو کچھ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھوں میں زخم پڑ گئے۔ کسی نے کہہ دیا: میاں جی! اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ میاں جی کو یقین آ گیا اور وہ مکان بند کر کے بیٹھ رہے۔ جو آیا، کہہ دیا: میں نابینا ہوگیا ہوں۔ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے کہ اس بیماری میں بینائی جاتی رہتی ہے۔ اب آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں، جو آ رہا ہے اس سے کہہ دیتے کہ: فلاں صاحب نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہتی ہے، بس میں نابینا ہوگیا ہوں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مضطرب و پریشان ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا پختہ خیال ہے کہ کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو نابینا کہہ رہے ہیں۔ مولانا مزاج پرسی کو پہنچے، احوال دریافت کیا۔ میاں جی نے فرمایا: جی! میری تو بینائی جاتی رہی۔ فلاں صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے: اس مرض میں بینائی جاتی رہتی ہے، اب وہ جھوٹ تھوڑا ہی بول رہے تھے۔ مولانا بہت زیرک و ذہین تھے۔ بات سمجھ گئے، کہنے لگے: حضرت جی! مجھے ایسا پانی پڑھ کر دینا آتا ہے، جس کا چھینٹا آنکھ پر پڑتے ہی بینائی واپس آ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پانی پڑھ کر دم کیا اور چھینٹا مار کر کہا: حضرت جی! آنکھیں کھولیے بینائی واپس آ گئی ہے۔ بینائی

گئی کہاں تھی وہ تو موجود ہی تھی۔ آنکھیں کھول کر فرمایا: اللہ تمہیں جزائے خیر دے میری بینائی واپس آ گئی۔

ادھر لطیفہ یہ ہوا کہ دوسرے دن مولانا یعقوب کی مسجد کے سامنے نابیناؤں کا مجمع اکٹھا ہو گیا کہ مولانا کو ایسا پانی دم کرنا آتا ہے جس سے بینائی واپس آ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی علاج کے لئے آ گئے۔ مولانا نے ان سے کہا: بھائی! یہ ترکیب تو میں نے میاں جی کو سمجھانے کے لئے کی تھی۔ میرے پاس کوئی پانی وانی نہیں۔

برکاتِ قرآن حکیم..... قرآن حکیم کا شغل ایک مبارک شغل ہے۔ اللہ کی کتاب سے واسطہ رہے گا تو اس کے ذریعہ اللہ سے بھی واسطہ رہے گا۔ قرآن نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راستہ سے کروڑوں بندگانِ خدا، خدا تک پہنچ بھی گئے۔ کسی کو نجات عطاء ہوئی، کوئی اس ذریعہ سے بلند درجات پر فائز ہوا۔ جس کا قرآن مجید سے جتنا گہرا واسطہ اور ربط رہا، اسی قدر بلندیٔ درجات حاصل ہوتی رہی۔ غرض کروڑوں انسان قرآن کریم کی بدولت فائز المرام ہو چکے ہیں اور کروڑوں اور ہوں گے ان شاء اللہ۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کریم جب اللہ تعالیٰ کے سامنے مجسّم شکل میں حاضر ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے: آج میں تیری وجہ سے کتنوں کو بلند درجات پر فائز کرتا ہوں اور کتنوں کو پستی و گہرائی میں ڈالتا ہوں۔ جو تجھ پر عمل کرتے تھے، تیرے علم میں مشغول تھے، ان کے لئے رفع مراتب اور بلندیٔ درجات اور بہترین جزاء ہے۔ اور جو تجھ سے اعراض کرتے اور بھاگتے پھرتے تھے نہ انہوں نے تجھے پڑھا، نہ تیرے پیغامات پر عمل کیا، وہ آج پست و ذلیل ہوں گے، اس گریز کی سزا پائیں گے اور ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوں گے۔ ''یَضَعُ بِهَا اَقْوَامًا وَيَرْفَعُ بِهَا اَقْوَامًا'' [1] (اللہ تعالیٰ اس قرآن حکیم کے ذریعہ کچھ اقوام کو بلند اور کچھ کو پست کرتا ہے)۔

اس سارے بیان سے قرآن کے خیر مطلق ہونے کا بخوبی پتہ چل گیا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پڑھانے والا اور پڑھنے والا تو قرآن سے براہ راست رابطہ رکھنے کی بنا پر خیر ہے ہی۔ اس کی اشاعت میں کسی درجہ کی مدد کرنے والا بھی اس خیر میں شامل اور برابر کا شریک ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر ''کلمۂ خیر'' کہنے والا بھی اس خیر میں داخل ہو گیا۔ غرض قرآن سے کسی بھی طور پر وابستگی خیر سے محروم نہیں رہنے دیتی۔ اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ خیر تو ساری قرآن پڑھنے پڑھانے والا سمیٹ کر لے گیا، باقیوں کے حصہ میں کیا رہا ایسا نہیں ہے، پڑھانے والے، جانی و مالی مدد کرنے والے، پڑھنے پڑھانے کے ذرائع قائم کرنے والے، ان کی خبر گیری کرنے والے۔ سب اسی خیر میں شامل و شریک ہیں۔ کوئی خیر سے محروم نہیں۔

حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی مجلس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، علم کی گفتگو ہوتی ہے تو اس مجلس

---

[1] الحدیث اخرجه الامام مسلم فی صحیحه، کتاب الصلوة، باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمه..... ولفظه: عن عمر رضی اللہ عنه أما ان نبیکم قد قال ان الله یرفع بهذا الکتاب اقواما ویضع بها آخرین..... ج: ۴ ص: ۲۵۲.

کو لاکھوں کروڑوں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔مجلس کے اختتام پر جب فرشتے اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں تو ارشادِ ربانی ہوتا ہے: کہاں گئے تھے؟ اللہ تعالیٰ کا یہ سوال ناواقفی کا نہیں! کیونکہ ان کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، بلکہ بطورِ حکمت ہوتا ہے۔ملائکہ علیہم السلام کہتے ہیں: آپ کے بندوں کی ایک مجلس میں گئے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس مجلس میں میرے بندے کیا کر رہے تھے؟ وہ کہتے ہیں: آپ کے عذاب سے ڈر رہے تھے، آپ کی نعمتوں کے طالب تھے، جنت کے طالب اور عذابِ جہنم سے پناہ کے طالب تھے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کیا انہوں نے جنت دیکھ لی ہے، جو اس کے طالب تھے اور کیا انہوں نے جہنم کا عذاب چکھ لیا ہے، جو اس سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: انہوں نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں آپ کے پیغمبروں نے جو ان کو بتایا، اس پر ایمان لاکر اور یقین کر کے یہ خواہش کر رہے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فرشتو! تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے افراد بھی شریک تھے، میں نے سب کی مغفرت کر دی، جو مانگتے تھے وہ دے دیا، جس سے پناہ چاہتے تھے، اس سے ان کو بچا لیا اور اس سے نجات دیدی۔شرکاءِ مجلس کے لئے کتنی بڑی عجیب بشارت ہے۔فرشتے عرض کرتے ہیں کہ: اے اللہ! اس مجلس میں سارے ہی تیراذکر کرنے والے تجھ سے انعام کی خواہش کرنے والے نہیں تھے۔کئی تو مجمع دیکھ کر بطورِ تماشائیوں کے کناروں پر آکھڑے ہوئے تھے۔ان کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: وہ بھی اس مجلسِ خیر میں شریک قرار دیئے گئے، وہ بھی اس مغفرت میں داخل ہیں۔اصل شریکِ مجلس ایسے لوگ ہیں کہ جن کے آس پاس کھڑے ہونے والا بھی محروم نہیں رہتا۔ ① تو قرآن کریم کا پڑھنا خود سراپا خیر ہے ہی، اس مجلس کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے والا بھی انشاء اللہ اس خیر سے محروم نہ رہے گا، چاہے وہاں وہ تعلیم وتعلّم کی غرض سے نہ بھی آیا ہو۔یہ اتنی وسیع رحمت ہے کہ آس پاس والے بھی اس کے احاطہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔کتنے مبارک ہیں وہ لوگ۔جو قرآن کی تعلیم دینے اور اس کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے میں شب وروز منہمک ومشغول ہیں۔اور کتنے خوش بخت ہیں وہ طالب علم۔جو کلام اللہ پڑھنے اور سیکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔دونوں ہی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مسرت کا موقع......قرآن کی تعلیم کا آغاز وافتتاح امرِ واقع یہ ہے کہ نہایت ہی خوشی اور مسرت کی بات ہے۔یہ اتنی بڑی خوشی ہے کہ ہم جتنا بھی اس پر خوش ہوں کم ہے۔اس لئے کہ انسان کی خوشی کے دو ہی موقعے ہیں۔ایک جب وہ کسی کام کی ابتداء یا افتتاح کرتا ہے، دوسرا جب وہ اس ابتدا کی انتہا کو پہنچتا ہے اور حصولِ مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔آپ جب کسی بچہ کو مکتب میں بٹھاتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں اور مٹھائی بانٹتے ہیں کہ زندگی کے ایک بڑے اور اچھے مقصد کی ابتدا ہو رہی ہے اور جب وہ بچہ عالم فاضل بن کر مقصد کی انتہاء پر پہنچتا ہے، تب بھی خوشیاں منائی جاتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں، مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔کوئی باغ لگاتا ہے تو خوشی مناتا ہے اور جب اس باغ

① الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل ج: ۲۰ ص: ۲۴.

میں پھل آتا ہے تو بھی خوشی مناتا ہے۔

خوشی کا دوسرا موقع......تو خوشی کے دو ہی موقعے ہیں ابتداء وانتہا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بڑے جشن منائے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، جلسے کئے جاتے ہیں اور جب وہ مرتا ہے تو میرے نزدیک وہ بھی خوشی کا دن ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ہوئی زندگی، اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر گزار دی اور وہ اس امتحان میں کامیاب گزرا۔

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ مردِ مؤمن کی خوشی ہے کہ وہ اپنا ایمان سلامت رکھ سکا۔ تو مرنا غم کی بات نہیں، خوشی کا موقع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ۔ لوگ تو مغموم ہوتے ہیں، روتے ہیں، خوش تو نہیں ہوتے، میں کہتا ہوں کہ لوگ اس کے مرنے پر نہیں روتے بلکہ اس کی جدائی پر یا اپنے مفادات سے محرومی پر روتے ہیں۔ موت پر تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ تب ہی تو یہ کہتے ہیں کہ: ’’اے اللہ! فلاں جیسی موت تو ہمیں بھی نصیب کر موت پر رنجیدہ ہوتے تو اس پر روتے اور اس کی تمنا نہ کرتے۔ معبود و محبوب سے ملنے پر بھی کوئی روتا ہے موت تو ہمیں اللہ سے واصل کرتی ہے، یہ غمی کی چیز کب ہوسکتی ہے غرض بچہ کی پیدائش بھی خوشی کا موقع ہے اور اس کا دنیا چھوڑ جانے کا مرحلہ بھی خوشی کا وقت ہے۔

حدیث شریف میں موت کو تحفۂ مؤمن فرمایا گیا ہے: اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ ① اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے لئے سب سے بڑا تحفہ موت ہے۔ تو کوئی تحفہ ملنے پر بھی روتا ہے! تحفہ پر تو اظہارِ مسرت وخوشی کیا جاتا ہے۔ موت تحفہ کس طرح ہے؟ اس کے بارے میں دوسری حدیث شریف میں یوں ارشاد ہے: اِنَّ الْمَوْتَ جِسْرٌ يُوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسّلام) ② موت درمیانی پل ہے جو محبّ کو حبیب سے ملاتا ہے، جو وصلِ حبیب کا ذریعہ ہو، وہ باعث کرب وملال کیسے ہوسکتا ہے؟ اپنے محبوب سے ملاقات بھی ماتم یا غمی کی بات ہے محبوب سے ملانے والا یہ ذریعہ تو محبت کرنے کی چیز ہے، تحفہ کی چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں اس پر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑی اچھی زندگی گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوگیا۔ اشکباری اور غم تو اس کی جدائی کا کرتے ہیں کہ عزیز ہم سے چھن گیا، اس سے ہم جو فائدہ اٹھا رہے تھے، جو آرام پا رہے تھے وہ منقطع ہوگیا، اس سے محروم ہوگئے۔ اپنے نفع کے لئے رونا تو خود غرضی کا رونا ہے، موت پر رونا نہیں ہے۔

بہرحال ولادت بھی خوشی کا موقع ہے اور موت بھی خوشی کا مقام۔ اسی لئے قرآن کریم کا آغاز بھی خوشی کی چیز ہے اور جب اس سے فارغ ہو جائے، اس کا حافظ وعالم ہوجائے وہ بھی خوشی منانے کا موقع ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ آغاز پر جو خوشی ملتی ہے وہ توقعات پر ملتی ہے، کیونکہ آغاز کے وقت یہ توقع باندھتے ہیں کہ بچہ پڑھے گا، لکھے

---

① کنز العمال، حرف المیم، ص: ۱۷۰. علامہ عجلونیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الدیلمی عن جابر بزیادۃ: رالدرھم والدینار مع المنافق وھمازا دہ الی النار... دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰.

② لباب الحدیث للامام السیوطی، ج: ۱، ص: ۳۴. یہ حضرت حبان بن الاسود کا قول ہے۔

گا، حافظ وعالم بنے گا۔ تو آغاز کی خوشی، توقع کی خوشی ہے اور فراغت وانتہا کی خوشی، کمال پر ہوتی ہے کہ ابتداء میں جو امید باندھی گئی تھی وہ پوری ہوگئی، مراد حاصل ہوگئی۔ بچے کی پیدائش کی خوشی بھی توقعات کی خوشی ہے کہ پلے گا، بڑھے گا، جوان ہوگا، عالم فاضل بنے گا، صناع وکاریگر بنے گا۔ یہ سب توقعات ہی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی زندگی حسب توقعات کامیاب گزار کر سلامتیٔ ایمان کے ساتھ موت کی سرحد پار کر جاتا ہے، تو بھی خوشی ہوتی ہے۔ گو زندگی بھر کا ساتھ چھوٹ جانے اور بچھڑ جانے کے غم سے آدمی اشکبار بھی ہوتا ہے اور یہ اشکباری اور رونا دھونا موت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ موت تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ تو خوشی کی چیز ہوئی۔

علامتِ ولایت تمنائے موت...... بلکہ خوشی کی چیز سے بھی بڑھ کر ولایت کی علامت ہے، کیونکہ دل میں موت کی محبت ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔ اسی لئے جب یہود نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے (اولیاء اللہ) ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو اور دیگر لوگوں کی نسبت اللہ کے زیادہ چہیتے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ: ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ① معلوم ہوا موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے اور ظاہر بات ہے کہ ولایت موجود ہوگی تو موت کی تمنا میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ حدیث شریف میں تو ایک دعا کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ملتا ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ② "اے اللہ! جو شخص میری رسالت کو مانتا ہو اور اس کا اقرار کرتا ہو اس کے لئے موت کو محبوب بنادے"۔ (اٰمِیْن ثُمَّ اٰمِیْن بِجَاهِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِیْمُ)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں موت کی محبت اور تمنا کا ارشاد ہے۔ اس سے دل میں طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں تو موت کی تمنا کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ" ③ "تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے"۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: "اِنَّا نَكْرَهُ الْمَوْتَ" کہ ہم موت کو ناپسند کرتے تھے۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ تمنا بھی فرما رہے ہیں، دعا بھی کر رہے ہیں اور تمنا سے منع بھی فرما رہے ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ دنیوی شدائد ومصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے اور جس کے دل میں اللہ کی محبت اور اس سے ملاقات کا ولولہ اور اشتیاق ہے، اس کے لئے تمنائے موت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان الگ الگ چیزوں کی وجہ

---

① پارہ ۲۸ :سورة الجمعة، الآیة: ۶۔ ② المعجم الکبیر للطبرانی، باب الحاء، شریح بن عبید الحضرمی عن ابی مالک، ج:۳ ص:۲۷۸۔ علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ محمد بن اسماعیل بن عیاش وھو ضعیف دیکھئے: مجمع الزوائد، ج:۱۰ ص:۳۰۹۔

③ الصحیح للبخاری، کتاب المرضیٰ، باب تمنی المریض الموت ج:۱۷ ص:۴۲۳، رقم: ۵۲۴۱۔

سے مضامین احادیث بھی مختلف ہیں، ان میں باہم کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔ غرض جس طرح ولادت خوشی کی چیز ہے، موت بھی خوشی کی چیز ہے۔

ابن قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریبِ مسرت...... تو جو بھی قرآن کریم کا آغاز کر رہے ہیں، ان کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر اور کوئی تقریب کیا ہوسکتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کی تقریبات کا جو انداز تھا اور کون سی تقریب ان کی نظروں میں اہم تھی، اس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ میرے جدِ محترم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ نے غالباً اپنی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب اس طرح کی کہ چپ چپاتے مسجد میں خود نکاح پڑھایا اور گھر آ کر لڑکے سے کہا: یہ تمہاری دلہن ہے، اسے لے جاؤ۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہیں تھا، سب حیران تھے۔ لیکن میرے والد محترم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ جب میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تو بڑی دھوم دھام کی شاہانہ دعوت کی۔ جب سب لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے اور رخصت ہوگئے تو تنہائی میں مجھ سے فرمایا: میاں احمد! تم حافظ بھی ہوگئے، تمہاری عزت افزائی بھی ہوگئی، دعوت بھی ایسی دوبارہ نہ ہوگی۔ یہ سب کچھ میں نے تمہارے لئے کیا۔ لیکن یہ قرآن میں نے تم کو اپنے لئے پڑھایا ہے (تاکہ آخرت میں یہ میرے کام آئے) اس لئے والدِ محترم کا یہ معمول تھا کہ دو پارے روزانہ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے لئے تلاوت فرماتے تھے۔

بہرحال قرآن کریم کا آغاز بھی مبارک اور انجام بھی مبارک۔ آج افتتاح ہے۔ اس تقریب سے بڑھ کر کوئی تقریب نہیں۔ نہ اس خوشی سے بڑھ کر کوئی خوشی ہے۔ تقریبات تو شادیوں اور پیدائشوں کی بھی ہوتی ہیں، مگر اصل تقریب افتتاحِ قرآن ہی کی ہے۔ جس کا افتتاح بھی مبارک، انجام بھی مبارک، ایسے موقع وتقریب کی مبارکباد دینا بھی مبارک۔ تو ہماری حاضری آپ کو مبارکباد دینے کے لئے ہوئی ہے۔ آپ حضرات بہترین کام کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ حق تعالیٰ اس کا انجام، اس کی انتہا بھی بہترین فرمائے، جس طرح اس کا آغاز بہترین فرمایا ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی برکات کا حصہ مقرر فرمائے اور آخرت میں بھی۔

اَللّٰھُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتَنَا فِیْ قُبُوْرِنَا ، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ ،وَاجْعَلْہُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً ،اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنَامِنْہُ مَا نَسِیْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْہُ مَاجَھِلْنَا ، وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَہٗ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَاٰنَآءَ النَّھَارِ وَاجْعَلْہُ لَنَا حُجَّۃً یَّارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ. اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ رِضَاءَ قَلْبِیْ وَجِلَآءَ حُزْنِیْ ، فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا ، وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ اَللّٰھُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِیْنَ،غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ.وَصَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِخَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ،بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ.

اقسامِ نعمت...... بزرگانِ محترم! اس دنیا میں حق تعالیٰ شانہ کی نعمتیں اس درجہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ رحمتوں کی ایک بارش ہے، جیسے بارش کے قطرات کو آپ گننا چاہیں تو ساری دنیا کے انسان مل کر سعی کریں کہ آسمان سے کتنے قطرے ٹپکے ہیں۔ تو یہ آپ کے قبضے میں نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اللہ کی رحمتوں کی بارش دنیا پر ہے۔ اگر کوئی انسان گننا چاہے تو ان کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کر سکے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے دعویٰ فرمایا کہ: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا﴾ ② اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تم انکا احاطہ نہیں کر سکتے، گن نہیں سکتے، آسمان کے ستاروں کا گننا ممکن ہے، بارش کے قطروں کا گن لینا ممکن ہے لیکن اللہ کی رحمتوں کا گن لینا، یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھا جائے تو اصولی طور پر دو قسم کی نعمتیں ہیں، ان دو قسموں میں پھر کروڑوں اور اربوں نعمتیں ہیں مگر قسمیں دو ہیں۔ ایک ظاہری نعمتیں ہیں اور ایک باطنی نعمتیں ہیں۔ ایک نعمتیں وہ ہیں جن کو ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، ہمارے بدن کو لگ (چھو) سکتی ہیں، ایک نعمتیں وہ ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ بدن سے بظاہر انکی ٹکر بھی نہیں لگتی (چھو کر نہیں گزرتی)، لیکن عجیب نعمتیں ہیں، جن کو انسان اپنے ضمیر میں محفوظ کرتا ہے۔

ظاہری نعمت...... نعمتوں کے درجے میں سورج بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس سے روشنی چھن رہی ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے، وہ نہ ہوتو ہم کام کاج نہیں کر سکتے، اس سے جو گرمی برس رہی ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے، وہ نہ ہوتو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ غذائیں انسان کو اللہ نے لاکھوں دیں۔ ترکیبیں بتلا دیں کہ مختلف انداز سے جوڑ توڑ

① پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ:۱۰۷. ② پارہ:۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۳۴.

کر کے انسان نئی نئی غذائیں نکال لیتا ہے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔لباس مستقل نعمت ہے۔گھر دیا گیا یہ مستقل نعمت ہے۔غرض کھیتی باڑی، باغ، زمین، کھانا پینا وغیرہ یہ سب نعمتیں ہیں اور ان میں بھی اتنی قسمیں ہیں کہ انسان گننے لگے تو ان کا گننا ناممکن ہے۔ ہر وقت آدمی ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، پھل فروٹ ہے یہ ایک نعمت کا دائرہ ہے، ہزاروں پھلوں کی قسمیں ہیں۔ غلے ہیں تو ہزاروں قسم کے غلے ہیں، کہیں چنا، کہیں چاول اور گیہوں۔غرض کھانے پینے، رہنے سہنے اور استعمال کی بے شمار نعمتیں ہیں۔اور یہ وہ نعمتیں ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔یہ ہمارے ہاتھوں اور بدن کو لگتی (چھوتی) ہیں انکا ہم احساس کرتے ہیں۔ان کو ظاہری نعمتیں کہا جائے گا۔

باطنی نعمت......ایک باطنی نعمتوں کی قسم ہے، جن کو دل محسوس کرتا ہے آنکھوں سے نظر نہیں آتی، جیسے علم اور معرفتِ خداوندی ہے۔علم دل کے اندر بھر جانا، یہ ایسی چیز تو نہیں کہ آدمی اسے پکڑ کر جیب میں رکھ لے علم ظاہری چیز نہیں ہے، وہ بدن سے نہیں ٹکراتی، وہ دل سے دل میں آتی ہے۔آدمی جانتا ہے کہ نعمت ہے لیکن آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ محبت خداوندی ہے، یہ عظیم نعمت ہے۔اپنے پروردگار سے محبت نہ ہو تو ایمان ہی نصیب نہیں ہوتا۔لیکن محبت کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔اسلام تو آنکھوں سے نظر آسکتا ہے،اس لئے کہ اسلام کے معنی ظاہری عمل کے ہیں۔نماز پڑھی، روزہ رکھا، حج کیا، زکوۃ دی۔نماز پڑھنے والے کو دیکھ کر ہر ایک کہے گا کہ: یہ نماز پڑھ رہا ہے، حج کرنے والے کو دیکھ کر کہے گا کہ حج کر رہا ہے، لیکن ایمان دل میں چھپا رہتا ہے، اسے آدمی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر ہر دل جانتا ہے کہ اس میں ایمان ہے۔تو ایمان بھی ایک نعمت، محبتِ خداوندی بھی ایک نعمت، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، یہ عظیم نعمت ہے، ایمان کی بنیاد ہے۔اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت نہ ہو، ایمان ہی نصیب نہیں ہوسکتا۔

امتحانِ محبّ، نعمت میں نہیں مصیبت میں ہوتا ہے......اسی واسطے حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''لَايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ'' ①
''تم اس وقت تک مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنی اولاد اور ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کے کسی سامان سے ہو''۔

جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوگی آدمی مؤمن نہیں بنے گا۔اس محبت کا ظہور کب ہوتا ہے، جب خدا اور رسول کی محبت کا دوسری محبتوں سے مقابلہ پڑے۔آدمی سو رہا ہے، اسے محبت اس سے ہے کہ میٹھی نیند آرہی ہے، نہ اُٹھوں۔مسجد میں اذان ہوتی ہے کہ آؤ مسجد میں اس وقت امتحان ہوگا کہ نفس سے زیادہ محبت ہے یا خدا سے زیادہ محبت ہے۔اگر لحاف کو اتار پھینکا، گرم ٹھنڈے کی پرواہ نہ کی، وضو کیا اور مسجد میں حاضر ہو گیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اپنے خدا کو اختیار کر لیا۔گویا یہ امتحان کا موقع ہوتا ہے۔اللہ کے راستہ میں جانا ہے، اولاد کی محبت چاہتی ہے کہ

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب حب الرسول صلى الله عليه و آله وسلم من الايمان، ج: ۱ ص: ۲۳.

نہ جاؤں ان کو چھوڑ کے، خدااور رسول کی محبت چاہتی ہے کہ چلا جاؤں۔ اگر چلا گیا تو محبت میں کامیاب ہے، اللہ و رسول کی محبت اولاد کی محبت پر غالب آ گئی۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ (زَادَهَا اللهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) کی طرف ہجرت فرمائی ہے تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بار اور بال بچے مکہ ہی میں تھے، جائیدادیں مکہ ہی میں تھیں، عزیز واقرباء مکہ میں تھے لیکن سب کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیئے۔ نہ جائیداد کی پرواہ کی نہ اولاد کی اور نہ بنیاد کی۔ تو یہ کہا جائے گا کہ یہ محبت میں کامیاب ہو گئے، امتحان میں پاس ہو گئے۔ جب خدااور رسول کی محبت کا اولاد و بنیاد کی محبت سے مقابلہ پڑا، انہوں نے اولاد و بنیاد کو چھوڑ دیا اور اللہ و رسول کا راستہ اختیار کیا۔ یہ مطلب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ میرے ساتھ اتنی محبت ہو کہ نہ اتنی اولاد سے ہو، نہ ماں باپ سے ہو اور نہ دنیا کی کسی چیز سے ہو ورنہ مؤمن نہیں بن سکتا۔ تو وہ محبت ہے جو مقابلہ کے وقت غالب آ جائے۔ یوں تو ہر شخص کہتا ہے کہ: مجھے اللہ سے محبت ہے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن جب دنیا کی محبت کا مقابلہ اللہ کی محبت سے پڑ جائے اس وقت کہے کہ ہاں مجھے محبت ہے اس وقت کہا جائے گا کہ ہاں واقعی محبت والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: سوچ کر کہو کیا کہتے ہو، عرض کیا: یارسول اللہ! آپ سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا: دیکھو بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو سمجھ کے کہو، کیا بات ہے؟ عرض کیا: آپ سے محبت ہے۔ فرمایا: اگر محبت ہے تو تیار ہو جاؤ فقر و فاقہ کے لئے، تنگیاں اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے کیلئے۔ یعنی ان تمام مواقع میں بھی محبت باقی رہی تب یہ دعویٰ سچا ہوگا کہ واقعی اللہ و رسول سے محبت ہے۔ عیش و آرام کے اندر ہر شخص کہتا ہے کہ یا اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے، آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! لیکن سب کچھ چھن جائے پھر بھی کہے: آپ میرے رب اور میں آپ کا بندہ! تب کہا جائے گا سچا بندہ یہی ہے۔ نعمتوں میں رہ کر بندگی کا اعلان کرنا، یہ آسان ہے۔ مصیبت میں رہ کر محبت اور بندگی کا اعلان کرنا، یہ مشکل ہے اور یہی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی شاعر نے کہا تھا کہ

دلا! اندر جہاں یاراں سہ قسم اند ــــــ زبانیاند و نانیاند وجانی

اے دل زمانے میں دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ یعنی آدمی جب دوستی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے پرکھا بھی جاتا ہے کہ دوستی میں سچا بھی ہے یا نہیں۔ تو شاعر نے کہا دوستوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک زبانی، جو زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، کہ ہم آپ کے دوست ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ و بہی خواہ ہیں۔ ایک نانی ہیں، روٹی کے دوست ہیں۔ یعنی جب تک دستر خوان پر چکنا کھانا مل رہا ہے، ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور ایک دوست وہ ہیں جو جگری دوست ہیں کہ دوست راحت میں ہو تب بھی ساتھ، مصیبت میں ہو تو کہیں گے: پہلے ہم مصیبت جھیلیں گے، بعد میں تمہارے اوپر آئے گی۔ یہ جانی دوست کہلاتا ہے۔ تو ایک زبانی جمع خرچ، ایک روٹی کی دوستی اور ایک جگر کی

دوستی۔اس شاعر نے کہا ہے کہ تینوں کے تین ہی طریقے ہیں۔جو زبانی دوست ہیں،ان کے بارے میں کہتا ہے کہ ؎

بنانی نان بدہ از در بدر کن ــــــ تلطف کن بیارانِ زبانی
ولیکن یارِ جانی را بدست آر ــــــ مدارائش بگیری تاتوانی

یہ جو روٹی کے دوست ہیں،انہیں کچھ کھلا پلا دواور اس کے بعد رخصت کرو۔ان کو دوست مت سمجھو،وہ آئے تھے،ان کو ٹکڑا مل گیا،بس ٹھیک ہے۔اور جو زبان سے کہتے ہیں کہ جناب کے دوست ہیں،تم بھی زبان سے کہہ دو جناب کا بہت بہت شکریہ! ہم بھی تمہارے دوست ہیں۔نہ حقیقی معنی میں وہ دوست،نہ حقیقی معنی میں تم دوست۔وہ زبان کی بات ہے۔زبان سے وہ خوش کرنا چاہتے ہیں،تم بھی زبان سے خوش کردو مگر اعتماد مت کرو،وہ دوست نہیں ہے۔

وہ جیسے کسی شاعر کا واقعہ ہے،وہ کسی امیر کے ہاں گئے تھے،اس نے قصیدہ لکھا اور امیر کی بڑی تعریف کی کہ آپ ایسے اور ایسے۔شاعری میں آدمی سچ کم بولتا ہے،جھوٹ زیادہ بولتا ہے۔شعر اچھا ہوتا ہی وہ ہے جس میں غلط بیانی زیادہ ہو اور جو سیدھی سیدھی بات کہہ دے،اس سے کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔تو مبالغہ اور بہت حد سے گزر کر بات کرنا، یہی ہوتا ہے۔شاعر حضرات خفا نہ ہوں، کبھی کبھی میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں، مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔تو شعر کہتے ہی اسے ہیں جس میں آدمی سچ کم بولے، جھوٹ زیادہ بولے۔تو اس شاعر نے قصیدہ لکھا،اس میں ایران توران کی ہانکی، آپ کی سلطنت تو ایسی ہے کہ آپ کے تخت کا پایہ آسمان پہ رکھا ہوا ہے اور آپ کے حسن وجمال کے آگے چاند بھی شرما رہا ہے اور ستارے بھی شرمندہ ہیں کہ ہمیں وہ حسن وجمال نصیب نہ ہوا، جو ان نواب صاحب کو نصیب ہے۔جب وہ قصیدہ پڑھ چکے، امیر نے کہا کہ: پرسوں کو آنا، دو ہزار روپیہ تمہیں (انعام) دیں گے، یہ بہت خوش ہو کر واپس ہوئے۔ چونکہ بڑے آدمی نے وعدہ کیا تھا تو یقین بھی پورا تھا، آ کے پانچ سو روپے قرض بھی لے لیا اور بڑا عمدہ اچکن بھی بنوایا، گھر میں مرغا اور بکرا بھی پک رہا ہے۔اس نے کہا پرسوں تو دو ہزار روپے مل ہی جائیں گے، پانچ سو کا قرض ادا کر دیں گے، ڈیڑھ ہزار بچ جائے گا، بہت بڑی رقم ہوگی۔تو خوش خوش گھر میں چاندنا، کھانا اور پینا وغیرہ وغیرہ۔ پرسوں وہ پہنچے، وہ امیر بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے جا کر سلام کیا، انہوں نے جواب بھی نہیں دیا، سرے سے گردن ہی نہ اٹھائی۔ بہت دیر کھڑے رہے، آخر انہوں نے کچھ کھنکار کے کہا: حضور! میں حاضر ہوں، انہوں نے کہا: کون ہیں؟ حضرت! میں وہی شاعر ہوں جو آپ کی تعریف میں قصیدہ لکھ کے لایا تھا اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں آنا، دو ہزار دوں گا۔ کہنے لگے: تم بڑے بے وقوف آدمی ہو، بھئی! تم نے ہمیں لفظوں سے خوش کیا ہے، معنی کچھ نہیں تھے۔ہم نے بھی لفظوں سے خوش کر دیا معنی کچھ نہیں تھے۔نہ ان اشعار کے معنی تھے، نہ اس وعدہ کے معنی تھے۔

تو حقیقت یہ ہے کہ جو زبانی جمع خرچ کے دوست ہیں آپ بھی ان کے ساتھ زبانی جمع خرچ کر دیں، مگر

اصل دوست وہ ہے جو سچا دوست ہو اور مصیبت کے وقت کام آئے

دوست آن باشد کہ گیرد دستِ دوست — در پریشان حالی ودر ماندگی

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دوست وہ ہے جو پریشان حالی میں آکر دوست کا ہاتھ پکڑے۔ مگر ہاتھ پکڑنے کے وہ معنی نہیں، جیسے ایک صاحب نے پکڑے تھے۔ ان کے بھی ایک دوست تھے، انہیں اتفاق سے دشمنوں نے گھیر کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا، انہوں نے جلدی سے جا کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے، اب وہ غریب رُکا ہوا ہے، آخر اس نے کہا کم بخت! کیا کر رہا ہے؟ میں پٹ رہا ہوں، میرے ہاتھ چھوڑ دے، میں بھی تو مقابلہ کروں، انہوں نے کہا: نہیں، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ: دوست وہ ہے جو مصیبت میں دوست کا ہاتھ پکڑے، میں نے بھی آکے ہاتھ پکڑ لئے، اب وہ غریب اچھی طرح سے پٹ رہا ہے۔ تو یہ معنی ہاتھ پکڑنے کے نہیں ہیں، ہاتھ پکڑنے کے معنی مدد کرنے کے ہیں، کہ جب دوست پریشانی میں مبتلا ہو مدد کرے۔

تو جب دنیا کی دوستی میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ آڑے وقت میں آدمی دعوے کو سچا کر کے دکھائے کہ میں دوست ہوں تو دین کے معاملہ میں تو اور بھی زیادہ امتحان کی ضرورت ہے، جب اللہ کو یوں کہے کہ میں آپ کا دوست ہوں تو اگر حق تعالیٰ کوئی مصیبت ڈالیں، جب بھی یوں کہے کہ میں آپ کا نیاز مند، غلام اور بندہ ہوں۔ تب کہا جائے گا کہ یہ سچا بندہ ہے۔ ورنہ نعمتیں برس رہی ہیں، اس میں کہے کہ میں بندہ ہوں یہ نہیں، نعمت چھن جائے اور پھر کہے کہ ویسا ہی بندہ ہوں جیسا پہلے تھا، جس حال میں آپ رکھیں میں خوش ہوں۔ تب کہا جائے گا کہ: یہ سچا بندہ ہے۔ تو محبتِ خداوندی ایک بڑی نعمت ہے، ایمان بھی نعمت، علم اور معرفت بھی نعمت، مگر یہ سب نعمتیں باطنی نعمتیں کہلاتی ہیں، جن کا قلب سے تعلق ہے۔ علم، ایمان اور محبت روٹی کی طرح سے نہیں ہیں کہ رکابی میں رکھ کر پیش کر دیئے جائیں، یہ قلبی دولت ہے۔ تو نعمت کی دو قسمیں ہو گئیں، ایک مادی نعمت جو آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ ایک روحانی نعمت ہے، جس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی مگر دل پہچانتا ہے کہ یہ نعمت ہے۔

اعلیٰ ترین نعمت اور حاصلِ کائنات...... ان تمام معنوی نعمتوں میں اعلیٰ ترین نعمت درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، جس کو اللہ نے بطور نعمت کے دنیا میں بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات بابرکات کے طفیل علم نصیب ہوا اور ایمان نصیب ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات بابرکات کی جوتیوں کے صدقے بندے کو اللہ کی محبت نصیب ہوئی، جس سے انسانوں نے اپنے خدا کو پہچانا، اپنی زندگیوں کے مقاصد کو جانا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طفیل ہے۔ اگر دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے، یہ عالم ظاہر نہ کیا جاتا، جیسے ایک حدیث میں ہے، گو وہ حدیث ضعیف ہے مگر معنی کے لحاظ سے وہ مقبول ہے۔ ابن کثیر المکی رحمۃ اللہ علیہ نے ''البدایۃ والنہایۃ'' میں یہ حدیث نکالی ہے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ جب ان کو پیدا کیا گیا اور ان میں روح ڈالی گئی تو سب سے پہلے ان کی نگاہ عرش کے اوپر پڑی، دیکھا کہ عرش کے پائے کے اوپر

لکھا ہوا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ.

آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ: یہ محمد رسول اللہ کون ہیں؟ فرمایا: تیری اولاد میں سے ہیں۔ میرے آخری اور سب سے بڑے پیغمبر یہی ہیں۔ اور اے آدم! اگر مجھے ان کا پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا، تجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ ان کو دنیا کے اندر لانا ہے۔ ① تو ساری کائنات کا پھل درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ایک درخت لگائیں، دس برس اس کے اوپر محنت کریں، پانی دے رہے ہیں، دھوپ اور پالے سے بچا رہے ہیں پھر جا کے وہ تیار ہوا۔ کیوں آپ نے یہ درخت لگایا کیوں اس پر اتنی محنت کی، اس لئے کہ اس پر پھل آ جائے۔ اگر اس نے پھل دے دیا تو آپ کہیں گے محنت وصول ہوگئی۔ پھل نہ دیا تو کہیں گے محنت اکارت ہوگئی، ضائع ہوگئی۔ تو درخت سے مقصود پھل ہوتا ہے۔ پھل آ گیا تو سمجھو کہ درخت کے لگانے کا مقصود حاصل ہوگیا۔ یہ پوری کائنات ایک درخت ہے، اس کے مالک نے اس کو چھ ہزار برس میں بنایا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ ② ”تیرے پروردگار نے اس زمین و آسمان کی کائنات کو چھ دن میں بنایا“۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ③ ”اللہ کے ہاں کا ایک دن تمہارے ہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے“۔ تو چھ دن میں بنانے کا یہ مطلب نکلا کہ چھ ہزار سال میں یہ کائنات تدریجی طور پر تیار ہوئی۔ اور وہ چھ دن ہفتے کے ہیں۔ یک شنبہ (اتوار) سے گویا کائنات شروع ہوئی ہے اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ ہفتہ کا دن فارغ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ دن چوبیس گھنٹے کا ہے لیکن اللہ کے ہاں یہ ایک سال کے برابر ہے۔ آخری دن جمعہ کا تھا، اس کی آخری ساعت میں جو غروبِ آفتاب کے ساتھ کا گھنٹہ ہے، آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ گویا چھ ہزار سال میں دنیا بنی اور اس میں آخری مخلوق جو ہے، وہ آدم علیہ السلام ہیں۔ اس لئے کہ آدم ہی کے لئے یہ ساری کائنات بنائی گئی، زمین، آسمان، چاند، ستارے سب اس لئے ہیں کہ آدم اس میں گزر بسر کر سکے۔ آسمان کی چھت ڈال دی، زمین کا فرش بچھا دیا، ستاروں کے قمقمے لٹکا دیئے، دریاؤں میں پانی رکھ دیا، زمین میں اُگانے کی صلاحیت رکھی، چوپائے اور جانور پیدا کیے جو انسان کے کام آئیں۔ جب مہمان کو بلاتے ہیں تو پہلے سامان سب مرتب کر دیتے ہیں، مکان، بستر، پلنگ، ملازم، کھانے کا سامان وغیرہ، تاکہ مہمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو آدم علیہ السلام کو لانا تھا، اس لئے پہلے گھر بنایا اور ساری چیزیں تیار کیں۔ جب دنیا مکمل ہوگئی تو آخیر ساعت میں آدم علیہ السلام کو لائے۔ گویا آدم ساری کائنات کا ایک شجرہ ہے۔ جیسے آپ نسب نامے کا شجرہ بناتے ہیں کہ باپ کا نام لکھا، انکے چار بیٹے، تو چار شاخیں نکلیں، پھر آگے اور شاخیں نکلیں، پھر آگے اور شاخیں نکلیں۔ اس کو نسب کا شجرہ کہتے ہیں۔ کائنات کے شجرہ

① البداية والنهاية لابن كثير، قال البيهقي: تفرد به عبدالرحمن بن زيد بن اسلم من هذا لوجه وهو ضعيف والله اعلم ج: ۱، ص: ۹۱. ② پاره: ۸، سورة الاعراف، الآية: ۵۴. ③ پاره: ۱۷، سورة الحج، الآية: ۴۷.

درخت کا پھل حضرت آدم ہیں۔ اور آدم کا جو شجرہ ہے اس میں آخری پھل جو مقصودِ اصلی ہے وہ جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو ساری کائنات کا مقصودِ اصلی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نکل آئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لانا تھا اس لئے یہ سارا قصہ کیا گیا۔

مقصدِ کائنات عبدیتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے...... اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں لائے گئے۔ اس واسطے کہ کائنات کو بنانے کا مقصد انسان کو لانا ہے اور انسان کا مقصد عبادت ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو یاد کرے۔ تو عبادت کے لئے یہ سارا قصہ کیا گیا، تا کہ اللہ کے آگے نیاز مندی، اس کے سامنے جھکنا اور گڑگڑانا ہو۔ اور آدم اور اس کی اولاد میں سب سے زیادہ مکمل عبادت، سب سے زیادہ اعلیٰ ترین عبادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کوئی عابد نہ پیدا ہوا اور نہ آئندہ پیدا ہوگا۔ آپ کی ذات کے اوپر مراتب عبادت ختم ہیں۔ بندگی اور عبودیت کی جتنی شاخیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائیں اتنی عالَم میں کسی نے نہیں دکھائیں۔ یوں کہنا چاہئے: جیسے اللہ معبودیت میں وحدہٗ لاشریک ہے، معبودیت میں اس کی کوئی نظیر نہیں، وہ یکتا معبود ہے۔ عبدیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحدہ لاشریک ہیں، عبدیت میں کوئی آپ کی نظیر نہیں ہے۔ اللہ کے آگے جتنی مکمل عبدیت اور بندگی آپ نے پیش کی ہے عالَم میں کسی نے نہیں پیش کی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''کَانَ یَذْکُرُ اللہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ.'' ① آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے خالی نہیں تھا۔ ''کَانَ دَآئِمَ الْفِکْرَۃِ حَزِیْنًا'' ② کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آخرت کا غم طاری نہ ہو، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غم میں ڈوبا ہوا ہے اور فکر میں مبتلا ہے۔ یہ کیفیت تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرتے: یارسول اللہ! آپ تو وقت سے پہلے بوڑھے ہوگئے، تو تیں آپ کی بڑی عظیم تھیں، فرمایا: ''شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَالْوَاقِعَۃُ'' ③ مجھے سورۂ ہود اور سورۂ واقعہ وغیرہ نے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت کے ہولناک مناظر بیان کئے گئے ہیں۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر مجھ پر بڑھاپا طاری ہوگیا۔ تو کوئی لمحہ آخرت کی فکر سے خالی نہیں تھا، کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں تھا۔ قدم قدم کے اوپر اطاعت، ذکر اور عبادت ہے۔ تو عبادت کو جس مکمل طریق پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نے پیش کیا ہے گویا وہ عبادت مقصود تھی، وہ عبادت نمایاں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے تو کائنات کا مقصد پورا ہوگیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد پھر اس امت کی عبادتیں درکار ہیں، کہ یہ نبی کے نمونے پر چل کر اس نمونے کا

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب تقضی الحائض ...... ج: ۲، ص: ۴.

② الشمائل للترمذی، باب کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم متواصل الاحزان: ص: ۱۱۹.

③ الترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ الواقعۃ، ج: ۱۱، ص: ۱۰۶. امام ترمذی نے اس کو حسن غریب کہا ہے اور علامہ البانی نے اس پر تحقیق فرما کر اس کو صحیح فرمایا ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن الترمذی ج: ۷ رقم: ۳۲۹۷.

پیغام دنیا کی اقوام کو پہنچادیں۔ ورنہ مقصد تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پورا ہوگیا۔ اسی واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ'' ① میں اور قیامت اس طرح سے ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں، کہ میں ذرا آگے نکل آیا ہوں، قیامت پیچھے دوڑتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ اس لئے کہ جب کائنات کا مقصد پورا ہوگیا تو اب اس کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جب درخت پھل دے کر فارغ ہو جائے اور آئندہ ایسا پھل بھی آنے والا نہیں پھر اسے کاٹ کے جلادیتے ہیں کہ مقصد پورا ہوگیا۔ وہ پھل تھا جو ہم نے کھالیا، تو اصل پھل آگیا، مقصد پورا ہوگیا۔ اب کائنات کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

فرمایا کہ قیامت کی ہزاروں علامتیں ہیں۔ سب سے پہلی علامت دنیا میں میرا آنا ہے۔ سمجھو کہ دنیا کے خاتمے کا وقت قریب ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے برپا کرنے کا مقصد میرے آنے سے پورا ہوگیا۔ اب جب مقصد آگیا تو اب دنیا کے باقی رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دنیا اس لئے باقی رہے گی کہ میرا پیغام پوری دنیا تک پہنچ جائے۔ اور امت نمونہ بن کر دکھلائے کہ یہ ہے عبادت کا نمونہ، جس کے لئے دنیا قائم کی گئی۔ تو جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سب سے بڑی نعمت ہے اور نعمتوں کی جڑ و بنیاد ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالَم کے لئے رحمت ہیں۔ پوری دنیا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا سبق دیا۔

اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے...... بعض غیر مسلموں نے یہاں مجھ سے سوال کیا کہ اسلام نے ہمیں نئی چیز کیا دی، جو ہم اسلام قبول کریں۔ ہم تو اپنے اپنے مذہب پر چل رہے ہیں۔ میں نے کہا: اسلام کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا، جو کل انبیاء علیہم السلام کا دین ہے، وہی دین، اسلام لے کر آیا ہے۔ یہی اسلام ہے جو سارے انبیاء کا مذہب اور دین رہا ہے۔ یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی لے کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام انبیاء کا دین اسلام بتلایا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، ایک جگہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ'' کہا میں مسلم بن گیا، فرمایا: اگر بن گئے ہو تو اعلان کرو: ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ''اے ابراہیم کہہ دو! میری نماز اور میرا حج، میرا مرنا اور جینا سب اللہ کے لئے ہے۔ مجھے اسی کا امر کیا گیا ہے اور میں (آج کے دور میں) اول مسلم ہوں''۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی طرف اسلام منسوب کیا گیا کہ وہ بھی مسلم تھے اور اسلام ہی لے کر دنیا میں تشریف لائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ ③ ''اے میرے پروردگار! مجھے مسلم بنا کر وفات دیجیے کہ مرتے دم تک میں اسلام پہ قائم رہوں''۔ یوسف علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہی ثابت ہوا۔ ابراہیم علیہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب بعثت انا والساعة......، ج: ۲، ص: ۱۵۹.

② پارہ: ۱، سورہ البقرة، الآیة: ۱۳۱. ③ پارہ: ۱۳، سورة یوسف، الآیة: ۱۰۱.

السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، فرمایا: ﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۔ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ① کہ اے بیٹو! تمہارے لئے اللہ نے ایک دین پسند اور منتخب کیا ہے، سوتم مرنا بھی تو اسلام ہی کے اوپر مرنا، یہی تمہارا دین ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا دین بھی اسلام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا دین بھی اسلام ہے، جو خود قرآن نے نقل کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا کہ: ﴿وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ ② اے مسیح! آپ گواہ رہیں، ہم سب مسلمان ہیں۔ تو دین عیسوی بھی اسلام ہے۔ سلیمان علیہ السلام پر بلقیس جیسی ملکہ ایمان لائی تو کہتی ہے: ﴿اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ③ میں اس سے پہلے گناہگار تھی مگر اب میں اسلام لاتی ہوں سلیمان کے ہاتھ پر۔ تو سلیمان علیہ السلام کا دین بھی اسلام ہے۔ غرض کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہے جس کی طرف اسلام منسوب نہیں کیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسلام لے کر آئے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ④ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ تو میں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے، جو سارے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے وہی دین ہے۔ نئی چیز کیا ہے؟

تکمیلِ دین ایک مستقل نعمت ہے...... ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ⑤ میں نے دین کو مکمل نقشے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تو دین نیا نہیں ہے بلکہ تکمیل دین ہے کہ دین کے ہر ہر جز، ہر ہر اصول وفروع کو آپ نے اتنا مکمل کر دیا ہے کہ اب اس میں کمی زیادتی کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ گویا دین، اسلام ہی چل رہا تھا، شریعتیں آ رہی تھیں۔ اس میں اضافے ہو رہے تھے، کمی بھی ہو رہی تھی، احکام منسوخ بھی ہوتے تھے، نئی نبوّت آ کر نیا پروگرام دیتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پروگرام دیا وہ اتنا مکمّل ہے کہ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ تو یہ تکمیل دین ہے، دین نیا لے کر نہیں آئے، دین وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے، شریعت مکمل لے کر آئے، جو پروگرام کہلاتا ہے، وہ نیا اور مکمل لے کر آئے۔ اب اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جب کوئی بچہ پیدا ہو آپ اسے جو کُرتہ پہنائیں گے، وہ بالشت بھر کا ہوگا لیکن اس کے بعد جب وہ چھ مہینے کا ہوگا تو کرتہ ڈیڑھ بالشت کا ہوگا، اس کے بعد جب وہ آٹھ برس کا ہوا تو گز بھر کا کرتہ پہنے گا۔ بچہ تو وہی ہے بعینہٖ، جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، آٹھ برس پہلے بھی وہی تھا، چار برس پہلے بھی وہی تھا۔ کرتے بدل رہے ہیں، اس کی پیائش بڑھ رہی ہے۔ بچہ وہی ہے۔ پھر چودہ برس کا ہوا تو سوا گز کا کرتہ ہو گیا اور جب تیس برس کا جوان ہو گیا جو نشو ونما کا انتہائی وقت ہے، اس وقت کرتے کی پیائش بالکل آخری اور مکمل ہو گئی۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۳۲ . ② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۲ . ③ پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۴۴.
④ پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۹ . ⑤ پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۳.

اب گھٹنے بڑھنے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اب گھٹنا بڑھنا ختم ہوگیا۔ جتنا قد و قامت ہونا تھا، وہ ہوگیا، اب جو کرتے کی پیمائش ہے، وہ مرتے دم تک ایک ہی رہے گی۔ اس میں اب کمی بیشی نہیں ہوگی۔

تو دین کو ایک بچے کی مانند سمجھو۔ آدم علیہ السلام جو دین لے کر آئے وہ بھی اسلام تھا، لیکن اس وقت یہ چھوٹا سا تھا، پیدا ہوا ہی تھا، اس کے لئے شریعت بھی چھوٹی رکھی گئی، بالشت بھر کا کرتہ اس کے لئے کافی تھا۔ عارضی طور پر وہ اس کے بدن کے اوپر پھب گیا۔ جوں جوں اسلام کا قد و قامت بڑھتا گیا شریعتیں یعنی کرتے بھی بڑھتے رہے۔ تو آدم علیہ السلام کے زمانے کی شریعت بہت مختصر اور معمولی سی تھی۔ حدیث میں ہے کہ ایک وقت کی نماز تھی اور وہ بھی مکمل صورت نہیں تھی، جواب اسلام میں ہے۔ بس اللہ کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو جاؤ، نیاز مندی سے کھڑے ہو جاؤ، یا اوندھے منہ لیٹ جاؤ، یہ کافی ہے۔ یہ قیام، رکوع، تشہد، قومہ، جلسہ اور یہ سجدہ، یہ چیزیں آدم علیہ السلام کی شریعت میں نہیں تھیں۔ جیسا دین اسلام تھا چھوٹا سا تھا، پیدائش ہی ابھی ہوئی تھی، ویسی ہی شریعت تھی۔ گویا لباس بھی اس کا چھوٹا تھا۔ جب اسلام کا قد و قامت بڑھا اور ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا، شریعت بھی ذرا پھیل گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، دین کا قد و قامت بڑھا تو شریعت کا لباس بھی وسیع ہوا اور فرمایا: ﴿وَتَفْصِيْلًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ ہم نے دین کے اندر بہت تفصیل کر دی۔ اور جب آخری زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آیا تو دین کا نشو و نما مکمل ہو کر جوان ہوگیا۔ اب جو شریعت کی پیمائش ہے اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔ یہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے جب کوئی تعلیم پائے اور دوسری شریعتوں کا شریعت اسلام سے موازنہ کرے، بالکل زمین و آسمان کا بیّن فرق معلوم ہوتا ہے کہ اور شریعتوں کے احکام معلوم ہوتے ہیں جیسے بچے ہیں اور شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جوان ہیں کہ ان کا قد و قامت مکمل ہے۔

توحید کی تکمیل ...... بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شریعت پیش فرمائی وہ دین کی تکمیل ہے، دین وہی ہے جو پہلے سے تھا مگر اس میں کمال پیدا ہو گیا۔ یعنی مثلاً توحید ہے، ہر نبی نے توحید کا عقیدہ سکھلایا، کسی نبی نے شرک کی تعلیم نہیں دی، سب نے یہی کہا کہ اللہ کو ایک جانو! لیکن توحید کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کو ایک جانو! اس کی ذات کو یکتا، اس کی شان یکتا، افعال یکتا، اس کو صفات و افعال کے لحاظ سے بھی یکتا جانو۔ ہر ہر چیز میں اسے یکتا سمجھنا چاہیے۔ جب اس کی ساری شانوں میں یکتائی ہے تو اتنے ہی حقوق قائم ہوں گے، پھر عبادتیں بھی اتنی ہی ہوں گی کہ قلب سے یوں عبادت کرو، زبان سے یوں عبادت کرو، قالب سے یوں عبادت کرو، اس لئے کہ جب اس کے حقوق بہت ہیں، اس کی شانیں بے حد ہیں، اس کے سامنے نیاز مندی کے سارے طریقے بھی مکمل ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام نے شرک سے روکا اور منع کیا لیکن اسلام نے فقط شرک سے نہیں روکا بلکہ شرک کے اسباب سے بھی روک دیا کہ وہ بھی منع ہیں، جن اسباب سے شرک کے پیدا ہونے کا وہم بھی ہوسکتا تھا، ان کو بھی رد کر دیا، جہاں شرک کا وہم بھی ہوسکتا تھا، اس وہم کو بھی ختم کیا۔

اسبابِ شرک کو بھی شریعتِ محمدی میں قطع کر دیا گیا..... حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ طواف کر رہے تھے اور مطاف کے اندر ہزاروں آدمی طواف میں مشغول تھے۔ جو لوگ حج کر کے آئے ہیں انہیں معلوم ہے، بیت اللہ کے ارد گرد سات پھیرے کئے جاتے ہیں۔ اس کو طواف کہتے ہیں۔ حجر اسود جنت کا ایک پتھر ہے، اس کو چوم کر پھیرا شروع کیا جاتا ہے اور اسی پر آ کر ختم کیا جاتا ہے، ہر پھیرے پر اس کی تقبیل کرتے ہیں (چومتے ہیں)۔ تو لوگ دوڑ رہے تھے، حجر اسود کے اوپر جھک رہے تھے اور عوام الناس حجر اسود پر زیادہ جھکتے ہیں۔ چاہے طواف ملے نہ ملے مگر اس کو چومنا مل جائے۔ اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ لڑائی تک کی نوبت آتی ہے۔ تو لوگ ہجوم کر رہے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ بالکل ایسی حالت ہوگئی ہے، جیسے حجر اسود کی پوجا اور عبادت کر رہے ہوں۔ بس وہیں کھڑے ہو کر للکارا، ایک دم طواف رک گیا اور حجر اسود کو خطاب کیا، فرمایا: "إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ، لَوْ لَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ قَبَّلَكَ مَا قَبَّلْتُكَ" ①

"میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے، نہ تجھ میں نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی۔ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے چوما ہے تو میں کبھی تجھے نہ چومتا" ہمارا نفع نقصان قطعاً تیرے قبضے میں نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے، مطلب یہ کہ اتباعِ سنت کے لئے چوم رہا ہوں، عبادت کے لئے نہیں۔ لوگوں کے خیالات درست ہوگئے۔ جو لوگ یہ سمجھ رہے تھے یا سمجھنے کا اندیشہ تھا کہ شاید اسی پتھر کی عبادت مقصود ہو تو پھر بت پرستی اور خدا پرستی میں فرق کیا رہتا۔ چنانچہ اس طرز کو رد کر دیا۔ تو اتنے اتنے احتمالات کے اوپر اسلام نے روک ٹوک کی ہے۔ شرک تو بجائے خود شرک ہے، شرک کا وہم بھی پیدا ہو، اس کو بھی رد کرنے کی کوشش کی ہے۔

سترہ سامنے رکھنے میں شرک سے بچنے کی احتیاط..... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ میدان میں نماز پڑھی، تو مسئلہ آپ کو معلوم ہے کہ سترہ سامنے رکھ لیتے ہیں، کوئی لاٹھی کھڑی کر لی، کوئی پتھر کھڑا کر لیا تاکہ آنے جانے والے نمازی کے سامنے نہ آئیں بلکہ اس کی وجہ سے باہر باہر سے چلے جائیں۔ مقصد یہ کہ نمازی کے آگے سے جو گزرے گا تو وہ جو بندے اور خدا کے درمیان رابطہ ہے وہ قطع ہو جاتا ہے، تشویش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب سترہ کھڑا کر لیا اور جانے والا سترہ سے باہر چلا گیا، اب قلب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے سنت طریقہ یہ ہے کہ کوئی سُترہ رکھ لو، لاٹھی رکھ لو یا پتھر رکھ لو۔ تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی سامنے سُترہ رکھا، ایک پتھر کھڑا کر لیا لیکن پتھر دائیں مونڈھے کے سامنے کھڑا کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ دائیں مونڈھے کے سامنے یا بائیں مونڈھے کے سامنے پتھر رکھو، بالکل ناک کے سامنے مت رکھو، فرمایا: ناک کی سیدھ میں رکھو گے تو کسی کو وہم ہوگا کہ کہیں پتھر کی تو عبادت نہیں کی جا رہی، اس وہم سے بھی بچو۔

تو یہاں پر اسبابِ شرک کو بھی رد کیا ہے، فقط شرک ہی کو رد نہیں کیا۔ ورنہ ظاہر ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

---

① الصحيح للبخارى، كتاب الحج، باب ماذكر في الحجر الاسود، ج: ٦ ص: ١٥١.

جو نماز پڑھ رہے تھے، ان کے قلب میں تو شرک کا وہم بھی نہیں تھا، جلیل القدر صحابی ہیں، ان سے زیادہ متبع سنت کون ہے یہ احتمال بھی نہیں ہوسکتا کہ معاذ اللہ! عبداللہ بن عمرؓ کے قلب میں کوئی شرک کا وہم تھا۔ لیکن صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہی، ناک کی سیدھ میں پتھر رکھنے سے شرک کی صورت بنتی تھی، اس صورت کو ختم کر دیا۔ تو بعید سے بعید احتمالات کو بھی قطع کر دیا کہ کسی طرح شرک قلب کے اندر گنجائش نہ پانے پائے، قلب اس سے بری رہے۔

بعض شرک چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ مدہم ہوتے ہیں...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اَلشِّرْکُ اَخْفٰی فِیْ اُمَّتِیْ مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ.'' ① اتنا باریک باریک شرک ہے جیسے ایک چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی کے چلنے کی آہٹ ہے۔ تو اس کے چلنے کی آواز نہیں آتی، اتنی باریک آواز ہوتی ہے کہ آپ اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ فرمایا: جتنی وہ باریک چلتی ہے شرک کی اس سے بھی زیادہ باریک چال ہے۔ بعض دفعہ آدمی شرک میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ میں شرک میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ مثلاً فرمایا: اگر کوئی شخص نماز پڑھنے لگے اور دل میں یہ جذبہ ہو کہ لوگ یوں سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے، تو فرمایا: ''اِنَّ الرِّیَاءَ شِرْکٌ'' ② ریاء خود شرک ہے۔ یہ خدا کی نماز نہیں پڑھ رہا بلکہ بندے کی نماز پڑھ رہا ہے۔ لوگوں کو دکھلانے کے لئے تاکہ یہ مجھے عبادت گزار سمجھیں۔ اب ریاء اور دکھلاوا کرنے والا ذہن میں تصور نہیں کرتا میں شرک کر رہا ہوں۔ اپنے نزدیک تو وہ خدا کی عبادت کر رہا ہے مگر حقیقتاً وہ خدا کی عبادت نہیں وہ تو دیکھنے والوں کی عبادت ہو رہی ہے، جن کو وہ دکھلا رہا ہے۔ تو ریاء بھی ایک شرک ہے مگر یہ ظاہری اور کھلا ہوا شرک نہیں۔

اور ایک شرک اس سے بھی زیادہ باریک ہے یعنی کوئی بھی دیکھنے والا نہ ہو اور پھر بھی شرک پیدا ہو جائے، اس کو عُجب کہتے ہیں۔ یعنی آدمی تنہا عبادت کر رہا ہے، دل میں غرور ہے کہ میں ایسی عبادت کر رہا ہوں کہ آج تک کسی نے نہیں کی۔ گویا میں ہی دنیا میں ایسی عبادت کرنے کو پیدا ہوا ہوں، فرمایا یہ بھی شرک ہے۔ یہ اپنے نفس کے لئے عبادت کر رہا ہے، خدا کے لئے نہیں۔ اس کے نفس میں غرور اور پندار پیدا ہو رہی ہے اور اپنے نفس میں بڑائیاں مار رہا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں، اتنی بڑی عبادت کی۔ جب یہ خود خدا کے سامنے کھڑا ہو کے بڑا بننے لگا تو اُس کی بڑائی کا تو انکار کر دیا، اپنے نفس کو اُس کی بڑائی کی جگہ دے دی۔ یہ بھی شرک پیدا ہوا۔ اس تک کو اسلام نے قطع کیا ہے کہ جب تنہا کھڑا ہو تو عُجب اور خود بینی نہ ہو کہ اپنے کو دیکھ کر نماز پڑھے۔ لوگوں کے سامنے کھڑے ہو تو لوگوں کے دکھلاوے کے لئے نہ پڑھے کہ وہ بھی شرک ہے۔ اگر ضرورت ہو تو سُترہ رکھو، اس کو بھی ایسے انداز سے

① المسند للامام احمد، احادیث ابی موسٰی الأشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ص: ۹۸. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ ابویعلی من روایة لیث بن ابی مسلم عن ابی محمد عن حذیفة ولیث مدلس وابو محمد ان کان ھو الذی روی عن ابن مسعودؓ او الذی رویٰ عن عثمان بن عفان فقد وثقه ابن حبان وان کان غیرھما فلم اعرفه، وبقیة رجاله رجال الصحیح دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱۰ ص: ۲۲۴. ② السنن للترمذی، ابواب النذور والایمان، باب ماجاء فی کراھیة الحلف...... ج: ۶، ص: ۱۳. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف الترمذی للالبانی ج: ۴ ض: ۳۵ رقم: ۱۵۳۵.

مت رکھو کہ وہاں شرک کی صورت بھی بن جائے، تو شرک کی صورت بھی درست نہیں، حقیقی شرک تو کیا درست ہوتا اور مذاہب نے بھی شرک کو رد کیا ہے مگر دور دور کے اسباب کو رد نہیں کیا۔ اسلام نے ان کو بھی رد کیا تا کہ توحید مکمل ہو کر دنیا کے سامنے آئے۔ وحدانیت کی تکمیل اسلام (یعنی شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) نے پیش کی ہے۔ صرف توحید پیش نہیں کی، توحید تو پچھلے انبیاء علیہم السلام بھی پیش کر گئے، مگر اس توحید کو اتنا مکمل بنا دیا کہ ظاہر اور باطن میں شرک کی کچھ گنجائش باقی نہیں رہی۔

بت پرستی کی ابتداء...... اس مذہب میں تصویر حرام کی گئی کہ اس سے شرک کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تصویر ہی سے شرک کی ابتداء ہوئی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں پہلے شرک پیدا ہوا ہے۔ ان کی قوم میں پانچ بزرگ تھے، جب ان کا انتقال ہوا، قوم نے ان کے بت بنا کے عبادت گاہوں میں رکھ دیئے تھے کہ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کے ہمیں خدا یاد آئے گا، جیسے ان کی مجلس میں بیٹھ کر خدا یاد آتا تھا۔ پہلی نسل تو ان کو دیکھ کر خدا کو یاد کرتی رہی، ان کی عبادت انہوں نے نہیں کی، مگر جب دوسری نسل آئی، انکے دلوں میں وہ علم ومعرفت نہیں تھا، جو ان کے بڑوں میں تھا کچھ تعظیم انہوں نے مورتیوں کی شروع کی جو عبادت گاہوں میں رکھی ہوئی تھیں، کچھ خدا کی طرف جھکے۔ اب جب تیسری نسل آئی تو خدا کو تو بھول گئے اور ساری عبادت ان بتوں ہی کے لئے رہ گئی۔ یہیں سے شرک کا قصہ چلا۔ تو شرک کی ابتداء انہیں چیزوں سے ہوئی ہے۔ ابتداء میں تصویر رکھ لی گئی پھر وہ شرک کا ذریعہ بن گئی۔

اسی طرح سے دنیا کی قومیں بہکتی ہیں کہ کسی بزرگ نے غلبہ حال میں کسی کام پر عمل کرلیا۔ بعد والوں نے اسے قانون بنا کر اسی پر عمل کرنا شروع کر دیا اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ تو انکے بزرگوں نے تصویر یاددہانی کے لئے رکھی تھی، عبادت کے لئے نہیں۔ مگر بعد والوں نے ان کی صورت کو اختیار کرلیا کہ وہ بتوں کے آگے جھک رہے تھے۔ لہٰذا ہم بھی جھکیں۔ یہی صورتیں ہوتی ہیں اور اس طرح کہیں درختوں کی پوجا شروع ہو جاتی ہے، کسی بزرگ نے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کے عبادت کی ہوگی۔ اس کے ماننے والے معتقدین نے اس درخت کی عظمت شروع کی۔ انہوں نے فقط تعظیم کی، ان کے بعد والوں نے اس کو پوجنا شروع کر دیا۔ آج ہندوؤں میں پیپل کا درخت واجب العبادت ہے، اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ ان کا کوئی بزرگ پیپل کے درخت کے نیچے عبادت کرنے بیٹھا ہوگا۔ انہوں نے پیپل ہی کی عبادت شروع کر دی، وہی معبود بن گیا۔

حضرت عمر کا شجرۂ حدیبیہ کو کٹوانا...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس چیز کو سمجھا۔ حدیبیہ کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بیعت جہاد کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی، وہ وقت ختم ہو گیا۔ یہ واقعی اثر کی بات ہے کہ بزرگ اور اہل اللہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں، وہاں بھی برکت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو سید الاولین والآخرین کسی جگہ بیٹھیں اور وہاں برکت نہ ہو یہ ناممکن تھا۔ اس درخت کے اندر برکت پیدا ہوئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ شروع

کیا کہ جب ادھر سے گزرتے تو تبرکاً اس درخت کے نیچے دو رکعت نفل پڑھ کر جاتے۔ اگر نماز کا وقت نہ ہوا یا وقت مکروہ تھا تو کم سے کم وہاں بیٹھ کے کچھ تسبیح و تہلیل ہی کر لیتے، کہ برکت حاصل ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ آج تو یہ صحابہ ہیں، یہ تو عارفین ہیں، اللہ اور رسول کی پہچان ہے، یہ محض تبرکاً یہاں بیٹھتے ہیں، درخت کی پوجا کرنے نہیں بیٹھتے لیکن آئندہ نسلیں جو آنے والی ہیں، کیا خبر ہے، ان کے دل میں علم و معرفت نہ ہو اور وہ اس درخت کی عظمت سمجھ کے اسی کی پوجا کریں۔ حکم دیا کہ: اس درخت کو کاٹ دو، درخت کٹوا دیا۔ صحابۂ کرام کو ناگوار ہوا کہ ایک بابرکت درخت کٹوا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تمہارے نزدیک بابرکت ہے۔ بعد والوں کے نزدیک یہی عبادت کا ذریعہ بنے گا اور کیکر کا درخت معبود بن جائے گا، پوجا شروع ہو جائے گی۔

دنیا کی اقوام اسی طرح سے بہکی ہیں، کہیں درخت معبود بنا، وہ اسی طرح سے کہ بزرگ نے وہاں برکت حاصل کرنے کے لئے قیام کیا۔ معتقدین و متوسلین نے نیک نیتی سے اس چیز کی عظمت سے فائدہ اٹھایا۔ بعد والوں میں نہ وہ نیکی رہی، نہ وہ نیت رہی، انہوں نے اس چیز کو معبود بنا لیا۔ یہیں سے شرک کی ابتداء ہوگئی۔

مولانا یعقوب نانوتوی اور گنگا جل کی حقیقت...... ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ جو عارف کامل، صاحبِ کشف و کرامت بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ تو مولانا کے مزاج میں کچھ مجذوبیت سی تھی۔ جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ آدھے باؤلے سے، آدھے عقلمند سے۔ اس طرح سے ایک جذب کا مادہ تھا، آنکھیں سرخ رہتی تھیں اور ایک کیفیت طاری۔ جس چیز کی لٹک لگ گئی وہ لگ جاتی تھی۔ ایک دن بیٹھے تھے یہ چیز ذہن میں آ گئی کہ اس کی تحقیق کرنی چاہئے کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے۔ ہندوستان میں یہ بڑا دریا ہے، ہندو گنگا کی پوجا کرتے ہیں، اس کے پانی کو بڑا باعظمت جانتے ہیں، اس کو سامنے رکھ کر پوجا کرتے ہیں، اس کی بڑی عظمت ان کے دلوں میں ہے، اس کو گنگا مائی کہتے ہیں کہ یہ ہماری ماں اور اصل ہے۔ جب وہ پانی لے کر گنگا سے چلتے ہیں جب تک پانی کندھے پر رہتا ہے تو جوتا نہیں پہنتے، زمین پہ بیٹھتے نہیں، کھڑے کھڑے اس کو لاتے ہیں۔ اتنی عظمت کرتے ہیں۔ تو مولانا مرحوم کے دل میں یہ ایک جذبہ پیدا ہوا کہ یہ گنگا کہاں سے نکلی ہے اور اس کے نکلنے کا کیا سبب ہوا ہے حالانکہ اس کی تحقیق ایک غیر ضروری بات تھی، مگر ایک لٹک لگ گئی تو رات کے بارہ بجے چارپائی سے اٹھ کے گنگا کی تحقیق کے لئے روانہ ہو گئے۔

دیوبند سے گنگا چالیس میل کے فاصلے پر بہتی ہے، چالیس میل کے سفر کے ارادہ سے رات کو بارہ بجے چارپائی سے اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ صبح کو جب مولانا درس میں نہ آئے تو سارے دارالعلوم میں ڈھونڈ پڑی کہ مولانا کہاں! مولانا کا کہیں پتہ نہیں، طلبہ پریشان، مدرسین پریشان کہ ہمارا صدر مدرس کہاں گیا۔ آدمی بھیجے گئے، کسی کو نانوتے، کسی کو گنگوہ، مولانا کا کہیں پتہ نہیں۔ لوگ سب حیران بعضے تو رو پڑے کہ خدا جانے کیا گزری اور مولانا گنگا کی طرف سفر کر رہے ہیں، پورا ایک دن رات لگا، پورے چوبیس گھنٹے کا پیدل سفر کر کے وہاں پہنچے۔ وہ ایک چھوٹا سا

گاؤں ہے، جس کا نام گنگوتری ہے۔ اسی مناسبت سے گنگا اس کو کہتے ہیں۔ تو اس گاؤں میں پہنچے، جہاں سے یہ دریا نکل رہا ہے اور چشمہ ہے۔ وہاں مولانا نے سات دن قیام کیا، نماز میں اور تلاوت میں سات دن لگے رہے، رات دن کامل عبادت کی۔ چونکہ خود بھی بزرگ تھے تو حال منکشف ہوا کہ گنگا کیوں نکلی! کیا بات ہوئی۔

فرمایا: مجھ پر منکشف ہوا کہ جہاں سے گنگا نکلی ہے یہاں یا تو کسی نبی کی قبر ہے یا کسی نبی کے بیٹھنے کی جگہ ہے، اس برکت کے آثار ہیں، اس لئے چشمہ نکلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی قوم مبتلا ہے۔ تو گنگا کا چشمہ کسی پیغمبر کی دعا سے نکلا ہوگا، اس میں کچھ برکت کے آثار آ گئے۔ لیکن قوم نے جہالت سے اس پانی کو معبود سمجھ لیا۔ ابتداء میں اس کی تعظیم و وقعت کی ہوگی اور جب علم و معرفت دل میں باقی نہ رہا وہی معبود بن گیا، قابل پوجا بن گیا۔ اسی کے سامنے سجدے شروع ہوگئے۔ یہ امتِ مسلمہ پر اللہ کا رحم ہے کہ وہی نوعیت مکہ مکرمہ میں آبِ زمزم کی ہے، جو ہندو گنگا کی سمجھتے ہیں۔ لیکن اللہ کا فضل ہے آج تک آبِ زمزم کی پرستش کسی نے نہیں کی، نہ پوجا کی، نہ زمزم سامنے رکھ کر کسی نے سجدے کئے، عظمت و توقیر کرتے ہیں۔ شرعاً حکم ہے کہ پانی بیٹھ کر پیو، مگر یہ پانی تبرکاً کھڑے ہو کر پیو، یہ سب کچھ ہے۔ لیکن یہ کہ اس سے مسلمان مرادیں مانگتے ہوں، اے زمزم! ہمیں بیٹا دے۔ یا اے زمزم! روٹی دے، یہ کوئی نہیں کرتا، معبود نہیں جانتے۔ یہ محض اللہ کا اس امت کے اوپر فضل ہے، اس امت میں بھی برکت کی چیزیں آئی ہیں مگر پوجا اور عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات کو سمجھتے ہیں۔ غیر اللہ کے آگے نہیں جھکتے۔

وہ کیوں! اس لئے کہ اسلام نے نہ صرف شرک سے روک دیا، بلکہ شرک کے دور دور کے اسباب کو بھی قطع کر دیا ہے کہ شرک پیدا نہ ہونے پائے۔ اس لئے یہ امت کامل توحید پر قائم ہے۔ اگر اسلام اسبابِ شرک کو نہ روکتا تو ہم بھی انہیں چیزوں میں مبتلا ہوتے جس میں دوسری اقوام مبتلا ہوئیں، ہر درخت کو پوجتے، ہر پانی کو پوجتے، ہر پتھر کے آگے جھکتے۔ اور جہاں کچھ طبقات میں جہالت ہے وہ اب بھی ایسا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ لیکن مجموعی طور پر امت الحمد للہ کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ لوگ نادانی اور جہل کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں۔ مگر اصل دین جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے ہیں، وہ موجود ہے۔ وہ قیامت تک رہے گا۔ اصل دین میں فرق نہیں آئے گا۔ یہ اس کی برکت ہے کہ اسلام نے توحید کو لیا، شرک کو رد کیا اور شرک کے دور دور کے اسباب تک کو رد کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے سے ہی روک تھام شروع ہوگئی تھی۔

فاروقِ اعظم کے زمانہ میں ایک پیغمبر کی قبر سے پیشن گوئی کی کتاب کا نکلنا...... حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے، کہ دمشق میں ایک پیغمبر کی قبر تھی، وہ اتفاق سے کھلی، پانی برسنے سے یا کسی اور وجہ سے، اس میں سے ایک کتاب نکل آئی۔ اس کتاب میں کچھ قواعد ایسے لکھے ہوئے تھے کہ آئندہ کی کچھ خبریں اس سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ کسی آدمی نے اس کو پڑھ کر بتلایا کہ کل کو یوں ہوگا، پرسوں یوں ہوگا۔ اس سے لوگوں کے اندر فتنہ پھیلنا شروع ہوا اور اس شخص نے دعویٰ کر دیا کہ میں خود پیغمبر ہوں۔ دیکھو میں تین دن کے بعد کی بات بتا رہا ہوں کہ یہ

ہوگا، ہفتہ بعد یوں ہوگا۔ اس کتاب سے دیکھ دیکھ کے اس قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔ لوگوں میں فتنہ پھیلا۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع دی گئی تو مدینہ طیبہ سے مستقل شام کا سفر فرمایا اور بیت المقدس پہنچے۔ اس شخص کو بلوایا گیا، کتاب اس سے لی گئی، اس کتاب میں کچھ قواعد کے ذریعے سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں' وہ قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، وہ قیاسی ہوتی ہیں، جیسے ایک طبیب طب کے لحاظ سے پیشین گوئی کرے کہ فلاں مریض تین دن میں مرجائے گا، یہ کوئی غیبی الہام نہیں ہوتا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو، قیاسی چیز ہے، ہو بھی سکتی ہے، نہیں بھی۔

بہت سے لوگ سیاسی پیشین گوئیاں کیا کرتے ہیں کہ دو برس کے بعد فلاں حکومت کا یہ حشر ہونے والا ہے۔ وہ اپنے تجربات اور سیاسی قواعد سے پیشین گوئی کرتے ہیں۔ وہ غیبی الہام نہیں ہوتا کہ اس کا یقین کرنا اور اس کا عقیدہ بنانا ضروری ہو۔ ہر صاحبِ فن اپنے فن کے لحاظ سے کچھ پیشین گوئیاں کردیتا ہے۔ اسی طرح سے علماء نے کچھ قواعد لکھے ہیں، ان کے ذریعے سے بعد کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں، کچھ مستقبل کی چیزوں کا پتہ چل سکتا ہے۔ اسلام نے ان چیزوں سے اس لئے روک دیا ہے کہ یہ قیاسی چیزیں ہیں، قطعی نہیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہوجائے' ہوسکتا ہے اس کے خلاف ہو۔ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھے۔ جو خبر اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ بھیجی ہے یقینی ہے باقی اور کوئی چیز قطعی اور یقینی نہیں ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ کتاب پیش کی گئی۔ فرمایا: جہاں یہ قبر کھلی ہے وہاں گیارہ قبریں کھدوائی جائیں۔ گیارہ قبریں کھدوادی گئیں اور اعلان کیا کہ جن پیغمبر کی نعش مبارک ظاہر ہوئی ہے اور وہ اوپر آ گئی ہے، ان کو دفن کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ قبر جو تھی اس میں سے نعش نکالی گئی اور رات کو جب تمام سوگئے تو کسی قبر میں دفن کردیا اور کتاب بھی ان کے ساتھ دفن کردی، اوپر سے ساری زمین برابر کردی گئی۔ لوگوں کو اب یہ پتہ نہیں چلا کہ کون سی قبر میں وہ کتاب دفن کی گئی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہوگئی۔ یہ اس لئے پیش بندی کردی کہ اگر وہ کتاب رہ جاتی تو لوگ اس سے فتنہ پھیلاتے، اس سے پیشین گوئیاں کرتے کہ ہم نبی ہیں، ہم پر الہام ہوا ہے، اس سے ختم نبوت کا انکار ہوتا۔ تو دور سے پیش بندی کر کے اس سلسلہ ہی کو قطع کردیا کہ لوگ پہنچنے ہی نہ پائیں۔ بہرحال اس قسم کے اسباب کو رد کرنا، یہ اسلام نے توحید کی تکمیل کے لئے کیا ہے، تاکہ توحید مکمل ہو کے دلوں کے اندر آئے۔

اسبابِ معاصی بھی حرام ہیں...... یہی وجہ ہے کہ ایسی تعظیم سے بھی روکا جس سے شرک کا واہمہ بھی پیدا ہو۔ جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ جب سلام کرو تو جھک کے مت کرو۔ مسلمانوں کا سلام "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ" ہے۔ یہ جھکنا جھکانا نہیں ہے، تھوڑا سا کوئی جھک جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر اتنا جھک گیا کہ رکوع کی شکل پیدا ہوگئی تو اس شخص کو سزا دی جائے گی کہ اس نے عبادت کی شکل پیدا کردی، حالانکہ انسان کے لئے عبادت نہیں رکھی گئی۔ تو سلام میں رکوع کی شکل پیدا ہوجانا، یہ مکروہ تحریمی ہے، اس سے شرک کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ یہاں تک پیش بندی کی اور دور تک اسباب کو قطع کیا۔ اسی طرح سے معاصی اور زنا میں بھی کیا گیا ہے

کہ زنا سے روکنا مقصود ہے لیکن اس کے روکنے کے لئے جو اسباب زنا تھے، ان کو بھی حرام قرار دیا۔ اجنبی عورت پر ارادے سے نگاہ ڈالنا، یہ بھی ممنوع ہے۔ اس کو ہاتھ لگانا، یہ بھی ممنوع، اس کی آہٹ پر چلنا، یہ بھی ممنوع ہے۔ حالانکہ اصل میں عورت کو دیکھنا کوئی ممنوع چیز نہیں ہے، یہ بری بات نہیں ہے۔ برا فعل وہ ہے جس کو زنا کہتے ہیں۔ مگر چونکہ بسا اوقات یہ اصل فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس لئے اس سے بھی روک دیا۔ فرمایا: عورت خوشبو لگا کر سڑک کے اوپر نہ نکلے۔ اس لئے کہ خوشبو ایک دعوت ہے کہ مجھے دیکھیں، خوشبو جب ناک میں پہنچے گی، لوگوں کی توجہات منعطف ہوں گی۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خوشبو لگا کر باہر جانے والی عورت کی مثال زانیہ کی ہے، گویا زنا کر رہی ہے کہ زنا کی دعوت لوگوں کو دے رہی ہے، اس حد تک روک دیا گیا۔ تو باہر نکلنا یا خوشبو لگا کے نکلنا یا ایسے زیورات پہن کے نکلنا، جس کی آواز دوسروں کے کانوں تک پہنچے، ان سب چیزوں سے روکا۔ تاکہ اصل فعل سے آدمی رک جائے۔ روکنا زنا کا مقصود ہے۔ یہ چیزیں اپنی ذات سے ناجائز نہیں تھیں، اس لئے روک دی گئیں، کہیں ذریعہ نہ بن جائیں۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''سدِّ ذرائع'' کہتے ہیں۔ یعنی وسائل کو روک دو، تاکہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچنے پائے۔ روکنا تو چوری کا مقصود ہے کہ دوسرے کا مال نہ لے، لیکن تاک لگانا، کسی مکان میں ٹوہ لینا، نقب لگانا، دیوار میں دیکھنا کہ اینٹ کہاں سے ٹوٹ سکتی ہے، مال اسباب کہاں رکھا ہوا ہے۔ اس سب دیکھنے کو ممنوع و حرام قرار دے دیا ہے۔ اس لئے کہ جو آج دیکھ رہا ہے وہ کل چوری بھی کرے گا، یہی چیزیں ذریعہ بنیں گی۔ تو چوری کو روکنے کے لئے جتنے اسباب اور دواعی تھے، ان سب کو ممنوع اور ناجائز قرار دے دیا گیا۔

عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے: مَنْ اَتٰی سَاحِراً اَو کَاهِناً اَوعَرَّافًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ① جو جادوگر کے پاس گیا، اس نے شریعتِ محمدی کے ساتھ کفر کیا۔ حالانکہ جادوگر کے پاس جانا اپنی ذات سے کفر نہیں۔ اس لئے کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو اس نے توحید کا انکار نہیں کیا، نبوت، قیامت اور فرشتوں کا انکار نہیں کیا۔ ایمان کا تعلق تو ان چیزوں سے ہے۔ جب یہ ساری چیزیں موجود ہیں پھر کیسے کفر کیا۔ پھر فرمایا گیا اس لئے کہ جو آج کسی جادوگر کے پاس جائے گا تو سب سے پہلے تو جادو کی برائی دل سے نکلے گی، وہ جو دل میں بیٹھا ہوا تھا کہ جادو کرنا حرام ہے، وہ حرمت دل سے نکلے گی۔ دوسرے دن جاکے وہ اسے یوں کہے گا کہ: ایک منتر مجھے بھی سکھلا دو، تو ایک منتر سیکھ لیا، تیسرے دن جائے گا تو خود منتر کرے گا اور چوتھے دن اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا اور کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس سے بچانے کے لئے یہیں سے روکا کہ جادوگر کے پاس جانا ہی کفر کی چیز ہے۔ اس کو کہتے ہیں کسی عمل کی تکمیل کہ اس کے دور دور کے اسباب کو بھی روک دو تاکہ اصل برائی کے اندر مبتلا نہ ہونے پائے۔

روکنا شراب سے مقصود تھا، فرمایا: مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ ② جس چیز کے زیادہ حصے میں نشہ

---

① مسند ابی یعلی، ج ۱۱ ص: ۱۲۲ رقم: ۵۳۸۰. مسند عبدالله بن مسعودؓ، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترهيب ۳: ۹۸. ② السنن لابی داؤد، کتاب الأشربة، باب النهي عن المسكر ص: ۱۰۶ .

ہے، اس کا کم حصہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ یعنی شراب کا گلاس پینا حرام ہے تو ایک قطرہ چکھنا بھی حرام ہے۔ اس کو نجس العین کہا گیا ہے، جیسے خنزیر نجس العین ہے کہ اس کی ذات ہی ناپاک ہے، اسی طرح شراب کو بھی فرمایا گیا کہ اس کی ذات اور جوہر بھی ناپاک ہے۔ اس لئے فرمایا: ایک قطرہ بھی اسی طرح سے حرام ہے، جس طرح سے ایک گھونٹ اور ایک جام پینا حرام ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ سوال کرے کہ شراب اس لئے حرام کی کہ نشہ لاتی ہے اور نشے میں آدمی کی عقل جاتی رہتی ہے مگر ایک قطرہ چکھنے سے تو نشہ نہیں پیدا ہوتا پھر یہ کیوں حرام ہے؟ وہ یہی وجہ ہے کہ جس نے آج ایک قطرہ پیا، وہ کل کو ایک گھونٹ پیئے گا، جو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا پرسوں کو ایک گلاس بھی پیئے گا۔ جو پرسوں کو ایک گلاس پیئے گا وہ چوتھے دن جا کر شراب خور بن جائے گا۔ تو شراب خور بننے سے روکنے کے لئے ایک قطرہ کو بھی ممنوع قرار دے دیا تا کہ ابتداء سے آدمی رک جائے۔

پھر یہی نہیں کہ شراب کا ایک قطرہ یا ایک گھونٹ ہی پینا حرام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے جن میں شراب پی جاتی تھی۔ جیسے اس زمانے میں بھی شراب پینے کے کچھ مخصوص برتن ہوتے ہیں جام اور صراحی، اس کے الگ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی زمانۂ جاہلیت میں چار قسم کے برتن تھے: حَنْتَم، دُبَّاء، نَقِیْر اور مُزَفَّت۔ ''دُبَّاء'' ایک خاص قسم کا کدّو ہوتا تھا، جس کو اندر سے کھرچ کر کھوکھلا کرتے تھے اور اس میں شراب رکھتے تھے، تو اس میں نشہ زیادہ پیدا ہوتا تھا۔ اسی طرح سے نقیر ایک خاص قسم کے درخت (کھجور) کی جڑ ہوتی تھی، اس کو کھود کر پیالہ بناتے تھے، اس پر روغن اور بہت عمدہ رنگ کر کے اس کو بیچتے تھے، اس میں شراب پی جاتی تھی تو وہ اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح دوسرے برتن تھے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جس طرح سے شراب حرام ہے اسی طرح سے یہ چار برتن بھی حرام قرار دیئے گئے کہ ان میں پانی بھی مت پیو۔ اس لئے کہ اگر پانی پینے بیٹھے، ممکن ہے شراب یاد آ جائے اور شراب کی طرف توجہ ہو جائے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ روکنا اصل، حرام فعل سے مقصود ہے، اس کے جتنے اسباب تھے دور دور تک، ان سے بھی روکا ہے تا کہ آدمی وہاں تک نہ پہنچنے پائے۔ تو شرک ایک قبیح فعل تھا اس کو روکنے کے لئے اس کے جتنے اسباب تھے ان سے بھی روک دیا تا کہ انسان میں کمالِ توحید اور کمالِ تقویٰ پیدا ہو۔

یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ۔ تو صغیرہ اور کبیرہ گناہ کی تعریف یہی ہے کہ ہر گناہ کے سلسلہ میں جو فعل اصل مقصود ہوتا ہے وہ تو کبیرہ ہے اور جو اس کے اسباب ہوتے ہیں وہ صغیرہ ہے۔ زنا تو کبیرہ گناہ ہے عورت کو دیکھنا، بری نیت سے ہاتھ لگانا، اس کی طرف چل کے جانا یہ سارے گناہِ صغیرہ ہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ اصل فعل واقع ہو گیا تو یہ سارے گناہ لا دے جائیں گے اور سب کا وبال چکھنا پڑے گا۔ لیکن اگر یہ سارے افعال سرانجام دیئے اور اصل فعل سے بچ رہا تو یہ بھی سب معاف کر دیئے جائیں گے۔ نیکیاں کرنے سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ تو شریعتِ اسلام نے فقط گناہ سے نہیں روکا بلکہ ان کے اسباب یعنی صغیرہ گناہ سے بھی روکا ہے۔ تا کہ اس گناہ سے آدمی دور دور رہے۔ یہ اصل میں دین کی تکمیل ہے کہ اصل مقاصد کو روکنے کے لئے اس

کے دواعی اور اسباب تک کو روکا اور مکمل قانون بنا دیا۔

اسبابِ فرائض پر اجر وثواب ہے......اسی طرح سے جو فرائض ہیں ان میں اصل مقصود تو فرض ہے لیکن فرض کو انجام دینے کے لئے اسباب کا سلسلہ بچھا دیا۔ مثلاً اصل مقصود نماز ہے، یہ تو فرض ہے لیکن اس کے لئے شریعتِ اسلام نے کہاں سے سلسلہ چلایا۔ فرمایا گیا: اگر ایک شخص لحاف میں پڑا ہوا سو رہا ہے اور اذان ہوئی تو جب مؤذن ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة'' کہے، جبھی بستر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر یہ خیال ہوا کہ ابھی یہ اذان دے رہا ہے، ابھی پانچ منٹ اذان میں لگیں گے، اس کے بعد پندرہ منٹ نماز میں! ذرا اور سو جاؤں تو سوتے سوتے وہ آدھ گھنٹے سوئے گا، جماعت بھی قضا ہو جائے گی۔ مسجد میں جانا ہی نصیب نہیں ہوگا۔ تو وہاں سے پکڑا ہے کہ جب ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة'' کی آواز آئے، جبھی اٹھ کھڑے ہو جاؤ، آسانی اسی میں ہے۔ اس کے بعد آدمی نے وضو کیا، فرمایا گیا: جب آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے تو جس عضو کو آدمی دھوتا ہے، جو گناہ اس عضو سے کئے ہیں، وہ جھڑنے شروع ہوتے ہیں، ہاتھ سے گناہ کیا، جب ہاتھ دھوئے گا تو ناخنوں سے وہ گناہ جھڑیں گے۔ پیر دھوئے گا تو پیروں کے گناہ جھڑیں گے۔ کلی کرے گا تو منہ سے جو گناہ کئے ہیں، وہ جھڑیں گے۔ ناک میں پانی دے گا، تو ناجائز سونگھنے کے جو گناہ کئے ہیں، وہ جھڑیں گے: ''حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوْبِ''۔ ① جب وضو کر کے اٹھے گا تو ایسا پاک ہوگا گویا اس نے وہ گناہ کئے ہی نہیں تھے۔ یہ سب پاکی نماز کے لئے کی جاری ہے۔ پھر فرمایا گیا: جب وضو کر کے آدمی چلا تو مسجد تک جانے میں ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک بدی مٹا دی جاتی ہے۔ اب نیکیوں کا ایک ذخیرہ یہاں سے جمع ہوا۔ پھر فرمایا گیا: اگر مسجد میں بیٹھا ہے اور ابھی نماز نہیں ہوئی، دیر ہے اور یہ انتظار کر رہا ہے تو نماز کا انتظار کرنے والا نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہے۔ انتظار کے وقت میں اتنا ہی اجر دیا جائے گا جتنا کہ نماز پڑھنے میں دیا جاتا ہے۔ یہاں سے ایک اجر کا ذخیرہ مہیا ہوا۔ تو وہاں سے ثواب کے وعدے دینے شروع کئے کہ لحاف سے اٹھے تو اجر وثواب، وضو کیا تو ایک ایک عضو دھونے پر ثواب، مسجد گئے تو ایک ایک قدم پر ثواب، مسجد میں انتظار کیا تو ایک ایک منٹ پر ثواب۔ حتیٰ کہ نماز کا وقت آ جائے۔ تو مقصود نماز کا ثواب دینا ہے۔ اس کے لئے ایک سلسلہ بچھا دیا کہ وہاں سے آدمی چل پڑے تاکہ نماز کے قضاء ہونے کا کوئی احتمال باقی نہ رہے۔

تو جیسے ناجائز چیزوں میں روکنے کے لئے اسباب تک کو روک دیا۔ یہاں فرائض کے ادا کرانے کے لئے کچھ اسباب بھی کروائے تاکہ آدمی مکمل طریق پر اپنے دین کو انجام دے۔ یہ بات مجھے اس پر یاد آ گئی کہ سوال اُس شخص نے یہ کیا تھا کہ اسلام نے کوئی نئی چیز ہمیں کیا لا کر دی۔ جو ہم اس کی طرف متوجہ ہوں؟ میں نے کہا کہ دین نیا نہیں لا کے دیا، دین تو وہی ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اس دین کی تکمیل کر دی ہے۔ ہر ہر حکم کو اتنا مکمل کیا ہے کہ وہ مستقل ایک قاعدہ اور ضابطہ بن گیا۔ توحید کی تکمیل، نماز کی تکمیل، صدقات کی تکمیل، حج کی تکمیل حتیٰ

① الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب خروج الخطاب مع ماء الوضوء ج: ٢ ص: ٤٥.

کہ سونے اور جاگنے کے اوقات کو عبادت سے مکمل بنادیا۔ یہ چیز اسلام نے لاکر دی ہے۔ اسی کی ہم دعوت دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں یہ چیز نہیں ملتی۔ اصل دین ملتا ہے، نیکی ملتی ہے۔ ہر مذہب کہے گا کہ: زنا مت کرو، بہت بری بات ہے۔ کوئی بھی اجازت نہیں دے گا، لیکن بچنے کے طریقے کیا ہیں؟ قانون کا ایک لمبا سلسلہ...... یہ نہیں ملے گا۔ ہر مذہب کہے گا کہ شراب مت پیو لیکن شراب کے لئے اسباب کیا ہیں جن سے شراب بنتی ہے اور جن میں پیتا ہے، ان سے اسلام نے روکا، ایسی صحبت مت اختیار کرو جس میں شراب کی رغبت پیدا ہو، ایسے اوباش لوگوں کے پاس بیٹھو بھی مت، جو تمہیں شراب پینے پر ڈال دیں اور تمہارے اندر رغبت پیدا کر دیں۔ ایک ایک شق اور سبب کو روک دینا ہر حکم میں یہی دیکھتے ہیں۔ ہر حکم ایک مستقل قانون بنا ہوا ہے۔ یہ ہے تکمیلِ دین۔ یہ تکمیل جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہوئی۔ تو کامل دین ایک مستقل نعمت ہے، اور اس نعمت کے لانے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس واسطے آپ کا دنیا میں آنا سب سے بڑی نعمت ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہدیہ...... اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ** ① میں اللہ کی ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ کے بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے۔ اللہ کا ایک ہدیہ جو بندوں کو ملا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ تو اتنی بڑی نعمت دی گئی کہ جتنی عالم کی نعمتیں ہیں سب اسی کے طفیل میں مل رہی ہیں۔ زندگی کی نعمت ملی، تب اسی کے طفیل ملی، جب آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ اگر انہیں پیدا نہ کرنا ہوتا تمہیں بھی پیدا نہ کرتے! اگر آدم علیہ السلام کو پیدا نہ کرتے ہم اور آپ کہاں سے آجاتے! ہمارا وجود اور زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہے۔ پھر زندگی کے بعد جتنی کائنات میں نعمتیں ہیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے تو کائنات نہ بنتی۔ پس وہ نعمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوئیں۔ ہمیں کھانا پینا جو بھی نعمتیں مل رہی ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے مل رہی ہیں۔ اگر آخرت میں نعمتیں ملیں گی وہ ایمان کی وجہ سے ملیں گی، ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکے دیا، پھر یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ غرض دنیا سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر حشر تک نعمتوں کا ایک سلسلہ ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہے۔ اس لئے اس نعمت کا جتنا بھی ناز کیا جائے وہ کم ہے اور جتنا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو پہچانا جائے اتنا ہی کم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق بنیادی طور پر تین ہیں، جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک عظمت، ایک محبت، ایک متابعت۔ عظمت یہ کہ آپ کو اتنا بڑا جانا جائے کہ کائنات میں کوئی بڑی ہستی نہیں ہے جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

---

① السنن للدارمي، المقدمة، باب كيف كان اول شأن النبي صلى الله عليه وسلم، ج: ١، ص: ١٧. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: السلسلة الصحيحة ج: ١ ص: ٨٨٢ رقم: ٤٩٠.

دوسری چیز محبت ہے۔ اگر محبت نہ ہوگی تو ایمان نصیب نہیں ہوگا۔ آپ کا یہ حق ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کریں۔ محبت کا یہ خاصہ ہے کہ فقط محبوب ہی محبوب نہیں ہوتا محبوب کی ادائیں بھی محبوب ہوجاتی ہیں۔ جس سے محبت ہوتی ہے، تو آدمی یہ چاہتا ہے کہ میں صورت بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے۔ میں چال ڈھال بھی ایسی بنالوں جیسی محبوب کی ہے۔ میں رہن سہن کا ڈھنگ بھی وہ بنالوں جو میرے محبوب کا ہے۔ محبوب سے جب محبت ہوتی ہے فقط محبوب سے نہیں ہوتی، اس کی ہر ایک ادا سے محبت ہوجاتی ہے، اس کا گھر بھی محبوب بن جاتا ہے۔ جیسے مجنوں لیلیٰ کا عاشق بن گیا تھا، لوگوں نے دیکھا کہ مجنوں لیلیٰ کے مکان کی ایک ایک اینٹ چومتا پھر رہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بھئی! اینٹ میں کیا رکھا ہے؟ اس نے یہ شعر پڑھا۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی ۔۔۔ اُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارِ وَ ذَاالْجِدَارِ

میں لیلیٰ کے مکان سے گزرتا ہوں تو کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں کبھی اس کو، کبھی دہلیز کو، کبھی اس کے کواڑوں کو۔

وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ ۔۔۔ وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَ

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں۔ مجھے اس سے محبت ہے جو ان اینٹوں کے اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے اینٹیں بھی عزیز ہوگئیں۔ وہ محبوب ہے تو اس کا مکان اور کتا بھی محبوب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں محبوب ہیں تو مدینہ منورہ بھی محبوب ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیں محبوب ہے کہ وہ حضور کی مسجد ہے۔ مدینہ کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب ہیں اور ہم انہیں اپنا مخدوم جانتے ہیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی ہیں۔ جب محبوب، محبوب ہے تو ادائیں بھی محبوب، ان سے جن کو نام لگ گئے ہیں یا ان کی نسبت لگ گئی ہے، وہ بھی سب محبوب بن گئے۔ تو وہ وطن بھی، مکان بھی اور وہاں کے باشندے بھی سب محبوب۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا اکرام مدینہ میں گیارہ دن تک بول و براز سے رُکنا...... اور عظمت تو عظمت کرنے والوں نے کی۔ ہم تو دعویٰ ہی دعویٰ کرتے ہیں۔ حقیقی عظمت کرنے والے تو گزر گئے۔ عظمت کرنے والے وہ تھے کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ جب حج کرنے گئے ہیں تو تین دن ٹھہر کر مدینہ طیبہ سے واپس ہونے لگے، تمام اہل مدینہ نے آ کے راستہ روکا کہ ہم تو آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ لوگوں کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اور محبت تھی۔ سارے اہل مدینہ آ کے کھڑے ہوگئے کہ ابھی آپ اور رہیں، ہم نہیں جانے دیں گے۔ ان کے کہے سنے سے پھر رک گئے۔ پانچ دن کے بعد پھر ارادہ کیا پھر اہل مدینہ نے آ کے روک دیا کہ ابھی نہیں جانے دیں گے۔ بہت کہا! بہت معذرت کی۔ مگر اہل مدینہ نے نہیں مانا، پھر رک گئے۔ یہاں تک کہ کئی دفعہ ہوتے ہوتے گیارہواں دن آ گیا۔ اب جانے کا ارادہ کیا پھر اہل مدینہ نے روکا تو کہا: اب میرے بس میں نہیں ہے رُکنا۔ لوگوں نے عرض کیا:

حضرت! بس کی کیا بات ہے؟ فرمایا: گیارہ دن گزر گئے ہیں آج تک میں نے استنجاء نہیں کیا، ایک ہی وضو سے اتنے دن گزارے۔ اس لئے کہ میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آ کر میں یہاں بول و براز کروں، اس زمین کو گندہ کروں۔ معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم کہاں پڑا ہوگا اور میں وہاں گندگی ڈالوں، یہ تھی حقیقی عظمت۔ ہم اور آپ اس عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا رتبہ اور حق تھا کہ گیارہ دن تک ایک وضو سے رہے۔ تب اہل مدینہ نے کہا کہ اب تو ہم جلدی رخصت کریں گے، لہٰذا جلدی رخصت کیا۔ تب جا کے استنجاء وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ خیر یہ تو ایک کرامت کا درجہ ہے، ہر ایک اس کو انجام نہیں دے سکتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اکرامِ مدینہ...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دارالہجرت کہلاتے ہیں۔ مدینہ سے بے حد محبت تھی اور یہ چاہتے تھے کہ مدینہ ہی میں میری وفات ہو جائے اور مدینہ ہی کی زمین مجھے قبول کرے۔ تو آخیر عمر ساری مدینہ میں گزار دی اور اس ڈر کے مارے حج نفل ادا کرنے نہیں جاتے تھے کہ کہیں مدینہ سے باہر موت نہ آ جائے۔ کیفیت یہ تھی، کہ جب تک مدینہ میں رہے ہیں، مدینہ کی گلیوں اور بازاروں میں ننگے پاؤں پھرتے تھے کہ معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک کہاں پڑا ہوگا میں جوتے لیکر وہاں سے گزروں! مجھے چاہیے تھا کہ میں سر کے بل چلتا مگر یہ میرے بس میں نہیں، کم سے کم جوتا تو پہن کے نہ چلوں۔ عظمتِ حقیقی یہ تھی جو ان اکابر نے کی ہے کہ ساری عمر مدینہ میں جوتے پہن کر نہیں چلے۔

آثارِ مدینہ نظر پڑتے ہی قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تڑپ اور بے خودی...... مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانیٔ دارالعلوم دیوبند جب حج کے لئے گئے ہیں تو مدینہ منورہ کے قریب ایک منزل آتی ہے، جس کو ''بیر علی'' کہتے ہیں۔ ذرا سی پہاڑی ہے، اس پر جب اونٹ یا کاریں چڑھتی ہیں تو ایک دم حرم (مدینہ) شریف کے مینار نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے مدینہ منورہ تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ حضرات مدینہ منورہ حاضر ہوئے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ اور سارے بزرگ۔ جب ''بیر علی'' پر پہنچے اور حرم کے مینار پر نظر پڑی تو حضرت مولانا قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بے تاب ہو کر ایک دم اونٹ سے کودے اور ننگے پیر چل پڑے تھے۔ اور کچھ عاشقانہ اشعار زبان پر تھے جیسے معلوم ہو کہ اپنے ہوش میں نہیں۔ حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی ہیں کہ جب وہ چبھتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چھُریاں چبھ رہی ہوں۔ اور لوگ بھی حضرت کو دیکھ کر کود پڑے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ دوسرے لوگ جو کودے، ہیں یہ نقالی کر رہے ہیں، اُن پر تو حال طاری ہے، وہ تو اپنے آپے میں نہیں، اُن کی یہ نقل نہیں اتار سکیں گے۔ چار پانچ میل اسی طرح ننگے پاؤں چلے، پیر لہولہان ہو گئے مگر انہیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ حقیقی عظمت تو اہل اللہ کی ہوتی ہے، جن پر عظمت کا حال طاری ہوتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہم اگر تھوڑی بہت نقل بھی اتار لیں۔ یہ بھی ہماری سعادت ہے، وہ حال تو حال والوں کا ہوتا ہے، ہم میں وہ حال کہاں۔

غرض مدینہ منورہ سے محبت کیوں ہے! اس لئے کہ صاحب مدینہ سے محبت ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن بنا تھا۔ جب وطن والا ہمارا محبوب ہے تو وہ وطن بھی محبوب، اس کے رہنے والے بھی ہمیں محبوب، اس کا پانی اور اینٹ اینٹ بھی محبوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکِ شفاء، مدینہ کی مٹی تھوڑی تھوڑی تبرک کے طور پر لے کر آتے ہیں، اس کو گھر میں تبرکا رکھتے ہیں۔ اس واسطے کہ جس ذاتِ اقدس سے ہمیں محبت ہے، وہیں کی تو یہ مٹی ہے۔ یہ مٹی بھی ہمیں عزیز ہے، اس کا ایک ایک ذرہ بھی ہمیں عزیز ہے۔

مدینہ میں موت آنے کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فکر و کڑھن ...... امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہ حال تھا کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مجھے موت مدینہ میں آئے۔ نفلی حج کرنا اس ڈر کے مارے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں باہر وفات نہ پا جاؤں۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ خواب میں دیکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حاضر ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے یہ بتلا دیا جائے کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ تا کہ اگر میری عمر زیادہ باقی ہو تو میں حج نفل کرلوں اور توقع رکھوں کہ لوٹ کے آ جاؤں گا اور مدینہ میں میرا انتقال ہو جائے گا۔ میں مدینہ کی زمین کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ میری عمر کے کتنے سال باقی ہیں۔ اگر دو تین سال باقی ہوں تو میں نفلی حج کر آؤں۔

یہ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ہاتھ سامنے کر دیا کہ پانچ انگلیاں سامنے ہیں۔ پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ کھل گئی۔ حیران ہوئے کہ پانچ انگلیوں کا کیا مطلب ہے! آیا میری عمر کے پانچ برس، یا پانچ ماہ، یا پانچ ہفتے، یا پانچ دن باقی ہیں! کچھ سمجھ میں نہ آیا تو تعبیر خواب کے بڑے ماہر، امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جو تابعی بھی ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر ہیں، خواب کی تعبیر ایسی دیتے ہیں کہ ادھر تعبیر دی اور ادھر ہاتھ کے ہاتھ واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس فن کے بڑے امام تھے۔ انہوں نے کتاب لکھی ہے **"تاثیر الأنام فی تعبیر المنام"**۔ دو جلدوں میں ہے، اس میں بہت بڑے تعبیر خواب کے اصول بتلائے ہیں۔

ایک جیسے دو خواب اور مختلف تعبیریں ...... ان کی بات پر یاد آیا۔ ان کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا: حضرت! میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں! فرمایا: جلدی جا، تیرا مکان گرنے والا ہے، بیوی بچوں اور سامان کو نکال لے۔ بے چارے نے جلدی جلدی سامان اور بیوی بچوں کو نکالا۔ دو تین گھنٹے کے بعد ساری بلڈنگ آ پڑی۔ خواب کی تعبیر بالکل ہاتھ کے ہاتھ ظاہر ہو گئی۔ کوئی پانچ چھ مہینے کے بعد ایک اور شخص آیا اور عرض کیا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری چار پائی کے نیچے انگارے دھک رہے ہیں۔ فرمایا جا کر چار پائی کے نیچے کھدائی کر، تجھے سونا ملے گا کھودنا جو شروع کیا تو لاکھوں روپے کا سونا نکلا، ایک خزانہ دبا ہوا نکلا۔

لوگوں نے امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! خواب تو دونوں نے ایک ہی دیکھا ایک کا تو آپ نے گھر گروا دیا اور ایک کو سونا دلوا دیا۔ فرمایا کہ: پہلے نے جو خواب دیکھا وہ گرمی کے زمانے میں دیکھا اور

گرمی میں چار پائی کے نیچے آگ کا ہونا، یہ گویا بنیاد کے منہدم ہونے کی علامت ہے۔لہٰذا میں نے تعبیر دی کہ تیرا گھر گر پڑے گا۔اور دوسرے نے یہی خواب سردی کے زمانے میں دیکھا اور سردی میں چار پائی کے نیچے آگ کا ہونا یہ بڑی خوشگوار نعمت ہے،اس سے بڑھ کر نعمت نہیں۔اور آگ کی رنگت سونے کے مشابہ ہے۔سو میں نے کہا: چار پائی کے نیچے سے سونا نکلے گا۔دونوں باتیں پوری ہوئیں۔

پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں......تو ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اس درجے کے امام تھے کہ ان کی تعبیر ہاتھ کے ہاتھ پوری ہوتی تھی۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا یہ خواب کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر پوچھی ،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں سامنے کر دیں،ایک شخص سے کہا اور فرمایا: تو اس کی تعبیر ابن سیرین سے پوچھ کے آ!مگر یہ مت کہنا کہ مالک نے یہ خواب دیکھا ہے،یوں کہنا کہ: ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے۔میرا نام مت بتلانا۔وہ شخص ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا اور کہا کہ ایک مسلمان نے یہ خواب دیکھا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے اور وہ یہ عرض کر رہا ہے کہ حضرت! یہ فرما دیجیے میری عمر کتنی باقی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں اٹھا دیں۔اس کی کیا تعبیر ہے؟

فرمایا: سچ بتلا یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ اس نے کہا: جس نے دیکھا ہے اس نے نام بتلانے کی ممانعت کر دی ہے۔بس یہ سمجھ لیجیے ایک مسلمان نے دیکھا ہے۔فرمایا: یہ خواب کوئی بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔عوام الناس میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔پھر فرمایا: مدینہ میں امام مالک سے بڑا کوئی عالم نہیں،تو امام مالک نے تو یہ خواب نہیں دیکھا؟ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا،اسے ممانعت تھی۔فرمایا: اچھا جاؤ! پوچھ کے آؤ،نام بتلانے کی اجازت لے کے آؤ۔اس نے آ کر امام مالک سے عرض کیا: حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ آپ ہی نے خواب دیکھا ہے مگر چونکہ اجازت نہیں تھی اس لئے میں نے کوئی حامی نہیں بھری،بس چپ ہو گیا۔فرمایا: اچھا جاؤ میرا نام بتلا دینا۔یہ آیا اور آ کر ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ: واقعی امام مالک نے ہی وہ خواب دیکھا تھا اور آپ نے ٹھیک سمجھا تھا۔فرمایا: امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے تھے،دوسرے کسی عالم کی مجال نہیں تھی۔کہہ دینا: اس کی تعبیر یہ ہے کہ حضور نے جو پانچ انگلیاں اٹھا کے دکھلائیں،اس سے نہ پانچ برس،نہ پانچ گھنٹے،نہ پانچ دن اور نہ پانچ ماہ مراد ہیں،بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ ''هِيَ مِنْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللهُ'' موت اور زندگی کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں [1]: ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ [2] پانچ چیزیں اللہ نے ارشاد فرمائیں کہ قیامت کا علم اللہ ہی کو ہے کہ کب آئے گی! کس سن میں آئے گی! کسی کو اس کا علم نہیں دیا

[1] الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان والاسلام ج: ۱ ص: ۸۷ رقم: ۴۸۔ [2] پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔

گیا۔حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں دیا گیا۔اور یہ بارش کہاں سے آتی ہے! کیوں آتی ہے! کیا اسباب باطنی بنتے ہیں! کسی کو پتہ نہیں۔ظاہری طور پر ہم آلات سے پتہ چلالیں کہ بادل اٹھے گا، مون سون اٹھے گا لیکن خود مون سون آج کے دن کیوں اٹھے گا! مون سون کو بنانے والی کیا چیز ہے! وہ کیا ہے اور وہ کیوں بناتی ہے۔یہ سب علل اور بنیادی چیزیں اللہ ہی جانتا ہے، اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے۔ہم ظاہری اسباب کا کچھ پتہ چلا سکتے ہیں مگر باطنی اسباب کا کچھ پتہ نہیں، وہی جانتا ہے۔﴿وَيَعْلَمُ مَافِي الْاَرْحَامِ﴾ ① ماں کے پیٹ میں کیا ہے! لڑکا یا لڑکی! اللہ ہی جانتا ہے۔بعض دفعہ بزرگوں نے بتلا دیا ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا ہے، وہ شخصی طور پر ایک جزوی چیز بتلائی۔کلی طور پر یہ علم کہ لڑکا کیوں بنتا ہے! لڑکی کیوں بنتی ہے! کیا اندرونی اسباب ہیں کہ اس دفعہ لڑکا بن گیا، اُس دفعہ لڑکی بن گئی۔یہ اللہ ہی کے علم میں ہے۔﴿وَمَاتَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ ② اور کسی نفس کو یہ پتہ نہیں وہ کل کو کیا عمل کرنے والا ہے۔کل جب آئے گی جبھی پتہ چلے گا۔﴿وَمَاتَدْرِىْ نَفْسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ③ کسی نفس کو یہ پتہ نہیں کہ کونسی زمین میں اور کب اس کا انتقال ہوگا! تو فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پانچ انگلیاں دکھائیں، اس کا یہ مطلب ہے کہ کونسی زمین میں آپ کا انتقال ہوگا! یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

سب سے بڑی نعمت کے حقوق......تو بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالَم کے لئے محسنِ اعظم ہیں اور ساری نعمتیں آپ کے طفیل سے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کو پہچاننا یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق تین ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم محبت کریں، آپ کی عظمت کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور متابعت کریں۔تو عظمت کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ عظمتِ حقیقی کرنے والے تو گزر گئے، لیکن ان کو دیکھ کر کچھ بھی کرلیں وہ بھی ہماری سعادت ہے۔چلو جتنی ہی کرسکیں، ورنہ اصل عظمت تو یہ تھی کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عمر بھر جوتا پہننا چھوڑ دیا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے گیارہ دن استنجا تک نہیں کیا کہ مدینۃ الرسول میں رہ کر میں گندگی پھیلاؤں۔دوسری چیز محبت ہے کہ اولاد و بنیاد کی محبت اس درجہ کی نہ ہو، یعنی جب اولاد و بنیاد سے مقابلہ پڑے تو ہم اللہ و رسول کی محبت کو ترجیح دیں۔جب کسی حکمِ شرعی سے اولاد کی محبت سے مقابلہ پڑ جائے تو ہم حکمِ شرعی کو ترجیح دیں۔مثلاً خدانخواستہ کسی کا بچہ بیمار ہوجائے تو مرد تو نہیں مگر عورتیں ٹونے، ٹوٹکے اور شرکیہ رسموں میں مبتلا ہوجاتی ہیں کہ شاید اچھا ہوجائے! جو خلافِ شرع ہوتا ہے۔تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت سے محبت ہونی چاہیے۔بچے سے اتنی محبت نہ ہو کہ ماں باپ شرکیہ امور سرانجام دینے لگیں کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔جان بچانے والا اللہ بزرگ و برتر ہے۔جب اس کے قانون

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴. ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴.

کی پابندی کرو گے ممکن ہے اسی کی برکت سے جان بچ جائے۔ بچے کی جان بچانے کے لئے شرکیہ امور انجام دینا، یہ اس کی دلیل ہے کہ خدا کی محبت گویا اتنی نہیں ہے جتنی بچے کی ہے۔ بچے کی محبت سامنے آ ئی تو خدا کے قانون کو چھوڑ دیا۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بچے کی جان کی شریعت کے مقابلے میں پرواہ نہ کی جائے۔ تو دوسرا حق یہ ہے۔ اور تیسرا حق متابعت ہے۔ جو قانون آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لا کے دیا ہے، اس کی پیروی اور اطاعت کریں۔ جو سنتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، ان کی اتباع کریں۔ ایک ایک سنت کی پیروی میں جو نورانیت اور برکت ہے، ہم اپنی عقل سے ہزار قانون بنالیں، اس میں وہ خیر و برکت نہیں آ سکتی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کی ادائیگی میں ہو سکتی ہے۔ تو ایک ایک سنت کی پابندی کرنا مثلاً پہننے میں، کھانے میں، پینے میں، چلنے پھرنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں...... اس انداز کو اختیار کرنے کی کوشش، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تھا۔ یہ ایک مستقل نعمت اور برکت ہے ، اسی کا نام متابعت ہے۔ ایک فرائض میں اتباع ہے جیسے نماز پڑھ لی، وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت کے مطابق پڑھیں گے۔ روزہ رکھیں گے، وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طریقے کے مطابق ہوگا۔ یہ وہ فرائض ہیں جو ہمارے ذمے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اسی کے لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے، علم سیکھا جاتا ہے تو قدم بقدم چلنے کی کوشش کریں۔

مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا قدم بقدم سنت پر چلنا...... میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو بزرگوں میں سے کسی نے خواب میں یوں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہزاروں کا مجمع پیچھے ہے اور بھی ہزاروں لوگ ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی دیکھا گیا، وہ بھی مجمع کے ساتھ ساتھ ہیں۔ لیکن مجمع تیزی سے جا رہا ہے کہ جلدی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں اور مولانا آہستہ آہستہ دھیمی چال سوچ سوچ کے قدم رکھ رہے ہیں، جس کی وجہ سے مجمع سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق میں دوڑے جا رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے ہیں، جلدی پہنچیں اور کسی طرح زیارت نصیب ہو، جا تو آپ بھی رہے ہیں مگر قدم ٹٹول ٹٹول کے۔ فرمایا کہ ہاں میں چاہتا ہوں کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم پڑا ہے، میں بھی وہاں قدم بہ قدم، قدم رکھوں، اس کے دیکھنے میں دیر لگتی ہے۔ اس لئے میں آہستہ چل رہا ہوں۔ الحمد للہ میرا ایک قدم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان سے الگ نہیں پڑا۔ ٹھیک اسی نشان پہ قدم رکھتا ہوا جا رہا ہوں، اگر چہ دیر میں پہنچوں گا۔ گویا وہ ان کی اتباع سنت کی چیز تھی جو خواب میں دکھلائی گئی۔

اللہ پاک ہمیں اتباع سنت نصیب فرمائے...... مسلمان میں یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو اس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہو بہو نقشہ تم ہم نہیں اتار سکتے، ہماری ایسی قسمت کہاں! مگر

اپنا کام سعی اور جدوجہد کرنا ہے۔ دل میں تڑپ پیدا ہو جائے۔ اگر تڑپ پیدا ہوگئی تو ممکن ہے اللہ پوری پیروی نصیب کردے، ورنہ جتنی بھی نصیب ہو جائے! اس جذبہ کی وجہ سے ہمیں نجات ہونے کی توقع ہے۔ تو تین حقوق ہیں، ایک عظمت، ایک محبت، ایک متابعت۔ محبت میں فنائیت ہوتی ہے کہ آدمی محبوب میں فنا ہو جائے۔ متابعت میں قدم بہ قدم چلنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ کہ ایک ایک چیز میں پیروی نصیب ہو۔ عظمت سے اعتقاد پیدا ہوتا ہے۔ اگر بڑائی دل میں نہ ہو تو عقیدت نہیں ہو سکتی۔ اور عقیدت و اعتقاد نہیں ہوگا تو ایمان نہیں بنے گا۔ اس واسطے ان تینوں حقوق کی ضرورت ہے۔ تو میں نے آیت ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ① پڑھی تھی' کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ تو عالموں کا وجود، ان کی نعمتیں اور ان کی ہستی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہی سے ہے۔ جس امت کو ایسی بابرکت ہستی دی گئی ہو، وہ امت کتنی قسمت والی اور بانصیب ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی عطا کیا گیا۔ تو امت پر نبی کے حقوق کا حق عائد ہوتا ہے۔ تو محبت بھی ہو، عظمت بھی ہو اور متابعت بھی ہو۔ محض محبت ہو کہ آدمی دعویٰ کرے کہ میں عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں..... مگر اطاعت نہ کرے، وہ محبت ناتمام ہے۔ محبت کی علامت ہی یہ ہے کہ اطاعت کرے، اطاعت دلیل ہے اور محبت دعویٰ ہے۔ جب کہے گا کہ مجھے محبت ہے تو دلیل پوچھیں گے! تو کہے گا کہ: میں پیروی کر رہا ہوں۔ کہا جائے گا کہ: بے شک یہ محبت ہے۔ ایک شخص اپنے باپ سے کہے کہ مجھے آپ سے بڑی محبت ہے۔ باپ کہے: مجھے حقہ پینے کی عادت ہے، ذرا حقہ بھر کے لاؤ۔ تو کہے: صاحب! میں نے تو یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے، یہ کب کہا تھا کہ میں حقہ بھی بھر کے لاؤں گا، یا پانی بھی پلاؤں گا! باپ کہے گا: تو پھر محبت کیسی! محبت تقاضا کرتی ہے کہ جو میں کہوں وہ کر۔ تو ہم نے دعویٰ کیا کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ محبت کا خاصہ ہے کہ اطاعت ہو۔ اطاعت نہیں ہوگی تو دعویٰ محبت غلط ہوگا۔ اسی کو حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "من احبی سنتی فقد احبنی ومن احبنی کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ" ② جسے میرے ساتھ محبت ہوگی وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور جو اطاعت کرے گا وہ جنت میں بھی میرے ساتھ ہوگا۔ تو اصل بنیاد محبت ہے اور محبت کی علامت اطاعت ہے اور دل میں عظمت ہو۔ تو آیت میں نے پڑھی تھی' اس کی روشنی میں یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں تاکہ حقوقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے آجائیں۔ سارا دین اور اسلام اس لئے ہے کہ انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق پہچان لے۔ دعاء کیجیے! اللہ تعالیٰ ہمیں اطاعت، محبت وعظمت اور عقیدت و اعتقاد کی توفیق عطا فرمائے اور سنت کی پیروی نصیب فرمائے اور ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً، اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ،
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷۔
② السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع ج: ۹ ص: ۲۸۹۔

بیتُ اللہ الکریم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ. فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا.﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

اوّلِ عالَم...... بزرگانِ محترم! اس وقت ہم سب خدام دین بحمد اللہ اولِ عالم میں موجود ہیں۔ جو مرکزِ عالَم بھی ہے، وسطِ عالَم بھی ہے اور اصلِ عالَم بھی ہے۔ میں نے یہ چار الفاظ مکہ مکرمہ کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔ اولِ عالَم، اصلِ عالَم، مرکزِ عالَم اور وسطِ عالَم۔ یعنی سب سے پہلا مقام دین میں یہی ہے اور ہم سب کی اصل یہی ہے۔ اور اس عالَم شاہد کے بیچوں بیچ بھی یہی ہے اور مرکزِ عالَم بھی یہی ہے۔ یہ چار چیزیں ہیں۔ اس میں بعض امور تو نصِ قطعی سے ثابت ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے اور بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں۔ یعنی اس بارے میں یا تو حدیث مرفوع ہے ہی نہیں یا ہمارے علم میں نہیں، لیکن آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بکثرت ملتے ہیں، جن سے یہ چاروں دعوے ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم نے تو ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ﴾ ② خدا کا سب سے پہلا گھر جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے وضع کیا وہ بکہ میں ہے۔ خواہ بکہ کے معنی (مکمل شہر) مکہ کے ہوں یا بکہ کے معنی خاص اس موضع کے ہوں جس میں بیت اللہ الکریم واقع ہے اور اس کے اردگرد کو مکہ کہتے ہوں۔ یہ اختلافِ اقوال ہے۔ مگر بہرحال حاصل یہ نکلا کہ خدا کا سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ مکہ میں ہے، جس کا نام بیت اللہ الکریم ہے۔ یعنی قدرت نے جب ارادہ کیا کہ اس عالَم کو پیدا کیا جائے اور بنایا جائے تو اس میں سب سے پہلی وضع بیت اللہ کی واقع ہوئی، جیسا کہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پورے عالَم میں

① پارہ: ۴ سورۃ اٰل عمران، الآیۃ: ۹۶-۹۷. ② پارہ: ۴ سورۃ اٰل عمران، الآیۃ: ۹۶.

پانی ہی پانی تھا۔یعنی عناصرِ اربعہ میں سے سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا فرمایا۔ جب حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس پانی سے دوسرے عنصر تیار کئے جائیں اور دوسری کائنات بنائی جائے تو اس پانی میں ایک وضع واقع ہوئی۔ پانی میں اتنی جگہ جہاں بیت اللہ واقع ہے، کا کچھ حصہ ابھرا ہوا تھا، جیسے پہاڑی کا ایک چھوٹا سا مقام ہوتا ہے ،وہ بھر گیا۔ وہ بیت اللہ تھا۔ اس کے بعد کچھ گہرائی واقع ہوئی۔ اس کے بعد پانی نے ٹکرانا شروع کیا تو پانی......اور بالخصوص سمندر کا پانی جب ٹکراتا ہے تو اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ سمندر کے کناروں پر جب پانی ٹکریں کھاتا ہے تو جھاگ پیدا ہوتی ہے ،وہ سمندری جھاگ مثل پتھر کے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پانی نے ٹکرانا شروع کیا اور ٹکریں کھا کر اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوا۔ گاڑھے پن نے سختی اختیار کی اور ایک اینٹ کے برابر جگہ میں سختی پیدا ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اول زمین ایک اینٹ کے برابر بنی۔ تو زمین کی اصل یہی بیت اللہ ہے، اس کے بعد میں حق تعالیٰ نے اس کو بڑھایا اور پھیلانا شروع کیا۔ وہ پھیلتے پھیلتے زمین بنتی گئی اور اس حد پر آ کر رک گئی، جس حد تک آج زمین ہے۔ کتنے دنوں میں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، قرآن کریم میں بعض جگہ تصریحات بھی ہیں۔ لیکن اس وقت مدت سے بحث نہیں کہ کتنی مدت تک زمین پھیلی ، بہر حال زمین پھیلی ۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ بیت اللہ ساری زمین کی اصل ہے۔ یہیں سے ایک اینٹ کے برابر زمین پیدا ہوئی ، وہیں سے پھیلی اور پھیلتے پھیلتے اس حد پر آ کر رک گئی، جس کو آج ہم زمین کہتے ہیں۔

ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے.....گویا زمین کا اول حصہ وہ ہے جو بیت اللہ ہے۔ نیچے سے زمین شروع ہوئی ، اور آپ سب جانتے ہیں کہ ہم سب زمینی مخلوق ہیں، ہمیں اللہ نے اس مٹی سے پیدا کیا، جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا: ''کُلُّکُمْ بَنُوْا آدَمَ وَ آدَمُ خلق مِنْ تُرَابٍ'' ① تم سب کے سب آدم کی اولا د ہو اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ آدم کی اصل بھی مٹی ہے، ہم سب کی اصل بھی مٹی ہے۔ اسی لئے انسان کو مشت خاک اور مشتِ غبار کہا جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ۔

قدرت خدا کی دیکھیں تو انسان کو دیکھئے! کیا کیا تکلفات ہیں مشتِ غبار میں

ایک مٹھی بھر مٹی ہے اور کیا کیا تکلفات دکھائے، کتنا دنیا کو سجایا اور کہاں تک پہنچایا۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے ہم سب کو مٹی سے بنایا اور مٹی کی اصل بیت اللہ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے۔ ایک عام اصول ہے: ''کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ'' ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر شاخیں ہیں تو وہ جڑ کی طرف رجوع کریں گی ، پانی ہے تو وہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گا، زمین ہے تو وہ مرکزِ ثقل کی طرف رجوع کرے گی ، ہر چیز اپنے مرکز کی طرف فطرتاً دوڑتی ہے، اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر بیٹے کو باپ کی طرف کشش ہے تو آپ بیٹوں کو تلقین نہیں کرتے کہ بھئی! باپ کی طرف رجوع کرو۔ کہیں نہ کہیں وہ تو رجوع

① شعب الایمان للامام البیهقي، ج: ۱۱،ص: ۲۳. حدیث حسن ہے. دیکھئے: غایة المرام ج: ۱ ص: ۱۸۹ رقم: ۳۰۹.

ہوگا، اس لئے خلقتاً وطبعاً تمام انسانوں کی بیت اللہ کی طرف رجوع ہے۔

لوگ بیت اللہ کی طرف کیوں کھنچتے ہیں...... بعض کے علم میں ہے کہ یہ ہماری اصل ہے اور بعض کے علم میں نہیں ہے، علم میں آ جائے تو پھر ان میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مثلاً کسی شخص کے اولاد ہوئی، بچہ پیدا ہوتے ہی باپ چھوڑ کر کہیں چلا گیا، بچہ جوان ہوا، بڑی عمر کا ہوا۔ اب اگر باپ کہیں سامنے آئے گا تو طبعی کشش تو ہوگی، مگر یہ نہیں جانے گا کہ یہ باپ ہے، جب تک کہ پہچانوایا نہ جائے۔ بیٹا جب پہچان جائے گا کہ یہی ہے وہ باپ، جس کی طرف طبعی کشش ہے تو طبعی چھوڑ کر وہ کشش عقلی بھی بن جائے گی، قدرتاً آدمی متوجہ ہوگا۔ تو فطرتاً ہر انسان جانتا ہے کہ یہ میری اصل ہے، اس کی طرف کشش ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے آ کر تعارف کرا دیا کہ جس اصل کی طرف انسانوں کی کشش ہے وہ یہی اصل ہے، مگر علم میں نہیں، کشش موجود ہے اور وہ تشخص کے ساتھ موجود ہے۔ جن کے علم میں آ گیا، وہ ایمان لے آئے۔ انہیں کشش بھی ہے اور تشخص یعنی معرفت اور پہچان بھی ہے۔ غرض انسان کا بیت اللہ کی طرف خلقتاً رجوع ہے۔

چونکہ طبعی کشش تھی، حق تعالیٰ نے عقلی کشش بھی پیدا فرما دی کہ عبادت میں بھی اسی کو مرکز سمجھو۔ اگر عبادت کا مرکز کوئی ایسا ہوتا کہ طبعاً اس کی طرف رجوع نہ ہوتا تو لوگ زبردستی رجوع کرتے، کیونکہ فطری کشش نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اسی چیز کو مرکزِ عبادت بنایا جس کی طرف کشش بھی تھی۔ وہ طبعی کشش انسانوں کو اس کی طرف کھینچ کر لاتی ہے۔ اب یہ لاکھوں انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر اربوں کھربوں انسان جو ﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ ① ہر گھاٹی سے نکل نکل کر آ رہے ہیں۔ سفر کی سختیاں اٹھاتے ہیں، محنتیں اٹھاتے ہیں، خلافِ طبع باتیں برداشت کرتے ہیں مگر پھر بھی آتے ہیں۔ تو کوئی تو کشش ہے، وہ فطری کشش بھی ہے، شرعی کشش بھی ہے اور عقلی کشش بھی ہے۔ کئی کششیں جمع ہو گئیں۔ فطری تو یوں ہے کہ وہ ہماری اصل ہے اور عقلی یوں ہے کہ اصل کی طرف رجوع ہوتا ہی ہے، معقول بات ہے۔ اور شرعی یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعارف کرا دیا کہ یہی ہے وہ بیت اللہ جو تمہاری اصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی ایسے نہیں گزرے، جنھوں نے آ کر بیت اللہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور جب انبیاء علیہم السلام نے طواف کیا تو یقیناً ان کی اقوام کے دلوں میں بھی یہ چیز ہوگی کہ یہ ہماری اصل ہے۔ یہ اصل صرف آپ ہی کی نہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں بلکہ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کی اصل ہے۔

بیت اللہ کی حدود...... حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی ہے، ملائکہ علیہم السلام نے اس کی بنیادیں بھری ہیں اور بنیادیں بھی دس بیس، سو پچاس گز نہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ تحت الثریٰ تک بیت اللہ کی بنیادیں بھری گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ فقط اس حصہ میں نہیں ہے جو چار دیواری آپ کے سامنے ہے بلکہ تحت

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۲۷.

الثریٰ تک جتنا حصہ چلا گیا وہ سب بیت اللہ ہے۔اس طرح سے اوپر کی طرف جائیے تو عرش تک سب بیت اللہ ہی ہے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ہر آسمان میں ایک قبلہ ہے، وہ قبلہ ٹھیک اسی سیدھ میں ہے جہاں یہ بیت اللہ ہے اور ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے، وہ ساتویں آسمان کا قبلہ ہے۔تو ہر آسمان میں قبلہ ہے۔یہ ایسا ہے جیسے ایک تار میں لٹو باندھ دیئے جائیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے پرو دیئے جائیں تو ہر لٹو دوسرے لٹو کا محاذی ہوگا۔گویا بالکل سیدھ میں بیت اللہ ہے۔جیسے حدیث میں ہے کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر گرایا جائے تو وہ سیدھا بیت اللہ کی چھت پر آ کر گرے گا۔تو بیت اللہ فقط اس چار دیواری کا نام نہیں ہے جو کعبہ شریفہ کی شکل میں موجود ہے، وہ ایک علامتی نشان ہے...... ورنہ بیت اللہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر آپ آسمانوں پر پہنچ جائیں اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھیں تو آپ کو الٹا نہیں لٹکنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو نیچے ہے، اسی طرح نماز پڑھیں گے جیسے زمین پر پڑھتے ہیں۔اس لئے کہ وہاں بھی بیت اللہ سامنے ہے اور اگر آپ کشتیوں کے ذریعے سے زمین کی بڑی تہ میں پہنچ جائیں تو وہاں آپ کو الٹ کے سجدہ نہیں کرنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو اوپر ہے۔آپ اسی طرح سجدہ کریں گے جیسے زمین پر۔تو بیت اللہ نیچے سے لے کر اوپر تک ایک کیل کی مانند ہے۔ایک نورانی لاٹ ہے جس کے اردگرد...... یہ سارے جہان چکی کے پاٹ کی طرح سے چکر کھا رہے ہیں، یہ بیچ میں ایک مرکز ہے۔

بیت اللہ میں اللہ کا عکس ......حق تعالیٰ نے اس کو مرکز بنا کر بغور دیکھا تا کہ اس کو وجود دیا جاسکے اور مرکز سے جو چیز چلتی ہے وہ چہار طرف برابر چلتی ہے۔اگر آپ پانی کے بیچ میں ڈھیلا ماریں تو دائرے بنتے بنتے کنارے تک پہنچیں گے مگر مرکز سب کا ایک ہی رہے گا اور برابر دائرے بنتے چلے جائیں گے۔تو مرکز میں جو حرکت ہوتی ہے وہ پورے محیط میں ہوتی ہے۔وجود کو جب حرکت دی گئی کہ زمین کو پیدا کیا جائے تو اسی مرکز کو قدرتِ حق نے تاکا اور وجودی تجلی یہیں نازل ہوئی۔اس لئے بیت اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے، کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ وہ تجلی گاہِ ربانی ہے۔اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلی جو اقرب الی الذات ہے وہ موجود ہے۔اسی تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔اس تجلی کو سجدہ کرنا عین ذات کو سجدہ کرنا ہے۔تجلی کے معنی فی الحقیقت عکس کے ہیں تو بیت اللہ آئینۂ جمالِ خداوندی ہے، جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے۔جو حرکت ذات کرتی ہے وہ عکس کرتا ہے سایہ بھی کرتا ہے، اگر ذات ہنس رہی ہے تو سایہ بھی ہنسے گا، اگر ذات چل رہی ہے تو وہ بھی چلے گا۔البتہ شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔ورنہ حرکت اور سکون وہ بھی وہی کرتا ہے جو اصل ذات کرتی ہے۔تو وہ تجلیِ ربانی بیت اللہ میں اتری ہوئی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں۔اسے سجدہ ......عین ذات کو سجدہ کرنا ہے۔اس لئے کہ عینِ ذات اتنی لطافت میں ہے کہ کوئی سیدھ اور محاذات بن نہیں سکتی۔اگر محض ذات کو سجدہ کرایا جاتا تو تصورِ محض ہوتا، ظاہر میں اصلیت کچھ نہ ہوتی۔

لیکن ذات کا عکس جب اتار دیا گیا تو عکس کا قاعدہ ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کا عکس بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز

میں آ جاتا ہے۔ آفتاب کو اپنے آئینے میں دیکھتے ہیں تو آئینہ زمین کا ایک حصہ ہے، اس حصہ کو سورج (جیسے کرہ) کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پورا آفتاب مع اپنی شکل وصورت کے اس میں موجود ہو جاتا ہے اور پھر جو کام اصل آفتاب کرتا ہے، وہی آئینہ کا آفتاب بھی کرتا ہے، آپ آئینے کو دوسرے آئینہ کے سامنے کریں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا، تیسرے کے مقابل رکھیں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا۔ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے گی...... چاہے آپ اندھیرے کوٹھے میں روشنی پہنچا دیں۔ اسی طرح آفتاب کا کام حرارت پہنچانا ہے، آئینوں کے ذریعے سے بھی وہی حرارت پہنچتی ہے، بس شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔ تو جو کام آفتاب کا ہے وہی اس کا عکس بھی کرتا ہے۔

اس لئے عکس کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔ آفتاب کی ذات کو ٹکٹکی باندھ کر کوئی نہیں دیکھ سکتا ورنہ تو نگاہیں کھو دینی پڑیں گی۔ آئینے میں جب آفتاب کا عکس آتا ہے تو دیکھ بھی سکتے ہیں، اس کی ہر جانب اور سمت کو آپ دیکھ سکتے ہیں، معائنہ کر سکتے ہیں۔ تو عکس میں اور ذات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ عین ذات کو سجدہ کرنا، یہ ناممکن تھا، اس لئے کہ وہ غایتِ لطافت میں اور غیب درغیب میں ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کھایا کہ اپنا عکس، آئینۂ بیت اللہ میں اتار دیا تا کہ ایک حد تک محدود ہو جائے اور بندوں کی نگاہ اس حد تک جا سکے اور اس کی طرف جھک سکیں، ورنہ جھکنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور عنایت ہے کہ ذات اور تجلی کی نسبت سے اپنی وہ تجلی جو اقرب الی الذات تھی اتار کر بندوں کو سجدہ کا موقع دیا۔ ورنہ کہاں ذات باری تعالیٰ اور کہاں یہ بندے! وہ نورِ مطلق اور ہم ظلمتِ محض! بیچ میں ایک چیز تجلی کی اتار دی تا کہ سجدہ بھی کر سکیں، طواف بھی کر سکیں، عبادت بھی کر سکیں۔ اور اس کی عبادت کو ذات کی عبادت قرار دیا۔

مادیت، روحانیت اور نورانیت سب کی اصل بیت اللہ ہے...... بیت اللہ فی الحقیقت ہماری مادی اصل بھی ہے، روحانی اصل بھی ہے۔ مادی اصل تو یوں ہے کہ زمین اسی سے بنی اور ہم سب زمینی مخلوق ہیں تو وہ ہماری مادی اصل ہوئی۔ اور روحانی اصل یوں ہے کہ جب عبادت کریں گے تو انوارِ ربانی اسی کے ذریعہ سے ہمارے قلب میں آئیں گے، تو روحانی اصل بھی ہوئی۔ اور جب یہ بیت اللہ تحت الثریٰ تک ہے اور اوپر عرش تک ہے تو میں کہتا ہوں کہ جہاں جہاں بیت اللہ ہے، اس کے اردگرد جو جو مخلوق ہے...... اس سب کی اصل یہی بیت اللہ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہر وطن کے مناسب اس کی صورت بن جاتی ہے، زمین میں بیت اللہ ہے تو اس کی صورت اینٹ پتھر کی ہے، آگے آسمانوں میں جائے گا لطافت بڑھتی جائے گی، نورانیت بڑھتی جائے گی، عرش کے قریب پہنچ جائے گا تو نورانیت محضہ رہ جائے گی۔ اس لئے کہ وہاں نوری مخلوق پیدا ہوئی، یہاں کثیف اور خاکی مخلوق پیدا ہوئی، مگر ہے سب کی اصل بیت اللہ۔ اس لئے سب کا رجوع اس کی طرف ہے، ملائکہ علیہم السلام بھی اس کا طواف کرتے ہیں، انسان بھی طواف کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض جانور بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سب پہچانتے ہیں کہ یہ ہماری اصل ہے۔

تو میں نے ایک تو عرض کیا تھا کہ وہ اول عالم ہے۔ تو واقعی وہ اول عالم ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ ① سب سے پہلے قدرت نے اسی کو بغور دیکھا اور حدیث میں فرمایا گیا ہے: جب زمین پھیلنی شروع ہوئی تو سب سے پہلے وہ پہاڑیاں پیدا ہوئیں جو مکہ کے اردگرد ہیں، پھیلتے پھیلتے اور پہاڑیاں بن گئیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب چاروں طرف زمین پھیلنا شروع ہوئی تو جس جس چیز میں جو جو خصوصیت تھی وہ چمک اٹھی۔ تو مدینہ منورہ بھی تو اسی میں آتا ہے، وہ بھی اوّلِ عالم ہے اپنے ماسوا کے لحاظ سے، اس لئے کہ مدینہ کے دائرہ کے باہر جو ہے، اس سے مدینہ مقدم ہے اور وہ مدینہ سے مؤخر ہے۔ تقدیم و تاخیر ہوتی چلی جائے گی۔ تو اصل جا کے سب کی بیت اللہ نکلتی ہے، اس لئے میں نے کہا وہ اول عالم بھی ہے، اصل عالم بھی ہے اور وسط عالم بھی ہے۔

بیت اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت...... معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کوئی مرکزی جگہ ہے۔ جس میں قدرت نے تجلّی ڈالی تاکہ چہار طرف انوار و برکات برابر پھیلیں۔ اسی واسطے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: "یَا اَهْلَ مَكَّةَ اَنْتُمْ فِيْ وَسَطٍ مِنَ الْاَرْضِ." "اے اہل مکہ! تم زمین کے بیچوں بیچ واقع ہوئے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ وسطِ عالم بھی ہے۔ اور مرکز ہوتا بھی وسط میں ہی ہے۔ دائرہ جبھی بنے گا جب بیچ میں مرکز ہو۔ پرکار کی ایک ٹانگ کو آپ مرکز پر رکھیں گے اور ایک ٹانگ گھمائیں گے، تبھی تو دائرہ بنے گا۔ اگر مرکز سے ٹانگ ہٹ جائے دائرہ بن نہیں سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اول بھی ہے، اصل بھی ہے، مرکز بھی ہے اور وسط و درمیان بھی ہے۔

بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت مکہ میں فرمائی۔ اور اللہ کی طرف سے اسلام اور جامع دین کی گویا پہلی دعوت مکہ سے چلی تاکہ مرکز سے دعوت چلے اور یکسانی کے ساتھ تمام عالم میں اس کی آواز پھیل سکے۔ اگر مثلاً بیت اللہ کو روس میں اور کا کیشیا کے پہاڑوں پر بنا دیتے تو ساری دنیا کو مصیبت اٹھا کے وہاں جانا پڑتا اور اگر کہیں مغرب میں امریکہ کی طرف بنا دیتے تو روس سے جو لوگ چلتے وہ لاکھوں مصیبتیں اٹھا کے پہنچتے، بہت سے پہنچ نہ سکتے۔ اللہ نے اسے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نرم اور گرم ہر ملک کا ہر انسان وہاں پہنچ سکے۔ مشقت سب پہ برابر پڑے اور اپنے مرکز کو پہنچ جائیں۔ جیسا کہ وسط ہونے کی وجہ سے آسانی ہے۔ اسی طرح مرکز سے جو چیز چلے گی اسے پھیلنے میں بھی آسانی ہوگی۔ حق تعالیٰ نے دعوت الی اللہ اور جامع دین کا کارخانہ مکہ سے شروع کیا اور اسلام کی پہلی دعوت مکہ سے شروع ہوئی۔

مرکزیت کی منتقلی...... وہیں سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی، اس کے بعد مدینہ مرکز بنا۔ یہ حق تعالیٰ کی مشیت اور شان ہے کہ اس نے کمالات کی 'ظاہر ہوں یا باطن کسی کے ساتھ تخصیص نہیں رکھی۔ مثلاً یہ کہ علم ہوگا تو فلاں ہی خاندان میں ہوگا اور کسی میں نہیں ہوگا، روحانیت ہوگی تو فلاں ہی خاندان والے اس کے وارث ہونگے، دوسرے محروم رہیں گے، علم ہوگا تو فلاں ہی خطے میں ہوگا۔ بلکہ بنی آدم کے ہر طبقہ کو علم اور روحانیت سے

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

نوازا اور تمام زمین کے خطوں کو اس میں سے حصہ دیا۔ تو اول مرکز مکہ بنا، اس کے بعد وہ مرکزیت مدینہ کی طرف منتقل ہوئی۔ خلفائے راشدین کی حکومت وہاں قائم ہوئی۔ اور علم کے دریا اور نہریں وہاں سے جاری ہوئیں۔ اس کے بعد مرکزیت عراق کی طرف منتقل ہوئی، بغداد دارالخلافہ بن گیا، تو وہاں ہزاروں لاکھوں علماء تیار ہوئے۔ اس کے بعد خراسان کی طرف مرکزیت منتقل ہوئی تو خراساں اور ماوراء النہر سے بڑے بڑے اجلہ علماء اور فضلاء تیار ہوئے۔ کبھی اسپین کی طرف علم منتقل ہوگیا، بڑے اکابر علماء اسپین میں پیدا ہوئے۔ کبھی فلسطین مرکز بنا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کسی ایک خطہ زمین کو خاص نہیں کیا کہ اسی میں اس کی برکت آئیگی۔ وہ مبداء فیاض ہے، اس کے لئے سب برابر ہیں۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی وہاں۔ اسی طرح سے خاندان بدلتے رہتے ہیں۔ کتنے عرصے بنی اسرائیل میں نبوت رہی، جب انہوں نے ناشکری و ناقدری کی تو اس خاندان بنی اسرائیل کو محروم کر کے بنی اسماعیل میں نبوت آ گئی اور ایک ہی نبوت ایسی آئی کہ ساری نبوتوں سے فائق تر ہوگئی، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا فرمائے گئے اور بنی اسماعیل کو نوازا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات و کمالات بھی کسی ایک خاندان کے ساتھ خاص نہیں ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اول ہیں، تو صدیقیت کے ساتھ خلافت آئی، پھر فاروقیت کے ساتھ آئی، عثمانیت کے ساتھ آئی اور پھر علویت کے ساتھ آئی۔ ہر خاندان کو حصہ ملتا رہا اور ہر خطہ زمین مستفیض ہوتا رہا۔ کبھی مکہ مرکز ہے، کبھی مدینہ مرکز ہے، کبھی خراساں مرکز ہے، کبھی اسپین ہے، کبھی ماوراء النہر مرکز ہے اور کبھی ہندوستان مرکز ہے کہ مرکزیت منتقل ہوئی تو دہلی پہنچ گئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، انہوں نے علم حدیث پھیلایا۔ پھر وہ دہلی سے ضلع سہارن پور کی طرف منتقل ہوگئی، بڑے بڑے اجلہ علماء اس میں پیدا ہوئے۔ تو مرکزیت کسی ایک خطے کے ساتھ خاص نہیں۔ مگر مرکز سب کا بہرحال ایک ہی رہے گا، مرکزیتِ حقیقی وہ صرف بیت اللہ کو حاصل ہے۔ وہیں سے علم اور کمالات کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔

برکت وہدایت کا گھر...... اس لئے فرمایا کہ: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① تو یہ گھر برکت والا بھی ہے اور ہدایت والا بھی ہے۔ برکت کا لفظ عام طور سے مادیات میں استعمال ہوتا ہے، چاہے روحانیت میں بھی استعمال کریں، مگر عام استعمال مادیات میں ہے۔ جیسے مثلاً بھائی! کھانے میں برکت ہوگئی، فلاں کی عمر میں برکت ہوگئی، فلاں کے کاموں میں برکت ہوگئی۔ تو برکت کا لفظ مادیات میں استعمال ہوتا ہے اور ہدایت کا لفظ معنویات میں استعمال ہوتا ہے۔ علم ہے، معرفت ہے اور کمالات معنویہ ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ برکت کا گھر بھی ہے اور ہدایت کا گھر بھی ہے۔ یعنی مادی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں، روحانی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

آیاتِ بینات......﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ① آج یہاں لاکھوں انسان آئے ہوئے ہیں تو یہ کھلی کھلی نشانیاں ہیں کہ لاکھوں کو روٹی بھی مل رہی ہے، پھل بھی مل رہے ہیں۔اس وادی غیر ذی زرع میں...... جہاں نہ سبزہ، نہ پانی، نہ نہریں، نہ باغات، لیکن ہر تازہ پھل میسر۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ: ﴿وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ② اے اللہ! اس گھر والوں کو رزق دے۔اور رزق بھی کیا! فروٹ جو اعلیٰ ترین رزق ہے، یعنی تازہ پھل۔اگر کہیں ملک شام میں دعا مانگتے تو اسباب طبعیہ کے مطابق دعا قبول ہوتی کہ وہاں پر تو پیدا ہوتے ہیں۔یہاں دعا مانگی، جہاں نہ سبزہ نہ پانی! لیکن دنیا بھر کے تازہ پھل موجود اور ہر ملک کے موجود، اور ہر شخص ان سے مستفید۔دس بیس ہزار کا مجمع ہو، گرانی الگ ہو جاتی ہے، جھگڑے اور نزاعات الگ ہوتے ہیں، ﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ﴾ ③ کھلی کھلی نشانیاں ہیں، رزق بھی مل رہا ہے، جھگڑے بھی نہیں ہوتے۔اور لاکھوں آدمی جمع ہیں۔عرفات میں تو ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، جو چودہ پندرہ لاکھ آدمی ہوتے ہیں (اور یہ تعداد روز افزوں بھی ہے)۔لیکن سانس کی آواز نہیں ہوتی، ہر شخص اپنے کام میں لگا ہوا ہے، ہر شخص اپنے مرکز کی طرف متوجہ ہے۔کوئی آواز ہو، کوئی گفتگو ہو، کوئی جھگڑا ہو...... بالکل بھی نہیں۔ایک ایسا سکونِ محض ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی مسجدوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا جتنا میدان عرفات کے لاکھوں آدمیوں میں سکون ہوتا ہے۔تو کیا یہ آیات بینات میں شامل نہیں ہے۔

قالبی امن کے ساتھ قلبی امن بھی......انسان میں دو ہی قوتیں ہیں، جن سے ساری معصیتیں پھیلتی ہیں، ایک قوتِ شہوانی اور دوسری قوتِ غضبی۔ایک سے فواحش و منکرات پھیلتے ہیں اور دوسری سے مار دھاڑ، جھگڑے اور ٹنٹے پھیلتے ہیں۔لیکن میں کہتا ہوں کہ مطاف کے اندر عورت مرد مخلوط ہو کر طواف کرتے ہیں، کندھے سے کندھا لگ رہا ہے، صرف یہی نہیں کہ مرد کو ادھر توجہ نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت پیدا ہوتی ہے کہ عورت کیوں سامنے آ گئی۔تو میں کہتا ہوں کہ ایک (باطل) جذبے کو سرد کر دینا، کیا یہ آیات بینات میں داخل نہیں ہے! یہ اللہ کی کھلی نشانی ہے ورنہ مرد کو عورت کی طرف طبعی کشش ہوتی ہے، لیکن سینکڑوں عورتیں موجود، کندھے سے کندھا، کمر سے کمر لگتی ہے۔نہ صرف یہ کہ رغبت نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت بھی ہوتی ہے کہ یہ کہاں بیچ میں آ گئی! اور ہماری طاعت و عبادت کے درمیان خلل انداز ہو گئی۔تو دلوں کا بدل ڈالنا بلاشبہ آیاتِ بینات میں داخل ہے۔

یہی قوتِ غضبی کا حال ہے، ورنہ اتنے جھگڑے جھیلے ہوتے کہ حکومت کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا، جگہ جگہ لڑائیاں ہوتیں، لیکن کہیں لڑائی نہیں، حتیٰ کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہے، خلافِ طبع امور پیش آ رہے ہیں۔اور

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷.

② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۶.

③ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷.

لاکھوں آدمیوں میں مُتَفَقِّہ فی الدین علماء تو نام کو ہیں زیادہ تو جہلاء ہیں، لیکن جھگڑے کا نشان نہیں۔ اور یوں کبھی اتفاق سے ہو جائے تو بندہ بشر ہے، انسان ہے! کہیں ہو جائے، لیکن جتنا طبعًا ہونا چاہئے تھا، قطعاً اس کا نشان نہیں۔ تو قوتِ غضبی بھی ساکن ہے اور قوتِ شہوانی بھی ساکن ہے۔ کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ باطنی طور پر بھی امن کا گھر ہے۔ تو اندر بھی امن ہے اور باہر بھی امن ہے اور قلوب کے اندر بھی امن ہے۔ قلبی اور نفسانی قوتوں کو وہاں اتنا پامال کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام میں نہیں لگتیں۔ خدا کی ذات بابرکات کی اطاعت وعبادت اور روحانیت کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ تو ﴿فِیْهِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ﴾ ① میں رزق کا ملنا، جھگڑوں کا نہ ہونا بھی داخل ہے، شہوانی امور کا مٹنا اور نہ ہونا، یہ بھی داخل ہے۔ خالص قلبی اور قالبی امن ہے، باطنی بھی اور ظاہری بھی ہے۔ ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ ② جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا۔ تو امن فقط اسی کو نہیں کہتے کہ جان بچ جائے، امن اسے بھی کہتے ہیں کہ آدمی نفس سے بچ جائے، شیطان کے رذیلوں سے بچ جائے نفس وشیطان کی مکاریوں سے بچ جائے۔ اور یہاں سبھی چیزوں سے بچاؤ ہو رہا ہے تو "آیات بیّنات" ظاہر میں بھی نمایاں، باطن میں بھی نمایاں۔ تو مکہ مکرمہ اور بیت اللہ اول عالم بھی ہے، مرکز عالم بھی ہے اور وسط عالم بھی ہے اور ہم سب کی اصل بھی ہے۔

وسطِ عالم میں ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت ...... اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں پیدا فرمایا گیا، کہ یہ دین عالمی ہے مقامی نہیں ہے کہ کسی ایک خطہ اور قوم کے لئے ہو، پوری دنیا کے لئے ہے۔ تو پھر ایسی جگہ سے آواز اٹھائی جائے کہ چاروں طرف اس کی آواز برابری کے ساتھ پھیلے، وہ مکہ ہی ہوسکتا تھا۔ اس لئے ولادت باسعادت مکہ میں ہوئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت الی اللہ شروع کی وہ مکہ سے شروع کی، ہر طرف اس کی آواز پھیلی۔ اگر کسی ایک جانب ہوتے تو وہاں دین کا غلبہ ہوتا اور دوسری طرف اندھیرا ہوتا۔ لیکن جتنا بھی دین پھیلا ہے بہر حال چہار طرف پھیلا ہے۔ کوئی ملک خالی نہیں جس میں اللہ کے نام لیوا موجود نہ ہوں۔

پھر اس کو وعدہ دیا گیا کہ ایک وقت آ رہا ہے کہ پورے عالم میں یہی ایک دین ہو جائے گا۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَّبِذُلِّ ذَلِیْلٍ ﴾ ③ روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھر، نہ کوئی اینٹ پتھر کا گھر اور نہ کوئی کپڑے اور چمڑے کا خیمہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا، رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر مانے۔ جبر کے معنی یہ نہیں کہ مسلمان گلے پر تلوار رکھیں گے کہ کلمہ قبول کرو، اس کی تو ممانعت ہے: ﴿لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾ ④ دین میں کوئی اکراہ (جبر) نہیں۔ ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾ ⑤۔ اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ دین قبول کریں! تو دین جبری چیز نہیں۔ اس لئے اسلام میں اکراہ جائز

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷. ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۷. ③ المستدرک للامام الحاکم، ج: ۱، ص: ۲۶۳. ④ پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۶. ⑤ پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الایۃ: ۹۹.

نہیں...... پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ ''بِـــذُلِّ ذَلِـیـلٍ''!!! یعنی دنیا میں چہار طرف دھکے کھا کھا کے اسلامی اصول مجبور کردیں گے کہ انہیں میں پناہ لی جائے، اس کے سوا پناہ گاہ کوئی نہیں رہے گی، مجبور ہوکر سب اس کی طرف آئیں گے۔

ہر ایک کو اسلامی اصول بالواسطہ یا بلاواسطہ تسلیم کرنا...... بادشاہوں میں عموماً گدی نشینی ہوتی تھی، خاندانوں میں اس کی وراثت چلتی تھی، کئی کئی صدیوں تک ایک ہی خاندان حکومت کرتا تھا۔ آج بین الاقوامیت غالب آئی تو بادشاہتیں اور اس کی حکومتیں ختم ہونا شروع ہوگئیں۔ ''انتخاب اصلح'' کا اصول آیا کہ جو تم میں بہتر ہو اس کو امیر بناؤ۔ یہ الگ چیز ہے کہ بہتری کا معیار کیا تجویز کیا گیا۔ اسلام میں بہتری کا اصول یہ ہے کہ جو فاضل ہو، متقی ہو، متوجہ الی اللہ ہو وہ اصلح ہے، جس کو خلیفہ کہتے ہیں۔ لوگوں نے کہا: جو مالدار زیادہ ہو، یا کہا کہ جس کے ساتھ ووٹ زیادہ ہوں۔ یہ تو الگ چیز ہے، الحاصل ''انتخاب اصلح'' کا اصول رائج کرنا پڑا۔ جیسے کہ عرف عام میں مشہور ہے کہ سب بادشاہتیں ختم ہوجائیں گی، بس دو بادشاہتیں باقی رہیں گی، ایک انگلستان کی اور ایک جو تاش میں بادشاہ ہوتا ہے۔ انتخاب اصلح اسلام کا اصول نہیں تو اور کیا ہے! انتخاب اصلح یعنی صالح ترین امیر مقرر کرو۔ اسلام نے یہ اصول دیا ہے۔ وہاں نہ خاندانیت تھی، نہ قبائلیت تھی۔ باقی چاہے وہ اتفاق سے خاندانی بھی ہوجائے تو اس کا مضائقہ نہیں، خاندان کی بالکل نفی نہیں کہ اچھے خاندان کی طرف جانا ہی نہیں۔ اگر خاندان میں ہی کوئی اصلح پیدا ہوجائے، کوئی صالح ترین فرد ہو تو سبحان اللہ! دونوں باتیں حاصل ہوجائیں گی۔ مگر مقصود اصلی یہ ہے کہ امیر صالح اور مصلح ہو۔ بہر حال انتخاب ہوا۔ تو انتخاب اصلح کا اصول آیا۔ آج لوگ انتخاب کرنے پر مجبور ہیں۔ انہیں اس کے علاوہ کہیں پناہ نہیں مل سکتی، ایک سلسلہ چل پڑا۔

اسی طرح وراثت کا قصہ ہے۔ بہت سی اقوام میں بیٹیوں کو وراثت نہیں ملتی تھی۔ اسلام نے بیٹے اور بیٹیوں کا حق رکھا۔ البتہ فرق مراتب ضرور قائم رکھے۔ مگر جس طرح بیٹا باپ کا وارث ہے، بیٹی بھی وارث ہوگی۔ بعض اقوام میں بیٹیوں کی بالکل وراثت نہیں تھی۔ ہندوستان میں بعض قوموں کی عورتوں نے ایجی ٹیشن برپا کیا اور انہوں نے اسمبلی کے اردگرد دھاوا بولا کہ: جس باپ کی اولاد لڑکے ہیں، اسی کی اولاد ہم لڑکیاں بھی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں میراث نہ ملے! آخر بالکل مجبور ہوکر گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑا اور وراثت میں ان کو حصہ دار بنایا۔ اس قانون کے بنانے میں اقوام نے کدھر رجوع کیا! ان کے ہاں تو کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے اسلامی فقہ کو لے کر اپنے الفاظ میں ادا کردیا اور کیا کہا جائے گا!۔ تو لوگ اسلام کا نام نہیں لیتے مگر اس کے اصول اختیار کرتے جارہے ہیں۔

ہندو گورنر کے ایم منشی کا تسلیم حق...... کے ایم منشی جو یوپی کا گورنر تھا، اس نے ایک جلسہ میں اپنا پیغام بھجوایا۔ میں بھی اس جلسہ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ اس کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اس نے معذرت کی کہ حکومت کے کام بہت پڑے ہوئے ہیں، میں نہیں آسکتا، میں اپنے بجائے اپنا پیغام بھیجتا ہوں۔ سیرت کا جلسہ

تھا، وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا، اس کے دو جز تھے۔

پہلا جز یہ تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مناقب اور فضائل اس نے بیان کئے اور ایسے بیان کئے کہ شاید کوئی مسلمان بھی اتنا نہ بیان کرے۔ اس نے کہا: دنیا میں اگر کوئی ہستی ایسی ہے جس کی زندگی پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں تو وہ سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسری کوئی نہیں، کامل اور مکمل ہستی ایک ہی پیدا ہوئی۔ یہ تو ابتدائی جز تھا۔ دوسرا جز یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلامی اصولوں پر بنایا ہے ہم نے عدل قائم رکھا، مساوات قائم رکھیں، اقوام کے حقوق برابر رکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان حقوق کو چور اور ڈاکو مارنے لگیں اور نہ پہچانیں، مگر قانون میں حقوق برابر رکھے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انکے ہاں اس قسم ...... کے اصول نہیں تھے آخر مجبور ہو کر اسلام کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں سے اصول لئے۔

گاندھی جی کا صدیق وفاروق کی حقانیت کے آگے سرنگوں ہونا...... ہندوستان میں جب کانگریس کی عارضی حکومت قائم ہوئی تھی تو گاندھی نے کہا تھا کہ: ''ہمارے وزراء اگر عالمی وقار چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ چھوت چھات کو ختم کریں، نسلی امتیازات کو ختم کریں، اونچ نیچ ختم کریں اور...... صدیق وفاروق کا نمونہ اختیار کریں''۔ گاندھی کی قوم نے برا مانا اور کہا کہ آپ کو صدیق وفاروق ہی کا نمونہ ملتا ہے!۔ اس نے کہا:

''بھئی! کسی اور قوم میں تم نمونہ بتادو۔ جب نہیں ملا تو اب میں کس کا نام لوں! یہ ساری مثالیں انہوں نے ہی قائم کی ہیں کہ حکومت بھی قائم اور درویشی بھی قائم، دبدبہ بھی قائم اور ساتھ میں پیوندوں کی چادریں بھی قائم اور زہد و قناعت بھی قائم۔ تم کوئی حکومتیں مثال میں بتلادو کہ نظام عالم بھی قائم ہے اور سارے درویش کے درویش ہیں''۔

خلفائے راشدین نے کوئی سونے چاندی کے محل نہیں قائم کرائے، یہی سادہ زندگی جو عوام الناس کی تھی، وہی زندگی ان کی تھی۔ مگر پورے عالم میں دینِ حق کا ایک دبدبہ پھیلا دیا۔ تو قوم نے برا مانا کہ تمہیں یہی نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا جب نمونہ نہیں ہے تو میں کسے پیش کروں، تم برا مانو یا بھلا! بہرحال مطلب یہ ہے کہ لوگ اسلام کی طرف جھکیں گے، مسلمان ان کے گلے پر کوئی تلوار نہیں رکھیں گے کہ اسلام قبول کرو، بلکہ اصول مجبور کریں گے کہ اسلام کی طرف آؤ، زمانہ مجبور کرے گا۔ دوسری طرف پناہ نہیں ملے گی، انہیں اصول میں پناہ ملے گی۔ اس لئے کہ یہ فطری اصول ہیں، تو قبول کرنے کیلئے لامحالہ مجبور ہوں گے۔

فیضانِ نبوت کا پورے عالم میں پھیل جانا...... تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا، فرمایا: ''لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ'' الخ روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھرانہ نہیں رہے گا مگر اس میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا① ''فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰہِ'' ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر پورے عالم میں ایک دین ہو جائے گا۔

① المستدرک للامام الحاکم، ج: ۱، ص: ۲۶۴.

بعض حضرات شرّاح فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ: ''فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ'' حدیث کا جز ہے۔بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے مگر بہر حال مقولہ حق ہے کہ جب روئے زمین کے ہر گھر میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔

یہ مکہ کی آواز تھی، سارے عالم میں پھیلنی چاہیے تھی۔اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی وہ آواز مرکز سے چہار طرف پھیلی اور اس کی تکمیل ہوئی تھی۔مگر وہ تکمیل کیفیت کے لحاظ سے تھی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار وہ افراد تیار فرما دیئے، جو نبی تو نہیں تھے مگر آثارِ نبوت سب کے اندر موجود تھے۔''عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ......'' ① وہ انبیاء علیہم السلام تو نہیں تھے، مگر حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ کام کئے جو انبیاء کرتے ہیں۔جو جس خطے میں پہنچ گیا اس خطے کو ایمان وعلم اور نور سے رنگ دیا۔صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان تو بڑی ہے۔آئمہ مجتہدین میں سے جو جہاں بیٹھ گیا اس نے اس خطے کو علم ومعرفت اور ایمان سے رنگ دیا۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خراسان میں تھے، انکا مذہب پھیلا تو خراسان، ہندوستان، افغانستان میں حنفیت ہو گئی، اس راستے سے کروڑوں آدمی جنت میں پہنچ گئے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ابتدائی قیام حجاز میں تھا اور وفات کے وقت مصر میں قیام تھا تو مصر وحجاز میں اکثریت شوافع کی ہے۔غرض جو امام جہاں بیٹھ گیا اس نے علم وتفقہ اور کمالاتِ دینی سے اس خطہ کو رنگ دیا۔تو یہ حضرات انبیاء نہیں تھے لیکن کام وہ کیا جو نبیوں کا کام تھا۔ایک نبی آیا تو علاقہ کو ایمان سے بھر دیا۔اس امت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام میں ایسے افراد پیدا ہوئے کہ کارہائے نبوت انجام دیئے۔طاقت ایک ہی نبوت کی تھی اور وہ ہے ختم نبوت! اس کے نیچے آ کر علماء نے کام کیا۔فیضان ایک نبوت کا ہے، اس کے تحت میں علوم وکمالات دنیا میں پھیلے......اور پھیلتے ہی رہیں گے۔تو عہدِ نبوت میں دین مکمل ہوا اور چہار طرف پھیلا......مگر کیفیت کے لحاظ سے، کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ایسے نمونے تیار ہو گئے کہ شاید ہر صحابی کسی ایک نبی کی نسبت پر ہے۔گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات جامع النّسب ہے اور آپ کی تربیت سے وہ نسبتیں آگے پھیلیں تو کیفیت کے لحاظ سے دین مکمل ہو گیا۔

مگر آواز مرکز کی یعنی مکہ کی تھی، اسے سارے عالم میں پھیلنا تھا، تو دورِ عیسوی میں اور دورِ مہدوی میں جو کہ آخری دو مجدد ہوں گے، اس وقت کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ ② پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔اسلام واحد کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہے گا اور اسلام سارے عالم میں پھیل جائے گا۔تو کمیت یعنی تعداد کے لحاظ سے اخیر میں تکمیل ہو گی۔کیفیت کے لحاظ سے پہلے تکمیل ہو چکی ہے۔تو مکہ کی آواز

① علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں: قال شیخنا ومن قبله الدمیری والزرکشی: انه لا اصل له، زاد بعضهم ولا یعرف فی کتاب معتبر دیکھئے: المقاصد الحسنة للسخاوی ج: ۱ ص: ۴۵۹. ② پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیة: ۳۹.

جو مرکز سے اٹھی تھی بے اثر نہیں جاسکتی تھی، کیفا بھی پہنچ گئی اور جب کمیت کے لحاظ سے پورے عالم میں دین واحد ہوگیا تو مقصدِ دنیا پورا ہو جائے گا کہ عبادت کا کارخانہ مکمل ہو چکا، اس کے بعد پھر قیامت کا دور ہے، چنانچہ یہ عالم ختم کر دیا جائے گا۔ میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مکہ سے اٹھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ خیر و برکت کے بعد پوری امت آپ کی قائم مقام ہے تو اس امت کا فرض بھی یہ ہے کہ اس آواز کو آگے بڑھائے اور مرکز سے چلائے۔

قاری طیب صاحب کے وفد کی شاہِ حجاز ملک عبدالعزیز سے ملاقات...... تقریباً انچاس برس کا عرصہ ہوا ہے، جب پہلی دفعہ یہاں (کعبہ مکرمہ میں) میری حاضری ہوئی ہے۔ اس وقت ملک عبدالعزیز بن سعود مرحوم زندہ تھے۔ اور ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا کہ مطاف میں ان پر کسی نے حملہ کیا، اللہ نے ان کو بچالیا۔ تو ہندوستانی زعماء کی طرف سے مبارک بادی کا جلسہ منعقد کیا گیا کہ مَلِک کو مبارک باد دیں کہ اللہ نے آپ کی حفاظت کی اور آپ کو محفوظ رکھا۔ فندق مکہ میں یہ جلسہ ہوا۔ اور تقریباً تین چار سو کے قریب حضرات' جن میں علماء زعماء تجار اور امراء سب جمع تھے۔ اس حج کو لوگ حج العظماء کہا کرتے تھے۔ یعنی ہر ملک کے بڑے بڑے لوگ اس حج میں شریک ہوئے۔ خیر وہاں جلسہ ہوا تقریریں ہوئیں، تجویز پاس ہوئی اور ایک وفد گیارہ آدمیوں کا تیار کیا گیا، جس میں مفتی نعیم صاحب مرحوم لدھیانوی، حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری، مولانا آزاد سبحانی مرحوم وغیرہ گیارہ آدمی تھے اور انہوں مجھے رئیس الوفد بنادیا کہ جا کر مَلِک کی خدمت میں تجاویز پیش کریں کہ کل جلسہ ہوا تھا، یہ اس کی کارروائی ہے۔ مَلِک نے اجازت مرحمت فرمائی اور بہت ہی توقیر و عزت کی۔

انہوں نے یہ فرمایا کہ: وہ جو گیسٹ ہاؤس ہے، مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ...... وہاں علما کو نہ بٹھایا جائے، اس لئے کہ وہاں میں آؤں گا تو علماء میری تعظیم کو کھڑے ہوں گے، میں چاہتا ہوں کہ خود ان کی تعظیم کروں، وہ میری تعظیم کو کھڑے نہ ہوں۔ لہٰذا محل میں جو ان کا اپنا کمرہ تھا اس میں بلوایا، تاکہ جب علماء آئیں تو میں تخت سے اتر کر ان کی تعظیم کروں چنانچہ ہم اندر پہنچے اور ملک اپنے شہ نشین سے اترے اور انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا، اپنا تعارف کرایا، خیر یہ کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد اخیر میں میں نے تجویز پیش کی کہ:

''اس وقت کوئی عیسائی حکومت ایسی نہیں، جس کے ہاں تبلیغی مشن نہ ہو۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس کی حکومتیں کروڑوں روپے اس پر خرچ کر رہی ہیں اور جگہ جگہ ملکوں میں تبلیغی مشن کے افراد پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر حکومت حجاز اس قسم کا اقدام کرے اور اسلامی تبلیغ کے لئے یہاں سے وفود روانہ کرے تو سارے مسلمانوں کے لئے ایک عزت افزائی کا سامان ہوگا، حکومت کی محبت بھی دلوں میں قائم ہوگی۔ اور اس آواز میں بھی اثر ہوگا۔ اور ہندوستان ...... جب وفد آئے گا...... تو میں نے عرض کیا: سارے علماء اس کی حمایت اور اسکے تعاون کے لئے کھڑے ہو جائیں گے جہاں جہاں آپ وفد بھیجیں گے''۔

یہ ہم نے تجویز پیش کی۔ ملک نے اس کو بہت پسند فرمایا اور فرمایا کہ بالکل مناسب تجویز ہے۔ مگر یہ کہا کہ ابھی اس کا وقت نہیں، اس لئے کہ مثلاً برطانوی حکومت ہے، ہم اسلامی تبلیغ کے لئے وفد بھیجیں گے۔ وہ کہیں گے اس میں کوئی سیاسی چال ہے، تو تبلیغ تو ایک طرف رہ جائے گی اور سیاسی قصے آ جائیں گے پھر اس میں کہیں شکوک وشبہات اور فتنے نہ کھڑے ہو جائیں۔ مگر تجویز معقول ہے وقت آ رہا ہے اس کے اوپر عمل درآمد ہوگا، وقت کا انتظار کیا جائے۔

ممکن ہے یہ چیز عمل میں بھی آ جائے، کچھ سننے میں آ بھی رہا ہے کہ یہ تجویز عمل میں آ رہی ہے۔ بہر حال وہ حکومت کا قصہ ہے۔ جس طرح حکومت نے حج کے سلسلے میں احسانات کئے ہیں، حرم شریف کی توسیع اور حج کے انتظامات کئے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایک چیز ہے کہ دین کی تبلیغ اور اشاعت کی طرف توجہ ہو۔ مگر بہر حال جب تک حکومت متوجہ نہ ہو اس وقت تک علماء کا کام ہے کہ وہ اپنے طور پر اس کو چلائیں اور اس کو مرکز بنایا جائے۔

اہل مکہ کے بجائے تبلیغی جماعت نے دین کا کام اٹھایا...... الحمد للہ ہماری تبلیغی جماعتوں نے اس کو مرکز بنالیا ہے۔ بہت سے افراد ہیں جو ہجرت کر کے یہاں آ گئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور کام جاری ہے۔ دیہات تک میں کام پھیلا دیا ہے۔ باقی وہ احق تھے اسکے...... کہ یہ کام پھیلاتے۔ یہ کام اس کا مستحق تھا کہ یہ کام یہیں سے جاری ہو۔ برکت اور وسعت کا اس میں اثر ہے۔ مکہ کے لوگ جب باہر ملکوں میں پہنچیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ تو قلوب پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ جو جماعتیں پہنچتی ہیں اس میں عرب ہوتے ہیں تو ہندوستان والے اس سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں ایک نیت پیدا ہوتی ہے کہ بھئی جب عرب تک تبلیغ کرنے آ گئے تو ہم ہی بیٹھے ہیں، ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بھی تبلیغ کریں، اس کا اثر پڑتا ہے۔ بہر حال تبلیغی جماعت نے یہاں بھی اور دنیا کے ہر ملک میں بحمد اللہ مراکز قائم کئے۔ حجاز میں بھی مرکز قائم ہے، مدینے ومکہ میں بھی ہیں اور یہاں سے مضافات میں بھی جماعتیں جاتی ہیں اور بہت سے لوگوں کے اندر یہ سلسلہ پھیل گیا ہے۔ تو واقعی مکہ ہی اس کا احق تھا کہ یہیں سے آواز اٹھتی۔

شام مرکزِ سیاست ہے...... آج مکہ مکرمہ جس طرح بین الاقوامی عبادت گاہ ہے اسی طرح بین الاقوامی تجارت گاہ بھی بن گیا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی چیز یہاں ملتی ہے اور کہیں ملے نہ ملے۔ تو بین الاقوامی تبلیغ گاہ بھی یہاں ہونی چاہیے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا کلمہ بلند ہو اور چلے اور آثار روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر دور میں عرب بھی کھڑے ہوں گے۔

انہی کے ہاتھوں پر قوت وشوکت کے ساتھ یہ چیز آگے بڑھے گی اور باطل قوتیں بھی انہی کے ہاتھوں ٹوٹیں گی۔ مہدی ہیں وہ بھی عربی ہیں اور حسنی ہوں گے، ان کے زمانے میں مغرب کی قوتیں ٹوٹیں گی، بیعت بھی انہی کے ہاتھ پر مکہ ہی میں شروع ہوگی اور وہ شام کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔ اس لئے کہ وہ مرکزِ سیاستِ اسلام ہے۔ حجاز مرکزِ عبادت بتایا گیا ہے، عبادت کے لئے امن کی ضرورت ہے، فتنہ ہوتا ہے تو آدمی نہ تلاوت کر سکے نہ ذکر

کر سکے، عبادت کے لئے سکون ضروری ہے۔ جب اللہ نے اس کو مرکزِ عبادت بنایا تو امن کا بھی مرکز بنادیا: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ ① . اور ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ ② . پھر اس کو امن گاہ بھی عالمی بنایا، اس لئے کہ یہ عبادت گاہ تھی اور عبادت فتنوں کے اندر نہیں ہوسکتی۔ یہاں جانوروں اور درختوں تک کو پناہ ہے، بلکہ یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں کاٹی جاسکتی۔ یہاں کے پتھر وغیرہ ہیں ان کے بارے میں بھی یہ پسندیدہ نہیں سمجھا گیا کہ آدمی اٹھا کر لے جائے کیونکہ یہاں امن ہے، محرم کے لئے شکار تک ممنوع ہے۔ تو جانوں کو بھی پناہ، مال کو بھی پناہ، یعنی امنِ کامل۔ جب اتنا امن ہے، تبھی عبادت کا کارخانہ یہاں چل سکتا ہے۔ اور سیاست کے لئے تعلقات، روابط، جوڑ توڑ اور اونچ نیچ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو عبادت کی خیر سلّا ہوجاتی۔ اسلام نے شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا ہے، حجاز مرکزِ عبادت ہے، اصل اصول وہی ہے۔ لیکن جب جنگ کرنی ہو، فوجیں بھیجنی ہوں تو وہ شام سے ہو۔ تو شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا۔

مصر مرکزِ عسکریت ہے...... اور مصر کو مرکزِ عسکریت قرار دیا کہ وہاں فوجی قوت جمع رکھو۔ شام اور حجاز کو مہاجر بنایا، کوئی ہجرت کرے تو شام میں اور حجاز میں کرے۔ مصر کو ہجرت گاہ نہیں بنایا، وہ فوجی چھاؤنی ہے۔ اس لئے کہ فوج میں جو لوگ بھرتی ہوتے ہیں وہ ہجرت کر کے وطن چھوڑ کے تھوڑا ہی جاتے ہیں، وہ تو طاقت کو فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مصر کو فوجی طاقت بناؤ اور لوگ مدد پہنچائیں مگر ہجرتیں کر کے وہاں نہ جائیں۔ طاقت ان کے وہاں پہنچتی رہے۔

اس لئے کہ مصر درحقیقت یورپ کے لئے ایشیا کا دھانہ ہے، اور ایشیاء کے لئے یورپ کا دھانا مصر ہے۔ تو ادھر کے لئے ادھر دھانا اور ادھر کے لئے ادھر دھانہ۔ اس دھانے پر جو غالب ہوگا اسی کے اثرات غالب ہوں گے۔ اگر ایشیا مصر پر غالب ہے تو یورپ تک اثرات پہنچیں گے۔ اور اگر یورپ نہر سویز اور مصر پر غالب ہوگیا تو پورے ایشیا پر یورپ کے اثرات پہنچیں گے۔ اس لئے احادیث سے اشارے ملتے ہیں کہ مصر کو قوت گاہ بناؤ، مرکز عسکریت قرار دو، شام کو مرکزِ سیاست قرار دو، یہاں شام میں امن رہنا چاہئے، وہاں مصر میں جنگیں ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس جنگوں کے بیچ میں رہا ہے، کبھی ہم غالب، کبھی یہودی غالب، کبھی نصرانی غالب، كُلَّمَا نَصَبَتْ حَرْبٌ نَصَبَتْ اُخْرٰى ایک جنگ ختم ہوتی ہے، دوسری چھڑ جاتی ہے۔ وہ مرکزِ عبادت بنتا تو عبادت کا کارخانہ کبھی نہ جم سکتا، رات دن جنگیں اور جوڑ توڑ رہتا۔ تو عبادت کا مرکز حجاز کو قرار دیا، اسے امن بخشا، سیاست کا مرکز شام کو قرار دیا کہ یہاں لڑتے مرتے رہو، جو بھی غالب آجائے۔

اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے...... بہرحال دین کی تبلیغ، یہ بھی امن کی چیز ہے، بدامنی میں تبلیغ بھی مشکل ہوتی ہے، جیسے نماز پڑھنی مشکل۔ تو یہ ملکِ (حجاز) زیادہ احق ہے کہ یہ مرکزِ تبلیغ بنے۔ یہیں سے اللہ کے دین کی آواز اٹھے،

---

① پارہ: ۱ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵ . ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۶۷ .

جیسا کہ یہاں سے دین اٹھا ہے۔اور خدا کا شکر ہے کہ تبلیغی حضرات نے اس کو سمجھا ہے اور کام چل رہا ہے۔دیہات تک ان کے تعلقات اور روابط ہیں۔یہیں سے جماعتیں ہندوستان اور دوسری جگہ بھی جانے لگی۔تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کام میں شرکت کر کے قوت پہنچائیں،اس لئے کہ اس کی قوت سے ہماری قوت ہے۔اسلام کی قوت جو ہے وہ پھیلنے میں ہے،سکڑنے میں نہیں ہے۔اگر اسلام کو آپ کسی کوزے میں بند کر کے رکھ دیں وہ پھیل نہ سکے گا،اسلام کی اصلیت ختم ہو جائے گی،اسلام میں جامعیت اور پھیلاؤ ہی ہے،وہ جبھی اپنی اصلی صورت میں رہے گا جب کہ وہ دنیا کے اندر پھیلتا رہے۔''لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ.''اس کے اندر جماعتی رنگ رہنا چاہئے۔اگر یہ تبلیغی دین نہ ہوتا تو حجاز سے باہر نہ نکلتا،لیکن یہ ساری دنیا میں پھیلا ہے،یہ تبلیغ ہی کی برکت ہے۔اس لئے کہ جب یہ دین کا مرکز ہے تو تبلیغ کا مرکز بھی ہے۔اس کے لئے یہاں کے لوگوں کو زیادہ آمادہ کیا جائے کہ یہ دینی تعلیم وتبلیغ کے لئے اور دعوت الی اللہ کے لئے اٹھیں۔

اختتامیہ کلمات......اس واسطے میں نے یہ چند باتیں عرض کیں کہ مکہ کا اول عالَم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ دین کے کاموں کی یہیں سے اوّلیت ہو۔اس کا مرکزِ عالَم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہاں دین کی مرکزیت ہو۔اس کا اصل عالَم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہیں سے چہار طرف آواز پھیلے۔

اس واسطے میں نے یہ چند چیزیں عرض کیں اور محض تعمیل حکم کے لئے عرض کیں،ورنہ میں کچھ بیمار بھی ہوں۔یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینہ اور مکہ میں ہماری جرأت تو بولنے کی ہوتی نہیں،اب زبردستی بڑے بلوائیں تو الگ چیز ہے۔مثل مشہور ہے کہ بڑا مارے بھی اور بار کر رونے بھی نہ دے۔حکم دیا کہ کرو تقریر!عذر بھی نہیں سنا جائے گا،اس لئے تعمیل حکم کے طور پر یہ چند باتیں عرض کیں،ورنہ کچھ علالت اور مقام کی ہیبت وعظمت کی وجہ سے نہ جرأت پڑتی ہے نہ ہمت ہوتی ہے۔یہ چند الفاظ بھی خود اپنی ہمت سے نہیں کہے کہ میری ہمت کام کر رہی ہو۔ممکن ہے آپ حضرات کی ہمت کام کر رہی ہو،ورنہ میں نے عرض کر دیا تھا:میرے میں جرأت نہیں،بہت سے لوگوں نے کہا کہ حرم شریف میں تقریر ہو جائے!میں نے کہا کہ تقریر کے بہت سے مواقع ہیں،حرم شریف ہماری تقریروں کے لئے نہیں،جو باعزم لوگ ہیں تقریر کریں،ہم جیسے طالب علموں کے لئے مناسب نہیں۔بہرحال تعمیل حکم کے طور پر یہ چند چیزیں عرض کیں تا کہ ایک تو مقامات کی برکت معلوم ہو جائے اور جو مقصد ہے،تبلیغ کا کام پھیلے،اس کی طرف بھی کچھ اشارہ ہو جائے۔اللہ تعالیٰ اس کام کو بڑھائیں اور ہم سب کو اس کام میں لگنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔

''اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ''

عبادت وخلافت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ!فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْبِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ. اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ٥ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

بزرگانِ محترم!...... یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ یہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کی اور حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو نقل فرمایا، یہ پورا رکوع ہے جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں ہی کا ذکر ہے،ان کی نصائح میں ایک نصیحت یہ ہے جو اس وقت میں نے تلاوت کی۔اس آیت کے سلسلہ میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی،اور نہ ہی آیت کی تفسیر کرنی ہے کہ وہ بہت لمبی چیز ہے، وقت اتنا نہیں ہے،اسی آیت سے ایک مضمون اخذ واستنباط کر کے میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اور وہ دو مقاصد پر مشتمل ہوگا، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ انسان کو اللہ نے دنیا میں کیوں بھیجا؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کی زندگی کے کیا مقاصد متعین ہیں؟ اور ہم ان مقاصد کو کس حد تک انجام دے رہے ہیں۔

تمہید...... ان دو مقاصد کی تفصیل سے پہلے ایک مختصر سی تمہید سمجھ لیجئے،تا کہ اس مقصد کا سمجھنا آسان ہو جائے،وہ یہ کہ یہ جو لمبی چوڑی کائنات آپ کے سامنے پھیلی پڑی ہے،جس میں بے انتہا طویل وعریض آسمان کا خیمہ تنا ہوا ہے،زمین کا فرش بچھا ہوا ہے،زمین وآسمان کے بیچ میں ہزاروں قسم کی مخلوقات پھیلی پڑی ہیں، جمادات اور ان کی ہزاروں قسمیں،نباتات اور ان کی ہزاروں قسمیں، جانوروں کی ہزاروں قسمیں ہیں،دریا اور خشکی کے جانور،غرض جمادات، نباتات اور حیوانات یہ بہت سی انواع واقسام ہیں، جو زمین وآسمان کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں پھر آسمانوں کے اوپر ایک عظیم مخلوق ہے،جس کو ملائکہ کہتے ہیں وہ اتنے پھیلے ہوئے ہیں، جیسے حدیث میں ہے کہ:

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمٰن، الآیۃ: ۱۷.

آسمان میں چار انگلی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔تو ان گنت ملائکہ اوپر پھیلے ہوئے ہیں،اس ساری کائنات اور مخلوقات کی انتہا عرش پر جا کر ہوتی ہے۔عرش عظیم کے اوپر شریعت کسی مخلوق کا پتہ نہیں دیتی،وہاں خالق کی تجلیاں اور کمالات ہیں۔صرف ایک مخلوق کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے ایک تختی اور لوح رکھی ہوئی ہے،اور وہ تختی زمین وآسمان سے بھی زیادہ بڑی ہے،اس پر لکھا ہوا ہے کہ"اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ" ① میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے رحمت آگے آگے چلتی ہے،غضب اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہے،اصل رحمت ہے،غضب اس کے تابع ہے،یہ ایک دستاویز لکھی ہوئی ہے،اس مخلوق کا تو نشان ملتا ہے باقی خالق کی تجلیات وکمالات اور اس کی صفات عرش کے اوپر پھیلی ہوئی ہیں تو زمینیں،آسمان وزمین کے درمیان فضا،آسمان،جنت، عرش اور کرسی پھر تجلیات ربانی کا یہ سلسلہ ہے،تو بڑی لمبی چوڑی کائنات ہے۔

انسان میں مخلوقات کے نمونے.....لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اس ساری لمبی چوڑی کائنات کہ جو کروڑوں میلوں پر پھیلی ہوئی ہے،ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر دیا آجکل کے سائنس دانوں کے قول کے مطابق چاند زمین سے ستر لاکھ میل دور ہے،جس تک جانے کا ارادہ کیا جارہا ہے،(اب تو ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پہنچ بھی چکے ہیں) پھر اس سے کتنا اوپر آسمان ہے،پھر اوپر کتنے آسمان اور کتنی جنتیں ہیں،تو لاکھوں کروڑوں میل پر مشتمل ہے،لیکن جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کی جگہ میں آگئی،اور وہ ڈیڑھ گز کی جگہ کیا ہے؟ وہ آپ ہیں ساری کائنات کو اللہ نے انسان میں جمع کر دیا،جس میں زمین بھی ہے،آسمان بھی ہیں،پہاڑ بھی ہیں،جمادات،نباتات اور حیوانات بھی اس کے اندر جمع ہیں۔

انسان کو دیکھا جائے تو اس میں مٹی بھی ہے،پیدا ہی زمین سے ہوا،اسے مشت خاک ہی کہتے ہیں کہ ایک مٹھی خاک سے ہمارا بدن پیدا کیا گیا تو یہ ہمارا بدن زمین کا ایک تودہ ہے،روح نے اس مٹی کو سنبھال رکھا ہے روح نکلنے کے بعد پھر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے تو اصل میں مٹی ہے،اور اس زندگی کی حالت میں بھی اس سے مٹی نکلتی رہتی ہے،اگر آپ روزانہ غسل نہ کریں،تو جب بدن پہ ہاتھ پھیریں گے،بدن سے سیاہ بتیاں اتریں گی،وہ مٹی اور کوڑا کباڑ نہیں تو کیا ہے؟ تو بدن خاک کا ہے اور خاک ہی اس سے چھنتی ہے۔

اگر خارش ہو جائے،تو سارے بدن سے بھوسی سی جھڑتی ہے،جیسے مٹی جھڑ رہی ہو،تو آج بھی انسان مٹی کا تودہ ہے مرنے کے بعد یہ مٹی بکھر جاتی ہے،گویا انسان کے اندر زمین موجود ہے،اور وہی خاصیت اس زمین کی ہے،جو عام زمین کی ہے۔اگر آپ اس میں غور کریں،آپ کی اس زمین میں پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے ہزاروں چھوٹے بڑے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں یہ جو انسان میں ہڈیوں کا سلسلہ ہے یہ پہاڑیوں کی مانند ہے،کوئی بڑی،کوئی چھوٹی،کوئی لمبی،کوئی چوڑی،جیسے پہاڑ مختلف ہوتے ہیں۔تو یہ ایک سلسلہ ہے جو اس میں پھیلا ہوا ہے،اسی طرح اگر آپ غور کریں،جیسے دنیا کی زمین میں درخت،گھاس اور نباتات اگتے ہیں،ہماری زمین میں بھی نباتات اگے

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب و کان عرشہ علی الماء، ص: ۴۳۲.

ہوئے ہیں، کہ بہت ہی قریب قریب درخت ہیں، تو سر ایسا ہے، جیسے گھنا جنگل، کہ سینکڑوں درخت اس میں قریب قریب اگے ہوئے ہیں۔کوئی زمین ایسی ہوتی ہے کہ اس میں درخت دور دور ہوتے ہیں۔ جیسے عام بدن کے اوپر رواں، یہاں بال دور دور ہیں، کوئی زمین کا حصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہی نہیں ہوتا، ہتھیلیوں پر کچھ بھی نہیں اگتا، ناک کے اوپر کوئی بال نہیں اگتا تو اور کچھ حصہ وہ ہے کہ اس میں سر سے بال اگتے ہی نہیں غرض ہمارے بدن کی زمین میں مٹی، پہاڑ اور نباتات کا سلسلہ بھی ہے۔

اور اس میں حیوانات بھی ہیں آجکل کے ڈاکٹروں کی تحقیقات تو یہ ہیں کہ خون میں جراثیم (چھوٹے چھوٹے حیوانات) ملے ہوئے ہیں، جو خوردبین سے دکھلائی دیتے ہیں، ویسے نہیں بدن کے ہر حصے میں نئے نئے رنگ کے جانور ہین، ان کے مجموعے سے خون بنا ہے، وہ مر جائیں تو انسان مر جاتا ہے، تو پورے بدن میں جراثیم پھیلے ہوئے ہیں جیسے آپ کی زمین میں مختلف صوبے ہیں، کسی صوبے میں خاص قسم کے جانور، کہیں اور قسم کے جانور، کہیں کچھ ہوتا ہے کہیں کچھ تو یہ ہاتھ اور پیر اس زمین کے صوبے ہیں، اس میں مختلف قسم کے جانور ہیں وہ حیوانات مختلف شکلوں کے ہیں، اس سے امراض بھی پیدا ہوتی ہین، اگر ان جراثیم کو مار ڈالا جائے تو ان سے بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

انہی جراثیم سے زندگی بھی ہے، انسان کے مادے (خون) میں پھیلے ہوئے ہیں اور سر میں بھی تو کبھی جوئیں پڑ جاتی ہیں، آدمی ان کو پکڑتا ہے اور ناخن پر رکھ کر مارتا ہے یہ ایسے ہے جیسے جنگل میں مختلف جانور پھرا کرتے ہیں تو جیسے اسی زمین سے جانور پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں کھپ بھی جاتے ہیں بعض دفعہ معدے میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر علاج کرتے ہیں، وہ کیڑے ساری غذا کھاتے رہتے ہیں، انسان کمزور ہوتا رہتا ہے بدن کو نہیں لگتی، تو سر میں جوئیں اور معدے میں کیچوے پیدا ہو جاتے ہیں، زخموں میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں بہر حال انسان کی زمین میں مختلف حیوانات ہیں، جو چل رہے ہیں تو جیسی کائنات باہر کی ہے ویسی ہی ہمارے اندر کی کائنات بھی ہے، کہ زمین، پہاڑ، نباتات اور مختلف قسم کے حیوانات بھی، شکل وصورت سے بھی مختلف، پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔

پھر جیسے آپ کی اس دنیا میں وقت آنے پر بارشیں ہوتی ہیں، اس بدن میں بھی بارش ہوتی ہے جب گرمی آتی ہے تو پسینہ نکل رہا ہے، ایسے ٹپک رہا ہے، جیسے بارش ہو رہی ہو پھر جتنے قسم کے پانی زمین میں ہیں، اتنے ہی قسم کے انسان کے اندر ہیں، دنیا میں بعض جگہ پانی کے گرم چشمے نکلتے ہین ہندوستان میں منڈیل کے ضلع میں بعض جگہ کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہیں، لوگ اس پانی کو ٹھنڈا کر کے غسل کرتے ہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے منوں آگ میں اسے پکایا گیا ہو بعضے چشمے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے ہیں سمندر کا پانی کڑوا ہے بعض جگہ پانی میں ترشی ہوتی ہے۔انسان کے بدن کے اندر بھی ایسے ہی ہے منہ کے اندر اللہ نے میٹھا چشمہ جاری کر رکھا ہے، اگر منہ میں کڑوا پانی ہوتا، آدمی کی زندگی تلخ ہو جاتی تو نہایت شیریں قسم کے پانی کا چشمہ زبان سے بہہ رہا ہے اسی پانی کی مدد

سے غذا اندر پہنچتی اور اسی کی مدد سے ہضم بھی ہوتی ہے آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں، وہ نمکین پانی ہے، کبھی زبان پر آنسو کا پانی لگ جائے، تو نمک کا سا مزا آتا ہے تو آنکھوں کے اندر نمکین چشمہ جاری کر دیا ہے پتے میں دیکھو تو کڑوا پانی بھرا ہوا ہے، اس میں کڑوا چشمہ جاری ہے معدے کے اندر ترش پانی بھرا ہوا ہے، جس سے غذاء ہضم ہو رہی ہے پھر کہیں پاک پانی اور کہیں ناپاک مثانے میں ناپاک پانی بھرا ہوا ہے جسے پیشاب کہتے ہیں اور منہ میں پاک پانی بھرا ہوا ہے جسے لعاب کہتے ہیں، یہ نکلے کہ آدمی تھوکے، اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ پیشاب کا ایک قطرہ نکل آئے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو بدن میں پاک، ناپاک، ٹھنڈا، گرم، ترش اور میٹھا کڑوا ہمہ قسم پانی موجود ہے برسات اس میں ہے کہ پسینہ ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے، تو جو اس کائنات میں ہے وہی انسان کے اندر ہے ساری کائنات انسان میں جاری ہے۔

یہاں اگر ہوائیں چلتی ہیں تو انسان میں بھی ہوائیں چلتی ہیں جیسے یہاں ٹھنڈی اور گرم ہیں، آپ جب سانس اندر کو لیتے ہیں، تو ٹھنڈی اور جب باہر کو لیتے ہیں تو گرم ہوا نکلتی ہے۔ جیسے دنیا میں بعض اوقات ہوا بند ہو جاتی ہے، آدمی دوڑا دوڑا پھرتا ہے کہ بھئی پنکھے چلاؤ، طبیعت گھبرا گئی، انسان کے بدن میں بھی بوجھ ہو جاتا ہے، معدے میں ہوا پھنس جاتی ہے، ڈاکٹروں کے پاس دوڑے دوڑے پھرتے ہیں کہ صاحب! کسی طرح سے ہوا نکال دو اگر ہوائیں بند ہو جائیں تو اندر بھی گھٹن ہوتی ہے تو انسان کے بدن میں پانی بھی ہے اور ہوا بھی اور چلنے کا ڈھنگ بھی وہی جو باہر کی زمین میں ہے۔ اسی طرح انسان کے بدن میں آگ بھی ہے کبھی آپ بدن پر ہاتھ رکھیں گے تو گرمی محسوس ہوتی ہے اگر بدن میں آگ نہیں تو یہ گرمی کا ہے کی ہے؟ اور اگر آدمی زور سے ہاتھ کو ملے، تو چنگاریاں ہی نکلنے لگتی ہیں اور میل پھر دوڑ لیں، تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بدن میں آگ بھر گئی اگر اندر حرارت نہیں ہے، تو اندر کیا چیز ابلتی ہے تو آگ پانی، ہوا اندر موجود ہیں، اور ان کا عمل بھی جاری ہے۔

غرض یہ آپ کا بدن اس پوری کائنات کی طرح ایک دنیا ہے، جیسے اس میں اوپر آسمان ہے، اور نیچے زمین ہے آپ کے اندر سر آسمان کی مانند ہے اور نیچے پیر زمین کی مانند ہیں جیسے آسمان میں چاند سورج ہیں، جن کی روشنی سے آپ اس کائنات کو دیکھتے ہیں، انسان کی پیشانی پر چاند اور سورج کی طرح سے دو آنکھیں ہیں، ان میں روشنی نہ ہو، کائنات نظر نہیں آتی تو چاند، سورج اور روشنی بھی ہے پھر حکومت کا ایک نظام بھی قائم ہے ہاتھ اور پیر یہ قلب کے خادم ہیں، قلب کا ذرا اشارہ ہو، ہاتھ پیر چلنے لگتے ہیں تو پوری کائنات جیسے باہر منظم ہے، اسی طرح اندر بھی ہے قلب حاکم بادشاہ اور ہاتھ پیر اس کے خدام ہیں غرض تفصیل کہاں تک عرض کی جائے انسان کے اندر ہوا، برسات، آگ مٹی، پہاڑ، سبزہ، جانور اور موت وحیات بھی ہے سارا قصہ وہی ہے جو کائنات کے اندر ہو رہا ہے انسان کی ایک صورت یہ ہے جس کا آپ نے مشاہدہ کیا اور مثال دیکھی کہ آسمان سے زمین تک جتنے درجے کائنات کے ہیں، وہ سب اس کے اندر موجود ہیں یہ اللہ کی صناعی ہے کہ جس کائنات کو لاکھوں، کروڑوں میل میں پھیلایا ہے، جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کے انسان میں ساری کائنات کو جمع کر دیا اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ انسان حقیقت جامعہ ہے،

یعنی اتنی جامع حقیقت ہے کہ وہ سارے کمالات اس کے اندر جمع ہیں جو پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔

انسان میں خالق کائنات کے نمونے...... پھر یہی کہ اس میں فقط کائنات ہی کے نمونے ہوں غور کیا جائے تو خالق کائنات کے نمونے بھی انسان ہی میں جمع ہیں ایسے نمونے جمع ہیں کہ اگر ہم انہیں سامنے رکھیں تو ان نمونوں سے خداتعالٰی کی ذات، صفات اور کمالات سب عیاں ہو جائیں ہمیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں اگر ہم اپنے اندر غور کریں، تو خدائی کمالات بھی ہمارے اندر سے ابھریں گے۔

آپ غور کیجئے کہ آپ کے بدن کی یہ ساری کائنات کس چیز سے سنبھلی ہوئی ہے، یہ روح ہی سے سنبھلی ہوئی ہے، اگر روح نکل جائے، تو ساری کائنات بکھر جائے۔ مٹی بکھر کر مٹی میں جا ملے گی، پانی پانی میں، آگ، آگ میں اور ہوا، ہوا میں مل جائے گی، ساری کائنات ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ روح ایک مدبر اعظم ہے، جس نے قیومیت کر رکھی ہے ساری کائنات کو سنبھال رکھا ہے ہم اس کو سامنے رکھ کر دلیل پکڑ سکتے ہیں کہ جب ہماری کائنات بدن کو سنبھالے رکھنے کے لئے ایک قیوم کی ضرورت ہے، اسی طرح اس پوری کائنات کا ایک مدبر اعظم ہے، جس نے پوری کائنات کو سنبھال رکھا ہے تو خدا کے وجود پر دلیل ہمیں اپنے اندر سے مل جاتی ہے۔

آپ غور کیجئے آپ کا بدن سرخی مائل ہے چہرے پر سرخی اور بالوں پر سیاھی ہے تو بدن پر کہیں سفیدی، کہیں سرخی، کہیں سیاہی، غرض بدن پر مختلف رنگ ہیں یہ سارے رنگ روح کی وجہ سے قائم ہیں، لیکن روح کا کوئی رنگ نہیں، وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے اسی طرح سے ہم کہیں گے کہ اس کائنات میں ہزاروں رنگ ہیں انسان کے مختلف رنگ ہیں درخت سبز، پھول سرخ ہیں ان سارے رنگوں کو اس روح اعظم نے سنبھال رکھا ہے جس کو ذات خداوندی کہتے ہیں اور خود ہر رنگ سے بری و بالا ہے، لیکن ہر رنگ کو جلوہ دے رکھا ہے تو خدا کے وجود کی دلیل اپنے اندر سے ملتی ہے۔ نیز اس پر غور کریں کہ آپ کے اس بدن کے اندر کسی کو جانے کا موقع دیا جائے اور آپ کے اندر گھس کے وہ خوب سیر کرے آپ اس سے پوچھیں کہ بھئی! روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے، ہاتھ پیر، دماغ یا دل میں؟ وہ یوں کہے گا کہ مجھے تو ہر ہر ذرے میں روح کا جلوہ نظر آتا ہے۔

میں (کسی خاص عضو کی طرف) اشارہ نہیں کر سکتا، کہ روح وہاں بیٹھی ہے جب روح اعظم اور جلوہ خداوندی ہر جگہ پھیلا ہوا ہو اور اشارہ نہ کیا جا سکے کہ وہاں ہے، یا یہاں ہے، اس میں کون سے تعجب کی بات ہے؟ یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ سمت اور جہت میں نہیں انگلی سے اس کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی جہت اور سمت میں مقید ہے وہ لامحدود ذات ہے، مگر اس نے اپنا نمونہ روح کو بنا دیا کہ روح کو آپ کسی خاص عضو میں مقید نہیں بتا سکتے ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کو بدن کے بعض حصوں سے خاص تعلق ہے جلوہ تو ہر جگہ ہے۔

مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔ روح کو جو تعلق قلب سے ہے، وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے، وہ پیٹ سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قلب میں سوئی بھی چبھو دی جائے، تو آدمی مرنے کو ہو جاتا ہے۔ روح دوڑنے لگتی ہے

کہ میں نہیں ٹھہرتی۔ دماغ کو توڑ دیا جائے، روح باقی نہیں رہے گی۔ ہاتھ پیر کو کاٹ لیا جائے، روح باقی رہے گی۔ اگرچہ آدمی ناقص ہو جائے گا۔ ناخن اور بال کاٹ دو تو کوئی اذیت نہیں ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے روح کو جو تعلق قلب سے ہے، دوسرے اعضاء سے وہ تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں اللہ کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے وہ آپ کی مسجدوں سے نہیں ہے اور جو آپ کی مسجدوں سے ہے۔ وہ آپ کے گھرانوں سے نہیں ہے۔ جو آپ کے گھرانوں سے ہے وہ ویران جنگلوں سے نہیں ہے۔ تو جلوہ ہر جگہ ہے، مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیت اللہ کے بارے میں اگر کوئی گستاخی کا کلمہ بھی کہہ دے تو پورے عالم میں شور مچ جاتا ہے، جیسے عالم تباہ ہونے کے قریب آ گیا۔ مسجد پر اگر کوئی حملہ کر دے، تو اس مقام کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل جاتی ہے، اگر آپ کے گھر پر کوئی حملہ کر دے تو آپ اور آپ کے خاندان والے پریشان ہوں گے۔

یہ نہیں کہ سارا شہر بے چین ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ سے اللہ کو جو تعلق ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور سارے انسان بے چین ہو جائیں گے۔ مسجد اور عام گھروں سے وہ تعلق نہیں۔ تو تعلق درجہ بدرجہ ہے مگر جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس لئے اللہ کے جلوے اور اس کی تجلیات کا ہر جگہ موجود ہونا اور اس کے تعلقات میں فرق مراتب ہونا، آپ کو اپنے اندر سے اس کی دلیل مل جاتی ہے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

نیز آپ غور کریں کہ آپ روح سے زندہ ہیں۔ تو ایک روح سے زندہ ہیں، یا دو روحیں کام کر رہی ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی روح ہے۔ اگر دو روحیں ہو جائیں، بدن پھٹ کر خراب ہو جائے، ایک روح کہے گی میں بدن کو بھوک لگانا چاہتی ہوں، دوسری کہے گی میں ہرگز نہیں چاہتی۔ ایک روح کہے گی سردی لگنی چاہئے، دوسری روح کہے گی گرمی لگنی چاہئے۔ تو روحوں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ بدن کی تربیت کون کرے گا؟ بدن خراب خستہ ہو کر تباہ ہو جائے گا۔ ایک ہی روح کام کر سکتی ہے۔ دو روحیں ہوں تو بدن کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔

یہی صورت اس کائنات کی ہے کہ: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ ① اگر کائنات میں دو خدا ہوں تو کائنات چل نہیں سکتی۔ ایک خدا کہے گا میں فلاں کو بیٹا دینا چاہتا ہوں، دوسرا خدا کہے گا میں اس کو بانجھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک کہے گا میں فلاں قوم کو عزت اور دوسرا کہے گا کہ میں اس کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ دونوں خداؤں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ کائنات کون چلائے گا؟ یہ بات الگ رہی کہ دو خدا ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر معاذ اللہ مان لیا جائے تو کائنات برقرار نہیں رہ سکتی۔ جیسے بدن میں دو روح ہوں۔ کائنات بدن باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ تو ایسا ہوگا جیسے ایک میان میں دو تلواریں ڈال دیں اور ایک شیروانی میں دو آدمی گھس جائیں، شیروانی پھٹے گی نہیں تو اور کیا ہوگا؟ تو ایک کائنات یا پچاس مخلوقات ایک ہی خالق سے چلتی ہیں۔

اور اگر یوں مان لیا جائے کہ دونوں خدا آپس میں صلح کر لیں۔ معلوم ہوا ایک دوسرے سے دب گیا، تو جو

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۲۲.

ذلیل ہو، وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا وہ ہے جو سب چیزوں پر غالب اور قوی ہو، جو لڑائی سے بچنے کے لئے دوسرے سے کہے کہ صلح کرلو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے سے خوف موجود ہو، جس میں خوف ہو، وہ خدا تھوڑا ہی ہے۔ خدا وہ ہے کہ سارے اس سے ڈریں، وہ خود ڈر اور خوف سے بالاتر ہو۔ تو نہ صلح کے اصول کو سامنے رکھ کر اور نہ فساد کو سامنے رکھ کر دو جب خدا نہیں مانے جاسکتے، تو اللہ کی توحید اور یکتائی کی دلیل آپ کے اندر سے آپ کو مل رہی ہے۔ آپ کو باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خود آپ کے اندر اللہ کی ذات توحید، اس کی یکتائی، اس کی صفات کے سب نمونے آپ کے اندر سے نکل آتے ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ بے شک کائنات میں کوئی مدبر اعظم ہے۔ اور یہ تخیل کہ معاذ اللہ خدا نہیں ہے۔ اور کائنات خود ہی چل رہی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میرے اندر روح نہیں ہے۔ یہ بدن ایسے ہی چل رہا ہے۔ اگر کوئی دہریہ اس کائنات کے اندر خدا کا منکر ہے، اسے اپنے اندر کی روح کا بھی انکار کرنا چاہئے۔

اور جس طرح سے آپ کی روح، بدن کے خطے خطے سے واقف ہے۔ آپ کے اندر شعور ہے کہ وہ جانتی ہے کہ یہ میرا ناخن، بال، پیٹ ہے، نیز یہ کہ اس وقت پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ یہ اسے علم ہوتا ہے۔ اس وقت پیٹ اچھا ہے، تو کائنات بدن کے ذرے ذرے سے روح واقف ہے اگر واقف نہ ہو، تو نظم کیسے چلائے، اگر روح کو پتہ ہی نہ چلے کہ بخار چڑھ رہا ہے، تو دور کرنے کی اسے فرصت کہاں ہوگی؟ اسی طرح اس کائنات کے ذرے ذرے کا علم اللہ کی ذات کو ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ نہ جانیں کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے۔ ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ (۱). جو پیدا کر رہا ہے، کیا وہ معاذ اللہ لاعلم ہوگا؟ پیدا کرنے والا ہی مخلوق کے ذہن، صفات اور احوال کو جانتا ہے، تو اللہ کے لامحدود علم کی نظیر ہمارے اندر موجود ہے۔ تو اللہ نے انسان کو ایسا جامع بنایا کہ اگر وہ اپنے اندر خدائی کمالات دیکھنا چاہے تو اپنے آئینے کے اندر دیکھ لے۔ اس کو سارے خدائی نمونے نظر آجائیں گے۔

﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ (۲) ہم عنقریب حق کی نشانیاں انسانوں کو ان کی جانوں کے اندر بھی دکھلائیں گے، تاکہ واضح ہو جائے کہ اللہ ہی حق وثابت ہے اور وہی کائنات کا چلانے والے ہے۔ تو منطقی دلیلیں الگ رہیں، یہ مشاہدے کی دلیلیں ہیں کہ آدمی اپنے اندر غور وفکر کرکے خدائی کمالات کو پہچان لے۔ میرے عرض کرنے کا حاصل یہ نکلا کہ خالق اور مخلوق کے نمونے سارے ہمارے اندر موجود ہیں۔ تو انسان ایک عجیب چیز نکلی، کہ اس میں دونوں نمونے جمع ہیں۔

نمونۂ کائنات ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ...... اس واسطے انسان پر دو ہی فرائض عائد ہوں گے، ایک ایسا فریضہ جو مخلوق ہونے کے مناسب اور ایک فریضہ ایسا جو خالق کے نمونوں کے مناسب ہے۔ نمونہ مخلوق ہونے کا فریضہ کیا ہے؟ جس مخلوق کو خدا وجود دے، وہ اپنی پیدائش میں بھی خالق کی محتاج ہے اور بقا میں

(۱) پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۱۴. (۲) پارہ: ۲۵، سورۃ حم سجدہ، الآیۃ: ۵۳.

بھی۔تو ہر قدم پر ہم خدا کے محتاج ہیں،محتاج کا کام غنی کے سامنے کیا ہوتا ہے؟محتاج کا کام یہ ہے کہ وہ غنی کے سامنے جھکے اور اس کے آگے سجدہ کرے۔اس لئے کہ اگر ہمارے پاس سب کچھ ہو،تو ہمیں اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ہم تبھی حاجت مندی اس کے سامنے لے جاتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ موجود نہیں۔

ایک فقیر آپ سے تبھی سوال کرے گا کہ اس کے پاس دولت نہ ہو،اگر اس کے پاس دولت ہو،اسے سوال کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟ تو محتاج ہاتھ پھیلاتا ہے،غنی نہیں۔زندگی ہمارے قبضے میں نہیں تھی۔ہم نے ہاتھ پھیلایا کہ اے اللہ! ہمیں زندگی عطا کر،اس نے دے دی۔زندگی آنے کے بعد اس کا باقی رکھنا ہمارے قبضے میں نہیں،اگر ہمارے قبضے میں ہوتا،تو ہم کبھی نہ مرتے۔مگر مرنا پڑتا ہے۔معلوم ہوا ہمارے ہاتھ میں زندگی نہیں۔ہم دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ ہمارے زندگی طویل کردے۔عملی دعا مانگتے ہیں۔یعنی ان اسباب کو اختیار کرتے ہیں جن سے زندگی باقی رہے،کھاتے،پیتے،دوائیں استعمال کرتے ہیں۔یہ عملی دعا ہے۔اور زبان سے بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں زندہ رکھ۔یہ کیوں مانگتے ہیں؟ محتاجگی ظاہر کرنے کو،کہ وہ غنی ہے،ہم محتاج ہیں۔محتاج کا کام جھکنا ہے۔تو مخلوق خالق کی محتاج ہوتی ہے۔اس کا فریضہ ہے کہ وہ جھکے۔

اور جھکنا بھی معمولی درجے کا نہیں،بلکہ انتہا درجے کا جھکنا ہے،یعنی ایسی ذلت ظاہر کرے،کہ ایسی ذلت کسی کے آگے ظاہر نہ کرسکے۔اسلئے کہ خالق وہ ہے کہ اس کی عزت کی کوئی انتہا نہیں۔تو اس کے سامنے ذلت بھی ایسی پیش کرنی چاہئے کہ اس ذلت کی بھی کوئی انتہاء نہ ہو۔اس انتہائی ذلت کو پیش کرنے کا نام،اسلام کی زبان میں عبادت ہے۔عبادت غایت تذلل کو کہتے ہیں۔اور اگر آپ غور کریں تو یہ انتہائی ذلت آدمی نماز میں ہی ظاہر کرسکتا ہے کسی اور عبادت سے ظاہر نہیں کرسکتا۔اس لئے کہ انتہائی تذلل کی جتنی شانیں ہیں،وہ ساری نماز کے اندر موجود ہیں۔نوکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر کھڑے ہونا۔پھر اتنی ذلت پر قناعت نہیں،رکوع کرکے گردن جھکادی،اور زیادہ ذلت کا اظہار کیا پھر اسی پر قناعت نہیں،سب سے زیادہ عزت کی چیز انسان میں ناک اور پیشانی ہے،اسے سجدے میں جاکر زمین پر رگڑتا ہے۔کہ اے اللہ! تیری عزت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلت پیش کرتا ہوں۔پھر اسی پر بس نہیں،اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ! تیری عزت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلت پیش کرتا ہوں۔پھر اسی پر بس نہیں،اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے نیکی دے،رزق دے،وغیرہ وغیرہ۔بھیک مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہوتی۔تو سجدے کے بعد اخیر میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔تو مقصود یہ نکلا کہ مخلوق اپنے خالق کے آگے جھکے۔انتہائی ذلت کا اظہار کرے،اور وہ نماز کے اندر ہوتی ہے۔تو نماز کا فریضہ عائد ہوا،جس سے آدمی عبادت کرسکتا ہے،نماز کے سوا عبادت حقیقۃً عبادت کی کوئی چیز نہیں ہے جس سے عبادت کی جاسکے عبادت کے معنی انتہائی ذلت پیش کرنے کے ہیں،یہ نماز ہی میں ہے اور کسی عبادت میں نہیں ہے۔مثلاً آپ زکوٰۃ یا صدقہ دیں،یہ حقیقی طور پر عبادت نہیں،اس میں ذلت کا اظہار تھوڑا ہی ہے،اس میں اللہ کے

ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہے، کہ جیسے اللہ مخلوق کو دیتا ہے، آپ بھی غریب کو دیتے ہیں۔ تو دینا اور احسان کرنا ذلت نہیں، بلکہ انتہائی عزت کی بات ہے، یہ خدائی کام ہے، تو زکوٰۃ وصدقہ دینا اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ چونکہ اللہ نے حکم دیا، ایسا کرو، تعمیل حکم کی وجہ سے اس میں عبادت کی شان پیدا ہوگئی۔ ورنہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔

اسی طرح آپ روزہ رکھیں۔ روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ اس لئے کہ روزے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کھانے، پینے اور بیوی سے بے نیاز۔ سب سے مستغنی۔ تو یہ شان اللہ کی ہے کہ کھانے، پینے اور بیوی سے بری وبالا ہے۔ اللہ سے مشابہت پیدا کرنا، یہ ذلت کی بات تھوڑی ہی ہے۔ تو روزہ عین عزت ہے، پھر بھی روزہ عبادت بنا، اس لئے کہ حکم ہے کہ روزہ رکھو، تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا۔ ہم سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں، لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں، کیونکہ سچ بولنا اللہ کا کام ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ ① اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ ② اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔ جو سچ بولے، وہ ذلت کا کام تھوڑا ہی کر رہا ہے۔ وہ تو انتہائی عزت کے مقام پر ہے۔ عبادت اس لئے بنا کہ حکم خداوندی ہے کہ سچ بولو، جھوٹ مت بولو۔ تعمیل حکم کی وجہ سے اس میں شان عبادت پیدا ہوگئی۔ ان تمام چیزوں میں کوئی چیز اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ یہ نیت اور مقاصد کی وجہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ لیکن نماز میں جتنے افعال ہیں، ان میں اپنی ذات کی وجہ سے اظہار ذلت ہے۔ کھڑے ہونا، جھک جانا، سجدہ کرنا، دعائیں کرنا، بھیک مانگنا سب ذلت کا اظہار ہے، اس لئے اپنی ذات سے جو چیز عبادت ہے، وہ صرف نماز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نماز اللہ نے فقط انسان پر نہیں، کائنات کے ذرے ذرے پر فرض کی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ③ ہر چیز نے اپنی نماز اور تسبیح پہچان لی۔ معلوم ہوا اور درخت، پہاڑ، جانور، سبھی نماز پڑھتے ہیں۔ سب پر نماز واجب ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انسان کو خطاب کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں عقل ہے اور مخلوقات کو خطاب نہیں کیا گیا۔ مگر بنایا ایسے گویا وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ جیسے علماء لکھتے ہیں کہ جتنے درخت ہیں، ان کی نماز میں قیام ہے، رکوع وسجدہ نہیں۔ گویا ایک پیر پر کھڑے ہوئے نماز میں مصروف ہیں۔ رکوع سجدے کی اجازت نہیں ہے۔ چوپائے، جو چار پیروں سے چلتے ہیں، انکی نماز میں رکوع ہے۔ ان کو ایسی ہیت سے اللہ نے بنایا، کہ وہ ہر وقت رکوع میں ہیں، سجدہ قیام ان کی نماز میں نہیں ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح بنایا، جیسے آدمی تشہد میں بیٹھتا ہے۔ گویا پہاڑ زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے التحیات میں مصروف ہیں، ان کی نماز میں قعدہ ہے۔ قیام، رکوع، سجدہ نہیں ہے۔ حشرات الارض جیسے سانپ بچھو، ان کی نماز میں سجدہ ہے نہ رکوع ہے نہ قیام۔ یہ گویا ہر وقت اوندھے پڑے ہوئے اللہ کے سامنے سجدے میں مصروف ہیں۔ چاند، سورج یا آجکل کے قول کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ یہ گردش سے اللہ کی عبادت کر رہے ہیں۔ حرکت دوری ان کی نماز ہے۔ اسی طرح سے جنت و

دوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت یہ سوال کر رہا ہے اے اللہ! قیامت کے دن مجھے بھر دیجئے۔ میرے محلات خالی نہ رہیں۔ جہنم بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ اور اللہ کا وعدہ ہے، قیامت کے دن دونوں کو بھر دیا جائے گا۔ وعدہ پورا کیا جائے گا۔ جب تک نہیں بھریں گے، جہنم پکارتا رہے گا۔ ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ' هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ.'' چاند، سورج، پہاڑ، دریا، مٹی، سب جھونک دیئے جائیں گے۔ پھر بھی وہ کہے گا ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ.'' جب ان سب چیزوں سے نہیں بھرے گا، تو حدیث میں ہے حق تعالیٰ جہنم کے منہ پر پیر رکھ دیں گے، جیسا پیر ان کی شان کے مناسب ہے۔ اس وقت کہے گا کہ بس! بس! اب میں بھر گیا اور وعدہ پورا ہو گیا۔

جنت میں سارے جنتی داخل ہو جائیں گے۔ پھر بھی اس کے شہر اور بستیاں خالی رہ جائیں گی، تو ایک مستقل مخلوق پیدا کی جائے گی۔ جس سے جنت آباد کی جائے گی۔ تو جنت وجہنم کی نماز دعا مانگنا ہے۔ فرشتوں کی نماز صف بندی ہے، کہ صفیں باندھ کر کھڑے رہیں۔ انسان اور بالخصوص مسلمان کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دیں۔ درختوں کا سا قیام، چوپایوں جیسا رکوع، حشرات الارض جیسا سجدہ، جنت وجہنم جیسی دعا پہاڑوں جیسا تشہد، فرشتوں کی سی صف بندی اور چاند وسورج یا زمین کی گردش بھی نماز میں ہے۔ اس واسطے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں۔ دو تین یا چار رکعت کی ہے۔ آپ ایک رکعت پڑھ کے کیا کام کرتے ہیں؟ جو کام پہلی رکعت میں کیا تھا، وہی کام دوسری، تیسری اور چوتھی میں کرتے ہیں۔ وہی الحمد سورت اور تسبیحات وغیرہ۔ اس لئے گردش اور دوران نماز کے اندر ہے۔

جیسے انسان کو اللہ نے ایک جامع حقیقت بنایا، عبادت بھی جامع دی۔ آپ کی عبادت میں ساری کائنات کی عبادتیں جمع ہو گئیں۔ اس سے دین کا کمال بھی واضح ہوتا ہے۔ پچھلے ادیان میں ایسی نمازیں نہیں تھیں۔ کسی قوم کو فقط سجدے، کسی کو فقط قیام' کسی کو فقط رکوع کی نماز دی گئی۔ لیکن اسلام کی نماز میں ساری قوموں کی نمازیں جمع ہیں۔ ساری اقوام اور ساری مخلوقات کی نمازیں جمع ہو گئیں، تو نماز ایک جامع ترین عبادت ہے، بلکہ نماز ہی عبادت ہے، اور چیزیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن جاتی ہیں، تو انسان پر ایک فریضہ جو عائد ہوتا ہے، وہ نماز کا ہے۔ اس لئے کہ جب وہ مخلوقات کے سارے نمونے اپنے اندر رکھتا ہے، تو سارے نمونوں کی ذلت وعبادت اللہ کے سامنے پیش کر دینا، اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا ایک مقصد تو عبادت ہے۔

نمونہ کمالات خداوندی ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ...... اب یہی انسان جیسے مخلوق کے نمونے رکھتا ہے، خالق کے نمونے بھی رکھتا ہے۔ اس پر یہ فریضہ بھی عائد ہوا کہ جو کام خالق کرتا ہے، یہ بھی وہ کرے۔ خالق کا کام کیا ہے؟ اپنی مخلوق کو پالنا، اس کی تربیت کرنا، اس کو ہدایت کرنا، اس نے رزق پیدا کیا، تا کہ مخلوق پلے، اس نے مخلوق کو تعلیم دی، تا کہ اپنے بھائیوں پر رحم کرے یعنی، جیسے میں رحم کرتا ہوں۔ جیسے میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں تم اپنے بھائیوں کو دکھاؤ۔ جیسے میں تمہاری تربیت کر رہا ہوں تم بھی اپنے بچوں اور عیال کی تربیت کرو۔ یعنی میری

طرف سے نائب بن کروہ کام کرو، جو میرے کام ہیں۔ میں مدبر ہوں، تم بھی تدبیر کرو۔ میں موجد ہوں، تم بھی دنیا میں ایجادیں کرو، میرا کام ہدایت دینا ہے، تم بھی دنیا کے لئے ہادی بنو۔ میرا کام احکام جاری کرنا ہے، تم بھی میرے نائب بن کر احکام جاری کرو۔

حاصل یہ نکلا کہ ایک فریضہ انسان پر عبادت کا اور ایک فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے۔ ایک طرف جھک کر عبادت کرے گا اور ایک طرف تختِ خلافت پر بیٹھ کر اللہ کا نائب بن کر اس کی کائنات میں تصرفات کرے گا۔ ملکوں کو فتح کرے گا۔ دنیا میں ہدایت پھیلائے گا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا۔ یہ اللہ کا کام ہے، لیکن نائب بن کہ یہ بھی کرے گا۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اللہ کے نائب بن کر آتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کائنات کے مربی ہیں۔ تو انبیاء بھی مخلوق کی روحوں کی تربیت کرتے ہیں۔ اللہ معلم ہے جو انبیاء کو تعلیم دیتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں، تاکہ دنیا میں علم پھیل جائے۔ اللہ کے احکام جاری کرتے ہیں۔ قصاص لیتے ہیں، شراب خوری پر درے لگاتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے اولین نائب ہیں۔ پھر انبیاء کے نائب ان کے صحابہ ہوتے ہیں، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نائب تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں۔ تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے نائب تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں۔ اخیر تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ علماءِ ربانی، مشائخ حقانی اور سچے درویش وصوفی، جو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ یہ خلافت کا کام ہے۔ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے سلطنت بھی کر کے دکھائی، خلافت کی گدی پر بیٹھ کر ملکوں کو بھی فتح کیا، مگر ملکوں پر اس لئے قبضے نہیں کئے کہ ان سے کچھ کھانا پینا مقصود تھا، اس لئے فتح کیا تاکہ مخلوق کو سیدھے راستے پر چلائیں۔ انکو خدا کے قانون پر چلائیں۔ انہوں نے اللہ و رسول کے نائب بن کروہ کام کئے جو اللہ کا منشاء تھے۔ دن بھر خلافت کے کام سرانجام دیتے، جب وقت آتا تو مسجد میں جا کے سجدے کرتے اور عبادت کا کام سرانجام دیتے، تو ایک طرف عبادت اور ایک طرف خلافت کر رہے ہیں۔

اس لئے صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دے اور عبادت میں آگے بڑھے، کہ اس کی ناک، پیشانی، ہاتھ، پیر، اس کی روح اور خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جھک جائے۔ یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا، یہ عبادت ہے، دوسرا فریضہ یہ ہے کہ تختِ خلافت پر بیٹھ کر دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصدِ زندگی ہے بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

ہمارے سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا، تو سب سے پہلے ملائکہ سے یہی بات فرمائی: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ ① میں زمین میں اپنا ایک نائب اتارنے والا ہوں۔ آدم علیہ السلام نائب کس چیز میں تھے؟ عبادت میں نائب نہ تھے، عبادت اللہ کا کام تھوڑا ہی ہے، وہ تو معبود ہے۔ عبادت سے بری ہے، عابد نہیں ہے۔ لیکن عالم کو درست رکھنے، اس کی تربیت اور اصلاح کے لئے خلافت دی، مگر یہ

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰.

خلافت وہ انجام دے گا، جو پہلے عبادت کرکے اپنے آپ کو درست کرے۔ پہلے اللہ کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق درست کرے اپنے اندر نیازمندی اور بندگی کی شان پیدا کرلے۔ اس میں تواضع وخاکساری وللھیت بھی ہو، نہ غرور وتکبر رہے، نہ حرص ولالچ رہے، بلکہ اس میں غنا اور ایثار ہو۔ مخلوق کی خدمت کا جذبہ اس میں ہو۔ یہ جذبات عبادت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ عبادت کرکے جب جذبات پیدا ہوگئے۔ اب وہ نائب خدا بن گیا، اب وہ دوسروں کی اصلاح کرے گا۔ تو مقصد زندگی دو چیزیں نکل آئیں۔ ایک عبادت دوسرے خلافت۔

تکمیل ایمان کے لئے عبادت وخلافت دونوں ضروری ہیں...... اسی واسطے ایمان کے دو رکن فرمائے گئے: ''اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللہِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللہِ'' ترجمہ:..... ''اللہ کے امر کی تعظیم کرنا، اس کے سامنے جھک جانا۔ دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت اور اس کی خدمت کرنا''۔ دونوں باتوں سے مل کر ایمان بنتا ہے۔ ایک شخص چوبیس گھنٹے مسجد میں رہے، مخلوق چاہے جیئے یا مرے، اسے کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا آدھا ایمان ہے۔ اور ایک شخص رات دن مخلوق کی خدمت میں انجمنوں کے ذریعے لگا ہوا ہے۔ مگر مسجد میں جانے کا نام نہیں لیتا اس کا آدھے سے بھی کم ایمان ہے۔ اس لئے کہ خلافت کا کام تو انجام دیا مگر عبادت چھوڑ دی۔ انسان مکمل تب ہوگا جب ایک طرف عابد وزاہد ہو اور ایک طرف خلیفہ خداوندی ہو۔ ایک طرف وہ کام کرے جو مخلوق کے کرنے کا ہے، وہ عبادت ہے۔ ایک طرف وہ کام کرے جو خالق کا ہے، وہ تربیت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے، راتوں کو دیکھو تو تہجد پڑھتے پڑھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ورم آجاتا تھا۔ دنوں میں دیکھو تو مخلوق کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہدایت وتبلیغ فرمارہے ہیں۔ دنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط جاری فرمارہے ہیں، جن میں اسلام کی دعوت دی جارہی ہے۔ سفر فرمارہے ہیں، کبھی طائف میں ہیں، کبھی مدینہ میں ہیں، تاکہ خلق خدا نیک راستے پر آجائے۔ یہ خلافت کا کام ہے۔ مسجد نبوی میں جس طرح سے آپ نماز پڑھتے، اسی طرح سے آپ مقدمات کے فیصلے بھی فرماتے۔ مسجد میں جیسے عبادت ہوتی، ویسے ہی درس وتدریس کے ذریعے تعلیم بھی ہوتی، یہ خلافت کا کام تھا۔ نماز پڑھنا، تلاوت کرنا، سجدے کرنا، یہ عبادت کا کام تھا۔

یہی شان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہے کہ ایک طرف تخت خلافت پر بیٹھ کر مخلوق خدا کی اصلاح، ایک طرف بورئے اور چٹائی پر بیٹھ کر اللہ کے سامنے عجز ونیاز سے سر جھکا دینا۔

فارس میں جب جنگ ہوئی ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعداد کل تیس یا تینتیس ہزار تھی۔ فارسیوں کا تین لاکھ کا لشکر تھا، پھر فارس کی فوجیں کیل کانٹے سے مسلح وردیاں، غذائیں اور رسدان کی باقاعدہ۔ یہ تو اہل فارس کی شان۔ اور ادھر صحابہ کرام محض درویشوں کا ایک لشکر۔ وردی تو یہ ہے کہ کسی کے پاس کرتہ ندارد ہے، تو کوئی لنگی باندھے ہوئے ہے، کسی کے پاس لمبا کرتہ، کسی کے سر پر پگڑی نہیں تو رسی باندھ رکھی ہے، کسی کے ہاتھ میں نیزہ، کسی کے ہاتھ میں تلوار، کسی کے ہاتھ میں خنجر۔ ہتھیار، لباس نہ غذائیں کچھ بھی باقاعدہ نہیں درویشوں کا لشکر

ہے۔مگر کیفیت یہ تھی۔ لاکھوں فارسی آتے تھے جب صحابہ رضی اللہ عنہم بھوکے شیروں کی طرح پڑتے تھے وہ بلیوں کی طرح سے بھاگتے تھے، اور یہ غالب تھے۔ پورے فارس میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ فارس کا سب سے بڑا سپہ سالار رستم تھا۔ آپ نے رستم پہلوان کا نام سنا ہوگا، وہ کمانڈر انچیف تھا، اس نے تمام سرداروں اور لیفٹننٹوں کو جمع کیا اور کہا کہ یہ غضب کی بات ہے کہ ہمارا لشکر تین لاکھ، اور عرب کے بدو، کل تیس ہزار، پھر ان کے پاس سامان باقاعدہ نہیں، ہمارے پاس سامان باقاعدہ، انہیں مدد نہیں پہنچ رہی، ہمارے پیچھے پورا ملک ہے۔ یہ ہمارے ملک میں حملہ کرنے آئے ہیں۔ انکا ملک دور رہ گیا، یہ ہمارے ملک میں گھرے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود حملہ کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھوکے شیر ہیں اور تم فارسی اس طرح سے بھاگتے ہو جیسے لومڑیاں بھاگتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ سرداروں نے کہا اے رستم! اگر آپ سچی بات پوچھیں، ہم بتلا دیں، مگر ہماری جان کی بخشش کر دی جائے، امان دیا جائے کہ ہمیں قتل تو نہیں کیا جائے گا۔ اس نے کہا تمہاری جان کو امان دی جاتی ہے۔

اب سرداروں نے مل کر کہا، اے رستم! یہ مٹھی بھر عرب تیرے ملک پر غالب آ کر رہیں گے، انہیں کا قبضہ ہوگا، انہی کی حکومت ہوگی۔ پورا ایران ان کے تحت میں آئے گا۔ یہ نہیں ہاریں گے، تم ہارو گے۔ رستم نے کہا کیوں؟ انہوں نے کہا۔ اس وجہ سے کہ انکی شان یہ ہے۔ ''هُمْ بِاللَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَانٌ'' دن بھر یہ گھوڑے کی پشت پر سوار جہاد میں مصروف ہیں اور رات میں مصلے کی پشت پر سوار ہیں، اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے مالک! ہم میں کوئی طاقت نہیں، طاقت والا تو ہے، ہم تیرے سپاہی ہیں، تو اگر ہمیں فتح دے گا، تو ہم فتح یاب ہو جائیں گے۔ تو ہمیں شکست دے گا، شکست کھا جائیں گے۔ ہمارے اندر کوئی طاقت اور قوت نہیں۔ قوت وسلطنت تیری ہی ہے۔ تو رات بھر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ عجز و نیاز سے سرزمین پر رگڑتے ہیں اور دن کو گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہیں۔

اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ایسے بزرگ ہیں، جس گاؤں میں جاتے ہیں، اگر کھیتیاں جلی ہوئی ہوتی ہیں تو سرسبز ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسروں کی بیٹیوں کی ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں، جیسے اپنی بہو بیٹیوں کی کرتے ہیں۔ اور اے رستم! تیرا یہ لشکر، شرابیں یہ پیتے ہیں، جس گاؤں میں جا پڑتے ہیں، بہو بیٹیوں کی عزتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ جس کھیتی اور باغ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھل اجڑ جاتے ہیں۔ کھیتیاں سب برباد ہو جاتی ہیں، یہ اثرات تیری فوج کے ہیں۔ اور یہ افعال ان کی فوج کے ہیں۔ تو غلبہ تجھے ہوگا یا انہیں ہوگا؟ راتوں کو مصلے کی پشت پر یہ عبادت میں مصروف اور دنوں کو گھوڑے کی پشت پر سوار، اللہ کے نائب بن کر یہ دنیا کی اصلاح کے درپے۔ تو درحقیقت رستم اور اس کے سرداروں نے پہچانا کہ ان بزرگوں میں یہی دو چیزیں تھیں۔ ایک طرف یہ عبادت میں کامل اور ایک طرف خلافت میں کامل۔ ایک طرف سر نیاز اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے، ایک طرف اس کی مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ جو مفسد سامنے آتا ہے، اس کو راستے سے ہٹاتے ہیں، تاکہ دین پہنچ سکے اور لوگ دین پر غور کر سکیں۔

بہرحال جب مقصد زندگی عبادت اور خلافت نکلا، سب سے بڑے عابد دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور سب سے بڑے اللہ کے نائب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو ان کی امت کو بھی سب سے بڑا عابد اور سب سے بڑا نائب خداوندی بننا چاہئے۔ یہ امت اس لئے آئی ہے کہ رات دن عبادت میں مصروف رہے اور رات دن اللہ کی نائب بن کر اللہ کی مخلوق کی اصلاح کرے۔ یہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اٹھے۔ اپنی زندگی اور موت کا یہ مقصد قرار دے میں چاہے جیوں یا مروں، مگر خدا کا نام اونچا ہو، تو اللہ اس قوم کو کبھی ذلیل نہیں کرے گا۔ ذلت و رسوائی جب ہوتی ہے جب کوئی خدا کے نام کو چھوڑ کر اپنی برتری چاہے، اپنے عیش کو آگے رکھے۔ خدا کی طرف سے اس کی مدد نہیں ہوتی۔ اس پر دشمن اور اقوام مسلط کی جاتی ہیں، جو اس کو غلامی میں بھی جکڑ کر بند کرتی ہیں۔ لیکن جو کہے مجھے ملک و دولت مقصود نہیں، مجھے اللہ کا نام اونچا کرنا ہے۔ میری دولت، میری جان اور خاندان اس کے لئے وقف ہے، اس نصب العین کے تحت زندگی ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی، موت ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی۔ انسان کو اصل میں عزت کی زندگی کے لئے اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں ذلیل ہونے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ تو سب سے بڑے خلیفہ خداوندی اور عابد خداوندی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جیسے وہ سردار انبیاء ہیں، یہ امت امتوں کی سردار بنائی گئی۔ اس کو خیر امت اور افضل الامم کہا گیا، مگر افضلیت کیوں؟ کھانے پینے اور دولت کی وجہ سے نہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کا کام یہ ہے کہ یہ دنیا کی قوموں کی اصلاح کرے۔ دنیا کی قوموں میں جو کھوٹ ہے اس کو رفع کرے اور اگر یہ دنیا کی قوموں کی نقالی کرنے لگے کہ جو کھوٹ انکے اندر ہے، وہ اپنے اندر لے لے، تو پھر یہ اصلاح کیا کرے گی؟ اس کا حاصل تو یہ نکلا کہ دوسری قومیں اس پر غالب آئیں گی، یہ غالب نہیں آ سکتی۔ یہ ایک چیز سے غالب آ سکتی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمہ خداوندی کو اونچا کرنے کا نصب العین لے کر چلے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ تم دنیا کی قوموں پر دولت سے غالب نہیں آ سکتے، دولت دوسروں کے پاس زیادہ ہے، تعداد میں تم دنیا پر غالب نہیں آ سکتے۔ اہل باطل کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے اور رہے گی۔ تم اگر دنیا کی قوموں پر غالب آؤ گے تو اخلاق محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غالب آؤ گے۔ کردار سے غالب آؤ گے، دین کو لے کر اٹھو گے تو غالب آؤ گے۔ اس لئے سب سے بڑھ کر تمہارے پاس حجت دین ہے، اس سے بڑھ کر کوئی حجت نہیں۔ اگر آپ کسی سے بحث کریں اور یوں کہیں کہ میری عقل یوں کہتی ہے، دوسرا کہے گا میری عقل تم سے زیادہ ہے، میری عقل یوں کہتی ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، ہم خادم ہیں، ہمیں یہ حکم پورا کرنا ہے، دنیا کی ہر قوم چپ ہو جائے گی، اس سے آگے اب حجت نہیں ہے۔ آگے پھر زور اور طاقت ہے، تو جس قوم کے ہاتھ میں خدا کا نام ہو اور خدا کی نائب بن کر آئے۔ وہ حجت میں بھی اور انجام میں بھی غالب ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کے بعد خلافت ربانی کا کام شروع کیا اور اسلام کی دعوت دی، تو پورا مکہ، حجاز اور ساری قوم آپ کی دشمن تھی۔ عزیز اقرباء دشمن۔ صرف تین آدمی مسلمان ہوئے۔ بوڑھوں میں

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عورتوں میں حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور لڑکوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، باقی سارا خاندان دشمن۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ پورے استقلال کے ساتھ اس کلمہ کو لے کر چلے۔ تو قوت مکہ والوں کے ہاتھ میں تھی۔ تعداد ان کی زیادہ تھی۔ تیرہ آدمی جب مسلمان ہوئے، تو دارارقم میں اندر سے زنجیر لگا کے نماز پڑھی جاتی تھی۔ خطرے کی وجہ سے مسلمان باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ناداری اور مفلسی کا یہ عالم تھا، کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں، ہم دارارقم میں بند تھے۔ رات کو بارہ بجے میں پیشاب کرنے کے لئے باہر نکلا، صفا کی پہاڑی پر بیٹھا، پیشاب کیا، دھار جو پڑی تو ایسی کھنکھناہٹ کی آواز آئی جیسے کاغذ کے اوپر دھار گرتی ہے۔ میں نے پیشاب کرنے کے بعد ٹٹولا۔ معلوم ہوا چمڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، اس کے اوپر پیشاب گر رہا تھا، اس چمڑے کے ٹکڑے کو لائے اور پانی سے پاک کیا، کئی وقتوں کے بھوکے تھے۔ اس چمڑے کو منہ میں ڈالا، جس سے تسلی ہوئی کہ میں بھی کچھ کھا پی رہا ہوں۔ یہ مفلسی اور ناداری کی کیفیت تھی۔ تو تعداد مسلمانوں کی تیرہ اور مشرکین مکہ کی تعداد کہیں زیادہ۔ افلاس کا یہ عالم کہ کھانے کو نہ ملے، خزانے سارے انکے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود زندگی کا مقصد یہ تھا کہ اس کلمہ کو اونچا کرنا ہے۔ ہم خواہ مٹیں یا رہیں۔ تیرہ برس کے بعد پورا مکہ اور پورا حجاز اسلام میں داخل ہوا۔ یہی قوم جو اقلیت میں تھی، اکثریت میں آ گئی، وہ قوم جو بے شوکت تھی، ساری شوکتیں اس کے ہاتھ آ گئیں اور جو قومیں شیر بنی ہوئی تھیں، وہ اس کے سامنے جھک گئیں۔ اللہ کا نام لے کر کھڑے ہونے میں جب استقلال وثبات دکھلائے، تو دنیا کی قومیں جھک جاتی ہیں۔ ہمیں دوسری قوموں کی دولت وعزت نہیں چھیننی۔ ہمیں تو خدا کا نام پہنچانا ہے۔ چاہے ہم مر جائیں، مگر یہ کلمہ قبول کرو۔ اگر اس شان سے چلیں گے، دنیا کی قومیں ممنون ہوں گی۔

حدیث میں فرمایا گیا: جب کوئی قوم میرے قانون کی خلاف ورزی کرتی اور گناہوں میں ملوث ہوتی ہے، میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں ان کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دیتا ہوں۔ وہ سزائیں دیتی ہیں۔ یہ درحقیقت میری طرف سے وہ قومیں جلاد بن کے کھڑی ہوتی ہیں، تا کہ معصیت چھڑا دیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر یہ چیز تمہیں ناگوار ہو کہ دنیا کی قومیں تم پر غالب آئیں اور تمہیں سزائیں دیں، ان کے بادشاہوں کو برا مت کہو، میرے سے معاملہ درست کر لو۔ میں عداوت کی بجائے انکے دلوں میں محبت ڈال دوں گا۔ آج جو قومیں نفرت کرتی ہیں۔ کل کو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائیں گی۔ دشمنی کرنے کی بجائے تمہاری خادم بن جائیں گی، قلوب تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ جب آدمی اللہ کا نائب بن کے اس کے کام کے لئے کھڑا ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اس کی عداوت پر ہی کمربستہ رہے؟ ایک نہ ایک دن عداوت ختم کر دینی پڑے گی۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ ہمیں دوسروں کا اقتدار چھیننا ہے نہ دولت چھیننی ہے۔ نہ کسی قوم سے حسد ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بس نیک اور صالح بن جاؤ۔ ہم نمونہ بن کے سامنے آئیں۔ اگر ہم کہیں کچھ اور نمونہ دوسرا پیش کریں، دنیا ہماری بات کو کبھی نہیں مانے گی۔ کہنے کی ضرورت

نہیں۔کر کے دکھلانے کی ضرورت ہے۔دنیا جھک جائے گی۔

اخلاقی قوت سے ہی انسان اونچا ہو سکتا ہے......حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہندوستان میں آئے ہیں،تو سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے۔مؤرخین لکھتے ہیں سندھ کے بازاروں سے جب صحابہ گزرے،تو ہزاروں لوگوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا اور کہا کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے۔ان کے چہروں پر سچائی برستی ہے۔انکا کردار اور چہرہ مہرہ سب اسلام کا مبلغ تھا۔ہم اپنے کردار سے دنیا کی اقوام کو اسلام سے نفرت دلا رہے ہیں۔دنیا کی اقوام ہمارے عمل کو دیکھ کر اسلام کو سمجھتی ہیں۔جب وہ ہمارے اعمال کو دیکھتی ہیں،کہتی ہیں کہ ایسے اسلام کو سلام ہے،اسے قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ہم اسلام کے مبلغ کیا ہوئے،ہم خود اسلام کی تبلیغ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی درست کریں، ہمیں علم وتعلیم اور اسلامی اعمال سے واقفیت ہو۔جہالت کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم اونچی نہیں ہوسکتی۔انسان کے لئے ترقی کا پہلا زینہ علم ہے۔تو تعلیم بھی ہو اور اخلاق درست ہوں۔ہم میں صبر وتحمل،بردباری،حیاء،غیرت، حمیت،جذبہ خدمت ایسے اخلاق ہوں۔جب یہ اخلاق اور علم ہوگا تو ایسی قوم کبھی نیچے نہیں رہ سکتی۔یہ علم اور اخلاق ایک قوت ہے جو انسان کو گرنے نہیں دیتی۔یہ انسان کو اونچا بنا دیتی ہے۔یہ جب نکل جاتی ہے تو کوئی چیز آدمی کو اونچا نہیں کرسکتی۔جیسے ربڑ کی گیند میں ہوا بھری ہوئی ہے۔اگر اسے آپ زمین پر زور سے پٹخ دیں تو اتنا ہی اوپر جائے گی۔اس لئے کہ اس میں ہوا کی قوت بھری ہوئی ہے۔وہ نیچا نہیں دیکھ سکتی۔اگر ہوا نکال دیں،وہ پھس سے ہو کے وہیں رہ جائے گی۔ایک مسلمان کو مثل گیند کے سمجھو۔اس میں جب تک دین اور علم واخلاق کی ہوا بھری ہوئی ہے۔اگر اس کو کوئی زمین پر پٹخے گا بھی یہ اوپر ہی جائے گا۔اور اگر یہ روح اس کے اندر سے نکل گئی پھر جس قوم کا جی چاہئے،اسے تھپڑ مارے اور نیچے گرادے۔ہوا کی طاقت تو اس میں ہے نہیں۔اس لئے ہوا اندر ہی بھرنی چاہئے جس سے اندر طاقت آئے۔اور طاقت روح سے آتی ہے،پھر روح کی طاقت علم واخلاق سے،اسی سے آدمی کو خلافت کا مقام ملتا ہے۔اسی سے انسان کے اندر عبادت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔جب تک کسی چیز کا مقصد پورا نہ ہو۔اس کی زندگی بے کار ہوتی ہے۔مثلاً مدرسہ ہے،اس کا مقصد تعلیم ہے۔اگر تعلیم نہ ہو،مدرسہ بے کار ہے۔گھر کا مقصد رہن سہن ہے،اگر اس میں رہن سہن نہ ہو گھر بنانے کا فائدہ کیا؟ بازار کا مقصد یہ ہے کہ سامان ملے،اگر سامان نہ ملے تو بے کار ہے۔اگر انسان کا مقصد عبادت وخلافت ہے۔جب یہ مقصد نہ ہو،یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔اگر مقصد پورا کر رہا ہے تو وہ زندگی کا ثبوت دے رہا ہے۔

مسلمان کا دنیا میں مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے......دنیا کی اقوام کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔کسی کا مقصد دولت،کسی کا روٹی،کسی کا اقتدار۔اسلام اور مسلمان کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے،کہ میں رہوں یا نہ رہوں خدا کا نام اونچا ہونا چاہئے۔میں اللہ کا نائب بن کے آیا ہوں۔میں تو اسی کے نام کا ڈھنڈورچی ہوں۔جب تک

آپ اللہ کے نام کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ اللہ کی حکومت کی قوت آپ کی پشت پر رہے گی۔ جب اسے چھوڑیں گے، قوت ختم ہوجائے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بادشاہ جب کوئی قانون نافذ کرتا ہے، تو قانون کو گورنروں کے پاس بھیجتا ہے۔ گورنر کمشنر کے پاس اور کمشنر کلکٹر کے پاس اور کلکٹر تحصیل دار کے پاس بھیجتا ہے۔ اور تحصیل دار کیا کرتا ہے؟ وہ بھنگی بلاتا ہے ڈھول اس کے گلے میں ہوتا ہے اسے کہتا ہے کہ اس قانون کی منادی کردے۔ تو بھنگی کی کیا قدر وقیمت ہے۔ معمولی اس کی تنخواہ ہوگی۔ لیکن جب سرکاری قانون کی منادی کرتا ہے، گورنمنٹ کی پوری قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت آپ اس کے گلے میں سے ڈھول نکال کر تھپڑ ماریں، پوری گورنمنٹ مدعی بن جائے گی۔ کیونکہ تم نے گورنمنٹ کے قانون کی منادی کرنے والے کی توہین کی، گویا گورنمنٹ کی توہین کی۔ مقدمہ قائم ہوجائے گا۔ تو بھنگی کی کوئی قوت نہیں۔ اصل قوت گورنمنٹ کی ہے۔ جب ایک مسلمان منادی بنے گا اور اللہ کا بھنگی بن کر اس کے قانون کو دنیا میں پکارتا پھرے گا، اس حالت میں اگر اس کی کوئی توہین وتذلیل کرے، وہ گویا خدا کی گورنمنٹ کی توہین کررہا ہے۔ اللہ کی مدد شامل حال ہوگی۔ وہ کبھی نیچا نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں آپ اپنے کو اونچا بنائیں گے، تو ہماری قدر وقیمت نہیں۔ ہمیں جس کا جی چاہے نیچا دکھادے۔ مگر جب خدا کی روح بھری ہوئی ہو، اسے لے کر چلیں تو اسے کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ تو بات وہ کرنی چاہئے جس سے ہم میں طاقت پیدا ہو۔ ہماری طاقت نہیں ہے۔ ہماری طاقت تو اللہ کے نام اور کام میں ہے۔ جو آیت کریمہ میں نے پڑھی، اس میں زندگی کے دو مقصد بتلائے۔ ایک عبادت اور دوسرے خلافت۔ عبادت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا۔ ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ﴾ ① حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں اے میرے بیٹے! نماز قائم کر، نماز ہی چونکہ اصل میں عبادت ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ خدا کا عبادت گزار بندہ بن۔ اللہ کے آگے اپنی ذلت پیش کر، اسی میں تیری عزت اور رفعت وسربلندی ہے۔ تو یہ فریضہ عبادت کا ہے جو زیادہ سے زیادہ نماز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات فرمائی: ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② معروف کا امر کر اور منکر سے ممانعت کر۔ یعنی دنیا میں نیکی پھیلاؤ اور برائیاں مٹاؤ۔ دنیا کی قوموں کو اچھے کاموں کی عادت ڈالو، برے کاموں سے روکو۔ فحش وبے حیائی کو مٹاؤ، بے غیرتی وبے حمیتی کا دنیا سے خاتمہ کرو۔ حیاء ایثار، سخاوت، مروت اور شجاعت، ان اخلاق کو دنیا میں پھیلاؤ، تاکہ اللہ کی طاعت وعبادت دنیا میں پھیلے اور بغاوت ختم ہو۔ اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا۔ امر بالمعروف یعنی نیکی کا آرڈر دینا۔ نہی عن المنکر، برائی سے روک دینا۔ اصل میں یہ کام اللہ کا ہے، وہ سب سے بڑا امر فرمانے والا اور برائیوں کو روکنے والا ہے۔ مگر اس نے انسان کو اپنا نائب بنایا، کہ تم میری طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ تو اس سے خلافت دنیا بھی ثابت ہوئی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا

① پارہ: ۲۱ سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷۔

عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ﴾ ① حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر ہم ان مسلمانوں کوطاقت واقتدار اور بادشاہت دے دیں۔ تو ان کا مقصد کیک پیسٹری کھانا نہیں ہوگا۔ ان کا مقصد اللہ کی ترجمانی ہوگا۔ یہ نمازوں کا نظام قائم کریں گے، صدقات پر دنیا کو مائل کریں گے۔ اچھی باتوں کا آرڈر جاری کریں گے برائیوں کو دنیا سے روکیں گے، یہ ان کا کام ہوگا۔ معلوم ہوا سلطنت دینے کا بڑا مقصد امر بالمعروف کا نظام قائم کرنا اور منکرات کو دنیا سے مٹانا ہے، اس کا نام خلافت ہے۔

قربانی سے نصب العین دنیا میں پھیلتا ہے..... ظاہر بات ہے جب مسلمان امر بالمعروف اور نصیحت لے کر کھڑا ہوگا۔ ساری دنیا نہیں مانا کرتی، کچھ دوست بن جاتے ہیں، کچھ دشمن۔ مبلغ کے سامنے مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کتنی گستاخیاں کی گئیں، اس میں صبر وتحمل، عالی ظرفی اور بڑے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آگے فرمایا گیا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ﴾ ② اور اس راستے میں جتنی مصیبتیں آئیں، ان کو جھیلنے کی عادت ڈالو اور اپنے اندر صبر وتحمل پیدا کرو، جس قوم میں صبر وتحمل اور برداشت آ گئی۔ وہ قوم کامیاب ہے۔ چاہے وہ ابتدا میں تکلیف اٹھائے۔ مگر چند دن کے بعد غلبہ اسی کا ہوگا۔ تو تین چیزیں فرمائی گئیں۔ عبادت وخلافت کا نظام اور اخلاق کا نظام، کہ صبر وتحمل اور اولوالعزمی ہو جو آدمی ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جائے۔ کسی نے گالی دے دی، بس لڑنے مرنے کو تیار، کسی نے اشارہ ہی کیا تو مکا دکھانے کو تیار، وہ کبھی کام نہیں کر سکتا۔ کام وہ کرے گا کہ قتل کی بھی دھمکیاں ہوں، دولت بھی چھین لی جائے، غلامی کی بھی دھمکی دی جائے۔ مگر وہ پرواہ نہ کرے، کہ یہ چیزیں مجھے مقصود نہیں مجھے تو اللہ کا نام بلند کرنا ہے۔ فاقہ کروں یا کچھ کروں مگر مجھے تو آگے بڑھنا ہے وہ کبھی نیچا نہیں ہو سکتا۔

اس واسطے اس آیت کی روشنی میں میں نے یہ تین باتیں عرض کیں۔ ایک عبادت درست ہونی چاہئے۔ ایک خلافت کا جذبہ ہونا چاہئے اور ایک اخلاق اور کردار درست ہونا چاہئے۔ تب جا کے قوم کی زندگی بن سکتی ہے، اگر عبادت اور خلافت کا جذبہ نہ ہو، اخلاقی قدریں بھی نہ ہوں آخر پنپنے اور زندہ رہنے کی صورت کیا ہے؟

روٹی زندگی نہیں، زندگی انسان کا کردار اور نصب العین ہے۔ وہ ہوگا تو قوم زندہ ہے۔ آج دنیا میں جتنی قومیں بڑھ رہی ہیں، وہ کھانے پینے سے نہیں، یہ تو آثار میں سے ہے، خود ہی آ جاتا ہے۔ اصل نصب العین ہے، جو قوم کوئی مقصد لے کر کھڑی ہوئی اور وہ اس مقصد کی خاطر قربانیاں دے، وہ بڑھے گی اور اقتدار پائے گی۔ ہم کوئی بھی مقصد نہ رکھیں۔ بس کھا پی لیا اور سو گئے۔ یہ کوئی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ مقصد ہے تو ہر جانور بھی یہ مقصد لئے ہوئے ہے، تو پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان تو کوئی کمال لے کر آیا ہے۔ جامع تو اتنا کہ ساری مخلوقات اور خالق کے کمالات کے نمونے موجود اور مقصد صرف روٹی۔ اتنا اعلیٰ کردار لے کر آئے اور

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱. ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷.

مقصد اتنا پھسپھسا، جو ہر جانور کو بھی میسر۔ جیسا جامع ہے ویسا ہی مقصد بھی ہونا چاہئے۔ وہ مقصد یہی ہے کہ ایک طرف عبادت ہو، یعنی اللہ کا سچا بندہ اس کے نام پر مر مٹنے والا۔ اور ایک طرف اس کا نائب کہ اس کا خلیفہ بن کر پوری دنیا میں اصلاح کا پیغام پہنچانے والا۔ اور اس میں مضبوط اتنا کہ جو مصیبت آئے، اسے خوشدلی سے جھیلنے کو تیار، ایسے افراد اور ایسی قومیں ہمیشہ بلند و بالا ہوتی ہیں۔ غور کیا جائے جو تین چیزیں میں نے پیش کی ہیں یہ قوم کی برتری اور سربلندی کا پیغام ہیں۔ تفصیلات اس کی بہت ہیں۔ وہ تعلیم اور غور فکر سے معلوم ہونگی، مگر اصولاً یہی تین چیزیں ہیں جس سے قومیں بڑھتی ہیں۔ ایک صحیح نصب العین کہ سچا عابد اور دوسرا نصب العین کہ سچا خلیفہ ربانی اور تیسرا کہ سچا اخلاقی نمونہ رکھنے والا اس سے انشاء اللہ برتری ہوگی۔

یہ آیت ہے تو دو تین لفظوں کی، مگر اس نے بڑا عظیم پروگرام پیش کر دیا ہے اور یہی اللہ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ میرا آپ کا کلام نہیں خدا کلام ہے کہ وہ لفظ فرمائے جاتے ہیں۔ اور علوم کے دریا اس کے اندر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنا کھودے جاؤ، نکالتے جاؤ۔ جتنا غرق ہوتے جاؤ موتی نکالتے جاؤ۔ اس لئے قرآن کریم کو معجزہ کہا گیا۔ جیسے سمندر میں موتی اور ہزاروں جواہرات بھرے ہوئے ہیں مگر کوئی غوطہ لگانے والا اور نکالنے والا ہونا چاہئے، جس میں دم اور سانس ہو کہ نیچے پہنچے، موتی نکال کے لائے اور جو دم توڑ دے گا، وہ تو اپنی جان کھو کے آئے گا، موتی تو کیا نکال کے لائے گا؟ جو تیراکی کے فن سے واقف نہ ہو، تو وہ جائے گا جان کھو کر ہی آئے گا۔ تیراکی کا فن سیکھ کر پھر سمندر میں گھسا جائے، تو موتی نکالتا ہے۔ قرآن حکیم ایک سمندر ہے اور اس میں تیرنے کا فن تعلیم ہے۔ علم سیکھ کر جب آدمی اس میں گھسے گا تو ہزاروں موتی اور علم کے جواہرات نکلیں گے، قرآن کے معجزہ ہونے کا یہی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک لفظ ہوتا ہے اور کوزے کے اندر ہزاروں دریا بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں اس کی تفسیر کروں تو کتنے ہی دن چاہئیں، تفسیر پھر بھی پوری نہیں ہوگی۔ اس لئے بالا جمال یہ تین مقاصد نکال کر پیش کئے، ان کی تفصیلات کے لئے لمبی مدت کی ضرورت ہے بالا جمال ان مقاصد کو یاد رکھ کے اپنی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہئے کہ کس حد تک ہم ان مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اگر پورا نہیں کر رہے، تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ معلوم کر کے انہیں زائل کیا جائے۔ اس واسطے میں نے یہ تین چیزیں پیش کیں۔ امید ہے کہ آپ حضرات ان تینوں پر وقتاً فوقتاً غور کریں گے اور اپنی زندگی کو بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کامیابی دے گا۔ ہزاروں مسائل کا اس میں علاج ہے۔ ہزاروں مصائب دنیوی واخری کا حل اسی کے اندر ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرماوے کہ ہم اپنے پروردگار کے کلام پر چلنے کی کوشش کریں اور اپنی زندگی کو قرآن و حدیث میں ڈھالیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نصیب فرما دے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖٓ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۔

اخلاص فی الدین

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿قُلْ إِنَّنِيْ هَدٰنِيْ رَبِّيْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ج دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ج وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ لَاشَرِيْكَ لَهٗ ج وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

طریق سنّت پر عمل سے عادت بھی عبادت بن جاتی ہے...... بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اس پر ہم کو فخر ہے لیکن ہم کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اسلام کا کیا معنی ہے؟ اس لئے مختصر سے وقت میں اس کا معنی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دو لفظ ''عادت اور عبادت'' سنے ہوں گے۔

عادت تو ان کاموں کو کہا جاتا ہے جو ہم روزمرہ (کی زندگی میں) کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، دوستوں سے ملنا، گھریلو زندگی، اجتماعی زندگی اور ایسے ہی جتنے طبعی افعال ہیں ان کو عادت کہا جاتا ہے۔ اور عبادت یہ ہے کہ انہی (مذکورہ بالا) افعال کو طریق سنت کے مطابق کیا جائے اور یہ جو ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسجد میں جانا تو عبادت ہے لیکن گھر میں رہنا عبادت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ اگر ہم گھریلو معاملات میں بھی سنت طریقہ پر عمل کریں گے تو وہ بھی عبادت ہو جائیں گے۔ صرف نیت کی ضرورت ہے یہی روزہ ہے اگر ایک آدمی بلا نیت سارا دن بھوکا رہے تو کوئی ثواب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر روزے کی نیت کرے تو تھوڑی نیت کی تبدیلی سے یہی عبادت بن جاتی ہے۔ تو اگر ہم ساری دنیا کو دین بنالیں تو کتنا اچھا سودا ہے اور اگر ہم نیت کے ذرا سے فرق سے دین کو دنیا بنالیں تو کتنا مہنگا سودا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ: اگر ایک آدمی ''بِسْمِ اللهِ'' سے کھانا شروع کرے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا'' پر ختم کرے تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ صرف نیت کرنے سے اتنا بڑا اجر ملا کہ دنیا تو بنی ہی

① پارہ: ۸، سورہ الانعام، الآیۃ: ۱۶۱-۱۶۳۔

لیکن دین بھی ساتھ ہی بنا۔ اسلام چاہتا ہے کہ تمام دنیاوی کاموں کو دین بنا دیا جائے۔ ①

حدیث میں ہے: ''اَلسِّوَاکُ مِطْهَرَةٌ لِلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ'' ② مسواک کرنا منہ کی صفائی کا ذریعہ اور خوشنودیٔ الٰہی کا باعث ہے۔ تو مسواک کرنا دنیا بھی ہے۔ (جب کہ محض یہی نیت ہو کہ دانت اچھے ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا بھی سبب ہے اس لئے دین بھی ہے۔ احادیث میں ہے کہ: آپ بہت مسواک فرماتے تھے۔ نمازوں کے اوقات، تہجد کے وقت اور اکثر اپنے دوستوں سے فارغ ہو کر مسواک فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ مرض وفات میں بھی آپ نے مسواک کی طرف دیکھا تھا۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سمجھ گئیں کہ آپ کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسواک دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک فرمایا، پھر وہی مسواک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باقی ازواجِ مطہرات پر اس بنا پر فخر کیا کرتی تھیں کہ آپ کا لعاب مبارک میرے حلق میں گیا اور آپ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میری گود میں تھا۔

اسلام کا ہر عمل دو حیثیت کا حامل ہے..... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! آپ اس قدر کثرت سے مسواک کیوں فرماتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ملائکہ علیہ السلام سے میری گفتگو ہوتی ہے اور ان کو بو سے نفرت ہے۔ ایسے ہی اسلام کے ہر عمل میں ایک راستہ دنیا کی طرف اور ایک راستہ دین کی طرف جاتا ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عیادت کے لئے ایک نوجوان حاضر ہوئے۔ جب واپس جانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انکو بلاؤ۔ جب ان کو بلایا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یَا أَخِيْ اِرْفَعْ ثَوْبَکَ فَإِنَّهٗ أَنْقٰى لِثَوْبِکَ وَأَرْضٰى لِرَبِّکَ'' ③ اے بھائی! (ٹخنوں سے نیچے جو آپ کا کپڑا ہے اس) اپنے کپڑے کو اوپر اٹھاؤ، کیونکہ اس سے کپڑا بھی صاف رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں۔ (تو کپڑے کی صفائی بھی ہے اور رضائے خداوندی بھی ہے، عمل ایک ہے لیکن دونوں حیثیتیں اس میں بھی ہیں)

مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔ ان میں سے ایک ''اَلْمُسْبِلُ'' ازار کو نیچے کرنے والا بھی ہے ④ (ٹخنوں سے ازار کا نیچا ہونا علامت تکبر ہونے کے باعث غضبِ خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔ اس لئے ازار کا اوپر ہونا اگرچہ اس سے صفائی بھی رہتی ہے لیکن اللہ کی رضا کا ذریعہ بھی ہے) تو ہر عمل میں حیثیتیں دو ہی ہیں، آپ کو جو ثواب ملتا ہے وہ آپ کے تعیین

① الصحيح للبخاري، كتاب الأطعمة، باب مايقول اذافرغ من الطعام، ص: ۱۰۱.

② الصحيح للبخاري، كتاب الصوم، باب سواك الرجل الصائم، ج:۷، ص:۱۸.

③ الصحيح للبخاري، كتاب المناقب، باب قصة البيعة والاتفاق على عثمان بن عفان، ج:۱۲ ص:۳۵.

④ الصحيح للبخاري، كتاب الإيمان، باب بيان غلظ تحريم الإسبال، ج:۱، ص:۲۲۷.

حیثیت ہی پر تو ملتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: ''وَفِیْ بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ .'' ① تمہاری شرمگاہوں میں بھی صدقہ ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: ''اَیَاْتِیْ اَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَلَهٗ فِیْهَا اَجْرٌ''؟ یعنی ہم میں سے کوئی اپنی شہوت کو پورا کرے تو اس میں بھی اسکے لئے اجر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہی پانی اگر حرام موقع میں ڈالتا تو گناہ نہ ہوتا؟ جب اس نے حرام سے اجتناب کیا تو یہی عبادت ہوگی۔ تو شہوت کے پورا کرنے میں بھی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک محض شہوت رانی اور ایک یہ ہے کہ اجتناب عن الحرام کی نیت سے شہوت کو پورا کیا جائے۔ تو اس حیثیت کے متعین کرنے کی وجہ سے وہ عبادت بن گئی۔

اتباع حکم ہی عبادت ہے...... حاصل یہ کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض گناہوں کی بھی اگر شریعت کی طرف سے اجازت مل جائے تو وہ عبادت بن جاتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا اگر چہ بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن صلح اور دفع فتنہ کے لئے واجب ہے۔ تو یہ عبادت میں شامل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ عبادت کسی کام کے کرنے کا نام نہیں بلکہ حکم ماننے کا نام ہے۔ (اسی لئے باوجود اس کے کہ ایک چیز اپنی ذات کے لحاظ سے درست ہوتی ہے مگر شریعت حقہ خلاف حکم ہونے کے باعث اس کے نتائج کو غلط قرار دیتی ہے مثلاً) جب نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے تو پڑھنا عبادت ہے اور جب روکا جائے تو عبادت نہیں۔ جیسا کہ تین اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ان اوقات میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ ایسے ہی روزہ ایک عبادت ہے لیکن جب اس سے روکا جائے تو عبادت نہیں۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، کیونکہ اس سے روکا گیا ہے۔ اس طرح سچ کہنا عبادت ہے لیکن اگر سچ کہنے سے فتنہ و فساد بڑھے تو ناجائز ہے۔ جیسے غیبت کرنا جو کہ واقع میں تو سچ ہوتا ہے۔ (کیونکہ خلاف واقعہ بموجب حدیث بہتان ہے) لیکن شریعت نے اس سچ سے منع فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ عبادت حکم ماننے کا نام ہے (کسی خاص فعل یا قول کا نام نہیں) اور حکم دینے والے اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں، وہی جانتے ہیں کہ کس جگہ حکم دینا مناسب ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ کیونکہ اکڑ کر نہ ہی تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بندہ ہے، بندگی کے لئے آیا ہے۔ اس کی مشیت (اس کا چلنا پھرنا) بھی بندگی ہی ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ② یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ غرض اترا کر چلنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ جہالت کی علامت ہے۔ اور اکڑ کر وہی چلتا ہے جو اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے۔ ایک متکبر آدمی بہت اکڑ کر چل رہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ بھی آرہے تھے، جن کی چال سے تواضع اور عاجزی ٹپک رہی تھی۔ تو اس بزرگ نے کہا کہ بھائی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکاة، باب بیان ان اسم الصدقة...... ج: ۵، ص: ۱۷۷.

② پارہ: ۱۹، سورة الفرقان، الآیة: ۶۳.

اکڑ کر نہ چلوتو اس کو غصہ آیا اور کہنے لگا کہ تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟ تو یہ شخص اگر اپنے مال میں مست تھا تو وہ بزرگ اپنی کھال میں مست تھے۔ انہوں نے فرمایا، جانتا ہوں تم کون ہو اور تمہارا تعارف یہ ہے کہ:

''اَوَّلُکَ نُطْفَةٌ وَّاٰخِرُکَ جِیْفَةٌ وَّاَنْتَ تَحْمِلُ بَیْنَهُمَا قَذْرَةً'' یعنی تیری ابتدا تو اس پانی سے ہوئی جو بدن کو لگ جائے تو پلید ہو جائے، کپڑے کو لگ جائے تو ناپاک ہو جائے اور بدن سے نکلے تو غسل واجب ہو۔ اور انتہا میں تو ایک مردار ہے اور ان دونوں حالتوں کے درمیان گندگی اٹھائے پھرتا ہے۔ تو اس شخص کو اپنی حقیقت نظر آئی، توبہ کی اور کہا:

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ۔۔۔ مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

انسان کی ذات میں کوئی کمال نہیں ...... کمال درحقیقت جو بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان کی اپنی ذات تو گندگی ہی ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس میں عقل بھی نہیں ہوتی۔ فخر تو انسان اس وقت کرے جب اس کی ذات میں کوئی کمال ہو۔ ورنہ فخر کرنا جہالت ہے۔

انسان کا سب سے بڑا کمال ایمان ہے۔ لیکن اس پر غرور کرنا ٹھیک نہیں، شکر کرنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی توفیق دی۔ ورنہ جیسے دنیا میں سینکڑوں کفار پھرتے ہیں۔ اگر ہمیں بھی انہیں میں سے کر دیتے تو ہماری کیا مجال تھی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ یعنی اپنے اسلام کا احسان اللہ پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے ایمان کی توفیق بخشی۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی ۔۔۔ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

بادشاہ کے خادم کو بادشاہ پر احسان نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ اس کی خدمت کر رہا ہے، بلکہ اس کو بادشاہ کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے اسی کو خدمت کے لئے چن لیا ہے (ورنہ بادشاہ کے ہزاروں لوگ خدام بننے کی خواہش رکھتے ہیں)

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسان کو اکڑ کر نہیں چلنا چاہئے لیکن اگر اکڑ کر چلنے کا خود حکم دیں تو یہ عبادت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ حج کرتے وقت طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل (اکڑ کر چلنا) کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یہ عبادت بن گئی۔

گر طمع خواہد زما سلطانِ دیں ۔۔۔ خاک برفرق قناعت بعد ازیں

معلوم ہوا جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت ہو جاتی ہے۔ پس یہی عبادت عادت ہے اور یہی عادت کے ساتھ عبادت ہے۔

اسلام کا سہل راستہ ...... اگر انسان نماز پڑھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ سوا گھنٹہ لگتا ہے تو گویا سوا گھنٹہ عبادت ہوئی۔ لیکن اسلام ایک ایسا (سہل اور آسان) راستہ بتاتا ہے کہ ہر ایک کام عبادت بن جائے۔ چنانچہ کھانا، پینا،

سونا تمام عبادت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس نیت سے انسان سوئے کہ میں اٹھ کر تہجد پڑھ سکوں یا بیت الخلاء میں اس لئے جائے کہ گندگی نکل جائے اور طبیعت میں نشاط پیدا ہو تو فراغت سے عبادت کر سکوں۔ روٹی اس نیت سے کھائے کہ اس سے قوت پیدا ہو تو اللہ کی عبادت کروں۔ تو یہ ساری چیزیں عبادت بن جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ: ’’مَنْ قَادَ اَعْمٰی اربعین خطوۃ غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ‘‘ ① یعنی جس نے اندھے کو لاٹھی پکڑ کر چلایا تو اس کے اگلے پچھلے تمام صغائر (چھوٹے گناہ) معاف ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی جنازہ اٹھانا ایک طبعی امر ہے۔ ثواب نہ بھی ہو تو بھی انسان اٹھاتا ہے۔ لیکن حدیث میں ہے کہ: جو شخص جنازے کے چاروں پاؤں کو کندھا دے تو اس کو چالیس نیکیاں ملتی ہیں۔ مردہ کو دفن کرنا ایک امر طبعی ہے۔ لیکن اتباع سنت کی نیت سے کیا جائے تو عبادت ہے۔ یتیم پر شفقت تو ہر ایک کو ہوتی ہے لیکن لوجہ اللہ کی جائے تو عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے تو جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے آئیں تو اس کو اتنی نیکیاں ملتی ہیں۔

عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں...... اور عمل کے لوجہ اللہ ہونے کے لئے دو چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ ایک اخلاص یعنی خالص اللہ کے لئے ہو۔ ریا یا شہرت کے لئے نہ ہو۔ اور حظ نفس کے لئے بھی نہ ہو۔ عبادت میں اگر اخلاص نہ ہو تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ پس ہر عبادت میں توحید کا رنگ ہونا چاہئے۔ اگر نماز پڑھی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ روزہ رکھا جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ نذر مانی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسرے کو شریک نہیں کرنا چاہئے۔

مشرکین کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا ھٰذَا لِلّٰہِ بِزَعْمِھِمْ وَھٰذَا لِشُرَکَآئِنَا ۚ فَمَا کَانَ لِشُرَکَآئِھِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَمَا کَانَ لِلّٰہِ فَھُوَ یَصِلُ اِلٰی شُرَکَآئِھِمْ﴾ ② یعنی کفار نے کھیتوں اور جانوروں میں تقسیم کی ہوئی تھی کہ یہ حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور یہ حصہ ان کے دوسرے معبودوں کا ہے۔ پس یہ عبادت مشترک ہوئی اور مشترک عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَآءِ مِنَ الشِّرْکِ ③

کسی دوسرے کو عبادت میں شریک کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دوسرے حصے کو بھی تو ہی رکھ لے مجھے تیری عبادت کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی اگر خیرات دی جائے تو چھپا کر دینی چاہئے۔ ہاں اگر کسی دینی مصلحت

① المعجم الکبیر للإمام الطبرانی، ج: ۱، ص: ۳۶۲ علامہ عجلونی فرماتے ہیں: رواہ الخطیب عن ابن عمر، قال المناوی: وفیہ عبدالباقی ابن قانع اوردہ الذھبی فی الضعفاء واوردہ الذھبی فی المیزان عن ابن عباس رفعہ بلفظ: من قاد مکفوفا اربعین ذراعا دخل الجنۃ، وقال فی سندہ عبداللہ بن ابان الثقفی لایعرف وخبرہ منکر باطل دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۶۹۔

② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۳۶۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الزھد، باب من اشرک فی عملہ غیر اللہ، ص: ۲۵۴۔

کے لئے اظہار ہو تو یہ بھی اچھا ہے۔ مثلاً اس نیت سے مشہور کر کے دے تا کہ دوسرے بھی دینے لگیں تو بہتر ہے۔ ورنہ اصل میں صدقہ کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اس طرح دیا جائے کہ بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو۔ اور جو کچھ مانگا جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ہی مانگا جائے۔ حدیث میں ہے کہ: اگر انسان کا تسمہ ٹوٹ جائے اور اس کو ٹھیک کرانے کے لئے پیسے بھی موجود ہوں تو جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے مانگنا چاہئے۔ اس پر بھی ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ نافع حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ چیزیں اسباب نفع ہیں اور اسباب نفع پر خاصیت کا مرتب ہونا عقلاً ضروری نہیں۔ مثلاً آگ پر جلانے کا مرتب ہونا ضروری نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی خاصیت بدل دے تو یہی پانی کا کام دے سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں پھینکا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے جلانے کی خاصیت چھین لی، تو آپ علیہ السلام صحیح سالم رہے۔ ایسے ہی روپیہ سبب نفع تو ہے لیکن نافع نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس سے اس کی خاصیت چھین لیں تو بے کار ہے۔ ایسے یہی تلوار گلا کاٹنے کا سبب تو ہے لیکن خود نہیں کاٹتی۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری کو پھیرا، لیکن اس نے کاٹا ہی نہیں۔ یہی پانی آب حیات ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ① لیکن یہی پانی قبطیوں کے لئے سبب موت بن گیا۔ اسی پانی سے بنی اسرائیل کیلئے راستے بن گئے اور ایک ایک قبیلہ ایک ایک راستے سے گزرنے لگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ڈبونے کی خاصیت اس سے سلب کر لی اور قبطیوں کو اسی پانی میں ڈبو دیا۔ ماں باپ انسان کے لئے خالق نہیں۔ سبب تخلیق ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہے تو بدوں اس سبب کے پیدا کر دے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بدوں ماں باپ کے پیدا کیا۔ البتہ "عادۃ اللہ" یوں ہی جاری ہے کہ اولاد میاں بیوی دونوں سے ہوتی ہے۔ سینکڑوں کیڑے مکوڑے بدوں ماں باپ کے صرف گندگی جمع ہونے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ﴾ ② اور کاشتکار سے فرماتے ہیں: ﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ ③ اور اگر ظاہری طور پر کاشت کار ہی بوتا ہو تو بونے کے لئے اعضاء، اسباب، بیج اور پھر بیج کا اگنا سب ہی تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حقیقت میں نافع اور ضار اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

اللہ کی عبادت کیوں کی جائے؟...... اور عبادت نافع اور ضار ہی کی ہوتی ہے۔ اسباب نفع و ضرر کی نہیں ہوتی۔ یہی دھوکہ دوسری قوموں کو لگا تو کوئی سورج کو سجدہ کرنے لگا تو کوئی درخت کو۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ نفع تو ہر چیز

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۰.

② پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۵۹.

③ پارہ: ۲۷، سورۃ الواقعۃ، الآیۃ: ۶۴.

میں موجود ہے۔پس تمام عبادتیں (جانی و مالی ہمہ قسم) اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہونی چاہئے۔نہ غیر اللہ کی نذر ماننی چاہئے۔نہ غیر اللہ کو سجدہ کیا جائے اور نہ رکوع کیا جائے۔البتہ جو چیزیں جائز ہیں ان کی تعظیم جائز ہے۔حضرات انبیاء نے بھی یہی تعلیم دی ہے فرمایا گیا: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ ① یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔اور میری اتباع کرو اور حضرات انبیاء علی نبینا وعلیہم الصلاۃ والسلام کی شان تو یہ تھی کہ اگر تکلیف ہوتی تو شکوہ بھی اللہ تعالیٰ سے کرتے تھے۔جب حضرت یوسف علیہ السلام گم ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللهِ﴾ ② یعنی میں اپنے غم کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں۔کیونکہ ان کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام انہی کی مرضی سے گم ہوئے ہیں اور انہیں کی مرضی سے ملیں گے۔

حدیث شریف میں ہے: ''اِذَا اسْتَعَذْتَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ.'' ③ یعنی جب تو پناہ پکڑے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ۔اور جب تو مدد چاہے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ۔مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی دعا کی تو پہلے ولادت کے تمام اسباب کے نہ ہونے کا ذکر فرمایا چنانچہ فرمایا: کہ اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور جب ہڈیوں تک کمزوری پہنچ گئی ہو تو گوشت اس سے اوپر ہوتا ہے، وہ بطریق اولیٰ کمزور ہوگا۔یہ تو اندرونی حالت تھی۔اور باہر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرا سر بڑھاپے سے سفید ہو گیا۔لیکن اے اللہ! میں تجھ سے مانگ کر کبھی نامراد نہیں گیا۔اور اولاد طلب کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں۔ان سے مجھے ڈر ہے کہ یہ میرے مشن کو چلا نہیں سکیں گے۔اور تربیت و ہدایت نہیں کریں گے۔پھر فرمایا کہ: میری بیوی بانجھ ہے۔اس میں اولاد کی صلاحیت ہی نہیں۔گویا اولاد کی صلاحیت نہ خاوند میں نہ بیوی میں اور نہ رشتہ داروں سے تعلیم وتربیت کی امید، جو میرے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔

بعد ازاں فرماتے ہیں اے اللہ! ایسا بیٹا دے جو میرا وارث ہو اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی وراثت مال نہیں ہوتا بلکہ علم الٰہی ہوتا ہے۔حدیث میں ارشاد ہے: ''اِنَّ الْاَنْبِيَآءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَلٰكِنْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ'' ④ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دعا کرے تو تردد نہ کرے بلکہ عزم کے ساتھ کرے۔جیسا کہ ایک بدوی حج کو آیا تو بیت اللہ کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگا: ''يَا رَبَّ الْبَيْتِ يَا رَبَّ الْبَيْتِ جِئْتُكَ وَاَهْلِيْ فِي الْبَيْتِ اِلَّا تَغْفِرْلِيْ فَاغْفِرْلِيْ.''

پھر دعا کے بعد بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بعینہ وہی چیز مل جاتی ہے۔اور بعض دفعہ اس سے اچھی چیز مل جاتی ہے۔اور کبھی کبھی دیر سے بھی ملتی ہے جیسا کہ بیٹا باپ سے کچھ پیسے مانگے تو باپ نہ دے اور کچھ دن گزرنے کے

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ النوح، الآیۃ: ۳. ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۶. ③ المستدرک علی الصحیحین للإمام الحاکم ولفظہ: اذا سئلت فاسئل الله، واذا استعنت فاستعن بالله، ج: ۳، ص: ۳۷۷.

④ الصحیح للبخاری، کتاب العلم، باب العلم قبل القول والعمل، ج: ۱، ص: ۱۱۹.

بعد دے۔ بیٹا کہے کہ جب میں نے مانگے تھے اس وقت تو آپ نے دیئے نہیں تھے تو باپ کہتا ہے کہ بیٹا اس وقت تو بیمار تھا اگر میں تمہیں پیسے دے دیتا تو تو ایسی چیزیں کھاتا جن سے تمہاری صحت بگڑتی۔ (بلاشبہ) ایسے ہی اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی مال مانگے تو بعض اوقات مال نہیں ملتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضول خرچ ہے۔ اگر اس کو مال دیا گیا تو یہ اور زیادہ معاصی میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن جب مفلس ہو جاتا ہے اور معاصی سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دے دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیٹا ساری زندگی مانگتا رہتا ہے باپ کچھ بھی نہیں دیتا۔ لیکن جب بیٹا بڑا ہو جائے تو باپ اس کو خزانہ دے دیتا ہے۔ بیٹا کہتا ہے کہ آپ نے ساری زندگی تو مجھے کچھ دیا نہیں باپ کہتا ہے کہ میں دیتا رہتا تو تو سارا مال ضائع کر دیتا۔ تو جتنا مجھ سے مانگتا رہا میں جمع کرتا رہا۔ اور آج اتنا خزانہ ہو گیا ہے۔

ایسے ہی انسان کی دعا بعض اوقات ساری زندگی قبول نہیں ہوتی۔ لیکن قیامت میں نیکیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہو گا تو یہ انسان کہے گا کہ اے اللہ! میں نے تو اتنی نیکیاں نہیں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو دنیا میں دعائیں کرتا رہا۔ میں ان کو تیری آخرت کے لئے جمع کرتا رہا۔ چنانچہ یہ تیری دعائیں ہیں۔ اس لئے انسان کو دعا سے کبھی تنگ نہیں ہونا چاہئے۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو بھی دعا کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے۔ ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ'' ① دعا عبادت کا مغز ہے۔ مغز کو چھوڑ کر محض چھلکے پر اکتفا کرنا کون سی دانش مندی ہے؟

غیر اللہ میں سے کس کی تعظیم ضروری ہے؟...... اور دعا و طلب صرف اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہئے۔ لیکن جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائیں ان کی تعظیم بھی ضروری ہے۔ مثلاً حضرات انبیاء کی تعظیم ضروری ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔ اور قرآن مجید کی تعظیم بھی ضروری ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بیت اللہ المکرّم کی تعظیم کرنی چاہئے کہ قضاء حاجت کے وقت اس کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کی جائے، کیونکہ وہ جہت صلوۃ ہے لیکن معبود نہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئے تو حجر اسود کو بوسہ دینے کا موقع نہ ملا۔ اور اس وقت ایسی حکومت تو نہ تھی کہ بذریعہ پولیس آپ کے سامنے سے سب کو ہٹا دیا جاتا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے لاٹھی کو حجر اسود کے ساتھ لگا کر اس کو بوسہ دے لیا۔ اور حجر اسود سے خطاب کر کے فرمانے لگے: ''اِنِّیْ اَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ لَوْلَا اَنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبَّلَکَ مَا اَقْبَلُکَ'' ② یعنی میں خوب جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو ضرر دے سکتا ہے اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہوتا کہ وہ تجھے بوسہ دے رہے ہیں تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ حدیث میں ہے: ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے میں نے قیصر و کسریٰ کو دیکھا کہ لوگ ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ میں

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، ج: ۱۱ ص: ۲۲۰.

② الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب تقبیل الحجر، ج: ٦، ص: ۳۷.

نے خیال کیا کہ اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ اس لئے کہ عبادت وسجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ذات عالی کے لئے مخصوص ہے۔ کسی اور کی نہ عبادت ہے نہ کسی کو سجدہ ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام نے خود بھی تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ① یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو کتاب اور نبوت دے۔ پھر وہ نبی کہنے لگے کہ میری عبادت کرو، اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرو۔ تو حاصل اخلاص کا یہ ہوا کہ تمام عبادتیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرنی چاہئے۔

قبولیت اعمال کے لئے اخلاص کے ساتھ اتباع نبوی ضروری ہے...... دوسرا اصول یہ ہے کہ عمل میں اتباع کی شان موجود ہو۔ ہر فعل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے۔ جو عبادت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے نمونہ پر ہوگی، وہ مقبول ہوگی ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ ظہر کی چھ رکعتیں پڑھے تو یہ عند اللہ مقبول نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے خلاف ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ روزہ مغرب تک تو ہوتا ہی ہے۔ میں آج عشاء کے وقت افطار کروں گا۔ تو یہ قبول نہیں۔ نیز نمونے بنانے کی ضرورت نہیں بلکہ نمونے بنے ہوئے موجود ہیں۔ کیونکہ دین کامل اور مکمل ہو چکا ہے۔ اس میں ہر قسم کی ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ بعض مشرکین حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ تمہارا نبی تمہیں ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتا ہے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ: ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم فارغ ہوتے وقت قبلہ کی طرف منہ نہ کریں اور نہ ہی پیٹھ کریں۔ تو جب حدیث میں ایسی ایسی چیزیں موجود ہیں تو اور کس چیز کی کمی ہوگی۔ اس لئے جتنا اخلاص کم ہوتا جائے گا اتنا شرک بڑھتا جائے گا اور جتنی اتباع میں کمی ہوگی اتنی ہی بدعات داخل ہوتی جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی ہمارے سامنے نمونہ کے لئے موجود ہے۔

سیر حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے صرف اسوۂ محمدی ہی موجود ہے...... یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے دنیا کی کوئی قوم اپنے مقتدا کی سیرت دنیا کے سامنے پیش نہیں کرسکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گھریلو زندگی کا آج ہمیں کوئی علم نہیں۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عملی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ صرف مسلمان ہی یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ

① پارہ:۳، سورة آل عمران، الآیة : ۷۹.

کھانے، پینے، سونے، غرض زندگی کے ہر کام کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

چین میں آٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم تشریف لے گئے اور وہاں جا کر تجارت شروع کر دی۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ دیانتدار تھے۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ ''**اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُم عَدُولٌ**'' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں۔ دیانتداری سے وہاں تجارت شروع کی تو تمام بازار ٹھنڈا پڑ گیا۔ تاجروں نے حکومت کے پاس شکایت کی کہ یہ لوگ عرب سے آئے ہیں اور ملک لوٹنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا تو یہ تمام دولت نکال کر عرب میں لے جائیں گے۔ اس شکایت کا ردعمل یہ ہوا کہ ایک کمیشن صرف اس مقصد کے لئے بنا اور وزیر اعظم خود اس کے صدر بنے۔ اور آکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہنے لگے: ''تم ہمارے ملک کو ویران کرتے ہو اس لئے تم یہاں سے نکل جاؤ'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ: آپ کے تاجروں نے غریبوں کو لوٹ رکھا تھا جب ہم نے دیانتداری سے کام شروع کیا تو ان کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا اور حسد کی وجہ سے شکایات لے کر آپ کے ہاں پہنچے ہم تو آپ کے ملک کو آباد کرنے آئے ہیں۔ ویران کرنے نہیں آئے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ہم کو بہرحال شکایت ہے اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اگر ہمارا قصور ہو تو ہم اقرار کرنے کے لئے تیار ہیں اور بلا قصور تم نکالنا چاہتے ہو تو ہماری طرف سے اعلان جنگ ہے۔ رعایا نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حکومت دب گئی۔ انہی آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت ہے کہ آج چین میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں۔ (تو نیت کی درستگی اور دیانت کی وجہ سے آٹھ نفوس قدسیہ پر مشتمل یہ چھوٹا سا گروہ اپنی زندگی کا مقصد اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنا چکا تھا۔ اتنی بڑی تعداد پر غالب آیا اور رہتی دنیا تک اپنے انمٹ نقوش چین پر ثبت کر دیئے۔ آج بھی توحید کی آواز چین کے درو دیوار سے بلند ہو رہی ہے)

توحید کی قوت اور شرک کی بے بسی...... ایران پر چڑھائی کے لئے جب مسلمانوں کا لشکر گیا تو راستے میں دریا آ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر سے فرمایا کہ جس خدا کے بندے ہو اسی کے قبضہ قدرت میں یہ دریا ہے۔ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دو۔ چنانچہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور تیرتے ہوئے دریا کو عبور کر گئے۔ ایک صحابی کا پیالہ دریا میں گر پڑا، دوسروں نے کہا کہ اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر پیالہ میرا ہو تو یہ نہیں ڈوبے گا۔ (اللہ اس کی حفاظت فرماویں گے) چنانچہ دریا کی موجوں نے پیالے کو دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ جب وہ صحابی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو پیالہ وہاں پڑا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں قلب کے قوت سے ہوتی ہیں اور قلب کی قوت توحید سے پیدا ہوتی ہے۔ شرک سے دل میں تذبذب آ جاتا ہے۔ ان کے ہاں نہ شرک کا واہمہ تھا نہ بدعت کا شبہ۔

- حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آٹھ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کو لے کر ماہان آرمنی عیسائی کے مقابلہ میں

تشریف لے گئے۔ ماہان ارمنی حضرت خالد سے کہنے لگا، میں تو سمجھا تھا کہ مسلمان عقلمند ہیں لیکن تم تو احمق ہو کہ اتنے آدمیوں کو لے کر ہزاروں کے لشکر کے مقابلہ کے لئے آ گئے۔ مجھے تمہارے نوجوانوں پر رحم آتا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ماہان! تو کمانڈر انچیف بن کے آیا ہے یا واعظ بن کر آیا ہے؟ تو اگر لڑنا نہیں چاہتا تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ میں لڑائی نہیں کر سکتا۔ ماہان کو غصہ آیا تو فوجوں کو لڑنے کا حکم دے دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو کفار میں گھس جانے کا حکم فرمایا راوی کہتے ہیں کہ سات گھنٹے تک لڑائی ہوئی آخر کفار شکست کھا کر بھاگ گئے مسلمان صرف سات شہید ہوئے اور عیسائیوں کے تیرہ ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آدمی جب دین کے لئے لڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ مدد فرماتے ہیں۔ اور ہمت تو صرف توحید سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مشرک میں یہ جان نہیں کہ وہ اتنی قوت پیدا کر سکے حاصل یہ کہ ایک طرف اخلاص کامل اور دوسری طرف اتباع کامل کی ضرورت ہے، آج مسلمانوں میں شرک و بدعات داخل ہو رہی ہیں۔ اس لئے آج ذلت کی بھی یہ حالت ہے کہ خدا کی پناہ۔

اقوام عالم کی اصلاح کا ذمہ دار مسلمان ہے...... اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے سے حسن ظن رکھنا چاہئے، بدظنی سے بچنا چاہئے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ضروری ہے لیکن کسی کو رسوا نہیں کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ اے اللہ! میں اس مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں، جو دوستی کا دعویٰ کرے لیکن جب میری بھلائی دیکھے تو اس کو دفن کر دے اور جب میری برائی دیکھے تو اس کو افشاء کر دے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''لَنْ یَّصْلُحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا'' اس امت کے آخر میں فتنہ وفساد رونما ہونے کی اصلاح قطعی طور پر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ امت اس راستہ پر نہ آ جائے گی جس راستہ پر امت کا پہلا طبقہ تھا۔ اور امت کی اصلاح پہلے اخلاص کامل اور اتباع کامل سے ہوئی تھی۔

آج مسلمان یہ شکایت کرتے ہیں کہ مجھے فلاں سکھ نے ایذا پہنچا دی، فلاں ہندو یا عیسائی نے مجھے تکلیف دی۔ میں کہتا ہوں کہ تمام اقوام عالم کی برائیوں کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کے معلم تھے۔ جب معلم درست ہوں تو دوسرے خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے: ''اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی'' (1) اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن ہم اسلام کے دائرے میں ہی نہ آئیں تو ہم پست ہوں گے۔ ورنہ اسلام میں پستی نہیں ہے۔

بندہ کو اپنی مرضی ختم کر دینی چاہئے...... تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نیت تبدیل کرنے سے عادت عبادت بن جاتی ہے۔ ایک شخص نے ایک مکان بنوایا اور اس میں روشندان بھی لگائے۔ بن جانے پر اپنے شیخ کو بلوایا۔ انہوں

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی، ج: ۵، ص: ۱۳۹.

نے پوچھا کہ یہ روشندان کس لئے بنوائے ہیں؟ اس نے عرض کی ہوا آنے کے لئے بنوائے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! اگر یہ نیت بھی کر لیتے کہ اذان کی آواز آئے گی ثواب بھی ہوتا اور ہوا بھی اس سے بند نہ ہوتی۔ کیونکہ نیت تو ان چیزوں کے لئے ضروری ہے جو نیت پر موقوف ہیں تو ثواب تو نیت پر موقوف ہے لیکن ہوا کا آنا نیت پر موقوف نہیں۔ پس ہر کام میں ثواب کی فکر ہی ہونی چاہئے اور اللہ کی رضا کی طلب ہونی چاہئے۔ عبداللہ (اللہ کا بندہ) کا معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کے موافق کام کرے۔

کسی شخص نے ایک غلام سے پوچھا کہ تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو کچھ مولا کھلائے گا۔ اس نے کہا کہ پیئے گا کیا؟ غلام نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پلائے گا۔ اس نے پوچھا کہ تو پہنے گا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پہنائے گا۔ اس شخص نے کہا کہ اللہ کے بندے تیری بھی کچھ مرضی ہے یا نہیں؟ غلام نے جواب دیا کہ اگر اپنی مرضی ہوتی تو غلام نہ ہوتا۔

آیت متعلقہ بیان...... جو آیت میں نے پڑھی تھی اس میں اسی اخلاص اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ابراہیم! کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا، میرا جینا، سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اسی ملت ابراہیمیہ کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ① یعنی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس امت کو خود امت مسلمہ فرمایا ہے: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اور اسلام کے معنی اطاعت اور سونپ دینے کے ہیں۔ اسلام کا اقرار کرنے کے بعد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد نہ کرنا غداری ہے پسندیدگی کا بھی اظہار اور ناپسندیدگی کا بھی اظہار یہ اجتماع ضدین ہے۔

نام کے اور کام کے مسلمان...... پنجاب کے ضلع انبالہ میں ایک بزرگ جمنا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ دریا کو طغیانی آئی تو وہ گاؤں بھی غرق ہونے لگا۔ لیکن ایک دیوار کی وجہ سے کچھ بچاؤ تھا۔ لوگ ان بزرگ صاحب کے پاس گئے اور عرض کی حضرت شاہ صاحب! گاؤں غرق ہونے لگا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غرق کرنے سے بچائے۔ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے پھاوڑا لیا اور جو دیوار باقی تھی اس کو بھی توڑنے لگے۔ لوگوں نے کہا حضرت یہ کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ ''جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولا'' تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرانا چاہتے ہو؟ اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ یہ بستی ڈوب جائے تو بندہ کو بطریق اولیٰ کہنا چاہئے کہ یہ بستی ڈوب جائے۔

اسی طرح ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی کے موافق دو جہاں کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اس نے کہا کہ دونوں جہاں کا کاروبار آپ کی مرضی کے موافق چل رہا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں: اس طرح کہ دونوں جہاں کا کاروبار اللہ کی مرضی کے موافق چل رہا

① پارہ: ١٧، سورة الحج، الآية: ٧٨.

ہے۔اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں ایسا فنا کر دیا ہے کہ اللہ کی مرضی ہی میری مرضی ہے۔

نازم بچشم خود کہ روئے تو دیدہ است	افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

عوام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ زمین کاشت کر رہے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنی تو وہیں کھڑے ہو کر دعا کی کہ اے اللہ مجھے آنکھیں اس لئے عزیز تھیں کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وفات پا گئے تو ان آنکھوں کے ساتھ اب کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا۔بس اسی وقت وہ صحابی رضی اللہ عنہ نابینا ہو گئے۔یہ تو بہر حال صحابی تھے۔ان کا تو مقام ہے ہی۔اس کے علاوہ اولیاء اللہ میں ایسے بزرگ ہوئے ہیں،امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے،ان کے شیوخ میں سے ایک شیخ ہیں جب وہ بازار نکلتے تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تھے۔ لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حافظہ بہت قوی دیا ہے جو چیز سنتا ہوں یاد ہو جاتی ہے۔چاہتا ہوں جن کانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنوں،ان کانوں میں کوئی دوسری آواز نہ پڑے۔یہ لوگ کام کے مسلمان تھے۔ہم تو نام کے مسلمان ہیں۔

آج اگر چہ ہم ان جیسے تو نہیں ہو سکتے بلکہ جو بزرگ ہمارے قریب زمانے کے ہیں ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔لیکن ہم کم از کم ان کے راستہ پر تو چل پڑیں۔وہ تو دوڑتے جاتے ہیں ہم چلیں تو سہی۔ہم بھی کبھی نہ کبھی انشاء اللہ منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔اور بغیر سلف صالحین کے نقش قدم پر چلے دین و دنیا نہیں ملتی۔

بہر حال دین و دنیا کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاص کامل اور اتباع کامل پیدا کرے۔یہی دو چیزیں کلید نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔جو بھی کامیاب ہوا وہ اسی طریق پر چل کر ہوا اور جو راستہ سے ہٹ گیا وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکا۔اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل نصیب فرمائے۔آمین

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

صُحبتِ صَالح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ①

کثرتِ علم کے باوجود بے عملی کثرت سے ہے...... بزرگانِ محترم! یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے ایک بہت اہم مضمون بیان فرمایا ہے۔ جس پر انسان کی دینداری کی بقا موقوف ہے۔ اگر کوئی دیندار بننا چاہے تو اس کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ آج کل تقریروں، جلسوں اور لٹریچر کی کمی نہیں۔ لیکن اسکے باوجود مسلمانوں کی دینی حالت تنزلی میں ہے۔ صرف دین ہی نہیں بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی تنزلی کا شکار ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک اسبابِ مرض معلوم نہ ہوں، اس وقت تک مریض کا علاج ناممکن ہے۔ اب دین میں کمی اس وجہ سے تو نہیں کہ کم علمی ہو۔ کیونکہ اس زمانے میں علم کے ذرائع اشاعت جتنے موجود ہیں وہ پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ اسی طرح آج جو جلسے ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں ایک ہزار دو ہزار آدمی تو معمولی بات ہے اور بعض جگہ تو لاکھوں تک بھی شرکت ہوتی ہے۔ بلکہ آج کل تو تمام دنیا اک جلسہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ ایک شخص ریڈیو میں بولتا ہے مشرق و مغرب تک اس کی آواز پہنچتی ہے اور صرف دنیوی باتیں ہی نہیں بلکہ اتر جمے اور تفسیریں بھی مختلف ممالک میں سنی جاتی ہیں۔ آپ کا ریڈیو پاکستان روزانہ ترجمہ قرآن مجید نشر کرتا ہے۔ اور مسائل تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دین میں وہ پختگی نہیں جو پہلے زمانوں میں تھی۔ دوسرا ذریعہ نشرِ علم کا قلم ہے۔ آج کے زمانے میں اس کی بھی کمی نہیں۔ قلم کی علماء نے دس قسمیں لکھیں ہیں۔ پہلی قلم لوحِ محفوظ والی قلم ہے۔ جس کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ" خَلَقَ اللهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ: اُكْتُبْ قَالَ مَآ اَكْتُبُ؟ قَالَ اُكْتُبْ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ." ②

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹. ② السنن لابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر، ج: ۱۲ ص: ۳۰۹، رقم: ۴۰۷۸. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۲۰۰ رقم: ۴۷۰۰.

اور ایک قلم وہ ہے جس سے روزانہ کے حالات لکھے جاتے ہیں۔حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں جب عرش کے قریب پہنچے، تو قلموں کی کھسکھساہٹ سنی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کس چیز کی آواز ہے۔انہوں نے جواب میں فرمایا کہ: یہ دفتر ہے جس میں مخلوق کے واقعات کولکھا جاتا ہےاور ایک ایک انسان دن میں لاکھوں حرکتیں کرتا ہے۔معلوم نہیں وہ دفتر بھی کتنا بڑا ہوگا۔

ایک قلم وحی ہے۔وہ یہ کہ وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی کو بلوا کر لکھوا دیتے تھے۔اسی قلم پر ہمارے دین کی بقا موقوف ہے۔ایسے ہی اگر حدیث کی کتابت نہ ہوتی تو اتنی کتب بھی ہمارے پاس موجود نہ ہوتیں۔پس یہ ذخیرہ احادیث اور قرآن کریم قلم کے ذریعہ ہی محفوظ کئے گئے ہیں۔جس کی وجہ سے آج ہم نماز، روزہ، حج وغیرہ کے احکام پمفلٹوں میں شائع کرتے ہیں۔

ایک قلم تصوف ہے۔جس کے ضروری مسائل اور تزکیہ نفوس کے طریقے محفوظ کئے جاتے ہیں۔اور ایک قلم سیاست ہے، جس سے تمام سیاسی معاملات محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔دین کے سلسلہ میں آج جتنی قلمکاریاں ہیں، وہ پہلے کسی زمانہ میں نہ تھیں۔امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: دنیا میں کوئی قوم تصنیف میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابیں محفوظ ہیں۔اندلس کے کتب خانوں کے متعلق ایک عیسائی عورت اپنی کتاب "حَاضِرُ الْاُنْدَلُسِ وَغَادِ بِهَا" میں لکھتی ہے کہ: تعصب میں آ کر عیسائیوں نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کر دیا جائے۔چنانچہ حکومت کی طرف سے اس کام کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس کا کام یہ تھا کہ کتب خانوں کو جلائے یا دریا برد کر دے۔وہ عورت لکھتی ہے کہ پچاس برس تک یہ مہم جاری رہی۔تاتاریوں نے حکومت بغداد کے کتب خانوں کو دریا میں ڈال دیا۔تو وہ ایک بڑا پل بن گیا۔تاریخ کی کتب میں لکھا ہے کہ ایک ماہ تک دریا کا پانی سیاہ رہا۔جب ایک کتب خانہ کی یہ حالت تھی تو باقیوں کا کیا حال ہوگا۔انجیل کے شباب کے زمانہ میں بھی عیسائی اتنے کتب خانے نہ بنا سکے اور نہ ہی یہودی تورات کے شباب کے زمانہ میں ایسے کتب خانے بنا سکے۔اور آج بھی جو انہوں نے تصانیف کی ہیں اور موجودہ یورپ کی ترقی انہیں مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔وہیں سے یورپ کے لوگ پڑھ کر آئے اور اپنے ملک میں علم پھیلایا۔اسی کی برکت ہے کہ آج عیسائی اس قابل ہیں کہ تصنیف کر سکیں اور ان کو اقرار ہے کہ یہ مسلمانوں کے فیض سے ہے۔

ماحول کا اثر......الغرض مسائل کی اشاعت کثرت سے ہے لیکن اس کے باوجود دین مسلمانوں میں نہیں پھیلتا۔ اور نہ ہی سلف کی طرح ایمان میں مضبوطی ہے اور نہ ہی ہمارا دل ایسا ہے کہ اعمال صالحہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائیں۔وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری معاشرت غیر اسلامی ہے۔اور ماحول بھی غیر اسلامی بن گیا۔دارالعلوم دیوبند میں دو ہزار کا عملہ ہے۔ممکن نہیں کہ وہاں کوئی بے نمازی ہو۔اذان ہوتی ہے سب کے سب ہر طرف سے دوڑتے ہیں۔یہ تمام ماحول کا اثر ہے۔ورنہ وہاں کوئی نماز کے متعلق کہنے والا نہیں ہوتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ہر کام پہلے ریا ہوتا ہے، پھر عادت ہوتی ہے، پھر عبادت ہو جاتی ہے ۔چنانچہ حدیث میں ہے: ''مُرُوْا صِبْیَانَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَیْهَا اِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا.'' ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور مار کر نماز پڑھاؤ جب کہ دس سال کے ہو جائیں''۔ ①

یہ مار کر نماز پڑھانا حقیقی نماز نہیں، کیونکہ وہ ڈر کے مارے پڑھتا ہے، یہاں تک کہ سجدہ کرتے ہوئے بھی ایک آنکھ سے دیکھتا رہے گا۔ جب دیکھا کہ باپ نہیں ہے بھاگ جائے گا۔ لیکن جب اس کو عادت پڑ گئی اور ساتھ ساتھ کچھ علم آ گیا، تو خیال کرے گا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ تو یہی عبادت بن جائے گی۔

عارف رومی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

بہر دنیا بہر دین و بہر نام اللہ اللہ کردہ باید و السلام

اس لئے نمازی کو اس وجہ سے نہیں رکنا چاہئے کہ شاید یہ ریا ہو۔

ظاہر کا اثر باطن پر...... حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو فقہ کے امام ہیں۔ مگر ان کا مذہب مدون نہیں ہوا۔ وہ فرماتے ہیں: ''طَلَبْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰهِ فَاَبٰی اَنْ یَکُوْنَ اِلاَّ لِلّٰهِ.'' ② ''ہم نے علم غیر اللہ کے لئے طلب کیا لیکن علم تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہا''۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی عورتوں کا سا لباس پہن لے، تو چند دن کے بعد اس کا دل یہ چاہے گا کہ وہ کلام بھی عورتوں کی طرح کرے، بلکہ تمام حرکات و سکنات عورتوں جیسی کرے۔ اسی طرح اگر کوئی بتکلف علماء کا سا لباس پہن لے تو وہ مخلوق کی خاطر بہت سے گناہوں سے بچے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی درویشوں کا سا لباس پہن لے، تو اس کا اثر بھی قلب پر پڑے گا۔ اگر کفار کا سا لباس پہننا شروع کر دے تو چند دنوں میں دیگر افعال بھی کفار کی طرح ہی کرنے لگے گا۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ: ''فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکُوْا'' ③ یعنی اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا لو۔ مقصد یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ظاہری افعال کا اثر حقیقی افعال کا سا مرتب ہوتا ہے۔ رونے کی شکل بنانے میں وہی اجر و ثواب ملے گا، جو حقیقۃً الحاح و زاری پر ملتا ہے۔ بہر حال ظاہر کا اثر نہ صرف باطن پر مرتب ہوتا ہے، بلکہ ایک درجہ میں عند اللہ بھی بلحاظ اجر و ثواب اس کا اعتبار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ حنین سے واپس آ رہے تھے، راستہ میں ایک جگہ پڑاؤ کیا، کفار کے بہت

---

① المسند للإمام احمد، ج: ۱۳، ص: ۴۴۰۔ اس حدیث کو علامہ البانی صحیح فرمایا ہے۔ صحیح وضعیف الجامع الصغیر ج: ۱۶ ص: ۱۲۰ رقم: ۷۴۷۳۔ ② المسند لابن الجعد، ج: ۱، ص: ۲۰۳۔

③ السنن لابن ماجه، کتاب اقامة الصلوة، باب فی حسن الصوت بالقرآن، ص: ۲۳۵۔

سے بچے مسلمانوں کے لشکر کے پاس جمع ہو گئے، ان میں حضرت ابومحذورہ بھی تھے۔ جب مؤذن نے اذان کہی تو ان بچوں نے بھی نقل اتارنا شروع کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ان کو پکڑ کر لاؤ۔ سب بچے تو بھاگ گئے مگر حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ ان میں سے کچھ بڑے تھے۔ انہیں بھاگتے ہوئے شرم آئی وہ نہ بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ان کو حاضر کیا گیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اب اسی طرح نقل اتارو۔ اور کہو اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے کہہ دیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو: ''اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللہُ'' انکو تامل ہوا۔ کیوں کہ اس میں توحید کا اقرار تھا۔ لیکن دبے لفظوں سے کہہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ کہو: ''اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللہُ'' ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ کہہ دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو ''اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ.''۔ اس میں حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو زیادہ تامل ہوا۔ کیونکہ توحید کے تو کسی درجہ میں مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے۔ (المسند للامام احمد، احادیث ابی محذورہ، ص: ۳۹۱) ''لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ اِلَّاشَرِیْکًا ھُوَلَکَ'' ①

اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ: ﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ﴾ ② یعنی اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کو اور اس کے بڑے عرش کو کس نے پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ توحید کے تو کسی درجہ میں قائل تھے۔ تو توحید کے کلمات کہنے میں اس قدر تامل نہ ہوا۔ لیکن رسالت کے وہ منکر تھے اور سارا جھگڑا رسالت کے نہ ماننے پر تھا۔ اس لئے ابومحذورہ رضی اللہ عنہ پہلے چپ ہو گئے۔ لیکن پھر دبے لفظوں میں کہا ''اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ.'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زور سے کہو تو ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے زور سے دوسری مرتبہ بھی کہا۔

ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے یہ اذان اسلام کی حالت میں نہیں کہی تھی محض نقالی تھی۔ لیکن اس کا اثر دل پر اتر گیا۔ کہنے لگے کہ یارسول اللہ! اب تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوں۔ اب اذان میں شوافع احناف کے خلاف ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ ترجیع صفت اذان میں سے ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ تعلیم تھی۔ یہ فقہاء کے اختلاف ہیں۔ لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے جب ظاہر سے اسلام کا اقرار کیا تو اس کا اثر دل میں بھی اتر گیا۔ اور اسلام قبول کرلیا۔ اس لئے نبی کریم نے ارشاد فرمایا کہ: اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنالو۔ پس اگر نماز کو جی نہ بھی چاہے تو بھی نماز نہ چھوڑنی چاہئے۔ مگر یہ ماحول سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ماحول اچھا ہو تو بچے بھی نمازی بن جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مطالبہ پاکستان کے وقت بچوں کے کھیل بھی جلسے اور جلوس بن گئے تھے کیونکہ اس وقت ماحول ہی ایسا تھا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک نوجوان طالب علم آیا۔ اور جلدی سے نماز

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ۱۰، ص: ۱۶۶ ② پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۸۶، ۸۷.

پڑھ کر چل دیا۔حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: تو نے نماز اچھی طرح سے کیوں نہ پڑھی؟ اس کے منہ سے نکلا کہ حضرت میں چھوٹی کتابیں پڑھتا ہوں۔حضرت کو غصہ آیا اور فرمایا کہ یہ اعمال تو ماں باپ سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ان میں کتابوں کی ضرورت نہیں لیکن یہ جب ہوتا ہے جب ماں باپ بھی ایسے ہی ہوں۔اگر عیسائی ذہنیت کا ماحول بن جائے تو دل اسی طرف مائل ہونے لگے گا۔

تربیت میں ماحول کا اثر......حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ ایک شادی کے سلسلے میں تھانہ بھون تشریف لے گئے۔تو خیال ہوا کہ حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ) صاحب کی زیارت بھی کرلوں۔چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہوگیا، کہ یہ فطرت سلیمہ رکھتے ہیں۔تو آپ نے پوچھا کہ آپ کسی سے بیعت بھی ہوئے یا نہیں؟ آپ نے کہا کہ نہیں۔حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پھر مجھ سے بیعت ہو جاؤ۔حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں اس شرط پر بیعت ہوں گا کہ آپ مجھے ذکر و شغل کا حکم نہ فرمائیں گے۔حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو بیعت ہونے کو کہا ہے شغل کا تو میں نے کہا ہی نہیں اور وعدہ بھی فرمایا کہ آئندہ بھی نہیں کہوں گا۔حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمایا اور یہ فرمایا کہ دو تین دن یہاں ٹھہر جاؤ۔آپ وہیں تھانہ بھون میں تین دن ٹھہرے جب رات کے وقت اڑھائی تین بجے دیکھا کہ سب لوگ اٹھ کر تہجد ادا کر رہے ہیں۔حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شرم آئی انہوں نے بھی اٹھ کر تہجد پڑھی۔پھر جب لوگوں کو ذکر و شغل میں دیکھا، آپ بھی ذکر میں مشغول ہوگئے۔دوسرے دن پھر یہی حالت ہوئی۔تیسرے دن خود بخود خوشی سے تہجد پڑھی اور ذکر و شغل میں مشغول ہوگئے۔تیسرے دن حضرت کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ نے تو سب کچھ ہی کرا دیا۔حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تھوڑا ہی کہا تھا۔میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔اب آپ جا سکتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ اب تو میں نہیں جاتا۔چالیس دن وہاں ٹھہرے اور اس تھوڑے عرصہ کے بعد خلافت لے کر واپس ہوئے۔بس یہ عبادت پہلے ریا تھی، پھر عادت ہوئی، پھر عبادت ہوگئی اور ساتھ ہی خلافت بھی مل گئی۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جب میری عمر آٹھ برس کی تھی۔ایک دفعہ میرا گنگوہ جانا ہوا وہاں ذکر و شغل کا ماحول تو تھا ہی۔گنگوہ کی مسجد میں بہت سے دھوبی کپڑے دھوتے تھے، وہ جب کپڑے کو مارتے تو اِلَّا اللّٰہ کی ضرب ساتھ کہتے۔یہ ماحول کا اثر تھا ورنہ ان کو پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔مقولہ مشہور ہے۔

"ہرچہ درکان نمک رفت نمک شد"

بس ماحول کا اثر یہی ہے۔جو نیک ماحول میں ہوگا اس کا بھی اثر ضرور ہوگا۔حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی ایک ماحول تھا کہ جو بھی اس میں آتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔اور ان کا ماحول بھی بہت قوی تھا۔حتیٰ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ تھا۔امت کا اجماع ہے کہ: "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ" وہ

معصوم تو نہیں تھے لیکن محفوظ تو ضرور تھے۔ امت کا اتفاق ہے کہ کوئی شخص کتنا بڑا غوث اور قطب بن جائے لیکن ادنیٰ صحابی کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ جو ماحول ان کو میسر آیا وہ کسی کو میسر نہ آسکا۔ ایسے ماحول سے ابوجہل جیسا بد بخت ہی متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ اور جبری طور پر تو وہ بھی مؤمن تھا۔ چنانچہ اپنے گھر میں کہتا تھا کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیں، پھر ان کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اسی سے ان کو عار تھی۔ بہر حال اگر ایک گھرانہ یہ عہد کرے کہ ہم گناہ چھوڑ دیں گے، تو ان کے ماحول میں جو داخل ہوگا۔ انہی کی طرح ہو جائے گا۔

قول و فعل میں مطابقت کا اثر...... حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سندھی ایک سیاسی مفکر تھے۔ روس کے انقلاب میں وہیں تھے۔ فرماتے تھے کہ: اسٹالن سے ملا اور اسلامی نظام اور اس کے اصول مع دلائل اس کے سامنے رکھے۔ تو اسٹالن نے کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اور اگر دنیا میں کوئی نظام جاری ہوا تو اسلام ہی جاری ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ بتایئے کہ اس کا کوئی عمل دنیا میں بھی موجود ہے...... اس پر مولانا خاموش ہو گئے۔ تو آج دنیا قول کو نہیں دیکھتی بلکہ فعل کا مطالبہ کرتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''فَمَنْ وَّافَقَ قَوْلُهُ فِعْلَهُ فَنَجَا وَمَنْ لَّمْ يُوَافِقْ قَوْلُهُ فِعْلَهُ فَقَدْ هَلَكَ'' ① یعنی جس آدمی کا قول اس کے فعل کے موافق ہوا، نجات پا گیا اور جس کا قول فعل کے موافق نہ ہوا، وہ ہلاک ہو گیا۔ آج اسلامیہ جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ لیکن دنیا اس قول کو نہیں دیکھتی بلکہ عمل کو دیکھتی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے عملی نقشہ پیش کریں۔ ایک شخص بڑے سے بڑا عالم ہو۔ لیکن جب تک وہ اپنے کہے کے مطابق عمل نہ کرے، اس کو اپنے قول کا خود بھی تذبذب رہتا ہے۔

ماحول قوانین حکومت سے بھی بڑھ کر ہے...... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے والوں میں نماز روزہ وغیرہ کا اہتمام تو تھا ہی۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ بھی قانون تھا کہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا موجب نہیں ہوگا۔ چنانچہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک دفعہ کسی صاحب کا ایک رومال گر پڑا۔ لیکن کسی نے وہاں سے نہ اٹھایا اور تین دن تک پڑا رہا۔ ماحول کی وجہ سے کسی کو چرانے کی ہمت نہ ہوئی، اسی وجہ سے حجروں کو تالا لگانے کا دستور ہی نہیں تھا۔

حجاز کی حکومت ہے۔ وہاں بادشاہ کا جذبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو۔ اب ایک عورت زیور پہن کر سفر کرتی ہے۔ تو اس کو کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ تلواروں اور بندوقوں سے دلوں میں ڈر پیدا نہیں ہوتا۔ پولیس اور ہتھیاروں کی کمی نہیں۔ لیکن دنیا میں فسق و فجور کی کثرت ہو رہی ہے۔

ہم حج پر گئے تو دیکھا کہ چند بوریاں بھری ہوئی رکھی ہیں۔ ایک شخص نے پولیس میں جا کر خبر دی کہ فلاں جگہ دو کھجوروں کی بوریاں پڑی ہیں۔ پولیس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ان میں کھجوریں ہیں؟ معلوم ہوا کہ تو نے ٹٹول کر دیکھی تھی؟ اور چرانے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ لیکن موقع نہیں ملا۔ اس شخص کو اس پر بھی سزا ملی۔

① مختصر تاریخ دمشق، ج: ۴، ص: ۴۰۲۔

ہندوستان میں مختلف میلے ہوتے ہیں، مسلمان بھی ہندوؤں کو دیکھ کر میلے کرنے لگے ہیں۔ان میں ہر طرح سے فسق و فجور اور چوریاں ہوتی ہیں۔لیکن مکہ مکرمہ میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے اور کبھی چوری نہیں ہوتی۔مکہ والے کبھی چوری نہیں کرتے۔میں یہ نہیں کہتا کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوتی۔لیکن یہ ضرور ہے کہ غلبہ دیانت کا ہے۔مگر چور کا ہاتھ ایک دفعہ کاٹا جائے تو برسوں تک چوری سے نجات ملتی ہے۔اسلامی حدود رجم اور قطع ید وغیرہ کو وحشیانہ سزا کہنا انہی سے ہوسکتا ہے جن کے نزدیک زنا یا چوری کوئی غیر وحشی فعل ہیں۔ادیان ساویہ میں زنا سے بڑا کوئی جرم نہیں تھا۔ایک عورت کے زنا کرنے سے سارا خاندان بدنام ہو جاتا ہے۔شہرت پر الگ دھبہ آتا ہے اور نسل کا بھی اختلاف ہوتا ہے۔تو یہ فعل بھی تو وحشی ہے اگر وحشی فعل پر وحشیانہ سزا ہو، اس میں کیا جرم ہے؟ طرہ تو یہ ہے کہ آجکل قانون میں اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔کہ صرف جبراً زنا کرنا ہی جرم ہے۔فریقین کی رضا ہو جائے تو جرم ہی نہیں۔ بہر حال ان چیزوں کا ماحول کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال کو تو روک سکتے ہیں لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھلا سکتے۔زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رک سکتا ہے لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی۔جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت و معیت سے نصیب ہوتی ہے۔

غیبت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُ کُمْ اَنْ یَّاْ کُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِ هْتُمُوْهُ﴾ ① ''کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے'' تو غیبت کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو کہ نجس ہے۔لیکن غیبت سے بچے گا کب؟ جب دل میں معاصی سے نفرت ہوگی۔ورنہ حکومت کا قانون تو یہاں نہیں لاگو ہوگا۔جھوٹ کے بارے میں حدیث شریف ہے کہ: انسان جب جھوٹ بولتا ہے، اس کے منہ میں ایک بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور فرشتہ اس کی وجہ سے اس سے دور ہو جاتا ہے۔جب وہ جھوٹ ختم کر لیتا ہے تو وہ واپس آجاتا ہے۔گویا فرشتے کو معصیت سے نفرت ہے۔اسی طرح انسان میں جب ملکوتی صفات آتی ہیں۔وہ بھی معاصی سے متنفر اور بیزار ہو جاتا ہے تو یہاں حکومت کی طرف سے احتساب نہیں ہے۔جس کی بنا پر جھوٹ سے بچے لیکن دل میں معاصی سے نفرت آچکی ہے اس لئے جھوٹ سے بھی بچے گا اور معاصی سے بھی بچے گا۔مشرکین کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِ کُوْنَ نَجَسٌ﴾ ② یعنی مشرکین (اعتقادی طور پر) نجس اور ناپاک ہیں۔معلوم ہوا کہ شرک اور ایسے ہی دوسرے معاصی معنوی نجاستیں ہیں۔آدمی جس طرح ظاہری نجاست کی آلودگی سے بچتا ہے اور دور بھاگتا ہے۔اسی طرح جن کا باطنی احساس زندہ ہے وہ معنوی نجاستوں سے بچتے ہیں۔اور اپنے باطنی احساس سے ان نجاستوں کو پہچانتے بھی ہیں۔حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک عورت پر نظر پڑ گئی۔تو

① پارہ: ۲٦ سورة الحجرات ،الآیة: ۱۲. ② پارہ: ۱۰، سورة التوبة، الآیة: ۲۸.

یہ نظر تو گناہ نہیں تھی۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ''اَلنَّظْرَةُ الْاُوْلٰی لَکَ وَالثَّانِیَةُ عَلَیْکَ'' ① یعنی پہلی نظر میں کوئی گناہ نہیں اور دوسری میں گناہ ہے۔ لیکن اس شخص نے قصداً دوسری دفعہ بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ: ''مَا لِلرِّجَالِ یَاْتُوْنَنَا وَفِیْ قُلُوْبِهِمْ اَثَرُ الزِّنَا'' یعنی لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ان کے دلوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے قلب اور روح کا حاسہ تیز تھا جس سے یہ گناہ نظر آ گیا تھا اور وہ تیز کیوں تھا؟ اس لئے کہ آپ کو صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میسر تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ گناہ نظر آ جاتے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جب مسجد میں آتے اور لوگ وضو کرتے ہوتے تو آپ نظر نیچی کر لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا: حدیث شریف میں ہے کہ جب انسان وضو کرتا ہے تو اس کے اعضاء کے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں، جب کلی کرتا ہے تو منہ کے گناہ جھڑتے ہیں۔ جب سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑتے ہیں اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ جھڑتے ہیں۔ تو فرمایا کہ: جب گناہ جھڑتے ہیں، مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس سے مجھے بدظنی پیدا ہوتی ہے تو میں نظریں نیچی کر لیتا ہوں تا کہ گناہ کا علم نہ ہو اور بدظنی پیدا نہ ہو۔ جن کی روحانیت قوی ہوتی ہے ان کو معاصی نظر آ جاتے ہیں۔

محاسبہ آخرت کی دنیا میں صورت مثالی...... اور قیامت میں تو اعمال بھی سب کو نظر آنے لگیں گے۔ حدیث میں ہے کہ: قیامت میں انسان کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم اور دوسرے اعمال کی صورت مثالی۔ اعمال کی صورت مثالی کی مثال یہ ہے کہ دیوان غالب اب چھپا ہے۔ تو غالب نے جس شعر میں جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس شعر کے نیچے اس کی تصویر کھینچ کر اس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ حدیث میں علم کی صورت مثالی دودھ بتائی گئی ہے اور نماز کی صورت مثالی حسین عورت اور سخاوت کی صورت مثالی ایک عظیم الشان درخت بتائی گئی ہے۔ جس کے سایہ میں سخی آدمی بیٹھے گا، جیسا کہ اس کی سخاوت سے دنیا میں غریبوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہ تو اعمال صالحہ کی صور مثالیہ ہیں۔ اسی طرح اعمال سیۂہ کے بارے میں بھی حدیث میں ہے کہ: جو شخص مالدار ہو اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا وہ خزانہ سانپ کی شکل میں متشکل ہو گا۔ اور اس مال دار کے گلے کا طوق بن جائے گا جو اس کو کاٹے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں' کیونکہ مال کی ظاہری صورت بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس کا تصور بھی دل کو خوش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کے پاس اگر مال ہو وہ اسے خرچ بھی نہ کرتا ہو تو چوری ہو جانے پر اس کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور اگر ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے مثلاً چوری کی جائے تو اس میں ایک قسم کا زہر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس پر سزا ہوتی ہے۔ اس لئے اس عمل بد (یعنی عدم اداءِ زکوٰۃ) کو سانپ کی شکل دی گئی۔ حاصل یہ ہے کہ ہر عمل کو اس کے اوصاف کے مطابق شکل دی جائے گی۔ اور یہی صفات مذمومہ اگر خود آدمی میں راسخ ہو جائیں تو آخرت

① السنن لابی داؤد، کتاب النکاح، باب مایؤمر بہ من غض البصر، ج:۲، ص:۵۴، رقم: ۱۸۳۷.

میں بھی آدمی پر اس کا پرتو پڑتا ہے۔ دیکھنے میں وہ صحیح‘ شکل وصورت کے لحاظ سے آدمی ہی کے لباس میں ہے۔ مگر حقیقت آدمیت اس میں نہیں ہوتی۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے بینائی دی ہے وہ اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عارف باللہ، صاحبِ کشف وکرامت تھے۔ جب بغداد کی مسجد میں داخل ہوتے تو منہ پر نقاب ڈال لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ: جب میں مسجد میں جاتا ہوں تو کوئی کتا نظر آتا ہے اور کوئی خنزیر نظر آتا ہے تو میں منہ پر نقاب ڈال لیتا ہوں تا کہ مسلمانوں سے بدظنی پیدا نہ ہو۔ یہ ایک الگ عالَم ہے جو اہل اللہ پر مخفی نہیں۔ وہ خوب واقف ہیں۔ اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں مقاماتِ آہ وفغاں ابھی اور بھی ہیں

اس جہان کی ایجادات نے اس صورت مثالی کو سمجھنا تو اب اور بھی آسان کر دیا ہے۔ چنانچہ سی۔ آئی۔ ڈی (C.I.D) کے محکمے کے پاس ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعے سے وہ ہر خفیہ بات کو معلوم کر لیتے ہیں اور تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مجرم کو انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ امریکہ میں فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ بھی اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیں گے۔ جب تک پہلے اس کو تمام زندگی کا ریکارڈ نہ دے دیں گے۔ اور پھر تمام اعمال کی صورت مثالیہ صف کی صورت میں اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ (جیسے کہ آج کل ٹی وی میں اعمال بعینہٖ موجود ومتشکل باقی رہتے ہیں)

حدیث شریف میں ہے کہ زمین کے جس ٹکڑے پر کوئی نیک عمل کیا ہوگا۔ نماز پڑھی ہوگی تو وہ ٹکڑا گواہی دے گا۔ اور جس ٹکڑے پر کوئی گناہ کیا ہوگا، تو وہ ٹکڑا بھی گواہی دے گا کہ اس نے فلاں گناہ میرے اوپر کیا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ملائکہ علیہم السلام بھی گواہی دیں گے۔ اس سے بڑھ کر تمام اعضاء میں قوت گویائی دے دی جائے گی۔ اور زبان سے یہ قوت سلب کر لی جائے۔ تو جس عضو سے جو کام کیا ہوگا، وہ خود گواہی دے گا کہ اس نے فلاں کام میرے اوپر کیا ہے۔ اتنی حجتوں کے بعد اس کو انکار کی ہمت نہ ہوگی اور خود زبان حال سے اقرار کرے گا کہ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔ پھر خواہ اللہ تعالیٰ معاف ہی فرما دیں یا سزا دیں۔ لیکن معافی اقرار گناہ کے بعد ہوگی۔

ترتیب اصلاح...... دلوں کو متقی بنانا دین کا کام ہے۔ اور یہ ماحول کے بہتر ہونے سے ہوتا ہے اور اس کی ابتداء اپنے گھر سے کرنی چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یہ فرمایا گیا: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ① یعنی اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ جب گھر نیکی کا نمونہ بن گیا پھر حکم فرمایا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ② تو آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا اور ایمان لانے کو تبلیغ کی۔ جن میں کچھ سعادت تھی، وہ متوجہ ہوئے اور ایمان قبول کر لیا اس کے بعد فرمایا: ﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ ③ وحی

① پارہ: ۲۸، سورۃ التحریم، الآیۃ: ۶۔ ② پارۃ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۲۱۴۔

③ پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۷۔

آپ کی طرف اتاردی گئی تا کہ آپ مکہ والوں کواوراردگر دوالوں کوڈرائیں۔ پھرفرمایا ﴿لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ ① تاکہ آپ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والے ہوں۔ چنانچہ پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام بادشاہوں کی طرف خطوط لکھے،اورایمان کی تبلیغ کی۔بس اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ اصلاح کی ابتدا پہلے اپنے گھر سے کرنی چاہئے۔نیکی بدی میں انسان ایک بھیڑ چال ہے۔بار ہا کا میرا مشاہدہ ہے کہ اگر مجلس میں ایک نے مصافحہ کیا تو تمام ہی شروع ہوجاتے ہیں ایسے ہی اگر ایک ابتداء کرے تو دوسروں سے بھی تمام بری عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔اور ترتیب بھی یہ ہونی چاہئے کہ اولاً گناہوں کو چھوڑنا چاہئے، پھرنیکیوں کو اختیار کرنا چاہئے۔اور گناہوں میں بھی پہلے کبائر کو، پھر صغائر کو چھوڑنا چاہئے۔حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔اوراس نے عرض کیا کہ حضور ایمان تو لاتا ہوں مگر جتنے برے کام کرتا ہوں ان سب کو چھوڑ نہیں سکتا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم صرف جھوٹ کو چھوڑ دینے کا وعدہ کرتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں۔اور خوشی خوشی یہ وعدہ کرکے چلا گیا۔مگر پھر جب گناہ کا خیال آتا تو محاسبہ کا خیال پہلے آتا۔چنانچہ جب شراب پینے چلا تو خیال ہوا کہ یہ فعل چھپے گا نہیں۔یا جھوٹ بولوں گا۔یا پھر حد لگے گی اور رسوائی ہوگی۔جب چوری کا جذبہ پیدا ہوا تو بھی خیال ہوا کہ چوری چھپے گی نہیں،خواہ مخواہ رسوائی ہوگی۔کیونکہ جھوٹ نہ بولنے کا سچا عہد کرکے ایمان قبول کیا تھا۔تو اس عہد سے تمام ہی گناہ ازخود چھوٹ گئے۔چنانچہ یہ تینوں گناہ اس سے چھوٹ گئے صبح کو حاضر ہوا تو عرض کی۔یارسول اللہ! آپ نے چھڑائی تو ایک برائی اور چھوٹ گئیں ساری برائیاں۔طبیبِ کامل مختصر سا نسخہ ہی تجویز کیا کرتا ہے۔جس سے تمام امراض کا علاج ہوجاتا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور بیعت ہوگیا۔کہنے لگا کہ مولوی جی! آپ نے پوچھا ہی نہیں میں تو افیون بھی کھاتا ہوں۔تو آپ نے حرام کہہ کر افیون نہیں چھڑائی بلکہ فرمایا کہ: جتنی افیون کھاتے ہو،بیس روز تک اس سے نصف کھایا کرو۔پھر بیس دن اس سے نصف کھایا کرو۔کرتے کرتے انشاء اللہ تعالیٰ چھوٹ جائے گی۔لیکن وہ آدمی پکا تھا۔جب سنا کہ یہ حرام ہے تو ایک دم ہی چھوڑ دی۔خانقاہ سے چلا گیا۔اور بیمار ہوگیا،خوب دست جاری ہوئے چھ ماہ تک بیمار رہا۔آخر صحت ہوئی تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔اور پانچ روپے بھی آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کئے۔حضرت چونکہ غریب آدمی سے کچھ لیتے نہیں تھے واپس کردیئے۔اس نے کہا کہ حضرت میں چھ ماہ میں پانچ روپے کی افیون کھاتا تھا تو میرا نفس خوش ہوا کہ اچھا ہوا پانچ روپے بچ گئے۔میں نے کہا یہ پانچ روپے اب نفس کے لئے نہیں ہیں،اب یہ افیون چھڑوانے والے کو ہی دینے ہیں۔پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں سے کچھ تھوڑا سے لے لیا۔

اصلاح کا عزم...... آج ساری مصیبت ہی یہ ہے کہ اصلاح کا عزم ہی نہیں ہوتا۔لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ماحول

بہتر نہیں۔ماحول کوئی ایسی بارش تو نہیں جو آسمان سے برسے۔آخر ماحول کا بہتر بنانا بھی تو عزم ہی سے ہوتا ہے ؎

تو ہی اگر نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں

ہر یکے ناصح برائے دیگراں۔شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے نفس سے ہمیشہ بدظنی رہے اور اپنے سوا ہر ایک سے حسن ظن ہو۔اور دنیا نے اس کے برعکس کیا ہوا ہے۔دہلی کے آخری تاج دار بادشاہ ظفر ان سے سلطنت چھن گئی۔آخر عمر میں صوفی ہو گئے تھے۔وہ کہتے ہیں ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر — رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی جب اپنی برائیوں پہ نظر — تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

تو میں نے عرض کیا کہ دین کا اثر اس وجہ سے کم نہیں کہ علم نہیں، بلکہ معاشرہ خراب ہے۔اس لئے پہلے ماحول اور معاشرہ کی اصلاح کرنے چاہیے۔

آج خیر خواہی سے اسلامی نظام کا مطالبہ ہو رہا ہے اور حکومت بھی خیر خواہی سے اس کو نافذ کرنا چاہتی ہوگی۔ لیکن تمام کام قانون سے نہیں ہوتے۔زنا کا اعلان حکومت تو نہیں کر رہی۔یہ جو زنا ہو رہے ہیں یہ ماحول کی خرابی سے ہیں۔اسی طرح چوری دیکھ لیجئے آج بھی چوری، زنا قانوناً جرم ہے گویا اسلامی نظام اگر مکمل طور پر نافذ نہیں، بعض اسلامی قوانین تو آج بھی نافذ ہیں۔اس کے باوجود زنا، چوری آج بھی ہو رہے ہیں۔اگر کل اسلامی نظام نافذ ہو گیا اور معاشرت ایسی ہی رہی تو بھی زنا چوری ہوتے رہیں گے اس لئے تمام کام حکومت پر ہی نہیں چھوڑنا چاہئے۔کم از کم جتنے اجزا اسلامی قانون کے نافذ ہیں ان پر تو عمل کرنا چاہئے۔ان پر بھی عمل نہیں۔

میں نے یہ آیت پڑھی تھی جس میں صرف تقویٰ ہی نہیں بلکہ صحبتِ صالح اختیار کرنے کا بھی حکم ہے۔اس لئے اہل علم اور درویش صوفیاء کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی ہے۔اگر انسان جائے تو خوشبو لے کر آتا ہے اگرچہ عطر نہ خریدے۔اور بری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی ہے۔اگر آدمی جائے اور کچھ نہیں تو دھواں اس کو ضرور پہنچے گا۔اگرچہ کپڑے نہ جلیں۔بہر حال نیک صحبت اور صالحین کی معیت اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔بقدرِ ضرورت آیت کی تشریح ہو گئی۔اب میں ختم کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو حُسنِ خاتمہ نصیب فرماوے اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے۔(آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

راہِ نجات

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ!فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ، وَالْعَالِمُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ. وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ. وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰى خَطَرٍ عَظِيْمٍ. ① صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

تمہید...... میرے محترم بھائیو اور بہنو!...... یہ ایک حدیث ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ کہ انسان کی نجات دنیا میں بھی، آخرت میں بھی، انہی باتوں میں منحصر ہے۔ انہی چند اصولوں کی اس وقت مجھے تشریح کرنی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ مختصر وقت میں ان کی کچھ ضروری شرح آپ حضرات کے سامنے عرض کروں۔

آدمی کی نجات اس کے اندرونی جوہر سے ہے...... پہلے اتنا اصول سمجھ لیجئے کہ انسان کو جو کچھ بھی نفع پہنچتا ہے، وہ جبھی پہنچتا ہے، جب کوئی خوبی اور بھلائی اس کے نفس میں آ جائے۔ نفس کے اندر پیوست ہو جائے۔ باہر کتنی ہی خوبیاں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن وہ انہیں اپنے اندر نہ لے، اس کے لئے نفع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ ایک باغ ہے اس میں قسم قسم کے پھول مہک رہے ہیں اور خوشبوؤں سے فضا بھری ہوئی ہے، لیکن آدمی ناک بند کر کے بیٹھ جائے اور کوئی خوشبو اندر نہ جانے دے، اس کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ دنیا میں خوشبوئیں بھری ہوئی ہیں، بھری رہیں، اسے نفع جب پہنچے گا جب خوشبو اندر پہنچے اور دماغ اس سے مستفیض ہو۔ اگر دنیا کے اندر ہزاروں خوب صورت اور خوش رو نوجوان پھر رہے ہوں، بہتر سے بہتر حسن و جمال کا نقشہ سامنے ہو، مگر ایک آدمی آنکھ بند کئے بیٹھا ہے، اسے کچھ پتہ نہیں کہ کون خوب صورت ہے کون بدصورت؟ تو اس کا دل نہ عشق سے آشنا ہوگا، نہ محبت سے

① دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات، ج: ۱، ص: ۲۰۰۔

آشنا ہوگا، نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکے گا۔ دنیا کے فضا میں ہزاروں نغمے گونج رہے ہوں، بہتر سے بہتر آوازیں پھیلی ہوئی ہوں، لیکن اس کے کان میں سننے کی قوت نہیں ہے، یا اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے، کوئی نغمہ اس کے کان میں نہیں پہنچتا، اسے اس سے کوئی نفع نہیں ہوگا۔ کتابوں میں ہزاروں مسائل لکھے ہوئے ہوں، علم پھیلا ہوا ہو لیکن اس کے دل کا دروازہ بند ہو، علم اندر نہ پہنچے، اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ایمان بھرا ہوا ہو، لاکھوں مؤمن موجود ہوں، لاکھوں اولیاء موجود ہوں اور اگر نبوت کا زمانہ ہو، تو نبی بھی موجود ہو، مگر وہ اپنے دل کے دروازے بند کر دے، نہ ایمان کو اندر داخل ہونے دے، نہ علم و معرفت کو، اسے انبیاء و اولیاء کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اتنی بات آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آدمی کی نجات اور اس کا نفع، اس کے اندرونی جوہر سے ہے۔ باہر کی چیز کو جب تک اندر نہ داخل کرے، اسے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کے لئے کوئی عزت کا سامان ہوسکتا ہے۔

اصل کمال وہی ہے جو انسان کی ذات میں ہو...... آپ نے نام سنا ہوگا حکیم سقراط کا۔ یہ یونان کا ایک بڑا حکیم گزرا ہے۔ فن طب کا یہ موجد ہے۔ اس فن کو اس نے مرتب کیا ہے۔ غرض بہت بڑا طبیب، حکیم، فلسفی اور عالم ہے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ رات اور دن جنگلوں میں، پہاڑوں میں اور باغات میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرنے کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ گل بنفشہ کی کیا خاصیت ہے، ملٹھی کی کیا خاصیت ہے، فلاں بوٹی کیا نفع پہنچائے گی اور کسی چیز کو کھا کر دیکھ رہا ہے اور کسی کو سونگھ کر دیکھ رہا ہے۔ غرض محقق تھا۔ دن بھر اسی میں گزارتا تھا۔

یہ ایک دفعہ، دن بھر کا تھکا ماندا شہر میں آیا۔ شہر میں آ کر کسی دکان پر بیٹھا، تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ بادشاہ وقت کی سواری نکل رہی تھی۔ جلوس آ رہا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا، سامنے سے فوجیں، سپاہی، نقیب اور چوب دار گزر رہے تھے۔ ہٹو اور بچو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر یہ بے چارا اتنا سویا ہوا تھا، خدا جانے کتنے دنوں کا جاگا ہوا ہوگا، اس کی آنکھ نہ کھلی یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آئی۔ تو بادشاہ کو بڑا غصہ آیا، کہ یہ بڑا بد تہذیب آدمی ہے۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، میری سواری آ رہی ہے اور یہ پیر پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا ہے۔ اور سو رہا ہے، کوئی ادب اس کے اندر نہیں ہے۔ بادشاہ نے غصے میں اپنے ہاتھی یا گھوڑے سے اتر کے اس کے ایک ٹھوکر ماری اور کہا او بے ادب! جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟ یہ بے چارہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ جیسے سویا ہوا آدمی جاگنے کے وقت آنکھیں ملا کرتا ہے۔ بادشاہ نے پھر ڈانٹ کر کہا ارے نامعقول! تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟ اس نے بڑے اطمینان سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! یہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اسی لئے آنکھیں مل رہا ہوں۔ اور اب تک میں اتنا جان چکا ہوں کہ آپ شاید جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں۔ اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ زمین پر پیر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ ٹھوکریں مارتے ہیں۔ چونکہ آپ نے ٹھوکر ماری ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی بھیڑیا شیر آ گیا ہوگا، کوئی جنگل کا درندہ ہے۔

بادشاہ کو اور زیادہ غصہ آیا کہ اب تک یہ ٹانگیں پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا تھا اب اس کی زبان بھی میرے سامنے پھیل گئی ہے۔ایسی بدتہذیبی کے کلمات۔! بادشاہ نے ڈانٹ کر کہا، ارے احمق، جاہل! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہِ وقت ہوں۔اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔اتنے خزانے میرے قبضے میں ہیں۔تاجِ شاہی میرے سر پر ہے۔قباءِ شاہی میرے کندھے پر ہے۔اتنی فوجیں کھڑی ہوئی ہیں۔اتنے ملک میرے تحت میں ہیں۔اور تو میرے ساتھ گستاخی کر رہا ہے؟

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ: آپ نے اپنی بڑائی بیان کرنے کے لئے تاجِ شاہی کو پیش کیا، قباء کو پیش کیا' قلعوں کو پیش کیا' پیسوں اور روپوں کو پیش کیا' ملکوں کو پیش کیا۔ان میں سے ایک چیز بھی تو آپ کے اندر کی نہیں ہے۔یہ تو باہر کی چیزیں ہیں۔اس میں تیرا کیا کمال ہوا۔اگر چاروں طرف سونا پھیلا ہوا ہے اور تیرے دل میں جہالت کی گندگی بھری ہوئی ہے، اس میں تیرا کیا کمال نکلا؟ تو نے بہترین لباس پہن رکھا ہے اور دل جہالت و بداخلاقی سے بھرا ہوا ہے۔تو لباس سے تجھے کیا فائدہ پہنچا؟ یہ تو باہر کی چیز ہے۔تو نے جتنی چیزیں پیش کیں، قلعہ یا فوج، ان سے تو نے اپنا فخر پیش کیا۔یہ سب چیزیں تیرے باہر کی ہیں۔اپنے اندر کی بات بتلا، کہ تیرے اندر کیا کمال ہے؟ جس کی بنا پر تو دعویٰ کرتا ہے۔اگر تیری عزت پیسے سے ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے اگر کوئی پیسہ چھین کر لے جائے تو تو بے عزت ہو گیا۔عزت ختم ہو گئی۔تیری عزت اگر تاج سے ہے، تو کسی نے تاج اتار لیا، یا تو رات کو میز پر رکھ کر سویا، تو تو بے عزت ہو گیا۔اس لئے کہ تاج سر پر نہیں رہا۔لباس اتار دیا تو بے عزت ہو گیا۔اس لئے کہ عزت تو کھونٹی پر ٹنگ گئی۔تیری عزت اگر ان چیزوں پر ہے، تو یہ سب چیزیں تیرے سے باہر باہر کی ہیں۔تیرے اندر کا جوہر کون سا ہے؟ اور کہا کہ اگر تجھے فخر کا یا شیخی کا دعویٰ ہے تو یہ تاج بھی اتار، لباس بھی اتار، یہ قلعہ اور فوج بھی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ کر دریا میں میرے ساتھ کود پڑ اور وہاں اپنے کمالات دکھلا، کہ تیری ذات میں کون سا جوہر ہے، تب تو میں سمجھوں گا کہ تو باکمال ہے تو نے تو کمال میں باہر کی چیزیں پیش کر دیں۔ان میں ایک چیز بھی تیرے اندر نہیں اس میں تیرا کوئی کمال نہیں۔اب بادشاہ بے چارہ شرمندہ، کیا جواب دے اس کا، بادشاہ چپ ہو گیا۔میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا سقراط نے یہ بتلایا کہ انسان کا کمال اندر کے جوہر سے حاصل ہوتا ہے۔باہر کے جوہر سے اس کا کمال نہیں۔سونا اگر اچھا ہے، اس سے آپ کی اچھائی تو ثابت نہیں ہوگی۔کپڑا اگر بہت بے نظیر ہے، کپڑے کی خوبی ثابت ہوئی، آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوئی۔محل اور بلڈنگ اگر بہت اعلیٰ ہے، تو وہ خوب اور اچھی نکلی، لیکن آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوتی۔خوبی وہ ہے جو انسان کے نفس کے اندر پیوست ہو۔ایسا کمال ہو کہ اگر آپ زمین کے اوپر رہیں تو بھی باکمال۔زمین کے نیچے دفن کر دیا جائے، تب بھی باکمال، لباس پہن لیں، جب بھی باکمال۔لباس اتار دیں، جب بھی باکمال۔کمال اپنے اندر ہونا چاہئے۔باہر نہ ہونا چاہئے۔ورنہ یہ تو ایسا ہو جائے گا جیسے فنِ نحو کا امام سیبویہ تھا۔عربی گرامر کا بہت بڑا عالم

گزرا ہے، بڑے اونچے درجے کا امام سمجھا گیا ہے۔ جب یہ تعلیم پا تا تھا۔ تو استاذ جو تقریریں کرتے تھے، یہ نوٹ کرتا رہتا تھا۔ اور اتنی بڑی ایک کاپی اس نے بنائی کہ کئی سیر کے کاغذات تھے، جس میں تمام یاداشتیں لکھی ہوئی تھیں۔ تو طالب علمی کے زمانے کی وہ کاپیاں اور نوٹ بکیں اس کے پاس لپیٹے ہوئے رکھے تھے، اتفاق سے روٹی جو لینے گیا، تو اس دستر خوان میں جس میں روٹیاں تھیں، اسی میں اس نے وہ کاغذ بھی لپیٹ دیئے۔ کتا جو آیا، روٹی لے کر چلا، تو وہ کاغذات بھی پوٹلی میں ساتھ لے گیا۔ اب یہ چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور کتا آگے آگے جا رہا ہے۔ لوگوں نے کہا سیبویہ! کہاں جا رہا ہے؟ اور کہاں بھاگ رہا ہے؟ اس نے کہا، کتا میرا علم لے کر چلا گیا، اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا: کمبخت! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا لے کر بھاگ جائے۔ اس نے کہا، واللہ باللہ میری تو عمر بھر کی کمائی اس میں تھی، جو کتا لے جا رہا ہے۔

تو جیسے سیبویہ نے سارا علم کتے کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی چیز نہیں رہی تھی، اسی طرح اگر آدمی کے اندر کوئی کمال نہ ہو، تو اسے کتا بھی لے کر بھاگ جائے گا۔ شیر بھی لے کر بھاگ جائے گا، بھیڑیا بھی لے جائے گا، دشمن بھی لے جائے گا وہ کمال ہی کیا ہوا کہ دوسرا لوٹ کر لے جائے اور آدمی کورا رہ جائے۔ کمال وہ ہے کہ انسان کے نفس میں ہو۔ ہزار آفتیں آئیں مگر وہ باکمال رہے۔ ہزار مصیبتیں آئیں۔ دشمن چڑھ آئیں، مگر وہ باکمال بنا رہے کمال اس کے نفس میں پیوست اور چھپا ہوا ہو، وہی اصل کمال ہے۔

دل ایک عجیب کیمیا ہے...... آپ نے مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام تو سنا ہوگا، بہت بڑے عارف کامل ہیں، مثنوی لکھی ہے، جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ۔

ہست قرآن در زبان پہلوی

گویا فارسی زبان میں اللہ نے ان سے قرآن لکھوا دیا۔ بہر حال بہت بڑے تصوف کے امام گزرے ہیں۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ اس واقع سے عبرت دلانی مقصود ہے۔ اس کو آدمی اگر غور سے سنے اور تدبر کرے۔ اس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوگی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم لڑائی ہوگئی۔ رومیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم بڑے صناع، دستکار ہیں اور بہترین صنعتیں بناتے ہیں، ہمارے ہاتھ میں حکمت ہے۔ بلڈنگیں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بناتے ہیں کپڑا بھی بہتر سے بہتر بناتے ہیں، برتن وغیرہ، غرض ہر سامان بہتر بناتے ہیں۔ چینیوں نے کہا ہم سب سے زیادہ صناع ہیں۔ ہم سے بڑا دستکار اور ماہر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی، جھڑپ شروع ہوئی۔ دونوں میں سے ہر ایک کہتا ہے کہ ہم زیادہ ماہر ہیں۔ اتنی جھڑپ ہوئی کہ آخر مقدمہ بادشاہ وقت کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے کہا کہ جھگڑا کیا ہے؟ رومیوں نے کہا کہ ہم بڑے صناع، دستکار اور ماہر ہیں، چینیوں نے کہا کہ ہم زیادہ ماہر ہیں۔ بادشاہ نے کہا دعویٰ سے کام نہیں چلتا، اپنی اپنی صنعت بنا کر دکھلاؤ۔ ہم مقابلہ کر کے سمجھیں گے کہ کون زیادہ تم میں ماہر ہے۔ بادشاہ نے ایک بہت بڑا ہال بنوایا اور بیچ میں پارٹیشن

کر کے ایک دیوار کھڑی کر دی اور رومیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تو تم اپنی صنعت دکھلاؤ گویا نقاشی کرو اور چینیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تم اپنا کام دکھلاؤ، اس کے بعد میں ہم ایک دوسرے کے کام کا مقابلہ کر کے دیکھیں گے، جس کا کام اعلیٰ ہوگا، اسے ڈگری دیں گے، اسے پاس کریں گے۔

چنانچہ مکان میں ایک طرف رومیوں نے اپنی دستکاری دکھلانی شروع کی اور ایک طرف چینیوں نے۔ چینیوں نے تو یہ کیا کہ دیوار کے اوپر پلاستر کر کے رنگ برنگ پھول، بوٹے اور بیلیں ایسی بنائیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ باغ و بہار ہے، ساری دنیا کے چمن اور گلشن اسی دیوار کے اندر آ گئے ہیں۔

رومیوں نے کیا کیا؟ ایک پھول نہیں بنایا، ایک بوٹا نہیں بنایا، دیوار پر پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا اور اسے مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکا دیا کہ دیوار بالکل آئینہ بن گئی۔ جب دونوں اپنے کام سے فارغ ہوئے، تو بادشاہ کو اطلاع کی کہ ہم نے اپنی اپنی دستکاری بنالی ہے اور محنت کر کے اپنے کاموں کا نمونہ تیار کیا ہے۔ آپ دونوں کو دیکھ کر فیصلہ دیجئے کہ کس کی صنعت زیادہ اعلیٰ ہے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ دیوار بیچ میں سے ہٹا دی جائے، جو پارٹیشن کے طور پر درمیان میں قائم کی تھی۔ دیوار کا ہٹانا تھا کہ چینیوں نے جتنے بوٹے بنائے تھے وہ سب کے سب ادھر نظر آنے لگے، کیوں کہ دیواریں تو صیقل ہو چکی تھیں۔ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو پھول پتے اُدھر بنے ہوئے ہیں، وہ ادھر بھی نظر آ رہے ہیں، جو رنگ اُدھر لگے ہوئے تھے، وہ اِدھر بھی ہیں۔ بلکہ ادھر یہ زیادہ دیکھنے میں آیا کہ ادھر کے پھول پتوں میں چمک بھی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ رومیوں کی صنعت بڑھ گئی، چینی ہار گئے، اس لئے رومیوں نے اپنی صنعت بھی دکھلائی اور ان کی بنی بنائی صنعت کو چھین کر اپنا کرلیا، تو دوگنی صنعت ہوگئی۔ لہٰذا رومی کامیاب ہیں۔ ہم انہیں پاس کرتے ہیں اور چینی فیل ہوگئے۔ ان کی صنعت کوئی بڑی صنعت نہیں نکلی۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ یہ مثال دے کر کہتے ہیں کہ: اے عزیز! تو بھی رومیوں کی صنعت اختیار کر، چینیوں کی مت کر، تو اپنے دل کو مانجھ کر صیقل کر کے ایسا آئینہ بنالے کہ دنیا کے سارے نقش و نگار تجھے گھر کے اندر بیٹھے ہوئے دل کے اندر نظر آئیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ   تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ ای در دل کشا بچمن درآ

بڑے ستم کی بات ہے کہ دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو کر کبھی اس باغ میں کبھی اس چمن میں کبھی اس بوٹے پہ کبھی اس پتی پر پھر رہا ہے۔ تو اگر رومیوں کی صنعت اختیار کر کے دل کو مانجھ لے یہ ساری پھول پتیاں گھر بیٹھے تجھے دل ہی میں نظر آئیں گی اور ساری دنیا تیرے دل میں چمک اٹھے گی۔ دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت پیدا کر تو اللہ میاں کے ہاں تو بھی پاس ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دل اللہ نے بڑی عجیب کیمیا بنائی ہے۔ باہر کی چیزیں آدمی چھان کر اندر لے آئے تو

اس کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اور باہر چمن کھلے رہیں اور دل اندر سے خالی رہے۔ اس کے لئے نہ نجات کی صورت ہے نہ نفع کی صورت تو اصل چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو مانجھے، صیقل کرے، آئینہ بنائے۔

قلب کے دو دروازے...... اللہ نے انسان کے دل میں دو دروازے رکھے ہیں، ایک دروازہ کھلتا ہے، تو اسے عرش کی چیزیں نظر آتی ہیں اور ایک دروازہ کھلتا ہے تو اسے فرش کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ دل میں، آنکھ، کان، ناک کے راستہ سے جب آدمی دیکھے گا، تو ظاہری چمک دمک، پھول بوٹے سب نظر آئیں گے۔ اور ان آنکھ، کان، ناک کے دروازوں کو بند کر کے دل کے اندر کے دروازے کھولے گا، تو عرش کی چیزیں نظر آئیں گی، وہاں کے علوم اور کمالات اترنے شروع ہوں گے، تو قلب کے اندر دونوں راستے ہیں۔ اگر اوپر کے دروازے بند کر دو گے، صورتیں، شکلیں نظر پڑیں گی۔ نیچے کا دروازہ بند کر دو گے، حقیقتیں کھلنی شروع ہو جائیں گی۔ دل میں دونوں قسم کی صلاحتیں موجود ہیں۔ اعلیٰ ترین صلاحیت یہ ہے کہ آدمی اوپر کی چیز کو جذب کرے، علم خداوندی کو، کمالات کو، معرفت خداوندی کو، اخلاق ربانی کو اور ملائکہ کی صفات کو جذب کرے، تو صحیح معنی میں کامل انسان اور کامل بشر بنے گا۔

مولانا رومی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اندر کی صنعت پیدا کرو۔ باہر کی صنعت کے اوپر فریفتہ ہونا مت سیکھو، باہر کی چیزیں بھی اگر لو گے، وہ بھی جبھی کام دیں گی۔ جب اندر کچھ جوہر موجود ہو اور اگر اندر خالی ہے، تو باہر کی چیزیں نفع نہیں دے سکتیں۔ اس واسطے اپنے دل کو صاف کر کے اسی طرف آنا پڑے گا۔

علم روشنی اور غلبہ کا ذریعہ ہے...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ایسی ہی بنیادی چیز کا ذکر فرمایا ہے کہ: جس سے انسان کا اندرون روشن ہو، قلب میں روشنی اور آراستگی پیدا ہو۔ آپ نے فرمایا: ''اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' سارے انسان تباہ و برباد ہونے والے، سب ہلاک ہو جانے والے ہیں، اگر بچیں گے تو اہل علم بچ سکتے ہیں، یعنی جہالت میں انسان کی نجات نہیں ہے۔ علم میں انسان کی نجات ہے، دنیا کا علم ہو، یا دین کا علم ہو، علم ہی سے راستہ نظر پڑ سکتا ہے۔ جہالت سے راستہ نظر نہیں پڑتا۔ جہالت فی الحقیقت ایک اندھیری ہے اور علم فی الحقیقت ایک چاندنا ہے تو چاندنے میں راستہ نظر پڑا کرتا ہے، اندھیرے میں راہیں نظر نہیں پڑتیں، جہالت میں نہ دنیا کی بھلائی سامنے آ سکتی ہے نہ آخرت کی بھلائی۔

آج دنیا بھی اگر سجی ہوئی ہے اور آراستہ ہے، تو وہ بھی انسان کے علم کی وجہ سے سج رہی ہے اگر آخرت درست ہے، وہ بھی انسان کے علم ہی کی وجہ سے درست ہے۔ آج یہ آپ کا شہر جگمگا رہا ہے، لاکھوں قمقمے بجلی کے روشن ہیں، شہر میں چاندنا ہے۔ کوٹھیاں اور بنگلے روشن ہیں۔ چاندنا آپ کے علم کا ہے، بجلی کا نہیں ہے۔ اگر آپ علم وسائنس کی قوتیں استعمال نہ کرتے۔ تو نہ قمقمہ بنتا، نہ بجلی اور قمقمہ نہ ہوتا تو یہ گھر اور شہر روشن نہ ہوتا۔ علم نے قمقمہ بنایا، بجلی کو دریافت کیا اور علم نے یہ صناعیاں کیں، اس کی وجہ سے روشنی ہوئی۔ تو درحقیقت یہ علم کا چاندنا پھیلا ہوا ہے، اگر انسانوں میں جہالت ہوتی، فن سائنس کو نہ جانتے، یہ چاندنا سامنے نہ آتا۔ یہ چھت میں آپ کو جو چمک نظر

آ رہی ہے۔ یہ آپ کے علم کی چمک ہے، بجلی کی نہیں ہے۔ بجلی تو خود آپ کے علم سے آئی ہے۔

جہالت ذریعہ مغلوبیت ہے...... یہی علم کی قوت ہے جو انسان کو اونچا بناتی ہے۔ اور دنیا کے اوپر غالب کرتی ہے۔ اگر جہالت ہو تو آدمی مغلوب ہو جاتا ہے۔ زمین بیچاری علم نہیں رکھتی، رات دن جوتیوں میں پامال ہے، جانور علم نہیں رکھتے، رات دن آپ کی غلامی میں مبتلا ہیں کسی جانور کے کندھے پر آپ نے ہل رکھا ہے، اس سے کھیتی باڑی کرا رہے ہیں، کسی جانور کی پشت پر زین کس رکھا ہے اور انسان سوار ہوا پھر رہا ہے۔ گھوڑا طاقت میں انسان سے چوگنی طاقت رکھتا ہے۔ مگر انسان کے آگے دبا ہوا ہے اس لئے کہ غریب کے پاس علم کی قوت نہیں۔ اور یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے جانوروں کو علم نہیں دیا، عقل نہیں دی۔ اگر کہیں گھوڑے اور بیل میں عقل آ جاتی اور انسان اس پر زین کسنے لگتا، گھوڑا کہتا کہ ٹھہر جایئے، پہلے دلیل سے ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سوار ہونے کا حق ہے۔ میں کیوں نا آپ پر سوار ہو جاؤں؟ اور میں کیوں نہ زین کس دوں؟ تو دو گھنٹے تو مناظرہ ہوتا۔ معلوم نہیں بحث میں کون جیتتا۔ کون ہارتا، نہ سواری ہوتی، نہ کھیتی باڑی ہوتی۔ تو شکر کرو کہ اللہ نے انہیں جاہل بنایا اور انہیں عقل نہیں دی۔

اس سے اتنی بات بھی معلوم ہوئی کہ کہیں جہالت بھی نفع دیتی ہے، محض علم ہی نفع نہیں دیتا۔ اگر دنیا میں جاہل نہ ہوں تو غلامی کرنے والا کوئی نہ ہو اور جب غلام کوئی نہ ہو، تو آقا کی آقائی کیسے کام دے گی؟ لیڈروں کی لیڈری جبھی چلتی ہے۔ جب پبلک جاہل ہو۔ اگر سارے پڑھے لکھے عالم بن جائیں تو لیڈر کام نہیں کر سکتا۔ بے چارے لیڈروں کی عزت تبھی بنتی ہے، جب پبلک میں جہالت ہو۔ تو جانوروں سے فائدہ جبھی اٹھایا جا سکتا ہے جب جانوروں کے اندر عقل وشعور نہ ہو۔ ان میں شعور ہوتا، تو نہ کھیتی ہوتی، نہ سواری ہوتی، نہ حشم و خدم ہوتا۔ بہرحال ان تمام چیزوں پر انسان نے غلبہ پایا ہے، وہ بدن کی طاقت سے نہیں پایا۔ بدن میں تو طاقت میں گھوڑا، بیل ہم سے زیادہ ہے، وہ غلبہ علم اور عقل کی طاقت سے پا رکھا ہے۔

بچپن میں ہم نے ایک حکایت عورتوں سے سنی تھی، واللہ اعلم قصہ واقعی ہے یا فرضی۔ واقعہ اگر فرضی بھی ہو تو مثال دینے اور عبرت پکڑنے کے لئے کافی ہے۔ وہ قصہ ہم نے یہ سنا تھا اپنی ماں بہنوں سے جو انہوں نے نصیحت کے لئے سنایا تھا کہ ایک شیر کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ دیکھو بیٹا! ہر ایک سے ملنا، ہر ایک کے پاس جانا۔ اس انسان کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، اگر کہیں اس کے پاس چلے گئے تو تم خطا اٹھاؤ گے، مصیبت میں مبتلا ہو گے، وہ شیر صاحب جو سارے جنگل کے بادشاہ تھے، انتقال فرما گئے۔ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے "یعنی شیر کا بچہ" ولی عہد بنے۔

شیر کا بچہ تجربہ نہیں رکھتا تھا، جوان ہوا، مگر عقل تو آتے آتے ہی آتی ہے۔ کیسی بھی عقل ہو، جانور ہونے کی یا انسان ہونے کی ہو، عمر گزرنے کے بعد آتی ہے۔ بچہ ہر ایک کا ناتجربہ کار ہوتا ہے، جانور کا ہو یا انسان کا ہو۔ تو شیر کے بچے کا بچپن تھا باپ تو اٹھ گیا، شیر کا انتقال ہو گیا۔ اس شیر کے بچے نے کہا کہ میرے باپ نے کہا تھا کہ تو انسان

کے پاس مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، دیکھنا تو چاہئے انسان ہوتا کیا ہے؟ اور میرا باپ بہت ڈر رہا تھا، میرا باپ تو سارے جنگل کا بادشاہ تھا، اتنی طاقت والا تھا، وہ بھی ڈر رہا تھا، انسان معلوم نہیں کوئی دس گز لانبا ہوگا، بیس گز کا ہوگا، کیا چیز ہوگی انسان؟ دیکھنا تو چاہئے، تو جو پاس کے حالی حوالی تھے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو بڑوں کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔ باپ نے کہا کہ انسان کے پاس بھی مت جانا، یہ بڑی ظالم چیز ہے، تم ارادہ مت کرو، کہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اس نے کہا نہیں بھائی کم سے کم ایک دفعہ دیکھنا تو چاہئے کہ یہ انسان کیا چیز ہے۔

باپ کی نصیحت نہیں مانی اور انسان کو دیکھنے کی خاطر چلے۔ اتفاق سے سب سے پہلے گھوڑے پر نظر پڑی کہ چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہا ہے۔ شیر کے بچے نے سمجھا کہ یہی انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ باپ تو ڈیڑھ گز لانبا تھا اور یہ تو بہت ڈیل ڈول کا ہے، میرا باپ جو ڈرتا تھا، یہ اس سے دوگنا چوگنا ہے واقعی ٹھیک ڈرتا تھا۔ تو گھوڑے کے قریب جا کے ڈرتے ڈرتے اس نے کہا کہ جناب ہی کا نام انسان ہے؟ گھوڑے نے کہا کس ظالم کا نام لیا۔ میرے سامنے انسان کا نام مت لینا' وہ تو بڑی ظالم چیز ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ میں بہت ڈیل ڈول کا ہوں مگر انسان میری کمر پر زین کستا ہے، اس پر سوار ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا ہے۔ میری پیٹھ پر کوڑے پڑتے ہیں۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہوں، انسان ہے کہ مارتے مارتے باز نہیں آتا۔ تو سب چیزوں کا ذکر کرنا مگر اس ظالم انسان کا نام مت لینا، یہ بڑی مصیبت کی چیز ہے۔ شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! انسان کتنے ڈیل ڈول کا ہوگا۔ یہ ایسا لانبا چوڑا جانور، یہ بھی انسان سے ڈر رہا ہے اور میرا باپ بھی ڈرتے ڈرتے مر گیا، کیا چیز ہوگی انسان؟ اور آگے چلے تو اتفاق سے اونٹ نظر پڑا۔ اس نے کہا یہ ہوگا انسان۔ کوئی کل ہی سیدھی نہیں۔ گردن ادھر کو جا رہی ہے، کمر ادھر کو جا رہی ہے۔ ٹانگیں ادھر کو نکل رہی ہیں۔ بس یہی انسان ہوگا۔ یہ تو گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے۔ اس نے قریب جا کر اونٹ سے کہا، کیا آپ ہی کا نام انسان ہے؟

اس نے کہا ارے: "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ" کس ظالم چیز کا نام لے دیا۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے، اس کا نام میرے سامنے مت لینا، اس واسطے کہ میں تو اکیلا ہوں۔ میرے علاوہ میرے سوسو بھائی بند اور ناک میں نکیل، جو آگے جا رہا ہے۔ اس کی دم میں پچھلے کی نکیل بندھی ہوتی ہے اس طرح سوسو کی قطاریں ہوتی ہیں اور انسان کا ایک بچہ ہمیں ہنکاتا ہے ہم گڑگڑاتے ہیں بل بلاتے ہیں مگر ایک بچہ ہنکا کر لے جاتا ہے سو اونٹ کی بھی ایک انسان کے آگے نہیں چلتی۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ اس کا نام میرے سامنے مت لینا۔ شیر کے بچے نے کہا، یا اللہ! کتنی بڑی چیز ہوگا۔ یہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا، یہ بھی ڈر رہا ہے، گھوڑے نے تو اپنی مصیبت بیان کی۔ اس نے تو اپنی برادری کی مصیبت بیان کی کہ سو اونٹ مل جائیں، تب بھی انسان کے ایک بچے سے عاجز ہیں۔ پھر یہ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی نظر پڑ گیا، اس نے کہا یہ انسان ہوگا، اس لئے کہ اچھے خاصے چار ستونوں پہ بلڈنگ بنی ہوئی ہے۔ چھت پڑی ہوئی ہے۔ اس پر ایک بڑا حوضہ رکھا ہوا ہے۔ یہ انسان ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے جا کر کہا، کہ جناب ہی کا

نام انسان ہے؟ آپ ہی کو آدمی کہتے ہیں۔

اس نے کہا، ارے "اَستَغفِرُ اللہ" کس مصیبت کا نام لے لیا، میرے سامنے اس کا نام مت لے، یہ بڑی ظالم چیز ہے، میرے ڈیل ڈول پر مت جانا، قد و قامت میرا اونچا نظر آ رہا ہے کہ ایک عمارت سی کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ایک انسان کا بچہ میری پشت پر سوار ہوتا ہے، لوہے کا ہنٹر اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ذرا میں چیخا، اس نے میرے سر پر لوہے کا ہنٹر مارا، میں چنگھاڑتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ گھوڑے کے منہ میں تو لگام بھی ہوتی ہے۔ میرے سر پر بے لگام ہی سوار ہوتا ہے، تو نہ لگام، نہ نکیل، مگر انسان کے سامنے میں مجبور ہوں۔ شیر نے کہا، یا اللہ! انسان کیا چیز ہوگی، جو ملتا ہے ڈرتے ڈرتے ملتا ہے، جو ملا وہ کانپ رہا ہے کہ انسان بڑی ظالم چیز ہے۔

آگے چلا تو اتفاق سے ایک بڑھئی کا بچہ دس برس کا، وہ ایک بڑا بھاری شہتیر چیر رہا تھا اور بہت بڑا آرہ اس میں ڈال رکھا تھا، اسے چیرے جا رہا تھا اور جتنا وہ چیر چکا تھا، اس میں ایک کھونٹی ڈال دی تھی، تاکہ اوپر نیچے نہ ہل سکے۔ تو شیر کو یہ وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان بھی ہو سکتا ہے، وہ دیکھ کر آیا تھا، اونٹ کو گھوڑے کو اور ہاتھی کو اور سب کو دیکھا کہ انسان سے ڈر رہے ہیں۔ تو وہ اس بچے سے تھوڑا ہی ڈر سکتے ہیں۔ اسے وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان ہوگا۔

مگر تحقیق کے لئے اس سے پوچھا کہ انسان کہاں ملے گا؟ بڑھئی نے کہا کہ انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا اچھا تو تو انسان ہے؟ آدھ گز کا اتنا سا بچہ؟ کہا جی ہاں، انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا: "لاحول ولا قوۃ" میرا باپ بڑا بے وقوف تھا، جو تجھ سے ڈر رہا تھا، میں ایک چپت میں تیرا کام تمام کر دوں گا اور شیر نے یہ کہہ کر اٹھایا پنجہ۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا کہ یہ تو شیر ہے۔ اب موت آ گئی۔ اگر اس نے ایک طمانچہ بھی مار دیا، میں تو ختم ہو جاؤں گا، تو تدبیر سے کام کرنا چاہئے، بڑھئی کے بچے نے کہا کہ آپ تو جنگل کے بادشاہ ہیں، میں کیا چیز ہوں آپ کے آگے۔ آپ بڑی طاقت والے۔ مگر ایک کام ہے جو میں نہیں کر سکتا، آپ ہی جیسا طاقت ور کر سکتا ہے اگر آپ اس کام کو انجام دے دیں؟

شیر نے کہا، ہاں بتلاؤ، کیا کام ہے؟ کہا یہ شہتیر جو میں نے چیرا ہے بڑی مصیبت سے اسے چیرتے چیرتے یہاں تک لایا ہوں۔ اوپر میں نے کھونٹی لگا رکھی ہے۔ اب وہ کھونٹی مجھ سے نکلتی نہیں، آپ اگر اس میں ہاتھ ڈال کے یہ کھونٹی نکال دیں، تو بڑا کام ہوگا۔ اس نے کہا یہ کونسا بڑا کام ہے، میں ابھی نکالتا ہوں۔ تو شیر نے دونوں ہاتھ اس میں دیئے، بڑھئی کے بچے نے چپکے سے وہ کھونٹی نکال دی، دونوں پھٹے برابر ہوئے تو شیر صاحب پھنس گئے؟ اور چیں چیں کر رہے ہیں، نکلا جاتا نہیں اور وہ بڑھئی کا بچہ کھڑا ہوا ہنس رہا ہے۔ دیکھ لیا انسان کو؟ اب وہ شیر ہے کہ پھنس رہا ہے، نہ نکل سکتا ہے نہ جا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر ان دونوں پھٹوں کے اندر پھنس گئے وہ کھونٹی نکل گئی اور بڑھئی کے بچے نے ہنسنا شروع کیا۔ اس وقت شیر کے بچے نے کہا کہ واقعی جو اپنے ماں باپ کی نصیحت نہیں مانتا، وہ اسی ذلت و خواری کا شکار بنتا ہے۔ گویا عورتوں نے ہمیں یہ قصہ عبرت دلانے کے لئے سنایا تھا کہ اپنے بڑوں کی نصیحت

ماننی چاہئے۔ جو اس نصیحت کے خلاف کرتا ہے، وہ یوں ذلت میں مبتلا ہوتا ہے اور مصیبت کا شکار ہوتا ہے۔

مجھے اس سے یہ سنانا مقصود ہے کہ بڑھئی کے اتنے سے بچے نے جو شیر پر قابو پایا۔ اور ہاتھیوں پر قابو پایا، اونٹوں اور گھوڑوں پر قابو پایا، وہ بدن کی طاقت سے قابو نہیں پایا۔ بدن کی طاقت اونٹ کی انسان سے زیادہ ہے۔ اگر اونٹ بلا ارادہ انسان پر گر پڑے تو انسان پس کر رہ جائے، چکنا چور ہو جائے۔ ہاتھی اگر کسی انسان پر آ پڑے، تو انسان تو بے چارہ پس کے رہ جائے۔ کچھ بھی طاقت نہیں۔ تو بدن کی طاقت سے انسان غالب نہیں آیا۔ علم اور عقل کی طاقت سے غالب آیا ہے۔ وہ طاقت آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ وہ دل میں رہتی ہے۔ انسان کی انسانیت فی الحقیقت اس طاقت میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن ہمارا بہت ڈیل ڈول کا ہو جائے، پہلوان بن جائیں اور اندر عقل نہ ہو، ہم غلبہ نہیں پا سکتے، انسان کا غلبہ تو علم وعقل اور فضل وکمال سے ہے۔

انسانی عقل وشعور کی قوت...... یہ جو ساری دنیا عاجز ہے۔ شیر نے بھی کہا کہ انسان کا نام مت لو، بھیڑیے نے بھی کہا، یہ اس کی عقل سے ڈر رہے تھے، بدن سے نہیں ڈر رہے تھے، آج یہ مشینیں چل رہی ہیں۔ مشین لگا دی اور پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھر پس پس کر اس میں چونا بن رہے ہیں۔ تو نہ پہاڑ کی پیش چلتی ہے، نہ درختوں کی پیش چلتی ہے۔ ساری چیزیں کٹ رہی ہیں دنیا ہے کہ پسی جا رہی ہے، انسان کے آگے عاجز ہے، انسان کھڑا ہوا ہے، کہیں چکی بنا دی کہیں مشین بنا دی۔ زمین کے خزانے انسان نے نکال نکال کے استعمال کئے اور زمین بے چاری چوں نہیں کر سکتی۔ اب آپ کے افریقہ میں جگہ جگہ سونے کی کانیں ہیں۔ ہزار فٹ گہرے غار کھود کر گویا انسان نے زمین کا جگر نکال لیا، مگر زمین کچھ بھی نہیں بول سکتی۔ سونا اس کا نکال باہر کیا۔ چاندی اسکی نکالی، ہیرے اس کے نکال ڈالے۔ انسان کے آگے سب چیزیں عاجز ہیں اور یہ تصرف کر رہا ہے، یہ بدن کا تصرف نہیں، یہ علم وعقل کا تصرف ہے۔ تو سائنس انسان کے بدن سے نہیں، انسان کے دماغ سے پیدا ہوئی، عقل سے نکلی، دنیا میں جتنی سجاوٹ ہے جتنی زینت اور آرائش ہے، وہ انسان کے علم کی ہے۔ آخرت جتنی منور ہوگی، وہ انسان کے علم سے منور ہوگی، عمل سے منور ہوگی۔ بدن کے ڈیل ڈول سے منور نہیں ہوگی۔

امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام...... حدیث میں ہے کہ: معراج کی شب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہنچے ہیں تو ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے، جس کو بیت المعمور کہتے ہیں۔ انسان کا قبلہ مکہ میں ہے، جس کو بیت اللہ اور کعبہ محترمہ کہتے ہیں۔ اس میں آپ لوگ طواف وسجدے کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ استقبال قبلہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے۔ فرشتے اس میں طواف کرتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ روزانہ ستر ہزار فرشتہ طواف کرتا ہے اور آج جنہوں نے طواف کیا ہے اب ابدالآباد تک انہیں نوبت نہیں آئے گی، اگلے دن پھر ستر ہزار، اس سے اگلے دن پھر ستر ہزار ابد تک اسی طرح نئے نئے ستر ہزار آتے رہیں گے، اور طواف کرتے رہیں گے، پھر چھٹے آسمان

میں اس کی سیدھ میں دوسرا قبلہ ہے۔ چھٹے آسمان کے فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ پانچویں آسمان میں اس کی سیدھ میں اور قبلہ ہے، اس کا وہاں کے لوگ۔ غرض ساتوں آسمانوں میں اوپر نیچے ایک سیدھ میں قبلے ہیں۔ حدیث میں ہے اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر ڈالا جائے، تو ٹھیک بیت اللہ الکریم کی چھت پر آ کر گرے گا، اس سیدھ میں ہے۔ اصل میں قبلہ یہ محل اور مکان ہے، عمارت قبلہ نہیں ہے اگر عمارت نہ بھی رہے۔ معاذ اللہ اس کو ڈھا دیا جائے، نماز جب بھی ادھر ہی کو منہ کر کے پڑھنی پڑے گی۔ اس واسطے کہ قبلہ ان پتھروں کا، یا اس مکان کا نام نہیں ہے، بلکہ اس موضع اور محل کا ہے، جہاں وہ عمارت بنی ہوئی ہے اور ساتویں زمین سے لے کر ساتویں آسمان تک ایک ہے، وہی قبلہ ہے۔ وہ ایک کلی ہے جس کے اردگرد ساتوں آسمان اور زمینیں گھوم رہی ہیں۔

اسی لئے اگر آپ فضا میں جائیں، پچاس ہزار نہیں پچاس لاکھ فٹ بلندی پر جائیں، تب بھی رخ ادھر ہی کو کرنا پڑے گا، کیونکہ قبلہ کی فضا یہاں سے آسمانوں تک ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک لاکھ میل اوپر پہنچ کر آپ نیچے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے۔ سامنے رخ کریں گے، کیونکہ نیچے سے اوپر تک وہ ایک کیل ہے جو درحقیقت اوپر تک چلی گئی ہے۔ وہی کعبہ محترم ہے۔ اس محل اور مقام کا نام کعبہ ہے، عمارت کا نام نہیں ہے۔ تو فرشتوں کا کعبہ ساتویں آسمان پر ہے۔ چھٹے آسمان والوں کا قبلہ چھٹے آسمان پر ہے، پانچویں والوں کا پانچویں پر، اسی طرح سے قبلے ہیں۔

اسی طرح جو یہ زمین پر قبلہ ہے، اس کی سیدھ میں نچلی زمین پر بھی قبلہ ہے۔ اس کے سیدھ میں اس کے نیچے کی زمین پر۔ سات زمینیں ہیں، سات آسمان ہیں۔ تو نیچے سے اوپر تک قبلہ ہے۔ بہر حال ساتویں آسمان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی، جو بیت المعمور کی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ جگہ غالباً اس لئے دی گئی کیونکہ دنیا میں انہوں نے بیت اللہ الکریم کی تعمیر کی ہے۔ تو جیسا عمل تھا، ویسی جزا سامنے آئی۔ ساتویں آسمان پر بیٹھنے کے لئے بھی انہیں بیت اللہ دیا گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ: ''اَلْجَنَّةُ قِيْعَانٌ'' جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے۔ ① اس میں کوئی چیز بنی ہوئی نہیں، جو بھی محلات اور باغات ہوں، وہ تمہارے لئے کچھ نہیں۔ تم جب کوئی عمل کرو گے۔ تمہیں جب ہی ان محلات کا استحقاق پیدا ہوگا۔ تم اپنی جنت خود بناؤ گے، بنی بنائی جنت تمہاری نہیں ہے، خود تمہیں بنانی پڑے گی، جیسے عمل کرو گے، ویسا ہی وہاں ثمرہ مرتب ہو جائے گا، جیسی نیکی کر کے بھیجو گے، ویسی ہی وہاں جزاء مہیا ہو جائے گی۔ تو تم یہاں بیٹھ کر جنت بناؤ، جب جا کے تمہارا مقام جنت میں ہوگا۔ تم نے کچھ عمل نہ کیا اور تم یہ امید لگائے بیٹھے رہے کہ

① الجامع للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل التسبیح.... ج: ۱۱ ص ۳۶۵، رقم: ۳۳۸۴. حدیث حسن ہے، دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۱ ص: ۲۰۴ رقم: ۱۰۵.

جنت میں محلات ملیں گے، تم نے بنائے ہی نہیں، تو ملیں گے کہاں سے؟ تم خود تعمیر کرو گے، جب تمہیں ملیں گے"۔

دنیا میں ہر انسان معمار ہے...... ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف بزرگوں میں سے تھے اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ مولانا میں کچھ تھوڑی سی مجذوبیت کی شان تھی، جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ کوئی لٹک لگ گئی، کوئی بات لگ گئی، بس اسی طرف چل پڑے۔ یہ کچھ عادت تھی۔

ایک دن رات کو بیٹھے اور لٹک لگی، یہ دعا مانگنا شروع کی، کہ یا اللہ! مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ اب کیوں دے دے تین لاکھ، کا ہے کیلئے دیدے، بس کچھ نہیں۔ آدھی رات گزر گئی دعا مانگتے مانگتے۔ یا اللہ مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ مجذوب جو ٹھہرے، تو مجذوبیت میں ایک بڑ ہاتھ لگ گئی۔ اور دعا شروع کر دی۔ تین چار گھنٹے گزر گئے، رات کے دو بج گئے۔ اسی دعا مانگنے کی حالت میں بیٹھے ہی بیٹھے مولانا کو نیند آ گئی۔ تو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا محل سفید رنگ کا ہے، کئی میلوں میں چلا گیا ہے اور بالکل ایسا جیسے انڈا سفید ہوتا ہے۔ گویا اعلیٰ قسم کا وہائٹ ہال بنا ہوا ہے۔ اور اس کے اوپر دیواروں کے کناروں پر بڑے بڑے موتی لگے ہوئے ہیں، جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہیں۔ تمام محل کے اردگرد چاندنا پھیلا ہوا ہے۔ ہزاروں سورج لگے ہوئے ہیں۔ مولانا کو محل بہت پسند آیا۔ ہزاروں لوگ وہاں پھر رہے ہیں۔ مولانا نے ان سے پوچھا کہ بھائی! یہ محل کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ مولانا محمد یعقوب صاحب کا محل ہے اور یہ جنت ہے۔ اور جنت میں یہ اللہ نے انکا مکان بنایا ہے۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ اس میں داخل ہونا چاہا۔ تو دربانوں نے روک دیا کہ ابھی داخلہ کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا جب داخل ہوں گے۔ بڑا پسند آیا سبحان اللہ! بڑا عجیب محل ہے، جس کے باہر اتنی چمک دمک ہے، تو اندر کیسے کیسے سامان ہوں گے۔ ایک طرف کو جو گئے تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک موتی ندارد۔ وہ موتی ٹوٹا ہوا ہے اور وہاں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔ سارے محل کے اردگرد تو چاندنا اور روشنی اور کونے میں ایک موتی نہیں ہے، وہاں اندھیرا، مولانا نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں موتی لگایا ہی نہیں گیا، یا تھا اور نہیں رہا۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ نہیں تھا تو، ابھی ٹوٹا ہے۔ کیوں ٹوٹ گیا؟ کہا کہ: مولانا محمد یعقوب صاحب اللہ تعالیٰ سے تین لاکھ روپے مانگ رہے تھے، تو حکم ہوا کہ محل کا ایک موتی توڑ کے بھیج دو، یہ تین لاکھ سے زیادہ قیمت کا ہے۔ تو وہ توڑ کر بھیج دیا گیا۔

اب مولانا کی آنکھ کھلی۔ اب دوسری دعا مانگنا شروع کی یا اللہ! مجھے نہ تین لاکھ چاہئے نہ تین ہزار چاہئے نہ تین سو چاہئے۔ اگر میری جنت کے محل کی اینٹیں توڑ توڑ کر میرے دنیا کے مکان کی تعمیر ہوئی تو میری آخرت تو ویران ہو جائے گی۔ مجھے یہاں نہیں چاہئے میں تو وہیں لوں گا۔ اب یہ دعا شروع کر دی کئی گھنٹے اسی میں لگ گئے کہ مجھے تین لاکھ نہیں چاہئے میں نہیں لینا چاہتا پھر آنکھ لگی۔ دیکھا تو پھر وہی محل ہے۔ اب جو کنارے پہ گئے تو وہ موتی لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مولانا نے مانگتے مانگتے یہ عرض کر دیا کہ اس وقت یہ مجھے نہیں چاہئے۔ موتی پھر لگا دیا گیا۔ مجھے یہ

بات اس پر یاد آ گئی کہ جنت کی تعمیر تو ہم کرتے ہیں۔ اگر ہم تعمیر نہ کریں۔ وہاں اندھیرا پڑا رہے گا۔ بلاشبہ اللہ نے جنت میں بڑی بڑی نعمتیں بنائی ہیں۔ مگر ہمارے حق میں کچھ نہیں جب تک ہم کچھ کر کے نہ جائیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ زمین میں سونا بھی ہے چاندی بھی ہے۔ مگر آپ کے حق میں کچھ بھی نہیں جب تک محنت کر کے مشین نہ لگائیں۔ مشین لگاؤ پھر نکالو سونا ایک شخص گھر میں بیٹھا رہے چاہے ساری زمین میں سونا بھرا ہوا ہو اس کے لئے کچھ نہیں۔ یہ تو کہا جائے گا کہ افریقہ سونے سے بھر پور ہے مگر ملے گا اسے جو محنت کرے گا یہ نہیں کہہ سکتے کہ افریقہ میں سونا نہیں۔ تو جنت میں سونے اور چاندی کے محلات ہیں مگر ملیں گے تب جب آپ یہاں محنت کریں گے۔

حدیث میں ہے کہ: جنت میں ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے۔ ملائکہ اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ تعمیر کرتے کرتے ایک دم تعمیر رک جاتی ہے۔ دوسرے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم تعمیر کر رہے تھے رک کیوں گئے؟ وہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں عمل کر رہا تھا ہم اس کے لئے مکان بنا رہے تھے اس نے عمل کرنا چھوڑ دیا۔ میٹریل بھیجنا چھوڑ دیا ہم نے تعمیر روک دی۔ تو درحقیقت جنت کی تعمیر آپ یہاں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ہر انسان معمار ہے۔ کوئی دنیا میں بیٹھ کر جہنم بنا رہا ہے کوئی جنت بنا رہا ہے۔ اپنی اپنی محنت کر رہا ہیں۔ مگر جو کچھ کرے گا اسی کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ تو مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ دعا روک دی اور کہا کہ: مجھے وہ موتی نہیں چاہئے۔ اس واسطے کہ اگر میری آخرت دنیا میں مل گئی آخرت میں کچھ نہیں رہے گا۔ تو اصل چیز محنت اور کمال ہے وہ ہوگا تو وہاں ملے گا ورنہ نہیں۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہہ دینا کہ اَلْجَنَّةُ قِيْعَانٌ جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے، اس میں تمہارے لئے کوئی چیز نہیں۔ جتنا کرلو گے، وہ تمہارے لئے ہو جائے گا، ورنہ اس میں کچھ نہیں۔ تو جو کچھ آدمی کو ملتا ہے، اپنی محنت سے ملتا ہے، تمنائیں کرنے سے نہیں ملتا۔ دنیا کو دارالکسب بنایا گیا ہے، جو محنت اٹھائے گا، وہ پالے گا۔ اگر آپ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ کر محنت نہ کریں، آپ پیسے لے کر گھر نہیں آ سکتے۔ اگر کاشت کار کھیت پر جا کر محنت نہ کرے، تو چار دانے لے کر اپنے گھر نہیں آ سکتا۔ اگر ایک صناع محنت نہ کرے، برتن نہ بنائے، بازار میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ کیونکہ دنیا تو محنت کی جگہ ہے، جو کرے گا، وہ پائے گا۔ جو نہیں کرے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔

سب سے زیادہ محنت طلب، ایمان کا علم ہے...... سب سے بڑی چیز جو انسان کے لئے محنت طلب ہے وہ علم ہے۔ علم ہی سے دنیا میں اور آخرت میں بھی چاندنا ہے۔ سائنس کا علم ہوگا، تو دنیا سجے گی۔ ایمان کا علم ہوگا، تو آخرت سجے گی۔ دنیا کا سجانا بھی ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مگر بھائی! اس کو اگر سجاؤ گے بھی، تو ایک دن ختم ہو جائے گی، اس لئے اگر سارا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا، یہ تو ہاتھ سے چھننے والی ہے، تو پھر سرمایہ اس چیز میں کیوں نہ لگایا جائے، جو باقی رہنے والی ہے۔ بقدر ضرورت اس میں لگاؤ۔ بقایا سرمایہ اس میں لگاؤ جس کی ابدالآباد تک ضرورت ہے۔

کیسی حکمت کی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی۔فرمایا:''اِعْمَلْ لِلدُّنْیَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا. وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِیْهَا'' ① ''دنیا کے لئے اتنی محنت کرو، جتنا دنیا میں رہنا ہے۔آخرت کے لئے اتنی محنت کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے''۔دنیا میں رہنا ہے پچاس برس، چالیس برس، دس بیس برس، آخرت میں ابدالآباد تک کے لئے رہنا ہے، تو کم سے کم وہاں کی محنت زیادہ ہونی چاہئے۔یہ ہم نہیں کہتے کہ آپ یہاں کے لئے کچھ نہ کریں۔نہیں یہاں کے لئے آپ سب کچھ کریں۔رہنے کے لئے گھر بھی بنائیں، کپڑا بھی بنائیں، کھائیں بھی، مگر سارا سرمایہ اسی میں نہ لگائیں۔کچھ سرمایہ آگے کے لئے بھی چھوڑیں۔کرنا دھرنا تو وہاں ہے سب کچھ، اس واسطے جب تک وہاں کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوگی، وہاں کا کام نہیں بنے گا۔اور وہاں کی سب سے بنیادی چیز علم ہے۔جب تک وہ قلب کے اندر نہیں ہوگا، چاندنا نہیں پیدا ہوسکتا۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ.'' ''سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں، تباہ ہوجانے والے ہیں، مگر علم والے بچیں گے''۔

جو اہل علم ہیں ان کے لئے نجات ہے۔جہالت کے ساتھ نجات نہیں ہے۔جاہل کو بھی اگر نجات ملتی ہے، تو کسی عالم کے ساتھ لگ کر ملتی ہے۔اگر مزدور کو بھی کچھ ملے گا تو وہ کسی سرمایہ والے سے ملے گا۔جب اس کی نجات بنے گی۔سرمایہ دار وہ ہے جو اپنے علم اور قابلیت سے دکان پر بیٹھ کر لاکھوں روپے کی کمائی کر رہا ہے۔وہ اپنے علم کے زور سے پل رہا ہے۔جو بے چارے علم نہیں رکھتے، وہ اس کے ساتھ لگ گئے ہیں، تو ہزار پانچ سو کی روزی اس کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔مگر انجام یہی نکلا کہ ان کی سمجھداری اور قابلیت سے دولت پیدا ہوئی ہے، جہالت سے پیدا نہیں ہوئی۔دنیا کی بات ہو یا آخرت کی، دونوں چیزیں ہیں علم سے متعلق۔تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ''تمام انسان ہلاک ہونے والے ہیں، علم والے بچیں گے''۔

علمِ محض کارآمد نہیں...... مگر علم والے بھی غرّہ نہ کریں، علم والے بھی ناز نہ کریں کہ بس ہمارے لئے تو نجات ہے، نہیں۔دوسرا جملہ بھی فرمایا:''وَالْعَالِمُوْنَ کُلُّهُمْ هَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ.'' ''علم والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔بچیں گے وہ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں''۔

اگر عمل نہ ہو، تو علم محض کوئی کارآمد چیز نہیں ہے، بلکہ اور زیادہ وبال بن جاتا ہے۔علم جب کارآمد بنتا ہے، جب اس کا استعمال کیا جائے، اس کو عمل میں لایا جائے۔علم محفوظ بھی جبھی رہتا ہے جب عمل میں آئے۔اگر آپ ایک علم سیکھ لیں، لیکن استعمال میں نہ لائیں، چند دن کے بعد بھول جائیں گے۔کام کے اندر لاتے رہیں، وہ ذہن کے اندر حاضر رہے گا، محفوظ رہے گا۔ہم تو اپنا تجربہ آپ سے عرض کرتے ہیں۔اور غالباً ہر طالب علم کو یہی تجربہ ہوگا کہ جن مسائل پر ہمارا عمل ہے، انکا علم محفوظ ہے اور جن مسائل پر عمل کی نوبت نہیں آتی، وہ یاد ہی نہیں رہتے۔مثلاً

① دیکھئے: تذکرۃ الموضوعات، ج: ۱، ص: ۲۰۰.

نماز کے مسائل جو ہیں، اگر آپ پوچھیں تو شاید میں فوراً بتلا دوں۔ لیکن اگر حج کے مسائل پوچھیں گے تو ذرا کتاب دیکھنی پڑے گی۔ اس لئے کہ ہر روز عمل کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ عمر میں ایک مرتبہ حج کر لیا۔ یاد ہی نہیں رہتے۔ اور اگر بیع وشراء کے مسائل پوچھیں اس میں تو شائد ایک مسئلہ بھی بے کتاب دیکھے بتانا مشکل ہوگا، اس لئے کہ خرید و فروخت کی نوبت تو کبھی آتی ہی نہیں۔ جو یہ یاد رہے کہ یہ بیع باطل ہے، یہ بیع فاسد ہے۔ یہ بیع اچھی ہے۔ یہ بیع مکروہ ہے اس لئے کہ ان مسائل پر ہمارا عمل نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کو اگر مسائل معلوم ہو جائیں۔ آپ کو نسبت عالم کے بیع وشراء کے مسائل زیادہ یاد رہیں گے۔ کیوں کہ رات دن آپ کو سابقہ پڑے گا۔ جن مسائل پر عمل ہوتا رہتا ہے، ان کا علم محفوظ رہتا ہے اور جن مسائل پر عمل نہ ہو، علم محفوظ نہیں رہتا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم محض کار آمد نہیں ہے، جب تک اس کا استعمال نہ ہو، جس پر عمل نہیں، وہ علم بیکار ہے، بلکہ وہ اور اللہ کی طرف سے زیادہ حجت بن جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: قیامت کے دن علماء کی ایک جماعت کو بلایا جائے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے، ہم نے تمہیں علم دیا اور بڑا علم دیا، بلکہ کئی کئی قسم کے علوم دیئے۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟۔ وہ عرض کریں گے، ہم نے مسائل بتائے، ہم نے نصیحت کی، ہم نے کتابیں تصنیف کیں۔ فرمایا، کیں مگر کیوں کیں؟

''لِیُقَالَ اِنَّکَ عَالِمٌ'' تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے۔ تو وہ ہوگئی۔ وہ چیز مل گئی جس کے لئے تم نے محنت کی تھی۔ مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟ اس قسم کے علماء کو گھسیٹ کر اوندھے منہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ علم ان کے کام نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ اس کے اوپر عمل نہیں تھا۔ تو علم محض بیکار ہے۔ جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو، بلکہ احادیث کے دیکھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو بے چارے بے پڑھے لکھے لوگ ہیں مگر کچھ نہ کچھ نیکی کرتے ہیں۔ ان کی نجات جلدی ہو جائے گی، علماء کی دیر سے ہوگی۔ اس واسطے کہ عالم سے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ تو یہ بات بھی جانتے تھے۔ پھر اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ یہ مسئلہ معلوم تھا، اس پر کیوں نہ عمل کیا؟ اور جو بے چارہ بے پڑھا لکھا ان پڑھ تھا، اس سے اجمالاً کہا جائے گا کہ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا حضور پڑھی تھی۔ زکوٰۃ دی تھی؟ جی ہاں دی تھی۔ اچھا جاؤ جنت میں۔ اس لئے کہ نہ زیادہ علم نہ زیادہ عمل، اس لئے زیادہ علم بھی ایک مصیبت کی چیز ہے، مواخذہ بڑھ جاتا ہے۔ ①

آپ کے سامنے کوئی بے وقوف سا سیدھا سادھا، آدمی آجائے، تو ایک آدھ بات پوچھ کے آپ کہیں گے، جاؤ چھٹی اور جو ذرا سمجھ دار ہے، جو کچھ زیادہ بولتا ہے، اس سے سوالات بھی زیادہ کریں گے۔ امتحان لینے والا جب بیٹھتا ہے، اگر کوئی طالب علم سیدھا سادھا بے وقوف سا ہے، ایک دو موٹی بات پوچھی، نمبر دے دیئے، جاؤ تمہیں پاس کر دیا۔ اور اگر کوئی ذکی ہے، بولتا زیادہ ہے۔ ممتحن اس سے زیادہ سوالات کریں گے، کہ یہ بات تم نے

① الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار ج: ۱۰ ص: ۹ رقم: ۳۵۲۷۔

کیوں کہی؟ اور یہ کیوں کہی؟ اس کے نمبر مشکل سے آتے ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے کہ ''عَلَيْكُمْ بِدِيْنِ الْعَجَائِزِ'' ''بوڑھیوں کا دین اختیار کرو''۔

پرانے زمانے کی بڑی بوڑھیاں جو ہیں، وہ اپنے دین پر چل رہی ہیں، نہ ان کے دل میں شک ہے نہ شبہ، نہ زیادہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا پکا دین ہے۔ ایسا دین اختیار کرو، جس میں نہ شکوک ہوں نہ سوالات ہوں۔ جلدی سے نجات مل جائے۔ زیادہ علم وبال بن جاتا ہے، اگر اس پر عمل نہ ہوا اور اگر عمل ہوا، پھر اس میں شک نہیں کہ ترقی بھی بڑی ہے، درجات بھی بڑے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: محض علم پر غرہ مت کرو۔ علم کارآمد نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ اور اس کا استعمال نہ ہو، تو دو چیزیں فرمائی گئیں کہ آدمی کی نجات جہالت میں نہیں بلکہ علم میں ہے اور محض علم میں نہیں ہے بلکہ عمل میں ہے۔

بڑا عمل بلا اخلاص معتبر نہیں...... پھر آگے ایک بات اور ارشاد فرمائی: ''وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ'' عمل کرنے والے سب تباہ و برباد ہیں، ان کے عمل کو بھی نہیں پوچھا جائے گا۔ عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد، بچیں گے کون؟ مخلصین، جو اپنے عمل میں خلوص رکھتے ہیں، للّٰہیت رکھتے ہیں۔ دکھلاوے کے لئے عمل کرے، وہ وبال کی چیز ہے۔ شہرت پسندی کے لئے عمل کرے، وہ تباہی کی چیز ہے۔ خالص خدا کی رضا کے لئے عمل کرے، کارآمد ہوتا ہے، اسی پر انسان کی نجات ہے۔

تو فرمایا: لوگوں کی نجات شکل وصورت سے نہیں ہوگی، علم سے ہوگی۔ پھر فقط علم سے نہیں ہوگی، عمل سے ہوگی، پھر فقط عمل سے نہیں ہوگی، اخلاص سے ہوگی، للّٰہیت سے ہوگی۔ دورُخے پن سے عمل کرے کہ خدا کو بھی خوش کرلوں اور کچھ بندوں کو بھی خوش کرلوں۔ وہ عمل معتبر نہیں ہے۔ فقط اللہ کی رضا کے لئے ہو، وہی عمل معتبر ہوگا، ورنہ نہیں ہوسکتا۔ تو فرمایا کہ: ''وَالْعَامِلُوْنَ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ'' ''عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ خلوص والے بچیں گے''۔ اگر کسی عمل کی شکل وصورت بڑی ہو، لیکن اس میں اخلاص نہ ہو، تباہی کا ذریعہ ہے۔ اور چھوٹا سا عمل ہو، بالکل معمولی سا ہو، مگر خلوص اور للّٰہیت ہو، تو وہ عمل نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ حدیث میں خلوص کی تین مثالیں فرمائی گئیں اور تین ہی مثالیں حدیث میں بلا خلوص کے عمل کی فرمائی گئیں۔ اور نتائج الگ الگ۔

ابھی جیسے میں نے ایک حدیث کا جز سنایا، کہ علماء کی ایک جماعت بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ اپنا احسان جتلائیں گے کہ ہم نے تمہیں قسم قسم کے علم دیئے، تم نے کیا کیا؟ کہیں گے، ہم نے نصیحت کی۔ ہم نے درس وتدریس کیا۔ ہم نے تبلیغ کی، ہم نے تصنیف کی، فرمائیں گے، کیں مگر کیوں کی؟ ''لِيُقَالَ اِنَّكَ عَالِمٌ'' تاکہ دنیا میں شہرت ہوجائے کہ تم بڑے عالم تھے، تو فَقَدْ قِيْلَ۔ وہ شہرت ہوگئی تمہارا مقصد مل گیا۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ یہاں تمہارے لئے اب کیا ہے؟ انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔ ①

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الامارة، باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار ج: ١٠ ص: ٩ رقم: ٣٥٢٧۔

حدیث میں ہے کہ: مالداروں کی ایک جماعت بلائی جائے گی، جن کو لاکھوں کی رقم اللہ نے دی تھی۔ حق تعالیٰ احسان جتلائیں گے۔ ہم نے تمہیں لکھ پتی، کروڑ پتی بنایا، لاکھوں کا مال دیا۔ اور ایک ہی قسم کا نہیں۔ نقد الگ دیا، باغات الگ دیئے، بلڈنگیں الگ دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا۔ وہ کہیں گے، ہم نے صدقہ کیا، خیرات کیا۔ ہم نے یتیموں کو، بیواؤں کو دیا۔ فرمایا، دیا مگر کیوں؟ لِيُقَالَ اِنَّكَ جَوَّادٌ. تاکہ دنیا میں شہرت ہو کہ تم بڑے سخی داتا ہو۔ بڑے دینے والے ہو۔ تو وہ تو ہو چکی شہرت۔ ہم سے کیا چاہتے ہو؟ یہ جماعت بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈالی جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: ایک جماعت شہیدوں کی بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے ہم نے تمہارے بدنوں میں طاقت دی۔ تمہیں پہلوانی کے بدن دیئے۔ تم میں قوتیں دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟ عرض کریں گے کہ: ہم نے جہاد کیا، ہم نے جانیں لڑا دیں۔ ہم نے گردنیں کٹا دیں، خون بہا دیا۔ فرمائیں گے یہ کیا، مگر کیوں؟ لِيُقَالَ اِنَّكَ جَرِيْءٌ. تاکہ دنیا میں تمہاری شہرت ہو کہ تم بڑے بہادر ہو، تم بڑے جواں مرد تھے۔ فَقَدْ قِيْلَ وہ شہرت ہوگئی۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟ اس جماعت کو بھی اوندھے منہ یہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علم سے تبلیغ کرنا، کتنا بڑا عمل ہے، پیغمبروں کا عمل ہے، مگر اکارت ہوگیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ سخاوت کتنا بڑا عمل ہے صدقہ خیرات لاکھوں کروڑوں دیا۔ اتنا بڑا عمل ہے بے کار ہوگیا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ شہرت پسندی کا جذبہ تھا۔ جہاد کتنا بڑا عمل ہے کہ آدمی نے جان تک دیدی۔ مگر عمل مقبول نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص نہیں تھا۔ تو عمل کا ڈھانچہ کام نہیں دیتا جب تک عمل کے اندر جان نہ ہو، روح نہ ہو، روح اخلاص اور خلوص ہے اس سے عمل میں جان پیدا ہوتی ہے، اگر جان نہ ہو، تو مردہ لاش کتنی ہی موٹی ہو پہلوانوں جیسی ہو، وہ تو دفن کرنے کے قابل ہوتی ہے، کارآمد نہیں ہوتی۔ کارآمد جبھی ہے جب اس کے اندر جان اور روح ہو۔ تو عمل کی شکل کتنی ہی بڑی ہو، اگر اس میں اخلاص کی روح نہیں ہے، خلوص کی روح نہیں ہے، وہ عمل کارآمد ثابت نہیں ہوگا۔ تو بڑے بڑے اعمال کی تین مثالیں آپ نے سنیں۔ جو خلوص نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہوئے۔

چھوٹا عمل خلوص کی وجہ سے ذریعہ نجات ہے...... تین مثالیں حدیث میں چھوٹے چھوٹے اعمال کی بیان کی گئیں۔ کوئی بڑے عمل نہیں تھے۔ خلوص کی وجہ سے نجات کا ذریعہ بنے۔ حدیث میں ہے کہ: تین آدمی سفر کے لئے نکلے، چند میل دور نکلے تھے کہ زور کی بارش آئی۔ سامان کچھ پاس تھا نہیں۔ تو انہوں نے کہا بھائی بارش شدید آگئی، پہاڑ میں قریب یہ غار نظر آرہا ہے، اس میں چھپ کر بارش سے بچو، جب بارش تھم جائے گی، پھر اس غار سے اپنا سفر شروع کریں گے، تو تینوں مل کر اس کے اندر اتر گئے، وہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں بیٹھ گئے۔ حدیث میں ہے کہ: جب بارش شدید ہوئی تو اوپر سے ایک بڑی چٹان اور پتھر جو منوں وزن کا تھا۔ رڑکا، تو وہ ٹھیک اس غار کے منہ کے اوپر آکر رک گیا۔ اور غار کا منہ بند ہوگیا۔ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ تینوں نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہماری موت کا وقت آگیا ہے۔ اس لئے کہ چٹان کو ہلا نہیں سکتے۔ اس کا ہٹنا ممکن نہیں۔ کوئی صورت نہیں۔ دو وقت کا

ہمارے پاس کھانا پینا ہے۔کھاتے پیتے رہیں گے۔اس کے بعد سسک سسک کر مرنا اور جان دینا ہے۔چنانچہ مرنے کے ارادے سے بیٹھ گئے۔غم انکے دلوں پر چھا گیا، آنسو جاری۔اب بے چارے کچھ نہیں کر سکتے۔جب ایک دن گزر گیا اور وہ کھانا بھی ختم ہونے لگا اور یقین ہو گیا کہ اب ہماری موت لازمی ہے۔تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ بھئی! مرنا تو ہے ہی، کوئی تدبیر ہی کرنی چاہیئے۔دوسروں نے کہا بھئی تدبیر کر بھی کیا سکتے ہیں۔یہ تو منوں وزن کی چٹان ہے، نہ اسے ہلا سکتے ہیں، نہ اسے توڑ سکتے ہیں۔سوائے اس کے کہ مریں اور کیا کریں گے۔اس نے کہا نہیں، میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی ہے۔کم سے کم وہی کرلو۔دونوں نے کہا کہ بھئی! کیا تدبیر ہے؟ اس نے کہا مادی تدبیر تو ہے نہیں۔کہ کسی پھاوڑے سے پتھر کو توڑ دیں۔یہ تدبیر نہیں بلکہ روحانی تدبیر ہے۔اور وہ یہ کہ ہم تینوں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیں۔اگر کسی کی زندگی میں کوئی نیک عمل ایسا ہوا ہے، جس میں کامل خلوص اور للّٰہیت تھا۔اس عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔یہ تو ہم کر سکتے ہیں۔سب نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔اب باری باری سب نے اپنے اعمال پیش کرنے شروع کر دیئے۔

ایک کھڑا ہوا اور اس نے کہا اے اللہ! تو دانا اور بینا ہے، تو جانتا ہے کہ میں ایک غریب آدمی تھا۔میرے ہاتھ پلّے کوئی پیسہ نہیں تھا مگر صورت حال یہ تھی کہ میرے پاس ایک بکری تھی، اسی کے دودھ پر میرا گزر تھا۔تو میں یہ کیا کرتا تھا۔کہ میری ایک ماں تھی، بیوی تھی، چند بچے تھے۔میں بکری کا دودھ نکالتا اور رات کو سب سے پہلے دودھ اپنی ماں کے سامنے پیش کرتا کہ اس کا حق مقدم ہے۔یہ بڑی بوڑھی ہے، اس کی وجہ سے ہم میں اس کا حق مقدم ادا ہونا چاہیئے۔تو وہ دودھ اس کے سامنے پیش کرتا۔جب وہ پیٹ بھر لیتی اور دودھ بچ جاتا تو اس میں سے بچوں کو پلاتا اس میں سے بچ رہتا تو بیوی کو پلاتا اس میں سے بچ جاتا تو آخیر میں میں پیتا تھا، کبھی نہیں بچتا تھا تو میں فاقہ کر لیتا تھا، مگر ان کے حقوق کو مقدم سمجھتا تھا۔

ایک دن میں دودھ لے کر آیا۔ذرا دیر ہو گئی، تو میری ماں کی آنکھ لگ گئی۔میں اس کی پائنتیوں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا کہ جب بھی اس کی آنکھ کھلے گی، میں دودھ کا پیالہ پیش کروں گا۔بچے رو رہے تھے بلک رہے تھے، ان کا حق مقدم نہیں، ماں کا حق مقدم ہے۔میں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا۔آدھی رات کہیں اس کی آنکھ کھلی، جب کہ بچے سو چکے تھے۔آدھی رات گزر چکی تھی۔اس نے بھوک سے بیتاب ہو کر کہا کہ دودھ! میں جھٹ پیالہ لے کر پہنچا، اس نے دودھ پیا اور مجھے بڑی دعائیں دیں، جو بچا میں نے بیوی اور بچوں کو پلایا، جو کچھ بچا تو میں نے بھی پی لیا۔اے اللہ! یہ جو میں نے عمل کیا، اس میں کوئی دورخی نہیں تھی، کوئی دکھلاوا اور سناوا نہیں تھا، صرف تیری رضا کے لئے میں نے یہ عمل کیا تھا، اگر واقعی تیرے ہاں میرا یہ عمل خلوص کی وجہ سے قبول ہوا۔تو اے اللہ! اس مصیبت سے ہمیں نجات عطا فرما۔حدیث میں ہے کہ: ایک تہائی پتھر ہٹ گیا اور غار کا منہ کھل گیا۔اب دوسرا کھڑا ہوا، اس نے کہا، اے اللہ! تو جانتا ہے۔دانا بینا ہے، میں ایک مزدور قسم کا آدمی تھا، کچھ روپیہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔میرے

ایک چچا کی بیٹی تھی، جو بڑی حسین وجمیل تھی۔ مجھے اس کے ساتھ عشق پیدا ہوا۔ میں نکاح کا پیغام نہیں دے سکتا تھا، اس لئے کہ میرے ہاتھ پلے کچھ بھی پیسہ نہ تھا اور وہ ذرا بڑے گھرانے کی تھی۔ میں نے اس کے سامنے تنہائی میں جا کر اپنا مقصد پیش کیا۔

مطلب یہ تھا کہ میں بدکاری میں مبتلا ہوں۔ اس نے کہا میری ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک ہزار گنی یا ایک ہزار پونڈ کی تھیلی جب تو لا کر دے گا۔ تب میں اس بدعملی پر آمادہ ہو سکتی ہوں۔ ورنہ نہیں۔ میں نے جا کر مزدوری کی محنت کی کئی برس دن میں جا کر کوئی ایک ہزار گنی جمع کی۔ اور وہ سونے کے ٹکوں کی تھیلی بھر کر میں لے آیا، اور تنہائی میں اس عورت کو بلایا۔ اور میں نے کہا کہ تیری یہ شرط پوری کر دی اور یہ ایک ہزار گنیوں کی تھیلی سامنے موجود ہے، اب تجھے انکار کرنے کی ضرورت نہیں، اس نے کہا بے شک اب میں انکار نہیں کر سکتی، شرط پوری ہوگئی۔ میں نے پورا ارادہ کیا کہ میں بدعملی اور سیاہ کاری میں مبتلا جاؤں۔

جب میں پوری طرح آمادہ ہوا، اس عورت نے کہا اے شخص! ''اِتَّقِ اللّٰہ'' اللہ سے ڈر، یہ جو تو بدعملی کرنا چاہ رہا ہے، قیامت کے دن کھلنے والی ہے مجھے اور تجھے اللہ کے آگے جواب دینا ہے۔ خدا سے ڈر اور تقویٰ اختیار کر۔ تو میرا دل لرز گیا اور کانپ گیا۔ میں اسی وقت کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا میں نے یہ ہزار گنی چھوڑی۔ اور ہمیشہ کے لئے توبہ کرتا ہوں، میں کبھی بدی کا ارادہ نہیں کروں گا۔ تو محض تیرے ڈر کی وجہ سے اے اللہ میں چھوڑ کر چلا آیا۔ بدعملی سے بچا اور وہ ہزار گنی بھی میں نے چھوڑی، اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد سامنے نہیں تھا۔ محض تیری رضا کے لئے میں نے یہ کام کیا۔ اگر تیرے ہاں مقبول ہوا تو ہمیں نجات دے حدیث میں ہے کہ ایک تہائی پتھر اور سرک گیا۔ دو تہائی غار کا منہ کھل گیا۔ اب تیسرا کھڑا ہوا، اور اس نے کہا اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں بھی ایک غریب آدمی تھا۔ کھانے پینے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میرے ایک دوست نے سفر کا ارادہ کیا اور سو روپے میرے پاس امانت رکھوائے اور یہ کہا کہ جب میں سفر سے واپس ہوں گا، میری امانت واپس کر دینا اور تجھے اجازت ہے کہ تو میرے عدم موجودگی میں خرچ کر لینا۔ جب میں آؤں گا تو دے دینا' کیونکہ امانت کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس روپے رکھوائے جائیں، تو بعینہ انہیں روپوں کا واپس کرنا ضروری ہے۔ وہی نوٹ بعینہ واپس کرنے پڑیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ انہیں خرچ کر کے یا بدل کر نوٹ دے دے اور سو روپے پورے کر دے۔ سوائے اس کے کہ رکھوانے والا اجازت دے دے کہ تم خرچ کر سکتے ہو، جب تو آپ خرچ کر سکتے ہیں، بدلے میں نوٹ دے سکیں گے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو بعینہ اسی چیز کا واپس کرنا واجب ہے، جو آپ کے پاس رکھوائی گئی تھی۔ تو اس شخص نے سو روپے امانت رکھوائے اور ساتھ ہی اجازت دے دی، کہ تم خرچ کر سکتے ہو۔ اے اللہ! میں نے انہیں خرچ کیا، ان سو روپے سے میں نے چند بکریاں خریدیں۔ بکریوں کا دودھ بیچنا شروع کیا، تو اس کی رقم آنی شروع ہوئی۔ اس رقم سے کچھ اور بکریاں خریدیں، ان بکریوں کا دودھ بڑھا تو اور خریدیں۔ تو نقد بھی جمع ہونا شروع ہوا۔ بکریوں کا گلہ بھی

بڑھ گیا۔ اس نقد سے پھر میں نے گائے خریدی، تو گائے کا گلہ بڑھنا شروع ہوا، اور بڑھا تو میں نے اونٹ خریدے غرض گائے، بیل، بکری، اونٹ اور بہت سا سامان جمع ہو گیا۔

پھر میں نے کچھ جائیداد خریدی، کھیت خریدے، باغات خریدے، اس سے لاکھوں روپے کی آمدنی شروع ہوگئی۔ جب دس پندرہ برس گزر گئے، تو لاکھوں روپے میرے پاس جمع ہو گئے، تو اس شخص نے کہا بھائی میرا سو روپیہ واپس کرو۔ تو میں بجائے اس کے کہ سو روپیہ دے دیتا، میں نے ساری تجوریاں پیش کیں، سارے جانور پیش کئے، سارے باغات پیش کئے، کہ یہ ہے تیری امانت، اس نے کہا کہ میری امانت تو سو روپے تھی۔ یہ لاکھوں روپے تو نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ لاکھوں روپے ان سو روپے سے ہی بنے ہیں۔ یہ لاکھوں روپے بھی تیرے ہی ہیں۔ اس لئے کہ سو روپیہ تیرا تھا۔ اس نے کہا نہیں مجھے سو چاہئے۔ لاکھوں نہیں چاہئے۔ میں نے کہا یہ لاکھوں بھی تیرے ہی ہیں۔ آخر میں نے اس کو قبضہ دلا دیا۔ اور ساری بلڈنگیں، سارے باغات اور سارے چوپائے سپرد کر دیئے۔ اور میں پھر وہی بھک منگا بن گیا۔ پھر وہی فاقہ مستی ہوگئی۔ ایک پائی میرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اے اللہ! میں نے یہ عمل تیری رضا کے لئے کیا۔ میں نے اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا۔ اگر یہ عمل تیرے ہاں مقبول ہے تو ہمیں نجات دے۔ حدیث میں ہے کہ جو ایک تہائی چٹان رہ گئی تھی وہ بھی سرک گئی، غار کا پورا منہ کھل گیا اور انہیں نجات ہوئی۔ یہ باہر آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

دیکھئے سخاوت، تبلیغ، شہادت اور علم پڑھانے جیسا عمل بے کار ہو گیا۔ جہنم سے نہیں بچا سکا۔ اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے اعمال کہ ماں کا حق ادا کیا۔ وہ تو فرض، واجب ہے، ادا کرنا ہی ہے۔ اسی طرح زنا کاری سے بچ گیا، وہ تو اس کا فرض ہے زنا سے بچنا، اس نے کوئی بڑا کام نہیں کیا، اسی طرح سے امانت سپرد کر دی، اس کے فرائض میں تھا کہ امانت سپرد کرتا۔ کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے اعمال تھے مگر خلوص سے کئے تو دنیا میں نجات کا سبب بن گئے اور اللہ کے ہاں مقبولیت کا سبب بن گئے۔

اللہ اگر عمل قبول نہ کرتا۔ تو یہ نجات نہ ہوتی، اور چٹان نہ ہٹتی۔ تو خدا کے ہاں بھی مقبولیت ہوئی، دنیا میں بھی نجات ملی، حالانکہ عمل بالکل حقیر سے تھے لیکن خلوص تھا۔ اور وہ بڑے بڑے تین اعمال تھے۔ وہ جہنم سے نہیں بچا سکے، اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا۔ تو اصل بنیادی چیز اخلاص ہے۔ خلوص سے جو عمل ہوگا، وہی اللہ کے ہاں قبول ہوگا، اس لئے کہ خلوص عمل کی روح ہے۔ کسی چیز کے ڈھانچے کی قیمت نہیں ہوتی، اس کی جان کی قیمت ہوتی ہے۔ لاش کی قیمت نہیں، جاندار میں جان کی قیمت ہوتی ہے۔

تو عمل کا ڈھانچہ مقبول نہیں۔ کتنا ہی بنا سنوار کے نماز پڑھیں۔ نیت یہ ہو کہ لوگ ہمیں نمازی کہیں، وہ کوئی مقبول چیز نہیں ہے۔ منہ پر مار دینے کے قابل ہے۔ بنیادی اور اساسی چیز انسان کے لئے خلوص، للّٰہیت اور اخلاص ہے اللہ کی رضا کے لئے عمل کرنا ہے، مخلوق کے دکھاوے کے لئے عمل کرنا یہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ اس لئے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ'' ''عمل کرنے والے بھی سب کے سب برباد ہیں۔ خلوص والے بچیں گے، جنہوں نے سچائی اور اخلاص سے عمل کیا''۔

گویا تین بنیادی چیزیں فرمائی گئیں کہ: ''اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ'' انسان ہلاکت اور بربادی سے بچنے والے نہیں ہیں مگر علم والے بچیں گے۔ علم اور عمل ہی نجات کا ذریعہ بنے گا، خلوص، للّٰہیت نجات کا ذریعہ بنے گا۔ گویا علم بھی ہو، اس کے ساتھ عمل ہو، اس کے ساتھ اخلاص بھی ہو، تب جا کے نجات کا ثمرہ پیدا ہوگا۔

غرور اخلاص کو ختم کر دیتا ہے..... مگر اخلاص کے بعد ایک چیز اور ارشاد فرمائی: ''وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ'' خلوص ہو تو آدمی غرہ نہ کرے، اترائے نہیں کہ میں نے بڑے خلوص سے عمل کیا، مرتے دم تک خطرہ ہے، جب خاتمہ اخلاص پر ہو جائے، تب اطمینان کرے کہ اب نجات ہوئی ہے۔ ورنہ خاتمہ سے پہلے پہلے اگر کہیں اتراہٹ پیدا کی، کہیں دل میں کبر و غرور آ گیا کہ میں بڑا مخلص ہوں سارا عمل ختم ہو جائے گا۔ سب عمل نامقبول ہو جائے گا۔ تو اخلاص اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک انسان کے اندر خدا پر بھروسہ کرنے کا جذبہ نہ ہو۔ ناز و اتراہٹ نہ ہو، کبر اور غرور نہ ہو کہ میں کوئی چیز ہوں۔ میں نے کوئی عمل کیا۔

مدارِ نجات، صرف اللہ کا فضل ہے..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ ارشاد فرمایا، حدیث میں آتا ہے کہ: بنی اسرائیل میں ایک شخص عابد زاہد تھا۔ رات دن اللہ کی یاد میں لگا رہتا تھا۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں عمل کرتا ہوں، محنت بھی کرتا ہوں، مگر بہر حال بیوی ہے، بچے ہیں، کھیتی باڑی ہے، کمائی ہے، کچھ نہ کچھ اس میں بھی وقت لگانا پڑتا ہے، کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ سارے جھگڑے ختم ہوں اور چوبیس گھنٹے میں خدا ہی کی یاد میں لگا رہوں۔ اس زمانے کی شریعتوں میں یہ بات جائز تھی؛ اب کی شریعت میں یہ بات جائز نہیں ہے، اس زمانے میں یہ جائز تھا کہ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہاڑ کی چٹان پر چلا جائے، تو اس شخص نے رہبانیت اختیار کی اور وہ یہ کہ بیوی بچے اور مال و دولت کو چھوڑ کر سمندر کے بیچ میں پہاڑ کا ایک ٹیلہ تھا، وہاں جا کے چھپر ڈالا، کہ یہاں بیٹھ کے اللہ کی عبادت کروں گا، اب یہاں نہ بیوی سامنے ہوگی، نہ اولاد و تجارت نہ دکان سامنے ہوگی۔ بس میں ہمہ تن اپنے خدا کو یاد کروں گا، وہاں بیٹھ گیا۔

اب کھانے پینے کے لئے تو چاہئے؟ اللہ نے اس کے لئے یہ سامان کیا کہ اسی کڑوے سمندر میں ٹیلے کے اوپر نہایت میٹھا چشمہ نکل آیا اور اسی سے ٹھنڈا پانی بہہ پڑا۔ اور اسی ٹیلہ کے اوپر انار کا درخت اگا یا، جس کو بڑے بڑے انار لگنے لگے اور بڑا میٹھا اور بہت ہی قوی قسم کا انار۔ اس عابد کا کام یہ تھا کہ روز ایک انار کھا لیتا اور ایک کٹورا پانی کا پی لیتا۔ اور صبح و شام اللہ کے ذکر میں مصروف۔ نہ رات کو سونا، نہ دن کو آرام کرنا بس دن بھی اور رات بھی اللہ کے ذکر میں مصروف پانچ سو برس اس عابد نے اسی طرح گزارے ہیں کہ ایک کٹورا پانی کا اور ایک انار روز اور چوبیس گھنٹے خدا کی یاد اور عبادت۔ مرتے وقت اس نے اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ! جب تو نے مجھے عمر بھر عبادت کی توفیق دی اور پانچ سو

برس عبادت میں لگے‘ میری موت سجدہ کی حالت میں ہو اور میرے بدن کو تو قیامت تک محفوظ رکھ تا کہ میں قیامت تک تیرا سجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں۔ بقیہ زمانہ بھی گویا میں نماز ہی میں لگا ہوا رہوں۔ جب میرا بدن قیامت تک سجدہ میں پڑا ہوا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے میں قیامت تک نماز ہی پڑھتا رہا۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ عین سجدہ کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں آج تک اس کا بدن اس پہاڑ کے ٹیلے پر محفوظ ہے۔ لیکن اللہ نے اس کے اردگرد بڑے بڑے گنجان درخت پیدا کر دیئے ہیں۔ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہیبت پیدا کر دی، اس لئے کہ اگر لوگ جاتے اور دیکھتے کہ ایک مردہ سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو بڑا فتنہ پھیل جاتا، کوئی پوجا پاٹ شروع کر دیتا، کوئی اس کی عبادت شروع کر دیتا۔ اللہ نے مخلوق کو بچانے کے لئے بڑے بڑے عظیم درخت اگا دیئے، ان کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا اور اندھیرے سے وہاں ایک ہیبت پیدا ہوئی، تو لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، اس لئے نگاہوں سے وہ قصہ اوجھل ہے۔ اس طرح سے اس عابد نے پانچ سو برس گزارے ہیں۔

حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ: مرنے کے بعد اس کی پیشی ہوئی حق تعالیٰ کے سامنے، حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے میں نے تجھے اپنے فضل و کرم سے بخشا اور ملائکہ سے فرمایا کہ: جنت کے اعلیٰ مقامات میں اس کا نام لکھ دو اور اس کا داخلہ جنت میں منظور ہے اور جہنم سے اس کو بچا دیا گیا۔

اس عابد کے دل میں خطرہ یہ پیدا ہوا کہ پانچ سو برس تو میں نے محنت کی، بیوی، بچوں کو چھوڑا، شہر کو چھوڑا، اور اب بھی انہوں نے اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا۔ کم سے کم میری تسلی کے لئے ہی کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دی۔ اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا۔ گویا میں نے ان کے سامنے کچھ کیا ہی نہیں، یہ ایک وسوسہ پیدا ہوا، عقیدہ تو کفر کا تھا، لیکن وہ عقیدے سے بری تھا مگر دل میں ایک خطرہ گزرا، ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ① وہ تو دلوں کی کھٹک سے واقف ہے۔ وہ تو دلوں کے خطروں کو جانتے ہیں۔ جوں ہی یہ وسوسہ پیدا ہوا، حق تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا۔ بجائے جنت میں لے جانے کے اس عابد کو جہنم کی طرف لے جاؤ، جہنم میں داخل نہیں کرنا، مگر اتنی دور کھڑا کر دو کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو، وہاں لے جایا گیا۔ ایک دم جو جہنم کی طرف سے گرم ہوا اور لپٹ آئی ہے اور اس کے بدن کو لگی‘ تو تمام بدن میں کانٹے پڑ گئے۔ پیاس پیاس چلانا شروع کیا، جیسے معلوم ہو کہ اس کا اندر بالکل خشک ہو گیا، تری باقی نہیں رہی، جہنم میں جل کر تو کیا کیفیت ہوتی، اتنی دوری پر ہے، جہنم کی لو اور اک لپٹ لگی۔ سارا بدن لکڑی کی طرح خشک ہو گیا۔

حدیث میں ہے ایک ہاتھ نمایاں ہوا، جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا کہ اے خدا کے بندے! یہ پانی مجھے دینا، وہ ہاتھ پیچھے ہٹ گیا، آواز یہ آئی، کہنے والا تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، پانی تو ملے گا، مگر اس کی قیمت ہے۔ مفت نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے کہا کیا قیمت ہے؟ آواز یہ آئی جس نے پانچ سو برس خالص عبادت کی

ہو۔ وہ عبادت اگر کوئی دے تو اس کے بدلے میں ایک کٹورا مل سکتا ہے، ورنہ مفت نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے کہا میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے اور بڑی خالص عبادت ہے۔ اس میں کوئی نفاق شامل نہیں۔ اس نے وہ پانچ سو برس کی عبادت پیش کی، بدلے میں کٹورا مل گیا، پی کر ذرا اس کے دم میں دم آیا۔

حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا: اس کو واپس لاؤ، واپس لایا گیا، اس کی پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے بندے! تیرے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت تو ادا ہوگئی اور وہ قیمت تو نے از خود تجویز کی کہ پانچ سو برس عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی ہے۔ وہ تو ہم دے چکے، معاملہ برابر ہوگیا، تو نے پانچ سو برس کی عبادت دی۔ ہم نے ایک کٹورا پلایا اور وہ تو نے خود تجویز کی کہ یہ قیمت ہے ہم نے نہیں کہا تھا۔ لہٰذا اس سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اب حساب دے، وہ جو دنیا میں تو نے لاکھوں کٹورے پانچ سو برس میں پیئے، ان کے بدلے میں کیا عبادت لے آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ یہ تو دانہ اور پانی تھا۔ وہ جو تو نے ہماری ہوا کے ذریعے سانس لئے ہیں، جس سے تیری زندگی قائم تھی۔ اب ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے، اور وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے نور پیدا کیا تھا، جس سے تو اچھے اور برے کو دیکھتا تھا۔ ایک ایک تار نگاہ کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ کتنی عبادتیں کیں اور وہ جو تیرے دل میں توفیق و ارادہ پیدا کیا تھا اس کے بدلہ کیا لے کر آیا؟۔ تو طاقت ہم نے دی۔ ارادہ تیرے قلب میں ہم نے پیدا کیا۔ توفیق ہم نے دی، دانہ پانی ہم نے پیدا کیا، تیرے بدن میں جان اور ہمت ہم نے پیدا کی، اور پھر بھی تجھے دعویٰ ہے کہ میں نے کچھ کیا، اور میرے کئے کے بدلے میں کچھ ملے۔ ارے یہ تو ہمارا کیا کرایا ہے، تو نے کیا کیا جس کے بدلے میں تو چاہتا ہے تجھے صلہ ملے۔ لیکن اگر کیا تو اب حساب دے، یہ عابد تھرا گیا، اور کہا: ''یا اللہ! بے شک نجات آپ کے فضل سے ہوتی ہے، کسی کے عمل سے نہیں ہوتی۔

عمل کی یہ قدر و قیمت ہے کہ پانچ سو برس کی عبادت کرے، تو وہ ایک کٹورا پانی کے برابر بھی نہیں''۔ اور وہ بھی اللہ کا فضل ہے، اگر وہ توفیق نہ دے، آدمی عبادت نہیں کر سکتا۔ بدن میں جان بھی ہو سب کچھ ہو، مگر دل میں ارادہ ہی پیدا نہ ہو۔ ارادہ بھی ہو مگر ہمت نہ ہو، کسل اور سستی بڑھ جائے، وہی توفیق دیتے ہیں، وہی ہمت دیتے ہیں، تب تو آپ سجدے کرتے ہیں۔ وہ ہمت نہ دیں تو سجدہ کیسے کریں؟ تو غرہ اور اترانے کے کیا معنی؟ ادھر کی ہی ساری چیزیں ہیں۔

ہر عمل توفیقِ خُداوندی سے ہی وجود میں آتا ہے...... وہ ایک شخص کا قصہ مشہور ہے کہ ایک لکھ پتی آدمی تھا، اس کے ہاں ایک ملازم تھا، تو وہ لکھ پتی، ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہیں تھا، کہ نماز کہتے کسے ہیں۔ اور یہ جو بوڑھا ملازم تھا، وہ بڑا پکا نمازی، فرض ہی نہیں سنتیں بھی، اور پچاسوں نفل پڑھ کے بھی دم نہ

لے۔ یہ رات دن کوستے کہ اسے جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، جب دیکھو بوڑھے کو تو نماز۔ یہ نماز ہی نماز کا رہ گیا۔ ایک دن اس کے آقا بازار میں کچھ سامان لینے گئے اور ملازم سے کہا کہ ہمارے ساتھ چل۔ بوڑھا ساتھ ہوگیا۔ راستے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ بوڑھے نے کہا صاحب؟ میں تو جاتا ہوں مسجد میں نماز پڑھنے، آقا نے چلا کر کہا کہ کمبخت جب دیکھو نماز، جب دیکھو نماز، ارے تجھے اور بھی کوئی کام نماز کے سوا رہ گیا۔ خیر کہا کہ جا اچھا، جلدی سے پڑھ کے آ۔ اب آقا صاحب مسجد کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہوگئے۔ وہ مسجد میں داخل ہوا، جماعت کے ساتھ نیت باندھ لی، جب فرض پڑھ لئے، تو اس کے بعد سنتیں پڑھیں، اب یہ آقا کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا جی گھبرایا۔ کہ جلدی آئے۔ بازار کا وقت نکلا جارہا ہے، سنتیں پڑھ کے اس نے اوابین کی نیت باندھ لی۔ اب ان کے دل میں غصہ اور گھٹن، کہ اس کمبخت کو اس کی بھی خبر نہیں۔ اب خدا جانے کب تک نفلیں پڑھے گا، جب اس نے نفلوں سے سلام پھیرا، اس نے دوسری نفلوں کی نیت باندھنے کا ارادہ کیا، تو انہوں نے چلا کر کہا ارے کمبخت! آتا کیوں نہیں۔؟ تو جواب میں بوڑھے نے کہا کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر بوڑھے نے پھر نیت باندھ لی۔ یہ گھٹ کے کھڑے ہوئے، اب بڑے خشوع وخضوع سے دو رکعتیں پڑھیں۔ پانچ دس منٹ میں سلام پھیرا، اور بوڑھا پھر نیت باندھنے کے لئے کھڑا ہونے لگا تو، انہوں نے چلا کے کہا کہ او منحوس! آتا کیوں نہیں؟ کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کر پھر نیت باندھ لی، اب یہ اور غم وغصہ میں، جب چھ پوری ہوگئیں اور پھر لگا کھڑا ہونے۔ تو انہوں نے کہا کہ آتا کیوں نہیں؟ کہ جی آنے نہیں دیتے کہ بھئی کون نہیں آنے دیتا؟ کہ جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے۔ تمہیں وہاں روک رکھا، مجھے یہاں روک رکھا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا اسے پڑھنے نہیں دیتے۔ اس کو دھتکار دی ہے۔ بندہ کی کیا مجال تھی وہ اللہ سے گریز کرے اور بھاگے۔ اور جب توفیق دیتے ہیں، تو آپ کا نہ بھی جی چاہے تب بھی آپ نماز پڑھیں گے، تب بھی آپ روزہ رکھیں گے، وہ دل میں اترائے نہیں، کہ میں نے کچھ کیا ہے، شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی، ہزاروں بندے ہیں جنہیں توفیق نہیں ہوتی توفیق ملنا یہ خود مستقل نعمت ہے، اللہ نے توفیق دے دی۔

تو اصل یہی ہے کہ نجات ہمارے عمل سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوگی، مگر بھئی اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج سے نماز صفر ہو جائے کہ نجات اللہ کے فضل سے ہوگی۔ مگر فضل کی علامت یہ ہے کہ آپ عمل کررہے ہیں۔ تو یہ عمل کرنا علامت ہے کہ فضل آپ کی طرف متوجہ ہے، اگر عمل نہ کرتے، تو یہ اسکی علامت تھی کہ فضلِ خداوندی آپ کی طرف متوجہ نہیں ہے، تو عمل ضروری ہے، کیونکہ وہ فضلِ خدا کی علامت ہے، نجات بے شک اللہ کے فضل سے ہوگی۔

جو عبادات ہی صُورۃً ہو تو اس پر اترانا کیا؟...... غرض تعلیم یہ دی گئی کہ کتنا بھی عمل کرے، مگر غرہ نہ کرے، ناز نہ کرے کہ میں نے کیا ہے، شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی، میرے اندر کچھ کرنے کی قوت نہیں تھی،

ملائکہ علیہم السلام قیامت کے دن یوں کہتے ہوئے ہوں گے ”مَاعَبَدْنٰکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَ مَا عَرَفْنٰکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ“. ”اے اللہ! ہم نے کوئی حق تیری عبادت کا ادا نہیں کیا۔ ہم تجھے پہچان بھی نہیں سکے جیسے پہچاننے کا حق ہے“۔

ہم اب تک جاہل اور لاعلم ہیں، تیرے کمالات کا اب تک بھی ہم اندازہ نہیں کر پائے۔ تیری ذات بہت بڑی ہے۔ تو فرشتے جو لاکھوں برس سے عبادت کر رہے ہیں، وہ بھی یہ کہیں گے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکے ہم ایک پچاس، ساٹھ برس کی عمر لے کر آئے اور اس میں بھی چودہ برس لڑکپن کے نکال دو، اس میں عبادت فرض نہیں ہوتی، اور اخیر کے دس پندرہ برس بڑھاپے کے نکال دو، جس میں آدمی معطل ہو جاتا ہے، مشکل سے تیس پینتیس برس رہ جاتے ہیں، وہ اس میں بھی سارے اوقات نماز کے نہیں ہیں، چوبیس گھنٹے میں سے بھی ہم بیس گھنٹے سونے اور اپنا مال و دولت کمانے میں لگاتے ہیں، گھنٹہ سوا گھنٹہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے میں لگاتے ہیں اور اس پر بھی لگے غرہ کرنے کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے، یہ بڑی نادانی کی بات ہوگی، ہم تو کچھ بھی نہ کر سکے، جب لاکھوں برس عبادت کرنے والے ملائکہ جو نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ سوتے ہیں، نہ غفلت میں ہیں، وہ کہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکے، اور ہماری یہ چند منٹ کی عبادت، اور عبادت بھی حقیقی نہیں، عبادت کی صورت بنا رکھی ہیں، کھڑے ہوئے اللہ کے سامنے ہیں، اور دل میں وسوسے بھرے ہوئے ہیں، دل میں کہیں یہ ہے کہ جلدی سے دو رکعت پوری ہوں، تو دکان پہ جاؤں، سودا بیچنے کا حرج ہو رہا ہے، تاکہ جلدی پہنچ جاتا، آج شنبہ کا دن ہے، گاہک زیادہ آئیں گے، یہ نماز جلد سے جلد ختم ہو، تاکہ پیسے کماؤں، یہ صورت اور تصویر عبادت کی ہم نے بنائی، عبادت نہیں ہے، یہ تو اللہ کا فضل اور انعام ہے کہ وہ اسے عبادت مان لیں، ورنہ یہ عبادت اس قابل نہیں کہ اسے قبولیت نصیب ہو، یہ محض ان کا فضل ہے، اور ان کا مفتی فتویٰ دے دے کہ ہاں ہوگئی نماز، تو اترانے کا، اور غرہ و غرور کا کوئی موقع نہیں ہے، بلکہ جتنا بھی ہو، آدمی شکر ادا کرے کہ میرے پروردگار نے مجھے توفیق دے دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لَنْ يُنْجِيَ اَحَدَ كُمْ عَمَلُهُ. ”تم میں سے کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ اللہ کا فضل نجات دلائے گا“۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا: ”وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ.“ ”یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائیگا؟ فرمایا: ”لَا اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ.“ ”مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ ہی کا فضل دستگیری نہ کرے“۔ اور مجھے اپنی رحمت میں نہ ڈھانپ لے، میرا عمل بھی نجات دلانے والا نہیں ہے۔ فضلِ خداوندی ہی نجات دلانے والا ہے۔ ①

حق تعالیٰ کے سامنے اعترافِ قصور ہی شکر ہے...... جب انبیاء علیہم السلام بلکہ سردارِ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام جن سے بڑھ کر مخلوقات میں کوئی نہیں ہے، فرمائیں کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ اللہ ہی کا فضل

① الصحيح للبخاری، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ص: ۱۱۹.

نجات دلائے گا، تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنے کسی عمل پر ناز کرنے لگیں، ہم کسی عمل پر اترائیں کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ بندہ کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کر کے کہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا، خدا کی ثناء خوانی یہی ہے ہم سے کچھ ثناء خوانی ممکن نہیں، نہ ہم اللہ کی پوری تعریف کر سکتے ہیں، نہ پوری پوری عبادت کر سکتے ہیں، نہ ہم شکر ہی ادا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ عاجزی اور قصور کا اعتراف کریں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا﴾ ① واقعی انبیاء علیہم السلام ہی اللہ کے کلام کو سمجھتے ہیں، جیسے سمجھنے کا حق ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے اللہ! شکر میں ضرور ادا کروں گا، جب آپ ارشاد فرما رہے ہیں، میرا فرض ہے کہ میں تعمیل کروں، اور میں ضرور ادا کروں گا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ شکر کس طرح سے ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، تو اس کے ادا کرنے کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے، تو توفیق ایک نعمت بن گئی، پھر اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہئے، ہر نعمت سے پہلے تو نعمت نکلتی ہے، شکر ادا کروں تو کس طرح، میں تو شکر کی ابتدا بھی نہیں کر سکتا آپ کے شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

جواب آیا حق تعالیٰ کی طرف سے کہ اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارا شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو یہی شکر کی ادائیگی ہے، اس کے معنی شکر ادا کرنے کے ہیں، اس لئے کہ حقیقی معنی میں کوئی ہمارا شکر ادا نہیں کر سکتا، شکر، نعمت کے مقابلے میں ہے، اور نعمتیں غیر محدود ہیں، ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور ہمارا دماغ بھی محدود، ہماری قوتیں بھی محدود، الفاظ و آواز بھی محدود، تو ہم شکر ادا کریں گے، تو اس میں حد لگی ہوئی ہوگی اور نعمتوں کی کوئی حد نہیں، تو لامحدود کا شکر محدود ادا کیسے کر سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ اپنی ہار مان لے، قصور کا اعتراف کرے، اپنے عجز کا اقرار کرے، یہی ہے فی الحقیقت شکر کی ادائیگی کہ آدمی اپنی عاجزی مان لے، کہ میں بالکل عاجز ہوں، اللہ کے ہاں تو سب سے بڑی عبادت یہی ہے کہ اپنے نفس کا قصور مان لے، کون ہے جو اس عبادت کا حق ادا کر سکے لاکھوں برس عبادت کر کے جب ملائکہ کہیں گے ہم کچھ نہیں کر سکے ہم کیا چیز ہیں جو ہم کہیں کہ ہم نے عبادت کر لی، ہماری عبادت یہی ہے کہ جو حکم ہے اس کی پوری طرح تعمیل کر کے یوں کہیں، کہ یا اللہ! قصور ہوا ہے، ہم پوری طرح کچھ نہیں کر سکے، آپ معاف کر دیں، بس یہی ہماری عبادت ہے، یہ جبھی ہوگا، جب آخرت کا فکر چڑھا ہوا ہو، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ هَالِكُوْنَ" سب انسان تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خُلوص والے، علم والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خُلوص والے اور خُلوص والے خطرے میں ہیں جب تک خُلوص کے اوپر موت نہ ہو جائے، خاتمہ جب ایمان پر ہو جائے، جب مطمئن ہو کہ ہو گئی نجات۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے مرتے دم تک خدانخواستہ کوئی بات پیش آ جائے، دل میں ایمان نہ رہے، دل ہی ایمان سے ہٹ جائے، عمل کی توفیق چھن جائے، بہت سے لوگ دیکھے گئے ہیں کہ پوری زندگی نیکیوں میں گذاری، مرنے کا وقت آیا

① پارہ: ۲۲، سورۃ السبا، الآیۃ: ۱۳.

تو لہو ولعب اور بری باتوں میں مبتلا ہو گئے، بہت سے دیکھنے میں آئے ہیں کہ پوری زندگی تو بری باتوں میں گذاری، خاتمہ کے وقت ایسی اچھی زندگی ہوئی کہ رات دن طاعت اور عبادت، اور بہترین خاتمہ ہوا، تو آدمی غرہ نہ کرے معلوم نہیں، خاتمہ کیسے ہونے والا ہے، تو فرمایا گیا: "وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ" "مخلصین خطرہ میں ہیں"۔ خطرہ جب ٹلے گا، جب موت آجائے گی، اب اطمینان کا وقت آیا، کہ اس چیز سے نجات پاگئے۔

روحانی زندگی کے عناصرِ اربعہ..... نجات کے گویا چار اصول فرمائے گئے، ایک علم، ایک عمل، ایک اخلاص، اور ایک اپنی آخرت کی فکر، یہ چار بنیادیں ہیں، جس سے آدمیت بنتی ہے، انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے اگر انسان میں علم نہ ہو، جہالت ہو، تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے، جہالت سے نجات نہیں مل سکتی اگر علم آگیا، روشنی آگئی، مگر عمل نہیں ہے، تو گویا علم کسی کو نجات نہیں دلائے گا، بلکہ وبال بن جائے گا، اگر علم کیساتھ عمل بھی ہو، مگر عمل کیساتھ نفاق ہے، اخلاص نہیں ہے، وہ علم بھی بے کار ہے، نجات نہیں دلائے گا، اگر علم بھی ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص بھی ہے، مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے، کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں، آخرت کا خطرہ نہ ہو، وہ اخلاص بے کار ہے وہ ختم ہو گیا، چار چیزیں جمع ہوں گی، تب انسان کی انسانیت بنے گی، علم، عمل خلوص، اور فکر۔ تین چیزیں اس میں قلب کی ہیں اور ایک چیز ہاتھ پیر کی ہے، علم بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، اخلاص اور للّٰہیت کا جذبہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، آخرت کا خوف اور خطرہ یہ بھی قلب میں ہوتا ہے، ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا، ہاتھ پیر صرف عمل کرتے ہیں، دل کا عمل فی الحقیقت علم، خلوص اور تفکر ہے یہ تین چیزیں قلب میں ہوں، اور ایک باہر، تب آدمی آدمی بنے گا، اس کی نجات کا سامان ہوگا۔ یہ گویا ایسا ہے جیسے آپ کا بدن چار چیزوں سے بنا ہے، آگ، پانی، مٹی، ہوا یہ نہ ہوں تو بدن ختم ہو جائے گا، اور اگر یہ چار چیزیں نہ ہوں، تو روح ختم ہو جائے گی۔

اصل بنیادی چیز صحبت اور معیت ہے..... انسان کی حقیقی زندگی ان چار چیزوں سے ہے۔ علم درسگاہوں میں، مکاتیب میں اور علماء کے پاس ملے گا، عمل عمل کرنے والوں کی ہیئت دیکھ کر ملے گا، خلوص ملے گا، مخلصوں کی جماعت میں بیٹھ کر فکر پیدا ہوگا، متفکروں کی جماعت میں بیٹھ کر، غافل لوگوں میں رہ کر فکر نہیں پیدا ہوتا، وہ تو اور غفلت میں مبتلا کر دیں گے، بدعمل لوگوں کی صحبت ہوگی وہ تو بدعملی پیدا کریں گے عمل کہاں سے آئے گا؟ جاہلوں کی صحبت رہے گی، جہالت ملے گی عمل کہاں سے آجائے گا؟ تو سب سے بڑی بات صحبت و معیت ہے جس سے علم، عمل، اخلاص اور تفکر پیدا ہوتا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کُند ــــ صحبتِ طالح ترا طالح کُند

نیکوں اور سچوں کی صحبت اختیار کریں گے تو سچائی آئے گی بروں کی صحبت اختیار کریں گے، لہو ولعب اور کھیل کود کے جذبات پیدا ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نیک صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے عطار کی دکان، جو عطر بیچتا ہو،

کہ اس کی دکان پر جا کے آپ عطر نہیں خریدیں گے تو کم از کم خوشبو تو آ ہی جائے گی، دماغ تو معطر ہو ہی جائیگا فرحت تو پیدا ہو ہی جائیگی، اور بری صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے لوہار کی دکان، کہ کچھ بھی نہیں ہوگا، آگ کا کوئی پتنگا ہی لگ جائیگا، کچھ دھواں ہی چڑھ جائیگا، بدبو پیدا ہو جائیگی، تو کچھ تکدر، کدورت اور انقباض ہی لے کر آئیں گے، نیک لوگوں کے پاس جب جائیں گے، کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، تو ان کے ایمان کی گرمی قلب میں کچھ نہ کچھ گرمی پیدا کردے گی، اللہ کی طرف توجہ بڑھ جائے گی، کچھ آخرت کی طرف توجہ بڑھ جائیگی، کوئی کلمہ ان کی زبان سے نکلے گا، دل کی گرہیں ہی کھلتی چلی جائیں گی، عمل کا راستہ ہی صاف ہو جائیگا نیک کی صحبت میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچے گا، اور برے کی صحبت میں بیٹھ کر برائی کی طرف طبیعت چلے گی۔

اور اس دنیا میں بری صحبت جلدی اثر کرتی ہے، نیک صحبت دیر میں اثر کرتی ہے، بروں کے پاس بیٹھ کر تو اگلے ہی دن برا بن جاتا، اور نیکوں کے پاس بیٹھ کر کہیں مہینے بھر میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے، تو دنیا میں بدی جلدی اثر کرتی ہے، نیکی دیر میں اثر پیدا کرتی ہے، اس واسطے نیک صحبت آدمی کی زیادہ چاہئے، بری صحبت سے زیادہ سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے، اصل بنیادی چیز صحبت ومعیت ہے، کہ آدمی اچھا ماحول تلاش کرے، اچھے نیک لوگوں میں رہنے کا جذبہ پیدا کرے۔

اب یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ نیک لوگ علماء ہی ہوں، نیک وہ ہے، جو اللہ کے راستے پر پڑا ہو، چاہے وہ بڑا عالم نہ ہو، معمولی مسئلے جانتا ہو، مگر مخلص ہو للہیت ہو، بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں کہ علم کا تو نشان نہیں، لیکن نیکی اور تقوی اس درجہ میں بڑھا ہوا کہ بڑے بڑے علماء کو نصیب نہیں، تو بعض مرتبہ عمل کی دولت صحبت سے نصیب ہوتی ہے، صحبت یافتہ لوگ بڑے پکے دیندار ہوتے ہیں، بعضے علماء میں بھی وہ دین نہیں ہوتا جو بزرگوں سے صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتا ہے، ان کا دین مضبوط ہوتا ہے، ایسے لوگوں کی صحبت میسر ہو تو وہ کیمیا ہے، انسان کے دل میں پھر دین گھر کرلیتا ہے، اور آدمی دیندار بن جاتا ہے، تو تاکید کی گئی ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

صحبت ومعیت کی ثمرات...... حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّهٗ.'' ① ''سات قسم کے لوگ ہوں گے کہ قیامت کے دن ان کو عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ بجز اللہ کے سائے کے نہ ہوگا''۔

ان میں سے ایک کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ کون ہوں گے: ''رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ'' ''وہ دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی اور دوستی اختیار کی'' اور یہ معاہدہ کیا کہ بھائی ہم اس لئے دوستی کرتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کریں اگر نماز میں سستی کروں، تو تم مجھے کھینچ کے لے جانا، اور سزا دینا کہ خبردار! جو تو نے نماز چھوڑی اگر تم سستی اختیار کروگے، تو میں تمہیں لے جاؤں گا، اگر تم نے تلاوت قضا کی تو میں

① الصحیح للبخاری، کتاب الحدود، باب فضل من ترک الفواحش، ج:۲، ص:۷۴۔

تمہارے سر پر مسلط ہوں گا، کہ تلاوت کرو قرآن کریم کی اور میں سستی کروں تو تم، تو ہم ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کے لئے دوستی کریں گے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ان میں سے جب ایک انتقال کرے گا اور وہ اللہ کی رضا میں اور مقام کریم میں داخل ہوگا، بہشت بریں میں جائے گا، تو دعا کرے گا کہ اے اللہ! میں فلاں دوست کی دوستی کی وجہ سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوں، میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر پہنچا، اس کا خاتمہ بھی ایمان پر فرما، اس کی دعا قبول ہوگی۔ تو دونوں جنتی بنیں گے، صحبت و معیت ہی سے تو یہ بات ملی، نیک صحبت اختیار کی، دونوں کے لئے نجات کا ذریعہ ہوگئی۔

اور یہی صورت اس کے برعکس سمجھ لیجئے اگر دو آدمی اس لئے دوستی کریں کہ بھئی! سینما میں ایک ساتھ جایا کریں گے، تھیٹر میں ساتھ جایا کریں گے، فلاں برائی میں ساتھ جایا کریں گے، چار آدمیوں نے مل کے دوستی کر لی کہ چوری کیا کریں گے، لوگوں کی جیبیں کترا کریں گے، یہ بھی آپس میں دوستی ہوگئی یہ بھی صحبت ہے، مگر یہ صحبت و معیت بدعملی کے لئے ہے اس لئے اگر ایک جہنم میں جائے گا تو وہ کہے گا خدا کرے وہ پہلا دوست بھی جہنم میں آئے، اسی کی وجہ سے میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں، یہ دونوں چیزیں اپنا اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہتیں، تو علم اتنا اثر نہیں پیدا کرتا، جتنی صحبت اثر پیدا کرتی ہے، تو بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی سچا ماحول تلاش کرے، نیک لوگوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا ہو، کبھی نہ کبھی یہ چیز کارآمد ثابت ہوتی ہے، کبھی نہ کبھی اس کا اثر پڑتا ہے، بہر حال اس حدیث میں چار باتیں بتلائی گئیں، علم، عمل، اخلاص، اور فکر اس کے بغیر آدمی آدمی نہیں بنتا، اس میں جو ہر نہیں پیدا ہوتا، وہ کھاتا پیتا ایک حیوان ہوگا، خوبصورت سہی کہ اور کوئی جانور اتنا خوبصورت نہیں، جتنا انسان ہے، مگر ہے جانور، جب علم اور عمل آئے گا تو کہیں گے، اب یہ جانور نہیں، اب اس میں انسانیت آگئی، یہی انسان اور حیوان میں فرق کی چیز ہے، اس واسطے سب سے بڑی توجہ مسلم قوم کو بالخصوص تعلیم کی طرف کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ علم کا جوہر پیدا ہو، جہالت سے کوئی قوم دنیا میں آج تک نہیں پنپی، یہ ضروری نہیں ہے کہ پوری قوم مولوی بنے سب کے سب عالم بنیں، یہ نہ فرض ہے، نہ واجب، نہ لازم، لیکن یہ ہر ایک پر فرض ہے کہ اتنا علم سیکھ لے کہ اپنے دین پر چل سکے، یہ معلوم ہو جائے کہ ہم مسلمان ہیں، اور مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ اور اسلام کے کیا ارکان ہیں، جن کے کرنے سے آدمی مسلمان رہتا ہے، یہ بے شک لازم اور واجب ہے، اس کے بغیر نجات کی صورت نہیں ہے، تو سب سے بڑی چیز ادھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، کہ تعلیم عام ہو، دین کا ایک چرچا ہو، اور چرچا اس کے بغیر نہیں ہوا کرتا، کہ تعلیم عام ہو۔

ہمارے ہاں مدارس میں، جیسے ابھی مولانا صاحب نے دارالعلوم دیوبند پر یہ تبصرہ کیا، اور یہ کہ وہاں کے فضلاء نے جگہ جگہ مدارس قائم کئے، تو ہزاروں کی تعداد میں مدارس ہیں، کوئی قصبہ خالی نہیں، اور اس تقسیم ملک کے بعد سے تو تقریباً یو، پی میں کوئی بڑا گاؤں بھی خالی نہیں رہا۔ جس میں لوگوں نے مدارس قائم نہیں کر دیئے ہزاروں کی تعداد میں دیہات اور گاؤں میں مدارس ہیں، تو علم کا اور مسئلے مسائل کا ایک چرچا ہے، اور دیہات کے لوگ

چونکہ بیچارے سادہ ہوتے ہیں، کوئی چالاکی، عیاری ان میں ہوا نہیں کرتی، ان میں جب علم آتا ہے تو سیدھا سیدھا اپنا عمل کرتے ہیں، کوئی فرق اور نفاق ان میں نہیں ہوتا علم وہاں زیادہ اچھا اثر کرتا ہے، جہاں دلوں کی صفائی اور سادگی ہوتی ہے۔ تو دیہاتی اتنے مسائل جانتے ہیں کہ چھوٹا موٹا مولوی انکے سامنے چل نہیں سکتا۔ اگر ذرا مسئلہ کی غلطی کر جائے تو کہیں گے مولانا صاحب! تمہاری بات تو سر آنکھوں پر، مگر کہی بات غلط، مسئلہ تو یہ ہے، ہم نے فلاں بڑے مولوی صاحب سے سنا تھا۔ فوراً دیہاتی غلطی بتلائے گا، اور مولوی کو ماننا پڑے گا، تو وہ صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے اور دل کی سچائی کی وجہ سے بہت سے مسائل جانتے ہیں، یہ جب ہوا، جب تعلیم کا چرچا ہے، قصبوں میں، شہروں میں دیہات میں دین پھیلا ہوا ہے۔

گناہ کا جمع ہونا بُرا ہے...... عمل کی کوتاہی ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہے، کچھ مجھ میں کوتاہیاں ہیں، کچھ آپ میں غلطیاں ہیں ہر ایک کچھ نہ کچھ مبتلا ہے، مگر علم اور فکر تو صحیح رہنا چاہئے، تاکہ جب عمل کی توفیق ہو، تو ہم عمل کر گذریں، اور اگر علم ہی صحیح نہیں تو جی بھی چاہے گا عمل کو تو راستہ صحیح نہیں ملے گا، اس لئے قلب کے اندر علم رہنا چاہئے، کوتاہی اللہ معاف کرنے والا ہے، بہر حال انسان بشر ہے اور بشر بھی ایسا جو بھول چوک سے مرکب ہے، بھول بھی ہوتی ہے، نفسانیت کا مادہ اس میں ہے، غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں، گناہ بھی ہو جاتا ہے، گناہ کا علاج اللہ نے توبہ بتلایا، جب تم گناہ کرو، ہاتھ کے ہاتھ توبہ کرلو، فرمایا گیا: اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ ① گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا، تو گناہ ہو جانا کوئی جرم نہیں، یہ تو انسان میں مادہ ہے، گناہ کا جمع رہنا بُرا ہے، کہ آدمی توبہ نہ کرے، توبہ کی، تو وہ روز کا روز کھاتہ صاف ہوتا رہے گا، تو آدمی اپنا کچا چٹھا روزانہ درست کرتا رہے۔ جب ادھر سے کوئی اکاؤنٹنٹ حساب لینے والا آئے گا تو کھاتے آپ کے درست ہوں گے، آپ کہیں گے، دیکھ لیجئے اور اگر کوئی کلرک ایسا غافل ہے کہ اس کے حساب میں غلطیاں ہیں اور وہ سست پڑا ہوا ہے کہ جب اکاؤنٹنٹ نے بجائے ایک مہینہ بعد کے بیسویں دن آ کے کہا، لاؤ حساب، وہ سارا غلط پڑا ہوا تھا، اس نے اسی وقت حکم دیا، معطل یا برخواست، اس کی تنخواہ ضبط، اب حیران بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

موت کا کوئی وقت معین نہیں...... انسان کے عمل کا کھاتہ کھلا ہوا ہے، جب موت کا وقت آئے گا، اسوقت کچا چھٹا درست کرلیں گے، یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے، نہ بیمار ہونا شرط ہے، ہزاروں انسان عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں، نہ بیمار ہوئے نہ کچھ، رات دن ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی آج ہمارے سے مل رہا ہے، کل ہم سن رہے ہیں کہ اس کا انتقال ہو گیا، تو موت کیلئے بڑھاپا آنا ضروری نہیں ہے، کمزور ہونا ضروری نہیں، بڑے بڑے قوی بھی مر جاتے ہیں، جوان ہونا ضروری نہیں بچے بھی مر جاتے ہیں، تو موت بچپن میں بھی آتی ہے، جوانی میں بھی آتی ہے، بڑھاپے میں بھی آتی ہے، بیماری میں آتی ہے، بلا بیماری سے

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ج: ٢، ص: ٣٠١.

بھی آتی ہے، یہ خیال کرنا کہ مرنے کے قریب توبہ کرلوں گا۔ یہ شیطان کا محض ایک دھوکہ ہے، کسی کو کیا خبر ہے کہ موت کا وقت کب آنے والا ہے۔ اور کیا ضروری ہے کہ آدمی کے اوپر بڑھاپا آوے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے، جوان زیادہ مرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ مجمعوں میں، بازاروں میں، درباروں میں دیکھیں تو بوڑھے کم نظر پڑیں گے، جوان زیادہ نظر پڑیں گے، اگر سارے بڑھاپے کو پہنچ کر ہی مرا کرتے تو بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی، سفید ڈاڑھیاں زیادہ نظر پڑتیں، مرتے ہی نہ جب تک بڑھاپے کی عمر کو نہ پہنچتے مگر بڑھاپے کو پہنچنے ہی نہیں پاتے، پہلے ہی مر جاتے ہیں اس لئے بوڑھوں کی تعداد کم نظر پڑتی ہے، جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔

تو اس دھوکے میں رہنا کہ جب بڑھاپا آئے گا، اس وقت توبہ کرلیں گے بس اب چلنے والے ہیں، یہ غلط ہے، کیا خبر ہے کسی کو بیماری آئے نہ آئے۔ روز کا روز اپنا حساب صاف کرتے رہنا چاہئے، یہ نہ آدمی سمجھے کہ اخیر میں توبہ کروں گا، اور جب اس نے اخیر میں کہا کہ کل کروں گا، کل کو ممکن ہے یہ کہے کہ کل کروں گا، تیسری کل آئی تو اس نے کہا نہیں کل کو کروں گا، بس کل میں کل ساری عمر گذر جائے گی، موت کا فرشتہ سامنے آجائے گا، اور اس وقت توبہ کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔

حدیث میں ہے کہ: بعض لوگ ملک الموت سے کہیں گے اے ملک الموت! ذرا سا وقفہ دے دو کہ میں توبہ کرلوں فرمائیں گے ملک الموت کہ: مرے پچاسیوں قاصد تیرے پاس پہنچے، جب تو نے توبہ نہیں کی، اب میں اخیر میں آ گیا ہوں، تو تجھے توبہ کی سوجھ رہی ہے، وہ کہے گا میرے پاس تو آپ کا کوئی قاصد نہیں آیا؟ ملک الموت کہیں گے، ایک دو نہیں میں نے تو بیسیوں قاصد تیرے پاس بھیجے انہوں نے تجھے نہیں سمجھایا، وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں آیا تو ملک الموت کہیں گے تجھ پر بڑھاپا نہیں آیا؟ ارے بڑھاپا میرا ہی تو قاصد ہے جو خبر لے کر آیا تھا کہ موت کا وقت اب قریب ہے، کیا تیری ڈاڑھی اور سر میں سفید بال نہیں آئے؟ یہ سفید بال میرے ہی تو قاصد تھے بتلا رہے تھے کہ اب موت کا وقت قریب آ گیا ہے، کیا تیرے پوتے اور نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی تو قاصد تھے، جو بتلا رہے تھے کہ اب قبر میں جانے کا وقت قریب آ گیا ہے، جب اتنے قاصدوں پر بھی تو نہ سمجھا، اور توبہ نہ کی، تو میں آخری قاصد ہوں، میرے بعد کوئی قاصد آنے والا نہیں۔ اب کون سا موقع ہے توبہ کا۔؟ اب تو گذر گیا وقت، جو کچھ ہونا تھا، ہولیا۔

مقام عبرت...... میں اس لئے عرض کررہا ہوں کہ جو کچھ کرنا ہو، جلدی سے کرلے اس لئے کہ وقت کم ہے، کسی کو اپنی عمر کا پتہ نہیں، سال بھر جو ہمارے سامنے موجود تھے، آج وہ ہمارے سامنے نہیں ہیں، آج جو ہیں ان سے کیا خبر کون رہے گا کون نہیں رہیگا تو روز موت کا بازار گرم ہے آنے والے آرہے ہیں جانے والے جارہے ہیں، اس میں آدمی آنکھ بند کئے غفلت میں پڑا رہے، یہ دانش مندی کے خلاف بات ہے، روزمرہ کا قصہ سامنے گذر رہا ہے۔

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

نہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کرویا وہ کرو میں یہ کہتا ہوں جو کرنا ہو جلدی کرو، اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے، ہم میں سے کسی کی آدھی عمر گذر چکی ہے کسی کی آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے، کوئی موت کے قریب پہنچ چکا ہے، کوئی قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہے روزانہ سلسلہ آنے والوں کا، جانیوالوں کا بھی جاری ہے، آخر پھر عبرت کا کون ساوقت آئے گا، جب اتنی چیزیں دیکھ کر عبرت نہ پکڑے؟ تو کیا ملک الموت کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے گا، یا موت جب سر پر آ کھڑی ہوگی، جب عبرت پکڑے گا؟ اس لئے ابھی سے عبرت پکڑ لینی چاہئے، اور سمجھ لینا چاہئے کہ وقت آرہا ہے، اس کے لئے ہمیں کچھ کرنا ہے۔

اُخروی غذا بھی حاصل کرنی چاہئے...... اس کے لئے سب کچھ کرنے میں پہلی چیز ہے کہ اللہ کی رضا کا علم اور معرفت حاصل کرلیں، کہ وہ کن چیزوں سے خوش ہے، کن چیزوں سے ناخوش ہے، کونسا راستہ ہے جس پر چل کر اس کو خوشی ہوگی، کونسا راستہ ہے جس پر چل کر وہ ناراض ہوگا، وہ علم آپ کو شریعت سے معلوم ہوگا، وہ سائنس اور فلسفہ میں نہیں ملے گا، وہ ہیئت اور اقلیدس میں نہیں ملے گا، وہ قرآن وحدیث میں ملے گا کہ جس سے اللہ کی رضا اور نارضائی کا پتہ چلے، اس کی خوشی وناخوشی کا پتہ چلے، تو اس علم کو حاصل کیجئے جس سے آخرت میں کچھ کام چلے، اور آخرت کا دروازہ کھلے، یہ جتنی نعمتیں ہیں، یہ یہیں کے لئے آرام دہ ہیں، یہ قبر میں آرام نہیں دیں گی، ہم یہاں بہترین مسہری اور گدے، تکیے پر لیٹ جائیں مگر قبر میں آرام دینے کے لئے یہ گدے، تکئے آرام نہیں دیں گے، وہاں کی چیز اعمالِ صالحہ ہے، وہاں کا گاؤ تکیہ نیکی ہے وہاں کا گاؤ تکیہ روئی، اون اور پلاسٹک کا نہیں ہے، وہاں دوسری چیزیں ہیں، یہاں روٹی، چاول اور غذاؤں سے پیٹ بھر جائیگا، قبر میں یہ چیزیں غذا نہیں بن سکتیں وہاں عمل صالح کی غذا کام آئے گی، وہاں بستر بھی ہوگا تو عمل کا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جب میت سچا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام تھا، میرے پیغمبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو ایک منادی ندا کرے گا ''اَنْ صَدَقَ عَبْدِیْ'' بندے نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ "فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا مِّنَ الْجَنَّةِ." ① ''اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ، اس کے لئے جنت کا لباس بھی دو، اس کے لئے جنت کے دروازے بھی کھولو''۔

ہوائیں بھی اس کے لئے وہیں سے آنی چاہئیں، تو وہاں کی غذائیں اور نعمتیں دوسری ہیں، اس عالم کی دوسری ہیں جہاں اللہ نے یہاں کی غذائیں دیں، کچھ وہاں کی غذاؤں کے بھی فکر کرنے ضرورت ہے، یہاں تھوڑا بہت فکر تھا، وہاں کے لئے زیادہ فکر کی ضرورت ہے، مگر ہم نے الٹا قصہ کیا، کہ یہاں کی فکر زیادہ ہے وہاں کی ذرہ

① السنن لابی داؤد، کتاب السنة، باب فی المسئلة فی القبر، ج: ۱۲، ص: ۳۶۸. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحیح وضعیف ابی داؤد ج: ۱۰ ص: ۲۵۳ رقم: ۴۷۵۳.

برابر نہیں ہے، یہاں ہر آسائش کا خیال ہے، وہاں کی آسائش کا خیال نہیں ہے، کم سے کم تھوڑا بہت وقت کچھ ادھر بھی لگانا چاہئے، اب موت کا بھی دھیان کر لینا چاہئے، تو پہلی چیز تو علم ہے کہ اللہ کی خوشی اور ناخوشی معلوم ہو، دوسری چیز راستہ ہے جو عمل صالح ہے کہ اس راستہ پر چل کر ہم پروردگار کے قریب ہوتے جائیں، تیسری چیز قلب کے مقامات ہیں، سب سے بڑی چیز اسمیں اخلاص اور خلوص ہے، کہ قلب کی راہ ہماری درست ہو جائے اور اس سے بھی بڑی چیز فکر ہے کہ آخرت کی دھن لگی ہوئی ہے، غفلت میں آدمی نہ گذارے۔

مسلمان کو متفکر پیدا کیا گیا ہے...... مسلمان کو متفکر پیدا کیا گیا ہے، غافل پیدا نہیں کیا گیا، مسلم وہ ہے جو فکر مند ہو، ہر وقت اسے ایک فکر چڑھا ہوا ہو۔ حدیث میں ہے کہ: ''اَلْکَافِرُ یَأْکُلُ بِسَبْعَةِ اَمْعَاءٍ، وَالْمُؤْمِنُ یَأْکُلُ بِمِعٍ وَّاحِدٍ''۔① ''کافر سات انتڑیوں سے کھاتا ہے اور مؤمن ایک انتڑی سے کھاتا ہے''۔

تو مؤمن کی غذا کم ہوتی ہے، کافر کی غذا زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سائز کے دو آدمی لیں، ایک مسلم اور ایک غیر مسلم، وہ زیادہ کھائے گا، یہ کم کھائے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر کے قلب میں فکر نہیں ہے، اور مؤمن کے قلب میں آخرت کا فکر لگا ہوا ہے، کتنے سے کتنا ہی بدعمل مسلم ہوگا، جب اندر ٹٹولو گے تو کچھ نہ کچھ فکر آخرت ضرور ہوگا، لکھ پتی ہے، مگر وہ پوچھ رہا ہے، مولانا یہ چیز جائز ہے، ناجائز ہے، یہ جائز ناجائز کیوں پوچھتا ہے؟ موت کی فکر لگی ہوئی ہے جبھی تو پوچھتا ہے، اگر اسے فکر نہ ہو کیا ضرورت تھی پوچھنے کی یہ کہنا کہ یہ معاملہ میں نے کیا ہے یہ حرام تو نہیں ہے؟ ناجائز تو نہیں ہے؟ کر بھی رہا ہے، مگر فکر چڑھی ہوئی ہے، اگر فکر نہ ہوتی سوال نہ کرتا، کوئی مؤمن ایسا نہیں ہے، جس کے اندر تھوڑا بہت آخرت کا فکر نہ ہو، اور جب فکر ہوتی ہے، تو کھانا بھی کم ہو جاتا ہے، عیش بھی کم ہو جاتی ہے، یہ کتنے ہی عیش میں مبتلا ہو، لیکن اسی درجہ کا غیر مسلم لیا جائے، وہ پانچ گنے عیش میں ہوگا، یہ ایک گنے عیش میں ہے، اس لئے کہ اس کے دل میں پھر بھی ایک فکر چڑھا ہوا ہے، کہ وقت آنا ہے، حساب دینا ہے، اسے اس کا کوئی فکر نہیں۔

فکرِ آخرت کو چمکانے کی ضرورت...... تو فکر کا مادہ اللہ نے رکھا، جو ہر مؤمن کے ایمان کے ساتھ دل میں لگا ہوا ہے مگر ذرا اسے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے ایمان ہر ایک میں ہے، مگر عمل سے ذرا اسے چمکانے کی ضرورت ہے اسی طرح سے اس تفکر کو بھی چمکانے کی ضرورت ہے، فکر اس وقت تک چمکتا نہیں، جب تک خلوص نہ ہو، خلوص چلتا نہیں جب تک عمل کا جذبہ نہ ہو، عمل بنتا نہیں، جب تک علم نہ ہو، تو علم، عمل خلوص اور فکر ضروری ہے۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے عرض کیں، کہ تعلیم میں بھی بہت کوتاہی ہو رہی ہے، تعلیم کی مردوں کو اور عورتوں کو بھی ضرورت ہے، اور اس کے ساتھ اپنے عمل اور اخلاص کی، اور فکر کی بھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ چاروں چیزیں نہیں ہوں گی، تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے، تباہی ہی تباہی ہے، نجات ان چار چیزوں میں ملے گی، تو فرمایا گیا،

---

① السنن للترمذی، ابواب الاطعمة، باب ماجاء ان المؤمن یاکل فی معیً واحدٍ، ج: ۶، ص: ۴۸۶. امام ترمذی فرماتے ہیں یہ روایت حسن صحیح ہے۔

لوگ تباہ برباد ہیں بچیں گے علم والے، علم والے تباہ و برباد ہیں بچیں گے عمل والے، عمل والے تباہ و برباد ہیں، بچیں گے خلوص والے، خلوص والے تباہ و برباد ہیں بچیں گے فکر رکھنے والے، یعنی غفلت سے نجات نہیں ہوگی، ہلاکت ہوگی۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے اس حدیث کی روشنی میں عرض کیں، امید ہے کہ آپ حضرات ان باتوں پر غور کریں گے اور وقتاً فوقتاً سوچیں گے دماغ میں یہ باتیں گھومیں گی تو اس کا فکر رکھیں گے کہ کس طرح سے اس حدیث پر ہم عمل کریں، کس طرح سے ہم اپنی انسانیت کو اجاگر کریں، تو سوچتے رہنا چاہئے اور فکر رکھنا چاہئے کہ ہم عمل کا کوئی نقشہ بنائیں، ایک آدمی ایک ہی نقشہ بناتا ہے، چار مل کر بناتے ہیں، تو ذرا نقشہ اچھا کھلا بڑا بن جائیگا اور قوم مل کر بنائیگی تو بڑا بہتر نقشہ بنے گا، سارے ہی عمل میں لگ جائیں گے، اس لئے بس اللہ سے دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو مردوں اور عورتوں کو نیکی کی، عمل کی، خلوص وللّٰہیت کی اور فکر کی توفیق عطا فرماوے، دنیا میں بھی نجات عطا فرماوے، اور آخرت میں بھی نجات عطا فرماوے آمین۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰاحِمِیْنَ.

راہِ اعتدال

''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ ھُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا.وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ . صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ. ①

بزرگانِ محترم!...... پہلے اس آیت کا ترجمہ سمجھ لینا چاہئے'' اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے بندے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی کتاب یعنی قرآن مجید نازل فرمایا اس میں بعض آیات تو محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی اِتباع کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کے لئے یا ان کی تاویلیں کرنے کے لئے اور حالانکہ ان کی تاویلیں اللہ ہی جانتا ہے اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے تمام ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت حاصل نہیں کرتے مگر عقل والے''۔

(پھر دعا کی تعلیم دی گئی) اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا۔ بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت نصیب فرمائی اور اپنی طرف سے رحمت عطاء فرما۔ بے شک تو بڑا بخشنے والا ہے۔ (دوسری دعا) اے اللہ! تو تمام لوگوں کو جمع کرنے والا ہے۔ ایک ایسے دن جس میں کوئی شک نہیں بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

شانِ نزول...... یہ تو آیات کا تقریباً لفظی ترجمہ ہوا۔ ان آیات میں ایک ایسا اصول بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دین محفوظ رہے گا۔ اس کا بیان کرنا میرا مقصد ہے۔ لیکن اس سے پہلے آیات کا شانِ نزول بھی سن لیں کیونکہ شانِ نزول سے آیات کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نصاریٰ نجران کی ایک جماعت

① پارہ: ۳،سورۃ آل عمران،الآیۃ: ۷.

مدینہ منورہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مناظرہ کے لئے آئی۔ ان میں عبدالمسیح، ابوحارث، بن علقمہ تینوں موجود تھے۔ ان میں عبدالمسیح بڑا مدبر تھا اور ابوحارث بہت ذہین اور ذکی تھا۔ اس کا حافظہ بہت قوی اور علم بہت وسیع تھا تورات وانجیل پر اس کی نظر تھی۔ تمام گرجاؤں کالاٹ پادری اور اپنے مذہب کا قائد تھا۔

عقیدۂ نصاریٰ کی تردید...... ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ اور اسی مسئلہ میں وہ مناظرہ کے لئے آئے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات فرمائے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ ''اللہ تعالیٰ حَیّ یعنی خود زندہ ہے اور قَیُّوْم یعنی زندگی کو تھامنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام پر فنا آئی اور اپنی زندگی کو وہ نہ سنبھال سکے وہ دوسرے کا اِلٰہ کیسے بن سکتا ہے؟'' نیز آپ ایک لامحدود زمانہ تک خود وجود میں نہ آئے اور اِلٰہ تو وہ ہونا چاہئے جو خود موجود ہو اور ہر زمانہ میں موجود ہو۔ یعنی ازل سے ابد تک۔ تو جو ایسا نہیں وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

اور دوسری جگہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ ① یعنی حضرت عیسیٰ اور مریم علیہا السلام دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کے محتاج تھے اور جو کھانے پینے کا محتاج ہو وہ زمین کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلہ اس سے پیدا ہوتا ہے اور سورج کا بھی محتاج ہے کیونکہ غلہ کی اصلاح اس سے ہوتی ہے۔ اس لئے عناصر اربعہ حتیٰ کہ بیل اور چارہ وغیرہ نباتات کا بھی محتاج ہے اور حاجت مندی اور خدائی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت ''صَمَدْ'' ہونا بھی ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور تمام کائنات اس کی محتاج ہو۔ جب عیسائیوں سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا وہ آیات متشابہات میں چھڑ گئے اور کہنے لگے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب میں ہی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں موجود ہے۔ ﴿وَكَلِمَتُهُ﴾ و ﴿رُوحٌ مِنْهُ﴾ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جز ہیں۔ (بہر حال وہ اصل بات کا جواب نہ دے سکے، پھر آیات متشابہات کے بارے میں کلام کرنے لگے)۔

آیات کی دو اقسام...... ایسی آیات کے بارے میں کچھ تفصیل اور وضاحت ضروری ہے جو اس طرح سے ہے کہ آیات کی دو قسمیں ہیں۔ محکمہ اور متشابہہ۔ محکمہ وہ آیت ہے جو بیّن المراد ہوں اور اس کا معنی پوری طرح واضح ہو، خواہ لغۃً معنی ہی ایک ہو یا مختلف ہوں۔ تو دوسرے قواعد سے ایک کی تعیین ہو جاتی ہو۔

اور متشابہہ وہ آیت ہے جس کی مراد واضح نہ ہو۔ مثلاً اس کے کئی معانی ہوں اور ایک کی تعیین نہ ہو سکتی ہو۔ یا ایک ہی معنی ہو، لیکن اس مقام پر صحیح نہ آتا ہو۔

اب یہاں ایک طریقہ تو اہل فتن کا ہے کہ محض اپنی رائے سے ایک معنی متعین کر لیتے ہیں۔ خواہ وہ محکمات کے خلاف ہو اور دوسرا طریقہ اہل حق کا ہے کہ متشابہات کا رجوع محکمات کی طرف کریں، جو معانی محکمات کے ہوں انہی پر متشابہات کو بھی محمول کریں۔ اس طریق پر دین میں کسی قسم کی تفریق پیدا نہیں ہوتی اور اگر پہلے طریقے کو

① پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٧٥۔

اختیار کیا جائے تو چونکہ ہر شخص کی عقل ورائے مختلف ہے، اس لئے مذہب میں تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ عیسائیوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ کیونکہ آیت ﴿وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ سے بظاہر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے کی گنجائش نکلتی ہے اور اس کو دوسری آیات پر محمول کیا جائے تو بیٹا نہ ہونے کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔ اب صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کا، آیات متشابہہ کو آیات محکمات پر محمول کیا جائے اور آیت محکم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ ① یعنی عیسیٰ علیہ السلام تو ایک بندے ہیں جن پر ہم نے انعام کیا۔ اور بندہ ہونا اُلوہیت کے منافی ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ ②۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا اور پھر فرمایا کہ ہو جا پس ہو گئے۔ اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے مخلوق ہونے کی تصریح فرماتے ہیں اور مخلوق و الٰہ میں منافات ہے۔

صفاتِ خُداوندی کے بارے میں نُصوصِ متشابہہ کا حکم...... جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ آیت متشابہہ ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بھی آیاتِ متشابہات ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ ③۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا بظاہر منہ ثابت ہوتا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ ④ یہاں اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ثابت ہوتی ہے۔ غرض انسان کے تمام اعضاء ثابت ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رحم اور امانت دونوں اللہ تعالیٰ کی کوکھ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے کہ "اے اللہ! جو ہم کو ملائے یعنی صلہ رحمی کرے تو اس کو ملا اور جو ہم کو قطع کرے، تو بھی اس کو قطع کر"۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ایک حدیث میں ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو بہت اچھی صورت میں دیکھا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا، تو اس کی ٹھنڈک میرے دل کو محسوس ہوئی اور ایک حدیث میں ہے کہ تمام مخلوق کے قلوب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں۔

اب ان نصوص کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم مان لیا جائے اور ایک صورت یہ تھی کہ ان کو آیاتِ متشابہات پر محمول کیا جائے۔ بعض تو یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم ہیں۔ جیسے ہمارا جسم ہے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا جسم بہت بڑا ہوگا۔ یہ مجسمہ کہلائے۔ اور بعض نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ جسم کے مشابہہ ہیں۔ یہ مشبہہ کہلائے اور ایک فرقہ کہنے لگا کہ الفاظ ہی بے معنی ہیں ان کا کوئی معنی مفہوم ہی نہیں۔ یہ معطلہ کہلائے۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۵۹.

② پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۵۹.

③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۵۲.

④ پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۲.

اہل سنت والجماعت نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ تمام صفات ثابت ہیں، لیکن ان کی کیفیات ہمیں معلوم نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ ① نیز ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ② کی تفسیر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَّالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّوَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ." ③ اوران اعضاء کی طرح عوارض انسانیہ کا اثبات بھی اللہ تعالیٰ کے لئے نصوص میں ملتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: "اَنَا الرَّزَّاقُ فَهَلْ مَنْ يَّسْتَرْزِقُنِيْ اَنَا الْمَلِكُ فَهَلْ مَنْ يَّسْئَلُنِيْ اَنَا الْغَافِرُ فَهَلْ مَنْ يَّسْتَغْفِرُنِيْ." ④

ایک اور حدیث میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو تین جگہ ہنسی آتی ہے۔ایک اس وقت جب کہ صفِ اول لینے کے لئے نمازی دوڑ رہے ہوتے ہیں۔دوسرے اس وقت جب کہ پچھلی رات کو خاوند اٹھے اور اپنی بیوی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور وہ بھی بیدار ہو کر نماز پڑھے۔یا بیوی اٹھے، خاوند کے منہ پر چھینٹے مارے اور وہ اٹھ کر نماز پڑھے۔تیسرے اس وقت جب کہ جہنم سے سب سے پیچھے جو شخص نکالا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں تمنائیں ڈالیں گے۔چنانچہ وہ کہے گا کہ اے اللہ! میرا چہرہ آگ سے پھیر دے۔اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر چہرہ پھیر دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگے گا؟ وہ کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیرا اعتبار نہیں، تو حلف اٹھا، کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا۔وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ میں کچھ نہیں مانگوں گا پھر اس کا چہرہ آگ سے پھیر دیا جائے گا۔جب وہ جنت کی فضا کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ میں تو ابھی تکلیف ہی میں ہوں اس لئے پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جہنم سے نکال دے۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "وَيْلَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَآ اَغْدَرَكَ." (تیری بربادی ہو، بہت عہد شکن ہے؟) پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اور تو کچھ نہیں مانگے گا۔تو وہ قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔پس اس کو اللہ تعالیٰ جہنم سے نکال دیں گے اور گھٹنوں کے بل نکلتے ہوئے کہے گا کہ "تَبَارَكَ الَّذِيْ نَجَّانِيْ مِنْهَا." پھر جب نہرِ حیات کو دیکھے گا، پھر اپنے آپ کو تکلیف میں پائے گا تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے اس نہر تک پہنچا دیا جائے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "وَيْلَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَكَ." پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر وہاں پہنچا دیا جائے، پھر تو کچھ نہیں مانگے گا۔وہ حلف اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔پس اس کو نہر تک پہنچا دیا جائے گا۔وہ اس نہر میں نہائے گا تو سیاہ اور جلا ہوا جسم روشن چاند کی طرح ہو کر نکلے گا۔اور وہ خیال کرے گا کہ جتنا انعام میرے اوپر

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۱۱۔

② پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵

③ نظم الدرر، ج: ۱ ص: ۲۹۲.

④ الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء فی نصف اللیل، ص: ۳۸۹.

ہوا، وہ کسی پر بھی نہیں ہوا۔ پھر جب جنت کے دروازے دیکھے گا جن میں ہر ایک کی مسافت اتنی ہوگی جتنی مکہ مکرمہ اور عدن کے درمیان ہے، یہ سینکڑوں میلوں کا فاصلہ ہے اور ساتھ ہی جنت کی شفاف دیواروں سے اندر کی چیزیں دیکھے گا، تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ''وَیْلَکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَکَ.'' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر تمہیں وہاں بھیج دیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں مانگے گا۔ تو قسم اٹھا کر کہے گا کہ کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اس کو جنت کے دروازے کے قریب ہی پہنچا دیا جائے گا۔ پھر جب جنت کی نعمتوں کو دیکھے گا تو یہی خیال کرے گا، کہ میں تو تکلیف میں ہوں۔ تو پھر تمنا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر دیجئے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ''وَیْلَکَ یَا ابْنَ اٰدَمَ مَا اَغْدَرَکَ.'' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو ایک دنیا جتنا ملک جنت میں دیا گیا، وہ شخص جنت میں جگہ نہ پائے گا۔ تو پھر حاضر ہو کر کہے گا کہ جگہ تو کہیں بھی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کو دو دنیا جتنا ملک دیا۔ پھر واپس جائے گا، تو جگہ اور زیادہ تنگ ہو جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گا تو وہی عرض کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ تمہیں تین دنیا جتنا ملک دے دیا۔ وہ دیکھے گا تو جگہ بہت تنگ ہو چکی ہوگی۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا ''اَتَسْتَهْزِئُنِیْ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ'' آپ جل جلالہ تو میرے سے مزاح فرما رہے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہنسی آئے گی اور فرمائیں گے کہ جا تمہیں دس دنیا جتنا ملک دے دیا۔ پھر جب واپس جائے گا تو اس کو اپنی جگہ نظر آئے گی۔ ① معلوم ہوا کہ جو شخص آخر کو جنت میں داخل کیا جائے گا اس کو دس دنیا جتنا ملک دیا جائے گا۔ اور حدیث سے اللہ تعالیٰ کا ہنسنا بھی معلوم ہوا۔ تو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ایسی صفات تو ثابت ہیں اور کیفیت کا علم نہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نصوصِ متشابہہ کا حکم...... اور جیسے متشابہہ الفاظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی صفات پر کیا گیا، ایسے ہی بعض انبیاء کے متعلق بھی الفاظِ متشابہہ کا استعمال فرمایا گیا۔ تو ان میں طریق اعتدال یہ ہے کہ ایسی آیات کو محکمات پر محمول کیا جائے۔ ایسے ہی چونکہ نصوص میں تصریح ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغائر اور کبائر سے منزہ ہوتے ہیں۔ اگر بعض انبیاء سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جو بظاہر بہتر معلوم نہ ہوتا ہو تو وہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ نبی جو کچھ کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی کرتا ہے۔ اگر عقل سے معانی متعین کئے گئے تو یہیں سے گمراہی شروع ہو جائے گی اور ایک نیا مذہب نکل آئے گا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اختلاف کنندہ تو وہ ہیں جو اہل سنۃ و الجماعت سے کٹ کر ایک فرقہ بنا لیتے ہیں اور جنگ کرنے والے بھی حقیقت میں اہلِ بدعت ہی ہوتے ہیں۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں الفاظِ متشابہہ کا حکم...... اور انبیاء علیہم السلام کی طرح ہی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا معاملہ ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم خود غرضی اور بے دینی سے بمراحل دور تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ

بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے راضی ہونے کا اعلان فرمادیا' جو قیامت تک کے لئے ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا. سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ② پہلے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق لفظ ''مَعَه'' نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ ان کا سلسلہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل ہے منقطع نہیں ہے اور ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ سے ان کے بغض فی اللہ کی تعریف فرمائی اور ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ سے ان کے حُب فی اللہ کا ذکر فرمایا۔ اور یہ صفات بغیر دین کامل ہوئے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اور پھر ﴿تَرٰهُمْ الخ﴾ میں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ رکوع وسجود میں مشغول رہتے ہیں اور ہر وقت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ پہلی کتب میں بھی ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ گویا آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مقبول عند اللہ ہونے کی شہادتیں دی گئیں اور قرآن مجید میں بھی ان کے مقبول ہونے کی شہادتیں موجود ہیں جو قیامت تک باقی رہیں گی۔ پس اگر ان سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بظاہر نامناسب ہو، تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے اعلان کو دیکھتے ہوئے مناسب تاویل کی جائے۔ مثلاً اگر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے لفظ کذب استعمال کیا ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ ان کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی اور نہ یہ کہ وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے مناسب حال کذب کے معنی کی تعیین کی جائے گی اور وہ خطاءِ اجتہادی سمجھی جائے گی، جس میں اُن کو ایک نیکی ملے گی، مواخذہ پھر بھی نہیں ہوگا۔

اولیاء اللہ کے کلمات کے بارے میں مسلکِ حق ...... جیسا کہ حضرت منصور رحمہ اللہ علیہ نے ''اَنَا الْحَقُّ'' کہا تو صرف ان کلمات کو دیکھ کر ان کے حق ہونے میں گستاخی نہیں کی جائے گی۔ بلکہ ان کی تمام زندگی کو دیکھ کر ان کے مناسب ''اَنَا الْحَقُّ'' کا معنی بیان کیا جائے گا۔ اور اصل یہ ہے کہ صوفیاء کرام کے نزدیک ایک درجہ فنا فی اللہ کا ہوتا ہے حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ اس قدر فانی فی اللہ ہو چکے تھے کہ اَنَـــا سے مراد ذات متکلم نہیں بلکہ ذاتِ حق تھی۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد انا اور انت کا مصداق ایک ہو جاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے: مُلْكِيْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْكِ اللّٰهِ. (میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے) واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ آپ رحمۃ اللہ علیہ پر بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی، تو آپ کے منہ سے نکلا مُلْكِيْ اَعْظَمُ مِنْ مُّلْكِ اللّٰهِ. جب افاقہ ہوا تو مریدین نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے تو

① پارہ: ۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۰۰.

② پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

آ ج کلمہ کفر صادر ہوا ہے۔آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے مجھے کیسے چھوڑ دیا؟

پھر دوسری دفعہ آپ پر ایسی ہی حالت طاری ہوئی،تو مریدین نے حضرت کو مارنا شروع کیا۔لیکن معاملہ یہ تھا کہ مارتے پیر صاحب کو تھے اور لگتی ان کو خود تھی۔ چنانچہ وہ بے چارے بدحال ہو گئے۔ جب حضرت بایزید کو افاقہ ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ مریدین نے عرض کی کہ آج بھی آپ سے وہی ''کلمہ کفر'' نکلا تھا، اس لئے ہم آپ کو مارنے لگے تو وہ ہمیں لگتی تھی۔جس سے ہمارا یہ حال ہو گیا۔

حضرت بایزید نے فرمایا: بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے؟ مریدین نے بتلا دیا۔آپ نے فرمایا کہ یہ کلمہ تو عین ایمان ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ملک تو میں اور بقیہ ساری کائنات ہے۔اور میرا ملک خود اللہ تعالیٰ ہے،جس میں میں ہر وقت سیر کرتا ہوں تو یقیناً میرا ملک اللہ تعالیٰ کے ملک سے بڑا ہے۔

اب یہاں بھی اہل زیغ کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی اس قدر تعریف کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیں گے اور یا قرآن وحدیث کے ظواہر پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ کی توہین کریں گے۔اور ایک ''اعتدال'' ہے۔وہ یہ کہ قواعدِ قرآن وحدیث بھی اپنی جگہ پر صحیح رہیں اور اولیاء اللہ کے کلام کا بھی ان کی زندگی کے مطابق معنی بیان کیا جائے اور یہ ''طریق حق'' مفرّط اور مفرط کو نصیب نہیں ہوتا، بلکہ اعتدال پسند آدمی کو نصیب ہوتا ہے۔

حضرت نظامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا عجیب واقعہ...... اس پر ایک واقعہ مولانا فخر الدین نظامی رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا، جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے، چودہ برس کی عمر میں ہی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ بہت خوبصورت تھے، جب آپ مسجد میں تشریف لاتے تو لوگ دیکھنے کے لئے سڑک کے کنارے پر جمع ہو جاتے۔تو آپ جس کی طرف دیکھتے'' وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔آپ فرماتے کہ اور گھور کر دیکھو۔

وہ واقعہ یوں ہے کہ آپ کے ایک مرید نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کی تمنا ہے اس کے لئے کوئی وظیفہ بتا دیجئے جس سے اللہ تعالیٰ کی زیارت ہو جائے۔آپ نے فرمایا کہ نماز فرض ترک کر دو۔مرید کو بہت تعجب ہوا کہ نماز فرض کیسے ترک کر دوں؟ تین دن کے بعد حاضر ہوئے اور پوچھا کہ حضرت! اللہ کے دیدار کی تمنا ہے، کوئی وظیفہ بتا دیں۔حضرت نے فرمایا کہ تمہیں وظیفہ تو بتلا دیا کہ فرض نماز چھوڑ دو۔وہ پھر بھی واپس چلا گیا۔دو تین دن کے بعد حاضر ہوا، اور وہی عرض کی، تو آپ نے پھر وہی جواب دیا۔آخر وہ مرید چلے گئے۔فرض چھوڑنے کی تو ہمت نہ ہوئی۔لیکن سنتیں چھوڑ کر سو گئے خواب میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیات ہوئی، آپ نے فرمایا کہ''اللہ کے بندے ہم نے کیا قصور کیا کہ ہماری سنتیں چھوڑ دیں''۔

اسی وقت جلدی اٹھے، وضو کر کے توبہ کی اور سنتیں ادا کیں۔صبح کو یہ واقعہ حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا۔

آپ نے فرمایا کہ اگر فرض چھوڑتے تو اللہ تعالیٰ خود تشریف لاتے اور فرماتے کہ فرض کیوں چھوڑتے ہو؟

یہاں بھی دو راستے نکلتے ہیں۔ایک یہ کہ اولیاء اللہ کی ہر بات کو قرآن وحدیث سے قطع نظر کرتے ہوئے مِــنَّ و عَــنُ تسلیم کرلیا جائے۔اور ایک یہ کہ قرآن مجید کے قواعد اپنی جگہ صحیح رہیں اور اولیاء اللہ کے کلام کے بھی مناسب معانی بیان کئے جائیں۔

اہل اللہ کی دو اقسام......حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو ریاضت ومجاہدات سے اللہ تعالیٰ تک پہنچتے ہیں۔اور ایک وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خود ہی چن لیتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔تو جو مجاہدات سے اللہ تک پہنچیں ان کو صوفیاء کی اصطلاح میں مرید کہتے ہیں۔اور جن کو اللہ تعالیٰ خود چن لیں ان کو مراد کہتے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص تو اپنی دیانت،خلوص اور خدمت کی بناء پر اتنی ترقی کرے کہ بادشاہ اس کو اپنا نائب بنادے۔اور ایک وہ لڑکا ہے جس کو بادشاہ خود چن لے اور اس کے لئے مربی مقرر کردے جو اس کی تربیت کریں۔اگر وہ نہ پڑھے تو اسے زبردستی پڑھائیں۔زبردستی اس کی تعلیم وتربیت ہو۔

حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو جنت میں جانا نہیں چاہتے۔لیکن ان کو زنجیر سے باندھ کر لایا جاتا ہے کہ انہیں جنت میں جانا پڑے گا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ ①
”یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں خود بخود اپنی طرف چن لیتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کو راستہ بنادیتے ہیں“۔پس قرآن مجید کی اصطلاح میں جن کو اللہ تعالیٰ خود چن لیں اور ان کو مجتبے اور جو مجاہدات سے واصل ہوں ان کو منیب کہتے ہیں۔حضرت حاجی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص (حضرت نظامی کے مرید باصفا) مرید نہیں تھے بلکہ مراد تھے۔اگر یہ نماز نہ پڑھتے تو اللہ تعالیٰ خود آکر پڑھواتے۔اور حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ ان کی نماز چھوٹ نہیں سکتی۔

اہلِ استقامت کا حال......پس اللہ کی تعظیم کی بناء پر قرآن میں تاویل بھی گمراہی ہے اور قرآن مجید کے ظاہر قواعد پر نظر کرتے ہوئے اولیاء اللہ پر تنقید کرنا بھی گمراہی ہے۔اور ایسے لوگوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کے گھمنڈ میں رہتے ہیں اور جن کو اپنے علم پر غرور اور فخر نہیں ہوتا وہ کسی بات کو اگر نقل بھی کرتے ہیں تو موجد ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ متبع ہونے کی حیثیت سے نقل کرتے ہیں۔

اس پر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔وہ یہ کہ ایک دفعہ آپ بہت خوش معلوم ہو رہے تھے۔تو حاضرین نے کہا کہ حضرت آج بہت خوش معلوم رہے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے۔آپ نے فرمایا کہ بتیس سال سے دل میں ایک رائے تھی۔اس کو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔کیونکہ متقدمین سے کسی کا قول نہیں ملتا تھا اور آج

---

① پارہ:۲۵،سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۱۳.

ایک تابعی کا قول نظر آیا۔جس سے اس رائے کی تائید ہوئی،اس وجہ سے خوشی ہوئی۔اہل استقامت کا یہی حال ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ہاتھ کتاب اللہ میں ڈال رکھا ہے اور ایک ہاتھ بزرگوں کے دامن میں۔اور یہ چیز جب نصیب ہوتی ہے جب انسان عارفین سے وابستہ ہو۔آج دنیا میں ایک طبقہ ہے جس نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اولیاء کرام کی اتنی تعظیم کی کہ ان کی ہر بات کو مذہب بنا دیا۔اگر ایک بزرگ نے سماع کیا جو ان کی ایک خصوصی حالت تھی۔تو اس کو بھی شریعت میں داخل کر دیا گیا۔

یہود اس لئے تباہ ہوئے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو چھوڑا۔حتی کہ ان کی توہین بھی کی اور بعض کو قتل بھی کیا اور صرف کتابوں کو ہاتھوں میں رکھا اور جو مطلب اپنی خواہش کے مطابق ہوا، وہ لے لیا۔اس سے ان میں غرور پیدا ہوا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَایَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ﴾ ① ''میں پھیروں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں تو ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں اس کو راہ نہ ٹھہرائیں اور اگر راستہ گمراہی کا دیکھیں تو اس کو راہ ٹھہرائیں۔یہ اس لئے کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان سے بے خبر رہے''۔

اس غرور کی اصلاح جب ہوسکتی ہے جب اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔اور نصاریٰ اس لئے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو کلیتہً چھوڑ دیا اور انبیاء علیہم السلام کو حتیٰ کہ احبار و رہبان کو بھی معبود بنالیا۔یہ اِفراط وتفریط گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔اس لئے اصل اعتدال یہ ہے کہ قرآن وحدیث کو بھی چھوڑا نہ جائے اور اہل اللہ کا دامن بھی ہاتھ میں رہے۔

محض حروفِ قرآن کافی نہیں...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّتِیْ.'' ② ''میں نے تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہوگے۔گمراہ نہیں ہوگے ایک اللہ کی کتاب۔اور دوسری اپنی سنت (طریق عمل)''۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ ③ ''البتہ تحقیق تمہارے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے''۔اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے حروف کافی نہیں، بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بھی ضرورت ہے۔تقویٰ کی کیفیت قلوب سے قلوب کی طرف آتی ہے، کاغذات

① پارہ: ۹،سورۃ الاعراف،الآیۃ: ۱۴۶.

② المؤطا لمالک ،کتاب الجامع ،باب النھی عن القول بالقدر ،ص: ۳۷۱.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ الاحزاب ، الآیۃ: ۲۱.

سے نہیں آتی۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر پوری طرح مٹی بھی نہیں ڈالی تھی کہ ہم نے اپنے دلوں کو "منکر" (یعنی اوپرا) پایا۔ حالانکہ علم اور کتاب اللہ موجود تھی۔ اگر نہیں تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود موجود نہیں تھا۔ اس لئے کتاب اللہ کے ساتھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی ضرورت ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ." ① "جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں اسی طرح تم بھی نماز پڑھو"

کیونکہ عمل کا نقشہ آپ ہی کو معلوم تھا۔ حالانکہ صلوٰۃ کا لغوی معنی صرف دعا ہے۔ اور یہ معنی صحابہ بھی جانتے تھے۔ لیکن یہ معنی اللہ تعالیٰ کے مطلوب نہیں تھے۔ ایسے آپ نے وضو کر کے دکھایا۔ چنانچہ ایک ایک دفعہ اعضاء کو دھویا اور فرمایا کہ یہ وضو ایسا ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں فرماتے۔ اور پھر اعضاء کو دو دو دفعہ دھویا اور فرمایا کہ جو شخص ایسا وضو کرے گا، اس کو دو اجر ملیں گے، پھر اعضاء کو تین تین دفعہ دھویا اور فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وضو ہے۔

ایسے ہی حج کا حکم دیا تو حج کر کے دکھلایا۔ معاشرت کی تعلیم دی تو وہ کر کے دکھلائی۔ حالانکہ ان کے لغوی معانی سب کو معلوم تھے لیکن وہ معانی شرعاً مطلوب نہیں تھے۔ لہٰذا شخصیتوں کو چھوڑ کر صرف لٹریچر پر کفایت کرنے سے دین نہیں سیکھا جا سکتا۔

عقل محض سے دین فہمی کا انجام...... کیونکہ ہر شخص کی عقل مختلف ہے اور عقل کے مطابق ہی عمل کیا جائے۔ تو دین میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا لٹریچر اور بزرگوں سے وابستگی دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا طریقہ ہے اور جو لوگ شخصیتوں کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھیں گے۔ وہ عمل صحیح سے محروم رہیں گے اور جو عمل کرتے بھی ہیں تو بھی انہیں شخصیتوں سے لیا گیا ہے۔

میں نے مشکوٰۃ شریف حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے پڑھی۔ ایک طرف تو آپ احادیث کا ترجمہ کراتے تھے اور دوسرے آپ رکوع اور سجدہ کر کے کیفیت بھی بتلا دیتے تھے۔ میں نے عرض کی حضرت! اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس لئے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی، تو آپ نے بھی رکوع اور سجدہ کی کیفیت عمل کے ساتھ بتلائی۔ میں نے عرض کی حضرت اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی وجہ سے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے اور حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے مشکوٰۃ شریف حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے پڑھی۔ انہوں نے بھی اسی ہیئت سے رکوع اور سجدہ بتایا۔ میں نے عرض کی

حضرت یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس لئے تو معلوم ہے کہ کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ ایسے ہی شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شیخ ابو طاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے اور ان سے اسی ہیئت کی سند رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں رواج تھا کہ اگر کوئی مر جاتا تو چھ مہینے تک رونے کی وصیت کرتے' اور رونے والی عورتیں نہ ہوتیں تو کرایہ پر رونے والی جاتیں، جو چھ مہینے تک روتیں تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ مرنے والا بہت بڑا آدمی ہے جس پر چھ ماہ تک ماتم ہوتا رہا۔ جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رونے کی ہیئت بنا کر مجھے بتایا پھر فرمایا کہ شاید تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی ہیئت بتلائی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ شاید تم کو یہ خیال ہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایسے ہی ہیئت بتلائی تھی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک پہنچتا ہے۔

دین فہمی کے لئے اشخاص بھی ضروری ہیں...... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کی سند بہت بلند تھی۔ ایک دفعہ سہارن پور کے سفر میں آپ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے فرمایا: کہ چونکہ میری سند عالی ہے، اس لئے تم مجھ سے اجازت حدیث لے لو، لیکن شرط یہ ہے کہ سہارن پور آنا پڑے گا۔ میں نے عرض کی بہت اچھا، لیکن اتفاق سے میں وہاں نہ جاسکا اور ایک سال گزر گیا۔ پھر میں نے وعدہ کیا، لیکن کچھ عرصہ گزر گیا اور میں نہ جاسکا۔ آخر آپ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کر جانے کا ارادہ فرمایا تو میں یہ سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا: کہ تم کو وقت پر خیال آیا۔ دو تین سفر ابھی باقی تھے۔ پھر آپ نے حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مرحوم کو فرمایا کہ حدیث کی تمام کتابیں لے آؤ۔ وہ تمام کتابیں لے آئے۔ بعض کا اول آخر پڑھا اور بعض کا اول آخر مجھ سے پڑھایا اور فرمایا: کہ میں تم کو بھی اس عمل کی اجازت دیتا ہوں۔ اسی طرح دین کا سمجھنا اشخاص پر موقوف ہے، ورنہ عبارت سے بعض اوقات صرف ترجمہ بھی سمجھ نہیں آتا۔ مثلاً ''کیا بات ہے'' ایک جملہ ہے اس کو اگر ایک خاص لہجہ سے ادا کیا جائے تو یہ استفہام کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور تفخیم شان' تحقیر شان اور تعجب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معنی مراد کی سمجھ الفاظ سے نہیں آتی۔ بلکہ لب ولہجہ سے آتی ہے۔ اس طرح لٹریچر کے ساتھ عمل کی ہیئت کی بھی ضرورت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب آیات ﴿کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ① نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سیاہ دھاگہ اور ایک سفید دھاگہ اپنے تکیئے کے نیچے رکھ لیا۔ صبح تک

---

① پارہ: ۲ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۷.

کھاتے پیتے رہتے اور دونوں دھاگوں کو بھی دیکھتے رہتے۔ جب کافی روشنی ہوئی اور دونوں دھاگے ممتاز ہونے لگتے تو آپ کھانا پینا بند کر دیتے۔

جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ وِسَادَتَکَ لَعَرِیْضٌ.'' ① ''یعنی تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے جس کے نیچے صبح صادق اور صبح کاذب دونوں آ گئیں''۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ سیاہ دھاگے سے مراد صبح کاذب اور سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔

اب حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی معنی سمجھا جو لغوی تھا۔ لیکن شرعاً وہ معنی مطلوب نہ تھا اور وہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد تھی۔ ایسے ہی قرآن مجید میں نماز کا حکم ہے، اس کا لغوی معنی دعا ہے۔ حالانکہ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں۔ حج کا معنی قصد کرنا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں۔ پس جیسے قرآن مجید کا ماننا ضروری ہے۔ ایسے ہی ان کو تنقید سے منزہ سمجھنا ضروری ہے، جن کے واسطے سے قرآن مجید ہم تک پہنچا ہے اور جن کے تقویٰ کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی۔ ان سے راضی ہونے کا اعلان بھی فرمایا۔ اور جن کے متعلق فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک آدمی آیا۔ جو قدریہ خیال کا تھا۔ تو آپ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا۔ اور فرمایا کہ تو نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مطلب کے خلاف کہا ہے۔ ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹے کے سامنے ایک حدیث بیان کی کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو تو آپ کے بیٹے نے کہا چونکہ یہ فتنہ کا زمانہ ہے۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہم ضرور عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع کریں گے۔ واقع میں یہ بات صحیح تھی، لیکن چونکہ یہ حدیث کا مقابلہ تھا۔ اس لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تم سے حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے پیش کرتے ہو۔ چلے جاؤ۔ میں ساری عمر تمہارا منہ نہ دیکھوں گا ② چنانچہ بہت سفارشیں کرائیں، لیکن ساری عمر اپنے لڑکے کا منہ نہیں دیکھا اور ان حضرات کا آپس میں اگر کوئی جھگڑا ہو جائے تو اس میں اتنی خیر ہوتی تھی کہ ہماری صلح میں بھی نہیں ہوتی۔

لوگوں کی دو اقسام...... غرض آیات کی دو قسمیں بیان کی گئیں۔ اور لوگوں کی بھی دو قسمیں بیان کی گئیں۔ فرمایا گیا کہ جن کے قلوب میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی عقل سے رکیک تاویلیں کرتے ہیں۔ پس ان معانی کی تعیین میں سلف صالحین کی اِتّباع ضروری ہے اور ان کو تنقید سے بالاتر سمجھنا بھی ضروری ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ صحابہ کو مقتدا بھی مانتے ہیں پھر ان پر تنقید کیسے کرتے ہیں یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتی.

---

① الصحیح للبخاری، کتاب التفسیر باب قوله تعالیٰ کلوا واشربوا...... ص: ۴۵۱.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصلوة، باب خروج النساء الیٰ المساجد، ج: ۲، ص: ۴۴۰.

اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ یہ کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ایک کتاب لکھ کر مولانا قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو نقل کرنے کے لئے دی۔ اس میں ایک جگہ کتابت کی غلطی تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ بوجہ غایت ادب نہ تصحیح کرتے ہیں نہ ہی اس کو اس طرح غلط لکھنے کی جرات ہوئی جب تحریر ختم ہوئی، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضرت! اس لفظ کی سمجھ نہیں آئی۔ تو حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ عین کی بجائے ہمزہ لکھ دو۔ پھر آپ نے تصحیح فرمائی۔

بہر حال ان اقسام کے بیان کے بعد زیغ سے بچنے کی دعا کی تعلیم ہے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کو کجی سے بچا اور کجی سے بچنا چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر موقوف ہے۔ اس لئے طلب رحمت کی دعا بھی تعلیم فرمائی اور جب ہدایت نصیب ہو جائے تو اس کا تھامنا اور سنبھال کر رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے موت کا استحضار ضروری ہوا، اس کے خوف سے ہدایت کو دانتوں میں مضبوط پکڑا جائے۔ اور یہ چیز تربیت سے، اصلاح سے آتی ہے، جو بزرگوں کی صحبت میں ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بیٹا بن کر سب نے کھایا، باپ بن کر کسی نے نہیں کھایا۔ اس لئے انکساری اور بزرگوں کی خدمت ضروری ہے۔

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تواضع کی یہ حالت ہے کہ قیامت کے دن کہیں گے "مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ." اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ." ①

آدم علیہ السلام سے ایک اجتہادی خطاء ہوئی تھی۔ اس پر بھی انہوں نے عاجزی اور زاری کی اور فرمایا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ ② اور ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی کی اور بجائے معافی مانگنے کے تکبر کیا۔ اس کا علاج سوائے اہل اللہ سے تعلق کے مشکل ہے۔

قال را بگذار، مرد حال شو ۔۔۔ پیش مردے کاملے پامال شو

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تواضع اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک انسان یہ خیال نہ کرے کہ میں نصرانی کے کتے سے بھی بدتر ہوں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بندہ جب دعوے سے کہتا ہے کہ میں نے عبادت کی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قوت تو میں نے ہی دی تھی، اعضاء تو میں نے دیئے تھے؛ پھر تو نے کیا کیا؟ اگر بندہ تواضع اختیار کرے اور کہے کہ اے اللہ! سب کچھ تیری رحمت سے ہوا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اولاً حرکت تو تو نے ہی کی تھی، ارادہ تو نے ہی کیا

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب مایقول فی الرکوع، ج: ٣، ص: ٣٦.

② پارہ: ٨، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ٢٣.

تھا، چل کر تو تو ہی آیا۔ گویا اس کو بلند فرماتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ کِبْرٍ.'' ① ''یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے ۔

اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں　　　پستی سے سربلند ہو اور سرکشی سے پست

بارش، پتھر اور مٹی دونوں پر برابر پڑتی ہے۔ لیکن پتھر کو اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور مٹی سے قسم قسم کی اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیات کی قسمیں بیان کیں اور لوگوں کی اقسام بھی بیان کیں اور ایمان کی حفاظت کا طریق بھی بتادیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں، وقت بھی کافی ہوگیا۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا، اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ.

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه ج: ۱ ص: ۲۴۷.

مقصدِ حیات

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّالِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ.حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُواالزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ﴾صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ①

تمہید..... بزرگانِ محترم! دنیا میں انسان جب بھی کوئی حرکت کرتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کسی دانش منداور عقلمندانسان کی حرکت بلامقصد نہیں ہوتی۔ آپ جب مسجد کی طرف آنے کے لئے حرکت کرتے ہیں تو نماز مقصد ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ اپنا گھر چھوڑتے ہیں اور محنت مشقت اٹھا کر مسجد میں آتے ہیں۔ ایک طالب علم اسکول، مکتب یا مدرسہ کی طرف جاتا ہے تو محض حرکت مقصود نہیں ہوتی، بلکہ حرکت سے تعلیم مقصود ہوتی ہے، اسے پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ اس لئے وہاں جاتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنے شیخ کے پاس خانقاہ کی طرف جاتا ہے، تو اس حرکت کا مقصد اخلاقی تربیت ہوتی ہے کہ میرے نفس کی اصلاح ہو جائے۔ محض حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ آپ ریل سے سفر کر کے کسی جگہ کے لئے حرکت کریں تو کوئی نہ کوئی اسٹیشن ضرور ہوگا جہاں آپ کو اترنا ہوگا جو آپ کی منزل مقصود ہوگی۔ بلامقصد کے حرکت دیوانوں اور مجنون آدمی کا کام ہے۔ دانش مند جب بھی کوئی حرکت کرے گا، اس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ اور وہ مقصد اس کے عقلمند ہونے پر دلالت ہوگی ورنہ اس کو بے وقوف کہیں گے۔ غرض یہ عقلی اور حسی قاعدہ ہے کہ کوئی حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ حرکت سے وہ منزل مقصود ہوتی ہے جس کی طرف آدمی جاتا ہے۔

سفرِ انسانی کی ابتداء و انتہاء..... اس اصول کے پیش نظر آپ غور کریں تو زندگی بھی ایک حرکت ہے ایک طرف سے آپ چلے ہیں اور ایک طرف جارہے ہیں۔ اور یہ کوئی چھوٹی موٹی حرکت نہیں کہ دس بیس میل کا سفر

① پارہ: ۳۰، سورۃالبینۃ،الآیۃ:۸.

کرلیا، بلکہ ایک لامحدود حرکت ہے جو دور تک جانے والی ہے اور بہت پہلے سے ہوئی ہے۔

آپ تو یہ سمجھے ہوئے ہوں گے کہ جب ہم ماں کے پیٹ سے نکلے تو حرکت شروع ہوئی۔ نہیں ایسا نہیں بلکہ ماں کا پیٹ تو ایک اسٹیشن ہے۔ حرکت اوپر سے آ رہی ہے۔ اس جگہ جو انسان کی حرکت ہوتی ہے۔ یہ ''عالمِ اَلَسْتُ'' سے چلی ہے جس کو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا اور احادیث نے اس کی تفسیر بیان کی تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی کمر پر داہنا ہاتھ مارا، جیسا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب اور اس کی جناب کے لائق ہے۔ ہم جیسا ہاتھ تو نہیں ہے۔ ہمارا ہاتھ تو جسمانی ہے اور وہ جسم سے پاک ہے۔ تو جیسا ہاتھ اس کی جناب کے لائق اور شان کے مناسب ہے ویسا ہی ہاتھ مراد لینا چاہئے۔ تو داہنا ہاتھ مارا تو آدم علیہ السلام کی کمر سے ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جنتی ہونے والی تھی اور قیامت تک آنے والی تھی۔ اس کے بعد بایاں ہاتھ مارا تو ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جہنمی ہونے والی تھی۔ تو نیک اور بد سارے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک وادی میں جمع کیا، اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے تھے کا ایک مجمع تھا۔ کوئی صف بندی نہیں تھی کہ ترتیب ہو۔ بلکہ کسی کا منہ کسی کی طرف کسی کی پشت کسی کی طرف اور کسی کا مونڈھا کسی کی طرف، ایسے ہجوم میں ہوتا ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے جن کے منہ آمنے سامنے تھے ان میں تو محبت قائم ہوگئی اور جن کی پشتیں ملی ہوئی تھی ان میں عداوت قائم ہوگئی اور جن کے پہلو ملے ہوئے تھے ان میں کچھ محبت اور کچھ عداوت۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انسان مشرق کا اور ایک مغرب کا، ایک ایشیاء کا اور ایک افریقہ کا، کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن جب جمع ہوتے ہیں تو ان میں دیرینہ محبت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ پہلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ وہی عالم الست کا اثر ہے۔ تو فرمایا گیا: ''اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ.'' ① روحیں جمع کردی گئیں وہی آپس میں محبتیں اور عداوتیں قائم ہوگئیں، جو دنیا میں آ کر ظاہر ہوئیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ماں کے پیٹ میں دو بچے پاؤں پھیلاتے ہیں۔ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ لیکن آپس میں عداوت، کشمکش اور کسی وجہ سے مناسبت نہیں وہ اس سے لڑتا ہے اور یہ اس سے لڑتا ہے۔ اور دو اجنبی اس طرح ملتے ہیں جیسے حقیقی بھائی ہیں۔ یہ ازل سے ہی کسی میں محبت اور کسی میں عدوات ڈال دی گئی۔ اس طرح سے یہ روحیں وہاں جمع کی گئیں۔

یہ بھی حدیث میں فرمایا گیا کہ: وہاں جوڑیاں بھی قائم کردی گئیں۔ جس کا جس سے نکاح ہونے والا تھا، وہ عورت اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ گویا وہیں تقرر کر دیا گیا کہ یہ زوج اور زوجہ بنیں گے۔ تو اس طرح سے لوگوں کی جوڑیاں بنا کر کھڑے کردیئے گئے۔ ان سب کو حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا اور بلا واسطہ حق تعالیٰ نے ان

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب الارواح جنود مجندة، ج: ۱۱، ص: ۱۱۷.

سب سے کلام فرمایا اور سب کو اپنا جمال دکھلایا۔ جس سے ہر ایک کے دل میں اپنے مالک کی محبت قائم ہوگئی۔ اور یہ فرمایا کہ: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ﴾ ① ''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟''۔

حدیث میں ہے کہ: سب انسان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ اس کا کیا جواب دیں، سب سے پہلے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بَلٰی۔ ''بے شک آپ ہمارے ربّ ہیں''۔

آپ کا فرمانا تھا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ کلمہ نکلا بَلٰی' بَلٰی بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے بول سے سب انسانوں کے دل میں ڈال دیا گیا۔ اور تمام انسان بولے کہ بَلٰی، بَلٰی، بَلٰی بے شک آپ ہمارے پروردگار ہیں۔ گویا سب سے پہلے معلم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے سب انبیاء علیہم السلام بولے اور انبیاء علیہم السلام کے بولنے سے تمام انسانوں تک یہ تعلیم پہنچ گئی۔

تو سب نے اللہ کے مالک ہونے اور رب ہونے کا اقرار کیا اور اس کی ربوبیت کو مانا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اس عہد کو یاد رکھنا دنیا میں جب جاؤ گے تو اس عہد کو بھولنا نہیں ہم انبیاء علیہم السلام کو بھیجیں گے، جو آکر تمہیں یاد بھی دلائیں گے۔ پھر اپنی زندگی صحیح کر کے کل کو ہمارے سامنے آنا اور عہد کو دل میں رکھ کر لانا۔ یہ مت کہنا کہ ہمیں تو کسی نے کچھ بتلایا ہی نہیں تھا، ہم کو کسی نے تعلیم ہی نہیں دی تھی۔ ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ.﴾ ② ''قیامت کے دن یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ ہم تو غافل تھے۔ نہ کسی کو رب جانتے تھے نہ کسی کو مالک و خالق۔ ہمیں یہ کسی نے بتلایا ہی نہیں تھا''۔

تو فرمایا کہ: ہم اپنا ''رب ہونا'' بتلا رہے ہیں۔ اور ہم سب کے باپ آدم علیہ السلام کو اللہ نے گواہ بنایا اور فرمایا کہ آدم! میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ربوبیت کا اقرار ان سب کے دل میں ڈال دیا۔ زمین کو گواہ کیا آسمان کو بھی گواہ کیا، کہ ہم نے تمہیں تعلیم دے دی اور جمال دکھلا کر اپنی محبت بھی پیدا کر دی اور سوال کا جواب دلا کر اپنی ربوبیت کا اقرار کرالیا کہ میں تم سب کا رب ہوں اور یہ کہ تم غافل نہیں ہو۔

یہی وجہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان اپنے دل میں ایک جمال محسوس کرتا ہے کہ میرا مالک اور خالق کوئی ضرور ہے۔ ''اور ہے بھی ایک''۔ یہ انسان کو سمجھ آتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی فطرت میں اقرار موجود ہے۔ ہر ایک کے اندر عشق و محبت خداوندی ڈلی ہوئی ہے، جسے ہر انسان محسوس کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام آکر اسے دعوت دیتے ہیں۔ اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ محبت کو کس طرح ظاہر کیا جائے۔ اس ربوبیت کے اقرار کو کس عمل سے نمایاں کرے۔ وہ تعلیم دے کر اس کی تفصیل کر دیتے ہیں۔ اجمالاً ہر ایک انسان کے دل میں یہ جذبہ موجود ہے۔

احوالِ برزخ...... تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ: آپ کا یہ سفر وہاں سے شروع ہوا تھا، وہاں سے یہ

---

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲.

② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲.

حرکت ہوئی آدم علیہ السلام کی اولاد ہوئی پھر اولاد کی اولاد اور آگے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ انسان اپنے اپنے والد کی پشتوں میں منتقل ہوتے رہے۔ تو پہلی منزل جہاں سے انسان چلا ہے وہ آدم علیہ السلام کی پشت ہے اور پھر اپنے باپ در باپ کی طرف منتقل ہوا۔ اس کے بعد پھر ہر انسان اپنی اپنی ماں کے پیٹ کی طرف منتقل ہوا۔ نو مہینے وہاں قیام کیا۔ یہاں اسے غذا ملی کچھ اسے سکھایا گیا، نو مہینے کی مدت گزار کر گاڑی آگے چلی، پھر دنیا کا اسٹیشن آ گیا۔ پھر دنیا میں کسی کی عمر چالیس برس، کسی کی پچاس برس، کسی کی ساٹھ اور سو برس اور کسی کی دو سو برس۔ پہلی امتوں کی بارہ بارہ سو، اٹھارہ سو برس عمریں ہوئیں۔ اب عمریں کم ہو گئیں۔ تو انسان آتے رہے اور اپنی اپنی عمر کے مطابق قیام کرتے رہے۔ جب دنیا میں اس کی عمر ختم ہوئی تو عالم برزخ میں پہنچ گیا، جس کو قبر کہتے ہیں۔ اور قبر یہ نہیں جس کو ڈیڑھ گز کا گڑھا بتلایا جاتا ہے۔ یہ تو اس کی علامت ہے۔ وہ ایک مستقل جہاں ہے جس کو برزخ کہتے ہیں، جو دنیا اور آخرت کے بیچ میں ہے۔ اس کا تعلق کچھ دنیا سے ہے اور کچھ آخرت سے ہے۔ مرنے والا بالکل دنیا میں بھی نہیں رہتا اور بالکل آخرت میں بھی نہیں پہنچتا، بلکہ بیچ بیچ میں رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ: قبر میں جنت کی کچھ کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں اور آدمی جنت میں اپنے مقام کو دیکھ لیتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ: "یَـارَبِّ اَقِـمِ السَّـاعَةَ" ① اے اللہ جلدی قیامت کر دے تا کہ اس مقام کریم تک پہنچ جاؤں۔ وہاں سے خوشبوئیں آتی رہتی ہیں اس میں "یہ مست" رہتا ہے۔ تو آخرت بھی سامنے ہے اور دنیا بھی سامنے ہے کہ کوئی ثواب پہنچائے تو پہنچ جاتا ہے۔

قبر پر زیارت کے لئے کوئی جائے تو حدیث ہے کہ قبر کی زیارت کا ادب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے میت کی طرف منہ کرے میت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے۔ تو ادھر اس کا رخ جنت کی طرف ہے اور ادھر اس کا رخ دنیا کی طرف ہے۔ وہاں سے ہوائیں آ رہی ہیں، ادھر سے دعائیں اور ثواب پہنچ رہا ہے۔ خود اہل برزخ بھی دنیا والوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ: مرنے والے کو جب نعمتیں ملتی ہیں اور قبولیت ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ! جتنے میرے عزیز اور مسلمان بھائی ہیں اس وقت تک انتقال نہ کریں جب تک انہیں تو یہ نصیب نہ ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے گناہوں سے معافی نہ چاہ لیں۔ تا کہ پاک صاف ہو کر یہاں پہنچیں جیسے تو نے مجھے پہنچایا ہے۔ تو ہر ہر میت اہل دنیا کے لئے دعا کرتی ہے اور دنیا والے میت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ "اَللّٰهُـمَّ اغْـفِـرْهُـمْ وَارْحَمْهُمْ." اے اللہ ان کی مغفرت فرما کر ان پر رحم فرما "اَعْـلِ دَرَجَـاتِهِمْ فِي الْفِرْدَوْسِ." ان کے درجات فردوس میں بلند فرما۔ تو ہم ان کے لئے دعا گو ہیں۔ وہ ہمارے لئے دعا گو ہیں۔ ان کی دعاء کا ہدیہ ہم تک پہنچتا ہے اور ہمارے ثواب کا ہدیہ ان تک پہنچتا ہے۔

① المسند للامام احمد، ج: ۳۷، ص: ۴۹۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح الترغیب والترهیب باالتعلیق للالبانی ج: ۳ ص: ۲۱۹.

اس واسطے فرمایا گیا کہ: میت پر رونے کی ضرورت نہیں۔ روئے دھوئے تو تب جب ہمیشہ کے لئے جدائی ہو۔ یہ چند دن کی جدائی ہے۔ ہم بھی وہیں پہنچ جائیں گے، جہاں وہ پہنچا ہے۔ تو زیادہ رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ قبر پہ جا کے آپ ثواب پہنچائیں ان کو مل گیا۔ انہوں نے دعا کا ہدیہ بھیجا وہ آپ کو مل گیا۔ تو یہ کیا جدائی ہوئی؟

یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا کوئی عزیز ہندوستان چلا جائے تو وہاں سے خط کی بھی آمد ورفت ہے، ہدیہ بھی جاتا ہے۔ سلام وکلام بھی پہنچتا ہے۔ اس لئے آدمی روتا نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ جب جی چاہے گا مل لوں گا اور آدمی کی ملاقات تو گویا ہوتی ہی رہتی ہے۔

اس واسطے فرمایا گیا کہ: میت پر اتنا رونا دھونا کہ آدمی نوحہ، بیان، بکاء کرے، ماتم کرنے لگے، گریبان پھاڑ ڈالے، رخسار نوچ ڈالے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا بھی اظہار ہے۔ اور بے وقوفی بھی ہے۔ اتنا تو تب روئے جب یہ بات ہو کہ اب کبھی ملنا نہ ہوگا۔ یہ چند دن کی جدائی ہے پھر ملاقات ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ جس کو ہم قبر کہتے ہیں وہ ڈیڑھ گز کی جگہ نہیں ہے وہ دراصل عالم برزخ ہے، جو اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیا جیسے لاکھوں عالم اس میں بن سکتے ہیں، تو انسان عالم برزخ کی طرف منتقل ہو گیا اور جب بھی منتقل ہوتا ہے ترقی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

آدم علیہ السلام کی کمر سے جب نکلا تو حدیث میں ہے کہ: تمام انسان چیونٹیوں کی طرح تھے۔ ماں کے پیٹ میں آیا تو قد وقامت بڑھ گیا، غذا بھی ملنے لگی۔ دنیا میں آیا تو قد وقامت اور بڑھ گیا۔ غذا بھی بڑھ گئی۔ وہاں حیض کا خون ملتا تھا یہاں صاف دودھ ملنے لگا۔ مٹھائیاں عمدہ غلّے، ترکاریاں، پھل، پھول اور فروٹ ملنے لگے۔ ماں کے پیٹ میں یہ نہ تھے وہ تنگ جہان تھا۔ جبکہ دنیا میں ماں کے رحم جیسے کروڑوں جہان بن سکتے ہیں۔

اب انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ: تم آہستہ آہستہ ترقی کے عالم میں پہنچ رہے ہو۔ اس کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے اور وہ اتنا بڑا ہے، کہ دنیا جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں اور وہ عالم برزخ ہے۔ وہاں نعمتیں اور راحتیں بھی ہوں گی۔ دنیا میں اگر بے چین رہے گا مگر ایمان تھا تو قبر کے اندر راحت ملے گی۔

حدیث میں ہے کہ: جب سوال و جواب قبر میں ہو چکے گا۔ اور منکر نکیر کو سب کا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام تھا۔ میرے پیغمبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو غیبی آواز پیدا ہوگی کہ "اَنْ صَدَقَ عَبْدِیْ." میرے بندے نے سچ کہا۔ "فَافْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَ اَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا مِّنَ الْجَنَّةِ." اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دو۔ جنت کے فرش بچھاؤ جنت کا لباس بھی دو۔ اور "وَيُوَسَّعُ لَهٗ قَبْرُهٗ مَدَّ بَصَرِهٖ." قبر اتنی وسیع کر دی جاتی ہے کہ جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے میدان ہی میدان نظر آتا ہے۔ آسمان تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے زمین سے آسمان تک پانچ سو برس کا راستہ ہے۔ قبر میں ہر انسان کو اتنا بڑا عالم ملے گا جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے۔ تو عالم برزخ میں دنیا جیسے لاکھوں عالم بن جائیں معلوم ہوا کہ انسان

ترقی کی طرف ہے۔ ①

برزخ میں پہنچ کر پھر انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ: ایک اور عالم آنے والا ہے جو اس سے بھی بڑا ہوگا۔ اور وہ محشر ہے۔ اس عالم کی کل عمر تو چند صدیوں کی ہوگی۔ اس عالم کا پچاس ہزار برس کا ایک دن ہوگا۔ ایک دن میں سارے اولین و آخرین انسان جمع ہونگے اسکے بعد پھر انبیاء علیہم السلام نے فرمایا کہ: ایک اور عالم آنے والا ہے جس کا نام جنت ہے وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ عالم برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں۔ اس لئے عالم برزخ میں ایک آدمی کو اتنا حصہ ملتا ہے جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے اور جنت میں ادنیٰ جنتی کو جو حصہ ملے گا اس دنیا کے دس گنا کے برابر ہوگا۔ تو اندازہ کیجئے جنت کتنا بڑا عالم ہے۔

تو انسان ''عالم الست'' سے چلا، عالم رحم میں آیا۔ عالم رِحم سے چلا، عالم دِنیا میں آیا، عالم دِنیا سے چلا، عالمِ برزخ میں آیا۔ عالمِ برزخ سے منتقل ہوا، عالمِ محشر میں پہنچا۔ عالم حشر سے منتقل ہوا، جنت میں پہنچا۔ اور جنت میں روزانہ ترقی ہوگی، نئے نئے عالم انسان پر کھلیں گے عجائبات ظاہر ہوں گے۔ طرح طرح کی نعمتیں نمایاں ہوں گی۔ اس لئے کہ انسان میں تجدد پسندی کا جذبہ ہے کہ نئی نئی چیزیں اس کے سامنے آنی چاہئیں۔ اگر ہمیشہ پرانی چیزیں رکھی رہیں، آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔ اگر روز پلاؤ کھانے کو ملے تو دوسرے دن جی گھبرا جائے۔ کسی دن دال، کسی دن چاول، کسی دن پلاؤ، روز نئی چیز ہو تو انسان کی طبیعت بہلتی رہتی ہے۔ اور روز ایک ہی غذا ہو، چاہے وہ اعلیٰ ہو تو بھی آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔

اس واسطے دنیا میں موٹر کاریں ہیں، ہر سال ان کا نیا ماڈل تیار کیا جاتا ہے۔ مکانات کے نقشے بدلتے رہتے ہیں۔ کل کچھ اور رنگ کا مکان تھا۔ آج اور رنگ کا۔ آج کل امریکن اسٹائل مکان چلے ہیں۔ ان کا کچھ اور ہی نمونہ ہے۔ سو برس کے بعد دنیا میں معلوم نہیں کیا نمونہ بن جائے۔ تو یہ انسان کی فطرت ہے کہ نئی نئی چیز سامنے آئے۔ جنت کی نعمتیں کتنی ہی پر لطف ہوں لیکن اگر ایک ہی قسم کی نعمتیں ہوتیں اور ابد الآباد تک رہتیں، تو آدمی گھبرا جاتا اس لئے روز نئے نئے سامان ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ: جنت میں ایک عالیشان محل ہے۔ جس میں انسان مقیم ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر جو نگاہ اٹھاتا ہے اب تک معلوم تھا کہ سبز رنگ ہے۔ دوبارہ جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اب سرخ ہوگیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نگاہ کی معلوم ہوگا کہ زرد رنگ ہوگیا۔ تو محلات کے رنگ نئے نئے آتے رہیں گے۔ نئے نئے جہاں کھلتے رہیں گے۔ نئی نئی نعمتیں سامنے آتی رہیں گی۔ اور نشاط پہ نشاط پہنچتا رہے گا۔ معلوم ہوا کہ جنت میں بھی حرکت ہی رہے گی۔ اور ختم ہونے والی نہ ہوگی بلکہ عروج ہوتا رہے گا گویا اصل ترقی وہاں ہوگی۔

بہر حال مجھے ان ترقیات کی تفصیل بیان کرنا نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ انسان حرکت میں ہے۔ اب بھی آپ حرکت میں ہیں۔ قبرستان میں بھی حرکت میں رہیں گے۔ جنت میں جا کر عالم متعین ہو جائے گا۔ مگر نعمتوں

اور لذائذ کی ترقی جاری رہے گی تو اتنی لمبی حرکت کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ تھوڑی سی حرکت، گھر سے مدرسہ اور خانقاہ تک کی جائے تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ چند گھنٹوں کی حرکت ہوتی ہے یہ تو ہزاروں برس کی حرکت ہے۔ تو اتنی طویل حرکت ہو اور بلا مقصد ہو۔ یہ عقل بالغ نہیں مانتی۔ عقل سلیم یہ قبول نہیں کرے گی کہ: انسان ایسے ہی بے کار حرکت کر رہا ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ عقل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اللہ نے اسے عبث و بے کار پیدا نہیں فرمایا۔

زندگی کی حقیقت...... بلکہ یہ آپ کی زندگی، یہ خود ایک مستقل حرکت ہے، جو آدمی کے اندر بہت دور تک چلتی رہے گی۔ جب تک آدمی کا بدن حرکت کرتا رہے گا، کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ جب حرکت ختم ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ آدمی مر چکا ہے۔ قلب حرکت کرتا رہے، کہتے ہیں کہ قلب زندہ ہے۔ اگر قلب کی حرکت ختم ہو جائے، تو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تو حرکت بند ہو جانے کا نام موت اور حرکت کے جاری رہنے کا نام زندگی ہے۔ انسان کی آنتیں جب تک حرکت کرتی رہتی ہیں فضلات خارج ہوتے رہتے ہیں، آدمی تندرست رہتا ہے۔ اگر آنتیں حرکت نہ کریں، ان میں غذا پڑی رہے، قبض ہو جاتا ہے، وہی موت کا پیش خیمہ ہے۔ تو آنتیں، دل، جگر اور دماغ سب حرکت میں ہیں، حتیٰ کہ عقل انسانی بھی حرکت میں ہے۔ آدمی اس سے کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ کل کیا ہوگا؟ پرسوں کیا ہوگا؟ گویا ہر وقت دماغ حرکت میں ہے۔ اگر حرکت بند ہو جائے، کہا جائے گا کہ فلاں آدمی بے وقوف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عقل نہیں۔ تو ایک ایک قوت اور عضو حرکت کرتا رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو نہ صرف انسان بلکہ زندگی بھی حرکت میں ہے۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: انسان ازلی تو نہیں کہ ہمیشہ سے تھا، مگر ابدی ضروری ہے کہ پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں۔ ابدالآباد تک زندہ رہے گا۔ جگہیں بدلتی رہیں گی ایک عالَم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے عالَم میں۔ تو مکان اور جہاں بدلتے رہیں گے اور انسان باقی رہے گا۔

کیا مقصدِ زندگی خورد و نوش ہے؟...... تو اس قدر طویل زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مقصد بھی اتنا طویل ہونا چاہئے جتنا لمبا سفر ہے۔ سفر تو ہزاروں برس کا ہو اور مقصد معمولی سا ہو، وہ اس کے اوپر چسپاں نہیں ہوگا۔ مقصد اتنا اونچا اور بلند ہونا چاہئے جو اس کی لمبی عمر کے مناسب ہو، جتنا ہی بڑا سفر اتنا ہی بڑا اور شن ہونا چاہئے۔ تو وہ کیا مقصد ہے جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے اور اتنا لمبا سفر اختیار کیا؟

فرض کیجئے یہ مقصد ہو کہ بس آپ روٹی کھا لیجئے۔ یہ بھی ایک مقصد ہے کہ کچھ پیسے جمع کیے، کچھ روٹیاں کھائیں کچھ مزے اڑائے۔ بس آدمی ختم ہو گیا۔ تو اتنا لمبا سفر اور اس کے لئے مقصد صرف روٹی۔؟ (کَلَّا وَ حَاشَا) روٹی تو جانور بھی کھاتے ہیں۔ پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ جو گائے، بھینس، بکری ہیں وہ سب اس مقصد کو ادا کر رہی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات اتنی بلند مخلوق اور اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ کہ روٹی

کھالے اور ختم ہو جائے۔ (یا ایسے اسباب و وسائل میں زندگی گنوا دے جن کا نتیجہ بہر صورت روٹی ہو۔ مثلاً تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ، یا باقی اسباب معاش جو روٹی کو نتیجہ کے طور پر میسر کرتے ہوں) یہ کوئی اہم مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ اہم مقصد ہوتا تو جو اس مقصد کو زیادہ عمدگی سے انجام دیتا، وہ اشرف المخلوقات ہونا چاہئے تھا۔ وہ انسان نہیں ہوسکتا۔ اس لحاظ سے ہاتھی بھینس اور گائے وغیرہ اشرف المخلوقات بنتے۔ انسان نہ بنتا۔ یہ اتنا نہیں کھا سکتا جتنا یہ جانور کھاتے ہیں۔ اگر کھانے کے لئے بیٹھ جائے تو ہاتھی کے برابر نہیں کھا سکتا۔ نہ پیٹ اتنا ہے نہ ہاضمہ اس جیسا ہے۔ اس لئے اس طویل زندگی کا مقصد ظاہر ہے کہ وہ روٹی تو نہیں ہوسکتی۔ اتنی لمبی چوڑی حرکت کی زندگی، کیا محض اللہ نے اس لئے دی کہ چند لقمے کھالئے جائیں۔ یہ تو عارضی سی بات ہے پھر یہ کہ کھانے کا مقصد در حقیقت یہ ہوتا ہے کہ بدن باقی رہے۔ اس کے باقی رہنے کا کیا مقصد ہے؟ پھر مقصد کی تلاش شروع ہوگئی۔ تو روٹی اگر مقصد بنتی، وہ مستقل چیز بنتی، حالانکہ وہ بدن کے پالنے کا ذریعہ ہے۔ پھر سوال اپنی جگہ قائم، کہ روٹی بدن کے پلنے کا ذریعہ ہوتی۔ پھر بدن کے پلنے سے کیا مقصد؟

اور اگر فرض کیجئے روٹی مقصد ہو بھی تو اتنی لمبی چوڑی عمر اور یہ مقصد؟ یہ مقصد تو پھر جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ جانور بھی آخر کھاتے پیتے ہیں۔ اگر آپ نے کھا پی لیا تو کونسا کمال کیا؟

آپ کہیں گے صاحب ہم تو پلاؤ، زردہ اور مرغ کھاتے ہیں۔ جانور تو یہ نہیں کھاتے۔ میں کہتا ہوں کہ جانور کیوں مرغ نہیں کھاتے۔ کیا بلی مرغی نہیں کھاتی اور شیر، گائے کو نہیں پھاڑ کھاتا؟ آپ نے گائے کا گوشت کھالیا تو کیا کمال کیا؟ بھینسا وہ بھی کھالیتا ہے آپ بھی کھالیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مصالحہ نہیں ڈالتا تو مصالحہ ڈالنا بھی کون سے کمال کی بات ہے؟ مصالحوں سے تو بلکہ گوشت کا اصل ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ صحیح طور پر گوشت کو پکایا جائے۔ تھوڑا سا نمک مرچ ملا کے کھالیا گوشت کا اصل ذائقہ رہے گا۔ یہ مصالحوں کی بھرمار سے تو اصل ذائقہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہوائی جہاز کا کھانا بڑا اچھا ہوتا ہے۔ وہ گوشت کو خاص طریق سے پکاتے ہیں۔ نہ اس میں نمک، نہ مرچ، نہ مصالحہ۔ ترکاری سامنے رکھ دی۔ نمک مرچ ڈالو اور کھالو۔ اس طرح ترکاری کی اصل مٹھاس قائم رہتی ہے اور ہم اتنے مصالحے بھر دیتے ہیں کہ ترکاری کی اصل مٹھاس اور حلاوت ختم ہو جاتی ہے۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بھی مرغ کھایا اور بلی نے بھی مرغ کھالیا۔ اس نے اصل ذائقہ چکھا آپ نے بدلا ہوا۔ آپ تو گھاٹے میں رہے اور اس نے اصل گوشت کھایا۔ یہ کون سا کمال ہے؟ اگر یہ کمال ہوتا، پھر بلی بھی اشرف المخلوقات ہوتی۔ تو کھانا کوئی مستقل کمال نہیں۔ کھانا ضرورت کے لئے ہے تاکہ بدن باقی رہے اور کھانا کھاتے ہوئے انسان کا جی گھبراتا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ کام زیادہ ہے کھانا وانا تو ہوتا ہی رہے گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کو اصل مقصد نہیں سمجھتے ہیں۔ تو کھانا کوئی اہم چیز نہیں۔ اگر ہمیں کوئی ایسا طریقہ ہاتھ لگ جائے کہ بلا کھائے پیئے ہم کام کرتے رہیں، تو شاید کھانے کی طرف رخ بھی نہ کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات

ہے کہ بلا کھائے پیئے زندگی باقی نہیں رہتی۔

مجھے اس پر اپنے بزرگوں کی ایک حکایت یاد آ گئی۔حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، جو میرے دادا بھی ہیں،ان کے زمانے میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیا نند سرسوتی جنہوں نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔وہ یو۔پی میں سہارن پور کے ایک قصبے میں آئے اور آ کر انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسلمانوں کا عالم میرے مقابلے میں مناظرہ کرنے کے لئے آئے۔اور یہ بھی اعلان کیا، کہ کسی چھوٹے موٹے عالم سے میں مقابلہ نہیں کروں گا۔مولبی کاسم (مولوی قاسم) کو بلاؤ۔ان سے مقابلہ کروں گا۔حضرت اس زمانے میں کچھ بیمار تھے مگر وہاں کے خدام نے لکھا کہ حضرت یہ صورت حال ہے اس لئے آپ ہی کو آنا ہوگا کیونکہ اس نے تو اعلان اور چیلنج کیا ہے کہ مولبی کاسم سے مناظرہ ہوگا۔اسی بیماری کی حالت میں حضرت تشریف لے گئے۔وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تو آئیں گے نہیں۔جب حضرت پہنچ گئے تو جناب نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جان کس طرح چھوٹے، بھاگوں کس طرح؟

منشی نہال احمد صاحب، حضرت کے خادم خاص تھے۔یہ بڑے ذہین وذکی تھے۔حضرت نے ان کو پنڈت جی کے پاس بھیجا کہ آپ جا کے مناظرہ کی شرائط طے کریں کہ کن احوال اور شرائط پر مناظرہ ہوگا۔کیا صورت اختیار کی جائے گی تاکہ پھر مناظرہ ہو سکے۔منشی صاحب پہنچے تو پنڈت جی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔انہوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں پنڈت جی تشریف رکھتے ہیں۔وہاں ایک بہت بڑی پرات (تھال) جس میں بہت سا حلوئی پوری، ترکاری اور بہت کچھ۔غرض دس پندرہ سیر وزن کا ملبہ اس کے اندر بھرا ہوا۔وہ لے جایا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کی خوراک تو نہ تھی، انہیں خیال گذرا کہ کمرے میں ایک آدمی تو نہیں ہوگا۔ایک آدمی آخر کتنا کھالے گا؟ پنڈت جی کے اعزاز میں بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔اس لئے یہ انتظار میں کمرہ سے باہر بیٹھے رہے۔کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ پرات آئی، وہ بالکل خالی تھی، وہ یہی سمجھے کہ کئی آدمی ہوں گے ایک آدمی تھوڑا اتنا کھا سکتا ہے۔اس کے بعد ان کو بلایا گیا، دیکھا کہ پنڈت جی اندر اکیلے بیٹھے ہیں۔یہ حیران ہوئے کہ ایک آدمی پندرہ بیس سیر کا ملبہ کس طرح کھا سکتا ہے؟ دل میں خیال کیا کہ جس کمرہ مین پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ممکن ہے اس میں کوئی دروازہ دوسری طرف ہو۔لوگ کھا کے ادھر سے نکل گئے ہوں، مگر وہاں تو کوئی دروازہ نہیں تھا۔یہی ایک دروازہ تھا جس سے یہ خود داخل ہوئے تھے۔پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ پنڈت جی کے ساتھ کسی اور نے بھی کھانا کھایا ہے۔لوگوں نے کہا کہ نہیں اور تو کوئی شریک نہیں تھا۔اب یہ حیران ہوئے کہ یہ ایک آدمی ہے یا آدمی سے باہر کوئی خاص قسم کا انسان یا جانور ہے جو اتنا کھا گیا (کہ خدا کی پناہ)۔

جب واپس آئے، انہوں نے حضرت کو شرائط بتلائیں۔اس کا سنانا تو مقصود نہیں ہے۔لیکن جب حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے بات چیت کر چکے تو باہر آ کے اپنے ہمجولی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور

مولانا محمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت کے شاگرد اور ان کے ساتھ تھے، سے بات کی کہ بھائی مجھے تو ایک فکر پیدا ہوگیا ہے، بڑی پریشانی ہوگئی اور اس کا حل بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ سب ساتھی متوجہ ہوئے کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ پریشانی یہ ہے کہ جب مناظرہ ہوگا، حضرت اِنشاء اللہ جیتیں گے، اس لئے کہ حق پر ہیں اور مناظرہ علم میں ہوگا تو علم میں ہمارے حضرت سے بڑا کوئی عالم ہم نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرت ہی غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہوگیا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ ایک ہنسی کی بات تھی۔ لوگ ہنس کے چپ ہوگئے۔ شدہ شدہ بات حضرت کے پاس پہنچ گئی۔

حضرت نے انہیں بلایا۔ اور فرمایا منشی جی! آپ نے کیا بات کی؟ یہ بے چارے، بہت گھبرائے اس لئے کہ مذاق کی بات تھی۔ اپنے دوستوں میں کردی۔ اب اپنے شیخ کے آگے خاموش۔! کہیں تو کیا کہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ: جو تم نے کہا ہے میں سن چکا ہوں۔ ذرا تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں تا کہ تمہیں جواب بھی بتلا دوں۔ اس لئے کہ تم نے یہ ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور حل طلب ہے۔ تو مجھے اس کا حل بھی بتلانا ہے۔ مگر اپنی زبان سے کہو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت میری زبان سے یہ نکلا تھا، کہ اگر علم میں مناظرہ ہوا تو انشاء اللہ ہمارے حضرت غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ اس لئے کہ پنڈت تو بیس سیر کا ملیدہ کھا جائے گا اور آپ سے آدھی چپاتی بھی نہیں کھائی جائے گی۔

حضرت نے فرمایا کہ: اس کے دو جواب ہیں۔ ایک ہنسی کا جواب ہے اور ایک حقیقی اور تحقیقی جواب ہے۔ ہنسی کا الزامی جواب یہ ہے کہ کیا سارے مناظروں کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں تم لوگ کس کام کے لئے ہو؟ اگر کھانے میں مناظرہ ہوگیا۔ میں تم کو آگے کر دوں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ: تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ کھانے میں مناظرہ ہو تو کون جیتے گا؟۔ فرمایا کہ کھانا بہائم اور جانوروں کی علامت ہے، تو مناظرہ بہیمیت اور جہالت میں ہوتا ہے یا علم میں؟۔ فرمایا اگر بہیمیت میں مقابلہ ہوا تو ہم پنڈت جی کے مقابلے میں بھینسے، ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھاؤ ان کے مقابلہ میں جتنا کھاتے ہو؟

اور فرمایا کہ: تمہارے دل میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟۔ فرمایا اس کے لئے بھی ہم تیار ہیں کہ کھانا کھلانے کے بعد پنڈت جی بھی ایک کمرے میں بند کر دیئے جائیں اور ہمیں بھی بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد نکلیں جو زندہ ہوگا، وہ حق پر ہوگا۔ تو کھانا یہ بہائم کی عادت ہے جو جہالت کا سرچشمہ ہیں۔ اور نہ کھانا، یہ فرشتوں کی عادت ہے، جو علم کا سرچشمہ ہیں۔ اور مناظرہ علم میں ہوا کرتا ہے جہالت میں نہیں ہوا کرتا، جہالت میں مناظرہ ہوا تو جانوروں کو مقابلہ میں پیش کریں گے۔ علم میں مناظرہ ہوا تو ہم مناظرہ کریں گے۔

یہ بات اس پر یاد آگئی تھی کہ انسان جب اشرف المخلوقات ہے تو کھانا کھانا اس کی کوئی ایسی خصوصیت نہیں

ہے کہ انسان ہی کھاتا ہو۔ انسان سے زیادہ بھینسا بھی کھا سکتا ہے۔ تو انسان کی زندگی کا یہ مقصد تو نہیں ہوسکتا کہ وہ روٹی کھالے۔ اور مقصد حاصل ہوگیا۔ اور اس لئے اتنا لمبا سفر کہ آدم علیہ السلام کی کمر سے نکلے۔ ماں کے پیٹ میں آئے۔ دنیا میں آئے اور مقصد یہ ہو کہ کچھ کھا پی لے۔ یہ کیا مقصد ہوا؟ یہ کوئی اہم چیز نہیں، یہ تو بہیمیت کی علامت ہے۔ گو انسان میں بہیمیت ہے اللہ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ کھائے پیئے۔ وہ بھی اچھا کھاتا پیتا ہے۔ خوشنما بنا کے کھاتا پیتا ہے۔ مگر مقصدِ زندگی یہ نہیں ہوسکتا۔

روحانی قوت کی کرشمہ سازیاں...... ملائکہ علیہم السلام زندہ ہیں۔ وہ کون سا گوشت روٹی کھاتے ہیں؟ ذکر اللہ ہی سے تو زندہ ہیں۔ اصل زندگی ذکر اللہ کا نام ہے۔ چونکہ ہم اس کوچے سے واقف نہیں، ذکر اللہ کی کوئی کیفیت ہمارے قلب میں نہیں اس لئے ہم غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ زندگی کھانے پینے کا نام ہے ورنہ اصل میں زندگی محبوب کا نام لینا ہے کہ آدمی محبوب کا نام لے۔

اگر دنیا میں کسی کو کسی سے محبت ہوجائے اور محبوب چلا جائے۔ وہ فراق وہجر میں رو رہا ہے، پریشان ہو رہا ہے۔ روتے روتے ضعیف ہوگیا ہے۔ بالآخر چارپائی کو لگ گیا۔ اچانک اس نے کہا، او تیرا محبوب آ گیا۔ ایک دم اٹھ کر بیٹھ جائے گا کہ کہاں ہے؟ یہ جو ایک دم جان آ گئی یہ کہاں سے آئی کیا کوئی روٹی کھالی تھی۔؟ کوئی پانی پیا تھا؟ محبوب کا نام ہی تو سامنے آیا۔ معلوم ہوا کہ زندگی کی قوت درحقیقت محبوب کا وصال ہے، روٹی اور کپڑا یہ زندگی کی قوت نہیں ہے یہ تو عوارض میں سے ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ۔

ہر چند کہ پیر و خستہ و ناتواں شدم ہردم نگاہ بروئے تو کردم بس جواں شدم

میں بوڑھا بھی ہوگیا، خستہ وکمزور بھی ہوگیا، ناتواں بھی ہوگیا۔ مگر جب تیرے چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ایک دم جواں ہو جاتا ہوں، قوت آ جاتی ہے اس لئے کہ محبوب کا جمال جب دل میں کھپ جاتا ہے تو قوت پیدا ہوجایا کرتی ہے۔

دنیا میں آدمی جب ان چھوٹے چھوٹے محبوبوں کی قوت سے زندہ ہوتا ہے، اگر کسی کے دل میں اللہ کی محبت سما جائے تو اس کی زندگی کا کیا ٹھکانہ؟۔ انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتے ہیں اس لئے ان کی زندگی کی قوت محبوب کا نام اور اس کا ذکر ہے۔ روٹی پانی سے انبیاء علیہم السلام زندہ نہیں ہیں۔ ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اگر ایک حبہ (دانہ) بھی نہ کھائیں تو بھی ان کی زندگی میں فرق نہیں پڑسکتا۔ وہ اپنی عبدیت ظاہر کرنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں اور امت کے لئے سنت قائم کرنا مقصد ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ عمل کر کے نہ دکھائیں ہم کس طرح سے کھائیں پیئیں؟ ہمارے لئے نمونہ کیا بنے؟ تو اسوہ حسنہ کے طور پر کھاتے ہیں۔ زندگی کی بقاء کے لئے نہیں، وہ اللہ کے ذکر سے ہے۔

آج اگر ہمیں یہ مقام میسر آ جائے کہ ہم بھی ذکر اللہ سے زندہ رہ سکیں تو کبھی روٹی کی طرف رخ بھی نہ

کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات ہے۔ ذکر اللہ سے ہم ناواقف، غلط فہمی میں مبتلا کہ زندگی روٹی سے قائم ہے اس لئے روٹی کی طرف لپکتے ہیں۔ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرے دادا، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ اولیائے کاملین میں سے تھے، نے وفات سے دو مہینے پیشتر یہ فرمایا کہ ”بحمد اللہ مجھے زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت باقی نہیں رہی۔ محض اِتباعِ سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں، ورنہ حاجت نہیں“۔

یعنی ذکرِ خداوندی دل و دماغ کے اندر اتنا رچ چکا ہے کہ اب اسی سے زندہ ہوں۔ پھر بھی اِتباعِ سنت کے لئے کھاتے تھے، تاکہ اس پر بھی اجر و ثواب مل جائے۔ اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا طریقہ آ جائے کہ بلا کھائے پیئے ہم زندہ رہیں۔ کبھی کھانے پینے کی طرف دھیان نہ کریں۔ کون اس مصیبت میں پڑے کہ صبح سے شام تک چولھا جھونکو۔ اور کھیتی کرو، وہاں سے غلہ آئے، وہ پسے، ایک مصیبت ہے۔ جب ہم اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو کیا ضرورت اس مصیبت میں پڑنے کی؟

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اول تو روٹی مقصد نہیں، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں اور اگر کسی درجہ میں ہوتا بھی تو یہ مقصد جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ انسان کو آخر اتنی بڑی زندگی کیوں دی گئی؟ یہ حقیر چیز ہے اور زندگی بڑی عظیم چیز ہے۔ عظیم چیز کے اوپر ایسا تھوڑا سا مقصد مرتب ہو۔ یہ حکمت خداوندی کے خلاف ہے۔

اصل میں کھانے کو چھوڑنا یہ کمال کی علامت ہے۔ کھانا کمال کی علامت نہیں انبیاء علیہم السلام بھی بقدر ضرورت کھاتے پیتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت یہ تھی کہ دن بھر گھوڑے کی پشت پر سوار رہتے، کھانے کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی، ہر وقت جہاد میں مشغول ہیں۔ بعض کے پاس بغل میں چند ٹکڑے پڑے ہوتے، وہ کھا لیتے تھے۔ اور بعض کے پاس وہ چند ٹکڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ کھجور کی چند گٹھلیاں ہی پڑی ہوتی تھیں جب بھوک نے بہت ستایا، بس وہ منہ میں ڈال کے نفس کو بہلا دیا کہ ہم بھی کچھ کھالیں۔ ورنہ وہ کھانے کی کیا چیز ہوتی ہے۔ کھانا تو یہ تھا اور محنت اور جدوجہد یہ کہ چوبیس گھنٹے گھوڑے کی پشت پر سوار ہیں اور جہاد میں مصروف ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ کر رہے تھے۔ تو کمال انکا سمجھا جائے گا۔ جنہوں نے کھانا ترک کیا۔ کھانا کھانا کوئی کمال کی چیز نہیں۔ اہل کمال جتنے بھی ہیں، وہ کم ہی کھاتے تھے۔ اس لئے انبیاء نے کم کھایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کم کھایا۔ حتیٰ کہ اولیاء اللہ نے بھی کم کھایا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ جو چشتیہ سلسلہ کے مشائخ میں سے ہیں، وہ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے، چالیس برس سے روزے رکھ رہا ہے اور کوئی روزہ نہیں چھوڑتا۔

شراح لکھتے ہیں کہ یہ خود حضرت شیخ قطب عالم ہی ہیں۔ تو چالیس برس تک پوری غذا کل یہ تھی کہ ایک بادام یومیہ کھاتے تھے۔ اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کو جب ذکر اللہ میں مشغول ہوتے، تو شہر میں اس طرح آواز

گونجتی تھی کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے گھر کے دروازے پر ذکر کر رہے ہیں۔ یہ قوت کھانے کی نہ تھی یہ روحانی قوت تھی جو ذکر اللہ سے پیدا ہوتی تھی۔

اور حدیث میں ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وِصال رکھنا شروع کیا روزہ پر روزہ، بعض صحابہ نے بھی آپ کو دیکھ کر صوم وصال شروع کر دیئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: ''أَيُّكُمْ مِثْلِيْ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ'' ① تم میں مجھ ایسا اور میری مثل کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے میرے اندر طاقت ہے۔ تو وہ کیا چیز کھلائی جاتی تھی؟ آسمان سے کوئی زردہ، پلاؤ اور بریانی کی رکابیاں نہیں اترتی تھیں۔ وہ ذکر اللہ کی طاقت تھی جو رگ وپے میں رچ بس گیا تھا اور سرایت کئے ہوئے تھا۔ یہ مادی قوت نہ تھی۔ اگر ساری عمر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لقمہ بھی استعمال نہ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت میں فرق نہیں آسکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے کھایا پیا ہے، تاکہ امت کے لئے نمونہ بن سکے۔ امت کے لئے راستہ بنے، جائز و ناجائز کا پتہ چلے، ورنہ کھانے کی محتاجگی نہیں تھی۔ حاصل یہ نکلا کہ کھانا پینا کمالی نہیں ہے۔ کھانے کو ترک کرنا کمال ہے۔ دنیا بھی اسی کو کمال سمجھتی ہے۔ اگر ایک شخص بہت کھاتا ہے تو کوئی خیال بھی نہیں کرے گا۔ اگر آپ کسی سے کہیں میں بہت باکمال ہوں اس لئے کہ میں بہت کھاتا ہوں تو وہ کہے گا۔ یہ کون سے کمال کی بات ہے؟ سبھی کھاتے ہیں، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص نظر پڑے جو ہفتہ عشرہ تک کھانا نہیں کھاتا تو مخلوق اس کے پیچھے ہولے گی کہ معلوم ہوتا ہے ولی اللہ ہیں۔ معلوم ہوا دنیا بھی نہ کھانے کو کمال سمجھتی ہے۔ دنیا کے نزدیک کمال بھی کھانے کو ترک کرنا ہے۔ کھالینا یہ کمال نہیں۔ اسی لئے روزے کو اصل عبادت فرمایا گیا۔ روزہ میں ترک طعام ہے کھانا تو نیت سے عبادت بنتا ہے، اپنی ذات سے عبادت نہیں اور روزہ رکھنا یہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اللہ کے ہاں بھی مقبولیت نہ کھانے سے پیدا ہوتی ہے، کھانے سے نہیں ہوتی۔

تو اللہ والوں نے بہت ترک فرمایا ہے ہم تم اللہ والے تھوڑا ہی ہیں۔ ہم صبح سے شام تک کھاتے رہتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ الگ، دوپہر کا کھانا الگ، شام کا الگ اور رات کا الگ۔ اور وہ اتفاق سے چار دفعہ کھانے کے بعد گنجائش نہیں ہوتی۔ ذرا بھی اور گنجائش ہوتی تو ایک دفعہ کا اور اضافہ کر لیتے۔ بہر حال یہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے۔ کمال کھانے کو ترک کر دینا ہے۔ تو اتنی بڑی زندگی کا مقصد متعین کرنا ہوا اور وہ ہو کھانا، یہ تو آپ بھی کمال نہیں سمجھتے اسی واسطے یہ اتنی لمبی حرکت کی منزل مقصود روٹی نہیں بن سکتی۔

کیا مقصدِ زندگی عزّت و اقتدار ہے؟...... پھر آخر کیا مقصد ہے؟ ہوسکتا ہے آپ کہیں دنیا میں اس سفر کا مقصد روٹی نہیں ہے، مگر کرسی، عزت، آبرو، جاہ واقتدار اور منزلت ہو۔ یہ روٹی سے بہر حال اونچے درجے کی چیز ہے آدمی اپنی عزت بچانے کی خاطر پیسہ اور روٹی داؤ پہ لگا دیتا ہے، تا کہ آبرو پر حرف نہ آئے، تو آبرو روٹی سے

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب التنکیر لمن اکثر الوصال، ج:۷،ص: ۱۷.

زیادہ اونچی چیز ہے۔

لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ زندگی کا مقصد یہ عزت بھی نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے کہ جس کو آپ عزت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ دوسرے آپ کو اچھا سمجھیں بس یہی تو عزت ہے۔ اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ دوسرے یہ خیال کریں کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی عزت خیالی چیز ہے۔ کسی نے خیال کرلیا کہ آپ بڑے ہیں تو بڑے بن گئے۔ کسی نے خیال نہ کیا، تو آپ چھوٹے کے چھوٹے رہ گئے۔ تو ایک بے بنیاد چیز ہے جس کا نام عزت ہے، خیالی چیز ہے۔ اور پھر خیال بھی دوسرے کا، اپنا نہیں۔ اگر اپنا خیال ہوتا، چلو صبح سے شام تک یہ خیال کئے بیٹھے رہتے کہ ہم بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے باعزت ہیں۔ یہ تو خیالی چیز ہے اور خیال بھی دوسرے کا، جس پر ہمیں قبضہ حاصل نہیں ہے۔ کوئی دوسرا اگر خیال کئے بیٹھا رہے تو بڑے ہوں گے اور اگر اس نے خیال یہ کرلیا کہ آپ بڑے نہیں، بس آپ حقیر ہوگئے۔ تو عزت ایک بے بنیاد چیز ہے، ایسی عزت محض خیالی پلاؤ ہے اور کچھ نہیں۔

عزت فی الحقیقت اللہ کے ہاں مقبول ہونے کا نام ہے۔ عزت کسی کے خیال کر لینے کا نام نہیں ہے، اللہ جس کو قبول کرلے، وہ عزت ہے۔ جس کو رد کردے، وہ بے عزت ہے۔ عزت و ذلت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے اگر بندے سے عزت کرائیں تو اس کی خوشامد کرتے پھریں۔ تو ذلیل تو پہلے ہی تھے۔ اب ہاتھ جوڑتے پھریں کہ حضور میری عزت کی جائے۔ کیونکہ عزت سے پہلے ذلت ہے، اب خوشامد کے بعد اور ذلیل ہوگئے، عزت تو کیا ہونی تھی؟

اور اگر آپ ڈنڈا لے کر کہیں کہ میری عزت۔ وہ آپ کے ڈنڈا رسید کرے گا، کہ تو میری عزت کر۔ یہ تو پہلے سے زیادہ تذلیل ہوجائے گی۔ تو عزت نہ انسان کے دبانے سے ملتی ہے نہ خوشامد سے ملتی ہے۔ عزت خدا کی طرف سے ملتی ہے، جب کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، یا ان کا فرمانبردار بنے، وہ قبول کرلیں گے، ان کے قبول کرنے سے انسانوں میں مقبولیت پیدا ہوگی۔ یہ اصل عزت ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہٗ جب کسی سے راضی ہوتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی ہوجا۔ جبرئیل علیہ السلام راضی ہوجاتے ہیں تو آسمان میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں بندہ میرے ہاں مقبول بن گیا ہے (جو قبولیتِ خداوندی کی علامت ہے)۔ لہٰذا تم بھی اسے مقبول بناؤ، پھر سارے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں۔ سب فرشتوں میں اس کی عزت قائم ہوجاتی ہے۔ ان ملائکہ کے اثرات زمین کے ملائکہ کے اوپر پہنچتے ہیں، وہ بھی عزت کرنے لگتے ہیں۔ زمین کے ملائکہ کے اثرات اولیاء اللہ کے قلوب پر پڑتے ہیں۔ تو اللہ والے بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور جتنے لوگ اہل اللہ سے وابستہ ہیں، نیک ہیں، پھر ان کی وجہ سے عوام میں عزت آجاتی ہے، الغرض اس شخص کی مقبولیت پوری امت میں پھیلا دی جاتی ہے۔ یہ مقبولیت کب ہے؟ کہ پہلے اس کو اللہ مقبول بنائے، پھر

دوسروں کے اندر اس کی مقبولیت پیدا ہوگی۔ تو عزت یہ ہے کہ اللہ کسی کو مقبول فرمالے، اس سے راضی ہو جائے۔ انسان خیال باندھے کہ فلاں عزت والا ہے۔ یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔ تو عزت بنیاد والی کیا ہوگی؟ ورنہ دنیا میں انسانوں کی عزت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ ایک لیڈر کی ہے۔ پبلک میں اس کی مقبولیت ہوئی تو گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور کل جو پبلک خفا ہوئی اور بدلی تو گلے میں جوتیوں کے ہار ڈال دیئے۔ بے چارا بے عزت پھر رہا ہے۔ اب اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ یہ کوئی عزت نہیں ہے۔ عزت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ کسی کو عزت دے۔ حق تعالیٰ قبول فرمالیں تو ہی عزت ہے۔ اور حق تعالیٰ تب ہی قبول فرماتے ہیں، جب کوئی نیکی اختیار کرے۔ ماموراتِ کرے اور بدی سے بچے بدعمل و بدکار کبھی باعزت نہیں ہوسکتا۔ تو اصل عزت نیکی ہے۔ حق تعالیٰ کے سامنے جھکنے میں اور اس کی اطاعت میں ہے۔ نہ یہ کہ لوگوں کے خیال میں آجائے کہ یہ باعزت ہیں۔ یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔ اس لئے کہ کل ہے، پرسوں کو نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ زندگی کی اتنی لمبی چوڑی حرکت اس کا مقصد نہ تو روٹی بن سکتی ہے اور نہ کرسی اور عزت بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ روٹی بہائم کی علامت ہے اور اقتدار پسندی یہ خیالی چیز ہے۔ تو زندگی تو حقیقی ہو اور اس کا مقصد محض خیالی ہو۔ یہ بے جوڑ بات ہے۔ سمجھ میں آنے والی نہیں ہے، حکمتِ خداوندی کے بھی خلاف ہے۔

مقصدِ زندگی قرآن کریم کی روشنی میں..... تو یہ دونوں مقصد نہیں بن سکتیں۔ تو آخر مقصد کیا ہونا چاہئے۔ لمبی زندگی کا مقصد بھی، خود اتنا لمبا ہونا چاہئے جو زندگی کے ساتھ آخرت تک جائے۔ یہ دونوں باتیں، روٹی اور کرسی لمبا مقصد نہیں۔ اس لئے کہ روٹی آپ اس وقت تک کھائیں گے، جب تک دنیا میں موجود ہیں اور جب قبر میں پہنچ گئے تو روٹی تو رہ گئی اور زندگی آگے تک جارہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی آگے تک جاری ہے اور مقصد پہلے ہی ختم ہوگیا۔ تو یہ مقصد کیسے بنے گا؟ اس طرح دنیا کا جاہ واقتدار تخیل اور خیال سے ہوتا ہے وہ بھی کوئی پائیدار چیز نہیں ہے۔ جب انسان ختم ہوگیا اور یہاں سے منتقل ہوگیا، تو عزت بھی ختم ہوگئی۔ ایک بادشاہ جب انتقال کر جاتا ہے، وہ اپنا سارا اقتدار دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔ قبر میں اس کا اقتدار ساتھ نہیں جاتا۔ اب زندگی باقی ہے اور حکومت ختم ہوگئی۔ تو یہ اقتدار کیسے مقصدِ حیات بن سکتا ہے کہ زندگی تو آگے جارہی ہے اور مقصد پیچھے رہ گیا۔ اس لئے نہ روٹی، نہ عزت واقتدار اور حکومت مقصد بن سکتی ہے، بلکہ صرف ایک چیز مقصد بن سکتی ہے، اس مقصد کو قرآن کریم نے پیش کیا۔ فرمایا: ﴿وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْنِ﴾ ① ''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اسی لئے پیدا کیا وہ میری عبادت اور اطاعت کریں''۔

انسان کی خِلقت اور پیدائش کا اصل مقصد یہ ہے۔ اگر ایک انسان عبادت میں لگ گیا۔ اس نے زندگی کا مقصد پورا کرلیا عبادت میں نہ لگا، زندگی رائیگاں چلی گئی۔ مقصد پورا نہ ہوا۔ تو قرآن حکیم نے مقصد بتلایا کہ زندگی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

کا مقصد فی الحقیقت اطاعت خداوندی اور عبادت خداوندی ہے۔عبادت خداوندی ہوگی تو عزت بھی حاصل ہوگی۔بھوکے نہیں رہوگے، روٹی بھی ملے گی۔اصل مقصد یہ ہے۔یہ مقصد کیوں ہے؟اس لئے کہ روٹی اگر مقصد ہوتو عمر تو بہت آگے تک جارہی ہے اور روٹی قبر کے کنارے پر ختم ہوگئی۔وہ مقصد کیا ہوا جو پوری عمر پر مرتب نہ ہو۔مقصد وہ ہے کہ جب تک عمر چلے، مقصد بھی چلتا رہے۔وہ مقصد، مقصد نہیں بن سکتا کہ عمر تو آگے تک چلے اور وسیلہ قبل از وقت ختم ہوجائے۔اسی طرح سے خیالی عزت بھی قبر سے آگے نہیں جاسکتی۔جب قبر میں ہم پہنچ گئے، کوئی ہمارے لئے (بڑے ہونے کا) خیال باندھے نہ باندھے، ہمارے لئے برابر ہے۔وہاں تو اپنے عمل کا امتیاز ہوگا۔وہاں یہ تھوڑا ہی دیکھا جائے گا کہ پبلک ہمارے لئے کیا خیال لئے ہوئے ہے؟یہ نہیں دیکھا جائے گا۔

اَبدی زندگی کا اَبدی مقصد......اور اگر اطاعت وعبادت مقصد ہو تو یہ فی الحقیقت لمبا چوڑا مقصد ہے جو پوری عمر پر مرتب ہوتا ہے کہ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے عبادت اس کے ساتھ رہے گی۔قبر میں جب پہنچے گا، جب بھی عبادت موجود ہوگی۔حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے تو فرمایا گیا کہ: "اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ." ① "انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔نمازیں پڑھتے ہیں"۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مُوْسٰی یُلَبِّیْ." میں موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ "لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ" کہتے ہوئے میدان عرفات کی طرف جارہے ہیں۔معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام حج بھی کرتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔②

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا، کہ وہ اونٹنی پر سوار ہیں اور وہ حج کررہے ہیں۔اس اونٹنی کا لگام اون اور صوف کا ہے۔③ حدیث میں ہے کہ: آپ علیہ السلام نے طواف فرمایا۔حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی طواف میں ساتھ تھے۔آپ نے دیکھا کہ ایک شخص "مَرْبُوْعُ الْقَامَۃِ" یعنی چوڑا سینہ اور بہت موزوں قد اور سرخ وسفید چہرہ جیسے گلاب کا پھول ہوتا ہے اور اتنا تروتازہ گویا ابھی حمام میں غسل کرکے نکلے ہیں کہ بالوں سے ابھی پانی ٹپک پڑے گا۔اتنا شاداب اور تروتازہ اور نہایت حسین وجمیل چہرہ۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون طواف کررہے ہیں؟ کہا یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیح اللہ ہیں معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام طواف بھی کرتے ہیں، لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے میدان عرفات میں بھی جاتے ہیں۔نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔قبر میں ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔④

---

① المسند لابی یعلیٰ الموصلی، ج:۷،ص:۳۴۵. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج:۲ ص:۱۲۰ رقم: ۶۲۱.

② شعب الایمان للامام البیھقی، ج:۹،ص:۳۱. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے صحیح الترغیب والترھیب ج:۲ ص:۴۵۷ رقم: ۲۹۵۸.

③ شعب الایمان للامام البیھقی، ج:۹، ص:۳۱.

④ الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واذکر فی الکتاب مریم، ج:۱۱، ص:۳۵۵.

توانبیاء علیہم السلام کے لئے تو ذکر اللہ اور عبادت صراحتہً احادیث سے ثابت ہے۔ ہمارے آپ کے لئے اور عامۃ المومنین کیلئے تو یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پیر سے عبادت کرتے ہیں۔ مگر ہاں ایک عبادت ہم بھی کرتے ہیں۔ وہ عبادت ہم قلب سے کرتے ہیں۔ بدن تو رہتا نہیں۔ انبیاء کا تو بدن بھی محفوظ ہے، وہ تو بدن سے عبادت کرتے ہیں۔ ہمارا بدن تو مٹ جاتا ہے۔ اس لئے بدنی عبادت نہیں رہے گی مگر روحی عبادت ہم بھی کرتے ہیں اور وہ قلب کے جذبے اور تخیل کی عبادت ہے۔ اس لئے کہ بدنی عبادت تو جب کریں جب بدن ہو۔ یہ عمل کا آلہ ہے۔ جب بدن نہیں رہے گا۔ آگے صرف روح ہی رہ جائے گی، روح عمل نہیں کرسکتی، مگر جذبات کی عبادت کرسکتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ: جب منکر نکیر سوال و جواب کے لئے آتے ہیں اور دو تین سوال کرتے ہیں کہ مَــنْ رَّبُّکَ؟ تیرا پروردگار کون ہے؟ وَمَــا دِیْــنُکَ؟ تیرا دین کیا تھا؟ وَمَنْ نَّبِیُّکَ؟ تیرے نبی کون تھے؟ توحید رسالت اور شریعت، ان تینوں کا سوال ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا جب ملائکہ علیہم السلام مؤمن سے کہیں گے کہ ''مَــنْ رَّبُّکَ''؟ تیرا پروردگار کون تھا؟ تو بموجب حدیث مؤمن کو جو اس وقت، وقت دکھلایا جائے گا۔ وہ ایسا ہوگا جیسے سورج غروب ہونے کو ہے اور دھوپ میں زردی چھا چکی ہے، دن ختم ہو چکا اور مغرب آنے والی ہے۔ ''یُتَمَثَّلُ لَهُ الشَّمْسُ.'' قبر میں سورج کی صورتِ مثالی دکھلائی جائے گی۔ تو فرشتوں کے جواب میں یہ بندہ مؤمن کہے گا ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' میاں پرے ہٹو وقت تنگ ہو گیا ہے۔ میری نماز قضا ہونے کو ہے مغرب آجائے گی۔ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے ''رب'' کے بارے میں کیا سوال کرتے ہو یہ تو رب کی عبادت کرنے کو ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ بہرحال ہماری ڈیوٹی ہے جو انجام دینی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ جواب حق دے گا اس کا چہرہ اور عمل ہی بتلا رہا ہے۔ ①

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے وہاں بدنی عبادت تو نہیں کرسکتے، مگر تخیل کی عبادت تو کریں گے جذبہ یہ ہوگا تبھی ''دَعُــوْنِــیْ اُصَـلِّیْ'' کہیں گے کہ میاں پرے ہٹو، نماز پڑھنے دو۔ اس پر فرشتے کہیں گے کہ اب نماز کا وقت نہیں یہ تو عالَم برزخ ہے وہ جو نماز پڑھنے کی تکلیف دی گئی تھی، وہ دنیا میں دی گئی تھی۔ برزخ اور عالَم آخرت میں یہ تکلیف نہیں دی گئی۔ اس وقت اسے پتہ چلے گا کہ یہ سورج کی صورت مثالی ہے۔ حقیقی دن نہیں ہے میں تو قبر کے اندر ہوں۔

مگر ''دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ'' کون کہے گا؟ جس نے دنیا میں نماز پڑھنے کی عادت ڈالی ہو۔ اگر دنیا میں نماز سے بے پرواہ رہے گا تو اس کی زبان سے ''دَعُــوْنِــیْ اُصَلِّیْ'' نہیں نکل سکے گا، کہ مغرب کا وقت آرہا ہے اور مجھے نماز پڑھنے دو۔ اس لئے کہ زندگی میں روزانہ اصلی مغرب کی نماز کا وقت آتا تھا اور اسے نماز کی پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ تو جو یہاں بے پرواہ تھا، وہاں بھی بے پرواہ رہے گا۔ جسے یہاں پرواہ تھی، وہاں جا کر بھی پرواہ دار بنے گا۔ حدیث

① المصنف لعبدالرزاق، ج:۳، ص:۵۶۷. روایت حسن ہے، دیکھئے: ظلال الجنة ج:۲ ص:۱۱۶ رقم: ۱۷۱ باب فی القبر.

میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''تُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ وَ تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَحْيَوْنَ.'' ''تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری''۔ اگر زندگی ذکر و عبادت میں گزاری ہے تو موت کے وقت بھی ذکر و عبادت کا ہی دھیان ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا جب بھی ذکر کا دھیان ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ: اگر کوئی حاجی میدان عرفات میں یا منیٰ میں ''لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ'' کہتے ہوئے مر گیا۔ جب وہ میدانِ محشر میں قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک لبیک جاری ہوگا۔ ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ'' ①

وہ یہی سمجھے گا کہ میدان عرفات میں جارہا ہوں۔ آگے جا کے پتہ چلے گا کہ یہ تو میدان محشر ہے، میدان عرفات نہیں ہے۔ مگر زبان سے لبیک کیوں نکلا؟ اس لئے کہ لبیک کہتے ہوئے انتقال کر گیا تھا اور لبیک کہتے ہوئے انتقال کیوں کیا؟ اس لئے کہ زندگی بھر یہ جذبہ تھا کہ کسی طرح حج کروں۔ تو جس حالت پر آدمی زندگی گزارتا ہے۔ اس حالت پر موت آتی ہے، قبر سے اٹھتے ہوئے بھی وہی حالت ہوگی۔ معلوم ہوا ذکر اللہ اور عبادتِ خداوندی وہ چیز ہے کہ دنیا میں بھی ساتھ، قبر میں بھی ساتھ اور میدان محشر میں بھی ساتھ۔ اور جنت میں بھی ساتھ رہے گی حدیث میں ہے کہ يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ اہل جنت کو تسبیح الہام کی جائے گی۔ بلا ارادہ سانس کیساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا۔ ارادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کو یہ تکلیف نہیں دی جائے گی کہ تم بیٹھ کے ذکر اللہ کرو، عبادت کرو، نمازیں پڑھو، وہ تو عیش کی جگہ ہے، ہر وقت راحت ہوگی مگر ان کے دلوں میں الہام کیا جائے گا ''پاس انفاس'' جیسے ہوتا ہے، جو صوفیائے کرام نے ذکر بتلایا ہے، ذکر اللہ کی وہ صورت ہوگی۔ ہر وقت سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا، اصل غذا وہ ہوگی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی لیکن کھانے پینے کی محتاجگی نہیں ہوگی۔ تفریحِ طبع کے لئے کھائیں پئیں گے بھوک کی تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ جنت میں تکلیف کا کوئی نشان نہیں۔ ②

تو عبادت خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی، میدانِ محشر میں پہنچی اور جنت تک پہنچ گئی۔ یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے۔ اگر زندگی اَبدی ہے تو عبادت بھی اَبدی ہے۔ کھانا پینا اَبدی نہیں، یہ تو قبر تک ختم ہو گیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہوگا اور اگر کچھ کھانا پینا ہوگا بھی تو وہ ذکر اللہ ہی ہوگا۔ جنت میں کھانا پینا ہوگا، مگر محتاجگی نہیں ہوگی۔ اصل محتاجگی ذکر اللہ کی ہوگی اور وہ زبان پر جاری رہے گا۔

دنیوی زندگی کی روح...... زندگی کا مقصد بنانے کے اگر کوئی چیز لائق ہے تو وہ عبادات خداوندی ہے ذکرِ حق اور اطاعتِ خداوندی ہے۔ یہ چیز ہے جس سے انسان، انسان بنتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی ایک بڑے شاعر گزرے ہیں۔ جن کا ''لسان العصر'' لقب تھا۔ انہوں نے دو شعر کہے ہیں ۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب التلبیة، ج: ۵، ص: ۴۴۵.

② الصحیح لمسلم، کتاب صفة نعیم الجنة و اهلها، باب فی صفات الجنة و اهلها... ج: ۱۳، ص: ۴۷۲.

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ۔ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی ۔ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جاتا ہے، راحت بھی گزر جاتی ہے۔ نہ یہ ابدی نہ وہ ابدی۔ تو اکبر نے کہا کہ مرنا جینا سب کے لئے ہے اور رنج و راحت وقتی چیز ہے۔ آتی ہے گزر جاتی ہے، لیکن ان اشعار میں مقصدِ زندگی نہیں آیا۔ یہ تو آ گیا کہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ سوال یہ ہے کہ پھر کاہے کی طرف توجہ کرو؟ مقصدِ زندگی پھر کیا ہے؟ تو میں نے تین اشعار بڑھا دیئے ہیں اور ان میں مقصد ظاہر کیا گیا ہے۔ اکبر کے تو یہ (مندرجہ بالا) دو شعر ہیں۔ میرے دو شعر اکبر ہی کے مطابق ہیں کہ جن کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ۔ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی ۔ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں۔

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا ۔ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

یہ خیالی چیز ہے، یہ لائق توجہ نہیں۔ اور

قابل ذکر ہی نہیں خورد و نوش ۔ یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ بہیمی کی علامت ہے۔ جانور بھی کھاتے ہیں۔ ہم بھی اسی کو کھا رہے ہیں۔ ایک مصیبت ہے جو گلے پڑی ہوئی ہے۔ تو یہ مقصد نہیں۔ آگے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ۔

مقصد زندگی ہے اطاعتِ حق ۔ نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

اصل مقصد یہ ہے اطاعتِ خداوندی نصیب ہو جائے۔ قرآن کریم میں اسی کو فرمایا گیا میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا، مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ نہیں۔ فرمایا کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَأْكُلُوْنَ﴾ ① میں نے اس لئے پیدا کیا کہ خوب کھائیں، خوب مزے اڑائیں۔ یا یوں فرمایا ہو کہ اِلَّا یُعَزَّوْنَ یہ عزتوں کا خوب خیال باندھیں بلکہ فرمایا اِلَّا لِیَعْبُدُوْن. فقط میری عبادت کریں۔ آگے فرمایا میں ان سے رزق نہیں مانگتا، یہ ہوں کہ وہ عبادت کریں۔ اور فرمایا ﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ ② رزق دینے والے ہم ہیں۔ طاقتوں کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔

مطلب یہ کہ ایک کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں۔ ایک تم اپنے ذمے لو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ہماری عبادت کرو۔ اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم تمہیں رزق دیں۔ تم عبادت کرنا ترک کرو گے ہم روٹی دینا ترک کر دیں گے۔ ہم تمہیں محتاج و مفلس کر دیں گے گویا، مقصدِ زندگی محض اور محض اطاعتِ حق ہے۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶. ② پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸.

شبہ کا جواب...... یہاں ممکن ہے کوئی سوال کرے اور سوال وہی کر سکتا ہے، جو قرآن شریف پڑھا ہوا اور قرآن شریف کے کچھ مقاصد اس کے سامنے ہوں کہ صاحب! قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد جانوروں کا بھی ہے۔ وہ بھی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① وئی چیز عالم میں ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ درخت اور اس کی شاخیں، آسمان و زمین، چاند و سورج سب اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ زبان سب کی الگ الگ ہے۔ تسبیحیں سب کی الگ الگ ہیں۔ مگر ہیں سب تسبیح میں مشغول۔ اب اگر کوئی فرانسیسی زبان میں اللہ کی یاد کرنے لگے، ہم نہیں سمجھیں گے۔ کوئی فارسی زبان میں مناجات کرنے لگے۔ غیر فارسی دان نہیں سمجھ پائے گا۔ کوئی عرب، عربی زبان میں دعا کرنے لگے۔ ہم نہیں سمجھ سکیں گے۔ جب ہم اپنے بھائی بندوں کی زبان نہیں سمجھتے جو انسان اپنے بھائی بندوں کی زبان نہ سمجھے، وہ اگر جانوروں کی زبان نہ سمجھے تو تعجب کی کیا بات ہے؟ قرآن میں یہی تو فرمایا گیا کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ② تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔ ان کی زبان الگ ہے، تمہاری زبان الگ ہے۔ پرندہ بظاہر تو سیٹیاں بجا رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ شیر دھاڑ رہا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لے رہا ہے۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لیتا ہے۔ شیر کی زبان دھاڑنا اور چنگھاڑنا ہے مگر وہ بھی تسبیح۔ اور پرندوں کی زبان سیٹیاں بجانا ہے۔ تم سیٹیاں سمجھتے ہو حقیقت میں تسبیح وتہلیل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کی زبان سے ہمیں واقف کر دے، تب ہمیں پتہ چلے گا کہ یہ تو وہی حمد و ثناء کر رہے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ کبھی تار گھر میں ٹیلی گراف دینے کے لئے گئے ہوں گے۔ تو آپ نے تار لکھ کر آفیسر کو دے دیا، اس نے جو مشین پر ہاتھ رکھ کر پیتل کا جو کھٹکا ہوتا ہے اس کو حرکت دی تو وہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ شروع کی۔ آپ کہیں گے کہ یہ بڑا احمق آدمی ہے، میں نے اسے کہا تھا کہ بھائی تار دے دے اور یہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کھٹا کھٹ میں ہی سارے علوم اور معلومات دوسرے ملک پہنچ رہی ہیں۔ ظاہر میں کھٹا کھٹ معلوم ہوتی ہے اور حقیقت میں یہ اصطلاحات ہیں۔ ان کے ذریعے سے جو خبر یا پیغام دیا ہے، وہ دوسرے ملک پہنچ رہا ہے۔ دیکھنے میں کھٹا کھٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اسی طرح سے پرندہ ظاہر میں تو سیٹی بجاتا ہے مگر حقیقت میں وہ تسبیح کرتا ہے اللہ نے اسے شعور دیا ہے وہ عبادت کرتا ہے، جس طرح سے ہم تار کی اس آواز کو محض آواز ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے کہ اگر ہم اس فن کو جان لیں تو یہ کھٹا کھٹ نہیں، علوم ہیں۔ بالکل اسی طرح جانوروں کی بولی ہے اگر ہم کسی طرح سے سیکھ جائیں، تب ہمیں پتہ چلے کہ یہ حمد و ثناء میں مصروف ہیں۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۱۵، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۴۴۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے پرندوں کی بولیوں کا علم دیا تھا، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ﴾ ① سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اے لوگو! ہمیں جانوروں کی بولیوں کی تعلیم اللہ کی طرف سے دی گئی ہے۔ کوئی جانور بولتا تھا، فرماتے تھے کہ اس کا یہ مطلب ہے حدیث میں جانوروں کی تسبیحات بیان کی گئی ہیں کہ تیتر یہ تسبیح پڑھتا ہے۔ پندرہ مثالیں بیان کی گئیں۔ تیتر بولتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ "کَمَا تُدِیْنُ تُدَانُ." "جیسا کروگے ویسا بھروگے" جیسی کرتوت ہوگی ویسے ہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ یہ اس کی تسبیح ہے۔ ②

حدیث میں ہے کہ: بعض ملائکہ علیہم السلام کی یہ تسبیح ہے "سُبْحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَزَیَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَآئِبِ" ③ پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو چوٹیوں اور مینڈھیوں سے زینت دی۔ عورتوں کے لئے چوٹی اور مینڈھی رکھنا حسن ہے اور مرد کے لئے ڈاڑھی رکھنا حسن ہے۔ ہر ایک کا حسن الگ الگ ہے۔ مردانہ حسن ڈاڑھی سے اور زنانہ حسن چوٹی اور مینڈھیوں سے ہے۔ غرض بعض ملائکہ علیہم السلام کی تسبیح یہ ہے۔ تو مختلف طریقوں سے پرندے، چرندے اور درندے بلکہ ہر مخلوق کسی نہ کسی طرح کی تسبیح میں مشغول ہے۔ تو کوئی قرآن کریم پڑھنے والا ممکن ہے یہ سوال کرے کہ آپ نے انسان کو اشرف المخلوقات کہہ کر اس کی زندگی کا مقصد عبادت اور ذکر اللہ بتایا ہے۔ وہ جانور، کنکریاں اور پتھر بھی کرتے ہیں، پھر انسان نے کیا کمال کیا جو ذکر اللہ اور عبادت کرلی؟ جیسے آپ نے یوں کہا تھا کہ گدھا، گائے اور جانور بھی کھانا کھاتے ہیں اگر انسان نے کھالیا تو کیا بڑی بات ہے؟ قرآن کریم کی رو سے ہم کہیں گے ذکر واطاعتِ خداوندی جانور بھی کرتے ہیں اگر انسان نے کرلی تو کون سا کمال کیا؟ یہ کون سا بڑا مقصد ہے؟ تو ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ جانور بھی تسبیح وعبادت کرتے ہیں مگر وہ ارادی عبادت نہیں، وہ ارادہ سے عبادت نہیں کرتے یہ ان کی طبیعتوں کی فطرت کا تقاضا ہے، جیسے مشین چلتی ہے تو مشین ارادہ کرکے نہیں چلتی، ارادہ چلانے والے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سمجھ کر کہ یہ عبادت ہے اور اس کا ثمرہ نکلے گا۔ یہ عقل وشعور جانوروں کو نہیں دیا گیا۔ ارادی عبادت صرف انسان کرتا ہے، تو غیر اختیاری عبادت پر اجر وثواب کچھ نہیں ملے گا۔ ارادہ اور اختیار سے کی ہوئی عبادت پر اجر وثواب ملتا ہے اور انہیں افعال پر ترقی مدارج ہوتی ہے اور جو بلا ارادہ خود بخود ہو، اس پر نہ کوئی اجر وثواب، نہ ہی ترقی مدارج کا وعدہ۔

حاصل یہ نکلا کہ جانور بھی عبادت کرتے ہیں مگر وہ غیر ارادی عبادت ہے، اس میں اختیار کا دخل نہیں۔ یہ ایک طبعی تقاضا ہے۔ جیسے ہم طبیعت کے تقاضے سے کھاتے پیتے ہیں، عقل وشعور سے نہیں کھاتے بھوک جو لگتی ہے تو

① پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔ ② تفسیر القرطبی، ج: ۱۳ ص: ۱۶۵۔ ③ یہ حدیث نہیں ہے، علامہ عجلونی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رواہ الحاکم عن عائشۃ وذکرہ فی تخریج احادیث سند الفردوس للحافظ بن حجر فی اثناء حدیث بلفظ: ملائکۃ السماء یستغفرون لذوائب دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۴۴۴۔

دلائل سے تھوڑا ہی لگتی ہے کہ آپ بیٹھ کر عقل سے سمجھیں کہ اس وقت مجھے بھوک لگنی چاہئے۔ اس میں یہ برکات اور یہ فوائد وغیرہ ہیں۔ لیکن بھوک جب لگے گی تو آپ لاکھ دلیل سے اسے روکنا چاہیں وہ تب بھی لگ کر رہے گی۔ جیسے انسان بے ارادہ کھاتا اور پیتا ہے اور اس پر اجر وثواب نہیں ایسے ہی اگر کوئی بے ارادہ عبادت کرے اس پر بھی کوئی اجر وثواب نہیں۔

انسان ارادہ، عقل وشعور سے اور اپنے معبود کو پہچان کر عبادت کرتا ہے اور اس کی یہ شان ہے، اس کے یہ کمالات ہیں اور یہ اس کی صفات ہیں، پھر حق عائد ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں۔ مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنے مالک کو یاد کروں۔ دلائل سے سوچ کر، سمجھ کر، ارادہ اور اختیار سے عبادت کرتا ہے۔ کبوتر، کتا، بلی اس شعور سے عبادت نہیں کرتے۔ سیٹیاں بجانا ان کی طبیعت کے تقاضے کی تسبیح ہے۔ اس واسطے یہ فرق ہوگیا۔ دوسرے لفظوں میں حاصل یہ نکلا کہ اتنی لمبی چوڑی زندگی کا مقصد ارادی عبادت ہے، جو جانوروں کو میسر نہیں۔

دوسرے شبہ کا جواب...... مگر ایک سوال پھر بھی شاید آپ کے ذہن میں پیدا ہو کہ اچھا صاحب! یہ ہم نے مان لیا کہ جانور ارادی عبادت نہیں کرتے، یا اختیاری عبادت صرف انسان کرتا ہے، مگر ملائکہ علیہم السلام تو ارادہ سے عبادت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے معبود کو پہچان کر شعور سے عبادت کرتے ہیں اگر انسان نے عبادت کر لی تو کیا کمال کیا؟ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو فرشتے بھی کر رہے ہیں۔ پھر سوال وہیں کا وہی رہ گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ملائکہ علیہم السلام ارادہ سے عبادت کرتے ہیں، اختیار سے عبادت کرتے ہیں۔ لیکن ارادے کی کی ہوئی عبادت ہی ان کے نفس کا تقاضا ہے۔ اس لئے کہ ان میں گناہ کا مادہ نہیں، وہ برائی کر ہی نہیں سکتے، وہ جب کریں گے نیکی ہی کریں گے، جب کریں گے عبادت ہی کریں گے۔ تو وہ بھی ان کی طبیعت کا تقاضا ہوا فرق اتنا ہے کہ جانور طبیعت کے تقاضے سے بلا ارادہ عبادت کرتے ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام طبیعت کے تقاضے سے ارادی عبادت کرتے ہیں۔ تو دونوں جگہ طبیعت کا تقاضا ہے، فرشتوں کی طبیعت میں گناہ کا مادہ نہیں اور شر کا مادہ نہیں کہ وہ مقابلہ کر کے عبادت کریں، بس وہ عبادت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔

انسان اپنے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے، نفس چاہتا ہے کہ میں آرام سے پڑ کے سوؤں وہ کہتا نہیں لحاف اتار کے جا کر اپنے رب کی عبادت کر، سردیوں کے زمانے میں نفس کا تقاضا یہ ہے کہ گرم گرم لحاف میں پڑا رہے۔ مگر انسان اس گرمی کو چھوڑ کر لحاف کو اتار کر وضو کرتا ہے اور اسے ٹھنڈے گرم کی خبر نہیں، ہوا میں چل کر مسجد کی طرف آتا ہے، مسجد میں آنے کے بعد بھی اونگھ آرہی ہے مگر پھر بھی وہ عبادت کرتا ہے۔ تو اس کی عبادت اپنے نفس کے مقابلے میں ہے۔ فرشتے نفس کا مقابلہ کر کے عبادت نہیں کرتے۔ فرشتوں کے نفوس تو پاک ہیں۔ ان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ عبادت کرو۔ فرق ہوگیا۔ تو یہ عبادت زیادہ قابلِ قدر ہے جو اپنا مقابلہ کر کے کی جائے۔ اس لئے کہ طبعی تقاضوں کے مطابق کئے ہوئے کام زیادہ قابلِ توجہ نہیں ہوتے۔

اگر آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑے اعلیٰ درجہ کا انسان ہوں اس لئے کہ میں روٹی کھایا کرتا ہوں۔لوگ کہیں گے کہ بھائی یہ کونسا کمال ہے؟ یہ تمہاری طبیعت کا تقاضا ہے،تم اسے پورا کرو گے ہی کوئی ایسا کام بتاؤ کہ تم نے اپنے نفس کے خلاف کر کے کیا ہو؟ اور اگر کسی کی نسبت یہ معلوم ہو کہ فلاں صاحب ایک ہفتے تک کھاتے ہی نہیں۔دنیا پیچھے دوڑ پڑے گی کہ صاحب کوئی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔دنیا ہے کہ جھکی جارہی ہے کیوں۔؟ اس لئے کہ نفس کے خلاف کام کررہے ہیں۔نفس کا تقاضا کھانا ہے اور وہ ایک ایک ہفتہ کھانا نہیں کھاتے تو کھانا کمال نہیں، نہ کھانا کمال ہے۔اس لئے فرشتہ اگر عبادت کرتا ہے تو نفس کے خلاف نہیں۔وہ ایسا ہے، جیسے ہم نے روٹی کھالی۔اگر طبیعت کے خلاف کر کے عبادت ہوتی تو کمال تھا اور قابل قدر تھا۔معلوم ہوا کہ انسان کی عبادت فرشتے کی عبادت سے زیادہ قابل قدر ہے۔وہ طبیعت کے تقاضے پورا کرتا ہے۔یہ طبیعت کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے۔اپنے کو پہلے ختم کرتا ہے پھر عبادت کرتا ہے۔یہ زیادہ قابل قدر ہے۔

گویا اس لمبی چوڑی زندگی کا مقصد یہ نکلا کہ عبادت ہو۔ارادی ہو اور نفس کی مخالفت کے ساتھ ہو۔یہ کام انسان ہی کرسکتا ہے اور کوئی نہیں کرسکتا اس واسطے فرمایا کہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ① میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں۔ایسی عبادات جو ارادی ہو اور نفس کی مخالفت سے ہو۔تو انسان کی عبادت ہی کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ وہ ملائکہ علیہم السلام اور دیگر مخلوقات سے بڑھی ہوئی ہے اور افضل ہے۔بہر حال مقصد زندگی اگر کوئی چیز ہوسکتی ہے، وہ صرف عبادت اور اطاعت خداوندی ہوسکتی ہے۔

طاعتِ خداوندی مقصدِ زندگی کیوں ہے؟......اس کی بناء اور حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، یہ سب آپ کے کام کی ہیں، چنانچہ سب آپ کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔زمین بھی آپ کے کام میں لگی ہوئی ہے۔سورج بھی آپ کے کام میں لگا ہوا ہے۔دریا بھی آپ کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔الغرض کائنات کا ہر ذرہ اس کا خادم ہے اور حضرت انسان مخدوم ہے۔

اس لئے کہ انسان کی زندگی کا دارومدار ان چیزوں پر ہے، ان میں سے ایک بھی نہ رہے، تو انسان باقی نہ رہے گا۔اگر سورج بالکل ہٹا دیا جائے، زندگی ختم ہو جائے گی۔نہ سورج نکلے گا، نہ چاند ہوگا، نہ حرارت اور گرمی باقی رہے گی۔انسان باقی نہیں رہ سکتا، زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔اسی طرح اگر دنیا میں سے ہوا کو کھینچ لیا جائے، ایک لمحے کے لئے بھی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا، سانس ہی نہیں چل سکتا۔تو زندگی ختم ہوگئی۔''عَلٰى هٰذَا الْقِيَاسِ'' دنیا میں پانی نہ رہے اور ایک قطرہ بوند بھی کسی کو نہ ملے، تو بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔غرض آگ، پانی، مٹی، ہوا، زمین سورج اور ستارے وغیرہ ذلک ان میں سے اگر ایک چیز بھی ختم کر دی جائے، انسانی زندگی ختم ہو جائے گی۔معلوم ہوا کہ ہر چیز انسان کے کام کی ہے، انسانوں کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔لیکن انسان خود ان میں سے کسی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶.

کے بھی کام کا نہیں ہے۔ اگر سارے انسان ختم ہو جائیں۔ سورج کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اگر ایک بھی انسان باقی نہ رہے۔ زمین اسی طرح قائم رہے گی۔ آسمان اسی طرح قائم رہے گا۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ ان میں سے ایک چیز بھی نہ رہے۔ انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور سارے انسان ختم ہو جائیں، ان چیزوں کا کچھ نہیں جاتا۔ معلوم ہوا کہ ساری چیزیں تو انسان کے کام کی ہیں۔ مگر انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے۔ آخر دنیا کے کروڑوں انسان ختم ہو گئے اور یہ سب کچھ اسی طرح موجود ہے۔

انسان صرف اللہ کے کام کا ہے:..... انسان ان میں سے کسی کے کام کا بھی نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساری چیزیں انسان کے کام کی ہیں۔ آخر انسان کس کے کام کا ہے؟ جواب اس کا یہی ہے کہ جب انسان مخلوقات میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے، خالق کے کام کا ہوگا۔ اور خالق کا کام یہ ہے کہ اس کے سامنے اس کی اطاعت کرے، اس کے سامنے نیاز مندی برتے، عبادت کرے اور جھکے۔ تو انسانی زندگی کا مقصدِ اصلی نکل آیا جو اطاعت اور عبادتِ خداوندی ہے۔ اسی لئے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ کھانے اور پینے کا نظام قائم کیا گیا۔ کیونکہ انسان اس وقت تک عبادت نہیں کرسکتا۔ اس لئے غذائیں، پانی اور ہوا کو پیدا کیا۔ اسی طرح جب تک چاند تارا نہ ہو، عبادت نہیں کرسکتا، اللہ نے سورج چاند کو پیدا کر دیا۔ درخت، جانور پہاڑ، پیدا کر دیئے۔ یہ سب کچھ اس لئے پیدا کیا کہ انسان یہ سب کچھ استعمال کر کے تیار ہو جائے اور اپنے اللہ کی عبادت کرے۔ الغرض یہ سارے انتظامات انسان کے لئے اور انسان اپنے مالک کے لئے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص گھوڑا پالے۔ تو گھوڑے کے لئے اصطبل بنائے گا اور اصطبل کے لئے ایک سائیس رکھے گا، جو گھوڑے کی خدمت کرے گا۔ گھاس دانہ اس کے لئے مقرر کرے گا، اس کے لئے ملازم رکھے گا۔ یہ سارا گھوڑے کے لئے کیا جارہا ہے۔

اور گھوڑا کس کے لئے؟ صرف مالک کی سواری کے لئے۔ اگر سواری کے وقت گھوڑا شرارت کرنے لگے اور سواری کا کام نہ دے، گھوڑا کس کام کا؟ وہ تو گولی مار دینے کے قابل ہے۔ مالک کہے میں نے سارے انتظامات اس کے لئے کیے اور اس کو اپنے لئے رکھا۔ اگر میرے ہی کام کا یہ نہیں، تو یہ رکھنے کے قابل کہاں؟ اس لئے جب گھوڑا ختم ہو جائے گا، مالک اصطبل کو، سائیس کو، ملازم وغیرہ کو از خود ختم کر دے گا۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں گھوڑے کے لئے تھیں اور گھوڑے کا مقصد تھا کہ مالک کو سواری کا کام دے۔ جب وہ مقصد پورا نہیں ہوگا، گھوڑا بھی ختم، اصطبل بھی، سائیس بھی ختم۔

ہم اور آپ اس اصطبل میں موجود ہیں۔ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک اصطبل بنایا، جس میں غذائیں رکھیں۔ اصطبل کی چھت بھی بنائی، پھر اس میں آگ ہوا وغیرہ سب کچھ رکھا۔ یہ سب کچھ آپ کے لئے اور آپ کو اس لئے کہ مالک کی عبادت کریں۔ اگر انسان عبادت نہیں کرے گا، تو وہ گولی مار دینے کے قابل ہے۔ اور اگر سارے ہی

مل کر عبادت چھوڑ دیں، تو سارے انسان ختم ہو جائیں گے، یہ اصطبل بھی ڈھا دیا جائے گا، اور اس میں جو سامان کھانے پینے کا ہے وہ بھی ختم کر دیا جائے گا، اور اسی کا نام قیامت ہے۔

فرمایا گیا کہ قیامت اشرارِ خلق پر قائم ہوگی۔ ان لوگوں پر جو بدترین خلائق ہوں گے، جنہیں اچھے برے کی تمیز نہیں ہوگی، برسرِ بازار برائیاں کرتے پھریں گے جیسے جانور اور بہائم ہوتے ہیں۔ اللہ کی کوئی قدر قلوب میں باقی نہیں رہے گی۔ جب اس طرح کے انسان بن جائیں گے تو انسان ختم کر دیئے جائیں گے۔ آسمان بھی اٹھا دیا جائے گا زمین بھی ختم کر دی جائے گی۔ اس لئے کہ جب تخلیقِ انسانی سے مقصدِ خداوندی ہی پورا نہیں ہوتا، پھر یہ چیزیں بھی بیکار ہیں۔ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اگر وہ مالک کے کام کا ہے تو ساری چیزیں برقرار ہیں۔ اگر وہ اپنے مالک کے کام کا نہیں، یہ ساری چیزیں ختم کر دی جائیں گی۔

عقلی اعتبار سے عبادتِ خداوندی کی ضرورت...... آپ اللہ سے لو لگائیں تو یہ ساری کائنات آپ کی خدمت کرے گی، لیکن اگر آپ اپنے مالک کو چھوڑ کر اس کائنات سے لو لگائیں تو مالک کا کیا بگڑے گا، وہ یہ چاہے گا کہ یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔

بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی صاحبِ جمال عورت سے نکاح کرے۔ بڑی شائستہ، مہذب اور حسین وجمیل ہو۔ اس کے لئے ایک عمدہ بلڈنگ تیار کی، تاکہ یہ عورت آرام کر سکے۔ بلڈنگ میں کچھ فراش مقرر کئے تاکہ وہ اس کو جھاڑیں اور صاف کریں۔ باورچی مقرر کئے تاکہ دو وقت کھانا پکائیں، تو اس نے یہ خیال کیا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، اس لئے ایک لمبا چوڑا تاج محل قائم کیا۔ بڑی لمبی چوڑی اور عالیشان بلڈنگ قائم کی۔ یہ سب کچھ کا ہے کے لئے؟ صرف بیوی کے لئے۔ اور بیوی کا ہے کے لئے؟ صرف خاوند کے لئے۔

اگر یہ بیوی خاوند کی بجائے کسی نوکر سے ملاقات شروع کر دے۔ یا اس محل میں باہر سے کوئی آدمی آنے لگے تو خاوند پر کیا گزرے گی؟ وہ کہے گا یہ بیوی طلاق دینے کے قابل ہے، بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے، اس نے تو میری آبرو ختم کر دی، تو وہ بیوی کو ختم کر دے گا۔ جب بیوی ختم ہو جائے گی، بلڈنگ کو کیا کرے گا؟ اسے بھی ختم کر دے گا اور جب بلڈنگ ہی نہ رہی، فراش کو رکھ کر کیا کرے گا؟ باورچی وغیرہ کس کام آئیں گے؟ یہ تو ساری چیزیں بیوی کے لئے تھیں۔ جب بیوی کو طلاق دے کے نکال دیا، ان چیزوں کی کیا ضرورت باقی رہی؟ یہ قصہ کب ہوگا؟ جب بیوی اپنے خاوند کی ہونے کی بجائے کسی دوسرے کی بننے لگے۔ فراشوں سے ہاتھ ملانے لگے، نوکروں سے آشنائی کرنے لگے، ایسے میں یہ بیوی نکال دینے ہی کے قابل ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اللہ نے انسان کو بڑی مخلوق بنایا۔ اللہ کو انسان سے اس سے بھی زیادہ محبت ہے، جتنی کہ ایک خاوند کو بیوی (بلکہ ماں کو بچے) سے ہو سکتی ہے۔ اس کی ضرورت کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے ایک بڑی بلڈنگ تیار کی اور آسمان کا خیمہ قائم کیا۔ اور زمین کا فرش بچھایا۔ ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ

فِرَاشًا﴾ ① ”زمین کو ہم نے تمہارے لئے فرش بنایا“۔﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ ②
”آسمان کو تمہارے لئے محفوظ چھت بنا دیا“۔ روشنی کی ضرورت تھی تو چاند سورج کے بلب لٹکا دیئے، تاکہ کائنات کے اندر روشنی ہو۔ کاروبار کے لئے تیز روشنی کی ضرورت تھی تو دن میں سورج نکال دیا۔ رات کو ہلکی روشنی کی ضرورت پڑتی ہے تو چاند ستارے نکال دیئے۔ ان میں روشنی بھی ہے مگر آنکھوں میں چمک نہیں پیدا کرتی۔ تو رات میں دھیمی اور دن میں تیز روشنی رکھی۔ دن کاروبار کے لئے اور رات آرام کے لئے ہے۔ فرمایا﴿وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ ③۔ رات کو سکون کے لئے بنایا گیا، تاکہ آرام کیا جاسکے۔﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾ ④۔ دن کو کام کاج کے لئے بنایا۔ تاکہ کارخانے لگا کر کام کریں، تو اس میں تیز روشنی رکھی۔ رات کو دھیمی روشنی رکھی۔ پانی کی ضرورت تھی، سو ہر طرف دریا بہا دیئے۔ بارش سسٹم الگ قائم کیا تاکہ پانی ہر وقت ملتا رہے۔ مخلوق کو تکلیف نہ ہو۔ زمین کو فرش بنایا۔ یہ فرش بھی ہے اور گودام بھی ہے اس لئے کہ غذائیں اسی میں سے نکلتی چلی آ رہی ہیں۔ گندم، چاول اور بے شمار نعمتیں بھی۔ تو یہ فرش اور بچھونا بھی اور ساتھ ہی گودام بھی کہ اس میں سارے غلے رکھے ہوئے ہیں۔ ساری ترکاریاں رکھی ہوئی ہیں۔ بارش سسٹم بھی اسی میں ہے۔ دریا بھی اسی میں ہیں۔ پھر پانی آسمان میں نہیں ہے۔ زمین کے اندر ہے اور زمین کے بھی اوپر نہیں ہے تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو۔ سورج کی روشنی تھی۔ گویا وہ ایک لالٹین اور چراغ ہے جس سے انسانوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ ایک گھڑی بھی جس سے صحیح اوقات معلوم ہوتے ہیں، جس روز سے اس کے مالک نے اس کو بنایا ہے۔ صحیح ٹائم دیتی چلی آ رہی ہے۔ آج تک کبھی اس میں خرابی پیدا نہیں ہوئی اور ایک ہیٹر بھی جس سے گرمی پہنچ رہی ہے تو سورج ایک ہے مگر منافع اس کے بے شمار ہیں۔ اسی طرح زمین ایک ہے مگر اس کے منافع بے شمار ہیں۔

یہ سارا قصہ اس لئے تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو، کھانے کو ملے، پینے کو ملے، ہوا ملے، تاکہ اس کے کام کاج میں کوئی خلل نہ پڑے۔ مگر یہ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اور انسان اپنے مالک کے لئے ہے، تاکہ اس کی اطاعت و عبادت کرے۔ اس لئے کہ سب کچھ دینے والے وہ ہیں اور محسن وہ ہیں۔ اس احسانِ عظیم کا بھی تقاضا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

عبادت و طاعت کا عام مفہوم...... اور پھر عبادت و طاعت کے مفہوم کو اتنا عام رکھا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہو سکتی ہے اور اسے ایک مخصوص انداز کے ساتھ متعین نہیں کیا بلکہ اس کو اتنا آسان کر دیا کہ مسلمانوں کی خدمت کرنا، دوستوں کی خدمت کرنا یہ بھی اللہ اللہ کرنا ہے۔ جو طاعت و عبادت میں داخل ہے۔

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۳۲۔
③ پارہ: ۷، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۶۔ ④ پارہ: ۳۰، سورۃ النبا، الآیۃ: ۱۱۔

میرے والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم حج کو گئے تو اس سال وہاں ہیضہ بہت پھیلا، چونکہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ سے بیعت تھے اوران کے خلیفہ بھی تھے۔ فرماتے ہیں کہ اس حج کے موقع پر ہزاروں حجاج بے چارے اسی بیماری میں مبتلا تھے اور میرا یہ کام تھا کہ ایک کو دوا پلا رہا ہوں، تو ایک کے لئے کھانا لے کے آ رہا ہوں۔ بس خدمت میں لگا ہوا، نہ طواف کر سکتا تھا، نہ حرم میں حاضری ہو سکتی تھی۔ اتنا کام رہ گیا کہ کبھی کسی کو دوا پلا رہا ہوں تو کسی کو لوٹے میں پانی وغیرہ دے رہا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض اسی پریشانی میں تھا۔ میں نے اپنے شیخ حضرت حاجی حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے اپنے حال کی شکایت کی کہ حضرت میرا آنا نہ آنا تو برابر ہو گیا۔ کہ میں نہ تو طواف کے قابل، نہ مدینہ منورہ جانے کے قابل میرے ہاتھ میں تو بس دوا کا پیالہ ہے، اور بیماروں کے پاس پڑا ہوں۔ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح سے انگلی دبائی اور فرمایا۔ بیٹا یہ کیا بات کہی آپ نے؟ حج اور طواف بھی عبادت ہے، مگر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی خدمت کرنا ہے، یہ عبادت ہے، تو اجر و ثواب اس سے کہیں زیادہ ملے گا جتنا حج اور طواف میں ملتا ہے

دل بدست آور کہ حج اکبر است

آدمی اپنے دل کو قابو میں لائے کہ یہ سب سے بڑا حج ہے، تو فرمایا کہ حج کا فریضہ ادا کر لیا ہے۔ اب ان بیماروں کی خدمت کرو، ہزار طواف سے بڑھ کر اجر و ثواب ملے گا۔ جو طواف میں نہیں ملے گا۔ گویا بتلایا کہ عبادت فقط صدقہ اور نماز میں نہیں ہے۔ عبادت کی بہت سی شاخیں ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دار العلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور مولانا رفیع الدین صاحب جو سب سے پہلے مہتمم ہیں۔ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں اور صاحبِ کشف و کرامت بھی ہیں، اول الذکر دونوں حضرات بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ مولانا رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی آئے، مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے تواضع کی اور عرض کیا کہ حضرت آپ بھی کھائیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرا تو روزہ ہے۔ نفلی روزہ تھا۔ غروبِ آفتاب میں کوئی دس منٹ باقی تھے، انہوں نے فرمایا کہ حضرت کھایئے۔ اللہ اس میں آپ کو زیادہ اجر دے گا۔ بس فوراً بیٹھ گئے اور کھانا شروع کر دیا۔ روزہ توڑ دیا، حضرت فرماتے تھے کہ مجھے اس تعمیلِ حکم میں جو اجر ملا ہے اگر میں ہزار روزے بھی رکھتا تو وہ اجر و ثواب نہ ملتا، جو اس وقت روزہ توڑنے میں ملا۔

تو عبادت فقط نماز روزہ میں نہیں ہے، عبادت کھانے، پینے میں بھی ہے، سونے، جاگنے، چلنے پھرنے میں بھی ہے۔ گویا اللہ فقط مسجد میں نہیں ملتا۔ گھر میں بھی ملتا ہے۔ دستر خوان پر بھی ملتا ہے۔ ہر جگہ آدمی اللہ کا جمال دیکھ سکتا ہے، جبکہ سچی نیت سے چلے اور طریقِ شریعت کے مطابق چلے۔ اتباع کا جذبہ لے کر چلے۔ تو ہر چیز اس کے لئے طاعت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اِسلام دنیوی معاملات سے روکنے کے لئے نہیں آیا...... حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ یہ ساری دنیا تمہارے لئے ہے اور تم اپنے مالک کے لئے ہو۔ مملوک کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کے سامنے نیاز مندی سے جھکے اور اطاعت کرے۔ جب آدمی اس میں مضبوط ہو جائے گا تو کوئی بھی دنیا کا کام کرے، اس میں خیر و برکت ہوگی۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کاروبار نہ کرو۔ دنیوی معاملات ترک کر دو۔ اپنے تحفظ کی شکلیں اختیار نہ کرو۔ سب کچھ کرو مگر اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کرو۔ عابد اور بندے بن کے کرو۔ یہ سمجھ کر کہ اسباب میں کچھ نہیں رکھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ہم نے یہ اسباب اختیار کئے ہیں۔ تو دینِ اسلام صرف درست کرنے کے لئے آیا ہے۔ آپ کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لئے نہیں آیا قلب کا رخ اللہ کی طرف پھیر لو اور کام ساری دنیا کے کرو۔ وہ خیر بنتے چلے جائیں گے۔ مسلمان کی شان یہ ہے، کہ دل بیار، دست بکار۔ دل مالک میں لگا ہوا ہے اور ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے کاروبار میں بھی برکت ہے، یہ عبادت ہی شمار ہوگی۔

تو اسلام کاروبار اور تجارت و زراعت کو روکنے کے لئے نہیں آیا۔ سب چیزوں کی اجازت دی مگر یہ کہ میرے ساتھ تعلق قائم کر کے میرے حکم کے مطابق چلو۔ اس لئے اسلام آیا ہے۔ اگر اپنے نفس کے حکم کے مطابق چلو گے تو نفس تو ہر ایک کا آزاد اور باغی ہے۔ ظاہر ہے اس سے نہ دنیا بنے گی نہ آخرت۔ اگر یہ ساری چیزیں حکمِ خداوندی کے تحت کریں تو اس میں خیر و برکت ہوگی۔ دنیا بھی بنی اور آخرت بھی بنی۔

تو دین کا کام قلب کا رخ درست کرنا ہے جب وہ درست ہو جائے گا، سارا راستہ درست ہوتا چلا جائے گا اور اگر خدانخواستہ وہ غلط ہوگا، سارے کام غلط ہوں گے۔ مثلاً آپ سفر میں جائیں اور دو چار ہزار میل کا سفر کیا، لیکن رخ بدل گیا تو جتنا سفر کرتے جاؤ گے منزلِ مقصود سے دور ہٹتے چلے جاؤ گے۔ تو سفر کی تیاری میں تو آپ نے کمی نہیں کی۔ روپیہ بھی خرچ کیا۔ سامان بھی لیا، لیکن بجائے اِدھر کے اُدھر چل پڑے۔ جانا تھا آپ کو نیروبی اور راستہ فرانس کا اختیار کر لیا اور اپنے دل میں یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ نیروبی جا رہا ہوں، جتنا چلو گے نیروبی سے دور ہوتے جاؤ گے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ راستہ بھی چلو، روپیہ بھی خرچ کرو۔ مگر منزل متعین کر لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے۔ جنت کی طرف چلنا ہے۔ آخرت کی طرف چلنا ہے۔ رخ صحیح کر لو ساری دنیا دین بنتی چلی جائے گی۔ اور رخ اللہ تعالیٰ سے پھیر لو۔ ساری چیزیں وبال بنتی چلی جائیں گی۔ خیر و برکت تو اس میں کیا ہوگی؟ اسلام کا کام راستہ درست کرنا اور صراطِ مستقیم پر چلنا ہے اور یہی حاصلِ عبادت ہے جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ تو فرمایا ﴿مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ ① ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں اور عبادت کا مفہوم عام قرار دیا۔ اس لئے کھانا، پینا، سونا جاگنا بھی عبادت ہے۔ جب کہ منزلِ مقصود ہماری ذات کو ٹھہرا دیا جائے۔ بس مقصود یہ ہے کہ مسلمان کی منزل اللہ ہو۔ وہ ہر کام کرتا جائے، خدا کی طرف چلتا

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۶۔

جائے اس کا ہر کام باعثِ خیر و برکت ہوگا۔ اور فرمایا: ﴿مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ﴾ ① ترجمہ: ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ہمیں رزق پہنچاؤ، تم ہمیں روٹی کھلاؤ، ہم تو غنی ہیں۔ روزی کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے وہ دینے والا ہے۔ ہم روزی نہیں مانگتے۔ تمہاری نیاز مندی چاہتے ہیں، روزی ہم دیں گے۔

اللہ اور بندہ میں معاہدہ...... تو ایک کام اللہ نے اپنے ذمہ لیا اور ایک کام بندہ کے ذمہ لگایا، اپنے ذمہ یہ کیا کہ ہم رزق دیں گے، عزت دیں گے۔ تمہارے ذمہ یہ کیا کہ تم عبادت کرو۔ نیاز مندی برتو۔ اب تم اپنا کام چھوڑ دو گے، وہ بھی اپنا کام چھوڑ دیں گے۔ اس لئے جو عبادت ترک کر دے گا، تو روزی اور عزت، جو دیا جا رہا تھا، اس کو بھی بند کر دیا جائے گا۔ اگر اسی کام میں لگے رہے جو آپ کے سپرد کیا گیا، پھر وہ اپنا کام انجام دیں گے، گویا معاہدہ ہے۔ لیکن جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو دوسرے کے ذمہ عہد پورا کرنا نہیں رہ جاتا۔ آج جو مسلمان پریشان ہیں کہ ہمارا غلبہ ختم ہوگیا، اقتدار ختم ہوگیا۔ حاسدین ہم پر چھا گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے اپنا کام چھوڑ دیا، انہوں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔

اور انہوں نے اس لئے نہیں چھوڑا کہ انکے خزانے میں کوئی کمی تھی۔ معاہدہ تھا کہ یہ کام تمہیں کرنا ہوگا اور یہ ہم کریں گے، جب یہ عہد شکنی کرے گا، تو دوسرے کے ذمہ عہد باقی نہیں رہے گا۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ آپ نے اطاعت کا عہد چھوڑ دیا، انہوں نے رزق دینے کا عہد چھوڑ دیا۔ رزق فقط روٹی کو نہیں کہتے۔ رزق، روٹی، عزت، اقتدار اور طمانیتِ قلب یہ سب کچھ اس میں آتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہم سب پریشان ہیں۔ روٹی ہمیں کھا رہی ہے اور ہم روٹی کو کھا رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ اس واسطے کہ وہ جو اطمینان قلب والی روزی تھی، وہ ملنا بند ہوگئی۔ وہ ہم سے چھین لی گئی۔ اس لئے چھین لی گئی کہ ہم نے عہد شکنی کی۔ تو یہ عہد یاد دلانے ہی کے لئے چند آیتیں پڑھی تھیں اور یہ وہی آیتیں ہیں جو اس عہد سے متعلق ہیں۔ یہیں سے آپ نے زندگی شروع کی ہے۔ یعنی عہد "اَلَسْتُ" سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ② "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" میں تمہارا پالنے والا نہیں ہوں؟ تمہیں روزی اور عزت دینے والا نہیں ہوں؟ یہ ساری چیزیں رب میں داخل ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا اور سب نے کہا کہ ﴿قَالُوْا بَلٰی﴾ ③ "کیوں نہیں بے شک آپ ہی رب ہیں"۔ سب کچھ آپ ہی ہیں۔ تو فرمایا ﴿شَهِدْنَآ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ﴾ ④ "فرمایا کہ تم بھی گواہ رہو۔ کہیں قیامت کے دن یوں کہ دو کہ ہمیں تو یہ بات ہی نہیں بتلائی"۔ ہم کس کی عبادت کرتے؟ کس کو رب مانتے؟ اس لئے ہم نے بتلا دیا اور سمجھا دیا۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۸۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔ ③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۲۔ ④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۳۔

﴿اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ ① ''یہ بھی مت کہنا کہ جو ہمارے پچھلے تھے وہ بہت برائیاں کر گئے۔ ان کی وجہ سے ہمیں پتہ نہیں تھا''۔ کسی کی برائی سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا، خود جو برائی کرے گا۔ اس کی اس کو سزا ملے گی۔ تو یہ نہ کہنا کہ ''اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا'' ہمارے ماں باپ نے شرک اور بت پرستی کی تھی، ہم تو بعد میں تھے، ہمیں کیوں پکڑا جاتا ہے۔ جواب میں ہم بتلاتے ہیں کہ ماں باپ کی وجہ سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا۔ جیسے ماں باپ سے عہد لیا تھا، تمہارے سے بھی عہد لیا تھا، ایک ایک فرد سے عہد لیا تھا۔ انہوں نے اگر عہد شکنی کی تھی تو تم نے کیوں کی؟ قیامت کے دن یہ عذر نہیں چلے گا کہ پچھلوں کی برائی نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں تھا، ہم غفلت میں رہے۔

تو ہماری زندگی عہد الست سے چلی ہے۔ جہاں اقرارِ ربوبیت کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں خالق اور مالک ہوں۔ مجھے یاد رکھنا اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام آئے۔ یہ روز کی تقریریں اور وعظ اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے ہیں، کہ یہ عہد بھول نہ جانا۔ اس لئے جب بندہ اس عہد پر پکا رہے گا۔ اور اس کے مطابق چلے گا، تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے عہد کو پورا کریں۔

بس یہ چند باتیں آیت کے تحت میں مجھے گزارش کرنی تھیں۔ وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اور بقدرِ ضرورت آیات کی تشریح بھی ہو گئی ہے۔ اب دعا کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسنِ اخلاق، عبادت، ریاضت اور توجہ اِلی اللہ کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۷۳۔

اِسلام میں تصورِ آخرت

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَـدُ اَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـــــا بَـعْـدُ !...... بزرگانِ محترم! دنیااور آخرت دو چیزیں ہیں۔آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے یہ تصور باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے اور دنیا یہ ہے، یہ غلط ہے۔ بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔اسے نکالنا ہمارا کام ہے یہی کھانے پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال، انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ان کے ذریعے سے اپنی آخرت نکالو۔یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالم ہے اور دنیا ترک کروتب جاکے آخرت میں پہنچو گے۔دنیا میں رہ کر اس میں سے آخرت نکالنا، یہ دانش مند کا کام ہے۔یہ جو آپ نماز روزہ کرتے ہیں بدن ہی سے تو انجام دیتے ہیں، بدن زمانے میں ہے یا مکان میں ہے، تو اس میں سارے دنیوی ہی افعال ہیں۔اس سے جنت بن رہی ہے۔جنت اس نماز سے ہی تو نکلی جو آپ نے بدن سے سرانجام دی۔آخرت کوئی الگ تو نہیں تھی۔

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ہزاروں نیکیاں لکھی گئیں، وہ ہزاروں نیکیاں جنت ہی تو ہیں۔آپ کی اس دنیا ہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔کہیں باہر جانیکی ضرورت نہیں ہے۔افعال صحیح ہو کے آئیں، جنت یہیں سے بن جائے گی۔افعال غلط ہو کے آئیں، تو جہنم یہیں سے بن جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر آدمی کھانا کھانے بیٹھے۔کھانا ایک طبعی فعل ہے بھوک لگے گی تو آدمی خواہ مخواہ کھائے گا، لیکن اس نیت سے کھانے بیٹھے کہ قوت پیدا ہوگی تو عبادت کروں گا۔اور ''بِسْمِ اللّٰہِ'' سے شروع کرے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا'' پر کھانا ختم کرے۔فرماتے ہیں کہ اس کے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔حالانکہ کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے، گناہوں کا بخشا جانا یہی تو آخرت ہے اس لئے آخرت دنیا ہی میں ہوئی۔

حدیث میں ہے کہ دو بھائیوں نے مصافحہ کیا اور قلبی محبت سے کیا۔دونوں کے منہ پر مسکراہٹ آ گئی اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔فرماتے ہیں کہ ہاتھ جدا نہیں کرنے پائیں گے کہ پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ایک

طبعی فعل انجام دیا مگر اس سے مغفرت ہوگئی بہر حال اس دنیا ہی سے ہماری آخرت نکلتی ہے۔

آخرت کے بارے میں اسلام اور دیگر مذاہب کا فرق ......یہیں سے دوسرے مذاہب اور اسلام میں فرق پڑ جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت دنیا سے بالکل الگ تھلگ کوئی چیز ہے۔ جب تک ترک دنیا نہیں کرو گے آخرت نہیں ملے گی۔ مثلاً ہندو مذہب ہے، اس میں سنیاس لیتے ہیں کہ گھر بھی ترک کیا بیوی بچے بھی ترک کئے اور جا کر کسی کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت بن گئی۔

عیسائیوں کے ہاں ترکِ لذات ایک مستقل موضوع ہے، کہ گرجا میں آدمی داخل ہو جائے اور یہ عہد کر لے کہ میں نکاح نہیں کروں گا۔ کسی سے ملنے بھی نہیں جاؤں گا۔ بالکل ترکِ دنیا کر کے ایک کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت ملی۔

اسلام نے ان سب چیزوں کو رد کر دیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے بتایا کہ گوشے میں بیٹھ جانا پہاڑوں میں بیٹھ جانا، سمندر کے کناروں پر اپنے آپ کو گرا دینا، اس سے آخرت نہیں بنتی۔ دنیا میں رہ کر، لوگوں میں رہ کر، ان کی اڑی کڑی جھیل کر اصلاح کی کوشش کرے، اس سے آخرت بنے گی، اسی کھانے اور پینے سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ تم کھانا پینا چھوڑ دو۔ قرآن حکیم نے حکم دیا ﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ اللہ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے بنائی ہیں، انہیں استعمال کرو اور اعمالِ صالح اختیار کرو۔ جتنی نیت سچی ہوگی اسی میں سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو اور جنگل میں جا بیٹھو، تب آخرت بنے گی۔

اسی طرح لباس ہے تو بعض مذاہب میں ترکِ لباس ہے۔ صرف لنگوٹا باندھو فرض لباس بھی ترک کیا۔ اسلام نے ناجائز قرار دیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ گوشہ گیری ہے یہ اسلام میں نہیں ہے لباس پہنو، موٹا پہنو، اچھا پہنو، نیت اچھی رکھو۔ اسی سے آخرت نکلے گی۔ تو کھانا پینا، رہنا سہنا، مکان بنانا، اس سے اسلام نے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا ہے۔ تھوڑی بہت زینت اور طبیعت کے موافق کرنے سے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا اس سے یہی چیزیں آخرت بنیں گی۔ تو اور مذاہب میں تو یہ کہ ترکِ دنیا سے آخرت بنتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر نیت صحیح کرنے سے آخرت بنتی ہے۔ انہی افعال میں سے آخرت بنے گی۔

اب مکان ہے۔ گیاہ میں ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے ہاں خدا رسیدہ وہ ہے جس کا نہ گھر ہو نہ در ہو۔ صبح کے وقت ان کے ہاں ایک لشکر نکلتا ہے۔ وہ گھر گھر کھانا مانگتے ہیں ان کے ہاں کھانا دانا نہیں پکتا، کسی نے بھیک دے دی، کھا لیا۔ اسلام نے اسے ممنوع قرار دیا کہ یہ کام نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے، بلکہ باوقار رہے۔ تو کھائے بھی، پیئے بھی، پہنے بھی، طبیعات کو استعمال کرے اور نیت یہ رکھے کہ اپنی آخرت کے لئے کر رہا ہوں۔ حکمِ خداوندی ہے تعمیلِ حکم کر رہا ہوں۔ وہی چیز اجر کا ذریعہ بنے گی۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ بھک منگے بن جاؤ۔ دنیا کماؤ، اس سے اپنی خدمت کرو اور کسبِ حلال کو فرض قرار دیا۔ تجارت کرو۔ یہ راستہ دکھلایا نہ یہ کہ سب چیزیں

چھوڑ کر پہاڑ کے گوشے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ اعضاء کو مفلوج کر دو تو آخرت بن جاتی ہے۔ مثلاً ہاتھ اونچا کر دیا، وہ خشک ہو گیا اور وہ یہ سمجھے کہ اب آخرت بنی، اسلام نے کہا یہ لغویت ہے، اس سے آخرت کا کیا تعلق؟

یا بولنا چھوڑ دیا اس سے سمجھتے ہیں کہ آخرت بنی۔ اسلام نے کہا کہ یہ آخرت کیسی کہ ایک قوت کو ضائع ہی کر دیا۔ قوت سے کام لینے کا نام آخرت ہے نہ کہ قوت کو معطل چھوڑ دینے کا نام آخرت ہے۔

میرا ایک دفعہ ''گیاہ'' میں جانا ہوا' تو وہاں ایک بہت بڑا اور اونچا مندر ہے۔ اس میں بدھ کی تصویریں ہیں۔ اس کے بت رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں ہم نے یہ دیکھا' کہ بدھ کا ایک بہت بڑا بت ہے اور لوگ اس کے ارد گرد گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ بہت سے پجاری چراغ جلا کر جا رہے ہیں۔ میں نے ایک پجاری سے پوچھا۔ اس گھی کو تم کیوں ضائع کر رہے ہو۔ کوئی آدمی کھاوے گا تو اس کے بدن میں قوت پیدا ہوگی اسے کیوں خواہ مخواہ ضائع کر رہے ہو۔ اب وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ میں سمجھا کہ یہ بہرہ ہوگا میں نے ذرا زور سے کہا۔ وہ پھر بھی دیکھ رہا ہے جواب کوئی نہیں دیتا۔ میں نے اور زور سے کہا' تو لوگوں نے مجھ سے کہا کیوں اپنا زور صرف کر رہے ہو۔ یہ جواب نہیں دے گا، ان کے ہاں چپ رہنا ایک عبادت ہے۔ یہ شخص چالیس برس سے نہیں بولا اور یہ پچاس برس سے نہیں بولا۔ تو زبان ایک قوت ہے اس کو ضائع کر دینے کا نام عبادت نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اس قوت سے ہی تو آخرت کماؤ گے۔ قوت ضائع کر دی، آدمی ناقص رہ گیا تو آخرت بھی ناقص۔ زبان کو استعمال کرو، تلاوتِ کلام پاک میں ، درود شریف پڑھنے میں اور عبادت میں لوگوں کی اصلاح میں نیک مشورے دینے میں اور سچی باتیں کہنے میں۔ اس میں قوت کو استعمال کرو۔ تو آخرت بنے گی۔ نہ یہ کہ قوت کو ختم کر دو اور بیکار بیٹھ جاؤ۔ اس سے تو بدی بنے گی۔

ہاتھ ہے آپ اس کے ساتھ مصافحہ کریں گے، اجر ملے گا۔ آخرت بنے گی۔ قرآن کریم کو ہاتھ لگائیں گے، اجر ملے گا۔ بیت اللہ شریف کو چھوئیں گے، اجر ملے گا، ہاتھ ہوگا جبھی تو اجر ملے گا۔ اور اگر ہاتھ کو اٹھا کر خشک کر دیا، قوت بھی ختم اور اجر بھی ختم ہو گیا۔ تو جتنے اجر وثواب کے راستے تھے وہ سارے بند ہو گئے۔

اس طرح پیر کو مفلوج کر دیا۔ پیر ہوگا تو مسجد کی طرف جائیں گے دوستوں کے گھر بھی جائیں گے عبادت گاہوں میں بھی جائیں گے مجالسِ وعظ میں بھی جائیں گے۔ اس سے اجر وثواب کے ڈھیر ملیں گے اور جو پیر کو کلہاڑا مار کے ختم کر دیا تو نہ مجلس رہی نہ مسجد کی طرف جانا رہا، نہ حج رہا۔ وہ کیا خاک اجر ملا؟

تو تمام مذاہب نے یہ کہا ہے کہ دنیا ترک کرو، تب آخرت ملے گی۔ بدن کو کھو دو تو آخرت ملے گی۔ اسلام کہتا ہے کہ دنیا میں رہ کر آخرت پیدا کرو۔ ترکِ دنیا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی نعمتوں کو چھوڑ دو۔ ہاں اس میں مبالغہ مت کرو۔ غلو مت کرو۔ حد سے مت گزرو۔ اعتدال کے ساتھ استعمال کرو۔ اس سے اپنا بھی کام چلاؤ۔ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کی بھی خدمت کرو۔ تمہاری آخرت بنے گی۔ تو یہ نیت پر اور افعالِ اختیاری پر ہے کہ مرضی

خداوندی کے مطابق وہ افعال ہوں گے تو دنیا ہی آخرت بنے گی۔

افعالِ دنیوی کے بارے میں اسلام کا نظریہ......اب دنیا کے بڑے افعال سونا، جاگنا، کھانا، پینا، رہنا، سہنا اور مکان بنانا۔ ان سب کو حق تعالیٰ نے نعمت شمار کیا ہے فرمایا ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْٓ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ ① اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کرے اس نے جو پاکیزہ غذائیں اور لباس دیئے ہیں۔ کون ہے جو انہیں حرام کرے؟ ممانعت فرمادی کہ انہیں حرام مت قرار دو۔ البتہ حدود بتلادیں کہ ریشم کا کپڑا ہے۔ مرد کے لئے ناجائز عورت کے لئے جائز۔ زیوارت میں سونا، چاندی عورت کے لئے جائز۔ مرد کے لئے ناجائز تو حدود بتلادیں ان حدود میں رہ کر استعمال کئے جاؤ۔

مکان ہے اس کے بارے میں اللہ نے احسان جتلایا اور فرمایا کہ ﴿وَاللهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ ② اللہ نے تمہارے گھروں میں تمہارے لئے سکون اور سکونت رکھی ہے۔ گھر بناؤ، استعمال کرو۔ اور پھر آگے کپڑوں کا بھی گھر ہوتا ہے۔ یعنی کپڑے کا خیمہ۔ اور چمڑوں کا گھر بھی ہوتا ہے۔ یعنی چمڑے کا خیمہ، پتھر اور اینٹ کا گھر ہوتا ہے۔ ساری قسمیں گنوا کے احسان جتلایا۔ احسان اسی پر جتلاتے ہیں جو نعمت ہوتی ہے۔ مصیبتوں پر تو احسان نہیں جتلایا جاتا۔ مکانوں کو اللہ نے نعمت قرار دیا۔ تو کون ہے جو اللہ کی نعمتوں کو رد کرے؟ حدود میں رہ کر انہیں استعمال کرو۔ مبالغہ اور غلو نہ کرو۔ ایک عام شریعت میں جو راحت کے سامان ہیں۔ انہیں آدمی اپنے لئے مہیا کرے تو کھانا ہو، لباس ہو۔ بلکہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ "اِنَّ اللهَ يُحِبُّ اَنْ يَّرٰى اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ" ③ اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے، تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس بندے پر دیکھے۔ تو ڈھنگ کا کھانا ہو، ڈھنگ کا پہننا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو یہ نہیں کہ پھٹے حال میں آدمی رہ رہا ہے۔ کوڑے کباڑ میں کھڑا ہوا ہے۔ نہ صفائی نہ ستھرائی مکان بنانے کا حکم دیا، صفائی ستھرائی کا حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا اپنے گھروں کے صحن چوک بھی صاف رکھو، دالان کو صاف رکھو۔ سڑک تک کو صاف رکھو۔ لباس کی صفائی کا حکم دیا۔ صفائی اور ستھرائی اسلام کا ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ چیزیں چھڑائی نہیں گئیں حدود بتلادی گئیں کہ ان سے آگے نہ گزرو۔ تو ہماری آخرت اسی دنیا ہی سے نکلتی ہے۔ اس بدن ہی سے تو آخرت پیدا ہوگی۔

اَعمالِ ایمانی کی خوشبو......حدیث میں ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے۔ تو ملائکہ علیہم السلام روح کھینچنے کے لئے آتے ہیں تو ہاتھ پیروں کو سونگھتے ہیں کہ اس میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے۔ اعضاء کو سونگھتے ہیں۔ کیونکہ ایمانی افعال سرانجام دینے سے بدن میں خوشبو ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ آخرت میں محسوس ہو جائے گی۔

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۲۔ ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۰۔

③ السنن للترمذی، ابواب الادب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب ماجاء ان اللہ یحب ان یری، ج: ۱۰، ص: ۲۰۔

حدیث میں ہے کہ ”خُلُوْفُ فَمِ الصَّآئِمِ اَطْیَبُ عِنْدَاللّٰہِ مِنْ رِیْحِ الْمِسْکِ“ ① روزے میں جب آدمی نہیں کھاتا تو منہ میں ایک قسم کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک یہ منہ کی بو مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یہاں تو یہ بدبو ہے، وہاں یہ خوشبو۔ وہ خوشبو درحقیقت روزے کی ہے اور روزے میں خوشبو ایمان سے ہے۔ ورنہ ایمان نہ ہو تو روزہ فاقہ ہے۔ وہ ایمان ہی کی خوشبو ہے ملائکہ علیہم السلام بدن میں سے اسی خوشبو کو سونگھتے ہیں کہ کتنی خوشبو آرہی ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوگا کہ آدمی کے ساتھ اعمال نہیں ہیں اور ملائکہ علیہم السلام نے بھی سمجھ لیا کہ یہ جہنم کے لائق ہے اور وہ ملائکہ آ گئے جو کفار کی روح قبض کرتے ہیں۔ ان کی شکلیں ہیبت ناک ہوں گی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اس کے بدن میں داخل کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پنڈلی سے ایک عمل چپکا ہوا تھا۔ اس نے کسی موقع پر ”سُبْحَانَ اللّٰہِ“ کہا ہے۔ نیکی ہاتھ لگ جاتی ہے تو ملائکہ رحمت کہیں گے کہ تم ہٹو ہم اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ اعمال اسی بدن ہی میں سے سرزد ہوئے۔ پنڈلی میں سے عمل نکلے گا جگر میں سے نکلے گا ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدمی دل کی قوت سے عمل کرتا ہے، تو دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کے کوئی عمل کرے تو گردوں کی طاقت سے آدمی کھڑا ہوتا ہے، اس عمل کا اثر گردوں پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑی بے جگری سے لڑتا ہے، خوب اس نے جہاد کیا۔ اس عمل کا تعلق جگر سے ہوگا۔ تو ہر عضو سے خاص اعمال متعلق ہیں۔ اور ملائکہ وہ پہچانتے ہیں۔ تو انہیں اعضاء میں اعمال کی تلاش کریں گے اور وہ کہیں گے کہ اس کا عمل پنڈلی میں چھپا ہوا تھا۔ لہذا یہ صاحب نیکی ہے۔ ملائکہ عذاب اس کی روح قبض نہیں کر سکتے۔ ہم اس کی روح قبض کریں گے۔ تو اسی عمل اور بدن ہی سے آخرت بنی۔

دربارِ خداوندی کی پہلی پیشی ...... اور یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد مؤمن کی روح آسمانوں پر چڑھ جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلے آسمان پر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اور ستر ہزار ملائکہ علیہم السلام کے ہجوم کے ساتھ استقبال ہوتا ہے۔ ملائکہ صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ قطار کے بیچ میں سے اعزاز و اکرام کے ساتھ گزرتی ہے۔ پھر آسمانِ دوم کے مقربین اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر آسمانِ سوم کے مقربین اس کا استقبال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عرش پر پہنچ جاتا ہے۔ اور وہاں روح سجدہ کرتی ہے حق تعالیٰ ابتدائی خطاب ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ فرماتے ہیں، کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ کیا لے کے آیا؟

ایک عالم ہیں ان کی وفات ہوئی۔ تو بعض عارفین پر ان کا حال منکشف ہوا۔ حق تعالیٰ کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تو ڈانٹ کر فرمایا۔ کیوں آیا؟ کیا لے کر آیا؟ انہوں نے کہا میں ڈیڑھ سو قرآن شریف ختم کر کے لایا ہوں۔ فرمایا ایک بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے روزے رکھے، فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے تہجد پڑھے۔ فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ اب یہ حیران کہ کیا چیز پیش کروں اور ادھر سے مطالبہ کہ کیوں آیا؟ آخیر میں انہوں نے کہا کہ میں آپ کی رحمت کا

① الصحیح للبخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم ج:٦ ص:٤٥٧.

سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ نہیں! فرمایا: اب بات ٹھکانے کی کہی۔ میری رحمت تیرے اوپر واجب ہوگئی۔ کسی وقت یہ نیت کی ہوگی وہ جا کر کام آ گئی۔

وسعت مغفرتِ خداوندی...... تو آدمی اپنے قلب کے رخ کو صحیح رکھے۔ عملی کوتاہیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں ہر ایک میں کچھ نہ کچھ گناہ، بڑا ہو یا چھوٹا، ضرور ہوتا ہے۔ سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کے وہ تو معصوم ہیں۔ نبی کے بعد کوئی ایسا نہیں جس سے کوئی ذلت یا خطا نہ ہوتی ہو اسی کو ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَاَیُّ عَبْدٍ لَّکَ لَا اَلَمَّا'' ① یا اللہ جب آپ کو بخشنا ہی ہے تو سارے گناہ کیوں نہیں آپ بخش دیتے۔ کون بندہ ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، آپ کے سامنے سارے گنہگار ہی ہیں۔

اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: فرمایا: ''رَبِّ مَغْفِرَتُکَ وَاسِعٌ مِّنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُکَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ'' ② اے میرے پروردگار تیری مغفرت میرے گناہوں سے بہت وسیع ہے۔ کہاں تک گناہ کروں۔ ہزار برس بھی کروں گا تو محدود ہوں گے۔ اور تیری رحمت کی کوئی حد ہی نہیں۔ میرے گناہوں کی تیری رحمت کے سامنے کیا قدر و قیمت ہے۔ نیز میرے عمل محدود ہیں۔ بلکہ کوئی چیز نہیں مگر تیری رحمت ان سے بہت وسیع ہے۔

توبہ کا راستہ نہ ترک کیا جائے...... بہر حال کوئی بندہ بشر ایسا نہیں جس سے کوئی غلطی اور خطا نہ ہوئی ہو۔ انبیاء علیہم السلام اس سے بری ہیں۔ اسی واسطے فضل ہی پر مدار ہے۔ تو جب فرمادیں گے، جبھی مغفرت ہوگی۔ نیت اپنی یہ ہونی چاہئے کہ آدمی حق تعالیٰ پر بھروسہ کرے جب خطاء ہو توبہ کرے۔ گناہ سرزد ہوا فوراً توبہ کرلے تا کہ کھاتہ صاف ہوتا رہے۔ اصل چیز نیت ہے کہ آدمی کا رخ صحیح ہونا چاہئے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حدیثِ قدسی ہے کہ: اے بندے اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی اتنی (گناہوں سے کہیں بڑھ کر) مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو اصل چیز عظمتِ خداوندی ہے۔ آدمی وہ قائم رکھے جو وفادار ہوتا ہے وہ غلطی بھی کرتا ہے تو آقا کہتا ہے کہ اس کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اگر گناہ سرزد ہو، فوراً توبہ کرے۔ تاخیر ہرگز نہ کرے۔ کیونکہ اگر گناہ کیا اور دل پہ جم گیا۔ پھر گناہ کرتا رہا۔ پھر توجہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ گناہ کے بعد معافی مانگ لے۔ اس سے قلب زنگ آلود نہیں ہوتا اور معصیت ڈھل جاتی ہے۔

---

① السنن للترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ والنجم، ج: ۱۱، ص: ۹۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح و ضعیف سنن الترمذی ج: ۷ ص: ۲۸۴ رقم: ۳۲۸۴.

② شعب الایمان للبیہقی، ج: ۱۵ ص: ۱۵۸. امام بیہقیؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قال ابو عبداللہ: رواتہ مدنیون لایعرف واحد منہم بجرح.

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک آدمی نے بہت بڑا گناہ کیا۔ اور ندامت ہوئی تو کہا۔ ''یَارَبِّ''! ابھی یہ نہیں کہا کہ میری مغفرت کر دیجئے، فقط ''یَارَبِّ'' کہا۔ فوراً حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''اَیَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یُؤَاخِذُهٗ'' اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کرے گا۔ فرمایا: اگر یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ مغفرت مانگے۔ اس سے پہلے ہی مغفرت کر دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہی کہ اس کی مغفرت ہوگئی۔ آ کر پھر وہی گناہ کیا جو پہلے کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اس لئے آدمی سے جب غلطی ہو، فوراً توبہ کر لے، بس معاملہ صاف ہوگیا۔ ①

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے راستے پر لگا ہوا آدمی ٹھوکر لگی، گر پڑا۔ اٹھا، کپڑے جھاڑ کر پھر چلنا شروع کر دیا۔ پھر گر پڑا پھر چلنا شروع کر دیا۔ بالآخر منزل تک پہنچ جائے گا اور جس نے گرتے ہی راستہ ہی بدل لیا۔ وہ نہیں پہنچے گا۔ تو راستہ نہ چھوڑا جائے۔ جس وقت گناہ سرزد ہو، توبہ کرے، ایک نہ ایک دن منزل پالے گا۔ اسی لئے ایک حدیث میں فرمایا گیا ''سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَرُوْحُوْا وَاغْدُوْا وَشَیْءٌ مِّنَ الدُّلْجَةِ'' ② راستے پر لگے رہو۔ اعتدال کے ساتھ چلتے رہو، منزل کھوٹی مت کرو کہ منزل چھوڑ کے کسی سبزہ زار کے اوپر بیٹھ گئے۔ کسی باغ میں بیٹھ گئے بلکہ راستے پر چلتے رہو۔ ایک نہ ایک دن پہنچ جاؤ گے۔

توبہ کی قوت...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام اور شیطان کی دشمنی ٹھن گئی تو شیطان آدم علیہ السلام کا حاسد اور فریبی دشمن تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تاجِ خلافت پہنا دیا گیا۔ جنتوں کے وعدے دیئے گئے۔ تو شیطان کو فکر ہوئی، اس نے کہا یا اللہ! آدم بہر حال میرا دشمن ہوگیا، میں اس کا دشمن اس کے پاس عقل بھی ہے اور اسبابِ ہدایت بھی ہیں۔ یہ تو میرا ناطقہ بند کر دے گا۔ کچھ قوت مجھے بھی دے دیجئے گا کہ میں اس پر غالب رہوں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا: ''ہم نے تجھے اکثریت کی قوت دی''۔ آدم علیہ السلام کا اگر ایک بیٹا ہوگا، تو تیرے دس بیٹے ہوں گے۔ اس کے سو ہوں گے، تیرے ایک ہزار ہوں گے۔ تو ہمیشہ اکثریت میں رہے گا۔ یہ ایک ارب ہوں گے تو، تو دس ارب ہوگا۔ مگر وہ بھی بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے دیکھا کہ بعض دفعہ تو اقلیت بھی اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اکثریت ہی کا غلبہ ہو۔ اس نے عرض کیا۔ یا اللہ! بے شک میں اکثریت میں ہوگیا۔ لیکن اگر طاقت دراقلیت ہو، وہ تو اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔ اس لئے مجھے اور طاقت دیجئے۔ فرمایا: تجھے یہ طاقت دیتے ہیں کہ تو آدم کے بدن میں اس طرح سرایت کر سکے گا جیسے خون رگوں میں دوڑتا ہے۔ کہنے لگا۔ ''اب میں اسے پچھاڑ سکوں گا''۔ اس لئے اس کے اندر گھس کے قلب میں وسوسے ڈالوں گا، دماغ کو خراب کروں گا۔ اور جو چاہے

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: یریدون ان یبدلوا کلام اللہ ج: ۲۳ ص: ۲۶.

② الصحیح للبخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة، ج: ۲۰، ص: ۹۹.

اندر جاکے کروں گا۔اب مجھے طاقت مل گئی۔اور وہ مطمئن ہوگیا۔

اب حضرت آدم علیہ السلام کو فکر پڑی کہ اس کمبخت کی یہ طاقت کہ میرے اندر گھس جائے، میرے اندر تو یہ طاقت نہیں کہ اس کے اندر گھس سکوں تو یہ غالب رہے گا اور سب کو جہنمی بنا دے گا۔ مجھے بھی تو کوئی قوت دیجئے۔ (میں بھی اس کا مقابلہ کرسکوں؟) حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''آدم کو بھی ہم ایک طاقت دیتے ہیں کہ شیطان کی ہزار برس کی کارروائیاں ایک دم میں سب ملیامیٹ ہوجائیں گی۔اور وہ ایسے چت ہوگا کہ چاروں شانے لگ جائیں گے''۔کفر تک کرلو،توبہ نصیب ہو،ایک منٹ میں سارا کفر ختم ہوجائے گا۔جس نے سو برس کفر کرایا۔تم نے ایک سچی توبہ کی۔وہ سارا سو برس کا کفر ختم ہوجائے گا۔اس کی ساری کارستانیاں ختم ہوجائیں گی۔تو توبہ میں اتنی بڑی طاقت ہے کہ شیطان بھی اس سے عاجز ہے۔اس لئے آدمی توبہ نہ چھوڑے۔ذرا سی بات ہوئی فوراً توبہ کرے۔بلکہ اِستغفار کو مستقل تسبیح کے طور پر پڑھے۔کم ازکم سو دفعہ روزانہ استغفار کرے۔''أَسْتَغْفِرُ اللهَ تَعَالٰى رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ'' [1] سو دفعہ پڑھ لے۔سو گناہ نہیں کرے گا مگر سو استغفار ہوجائیں گے۔تو اس کے گناہ ختم ہوتے رہیں گے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے،صرف دس منٹ کی بات ہے۔صبح کی نماز کے بعد اگر سو دفعہ استغفار پڑھ لے۔تو کوئی محنت نہیں مشقت نہیں۔دن بھر میں آدمی سو گناہ نہیں کرتا،مگر توبائیں (توبہ کی جمع) سو ہوگئیں۔انشاءاللہ سب گناہ ختم ہوجائیں گے۔

بہرحال قلب کا رخ صحیح رکھے اِعتدال کے ساتھ چلتا رہے۔جب گناہ ہو معافی مانگ لے۔ایک نہ ایک روز منزل پر پہنچ جائے گا۔اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے۔حسنِ اخلاق نصیب فرمادے اور خاتمہ بالخیر فرمادے۔آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي، ج:٥،ص:٢٨٦.

فضیلتِ یوم الجمعہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! میں اس وقت اپنی بعض مصروفیات کے وجہ سے آپ حضرات کا زیادہ وقت نہیں لے سکوں گا۔اس کے علاوہ کچھ تعب تھکاوٹ وتکان بھی ہے۔رات تقریباً دواڑھائی گھنٹے بیان ہوا۔اس وقت بھی ایک گھنٹہ کے قریب ایک نکاح کی مجلس میں بیان ہوا۔اب کچھ بیان کرنے کی ہمت نہیں۔لیکن چونکہ اعلان ہو چکا ہے،اس کا بھی احترام ضروری ہے۔اسے واسطے تھوڑا سا وقت آپ حضرت کا لوں گا۔

سب سے پہلے سوال موضوع کا ہے کہ کس موضوع پر بیان کیا جائے اور میرے لئے یہ مستقل کام ہوتا ہے کہ کون سا موضوع منتخب کیا جائے۔اس وقت سب سے بہتر موضوع وہی ہے جس کے لئے ہم اور آپ حاضر ہوئے ہیں اور وہ ہے نماز جمعہ،جو بہترین عبادت اور بہترین قربت بھی ہے۔

ایک حدیث......اسی سلسلہ میں مجھے چند باتیں عرض کرنی ہیں اور وہ باتیں اپنی نہیں ہوں گی۔ بلکہ ایک حدیث شریف جو ذہن میں آ گئی اسی کو بیان کرنا ہے اور اس کا ترجمہ کرنا ہے۔حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے،اس شان سے کہ ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔اس آئینہ کے وسط میں ایک سیاہ نقطہ تھا،جو بالکل ممتاز تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا"اے جبرئیل! یہ سیاہ نقطہ کیسا ہے؟اور یہ آئینہ کیسا ہے؟"

میدانِ مزید......فرمایا کہ یہ سیاہ نقطہ مزید ہے۔جس کے معنی زیادتی کے آتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

① پارہ:۲۸،سورۃ الجمعۃ الآیۃ:۹.

فرمایا کہ مزید کیا ہے؟ عرض کیا یارسول اللہ! یہ جنت میں ایک میدان ہے اور جنت کے بالائی حصہ میں ہے۔ یعنی اوپر تلے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سب سے اوپر کا حصہ جو عرش کے نیچے ہے۔ اس میں ایک میدان ہے جو بالکل سفید ہے اس کی گھاس بھی سفید، درخت سفید، غرض ہر چیز سفید اور شفاف ہے۔ اور عرض کیا کہ یہ اتنا بڑا میدان ہے کہ ہزار ہا برس مجھے گھومتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ اب تک پوری طرح اس کی کنہ (اور حقیقت) کو نہیں پا سکا۔ ①

حدیث میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو اصل شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ اس شان سے کہ زمین سے لے کر آسمان تک اور مشرق سے کر مغرب تک ساری فضا ان کے بدن میں گھری ہوئی تھی۔ چھ چھ بازو تھے۔ سورج سے زیادہ روشن تاج ان کے سر پر تھا۔ اندازہ کیجئے کہ وہ میدان کتنا بڑا ہوگا جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام ہزار ہا برس سے گھوم رہے ہیں لیکن ابھی تک پورا نہیں کر سکے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میدان کی غرض و غایت کیا ہوگی؟ عرض کیا کہ دربار خداوندی منعقد ہونے کا موقع ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام کے منبر اس میدان میں بچھائے جائیں گے۔ گول دائرے کی شکل میں نور کے منبر ہوں گے۔ ہر نبی علیہ السلام کے منبر کے پیچھے امت کی کرسیاں ہوں گی۔ اور وہ پورا میدان ان بیٹھنے والوں کی کرسیوں سے بھر جائے گا۔ دنیا میں جتنا جس کو تعلق نبی اور دین سے تھا، اتنا ہی وہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگا۔ اور وہ کرسیاں اس شان سے ہوں گی کہ ایک کے دیکھنے میں دوسرا حائل نہیں ہوگا، جیسے آپ نے دیکھا ہوگا، بڑی بڑی مجالس میں کرسیاں اس ترتیب سے بچھاتے ہیں۔ اگلی صف ذرا نیچی تا کہ ہر شخص بے تکلف سامنے اسٹیج کو دیکھ سکے۔ اس انداز سے کرسیاں بچھائی جائیں گی۔ میدان کے کناروں پر کرسیاں نہیں ہوں گی۔ بلکہ کچھ غالیچے، کچھ فانوس ہوں گے۔ اس طرح سے میدان بھر جائے گا۔ اب گویا دربار بن گیا کہ چہار طرف انبیاء علیہم السلام کے منبر ہیں، ان کی پشت پر کرسیاں ہیں۔ بیچ میں حق تعالیٰ شانہٗ کی کرسی آئے گی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ ②

حدیث شریف میں اس کرسی کی عظمت و بڑائی بیان فرمائی گئی کہ ساتوں آسمان اور زمین اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک میدان میں ایک چھلہ پڑا ہوا ہوتا ہے، اتنی عظیم کرسی ہے۔ آخر جس بادشاہ کی یہ کرسی ہے اس کی بڑائی اور عظمت کے مناسب اس کی شان ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کرسی و تخت پر بیٹھتے نہیں۔ وہ جسم سے بری اور صورت سے منزہ ہیں۔ لیکن ان کی صفت "ملک" بادشاہ ہے۔ چنانچہ بادشاہت کے جتنے لوازم ہیں، وہ سب جمع کئے گئے تختِ سلطنت بھی ہے جس کا نام عرشِ عظیم ہے۔ عرش مثل قُبّہ کے ہے جو ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور ڈھانپے ہوئے ہے۔ عرش کے اوپر رحمت کی تجلی مستوی ہے۔ فرمایا گیا ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾

① تفسیر القرطبی، ج: ۲۲ ص: ۳۶۸۔ ② پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵۔

تو عرش کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے اور عرش کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ جو تعلق قائم کیا ہے، وہ رحمت کے ساتھ ہے، غضب کے ساتھ نہیں۔ غضب اگر سامنے آ جائے تو مخلوق کا پتہ بھی نہ چلے۔ رحمت ہی نے سنبھال رکھا ہے۔ تو رحمت کی تجلی عرش پر مستوی ہے۔ اس رحمت سے احکام پھوٹتے ہیں۔ ہدایت و رہنمائی، کتبِ سماوی، قوانینِ خداوندی اور قضاو قدر سب وہیں سے چلتی ہیں۔ جیسے ملک کی تمام تجاویز و احکامات تختِ سلطنت سے جاری ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرشِ عظیم سے تختِ سلطنت قائم کیا گیا۔ عرش کے نیچے عظیم سمندر ہے جس پر عرش قائم ہے۔ اس سمندر کے نیچے سو جنتیں ہیں۔ ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سو جنتوں کے نیچے پھر آسمان تہہ بتہہ ہیں اور اس کے نیچے پھر ہفت زمین تہہ بتہہ ہیں۔ یہ کائنات کا ایک (عجیب) سلسلہ ہے کہ نیچے زمین، اوپر فضا، اس کے اوپر آسمان، اس کے اوپر جنتیں، اس کے اوپر سمندر اور اس کے اوپر عرشِ عظیم۔ عرش پر پہنچ کر مخلوق کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو عرش اور جنتوں کے درمیان میں یہ میدان ہے۔ جس کی عظمت و بڑائی یہ ہے کہ اس میں دربارِ خداوندی منعقد ہوگا۔ بیچ میں کرسی حق بچھائی جائے گی۔ ①

میدانِ مزید میں اہلِ جنت کی حاضری..... تمام اہلِ جنت اس دربار میں شرکت کے لئے اپنی اپنی سواریوں پر پہنچیں گے، ان کی سواریوں کی یہ شان آئی ہے کہ بعض تخت ہوا پر سوار ہوں گے، اُڑتے ہوئے تخت ہوں گے۔ اور مختلف قسم کی سواریاں ہوں گی جن کے ذریعے اہل جنت پہنچیں گے اور ایسا وقت آئے گا کہ کل دربار منعقد ہوگا۔ تمام اہلِ جنت جمع ہوں گے۔ اور انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے منبروں پر ہوں گے۔ بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہوگی جب سارا دربار جم جائے گا تو اب بندے محسوس کریں گے کہ اب تجلّیاتِ حق کا ظہور ہو رہا ہے۔ گویا کرسی پر حق تعالیٰ کی تجلی مستوی ہے! حدیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح چرچرائے گی، جیسے بوجھ سے دب کر کوئی چیز ٹوٹنے کے قریب ہوتی ہے۔ وہ ہیبت حق کا بوجھ ہوگا، کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔ ②

حدیث میں فرمایا گیا کہ داؤد علیہ السلام کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی کہ جب وہ مناجات پڑھتے تو چرند و پرند ان کے اردگرد جمع ہو جاتے اور محو ہو جاتے۔ انسان تو بجائے خود جانوروں پر بھی ایک غنودگی کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمایا جائے گا کہ ان تمام درباریوں کو اپنے مضمون سے مستفیض کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس اعجازی خوش آوازی سے مناجات و مضامین پڑھیں گے کہ اہل جنت پر کیف طاری ہو جائے گا، جس طرح شراب طہور کا وعدہ فرمایا گیا۔

ملائکہ علیہم السلام کو فرمایا جائے گا کہ تقسیم کرو، یہ شرابِ طہور دنیا کی شراب جیسی نہیں ہوگی۔ دنیا کی شراب میں

---

① تفسير ابن كثير ج: ١ ص: ١٢٦.

② تفسير الطبرى ص: ٣٦٨.

تلخی ہوتی ہے، اس میں شیرینی ہوگی۔ دنیا کی شراب سے عقلیں جاتی رہتی ہیں۔ اس سے عقلوں میں تیزی اور معرفت وبصیرت پیدا ہوگی۔ وہ سکر اس سکر کے مشابہ ہوگا جو حضرات صوفیاء پر کثرت ذکر سے معرفت کا ایک نشہ سا طاری ہوتا ہے۔ اور ایک استغراق ہوتا ہے اس میں ان پر اَحوال وعلوم اور مواجید منکشف ہوتے ہیں۔ گویا دنیا میں جو معرفت کا سکر دیا گیا تھا، جنت میں ''شرابِ طہور'' اس کی صورتِ مثالی ہوگی۔ اسی طرح سے عقلوں پر کیف طاری ہوگا۔ روحوں میں بھی کیف بڑھے گا۔ معرفتِ خداوندی اور بصیرت بڑھتی جائے گی۔

میدانِ مزید میں اہلِ علم کی احتیاج...... اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "سَلُوْنِیْ مَاشِئْتُمْ" ① جو جس کا دل چاہے مانگے، طلب کرے۔ سب کو خطاب عام فرمایا جائے گا۔ تو سب مل کر عرض کریں گے کہ کونسی نعمت ہے جو آپ نے عطاء نہیں فرمادی۔ ہمیں ساری نعمتیں مل چکی ہیں۔ بس ہماری درخواست یہ ہے کہ اپنی رضا ہمیں عطاء فرمادیجئے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے یہ نعمت مل چکی اگر میں راضی نہ ہوتا تو تمہیں اس مقام پر گھسنے نہ دیتا۔ میں راضی ہوں اور ایسا راضی ہوں کہ ابدالآباد تک کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ مقام تمہیں مل چکا۔ کچھ اور مانگو۔ حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ کون سی نعمت ہے جو ہمیں نہیں مل گئی۔ اس وقت سب مل کر علماء کے طرف رجوع کریں گے۔ ان سے استفتاء کریں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے جو ہم مانگیں؟ ہمارے علم کے اعتبار سے تو ہر نعمت مل چکی ہے۔ گویا علم اور اہل علم کی احتیاج وہاں بھی باقی رہے گی۔ لوگ دنیا میں علماء سے مستغنی ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حاجت مندی وہاں بھی قائم رہے گی۔ وہ کسی کی ذات کی احتیاج نہیں ہوگی۔ وہ علم کی احتیاج ہوگی۔ اور ابدالآباد تک آدمی علم کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ جیسے ذات لامحدود ہے، اس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔ انسان کتنے ہی بڑے مقامات طے کرلے، پھر بھی لامتناہی مقامات رہتے ہیں جن کی طلب رہے گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قطعہ ہے جو وہ پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ جوں جوں مجھے زمانہ ادب سکھاتا ہے۔ مجھ پر میری عقل کا نقصان وارد ہوتا ہے، جو ادب کا مقام طے کیا تو سمجھ میں آیا کہ اب تک میری عقل نے یہ نہیں پایا تھا۔ اس مقام تک میری عقل ناقص ہے۔ پھر اگلا مقام طے ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اب تک میری عقل نہیں پاسکی تھی۔ اس طرح جوں جوں مقام ادب آتے رہے میری عقل کا نقصان مجھ پر واضح ہوتا رہا اور جیسے جیسے مراتبِ علم بڑھتے رہے۔ میری جہالت مجھ پر واضح ہوتی رہی۔ جب کسی علم کے مقام پر پہنچا، معلوم ہوا کہ اب تک میں اس سے جاہل تھا۔ مراتبِ علم کھل رہے ہیں تو میرے نفس کی جہالت کے مقامات بھی میرے نفس پر کھل رہے ہیں۔

لامحدود تک انسان جاہل اور محدود تک عالم ہوتا ہے، جو ہمیں معلومات ہیں وہ محدود ہیں۔ اور جو غیر معلوم چیزیں ہیں، وہ لامحدود ہیں۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ علم، انسان جتنا بھی بڑھتا جائے، چاہے وہ علم کے کروڑوں مقامات ہوں، پھر بھی ان گنت مقامات باقی رہیں گے، کیونکہ لامحدود کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لئے

① تفسیر القرطبی ج:۲۳ ص:۱۶.

میں نے عرض کیا کہ علم کی محتاجگی دنیا میں ہی نہیں، جنت میں بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ صفتِ خداوندی وہاں پہنچ کر محدود نہیں بن جائے گی۔ علم اور معرفت کے مقامات وہاں بھی لامحدود رہیں گے۔ تو لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ ساری نعمتیں مل گئیں کونسی چیز باقی ہے جو ہم مانگیں؟ علماء مل کر ایک مشورہ دیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے جو طلب کرو، وہ نہیں ملی اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ اپنا جمالِ مبارک دکھا دے۔ دیدارِ خداوندی ابھی تک باقی ہے۔ یہ نعمت ابھی تک نہیں ملی۔ قرآن مجید میں وعدہ فرمایا گیا۔ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ ① بہت سے چہرے تروتازہ اور شاداب ہوں گے، جو اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ جیسے کفار کے بارے میں دھمکی دی گئی ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ ② یہ (سیاہ چہرے والے) وہ لوگ ہیں کہ ان کے اور پروردگار کے درمیان حجابات حائل ہوں گے۔ یہ زیارت نہیں کر سکیں گے، انکے لئے ابدی محرومی ہوگی۔

تو دیدارِ خداوندی کا وعدہ دیا گیا۔ اس وعدے کا ظہور وہاں ہوگا۔ علماء مشورہ دیں گے کہ ایک نعمت رہ گئی ہے، وہ طلب کریں۔ ''اور وہ ہے دیدارِ خداوندی''۔ تو سب مل کر یک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ ہمیں یہ نعمت عطاء فرما دیجئے، اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ اسی کی تمنا میں ہم نے عبادتیں کیں۔ عمریں گزار دیں۔ مشاہدہ حق اصل مقصود تھا۔ اب اس مقام پر مشاہدہ نہ ہوا تو اور کون سا مقام ہوگا جہاں مشاہدہ حق ہوگا۔ درخواست قبول کر لی جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ صرف ایک حجابِ کبریائی اور عظمت کا باقی رہے گا۔ باقی سب حجاب اٹھ جائیں گے اور بندے اپنے خدا کو دیکھیں گے۔ اس شان سے کہ سمت ہے، نہ جہت ہے، نہ رنگ ہے اور پھر مشاہدہ ہو رہا ہے اور دیکھ رہے ہیں۔ یہ اس مزید کا موضوع ہے جس کا نام ''میدان مزید''۔ گویا درباری مقام ہے۔ یہ ایک حدیث ہے جس کا میں نے ترجمہ اور تفسیر آپ کے سامنے عرض کی۔ ③

دنیا میں ''میدان مزید'' کی مثال ...... یہ جنت میں میدانِ مزید ہے۔ اور ہفتے میں ایک بار اجتماع ہوگا۔ جب دربار ختم ہوگا تو اللہ تعالیٰ اہل جنت کو فرمائیں گے ''جاؤ اپنے اپنے مقامات پر''۔ اہل جنت واپس ہوں گے۔ جنت میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔

دنیا میں اس دربار کی مثال جمعہ کو رکھا گیا ہے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ دربارِ خداوندی ہے، جو دنیا میں منعقد ہوتا ہے۔ خطیب اور امام وہ نائب حق ہوتا ہے، جیسے کہ تجلّیاتِ ربانی کرسی پر ہوتی تھیں۔ یہاں خطیب منبر پر بیٹھتا ہے گویا وہ نمائندہ حق ہے اور خطبات کی تجلی اس میں ظہور کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ انکے بعد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اس لئے حدیث میں آپ فرماتے ہیں ''اَنَا قَائِدُهُمْ وَاَنَا خَطِيْبُهُمْ'' ④ قیامت کے دن میں ہی ساری امتوں کا قائد اور میں ہی خطیب ہوں گا۔ میں ہی ان کے سامنے خطبہ دوں گا۔ تو

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۲۲-۲۳۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ المطففین، الآیۃ: ۱۵۔

③ تفسیر الطبری، ص: ۳۶۸۔ ④ سنن الدارمی، المقدمۃ، باب ما اعطی النبی من الفضل ج: ۱ ص: ۵۷۔

انبیاء علیہم السلام اس تجلّی کے بارے میں جو خطبات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے، نمائندگانِ حق ہیں۔اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔اس دنیا میں ان کا نمائندہ امام اور خطیب ہوتا ہے۔

خطبہ جمعہ کے آداب، عام خطبات سے زیادہ ہیں...... یہی وجہ ہے کہ عام مواعظ اور خطبوں کے جو آداب ہیں۔اس خطبے کے آداب ان سے ممتاز ہیں۔فرمایا گیا: ''**اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ**'' ① خطبہ کے لئے جب امام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو، تو اب نہ سلام وکلام جائز ہے نہ نوافل پڑھنی جائز ہیں۔صرف یہ کام ہے کہ امام کو خطبہ کی حالت میں دیکھو فرمایا گیا جو کنکریوں سے کھیلنے لگا، اس نے لغو حرکت کی۔مکروہ کا ارتکاب کیا۔عام وعظوں میں اگر کوئی کنکری اٹھالے، کوئی کراہت نہیں۔لیکن خطبہ جمعہ میں اگر کنکریوں سے، یا چٹائی کے تیلوں سے کھیلنے لگے، اس پر نکیر کی گئی ہے۔خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز بھی جائز نہیں۔تلاوتِ قرآن مجید بھی جائز نہیں درود شریف جیسی طاعت بھی جائز نہیں۔خطبہ شروع ہونے کے بعد سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس وقت خطیب کو دیکھا جائے۔اس کے خطبہ پر کان لگائے جائیں، جو زیادہ سے زیادہ اس کو دیکھنے کی عادت ڈالے گا، اسے میدانِ مزید میں زیادہ سے زیادہ حق تعالیٰ کا دیدار میسر ہوگا، وہاں تجلیات حق سامنے ہوں گی۔ ②

اس لئے فرمایا گیا کہ جمعہ میں جو اذان سے پہلے اول وقت آ گیا۔صف اولیٰ میں اسے جگہ ملی۔وہ ایسا ہے۔جیسے ایک اونٹ قربانی کا ذبح کر دیا۔اس کے بعد اس سے کم درجہ ہے کہ گائے ذبح کی پھر اس سے کم درجہ ہے کہ بکرا ذبح کیا۔اس کے بعد جو آیا وہ ایسا ہے کہ اس نے مرغی ذبح کی۔جب امام خطبہ کے لئے کھڑا ہو گیا، تو ملائکہ علیہم السلام اپنے صحیفے لپیٹ کر خطبہ سننے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔پھر درجات عالی کا کوئی مقام نہیں رہتا کہ اس میں نام لکھا جائے۔ایسے میں جو آئے گا، بس اس کا فرض ادا ہو جائے گا۔اور جو یہاں صف اولی میں ہوگا وہاں بھی انبیاء علیہم السلام کے پیچھے صف اُولیٰ میں جگہ پائے گا، جو یہاں جتنا پیچھے ہو جائے گا، وہاں بھی اتنا ہی پیچھے ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر لگاتار تین جمعے چھوڑ دیئے، بلا کسی شرعی یا طبعی عذر کے، تو ظن غالب یہ ہے کہ پھر اسے عمر بھر جمعہ پڑھنے کی توفیق نہیں ہوگی۔جب تک سچی توبہ نہ کرے اور رجوع نہ کرے۔تو جمعہ کی نماز بھی بے شک فرض ہے مگر عام فرائض سے اس میں کچھ زیادہ خصوصیت ہے۔اور وہ خطبہ عام خطبوں سے بڑھ کر ایک نئی شان رکھتا ہے، جو امتیازی شان ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ ظہر کے چار فرض ہیں۔جمعہ کے دو ہوتے ہیں دو فرضوں کے قائم مقام یہ دو خطبے ہوتے ہیں جو امام کھڑے ہو کر دیتا ہے۔اسی لئے ان خطبوں کے آداب عام خطبات سے زائد ہیں کہ امام کو دیکھو، تلاوت

---

① تفسیر حقی، ج:۴، ص:۳۶۴۔امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: اس کو حضورؐ کی طرف منسوب کرنا کھلا وہم ہے یہ صرف امام زہری کا مقولہ ہے۔دیکھئے: التمر المستطاب، باب صلاۃ الجمعہ ۶۲۵۔نیز دیکھئے: نصب الرایہ فی تخریج احادیث الهدایہ، باب صلاۃ الجمعہ ج:۳ ص:۳۶۴۔ ② تفسیر ابن کثیر، ج:۱ ص:۱۲۶۔

مت کرو، عبادت بھی نہ کرو۔ بڑی عبادت یہ ہے کہ خطبہ سنو اور امام کو دیکھو۔ گویا یہ دو خطبے بمنزلہ نماز کے ہیں، تو چار رکعتیں ہو جاتی ہیں، اس شان سے کہ دو رکعتیں جمعہ کی اور دو رکعات ان خطبوں کے قائم مقام۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اس جمعہ کو دنیا میں میدان مزید کا نمونہ اتارا ہے۔ اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یَوْمُ الْمَزِیْدِ" ہے۔ اس لئے "یَوْمُ الْمَزِیْدِ" کہا گیا کہ یہ جنت کا میدان اس دنیا میں ہے۔ جنت میں جا کر میدان مزید وہاں کی شان کے مطابق ہوگا۔ تو ساری دنیا کے جمعے اور جامع مسجدیں مل کر میدان مزید کا دنیا میں ایک نقشہ ہیں۔ ان کے مجموعوں کو اٹھا کر آخرت میں لے جائیں گے اور یہ خطبے اوپر جنتوں میں پہنچائے جائیں گے۔ تو وہاں کے دربار خداوندی کا یہاں ایک نمونہ ہے۔ اسی واسطے جمعہ کو "سَیِّدُ الْاَیَّامِ" کہا گیا ہے کہ تمام دنوں کا سردار ہے۔ ①

حق تعالیٰ کا انتخاب...... حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَایَشَآءُ وَیَخْتَارُ﴾ ② تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے اپنے لئے چھانٹ لیتا ہے۔ سات آسمان بنائے، ساتویں کو پسند کیا، منتخب کرلیا، وہ مقبول زمین ہے جنتوں کی بنیاد ہے ساتویں آسمان پر جنتوں کا علاقہ ہے جو مقام کریم ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ سِدْرَةِ الْمُنْتَھٰی ③ ساتویں آسمان پر ہے، جو جبرئیل علیہ السلام کا مقام ہے اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَھٰی o عِنْدَھَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی﴾ ④ "سِدْرَةُ الْمُنْتَھٰی" کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ "سِدْرَةُ الْمُنْتَھٰی" ساتویں آسمان پر ہے۔ سدرہ کے پاس مقام جنت ہے تو جنتیوں کا علاقہ ساتویں آسمان سے شروع ہوتا ہے۔ سرکاری مہمان خانہ اسی میں بنا دیا گیا ہے۔ سات زمینیں پیدا کیں، تو اوپر کی زمین منتخب کی کہ وہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے، اور ساتویں زمین کی تہہ میں جہنم ہے، جیسے جنت سات آسمانوں سے بالاتر ہے، جہنم سات زمینوں سے نیچے ہے۔

قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا۔ آسمان توڑ دیئے جائیں گے تو جنتیں نمایاں ہو جائیں گی۔ زمینیں ختم کردی جائیں گی تو جہنم نیچے سے نمایاں ہو جائے گی ﴿وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ o وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ﴾ ⑤ جہنم دھونکا دیا جائے گا اور جنتیں سامنے کردی جائیں گی، زمینوں اور آسمانوں کے بیچ میں جو پردے حائل ہیں یہ سب توڑ پھوڑ کر برابر کردیئے جائیں گے، تو زمینوں میں اوپر کی زمین کو اپنے لئے پسند کیا اور آسمانوں میں اوپر کے آسمان کو پسند کیا۔ پیدا کئے سات اور منتخب کرلیا ایک جنتیں سات پیدا کیں اور اپنے لئے جنت الفردوس کو پسند کیا، جو

---

① السنن لابن ماجه، كتاب اقامة الصلوة والسنة فيها، باب فى فضل الجمعة، ج:٣ ص:٣٨٥. ② پارہ: ٢٠، سورة القصص، الآية: ٦٨. ③ الحديث اخرجه مسلم فى صحيحه ولفظه: وهى فى السماء السادس و اليها ينتهى مايعرج به من الارض... كتاب الايمان، باب فى ذكر سدرة المنتهى، ج: ١، ص: ٤٠٥. ④ پارہ: ٢٧، سورة النجم، الآية: ١٤، ١٥. ⑤ پارہ: ٣٠، سورة التكوير، الآية: ١٢-١٣.

انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے اور سب سے اوپر جنت ہے۔ پہاڑ اللہ نے ہزاروں بنائے طورِ سیناء کو پسند کرلیا کہ اسے اپنی تجلی گاہ بنایا۔ دنیا میں اس کے شہر ہزاروں لاکھوں ہیں مگر "بلد الأمین" کو پسند کرلیا جس میں حرم واقع ہے یعنی "مکۃ المکرمۃ" زمین کے ٹکڑے کروڑوں بنائے۔ سب سے زیادہ پسندیدہ ٹکڑا وہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں۔

ہمارے علماء لکھتے ہیں کہ وہ ٹکڑا عرش سے بھی افضل ہے اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عرش کو حق تعالیٰ سے نسبت ہے، مگر حق تعالیٰ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے پاک ہیں۔ اور وہ ٹکڑا جو قبر مبارک ہے اس کو بدنِ مبارک لگا ہوا ہے اور جس حصہ زمین کو بدنِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم چھو جائے وہ یقیناً عرش سے افضل ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ شانہٗ عرش کو چھوئے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ وہ جسم سے بری وبالا ہیں۔ صرف ایک نسبت ہے اور یہاں نسبت نہیں بلکہ اتصال وملاپ ہے تو زمین کے ٹکڑے ہزاروں بنائے یہ زمین منتخب کرلی اور یہ ٹکڑا منتخب کرلیا۔

راتیں سات بنائیں اور "لَیْلَةُ الْقَدْرِ" کو پسند کرلیا اور فرمایا کہ ﴿لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ﴾ ① لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ گویا ہزار مہینے جو شخص رات دن عبادت کرے، اس محنت سے جس مقام پر پہنچے گا، اگر لیلۃ القدر کو زندہ کیا، تو اس مقام پر ایک رات میں پہنچ سکے گا۔ تو لیلۃ القدر کو اپنے لئے پسند کرلیا۔ اسی طرح سے سات دن بنائے ان میں اپنے لئے یوم الجمعہ کو پسند کرلیا کہ ہمارے دربار کا دن ہے۔

جنت کا موسم...... جنت میں بھی اسی دن دربار ہوگا، حالانکہ جنت میں رات اور دن نہیں۔ وہاں تو یکساں ایک وقت رہے گا۔ وہاں سورج کی گردش نہیں ہے کہ رات اور دن بنیں۔ رات اور دن کا بننا۔ کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں، کبھی رات اور کبھی دن، یہ گردشِ آفتاب کے آثار ہیں۔

حدیث میں ہے جنت میں عرش کا چاندنا ہوگا۔ عرش کی نورانیت یکساں پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس نورانیت کی تمثیل اور تشریح دی گئی ہے کہ گرمی کے زمانہ میں صبح صادق کے بعد سورج نکلنے سے پہلے جب ٹھنڈی روشنی اور دودھ سا چاندنا ہوتا ہے، جنت میں روشنی کی یہ نوعیت نہ ہوگی کہ آدمی دھوپ میں نہ بیٹھ سکے۔ روشنی بھی ہے، ٹھنڈی بھی ہے، بردوسلام بھی ہے مگر تیزی نہیں ہے، وہ خوشگوار ہے، نگاہوں کو بھانے والی اور یکساں رہے گی، وہاں نہ رات ہے نہ دن ہے، نہ سونا ہے، بلکہ جاگنا ہی جاگنا ہے۔ اس لئے کہ سوجانا تھکن اور غفلت کی علامت ہے۔ وہاں تعب و تکان نہیں کہ آدمی پڑ کے سوجائے۔ وہاں تو رات دن کا عیش ہے اور رات دن کی بادشاہت ہے اس لئے نہ رات ہے نہ دن نہ تعب اور نہ تو رات رکھی جاتی کہ آرام سے سوجاتے۔ جب تکان نہیں تو رات کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یکساں دن رہے گا۔

سَیِّدُ الْاَیَّامِ...... پھر یہ جو فرمایا گیا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ دربارِ خداوندی منعقد ہوگا۔ یعنی جنتی تمہارے یہاں

① پارہ: ۳۰ سورۃ القدر، الآیۃ: ۳۔

ایک ہفتہ کی مسافت و مدت ہوتی ہے اتنی مدت کا حساب لگالو۔ اتنے اتنے وقفے کے بعد دربار خداوندی منعقد ہوگا۔ وہ ہفتے میں ایک بار سمجھ لیجئے اس لمحے کا نام مزید رکھا گیا ہے۔ دنیا میں ساتویں دن کا نام "یَوْمٌ مَّزِیْدٌ" رکھ دیا، جو دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ اس لئے اس کو "سَیِّدُ الْاَیَّامِ" فرمادیا گیا کہ یہ سب سے پاکیزہ، سب سے بڑا اور بہترین دن ہے۔ جتنے بھی عظیم واعظم امور ہیں وہ اسی دن میں ظاہر ہوئے فرمایا گیا "فِیْهِ جُمِعَ طِیْنُ اٰدَمَ"

"جُمُعَۃٌ" اس کا مادہ (ج، م، ع) ہے۔ جامعیت کی شان جمعہ میں موجود ہے۔ منتشر چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دینا، بکھری ہوئی چیزوں کو ملا دینا یہ جمعہ کا مادہ ہے، جتنی بھی بڑی بڑی چیزیں منتشر تھیں، وہ اس دن میں جمع کی گئیں، آدم علیہ السلام کی مٹی جو پوری زمین سے لی گئی، وہ جمعہ کے دن ہی جمع کی گئی اور ان کا پتلا بنایا گیا۔

حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام جس دن جنت میں داخل کئے گئے، وہ جمعہ کا دن تھا۔ جنت سے زمین پر لائے گئے، وہ بھی جمعہ کا دن تھا صحف آدم علیہ السلام آسمانوں سے اتارے گئے، وہ دن بھی جمعہ کا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں تفسیر بتلائی گئی اور حدیث میں زیادہ شرح ہے کہ چھ دن میں اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تیار کیا اور اس کے چھ دن تمہارے چھ ہزار سال کے برابر ہیں۔ ﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (1)

تو چھ ہزار سال میں کائنات تیار ہوئی۔ گویا اتوار سے بنی شروع ہوئی اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ اس میں زمین بچھائی گئی، پھر آسمان بنائے گئے، پھر زمین میں قوتیں رکھی گئیں، پھر جمادات و نباتات پیدا کئے گئے، پھر آسمانوں میں ستارے پیدا کئے گئے، اس کی تفصیلات آئی ہیں۔ جب ساری کائنات بن کر تیار ہوگئی، تو جمعہ کی آخری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا یہ زمین کا فرش بچھایا گیا، آسمان کا خیمہ تانا گیا، چاند ستاروں کے انڈے لٹکائے گئے۔ دریا جاری کئے گئے، غذائیں جمع کی گئیں۔ یہ کس کے لئے تھیں؟ "وَاِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ" (2)

ساری دنیا انسان کے لئے بنائی گئی، انسان معبود کے لئے بنایا گیا۔ آپ جب کسی کو مہمان بلاتے ہیں تو پہلے آپ کوٹھی منتخب کرتے ہیں، وہاں مہمانداری کا سامان کرتے ہیں، کھانے کا، پینے کا، رہائش کا، جب سب کچھ مہیا ہوتا ہے تب کہتے ہیں کہ تشریف لایئے، تو مہمان آتا ہے۔ ساری چیزیں اس کے استعمال میں آتی ہیں۔ تو آدم علیہ السلام ساری دنیا کے مہمان ہیں، ان کو لانے سے پہلے ساری دنیا مکمل کر دی گئی۔ زمین کو فرش بنا دیا گیا، آسمان کو چھت بنا دیا گیا، سورج اور چاند کے چراغ لٹکائے گئے تاکہ روشنی ہو اور پھر عجیب طریقے سے زمین کو گودام بنا دیا، اس میں سے غذائیں نکل رہی ہیں، زمین کو واٹرورکس بنا دیا، جس میں سے پانی نکل رہا ہے۔ ایک صندوق

---

(1) پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۷. (2) شعب الایمان للبیهقی، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس فی جواب التشمیت ج: ۲۲ ص: ۶ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں یہ روایت منقطع ہے۔ دیکھئے تخریج احادیث الاحیاء، ج: ۷، ص: ۲۶۲.

بنادیا، جس میں سے لباس بھی نکلتے چلے آرہے ہیں۔ تو زمین ساری ضروریات کا ذخیرہ ہے حتی کہ زندگی کا بھی اور موت کا بھی۔ اس سے آدمی پیدا ہوتا ہے اس میں کھپ جاتا ہے۔ ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾ ①

''جمعہ'' میں شانِ جامعیت...... تو زمین ہماری قرار گاہ بھی ہے، ہماری موت گاہ بھی ہے، ہماری دنیا بھی ہے ہمارا برزخ بھی ہے۔ ساری چیزیں جمع کر دیں گئیں۔ اس کے بعد آخر میں آدم علیہ السلام لائے گئے تو جمعہ کا دن تھا۔ آخری ساعت تھی جس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ جمعہ کے دن میں ایک ساعت ہے وہ اگر کسی پر گزر جائے تو اس میں جو دعا مانگتا ہے یقیناً قبول ہوتی ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ یہی وہ ساعت ہے جس میں آدم علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آئی تو جتنے بڑے بڑے امور ہیں، سب اسی دن واقع ہوئے ہیں۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش، آدم علیہ السلام کی مٹی کا جمع کرنا' آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارنا۔ تو اس دن کو آدمی سے کوئی خاص مناسبت ہے اور ایام بھی انسانوں کے لئے ہیں۔ مگر جمعہ کے دن ولادت، موت و حیات و جمعیت اور جنت سے نزول ہوا۔ دنیا میں آئے تو صورۃً نُزول ہوا، حقیقۃً عروج ہوا۔ اس لئے کہ دنیا میں نہ آتے تو خلافت نہ پاتے، ظاہر میں تو نیچے اتارے گئے اور حقیقت میں اس عمل گاہ کے ذریعے سے جب انسان نے عمل کرنے شروع کئے تو بڑے بڑے مراتب اور درجات بلند ہوئے۔ تو معنوی طور پر انسان بلند ہوا۔ ظاہری طور پر اسے نیچے اتارا گیا۔ تو وہاں کھلا ہوا حسی ورود تھا، یہاں حسی نزول اور معنوی خلافت کا تاج رکھا گیا۔ انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے علمائے ربانی پیدا ہوئے۔ ہر ایک کے جو ہر ظاہر ہوئے تو دنیا مظہرِ کمالات ہے۔ دنیا نہ ہوتی تو کمالات کا ظہور نہ ہوتا۔ اگر یہ ساری اولاد جنت میں پیدا ہوتی تو بادشاہوں کی طرح بسر کرتی۔ رات دن کھانے پینے اور عیش اڑانے میں لگے رہتے۔ لیکن دنیا میں لاکر مصائب میں مبتلا کیا گیا۔ تاکہ ان مصائب کے توڑ اور دفعیہ کے لئے انسان کے اندر جو ہر نمایاں ہوں۔ مصیبت رکھی گئی تاکہ دفاع کی طاقتیں کام میں آئیں۔ اقوام کو اقوام کے مقابلہ پر ڈالا گیا، تاکہ شجاعتوں کا ظہور ہو، صبر و تحمل کا ظہور ہو۔ جنت میں نہ جنگ ہوتی نہ لڑائی ہوتی، نہ دفعیہ کی تدبیریں سوجھتیں، نہ صبر و تحمل کام آتا۔ انسان کے بہت سے جوہر چھپے ہوئے رہ جاتے۔ دنیا کو ان کے لئے ظہور گاہ بنایا گیا۔ تو آدم علیہ السلام ظاہراً تو جنت سے نیچے اتارے گئے جو نزول ہوا، حقیقت میں عروج ہوا کہ جب تک دنیا میں نہ آئیں کمالات کا ظہور نہیں ہوسکتا۔ قیامت بھی قائم ہوگی تو جمعہ کے دن ہوگی۔ جس میں اولین و آخرین جمع کئے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن میں جامعیت کا مادہ موجود ہے۔ آدم علیہ السلام کی بکھری ہوئی مٹی یوم جمعہ میں جمع کی گئی۔ جو کمالات چھپے ہوئے تھے، وہ جمع ہو کر جمعہ کے دن نمایاں ہوئے۔ قیامت ہوگی تو کروڑوں اربوں انسان زمینوں میں چھپے پڑے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۵.

جمع ہوں گے، جمعہ کا دن انہیں جمع کر دے گا۔ غرض اس میں جامعیت کی شان ہے۔

تو دنیا میں جمعہ لایا گیا تا کہ انسان جیسے اس کی تکوینی طور پر چیزیں جمع ہوئی ہیں، اپنے ارادے سے جمعیت کی شان اپنے اندر پیدا کرے۔ یعنی جمع ہونا سیکھیں قلوب کی یکسانی سیکھیں، قلوب کا میل ملاپ اور اتحاد سیکھیں۔ اختلاف سے بچیں گروہ بندیوں سے بچیں اس کے لئے جمعہ کو نمونہ بنادیا گیا۔ کہ شکلیں مختلف، عقلیں مختلف، رنگ مختلف، مگر سب آ کر جمعہ کے اندر جمع ہوتے ہیں۔ دیہات کے قصبوں کے لوگ اور محلوں کے بھی ایک جگہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ باوجود اختلاف مزاج کے پھر ان میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جمعہ ہی کی برکت ہے۔ جب ہفتہ میں ایک دن جمع ہونا سیکھ لیا تو بقیہ ایام میں بھی ان کے لئے جمع ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ ان میں اجتماع کی خو پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر انسان اس وقت جہنم میں ہے، اس سے نکلنے کی تدبیر ...... جمعہ کا دن اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے کہ باہمی میل ملاپ اور محبت پیدا ہو، باہمی یگانگت پیدا ہو۔ تمہارے اندر اتحاد باہمی ہو۔ مگر اس کے ذریعہ کیا ہے؟ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (1) امام خطبہ دیتا ہے، وہ قرآن پڑھتا ہے۔ نماز میں بھی قرآن پڑھا جاتا ہے، وہ اللہ کی رسی ہے جس کو پکڑنے کے بعد آدمی اوپر پہنچے گا۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن اللہ کی رسی ہے۔ جو آسمان سے لے کر زمین تک لٹکا دی گئی، جس نے مجھ تک آنا ہو، اسی رسی کو مضبوط تھام لے، جب ہم رسی کھینچیں گے، جو اس میں لٹک جائے گا وہ لٹک کر ہم تک پہنچ جائے گا۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ آسمان سے نیچے کی جگہ سارا علاقہ جس میں ساتوں زمینیں شامل ہیں۔ یہ سب جہنم کا علاقہ ہے۔ قیامت کے دن اسی میں جہنم تپے گی۔ اسی میں آگ، اسی میں سانپ اور بچھو اور اسی میں وہ سارے عذابات ہوں گے۔ تو ہم اور آپ گویا اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔ قرآن کی رسی ٹانگ دی گئی جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہو، وہ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے، جو نہیں پکڑے گا، اسے جہنم میں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود بخود جہنم کے اندر موجود ہے۔ اس سے نکلنے کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ اللہ کی رسی ہے۔ وہ رسی ٹوٹ نہیں سکتی۔ البتہ اگر کوئی مضبوط نہ پکڑے تو چھوٹ سکتی ہے۔ تو پوری قوت کے ساتھ اس کو مضبوط تھام لیا جائے۔ اس روز بھی قرآن پورے شہر کے آگے پڑھا جاتا ہے۔ تا کہ لوگ پیغام خداوندی سن کر اس سے وابستہ ہوں اور اپنے اندر اجتماعی شان پیدا کریں۔

جُمعہ یومِ اِمتحان ...... جمعہ کا دن گویا عبرت و موعظت بھی ہے اور ایک امتحان بھی ہے۔ یہ امتِ مرحوم جمعہ کی وجہ سے امتحان میں کامیاب ہوئی، امتحان میں کامیابی کی فضیلت اس کو حاصل ہوئی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ نے اقوام کا امتحان لیا۔ یہود سے کہا کہ تم عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو، جو ہمارے علم

(1) پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔

میں متعین ہے۔انہوں نے ''یَـوْمُ السَّبْـتِ '' مقرر کیا۔شنبہ کا دن کہ ہفتہ کے دن بجز طاعت وعبادت کوئی کام مت کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہود سے فرمایا،اے یہود!''یَـوْمُ السَّبْـتِ '' کا احترام کرو۔جب دعوے کرتے ہو کہ وہ مقدس دن ہے تو اس کی تقدیس کرو۔

نصاریٰ سے کہا گیا کہ تم بھی ایک دن طے کرو، جو ہمارے علم میں طے شدہ ہے۔دیکھتے ہیں تم پہنچتے ہو یا نہیں؟۔نصاریٰ نے اتوار کا دن عبادت کے لئے تجویز کیا۔اسی میں ان کے لئے عبادت فرض کر دی گئی۔

مسلمانوں سے کہا گیا تم بھی ایک دن منتخب کرلو۔تو ہمارے پیغمبر(فِـدَاهُ رُوْحِـیْ وَاَبِـیْ وَاُمِّیْ)صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا دن منتخب فرمایا۔فرمایا یہی ہمارے علم میں طے شدہ تھا۔تو اس وقت کو وحیِ خداوندی سے مناسبت دی گئی۔اب پوری امت اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے، جو اللہ کے علم میں طے تھا، وہی طے پا گیا۔

حق فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ گھومتا ہے...... جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی کہ پچھلی امتوں میں کچھ محدث ہوتے تھے جن سے حق تعالیٰ کلام فرماتا۔میری امت میں وہ حضرت عمر ہیں۔فرمایا گیا کہ جدھر عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں حق بھی ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے۔یہ نہیں کہ جدھر حق گھومتا ہے عمر رضی اللہ عنہ گھومتے ہیں۔گویا اس درجہ فاروقِ اعظم سراپا صدق اور حق بن چکے ہیں کہ جدھر وہ گھومتے ہیں حق بھی ادھر گھوم جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بارہ، تیرہ [illegible]ں میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، وہی آسمان سے وحی اتری۔اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیًّا لَکَانَ عُمَرَ''①

اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی اور میرے بعد کوئی نبی آتا، تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔لیکن چونکہ دنیا میں نبوت باقی نہیں،اسی واسطے کوئی نبی نہیں ہوگا۔مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں صلاحیت ہے کہ اگر دنیا میں نبی آنے والا ہوتا تو وہ نبی بنائے جاتے۔یعنی ان کے ذوق کو ذوقِ نبوت سے مناسبت تھی، وحی سے مناسبت تھی۔رائے وہ قائم کرتے تھے جس پر وحی آنے والی ہوتی تھی۔وحی ان کے معاون بن کر اترتی تھی۔مخالف بن کر نہیں اتری تھی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں سے یہ عظیم فضیلت ہے کہ ان کے ذوق کو وحیِ خداوندی سے کامل مناسبت تھی۔

مجموعہ امّت میں ذُوقِ نبوت...... مجموعی طور پر یہ امت مل کر اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔تو مجموعہ امت میں بھی نبوت کا ایک خاص ذوق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کی قائم مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعتِ اصلیہ لے کر آئے امت نے اجتہاد سے وہ مسائل قرآن وحدیث سے نکالے،اور لا (LAW) اور قانون کی شکل میں پیش کئے۔پہلے وہ مسائل نہیں تھے اس امت کے مجتہدین کے علم میں آئے تو انہوں نے قرآن سے نکال کر پوری شریعت کو گلدستہ بنا کر پیش کر دیا۔اگر پیغمبر پر وحی اتری تھی تو اس امت کے مجتہدین پر الہامِ ربانی منکشف ہوا۔وہ اصلی شریعت لے کر آئے۔انہوں نے اس شریعت میں سے شریعت وضع کی، گویا پیغمبر کے قائم مقام

① السنن للترمذی،ابواب المناقب،باب مناقب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ،ج:۱۲،ص:۱۴۶.

ہو گئے، کہ جیسے پیغمبر شرائع لائے تھے، اس امت کے مجتہدین بھی شرائع لے کر آئے اور شریعتیں پیش کیں، مگر وہ شریعتیں اصل شریعت میں سے نقل تھی۔ اس لئے علماء لکھتے ہیں کہ ''اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَامُثْبِتٌ''۔

مجتہد جو قیاس کر کے اجتہاد کرتا ہے تو قیاس کسی مسئلہ کو ثابت نہیں کرتا بلکہ ظاہر کر دیتا ہے۔ مسئلہ شریعت میں پہلے ہی ثابت شدہ ہے۔ مجتہد کا اجتہاد اسے شریعت کے اندر سے نکال کر لاتا ہے۔ ہم میں اور آپ میں وہ فہم نہیں کہ ہم نکال لیں، مجتہدین کو وہ فہم دیا گیا کہ وہ نکال کر پیش کر دیتے ہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کنواں ہے اس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ڈول رسی جس کے ہاتھ میں ہے پانی وہی نکالے گا۔ گویا مجتہد کا اجتہاد بمنزلہ ڈول رسی کے ہے کہ وہ قوت سے کھینچتا ہے اور پانی کو نالیوں میں، نہروں میں اور جنگلوں میں بہا دیتا ہے جس سے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔

امّتِ محمدیہ کی مثال...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری لائی ہوئی شریعت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے شدید قسم کی بارش اتری اور موسلا دھار پانی زمین پر برسنا شروع ہوا۔ پانی آ کر پڑا تو زمین کے تین حصے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا نہایت پاکیزہ نہایت عمدہ تھا، اس نے پانی کو جذب کیا۔ اور جذب کر کے طرح طرح کے پھل اور پھول چمن اور رنگ رنگ کے باغ لگائے اور دنیا کو بہار بنا دیا۔ ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ کچھ اگا تو نہیں سکا، مگر اس نے بارش کے پانی کو جمع کر لیا۔ بڑے تالاب بھر دیئے کہ لوگ اس سے پانی لے جاتے ہیں، سیراب بھی ہوتے ہیں، تو وہ زمین اگر پھل پھول نہ نکال سکی، تو اس نے پانی جمع کر لیا۔

اب تیسرا ٹکڑا ایسا تھا کہ وہ چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو جذب کر سکا نہ جمع کر سکا۔ پانی آیا اور بہہ کر ادھر ادھر نکل گیا اور وہ خالی رہ گیا۔ فرمایا اس طرح سے وحی کا پانی اترا، تو قلوب کی دنیا تین حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک وہ قلوب جنہوں نے وحی الٰہی اور علمِ ربانی کے پانی کو جذب کیا، یہ طبقہ فقہاء اور علماء ربانی کا تھا۔ دوسرے وہ قلوب جنہوں نے جذب تو نہ کیا مگر پانی جمع کر لیا، یہ طبقہ حفاظ اور محدثین کا تھا۔ تیسرے وہ قلوب جن پر کوئی اثر نہیں ہوا اور یہ طبقہ کفار کا ہے۔

علمائے امتِ محمدیہ کی خدمات...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصل شریعت لے کر آئے اور اس امت کے مجددین و مجتہدین نے اس شریعت میں سے مسائل استنباطیہ نکالے۔ ان پر وحی تو نہیں آتی تھی۔ مگر ان کے قلوب پر الہام ہوتا تھا۔ انبیاء علیہ السلام کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر ہوئے، ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا۔ گو حدیث ضعیف ہے مگر علماء اس حدیث سے جگہ جگہ استدلال کرتے رہتے ہیں کہ میری امت کے علماء ایسے ہوں گے جیسے بنی اسرائیل کے پیغمبر۔ ① یعنی پیغمبر تو نہیں ہوں گے، مگر کام وہ کریں گے جو پیغمبروں نے کیا۔ ان کے کام کی نوعیت وہ ہوگی جو انبیاء علیہ السلام

① اس کی کوئی اصل نہیں۔ یہ حدیث نہیں ہے۔ دیکھئے المقاصد الحسنة ص: ۷۰۲۔

کے کام کی تھی، جیسے ایک نبی جس خطے میں آتا ہے تو اس خطے کو ایمان سے رنگ دیتا ہے اور لوگ مؤمن بنتے چلے جاتے ہیں۔ عالم و عارف بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس امت کے علماء ربانی اور مجتہدین وہ ہیں کہ ایک عالم ربانی جہاں بیٹھ گیا، ہزاروں کے ایمان کو سنبھال گیا۔ ہزاروں کو ایمان سے رنگ دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں پورا ہندوستان تو کیا، پاکستان (بنگلہ دیش) افغانستان اور پورا ترکستان حنفی۔ ایک عالم ربانی، ایک مجتہد اٹھا، کروڑوں کے ایمان کو درست کیا۔ کروڑوں کو جنت تک پہنچا دیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مکہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی عمر مکہ میں گذاری آخیر عمر مصر میں اور وہں میں وفات پائی تو حجاز تقریباً سب کا سب شافعی ہے۔ ایک عالم ربانی اترا، اس نے ملکوں کو ایمان سے رنگ دیا اور لاکھوں متبع شریعت پیدا کیے۔ جتنے حنابلہ ہیں وہ کثرت سے ادھر ہیں، مغربی ممالک میں زیادہ مالکیہ ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور ادھر ہوا اور علماء پیدا ہوئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ عبداللہ بن مبارک، امام نووی، امام اسحٰق رحمہم اللہ علیہم یہ سب وہ ہیں جو صاحبِ مذہب تھے، اب یہ الگ چیز ہے کہ یہ مذاہب ختم ہو گئے۔ ان چار مذاہب کو قبولِ عام ہو گیا۔ یہ کوئی ارادی اور اختیاری چیز نہیں ہے۔ یہ منجانب اللہ ہے جیسے صوفیاء کرام کے سلاسل تو بہت سے ہیں لیکن قبولِ عام زیادہ تر چار سلسلوں کو ہوا۔ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ نقشبندیہ تو یہ قبولیت منجانب اللہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس امت میں ہزاروں آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جن کی روشنی سے دنیا مستفید ہوئی جہاں ایک بیٹھ گیا، کروڑوں کے ایمان درست ہو گئے۔

آفتابِ عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے علماء، انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ہوں گے، یعنی پہلی امت میں جو کام نبی علیہ السلام سے چلتا تھا۔ اس امت میں ختم نبوت کے طفیل وہ کام مجددین اور علماء سے چلے گا۔ گویا ایک ہی نبوت اتنی قوی ہوگی کہ اور نبوتوں کی قوت باقی نہیں رہے گی۔ جیسے مثلاً رات ہو جائے، تو آسمانوں پر ہزاروں ستارے طلوع کرتے ہیں۔ اربوں کھربوں ستارے۔ جدھر دیکھو ستارے۔ کروڑوں ستارے روشنی دار جمع ہیں مگر رات کا دن نہیں بنتا۔ ہے رات کی رات، یعنی تاریکی کلیتہً زائل نہیں ہوتی، ٹیوب لائٹوں کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ رات سے دن ہو جائے۔ لیکن جونہی آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد ہوتی ہے ابھی پو پھٹی ہے۔

آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ صبح صادق نے خبر دی کہ آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم جو روشنی کا بادشاہ ہے، آ رہا ہے۔ آمد کی خبر تھی کہ ستارے بھی غائب، رات بھی غائب اور دن نمودار ہونا شروع ہو گیا اور جب سورج آتا ہے۔ تو سارے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں یہ نہیں کہ ستاروں کا نور چھن گیا بلکہ اتنا ماند پڑ گیا کہ مدھم ہو جاتا ہے کیونکہ سورج کے نور میں کوئی امتیازی طور دکھلائی نہیں دیتا اگر آفتاب یوں کہے کہ میرے بعد کوئی ستارہ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خاتم الانوار ہوں۔ نور کا خزانہ ہوں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی حاجت باقی نہیں۔ سارا دن گزر جائے گا، میری روشنی کام دیتی رہے گی۔ میدانوں میں میری دھوپ پڑے گی۔ اس سے کام

لے اگر کوئی میدان میں نہ آسکے، تو گھر کے دروازے کھول دے۔ اس میں بھی چاندنی پہنچ جائے گی اور اگر کوئی تہہ خانے میں بیٹھا ہوا ہے تو کم از کم کچھ دمک چمک ہی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے بھی کام کر سکتا ہے۔ تاریک سے تاریک کوٹھڑی میں میری روشنی پہنچے گی۔ دن میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی آنکھوں کا نین سکھ ہی بن جائے کہ دن میں بھی بجلیاں جلائے اس کا تو کوئی علاج نہیں، ورنہ سورج نے ہر روشنی سے مستغنی کر دیا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں۔ یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام طلوع ہوئے۔ ایک ایک وقت میں ہزاروں نبی تھے۔ نبی اسرائیل میں چار چار ہزار نبی ایک وقت میں آئے۔ تو آسمانِ نبوت پر آدم علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ نوح علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام آئے۔ موسیٰ وعیسیٰ (علے نبینا وعلیہم والسلام) آئے مگر رہی رات، دن نہیں نکلا۔ جونہی آفتاب نبوت کی بشارت دی گئی۔ پو پھٹی اور صبح صادق ہوئی، یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے پانچ سو برس پہلے آکر کہا۔ ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾ ① میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے۔ ان کا نام نامی احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔

صبح صادق کا نمایاں ہونا تھا کہ قلوب میں جگمگاہٹ شروع ہوگئی۔ اسی جاہلیت کے دور میں دل توحید و رسالت کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے۔ جہالتیں رفع ہونا شروع ہوئیں۔ اور جب فاران کی چوٹیوں سے آفتاب طلوع ہو گیا تو جس دل میں ذرا سی بھی استعداد تھی، اس میں نور داخل ہوا اور روشنی آنی شروع ہوئی۔ قیامت تک یہ دن لمبا دن ہے، جو ہزاروں برس کا ہوگا۔ جیسے کہ اب بارہ گھنٹے کا دن ہوتا ہے تو صبح صادق تو گھنٹے سوا گھنٹے کی ہوتی ہے۔ جتنا بڑا دن اتنی بڑی صبح صادق۔ یہ دن چونکہ ہزاروں برس کا تھا، تو اس کی صبح بھی پانچ سو برس کی ہوئی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک تک۔ اس کے بعد قیامت تک دن ہوگا۔ اگلی صبح قیامت کا دن ہوگا۔ تو قیامت کی صبح تک اب آفتاب عالم تاب کی روشنی کافی ہے، کسی اور ستارے کی ضرورت نہیں۔ یہی ایک ستارہ (آفتاب) پورے عالم کو نور پہنچائے گا اور پہنچا رہا ہے۔

مختلف صورتوں میں ایک ہی نور...... اس کی روشنیوں کے ظہور مختلف ہیں۔ مجددین میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ علماء ربانی میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ صوفیائے کرام میں اسی کی روشنی کا ظہور ہے۔ کسی نے عالم باطن کھولا، کسی نے عالم ظاہر کھولا۔ کسی نے مسائل شرعیہ پیش کئے۔ کسی نے مسائل باطنیہ پیش کئے۔ کسی نے نفس کی الجھنیں دور کیں۔ کسی نے مکائد نفس پر روشنی ڈالی۔ کسی نے فضائل اخلاق پیش کئے اور رذائل اخلاق کو دھکا دیا۔ ایک ہی نور ہے، جو مختلف صورتوں سے کام کر رہا ہے اور یہ پوری امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔

① پارہ ۲۸ سورۃ الصف، الآیۃ: ٦.

امتِ محمدیہ سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا...... فرمایا دیا گیا: ”لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلٰلَةِ.“ ① میری پوری امت مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ فرقے، گروہ بندیاں ہوں گی۔ مگر ایک فرقہ ناجیہ ضرور ملے گا، وہ وہی کرے گا جو میں کررہا ہوں، وہی کہتا رہے گا جو میں کہہ رہا ہوں، وہی باتیں پیش کرے گا جو میں کررہا ہوں فرمایا: اس امت میں ہر صدی پر ایک نہ ایک مجدد آتا رہے گا۔ جماعت کی شکل میں ہو یا فرد کی شکل میں، مختلف خطوں میں مختلف مجدد ہوں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ امت کیسے ضائع ہوسکتی ہے جس کے اول میں تو میں ہوں اور آخر میں مسیح علیہ السلام آسمان سے نزول کریں گے اور بیچ میں حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے۔ ② وہ امت کیسے ضائع ہوگی؟ جس میں اتنے بڑے بڑے مجدد پیدا ہوں گے۔ تو صدی پر وعدہ کیا، مجموعہ امت پر (عدم گمراہی کا) وعدہ کیا۔

پھر صدی کے اندر ہر دن کے لئے بھی وعدہ ہے، فرمایا اس امت میں ہمیشہ سلف سے خلف علم حاصل کرتے رہیں گے، جو اَخلافِ رشید ہوں گے۔ وہ اسلاف سے علوم لیتے رہیں گے۔ اور اس علم کے ذریعے غُلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ ان کے غلو کو کھول کر رکھ دیں گے۔ اور کم عقلوں اور جاہلوں کی تاویلات کا پردہ چاک کرکے قرآن وحدیث کا اصل روپ پیش کردیں گے۔ جس سے روز بروز دین نکھرتا رہے گا۔ تو مجموعی طور پر امت حق پر مجتمع ہے۔ ہر صدی پر مجدد آئیں گے صدی کے اندر علماء پیدا ہوں گے، امت ضائع نہیں ہوگی۔ تو پوری امت مجموعی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے اور جتنے کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں وہ اس امت میں بٹے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوتِ آیات کی، تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہوگیا، جو تلاوت کررہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیمات کتاب کیں، تو علماء اور فقہاء کا طبقہ کھڑا ہوگیا۔ جس نے کتاب کی تعلیم شروع کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم حکمت دی، اسوہ حسنہ پیش کیا، تو صوفیاء کا طبقہ کھڑا ہوگیا، جس نے وہی کردار اور کریکٹر بنا کر دکھلا دیا اور لوگوں کو اس پر چلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تزکیہ نفس کیا۔ تو صوفیا نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ریاضت ومجاہدے کے اصول مرتب کئے اور امت کی تربیت کی۔ ③

جو فرائض پیغمبر کے تھے، وہ ”بجنسہٖ“ آج بھی باقی ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ علماء میں بہت سی خطائیں ہوں، بہت غلطیاں بھی ہوں، بہرحال وہ معصوم تو نہیں، لیکن حق منقطع ہوجائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان کے بیان کردہ مسائل پر چلیں ان کے ذاتی کردار سے قطع نظر کریں اگر کوئی برائی ہے تو ذات کے لئے چھوڑ دیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کا زریں مقولہ...... حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، ج: ١١ ص: ٤٤٢.

② جامع الاصول من احاديث الرسول، فضل المؤمنين والمسلمين ج: ٩ ص: ٦٧٧٢.

③ الابانة الكبرىٰ لابن بطة، ج: ١ ص: ٣٧.

سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی آدمی ایسا نہیں جس میں صرف خیر ہی خیر ہو اور کوئی ایسا نہیں جس میں شر ہی شر ہو۔ خیر بھی ہے شر بھی ہے بھلائی بھی ہے برائی بھی ہے۔ نیکی بھی ہے بدی بھی ہے۔ دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر ایک نیکی سے فائدہ اٹھائے اور اس کی بدی اس کے لئے چھوڑ دے۔ کہ تو جانے اور تیرا خدا جانے۔ تو پوری امت فرشتہ دکھائی دے گی۔ یوں معلوم ہوگا کہ سب خیر ہی خیر ہے۔ آج ہم ہر شخص کے شر کو لیتے ہیں اور خیر کو دھکا دے دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری امت میں شر پھیلی ہوئی ہے، وہ ساری خیر ماند پڑ گئی۔ تو دانشمندی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اس میں شر ہے وہ خدا کے حوالہ کرو۔ تم سے اس کے شر کا سوال نہیں ہوگا، اسی سے سوال ہوگا وہ نمٹے گا۔ تم اس کی خیر کو اپناؤ۔ (ہو سکے تو اس کے لئے دعا ہی کر دو)۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی صفات ہیں کہ ان کا چلنا پھرنا کہنا سننا، سب حجت ہے۔ ہر گناہ، ہر برائی سے معصوم ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بعد اور کوئی معصوم نہیں، اولیاء اللہ محفوظ ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود محفوظیت کے امکان ہوتا ہے کہ غلطی سرزد ہو جائے اور ہوتی رہتی ہے۔ تو آپ کا یہ کام نہیں ہے کہ آپ ان کی کمزوریوں پر نظر کریں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جو علم ان کے اندر سے نکل رہا ہے، وراثت کے طور پر اس کو اختیار کریں اور ان کی برائی کو ان پر چھوڑ دیں، یا اگر خیر خواہی کا جذبہ ہو تو آپ تنہائی میں ادب سے کہیں کہ یہ غلطی ہے آپ اسے چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے ممنون ہوں گے۔

حسنِ ظن اختیار کرنے کی ضرورت...... لیکن ہر شخص کی برائیوں کو اچھالنا، اس سے پوری قوم کو رسوا کر دینا ہے۔ فرمایا گیا: "ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا۔" مؤمنوں کے ساتھ حسن ظن اختیار کرو۔ حسن ظن کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ بدظنی کے لئے جب تک کوئی دلیل نہیں ہوگی، بدظنی کی اجازت نہیں۔ یہ فرض ہے کہ ہر شخص حسن ظن رکھے۔ جب ایسے دلائل ہی مہیا ہو جائیں کہ برائی پیدا ہوگئی تو بے شک بدظنی قائم کرے۔

اب اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ اسے اچھالتے پھریں، نصیحت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اور فرمایا "اے اللہ! میں مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں کہ اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ میری ہر نقل و حرکت کی رقیب بنی رہیں، اگر بدی سامنے آئے اسے اچھال دیا، نیکی سامنے آئی اسے دفن کر دیا۔ ایسے مکار دوستوں سے میں پناہ مانگتا ہوں"۔ ہمیں اور آپ کو ایسا دوست نہیں بننا چاہئے۔ بلکہ کسی کی نیکی سامنے آئے تو اسے اچھال دو۔ بدی سامنے آئے تاویل کر دو۔ پیار و محبت سے سمجھا دو، نصیحت کرو۔ نہیں مانتا تو خدا کے حوالے کرو۔ وہ جانے اس کا خدا جانے۔ پھر بھی اس میں کوئی نیکی ہے، علم کی بات ہے تو اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ہر جگہ سے آدمی حُصولِ خیر کرتا رہے...... مولانا حبیب الرحمٰن، حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ بڑے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن تھے جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم رہے تھے۔ وہ بڑے بلا کے ذہین تھے۔ ان کی ذکاوت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ان کی ذکاوت و ذہانت عجائبات تھی۔ شروع عمر جوانی میں کوئی برائی ایسی نہیں جو ان سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ یعنی جوا تک کھیلا، غصب کیا۔ دوسرے کا

مال و دولت جھپٹ لیا۔ یہ واقعہ ہے کہ علمی استعداد اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دیوبند تشریف لاتے تو طلباء مٹے ہوئے تھے۔ ان کے علم کی وجہ سے ان پر قربان تھے۔ اسٹیشن سے شہر کی طرف آ رہے ہیں۔ طلباء کے ہاتھوں میں ہدایہ ہے، ہدایہ کا سبق ہو رہا ہے۔ اور طلباء پیچھے پیچھے ہیں۔ دیوبند میں پہنچے بازار میں بنیا رہتا تھا۔ بلاّ اس کا نام تھا۔ بہت جواری تھا۔ اس کے مکان کے نیچے بیٹے کو آواز دی۔ وہ سامنے آیا تو کہا کہ ''تو پٹ لے گا جوتا، یا چت لے گا'' اس نے کہا پٹ۔ بس جوتا پھینکا وہ چت گرا دس ہزار کی شرط ٹھہری دس ہزار لے کر آگے روانہ ہوئے بنیا ہار گیا۔ اور ساتھ ساتھ سبق بھی ہو رہا ہے۔

ایک دفعہ ایک بیئے سے قرض لیا۔ بیس ہزار روپے کی دستاویز لکھ دی۔ دستخط کر دیئے۔ میعاد طے ہوگئی کہ برس دن بعد ادا کریں گے۔ برس دن بعد، بیئے نے مانگا کہ میرا روپیہ کہا کیسا روپیہ؟ کہا کہ حضرت وہ جو آپ نے لیا تھا۔ فرمایا مکار! ہم نے کب لیا تھا۔ اس نے کہا صاحب دستاویز لکھی ہے۔ کہا غلط ہے۔ کوئی دستاویز نہیں، بھاگ جا یہاں سے۔ اس نے جا کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ دستاویز اس کے پاس تھی۔ مولانا کے اس پر دستخط تھے۔ کہا کہ انہوں نے بیس ہزار روپیہ مجھ سے لیا اور دستاویز جج کی میز پر رکھ دی۔ مولانا نے کہا کہ حضور میں بھی دستاویز دیکھ سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا دیکھو، تمہارے لئے تو حجت ہے۔ تو اس نے اس طرح سے وہ کاغذ پکڑا یا کہ اوپر کا سرا تو جج کے ہاتھ میں نیچے جہاں ان کے دستخط تھے، دوسرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ خدا جانے انگوٹھے میں کوئی مسالہ لگا کر گئے تھے، کیا صورت تھی۔ اس طرح سے اس کو پکڑ کر مسلا ہے۔ کہ جب کاغذ میز پر رکھا، وہ دستخط غائب تھے، سادہ کاغذ تھا۔ مولانا نے کہا کیا یہ دستاویز آپ کو بیئے نے دی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ جعلی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر تو دستخط نہیں، گمنام ہے۔

دیکھا تو اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ جج نے غصے کے لہجے میں بیئے سے کہا۔ گمنام دستاویز لے کر یہاں آئے ہو؟ اس نے کہا حضور! دستخط تھے، میں حلف کرتا ہوں۔ اس نے کہا تھے تو کہاں گئے؟ کوئی جن کھا گیا۔ کوئی اسے لے گیا۔ کہاں گئے دستخط؟ بیئے نے سر پیٹ لیا۔ آخر مولانا کی ڈگری ہوئی۔ بیس ہزار روپے کا اور دعویٰ کر دیا کہ میری حیثیت کی ہتک ہوئی ہے بیس ہزار اور وصول کر لئے یہ کیفیت تھی۔

سُنار کو گھر بلایا کہ زیورات کی ضرورت ہے۔ شادی ہونے والی ہے۔ دس پندرہ ہزار کے زیورات لینے ہیں۔ فرمایا کہ اتنی مہلت ہے، اجازت ہے کہ میں گھر کی عورتوں کو دکھلا آؤں۔ اس نے کہا ضرور دکھلا دیجئے۔ کوئی بے اعتباری تھوڑا ہی ہے۔ بس وہاں سے جا کر آدھ گھنٹہ میں جو کام کیا کہ سارے نگ اکھاڑ کر چھوٹے چھوٹے پرچوں پر دستخط کر کے نیچے رکھ دیئے اور نگوں کو اس طرح جڑ دیا جس طرح تھے اور لا کر واپس کر دیئے۔ وہ لیکر چلا گیا۔

مولانا نے جا کر عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ سنار میرے گھر سے پندرہ ہزار روپے کے زیورات چرا کر لے گیا ہے اور پتہ نہیں ہے کہ کہاں ہیں۔ تو فوراً سمن جاری ہوا۔ اس کی طلبی ہوئی، عدالت میں حاضر ہوا۔ مولانا کا

دعویٰ تھا کہ پندرہ ہزار کے زیور لے گیا ہے۔اس نے کہا صاحب! میں کسی کے زیور نہیں لایا۔دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔مولانا نے کہا یہ جھوٹا ہے۔ جبراً کر لے گیا ہے۔بات بنارہا ہے کہ میں دکھانے کو لے گیا تھا۔ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔میں خود دکان پر جا کر دیکھ آتا۔

جھڑپ شروع ہوئی تو جج نے کہا''کوئی ثبوت''؟ مولانا نے کہا کہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے سارے زیور عدالت میں طلب کر لئے جائیں میں اپنے زیور پہچان لوں گا۔چنانچہ سارے زیور عدالت میں حاضر کئے گئے۔ مولانا نے جتنے ان کی نگاہ میں آچکے تھے،سب الگ کر دیئے۔اور کہا کہ''یہ ہیں وہ سب زیور''۔سنار نے شور مچایا کہ صاحب ان کے کہاں سے آئے؟ یہ میری دکان کے زیور ہیں،ان کے نہیں۔

جج نے کہا''ثبوت''؟۔انہوں نے کہا کسی زیور کا نگ اکھاڑ کر دیکھ لیجئے ہر نگ کے نیچے میرے نام کے دستخط موجود ہیں۔اب جس نگ کو اٹھاتے نیچے مولانا کے دستخط تھے۔پندرہ ہزار کے زیوروں پر دستخط موجود تھے۔آخر وہ زیور مولانا کو مل گئے اور گھر لے کر چلے آئے۔یہ حالت تھی اور ساتھ ہی علمی استعداد کا یہ حال کہ سڑک پر بھی جارہے ہیں تو طلباء پیچھے۔مگر خیر آخر میں اللہ تعالیٰ نے توبہ نصیب فرمائی۔اور اس درجہ پر پہنچے کہ پوری پوری راتیں نوافل وتلاوت قرآن مجید اور درود شریف میں گزری ہیں۔یہ ان کا عام معمول تھا کہ جمعہ کی پوری رات درود شریف پڑھ کر گزارتے۔سوتے نہیں تھے۔جیسے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہم نے علم دنیا کی طلب کے لئے حاصل کیا تھا۔مگر علم نے کہا میں غیر کی طرف نہیں جاؤں گا۔تو ہمیں بھی اللہ سے ملا دیا۔انہوں نے علم سیکھا تو بالآخر اس علم نے اپنی طرف کھینچا۔یہ چیزیں ختم ہوئیں۔اخیر عمر ان کی نہایت مقدسانہ اور نہایت پاکیزہ زندگی بن گئی۔مگر میں نے اس پر یہ عرض کیا کہ باوجود ان خرافات کے،ان کی برائیوں کے چونکہ علم تھا،تو طلباء ان کے جوے کے درپے نہیں تھے۔انکے علم کے درپے تھے کہ یہ ہمیں مل جائے۔ان کا جوا ان کے ساتھ ہے، اللہ جانے اور وہ جانیں۔

پوری امت میں خیر کیسے نمایاں ہوسکتی ہے......اگر پوری امت میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ اور اس کی شر کو اس کے لئے چھوڑ دو۔تو ساری امت نیک نظر آئے گی اور اگر پوری امت کے ایک ایک فرد کی برائیاں اچھالیں گے۔اور نیکیاں دفن کر دیں گے تو معلوم ہوگا کہ ساری امت برائیوں سے بھری ہوئی ہے۔اس امت میں کوئی نیک آدمی نہیں۔

اس جذبے سے ہم پوری امت کو برا کر کے دکھلا رہے ہیں۔نہ اجتماعیت باقی ہے،نہ اتحاد وحدت اور نہ قلوب کی یگانگت۔اس لئے ہر شخص کی نظر برائی پر ہے۔اپنی جانب سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور دوسرا حقیر اور دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور وہ حقیر۔سات فقیر ایک کمبل میں سو سکتے ہیں مگر دو بادشاہ ایک ملک میں جمع نہیں ہوسکتے۔اس لئے کہ فقیر میں تواضع ہے اور بادشاہ میں کبر۔تو کبر دوسرے کے ساتھ جمع نہیں

ہونے دیتا۔ ہر شخص نے کبر و نخوت کو پیشہ بنالیا۔ اس لئے فسادات اور جھگڑے بھی ہیں۔

تواضع پیدا ہوجائے تو جھگڑے ختم ہوجائیں۔ جب آپ دوسرے سے یوں کہیں گے کہ آپ بڑے ہیں۔ میں آپ کا خورد ہوں۔ وہ کہے گا کہ آپ بڑے ہیں، میں آپ کا خورد ہوں۔ لڑائی کیسے ہوگی؟ لڑائی اس سے ہوگی کہ آپ کہیں میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ اس نے کہا میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ بس لاٹھی چل پڑے گی۔ جب ہر شخص یہ کہے کہ حیثیت تو آپ کی ہے، میں تو آپ کا خادم ہوں۔ تو پاؤں میں پڑے سانپ کو بھی کوئی نہیں مارتا۔ بہرحال امت میں آپ جہاں دیکھیں کہ جھگڑا چلتا ہے، تو سمجھ لیں کہ کوئی متکبر آ گیا، کوئی صاحب نخوت موجود ہے، جسے اقتدار کی ہوس ہے۔ جاہ پسندی اس کے اندر گھر کئے ہوئے ہیں، وہی جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

دو چیزیں ہیں جو امت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ ایک حبّ جاہ اور ایک حبّ مال۔ جاہ اللہ کی دین ہے اسے استعمال کیا جائے۔ اس پر فخر نہ کیا جائے۔ مال اللہ کا انعام ہے۔ اس کے بتائے ہوئے مصارف میں اس کو استعمال کیا جائے۔ نہ کہ مال کوئی خدا بنانے کی چیز ہے کہ آدمی سر بسجود ہوکر جھک جائے۔ یہ تو استعمال کی چیزیں ہیں۔ بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اس کو جاہ دی ہے محنت کرتا ہے تو اسے مال دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں خدا کی ہیں۔ خدا ہی کے لئے استعمال میں آتی ہیں۔ اس واسطے کہ اگر ان چیزوں کو ہم مخلوق کے لئے استعمال کریں۔ اپنی نخوتوں کا سامان نہ بنائیں تو پوری امت میں خیر نمایاں ہوگی۔

بحیثیت مجموعی امت بھی معصوم ہے..... تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں کہ پوری امت اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے۔ جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، بحیثیت مجموعی امت بھی معصوم ہے۔ اس میں طبقات برے ہوں گے، افراد بھی برے ہوں گے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے امت معصوم ہے یعنی دین ضائع نہیں ہوسکتا، کہ دین ختم ہوجائے اور گمراہی عام ہوجائے۔ ہدایت بالکل باقی نہ رہے۔ اصل ہدایت باقی رہے گی۔ تو مجموعی حیثیت سے گویا عصمت کے مقام پر ہے کہ امت ضائع ہوکر کسی دوسری امت کا وجود ہوجائے، یہ نہیں ہوگا۔ جیسے پہلی امتیں ختم ہوتی تھیں۔ نئی امت کی بنیاد پڑتی تھی۔ تو وہ یہ ہوتا تھا کہ ایک نبوت ختم ہوتی دوسری نبوت کی بنیاد پڑتی۔ اب نبوت ایک ہے جو قیامت تک رہے گی۔ تو امت بھی ایک ہے کہ قیامت تک رہے گی۔ اس لئے اس میں حق بھی رہے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ حق منقطع ہوجائے اور گمراہی پھیل جائے۔

ہمہ وقت اللہ کا دھیان رہے..... تو ساری ہدایتوں کا اجتماع جمعہ کے طفیل ہوا۔ جمعہ ہی آدم علیہ السلام کو نیچے لانے کا ذریعہ بنا۔ وہ نیچے آئے تو اولاد پیدا ہوئی اور پیغمبریاں بھی ظاہر ہوئیں۔ نبوتیں بھی نمایاں ہوئیں علم و کمال نمایاں ہوئے۔ پاکیزہ اخلاق بھی نمایاں ہوئے اور اب تک یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ تو جمعہ کا دن تمام کمالات کا جامع اور سبب ہے۔ اس سے ہم فائدہ اٹھائیں کہ جس طرح ہم یہاں جمع ہوئے، کاش باہر جا کر بھی ہم بھائی بھائی بنے ہوئے ہوں۔ اسی طرح ہمارے قلوب میں یکسانی ہو۔ مسجد اور باہر کا فرق کیا؟ یہ کہ جب آپ باہر جائیں گے تو دنیا

سامنے ہوگی۔ جب جمعہ کے لئے مسجد کے اندر آئے تو اللہ میاں سامنے ہیں۔ معلوم ہوا خدا سامنے ہو تو وحدت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا سامنے ہو تو انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ دنیا کو چھوڑ دو۔ کسبِ حلال تمہارے اوپر فرض ہے۔ اسلام میں یہ ہے کہ دنیا پر قابو پا کر اس کی محبت ترک کر دو۔ دنیا کو استعمال کے لئے رکھو۔ اور تمہاری شان ہو کہ۔

دل بیار و دست بکار

ہاتھ پیر کام میں لگے ہیں اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہے۔ گویا اپنے پروردگار سے باتیں کر رہا ہے۔ غرض ترکِ دنیا اسلام میں اس معنی پر نہیں ہے کہ شہروں کو چھوڑ دو۔ آبادیوں کو چھوڑ دو۔ لذات کو ترک کر دو۔ حکم دیا گیا۔ ﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ ① پاک غذائیں کھاؤ اور عملِ صالح اختیار کرو۔ فرمایا گیا ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ② نکاح بھی کر سکتے ہو، ضرورت پڑے تو چار بھی کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ ضرورت پڑے اور دل اجازت دے۔ اور دل میں عادل بنو تب، ویسے نہیں۔ مکان بنانے کے بارے میں قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلایا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا﴾ ③ اللہ نے تمہارے لئے سکون کی جگہ رکھی۔ سکونت کی جگہ۔ کپڑوں کے گھر دیئے چمڑوں کے گھر دیئے اگر گھروں میں بسانا منظور نہ ہوتا، جنگلوں میں بسانا منظور نہ ہوتا تو احسان کیوں جتلایا جاتا۔ تو کھانے کی اجازت، پینے کی اجازت۔ اور فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ ④ کہہ دے اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمت و زینت کو اپنے لئے حرام کرے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ حلال طریقے پر لذات کو استعمال کرو اور شکرِ خداوندی بجالاؤ اور عملِ صالح اختیار کرو۔

اسلام میں ترکِ دنیا کا مفہوم...... اسلام میں ترکِ دنیا کا یہ مفہوم نہیں کہ آدمی شہروں کو چھوڑ کر ساری لذات سے منہ موڑ کر جنگلوں میں پہاڑوں میں جا بیٹھے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ مال کمائے، شہر بسائے آباد کرے۔ سب میں رہے پھر بھی اللہ سے متعلق رہے۔ معبود ایک ہے، یہ چیزیں پرستش کے لائق نہ بنائے۔ تو روپے پیسے کو معبود مت بناؤ۔ اللہ نے یہ دولت خادم بنا کر دی ہے، مخدوم بنا کر نہیں دی کہ آدمی اس کی پرستش میں لگ جائے۔ جاہ و عزت آدمی کو اللہ نے اس لئے دی ہے کہ اس کے ذریعے باطل کو دفع کیا جائے۔ اس اقتدار سے مدافعت میں کام لیا جائے۔ اس لئے نہیں دی گئی کہ آدمی غرور کی شکل میں بولے۔ بڑا بول بولے، متکبر بنے اور عقل کے لئے مال دیا گیا ہے مال کے لئے وہ چیزیں جمع کرو جو نافع ہوں اور جاہ کے ذریعے ان چیزوں کو دفع کرو جو نفس کے لئے

① پارہ: ۱۸، سورۃ المؤمنون، الآیۃ: ۵۱. ② پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳.

③ پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۸۰. ④ پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۳۲.

مضر ہوں۔ مقاصد کو چھوڑ کر آلات و وسائل میں پڑ جاؤ، یہ دانش مندی کے خلاف ہے۔

جمعہ کی تعلیم...... بہر حال جمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں اور جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رخ ہوگا، مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے تب ٹکر پیدا ہوگی۔ جب سب کا رخ ایک طرف ہوگا۔ ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔

آپ میں سے جو حضرات حج کے لئے گئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ طواف کرنے کی جگہ میں کئی لاکھ آدمی طواف کرتے ہیں۔ بیت اللہ شریف میں ایک ہی مقام پر لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ مرد و عورت کا ایک ہجوم ہے۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے، لڑائی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سب ایک ہی رخ میں گھومتے ہیں۔ اگر کچھ ادھر کو چلتے، کچھ ادھر کو تو مڈبھیڑ ہوتی، اچھا خاصا تصادم ہوتا، کیونکہ رخ ایک ہے۔ اس لئے لاکھوں جمع ہیں، ان میں کوئی ٹکر نہیں۔

جب آپ جامع مسجد میں آئیں گے تو سب کا رخ ایک ہی طرف ہوگا، تو یگانگت پیدا ہوگی۔ آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں جب باہر جائیں گے تو کسی کا منہ دکان کی طرف، کسی کا منہ دفتر کی طرف، ہر کوئی دوسرے کے سامنے۔ اس میں تصادم ٹکراؤ اور جھگڑے شروع ہوں گے۔ جیسے یہاں ظاہری طور پر ہے اگر باطنی طور پر خدا کی طرف منہ کر لیا جائے وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی۔ تو جمعہ کا دن بتلاتا ہے کہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو، باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے۔ اس لئے جب تم باہر جاؤ تو باطن کا رخ ایک طرف رکھو۔ اللہ سے لو لگائے رکھو۔ تم میں تفریق پیدا نہیں ہوگی۔ بہر حال جمعہ یومِ امتحان بھی ہے کہ یہ امت کامیاب ہوئی۔ جمعہ یومِ جامعیت بھی ہے جس نے تمام بکھری ہوئی چیزیں جمع کیں۔ جمعہ یومِ فضیلت بھی ہے جس میں انسانوں کو فضیلت ملی۔ جمعہ یومِ مزید بھی ہے، جس میں دربارِ خداوندی میں حاضری کی عادت پڑی۔ اس لئے جمعہ کو انتہائی ذوق وشوق سے ادا کرنے کی ضرورت ہے اور اذانِ جمعہ سے پہلے آکر مسجد میں صفِ اوّل ہی میں بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ فضائل و برکات حاصل ہوں۔ اس مختصر سے وقت میں یہی موضوع جمعہ کا سامنے تھا۔ اسی کے متعلق میں نے چند باتیں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماوے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ، اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ ، وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ. اٰمِيْن.

سنّتِ حضرت خلیل علیہ السّلام

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَـاوَسَنَـدَنَـا وَمَوْلَانَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّـا بَعْـدُ ! "قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ یَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَـی اللّٰہِ مِـنْ اِھْرَاقِ الدَّمِ، وَاِنَّہٗ لَیَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِقُرُوْنِھَا وَاَشْعَارِھَا وَاَظْلَافِھَا، وَاِنَّ الدَّمَ لَیَقَعُ مِنَ اللّٰہِ بِمَکَانٍ قَبْلَ اَنْ یَّقَعَ بِالْاَرْضِ، فَطِیْبُوْا بِھَانَفْسًا .اَوْکَمَا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ "①

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ بقرہ عید کے دن انسان کے تمام نیک اعمال میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب عمل قربانی ہے یہ قیامت کے دن اپنے سینگ، بال اور کھر کے ساتھ (صحیح سالم) آئے گی اور یقیناً (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے حق تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ سو قربانی خوشدلی سے کیا کرو"۔

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ حدیث جو اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی (اور جس کا ترجمہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے) احکام قربانی پر مشتمل ہے۔ جو اس وقت تقریر و جلسہ کا موضوع ہے، تقریر تو مختصر ہوگی۔ اس لئے کہ اول تو یہ مسئلہ جزئی ہے اور جزئیات میں تفصیل نہیں ہوتی۔ کیونکہ بسط و تفصیل تو اصول میں ہوا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور اس سے کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جو واقف نہ ہو۔ قربانی کا عمل کوئی سال کا عمل نہیں بلکہ صدیوں سے یہ عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے بھی اس میں تفصیل کی ضرورت نہیں تو نہ نفسِ مسئلہ میں تفصیل کی گنجائش اور اس کے عام ہونے کی بناء پر نہ تفصیل کی ضرورت ہے۔

اُصولِ ثلاثہ تکوینیہ...... اُصولِ اوّل: مسئلہ کی شرح سے پہلے ایک اصول سمجھ لیجئے اور یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اس طرح تشریعی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو چیزوں سے ملا کر بنایا ہے۔ ایک روح ایک جسم یعنی ہر چیز کی صورت ہے، ایک اس کی حقیقت ایک اس کی ہیئت اور ایک ماہیت یا یوں کہئے کہ ایک اس کا ظاہری حصہ

① السنن للترمذی، ابواب الاضحیۃ،باب ماجاء فی فضل الاضحیۃ، ج: ۵ ص: ۴۴۴.

ہے اور ایک باطنی۔ غرض تمام انسان، کل حیوانات، نباتات، جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں اس کی ایک حقیقت بھی ہے، ایک اس کا بدن اور ایک اس کی روح ہے۔ اور ہر بدن میں خدا تعالیٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔ جب حق تعالیٰ کی توجہ کائنات کی طاقتوں اور بدن بنانے کی طرف متوجہ ہوئی، تو یہی اصول مدِّ نظر تھا۔

سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے کہ اوّل انسان کا بدن تیار کیا جاتا ہے جس کی ابتداء نطفہ یعنی ایک گندے قطرہ سے ہوئی۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۗ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ① ''یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خُلاصہ (یعنی گندے قطرے) سے بنایا۔ پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنادیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری مخلوق بنادیا۔ سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے''۔

تو روح ڈالنے سے پہلے ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے، جس کی تیاری میں زمین کی قوتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں۔ آسمان کی بھی۔ آفتاب کی طاقتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں اور ہواؤں کی بھی۔ غرض جب کائنات کی ساری قوتیں مل کر ڈھانچہ تیار کر لیتی ہیں تو پھر اس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ یہی صورت سارے جمادات اور نباتات اور حیوانات کی ہے۔

دوسرا اُصول...... جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کی کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی جب تک بدن اور روح ملے ہوئے نہ ہوں، گویا بدن کی بقا روح پر موقوف ہے اور روح کی بقا بدن پر۔ اگر آپ نے بدن کو پھوڑ کر خستہ وخراب کر دیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہو گیا اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں روح نہیں ٹھرتی، بلکہ پرواز کر جاتی ہے۔ اس لئے کہ بدن ہی روح کو سنبھالے رکھتا ہے۔

غرض انسان میں جب تک روح ہے تو انسان ہے ورنہ لاشہ ہے جو بے کار ہے۔ پھر جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اس طرح بدن کے ہر جزء کے لئے ایک ایک روح ہے جو اسی کے ساتھ رہ سکتی ہے اگر اس جزء کو ختم کر دیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی۔ یہ نہ ہوگا کہ اگر ایک جزء کو ختم کر دیں تو اس کی روح کسی دوسرے جزء میں پہنچ جائے۔ مثلاً آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت ناک میں آ جائے بلکہ یہ قوت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح ناک ہے اس میں سونگھنے کی قوت ہے وغیرہ۔

حاصل یہ کہ خداوند تعالیٰ نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان میں روح اور قوت بھی ساتھ ساتھ پیدا کر دی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصہ بنتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ کر دیا جائے۔ تو اسی حقیقت کو ''موت'' کہتے ہیں اور اس علیحدگی سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک دوسرا اصول اور سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے کہ

① پارہ: ۱۸، سورۃ المومنون، الآیۃ: ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

بدن کے اندر جو قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان ابدان ہی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔مثلاً قوتِ بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوتِ سماعت کی کان سے غرض یہ صورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں اگر یہ صورتیں نہ ہوتو یہ تعارف ختم ہو جائے۔اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ ''بدن روح کی پہچان کا ذریعہ ہے''۔

تیسرا اُصول......اب تیسرا اصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ روح تک کوئی اثر پہچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں۔اس عالم میں براہِ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔مثلاً آپ روح پر گرمی کا عمل کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں گے جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا،اس کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی اور اگر ٹھنڈک پہچانا چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے، یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ۔غرض ہر تاثیر کے لئے بدن ذریعہ ہے۔بغیر بدن کے روح پر اثرات نہیں پہنچ سکتے۔

اُصولِ ثلاثہ تشریعیہ......تو اب تین اصول معلوم ہوئے کہ بدن سے تین کام لئے جاتے ہیں۔روح کے قرار اور قیام کا۔دوسرے روح کے تعارف اور پہچان کا۔اور تیسرے تاثیر کا۔اور یہ تینوں باتیں اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور یہ تینوں اصول جس طرح تکوینی ہیں،اسی طرح تشریعی بھی ہیں۔یعنی اعمال شرعیہ میں بھی ایک صورت ہے اور ایک روح۔اور بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے اس طرح اگر روح تک کوئی اثر پہچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے اس کی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے۔مثال کے طور پر وضو ہی کو لیجئے کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح۔اس کی صورت تو وہ خاص ہیئت اور افعال ہیں جو انسان وضو کرنے کے وقت اختیار کرتا ہے یعنی ایک خاص طرح بیٹھ کر اعضاء کا دھونا وغیرہ۔اور یہی ہیئت اس کے تعارف کا ذریعہ ہے۔چنانچہ آپ وضو کر رہے ہوں تو ہر شخص آپ کو دیکھ کر پہچان لے گا کہ آپ وضو کر رہے ہیں۔کھانا نہیں کھا رہے کیونکہ کھانا کھانے والے کی ہیئت اور ہے۔یہ تو اس کی صورت ہے اور ایک اس کی روح ہے۔یعنی طہارت حاصل کرنا تا کہ انسان دربارِ الٰہی میں حاضری کے قابل ہو سکے۔اور ایک اس کی تاثیر ہے یعنی وہ خاص قسم کا انشراح جو انسان کے قلب میں وضو کے بعد پیدا ہوتا ہے۔تو یہ طہارت اور انشراح بغیر وضو کی صورت اختیار کئے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔اسی طرح غسل کی بھی ایک صورت ہے یعنی تمام جسم کو دھونا اور ایک اس کی روح ہے۔یعنی طہارت اور صفائی۔اور اس کی تاثیر فرح و انبساط ہے۔اب اگر کوئی شخص تمام عمر غسل نہ کرے تو اس کو فرح و انبساط کی وہ خاص کیفیت کبھی بھی نصیب نہ ہوگی الغرض ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لئے اس کی صورت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔اسی طرح آپ نماز کو لیجئے کہ اس کی صورت نیت باندھ کر کھڑا ہونا اور رکوع وسجود وغیرہ ادا کرنا ہے اور اس کی روح خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے اور اپنی عبدیت وبندگی کا اظہار کرنا ہے، اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہوگی اس طرح زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ عبادات ہیں کہ ہر ایک کی

ایک روح اور ایک صورت ہے۔

محبوباتِ نفس کی قُربانی......تو یہ جزء" قربانی" ہے۔اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح، صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقرب الی اللہ ہے۔تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کئے کیسے حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ یہ بات پہلے معلوم ہوچکی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے نماز میں نماز کی روح۔زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے غرض اللہ تعالیٰ نے اس کی جو صورت مقرر کردی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ① "یعنی تم خیرِ کامل کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے"۔

اور مال محبوب چیز ہے۔مال میں سے بھی جانور زیادہ عزیز ہوتا ہے۔کیونکہ جاندار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کوئی بے جان چیز ضائع ہوجائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے بخلاف جاندار کے اگر فنا ہوگیا تو دوسرا نہیں ملتا۔اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہو کر ہی نفع پہنچاتا ہے اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہو تو وہ بے کار ہے، اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو خرچ نہ کرے تو جب دنیوی منافع اس کو خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتے تو "رضاءِ حق" جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ محبوبات قربان کئے بغیر کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ اور محبوبات کیا ہیں؟ جان، مال، اولاد، عزت آبرو وغیرہ۔

چنانچہ ارشاد ہے﴿إِنَّ اللهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ② "یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا"۔

غرض آپ کو ان میں سے ہر چیز لٹانی ہوگی۔تب کہیں بندگی کا اظہار ہوگا۔درحقیقت جنت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔جیسے اگر سونا خریدا جائے تو اس کو کسوٹی پر گھسا کر دیکھا جاتا ہے اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ نہیں تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے، لکیروں کی نہیں جو کسوٹی پر پڑ جاتی ہیں۔بس اس طرح آخرت کے بازار میں جنت کے عوض ایمان کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور یہ ہمارے اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں۔اس لئے جنت حاصل کرنے کے لئے ہمیں "محبوباتِ نفس" کو قربان کرنا لازمی ہے۔اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو مال خرچ کرو۔جان دینے کا حکم ہو تو جان نثار کرو۔عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو۔یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟۔انہوں نے پھر یہی عرض کیا اور آپ

① پارہ:۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۲. ② پارہ:۱۱، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۱.

صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا، کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے تیسری بار بھی یہی عرض کیا کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مصیبتیں جھیلنے کو فقر فاقہ کی زندگی بسر کرنے کو اور آفتیں جھیلنے کو تیار ہو جاؤ اور ظاہر بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک مصیبتیں نہ جھیلے اسی لئے ارشاد ہے۔ ﴿الٓمّٓ ○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ﴾ ① ''یعنی کیا لوگوں کا خیال ہے کہ محض ''اٰمَنَّا'' کہنے سے ان کا چھٹکارا ہو جائے گا اور انکی آزمائش نہ ہوگی۔ حالانکہ ہم نے آزمایا ان سے پہلے لوگوں کو پس ضرور معلوم کرلے گا اللہ تعالیٰ سچے لوگوں کو اور ضرور معلوم کرلے گا جھوٹوں کو''۔

روحِ قربانی اور شبہ کا جواب..... غرض اصل بیان یہ تھا کہ جس طرح اعمال کی روح ضروری ہے اسی طرح ان کی صورت بھی مطلوب ہے اس لئے کہ دنیا میں صورت اصل ہے اور روح اس کے تابع اور آخرت میں معاملہ برعکس ہوگا، روح اصل ہوگی اور صورت تابع۔ تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں جس طرح ہر چیز کی روح کی بقا کے لئے صورت کی ضرورت ہے اسی طرح اعمال شرعیہ کی روح کی بقا کے لئے ان کے جسم وصورت کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ اعمال میں تو اصل روح ہے اس لئے روح کو لے لو اور صورت کو چھوڑ دو تو اس کو چاہئے کہ یہ عمل پہلے اپنے اوپر جاری کرے کہ اپنے بدن کو ختم کردے اور خودکشی کرے کہ بس میں تو روح کو باقی رکھوں گا لیکن اگر خود بغیر صورت کے نہیں رہ سکتے تو پھر اعمالِ شرعیہ میں یہ عملِ جراحی کیوں کیا جاتا ہے؟

جیسا کہ شروع میں معلوم ہو چکا کہ کائنات میں جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اسی طرح ہر ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ روح بھی ہے۔ جیسے آنکھ میں بینائی کی قوت ایک روح ہے وغیرہ۔ اسی طرح سارے اعمال کا نام ''تقویٰ'' ہے۔ چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے۔ ﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ﴾ ② ''یعنی اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے''۔

تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے سو اگر کوئی یہ کہے کہ جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے تو قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ تقویٰ اختیار کرلو کافی ہو جائے گا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کرلو کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے۔ ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ③ ''تم پر روزوں کا حکم ہوا جیسے تم سے پہلے لوگوں پر حکم ہوا تھا۔ شاید کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ''۔ تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہے۔ نماز کے متعلق ارشاد باری ہے کہ ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ ④ ''نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے''۔ جس کا حاصل تقویٰ ہے۔ لہٰذا نماز اور روزہ

① پارہ: ۲۰، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۱-۳۔ ② پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۳۷۔
③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۳۔ ④ پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۴۵۔

بھی چھوڑ دیجئے۔ پھر ارشاد ہے کہ ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ ① ”مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا نیکی نہیں ہاں نیکی یہ ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اور اس کی محبت پر مال دے اور رشتہ داروں کو، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوۃ دے، اور جو لوگ اپنے عہد پورے کریں۔ یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی متقی ہیں“۔

لیجئے سارے اسلام کا حاصل تقوی نکلا اس لئے سب کچھ چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لیجئے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ ہر ہر چیز کی روح علیحدہ ہے اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعہ پہنچتا ہے اور حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسری عبادت، صدقہ وغیرہ سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قالب میں اگر منتقل کر دیا جائے تب بھی وہ زید نہ بنے گا بلکہ گدھا ہی رہے گا اسی طرح صدقہ، صدقہ ہی رہے گا قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کہا جا سکتا ہے تو دنیا میں چونکہ بغیر صورت چارہ نہیں اس لئے قربانی کرنی ہی پڑے گی ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ وہاں صورت ضروری نہیں لیکن اگر آپ نے دنیا میں اعمال کی صورت کو ترک کر دیا تو یقین رکھیئے کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کر دیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ ”اَلْاِيْمَانُ سِرٌّ وَّالْاِسْلَامُ عَلَانِيَةٌ“ ② ”ایمان پوشیدہ چیز ہے اور اسلام ظاہر“۔

اور چونکہ قربانی کا قائم مقام صدقہ یا کوئی عبادت نہیں ہو سکتی۔ لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَّوْمَ النَّحْرِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ.“ ”بقرہ عید کے روز سب سے زیادہ محبوب عمل قربانی ہی ہے۔“ تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِيُّ“ ”یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ“ ”تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے“۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے استفسار کیا کہ ”فَمَا لَنَا فِيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ“ ”یارسول اللہ اس میں ہمارا کیا نفع ہے؟“

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۷۷۔ ② قال ابن تیمیۃ فی شرح عقیدۃ الواسطیۃ: نعنی بالاسلام الاعمال الظاھرۃ، وبالایمان الاعتقادات الباطنۃ، کما جاء فی المسند من حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ .... ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: "الایمان فی القلب والاسلام علانیۃ." شرح عقیدۃ الواسطیۃ، ج: ۱۳، ص: ۱۴۰۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ" "قربانی کے ہر بال پر ایک نیکی ملے گی"۔ ① تو یہ اجر وثواب صدقہ وغیرہ پر کیسے مرتب ہوسکتا ہے؟ کیونکہ صدقہ میں بال کہاں ہیں تو بات دراصل وہی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔

قربانی کی حقیقت...... اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے ان کو یہ گوارہ نہ ہوا اس لئے حکم دیا تم جانور ذبح کر دو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواب کے ذریعہ بشارت دی گئی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل (علیہ السلام) کی قربانی پیش کریں اب دیکھئے کہ یہ حکم اول تو اولاد کے بارہ میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی، فرزند اور فرزند بھی نا خلف نہیں بلکہ نبی معصوم۔ ایسے بچے کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا آسان ہے، مگر حکمِ خداوندی کے سامنے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر منیٰ کے منحر میں تشریف لائے اور فرمایا بیٹا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کروں۔ تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً فرمایا ﴿اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ ② جو آپ کو حکم ہوا ہے ضرور کیجئے۔

اگر میری جان کی ان کو ضرورت ہے تو ایک جان کیا؟ اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رسیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے چھری تیز کی۔ اب بیٹا خوش ہے کہ میں خدا کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں ادھر باپ خوش ہے کہ میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر رہا ہوں چنانچہ حکمِ خداوندی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن میں چھری چلائی تو چھری کُند ہوگئی اور اس وقت حکم ہوا۔ ﴿قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَآ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ③ "بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں"۔ اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں چنانچہ اسی دن سے گائے، مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ مقرر ہوگیا۔

قربانی اور صدقہ میں فرق...... اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے چنانچہ انسان میں جان سپاری اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کی روح ہے، تو یہ روح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی کیونکہ قربانی کی روح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی روح مال ہے۔ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اس طرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن مقرر نہیں مگر اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا ہے اور اس کا نام بھی "يَوْمُ النَّحْرِ" اور "عِيْدُ الْاَضْحٰى" یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الاضاحي، باب ثواب الاضحية، ج: ٩ ص: ٢٨١.

② پاره: ٢٣، سورة الصافات، الآية: ١٠٢.

③ پاره: ٢٣، سورة الصافات، الآية: ١٠٥.

جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی اور امت کا اس پر اجماع ہے انبیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ائمہ کرام کا اس پر اجماع ہے یہ اور بات ہے کہ امام شافعی امام احمد بن حنبل، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم کے یہاں قربانی سنت ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ یہ اس کے حکم میں اختلاف ہے اور ائمہ کے دقائق ہیں مگر قربانی کی مشروعیت میں سب متفق ہیں۔اور اگر یہ کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں؟

چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ”أَنْ نَّسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْأُذُنَ وَأَنْ لَّا نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَّلَا مُدَابَرَةٍ وَّلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ“ [1] ”ہم قربانی کی آنکھ اور کان کو خوب دیکھ بھال کرلیا کریں ہم ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان چرا ہوا ہو، اور نہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو“۔

اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جدا ہیں اس لئے اس میں صدقہ کے احکام سے پرہیز کرنا ضروری ہے پھر ساری امت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آ رہی ہے، اور تعامل امت سب سے بڑی دلیل ہے۔

منکرینِ قربانی پر طریقِ ردّ......قربانی کے متعلق تو اب بیان ہو چکا، لیکن اگر کہا جاوے کہ آپ تو حدیث سے استدلال کر رہے ہیں حالانکہ ہم حدیث کو حجت ہی نہیں مانتے تو ایسے لوگوں سے پھر قربانی کے مسئلہ میں جھگڑا نہیں بلکہ پھر تو حدیث کے حجت ہونے پر گفتگو ہے یہ ایک اصولی اختلاف ہے ایسے لوگوں سے یہ سوال کیا جاوے گا کہ آپ قرآن مجید کو جو کلام اللہ تسلیم کرتے ہیں تو اس کا کلام اللہ ہونا کیسے معلوم ہوا؟

اگر یہ جواب ہے کہ خود قرآن سے معلوم ہوا تو یہ ”مکابرہ“ ہے یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل اور یہ صریح غلطی ہے ورنہ پھر یہ تسلیم کر لیجئے کہ حدیث کا کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا حدیث سے ثابت ہے۔درحقیقت جو شخص احادیث کا انکار کر رہا ہے وہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کا بھی منکر ہے کیونکہ قرآن بغیر حدیث کے حجت نہیں بن سکتا جس طرح کوئی شخص بغیر رسول کے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کلام اللہ تک بغیر کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رسائی ممکن نہیں کیونکہ لغت کے زور سے اگر کلام اللہ کو حل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہوگی بلکہ اس شخص کی اپنی مراد ہوگی۔ جب تک پیغمبر یا پیغمبر کے نائبین کسی آیت کی مراد کو بیان نہ کریں وہ شریعت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آ سکتیں بلکہ لب ولہجہ بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں چنانچہ کبھی اس کو اِستفسارِ حال کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی تعجب کے لئے کبھی تعظیم شان کے لئے اور کبھی تحقیر کے لئے اب اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو بھیج دیں تو کیا وہ شخص اس کو پڑھ کر متکلم کی مراد کو سمجھ سکے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ

---

[1] السنن للترمذی، کتاب الاضاحی، باب مایکرہ من الاضاحی، ج: ۵ ص: ۴۵۴.

جو کچھ وہ سمجھے گا وہ اس کی اپنی مراد ہوگی چنانچہ اگر یہ شخص اس وقت تعجب کی حالت میں ہوگا تو اس کو تعجب کے لئے سمجھے گا اور اگر استفسارِ حال کا اس پر غلبہ ہوگا تو اسی کے لئے سمجھے گا۔ تو یہ کیفیات کاغذ پر نہیں آسکتیں۔

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید   لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

یعنی مصور تو صرف محبوب کی صورت بنا سکتا ہے۔ اس کے ناز و انداز کو کیسے اس میں ڈھال سکتا ہے؟

طریق رد نمبر۲...... اس کے علاوہ ایک چیز "عُرف" ہے یعنی کلام میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اہلِ عُرف کے پاس رہ کر ہی سمجھ میں آسکتی ہیں چنانچہ دیو بند میں ایک صاحب تھے جو کلکو کے یہاں منشی تھے کلکو اگر چہ انگریز تھا مگر اس کو خیال تھا کہ میں اُردو بہت اچھی جانتاہ' چنانچہ اکثر وہ میر منشی صاحب سے بھی کہا کرتا تھا کہ ویل میر منشی! "ہم تم سے زیادہ اُردو جانتے ہیں"۔ اور یہ بے چارے منشی اس کا جملہ سن کر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے کیونکہ کے ملازمت کا سوال تھا۔ آخر یک روز اس نے کسی بات پر میز پر ہاتھ مار کر کہا "ول منشی، ہم تم سے زیادہ اردو جانتے ہیں"۔ اس مرتبہ ان کو بھی جوش آگیا انہوں نے سوچ لیا کہ ملازمت رہے یا نہ رہے مگر کم از کم ایک مرتبہ اسکو جواب تو دے دوں۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میز پر مکہ مار کر کہا کہ "صاحب بہادر: اُردو کی ابجد بھی نہیں جانتے" یہ سن کر وہ انگریز بڑا حیران ہوا، اور کہا کہ ہمارا امتحان لو انہوں نے کہا اگر میں امتحان لوں تو صاحب بہادر بغلیں جھانکنے لگیں۔ اب تو صاحب بہادر واقعی بغلیں جھانکنے لگے کہ اس کا مطلب کیا ہوا بہت غور کیا مگر خاک سمجھ میں نہ آیا آخر کہا کہ تین دن کی مہلت دو۔ انہوں نے کہا کہ سات دن کی مہلت ہے غرض اس نے جملے کو لُغت میں تلاش کیا مگر لغت میں تو بغل مل گیا اور جھانکنا مل گیا مگر یہ جملہ کہاں ملتا۔ آخر کار اس نے سات دن کے بعد کہا کہ مطلب یہی ہے کہ بغل اُٹھا کر دیکھ لیا اور ادھر کی بغل کو اسی طرح دیکھ لیا۔ میر منشی یہ سن کر ہنس پڑے تب اس نے پوچھا کہ پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ میر منشی نے کہا کہ اس شرط پر بتاؤں گا کہ پھر کبھی اردو دانی کا دعویٰ نہ کرو۔ چنانچہ اس نے اقرار کیا اور انہوں نے اس کا مطلب بتایا کہ دراصل یہ جملہ تحیر سے کنایہ ہے یعنی اگر صاحب بہادر کا امتحان لیا جائے تو وہ حیرت میں پڑ جائیں اور اس قسم کی غلطیاں ہونے کے متعدد واقعات ہیں غرض کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو "عرف" سے متعلق ہیں۔ غیر اہلِ عرف ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے ہیں۔

جب ہماری زبان اور کلام میں محاورات ہیں تو قرآن مجید میں بھی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی تو اب جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہیں ان کو چاہئے کہ اہلِ عرف کی طرف رجوع کریں یعنی جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف اور جو معنی وہ بتائیں ان کو صحیح سمجھیں اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ ① "اللہ

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔

تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے قلوب کو صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں تعلیم کرتا ہے حالانکہ وہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہ تھے"۔

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے تین فرائض بیان فرمائے یعنی تلاوت، تزکیہ و تعلیم اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا کام صرف آیتیں پڑھ کر سنا دینا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب کو پاک کریں تاکہ وہ قرآن کے معانی سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے قابل ہوسکیں یہی وجہ ہے کہ آیت میں "تزکیہ" کو تعلیم پر مقدم کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسے حاصل کئے بغیر انسان کو قرآن مجید کے معانی سمجھنے کی استعداد حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب کا ایسا تزکیہ کیا کہ وہ حضرات پھر قرآن کے معانی کو اسی طریقے سے سمجھنے لگے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے تابعین کے قلوب کی تزکیہ کیا اور انہوں نے تبع تابعین کا۔ غرض اسی طرح سلسلہ وار آج تک یہ معانی و مطالب محفوظ ہیں۔ اس لئے ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نکتہ بھی بغیر استاذ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ قرآن مجید ہمارے پاس امانت ہے۔ جس طرح ہم لفظوں کے امین ہیں اسی طرح ہم معانی کے بھی امین ہیں۔ اور ہم کیا؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی الفاظ و معانی دونوں کے امین تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ شروع شروع میں آیات کو رٹنے کی کوشش فرماتے تاکہ بھول نہ جائیں اس لئے وحی نازل ہوئی ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ ① "آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھنے کی خاطر وحی کے دوران زبان بھی نہ ہلایئے"۔ اور زبان کیوں نہ ہلایئے اس لئے کہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ ② "ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور آپ سے پڑھوانا"۔

پھر آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ③ ترجمہ: جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت سنتے رہئے پھر ہم ہی اس کا مطلب بیان کریں گے۔" اس آیت میں حق تعالیٰ صاف صاف فرما رہے ہیں کہ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اگر اس کے مطلب و معانی خود سمجھ میں آسکتے تو یہ کیوں فرمایا جاتا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے تو کسی اور کا کیا منہ ہے؟

یہی وجہ کہ بعض اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم کسی آیت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غور فرماتے رہتے۔ پھر کبھی تو من جانب اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس کا مطلب ڈال دیا جاتا ورنہ آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار فرماتے اگر ان کو معلوم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر دیتے ورنہ وہ فرماتے کہ میں حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتادوں گا۔ تو قرآن مجید کے معانی اس طرح

① پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۶۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۷۔ ③ پارہ: ۲۹، سورۃ القیامۃ، الآیۃ: ۱۸۔

آپ کو من جانب اللہ بتائے گئے اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معنی کے متعلق استفسار کی ضرورت پڑتی تھی حالانکہ آپ اہل زبان تھے نور نبوت سے منور بھی تھے پھر کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ بغیر حدیث کے قرآن فہمی کا دعویٰ کرے؟ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے موجد یا مخترع نہ تھے بلکہ الفاظ و معانی میں امین تھے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرمادیتے اس طرح آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب کو مانجھا اور تزکیہ فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم بھی مسائل پر اسی طرح غور فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے تابعین کے دلوں کو اسی طرح مانجھا اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو اسی طرح تزکیہ باطن سے آراستہ کیا اور یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری ہے۔ ہم کو قرآن مجید کے جو مطالب پہنچے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں سے پہنچے ہیں یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں ہر شخص قرآن مجید کا مفسر نہ بن سکتا تھا۔ جب تک کسی ایسے ہی استاذ کا شاگرد نہ ہوا اور جو شخص قرآن مجید یا حدیث کی تفسیر وغیرہ بیان کرتا اس سے سند پوچھی جاتی تھی اگر وہ شخص مستند ہوا، اس کی بات قابل قبول سمجھی جاتی تھی ورنہ رد کر دی جاتی تھی۔ مگر آج کل چونکہ ناواقفیت کا زمانہ ہے اور خدا کا خوف لوگوں کے دلوں میں کم ہے اس لئے ہر وہ شخص جو ذرا عربی جانتا ہو وہ مفسر قرآن بننے کا مدعی ہے اور لوگ بغیر کسی تحقیق کے اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کے مطالب صرف انہی لوگوں سے حاصل کرنے چاہئیں جو خود صحیح سمجھتے ہوں۔ یعنی بزرگوں کے صحبت یافتہ اور عالم کے شاگرد ہوں تاکہ ان کے اندر بھی تزکیہ نفس کا وہ وصف موجود ہو جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

حقیقت میں صحابہ رضی اللہ عنہم جو ساری امت سے افضل ہیں وہ اسی صحبت کی برکت سے ہیں کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی، جس سے ان کے دل صاف ہو گئے کہ اس میں صرف حق بات ہی سما سکتی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس نہج پر ڈالا، اور ان کے قلوب کی صفائی و تزکیہ کیا۔

”أُولٰئِکَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ وَأَصْحَابُ أَبِیْ بَکْرٍ وَأَصْحَابُ عُمَرَ“

غرض یہ حضرات تھے کہ ان پر حق کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ حاصل یہ کہ کتاب اللہ تک ہم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نہیں پہنچ سکتے اور ہم کو کتاب اللہ کے اندر غور و فکر کرنے کی بھی جبھی اجازت ہے کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مطلب بیان فرمادیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾ ① ”اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف قرآن مجید کو تاکہ آپ بیان فرمادیں لوگوں کے لئے جو ان کی طرف نازل ہوا، تاکہ وہ فکر کریں“۔

دیکھئے: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ﴾ ② فرمایا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۴۴.

کا مطلب بیان کریں اس کے بعد "یَتَفَکَّرُوْنَ" ہے۔یعنی اس کے بعد لوگوں کو غور فکر کی اجازت ہے۔تا کہ لوگ غور فکر کرنے میں شریعت کی حدود سے نہ نکل جائیں۔

درحقیقت اگر ہر شخص اپنی اپنی عقل اور فہم کے مطابق غور کرنا شروع کر دے تو قرآن مجید تو ایک کھیل تماشہ بن جائے۔اس لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے بھی حدود و قیود مقرر کی جائیں۔چنانچہ کر دی گئیں۔اب کسی کو بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "بیان" کے قرآن مجید کی تفسیر کی اجازت نہیں۔اور چونکہ کلام اللہ کا مطلب سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے ہر کتاب کے ساتھ ایک نبی ضرور بھیجا، چنانچہ اگر توریت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے۔صحف آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام بھی تشریف لائے اور انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور سب سے آخر میں قرآن مجید کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا۔ورنہ اگر صرف عربی دانی اور لغت کے زور سے کلام الٰہی کو حاصل کیا جا سکتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری کی کیا ضرورت تھی؟ بلکہ یہ ہوا کرتا کہ ایک کتاب کسی فرشتہ کے ذریعہ سے بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دی جایا کرتی اور اعلان کر دیا جاتا کہ لوگو! یہ خدا کی کتاب ہے اس پر عمل کرو۔مگر ایسا نہیں کیا گیا۔کیونکہ کتاب کے ساتھ اس کو سمجھانے اور پڑھانے کی بھی ضرورت تھی۔ورنہ ہر شخص قرآن مجید سے اپنے نفس کے مطابق مطلب گھڑ کر استدلال کر لیا کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج سے مناظرہ کرنے کو بھیجا تو ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کے سامنے قرآن سے استدلال مت کرنا بلکہ احادیث سے استدلال کرنا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا اور سوال فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ قرآن مجید کو میں خاص طور پر سمجھتا ہوں۔کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں دعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْقُرْاٰنَ." (1) یا اللہ! ابن عباس کو قرآن کا فہم عطاء فرما۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک تم قرآن کو صحیح سمجھتے ہو مگر "اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْہٍ" (یعنی قرآن مجید کے الفاظ سے متعدد مطالب نکل سکتے ہیں) اس لئے تم صحیح مطلب بیان کرو گے اور لوگ اس کا غلط مطلب بیان کر دیں گے۔اور الفاظ سے کسی ایک کی بات متعین نہ ہوگی۔اس لئے تم حدیث سے استدلال پیش کرنا۔کیونکہ حدیث نے قرآن کے معانی متعین کر دیئے ہیں، جس میں کسی تاویل اور کید نفس کی گنجائش نہیں رہی۔ (2)

یہی وجہ ہے کہ زمانہ سابق میں بھی جب کوئی فرقہ ایسا ہوا کہ اس نے دین میں تحریف کا ارادہ کیا تو اس نے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا۔کیونکہ حدیث ہوتے ہوئے کسی قسم کی تحریف کا احتمال ہی نہیں رہتا۔اس لئے اس نے پہلے اس کانٹے کو راہ سے ہٹایا مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ آج وہ لوگ ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کی تحریفات

(1) الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباس، رقم: ۳۷۴۳. (2) الدر المنثور، ج: ۱، ص: ۱۰.

بھی ختم ہوگئیں۔اور حدیث پر عمل کرنے والے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔الغرض حدیث کے بغیر قرآن نہیں سمجھ میں آسکتا۔اور عجیب بات ہے کہ علماء صلحاء کا قول حجت ہو مگر نبی کا کلام حجت نہ ہو۔

تقریر کا اصل موضوع تو قربانی کا مسئلہ تھا جس میں تفصیل نہ تھی مگر درمیان میں چونکہ کچھ اصول کی بحث آ گئی اس لئے بات ذرا طویل ہوگئی اگر چہ اس اصول بحث کو بہت مختصر بیان کیا گیا۔تاہم بحمد اللہ ضروری باتیں آ گئیں اور یہ معلوم ہوگیا کہ حدیث پر بھی ایمان ضروری ہے۔اب اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

متعلقات قربانی کی وضاحت......اس جگہ یہ اشکال کہ قربانی کرنے سے جانور ختم ہو جائیں گے،سو اول تو یہ خیال ہی غلط ہے کیونکہ روزانہ جو لاکھوں جانور بطور ذبیحہ کے کاٹے جاتے ہیں،عید کے دن وہ ذبح نہیں ہوتے اس طرح کچھ معمولی سا فرق پڑتا ہے جو کسی طرح بھی قابل اعتناء نہیں۔پھر اس روز بعض ایسے لوگوں کو بھی گوشت پہنچ جاتا ہے جو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی کھا سکتے ہیں۔پھر ان کی ساری کھالیں غرباء ومساکین میں تقسیم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو روپیہ قربانی میں خرچ ہوتا ہے،اس کو مہاجرین وغیرہ کی امداد میں صرف کیا جائے۔تو بے شک مہاجرین کی امداد ضروری ہے مگر ہر کام کے لئے اسلام کے گلے پر چھری کیوں چلتی ہے۔کچھ اپنی خواہشات نفس پر بھی تو چھری چلایئے اور غیر شرعی اخراجات کو بند کر کے مہاجرین کی امداد کیجئے۔مثلاً سینما ہے شراب ہے،اور دوسرے فضول اخراجات ہیں۔

حاصل یہ کہ اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے اور ایک روح ہے اسی طرح اعمال شرعیہ میں بھی ایک روح ہے۔اور جیسے وہاں صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آسکتی۔اسی طرح یہاں بھی ایک روح ہے جو دوسرے میں نہیں آسکتی۔

سو اب سمجھئے کہ سارے اعمال شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔مثلاً نماز سے عاجزی وانکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔روزے میں تزکیہ نفس کی صورت میں جہاد میں شجاعت کی صورت میں،صدقہ میں انفاق مال کی صورت میں،اور قربانی سے جان نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔اب اگر آپ نے قربانی کی بجائے نماز پڑھ لی،تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) نہ ملا پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس کو ثواب مل جائے گا مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز پڑھتا رہا اور روزہ نہ رکھا تو روزہ کا مطالبہ ہوگا۔اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ آپ نے ایک نوکر رکھا،جس کے سپرد کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کی خدمت سونپی۔اب اس نوکر نے یہ کیا کہ کھانا تو پکایا نہیں مگر گھر کو صاف کر کے آئینہ بنا دیا۔ہر چیز قرینے سے رکھ دی جھاڑ و بھی دی،فرش بھی دھویا،جالے بھی صاف کئے اب آپ جب گھر پہنچے اور دیکھا کہ ملازم نے گھر کو بہت صاف ستھرا کر رکھا ہے تو یقیناً آپ خوش ہوں گے مگر جب کھانے کے وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ اس

نے کھانا نہیں پکایا؟ تو کیا وہ ملازم جواب دے سکتا ہے کہ صاحب میں نے گھر تو صاف کر دیا۔ اب کھانے کا مطالبہ کیسا؟ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ یہاں جو کام تیرے سپرد کیا تھا وہ تو تو نے کیا نہیں اور ایک ایسا کام جو فی الجملہ اچھا ہے مگر تیرے سپرد نہ تھا۔ اس لئے تجھ کو یہ کام کھانا کھلانے کے بعد کرنا چاہئے تھا۔ اسی طرح صدقہ و خیرات تو عبادات نافلہ ہیں، مگر قربانی واجب ہے تو صدقہ دینے سے اس کا مطالبہ باقی رہے گا۔

حاصل یہ کہ آپ جو صورت اختیار کریں گے، اسی کی روح اس میں ڈالی جائے گی۔ جیسے انسان کی صورت میں انسان کی روح اور حیوان کی صورت میں حیوان کی پھر قربانی کی روح صدقہ میں کیونکر آ سکتی ہے؟ اسلئے قیامت میں ہر ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ مثلاً جو شخص مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں مکان ملتا ہے۔ روزہ دار کے لئے قیامت کے دن دستر خواں بچھایا جائے گا۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد ہے کہ: ''اِنَّـهٗ لَيَـاْتِـیْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا'' ① قیامت کے دن قربانی کے جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھالوں کے ساتھ موجود ہوگا۔

اس جگہ ان اجزاء کا ذکر ہے جن کو ہم بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ یعنی اس کے ردی اجزا پر بھی ثواب دیا جائے گا۔ تو جو اصلی چیز یعنی گوشت ہے اس پر کیوں نہ ملے؟ پھر آگے ارشاد ہے: ''وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا'' ② ''قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تم اس عمل کو کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرو''۔ تو مقبولیت کا درجہ بھی قربانی کے ساتھ خاص ہے۔

مسئلہ کا بیان تو ہو چکا مگر ایسے جزئی مسائل میں جو اجماعی چیزیں ہیں شبہ پیش آنا، انتہائی تنزل، اور انحطاط کی علامت ہے۔ اب تک تو علماء کو صرف اصول ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ مگر افسوس اب جزئیات و مسلمات کو بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ علماء کے ذمہ اس کا ثابت کرنا نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں مگر میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہماری یہی رفتار رہی تو کہاں تک جزئیات کو ثابت کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں مسلمات سے بھی رہنے دیجئے یہ تو نہ ہو کہ ہر چیز کی دلیل کی ضرورت پڑنے لگے۔ یہ انتہائی پستی اور تنزل کی دلیل ہے جس کی وجہ علم دین کی طرف سے لاپرواہی اور بے توجہی ہے جس کا علاج بجز اس کے کہ آپ لوگ علمِ دین حاصل کرنے کی طرف توجہ کریں، کچھ نہیں اور میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دوسرے علوم وفنون حاصل نہ کریں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کریں۔ تاکہ روزمرہ کے موٹے موٹے مسائل میں آپ کو شبہات پیش نہ آئیں اور آپ کو ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام نہ بنا سکے۔ بلکہ آپ کو خود بھی حق و باطل میں

---

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، ج: ۹ ص: ۲۶۱۔

② السنن للترمذي، ابواب الاضحية، باب ماجاء في فضل الاضحية، ج: ۵، ص: ۴۴۴۔

امتیاز کی تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔قرآن مجید کا ترجمہ بھی کسی سے تعلیم کے طور پر حاصل کریں،خود دیکھنے میں ہزاروں غلطیوں کا احتمال ہے۔

اگر آپ کو کسی مسئلہ میں شبہ ہواوراس کی وضاحت کی ضرورت ہوتو خود اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کرنے کی بجائے علماء کی طرف رجوع کیجئے کہ دین بالکل بے غبار ہے بشرطیکہ آپ سمجھنے کا قصد رکھتے ہوں اور آپ کی بحث کا پیرایہ تحقیقی وتعمیری ہو۔ہٹ دھرمی اور ضد کو اس میں ادنی بھی دخل نہ ہو۔اب میں بات ختم کرتا ہوں۔دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو شرور وفتن سے بچائے اور راہِ مستقیم پر قائم رکھے،اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہو۔

آمِيْنَ يَارَبَّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِالْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّدٍوَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ،بِرَحْمَتِكَ يَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

حقیقت نکاح

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

أَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ، إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ. ①

اَحوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! ابھی آپ کے سامنے نکاح کی تقریب انجام پائی ہے۔ اور اس میں اپنے عزیزوں میں سے ایک عزیز کا نکاح ہوا اس تقریب کا تقاضا یہ ہے کہ میں نکاح ہی کے سلسلہ میں کچھ کلمات گزارش کروں، جو نکاح کے ثمرات پر مشتمل ہوں۔ چونکہ موقع کے مناسب کوئی بیان ہوتا ہے، تو وہ نفع دیتا ہے۔ جو وقت کا تقاضا ہو۔ اسی کے مطابق بیان کیا جائے۔ گویا اس تقریب نے تقریر کا موضوع متعین کر دیا اسی موضوع کے سلسلہ میں کچھ بیان کیا جائے گا۔ اس وقت دو تین باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی حقیقت کیا ہے؟ دوسرے نکاح کی غرض وغایت، اور یہ کہ نکاح کے احکام کیا ہیں؟ یہ تین باتیں اس تقریر کا موضوع ہوں گی۔

دنیا جنت اور جہنم سے مرکّب ہے، تمہید...... ان تین باتوں کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی بات بطور تمہید کے سمجھ لیجئے پھر تینوں باتیں آسان ہو جائیں گی۔ وہ یہ کہ اس کائنات میں اللہ نے دو سلسلے پیدا کئے ہیں۔ ایک خیر کا سلسلہ ہے اور ایک شر کا ایک سلسلہ بھلائی، خوبی اور نیکی کا ہے اور ایک سلسلہ بدی، برائی اور شر کا ہے۔ ہر اصل کے مقابلے میں، جو اچھی اصل ہے، کوئی نہ کوئی اس کی ضد ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ دنیا اکہری نہیں ہے بلکہ بھلائی اور برائی دونوں سے مرکب ہے۔ جو خیر آپکے سامنے آئے گی، اس کے مقابلے میں کوئی شر ضرور ہوگی، جو اس کی ضد کہلائے گی۔ اگر اللہ نے دنیا میں اسلام پیدا کیا، تو مقابلے میں کفر بھی پیدا کیا۔ اگر دنیا میں سچ آیا تو مقابلے میں جھوٹ بھی آیا! اگر نور دنیا میں لایا گیا، تو مقابلے میں ظلمت بھی لائی گئی۔ اگر تقویٰ وطہارت لایا گیا تو

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

مقابلے میں فسق و فجور بھی لایا گیا۔غرض ہر چیز کی اصل کے مقابلے میں کوئی ضد ضرور ہے۔اگر دن لایا گیا، تو مقابلے میں رات لائی گئی۔ یہ ایک سلسلہ ہے خیر وشر کا۔اگر آپ کو محض خیر کی تلاش ہو، جہاں برائی کا نشان نہ ہو، وہ جنت کا عالم ہے اور جہاں خیر اور بھلائی کا نشان نہ ہو تو وہ جہنم کا عالم ہے کہ وہاں سوائے برائی، اور کدورت اور تکلیف کے کچھ نہیں۔ دنیا کو اللہ نے جنت اور جہنم سے مرکب بنا دیا ہے، کہ کچھ خیر جنت سے لائی گئی اور کچھ شر جہنم سے لائی گئی دونوں سے ملا کر ایک عالم بنا دیا گیا، جس کا نام دنیا ہے۔اس لئے یہاں خیر بھی ہے شر بھی اور نیکی بھی ہے، بدی بھی برائی بھی ہے بھلائی بھی۔اسلام بھی ہے ظلمت بھی ہر اصل کے مقابلے میں ایک ضد لگی ہوئی ہے۔

عالم غیب میں خیر وشر کا سلسلہ......اس کائنات میں اوپر سے لے کر نیچے تک یہی سلسلہ ہے۔غیب کو دیکھا جائے۔یعنی وہ مخلوق جو آنکھوں سے اوجھل ہے، وہاں بھی یہ دونوں سلسلے ہیں ایک طرف ملائکہ علیہم السلام ہیں جو خیر محض ہیں۔ان کے مقابلے میں شیاطین ہیں، جو شر محض ہیں۔ملائکہ ہر بات میں خیر کی طرف چلتے ہیں، شیاطین ہر معاملے میں شر کی طرف چلتے ہیں۔ملائکہ کے لئے فرمایا گیا: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾ ①

یہ اللہ کے پاکباز اور مکرم بندے ہیں. ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ ② ان کا شیوہ یہ ہے کہ اللہ کی ذرہ برابر نافرمانی یا عصیان کا کوئی شائبہ تک ان میں نہیں، سوائے اطاعت، پاکیزگی اور برگزیدگی کے تو ان کو کہا گیا "لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ "عصیان کا نشان نہیں۔اور شیاطین کو کہا گیا ﴿وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ ③ "شیطان کا کام ہی کفر کرنا اور کفران نعمت ہے۔

ملائکہ علیہم السلام جہاں ہوں گے، خوشبو کی طرف دوڑیں گے۔شیاطین جہاں ہوں گے بدبو کی طرف دوڑیں گے۔حدیث میں ہے کہ مساجد اور ذکر اللہ کی مجالس میں، ملائکہ علیہم السلام کا ہجوم ہوتا ہے۔جتنی کوڑیاں اور گندگی کی جگہیں ہیں، وہاں شیاطین کا ہجوم ہوتا ہے۔انہیں وہ پسند ہے۔یہ خیر کی طرف جاتے ہیں۔وہ شر کی طرف جاتے ہیں۔ ④ ملائکہ کا کام کیا ہے؟ ہر مخلوق کی خیر خواہی کرنا' ہر ایک کے لئے دعا کرنا، ہر ایک کے لئے بھلائی چاہنا شیاطین کا کام ہے، ہر ایک کی برائی چاہنا، ہر ایک کو ایذا پہنچانا۔ہر ایک کے لئے تکلیف کا سامان کرنا۔ملائکہ علیہم السلام کی شان قرآن کریم میں فرمائی گئی کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ⑤ جو ملائکہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، ان سے زیادہ مقرب کون ہوگا؟ وہ اتنے نزدیک ہیں حق تعالیٰ کے کہ ملائکہ میں سے کسی کو اتنا قرب حق تعالیٰ کا میسر نہیں ہے۔اور جو ان کے ارد گرد اربوں کھربوں ملائکہ ہیں۔ان کا کام کیا ہے؟ ﴿يُسَبِّحُوْنَهٗ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ

---

① پارہ:۱۷،سورۃ الانبیاء،الآیۃ:۲۶،۲۷ ② پارہ:۲۸،سورۃ التحریم،الآیۃ:۶. ③ پارہ:۱۵،سورۃ الاسراء،الآیۃ:۲۷.

④ تفسیر ابن ابی حاتم،ج:۱۱،ص:۴۴۷. ⑤ پارہ:۲۴،سورۃ المؤمن،الآیۃ:۷.

بِہٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ① حق تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور زمین والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہماری اولادوں کے لئے، ہماری بیویوں کے لئے، اہل وعیال کے لئے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ! ان کے لئے دنیا میں آخرت میں بھلائی دے۔ یہ ان کا کام ہے۔

اور شیاطین نے کیا کیا؟ سب سے پہلے بڑے شیطان نے اللہ ہی کے سامنے کہا کہ: ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ﴾ ② تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ایک انسان کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ ایک ایک انسان کو بھٹکا کے رہوں گا۔ کبھی خیر پر نہیں آنے دوں گا۔

حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں، تیرے ایک ایک تبع کو جہنم میں ڈال کے رہوں گا' اور جہنم کو بھر دوں گا۔ تو ملائکہ کہتے ہیں یا اللہ! سب کو بھیج جنت میں، خیر ان کے لئے پیدا کر۔ شیطان کہتا ہے کہ میں گمراہ کروں گا، تاکہ ایک ایک کو جہنمی بنا کے چھوڑوں۔ تو وہ انتہائی خیر خواہ یہ انتہائی بدخواہ۔ وہ نیکی کی طرف لاتے ہیں، یہ بدی کی طرف۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اور بائیں جانب شیطان بیٹھا ہوا ہے۔ فرشتہ کا کام کیا ہے؟ خیر کا راستہ دکھلاتا ہے، قلب میں خیال ڈالتا ہے کہ یہ بھی نیکی کر لے یہ بھی نیکی کر لے۔ شیطان کہتا ہے، یہ بھی بدی کر، یہ بھی بدی کر۔ اس میں بڑی لذت ہے۔ زنا کاری کر، اس میں بڑا لطف آئے گا۔ چوری کر، اس میں مال بڑھ جائے گا۔ یہ بدی کو مزین اور آراستہ کر کے پیش کرتا ہے، تاکہ انسان دل لبھادے اور مبتلا ہو جائے۔ فرشتہ نیکی کا راستہ دکھلاتا ہے کہ گناہ میں لذت تو آجائے گی، مگر انجام کو سوچ لے کہ جہنم بھی بھگتنا پڑے گا۔ معصیت کے اندر نفس کو نہایت لذت آتی ہے، مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ اس کے بعد قلق، کدورت اور تشویش پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں نفرت بڑھتی ہے۔ نیکی کرنے میں ابتداء تکلیف ہوتی ہے۔ مگر انجام کار قلب میں راحت، سکون، بشاشت اور ایک نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ تو فرشتہ خیر کی راہ دکھلاتا ہے۔ اور شیطان شر کی راہ دکھلاتا ہے۔ فرشتہ نیکی کے خطرات ڈالتا ہے۔ اور یہ بدی کے وساوس ڈالتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا، یہ جو بعض اوقات انسان کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ کبھی تو جی چاہتا ہے، کہ لاؤ نیکی کر لوں اور کبھی سستی آتی ہے کہ دیکھی جائے گی۔ کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ تہجد پڑھ لوں۔ پھر خیال آیا کہ رات کا اخیر ہے، بڑی میٹھی نیند ہے، کون پڑھے، کل کو دیکھی جائے گی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر یہ فرشتے اور شیطان کی جنگ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان ڈانواں ڈول ہوتا ہے۔ جو غالب آجائے، وہی انسان کر گزرتا ہے۔ ادھر ہی کو طبیعت مائل ہو جاتی ہے۔

شیطان کے کہنے سے نیکی بھی درست نہیں......اسی واسطے فرمایا گیا: کہ شیطان انسان کا انتہائی دشمن

① پارہ: ۲۴ سورۃ الغافر، الآیۃ: ۷۔ ② پارہ: ۲۳ سورۃ ص: الآیۃ: ۸۲۔

ہے۔اس کے کہنے سے نیکی بھی مت کرو۔نیکی اپنے ضمیر کے تقاضے سے کرو۔وہ اگر یوں بھی کہے کہ نماز پڑھ لو۔ سمجھو کہ اس میں بھی کوئی مکاری اور شر پوشیدہ ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سو رہے تھے۔اتفاق سے شیطان نے وسوسے ڈالے۔بہرحال نبی اور معصوم تو نہیں تھے۔حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ابتلاء ہوسکتا ہے۔تو اس کی کچھ حرکت اور تصرف سے ان کا تہجد قضا ہوگیا۔شیطان بہت خوش ہوا کہ ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کا تہجد قضا کرادیا۔فرض تو چھڑا نہیں سکتا تھا۔صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔نفل چھوٹ سکتی تھی، وہ چھوٹ گئی۔مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اتنا صدمہ گزرا کہ برسوں کا میرا معمول چھوٹ گیا۔سارے دن روئے، استغفار کیا، بیسیوں نفلیں پڑھیں توبہ کی۔اگلا دن جب ہوا، تو ارادہ کرکے سوئے کہ آج اِنشاء اللہ ضرور اٹھوں گا۔اور آج میرے اوپر نیند کا غلبہ نہیں ہونا چاہئے۔

ابھی اٹھنے نہیں پائے تھے۔ایک شخص نے آکر پیر ہلایا کہ امیر معاویہ! اٹھیئے اٹھیئے تہجد کا وقت آگیا۔انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، کہ میرے اٹھانے کے لئے میرے محل سرائے میں رات کے وقت کون اجنبی آیا؟ ہاتھ پکڑا تو معلوم ہوا یہ شیطان ہے۔وہ بھی صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔قوی الایمان ہیں۔فرمایا۔مردود تو یہاں کیوں آیا؟ اس نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی پیش نظر تھی۔کل آپ کا تہجد قضا ہوگیا تھا۔میں نے کہا آج میں ہی جا کے اٹھادوں۔آپ کو تکلیف دی تھی۔کہا۔منحوس! تو؟ اور خیر خواہی؟ اللہ نے کہا ہے کہ: ﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① شیطان تمہارا ازلی دشمن ہے، اسے دشمن ہی سمجھو یہ مت سمجھنا کہ دوست ہے۔تو اور دوستی کرے اور خیر خواہی کرے۔سچ سچ بتلا، تو نے مجھے نماز کے لئے کیوں اٹھایا، کوئی مکاری اس میں ضرور پوشیدہ ہے، کوئی اس میں شر ہے۔کہا کہ نہیں خیر خواہی پیش نظر تھی۔فرمایا کہ تو اور خیر خواہی؟ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔اللہ نے کہہ دیا کہ تو دشمن ہے، یہ ممکن نہیں کہ تو دوستی کرے۔

میں بھی صحابی ہوں۔روحانیت میری بھی قوی ہے۔آج میں تجھے انتہائی طور پر پکڑ کے پیٹوں گا، ورنہ بتا اصلیت کیا ہے؟ ہاتھ پکڑا ہوا ہے چھوٹتا نہیں۔وہ اگر مزاج کا لطیف تھا۔تو یہ روحانیت کے لحاظ سے قوی تھے، ان میں بھی لطافت تھی۔کوئی ہم جیسا ہوتا، شیطان کبھی کا دھکا دے کے بھاگ بھی جاتا۔تب وہ بات کھلی۔

اس نے کہا اصل قصہ یہ ہے کہ کل میں نے کچھ تصرف کیا تو آپ کا تہجد قضا ہوگیا۔آپ نے توبہ کی، استغفار کیا۔پچاسوں نفلیں پڑھیں تو اتنا ثواب ملا کہ تہجد کا بھی اتنا نہیں تھا۔میں نے کہا لاؤ اٹھادوں کہ ثواب تو تھوڑا ہوجائے۔دن بھر محنت کریں گے، پچاس رکعتوں کی بجائے یہ چار رکعات ہی سہی فرمایا۔اب بات تو نے ٹھیک کہی، پھر اس کو چھوڑ دیا، کہ دور ہو ملعون تجھ پر لعنت تو شیطان خیر خواہی کبھی نہیں کرسکتا وہ ہمیشہ بدخواہی کرتا ہے۔وہ اگر خیر کا راستہ بھی دکھائے۔اس میں بھی کوئی نہ کوئی شر ہوگی۔اس کے کہنے سے خیر بھی نہیں کرنی چاہئے۔جب دل میں اور

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۶۔

ضمیر میں آ جائے۔ تبھی آدمی کرے۔ تو ملائکہ علیہم السلام انتہائی خیر خواہ ہیں، اور شیاطین انتہائی بدخواہ ہیں۔ تو غیب کا عالَم ہے۔ دونوں سلسلے وہاں بھی قائم ہیں۔ ایک خیر کا، وہ ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ اور ایک شر کا، وہ شیاطین ہیں۔

دنیا میں خیر و شر کا سلسلہ...... دنیا میں آنے کے بعد یہ سلسلہ یہاں بھی قائم ہے۔ انسانوں میں مقدس ترین طبقہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جو خیر محض ہیں۔ ان میں شر کا نشان نہیں ہے۔ ہر چیز میں بھلائی، ہر چیز میں خیر اور ہر انسان کے خیر خواہ۔ اور اس درجہ خیر خواہ کہ بعض اوقات حق تعالیٰ کو روکنا پڑتا ہے کہ اس درجہ خیر خواہی بھی مت کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں۔ آپ ہدایت فرماتے، کوئی ہدایت کو نہ مانتا، تو بیٹھ کر گھٹتے، محبت اور مخلوق کی خیر خواہی کی وجہ سے قلب مبارک کو تکلیف پہنچتی۔ کہ کیوں نہیں یہ سیدھے راستے پر آتے، کیوں برائی کے راستے پر چل رہے ہیں؟ کیوں تھوڑی سی لذت کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں انہیں سمجھ اور عقل آتی۔ تو جب نہیں مانتے تھے تو آپ گھٹتے تھے۔ حق تعالیٰ نے روکا ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ ① کیا ان کی ہدایت کی طمع میں آپ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کر دی، نہیں کوئی مانتا تو جائے جہنم میں۔ آپ اس میں کیوں مبتلا ہیں کہ قلب میں ضیق اور گھٹن ہے۔ تو روکنے کی نوبت آئی، اس لئے کہ خیر خواہی انتہائی درجہ کی تھی۔ ہر ایک کے لئے چاہتے تھے کہ ایماندار بن جائے۔ اس لئے جو خلاف کرتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچتی تھی۔ تو انبیاء علیہم السلام خیر محض ہیں۔ انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ اور محبت ہی دنیا میں پھیلاتے ہیں۔

دنیا میں جو انبیاء علیہم السلام کے مقابل ہیں۔ وہ دجال کہلاتے ہیں۔ ہر نبی علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی دجال آیا۔ اور انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں دجال آئے۔ انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا دجل کے معنی ہی یہ ہیں کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ آدمی تلبیس پیدا کرے۔ دعویٰ نبوت کا اور اندر سے کفر بھرا ہو۔ یوں تلبیس کر کے دنیا کو کفر پر لاتے تھے۔ تو نبی کا ٹھیک مقابلہ دجال سے ہوتا ہے۔ نبی خیر محض اور دجال شر محض ہے۔ ہر نبی کے مقابلے میں ایک نہ ایک دجال لایا گیا ہے کہ نبی مخلوق کو خیر کی طرف لائے، اور دجال، شر کی طرف لائے۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور نبوت، علم اور ایمان کا کمال، غرض سارے مراتب نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو چکے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الایمان نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الہدایت نہیں ہے۔ سارے مراتب خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ختم ہیں۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں کہ نبوت کا ہر درجہ اور مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر آ کر ختم ہو گیا۔ اسی لئے آپ کی امت میں جو دجال آئے گا، وہ اتنا بڑا دجال ہو گا کہ کوئی دجال ایسا نہیں گزرا ہو گا۔ اس لئے کہ اتنے بڑے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو اتنا ہی بڑا دجل و فریب ہونا

① پارہ: ۱۹ سورة الشعراء، الآية: ۳.

چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اور دجالوں نے نبوت کے دعوے کئے۔ اسلام میں جو اخیر میں دجال آئے گا، وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ اس پر شر کے مراتب ختم ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی پشت مبارک پر مہر نبوت تھی، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی علامت تھی، اور اس پر لکھا ہوا تھا: سِرْ حَیْثُ شِئْتَ فَاِنَّکَ مَنْصُوْرٌ جہاں بھی جاؤ، خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ خیر تمہارے ساتھ ہے۔ خیر کے مراتب تم پر ختم ہیں۔ تو آپ کے لئے مہر نبوت تھی۔ جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیر مجسم ہیں۔ دجال کی پیشانی پر کفر لکھا ہوا ہوگا "ک، ف، ر" تو یہ کفر مجسم ہے۔ وہاں کفر کے مراتب ختم۔ تو انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ دجالوں سے ہے۔ انبیاء خیر و محبت لیکر آتے ہیں۔ دجال عداوت اور شر لے کر آتے ہیں۔ تو وہاں ملائکہ اور شیاطین کا مقابلہ تھا، یہاں انبیاء اور دجالوں کا مقابلہ ہے۔

انبیاء کے ماننے والوں میں جو اعلیٰ مقام پر پہنچتے ہیں۔ انہیں امام کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ ① ہم نے لوگوں کو امام بنایا وہ خیر کے راستے کی ہدایت کرتے ہیں"۔ دجالوں کے جو اعلیٰ ترین متبع ہیں، ان کو آئمۃ الکفر کہا گیا ہے ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ ② "ہم نے ایسے امام بنائے، جو جہنم کی دعوت دیتے ہیں۔ لوگوں کو آگ کی طرف لے جاتے ہیں"۔

یہ امام شر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام خیر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام ایمان کے ہیں یہ امام کفر کے ہیں۔ پھر ان آئمہ کے متبع ہیں۔ ائمہ ہدایت کے جو متبع ہیں، ان کا لقب "اولیاءُ الرّحمٰن" ہے۔ اور ائمۂ کفر کے جو متبع ہیں، ان کا لقب "اولیاءُ الشیطٰن" ہے۔ ایک "حزب اللّٰہ" ہے، اور ایک "حزب الشیطان" ہے۔ ایک کے لئے کہا گیا ہے۔ ﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ③ اللہ ہی کے لشکر کو انجام کار فلاح نصیب ہوگی۔ ادھر کہا گیا: ﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ④ شیاطین کے جو لشکر ہیں، وہ انجام کار گھاٹے، خسارے اور ٹوٹے میں رہیں گے۔ غرض اوپر سے لے کر نیچے تک دو سلسلے ہیں۔ ایک خیر کا، ایک شر کا۔ ادھر ملائکہ، ادھر شیاطین ادھر انبیاء، ادھر دجال، ادھر ائمۃ الایمان، ادھر ائمۃ الکفر۔ ادھر اولیاء الرحمٰن، ادھر اولیاء الشیطان یہ دو متضاد سلسلے دنیا میں چلے آرہے ہیں۔

خیر و شر کے سلسلوں کے کام...... اس خیر کے سلسلہ کا کام کیا ہے؟ یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ جو بچھڑ جاتے ہیں، ان کو ملاتا ہے۔ جن میں عدوات ہو، ان میں محبتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن میں لڑائی ہو، ان میں صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ملائکہ انبیاء اور اولیاء الرحمٰن کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا بس ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائے۔ سب کے قلوب ایک بن جائیں، سب ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے سے

① پارہ: ۲۱، سورۃ السجدۃ، الآیۃ: ۲۴. ② پارہ: ۲۰ سورۃ القصص، الآیۃ: ۴۱.
③ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۲۲. ④ پارہ: ۲۸، سورۃ المجادلۃ، الآیۃ: ۱۹.

ملیں، ایک دوسرے کی خیر خواہی میں غرق ہو جائیں۔ شیاطین، دجالوں اور آئمۃ الکفر کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ جو جڑے ہوئے ہیں، ان میں عداوتیں پھیل جائیں۔ جو ایک دوسرے کی خیر خواہی کر رہے ہیں وہ ایک دوسرے کی بد خواہی میں لگ جائیں۔ ہر ایک دوسرے کے راستے میں کانٹے بچھائے، ہر ایک دوسرے کو ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کرے۔ دنیا میں فتنہ و فساد پھیلے۔ یہ دجالوں کا شیاطین کا اور آئمۃ الکفر کا تقاضا و مقتضیٰ ہے تو انبیاء محبتیں پیدا کرانے، اور دجال عداوتیں پیدا کرانے کے لئے آئے ہیں۔

انبیاء کا کام یہ ہے کہ جو بندے خدا سے بچھڑ جائیں، انہیں خدا سے ملا دیں۔ جو آپس میں بچھڑ جائیں۔ انہیں آپس میں ملا دیں۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ بندے خدا سے بھی ٹوٹ جائیں۔ بندے بندوں سے بھی آپس میں ٹوٹ جائیں۔ بھائی بھائی میں لڑائی ہو۔ گھر گھر میں فساد ہو۔ اس واسطے جتنے سلسلے محبتیں اور اتحاد کے ہیں، انبیاء علیہم السلام ان کے حامل ہیں۔ اور جتنے سلسلے لڑائی، فتنے اور دنگے فساد کے ہیں، شیاطین ان کے حامل ہیں۔

انسانوں کو ملانے والا سب سے بڑا سلسلہ..... سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو ملانے والا نکاح کا سلسلہ ہے، جس سے دو اجنبی جڑ جاتے ہیں، جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافع مشترک، اِتحاد باہمی اور خاندانی اشتراک سے ایسی محبت ہو جاتی ہے۔ ایسی مودت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگانے کا سلسلہ ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سلسلے کے حامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ." ① "فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ." ② "نکاح میری سنت ہے، جو اس سے بھاگے گا، گریز کرے گا۔ وہ میری جماعت سے خارج ہے"۔ وہ میری جماعت میں شامل نہیں۔ اس واسطے کہ نکاح اتحاد کا ذریعہ ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وحدت و محبت باہمی پیدا ہو۔

شیاطین اس کے حامل ہیں کہ یا نکاح ہونے نہ پائے، یا ہو کر ٹوٹ جائے، ایسی تفریق ان میں پڑے کہ نکاح ٹوٹ جائے، کہیں طلاق ہو جائے، آپس میں پھوٹ پڑ جائے، وہ یہ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ طلاق اگرچہ جائز ہے، اور مجبوری کے وقت میں اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک جائز ہو کر بھی اس سے بغض ہے۔

ارشاد ہے: "أَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَاللهِ الطَّلَاقُ" ③ وہ چیز جو جائز ہے، پھر اللہ کو اس سے عداوت اور بغض ہے، وہ طلاق ہے۔ اس لئے کہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، جس سے لوگ بچھڑ جائیں گے، عداوتیں

---

① السنن لابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، ج:٥، ص:٤٣٩. حدیث صحیح ہے، دیکھئے: صحيح وضعيف سنن ابن ماجه ج:٤ص:٣٤٦، رقم:١٨٤٦. ② الصحيح للبخارى، كتاب النكاح، باب الترغيب فى النكاح، ج:١٥، ص:٤٩٣. ③ السنن لابى داؤد، كتاب الطلاق، باب فى كراهية الطلاق، ج:٦ ص:٩١.

پیدا ہوں گی اور یہ انبیاء کے موضوع کے خلاف ہے۔ اس لئے انبیاء نکاح سے محبت رکھتے ہیں۔ شیاطین طلاق سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ ورسول کے نزدیک طلاق مبغوض ہے۔ مجبوری کی بات الگ ہے مگر مبغوض ہے۔ نکاح کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ''اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ.'' اور یہ نہیں کہا گیا کہ 'اَلطَّلَاقُ مِنْ سُنَّتِيْ.'' طلاق میری سنت ہے۔ یہ تو مجبوری کی چیز ہے، کوئی عاجز آ جائے، ایسے وقت میں اجازت دی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ چونکہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے، اول تو اس سے بغض کیا گیا اور پھر اس کی تقسیم کی گئی۔ وہ یہ ایک طلاق سنت ہے، اور ایک طلاق بدعت۔ طلاق سنت یہ ہے کہ آدمی تین طلاق ایک دفعہ میں نہ دے۔ الگ الگ دے۔ اس لئے ہر طلاق کے بعد موقع رہتا ہے کہ پھر رجوع کرے۔ نکاح کی ضرورت نہ پڑے۔ تو سنت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ مجبوری یا ضرورت پیش آئے۔ تینوں طلاقیں ایک دم ہاتھ سے نہ نکالے، پھر وہ بائنہ ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈرانے دھمکانے کی خاطر دینا ہی ہے تو ایک دے۔ تاکہ چار مہینے اور دس دن جو عدت ہے، اس میں پھر آدمی کو رجوع کا حق رہے۔ اس کے بعد بھی اگر نوبت آئی، پھر ایک اور دے دے۔ پھر تین چار مہینے موقع رہے گا کہ پھر رجوع کرے اور تین طلاق ایک دم ختم کر دیں، سارے تیر ترکش سے نکال دیئے۔ آگے رجوع کا کوئی موقع نہیں۔ اکٹھی تینوں دے دنیا، اسے طلاق بدعت کہا گیا ہے اور طلاق سنت یہ ہے کہ ایک ایک کر کے دے۔ تاکہ رجوع کرنے کا موقع رہے۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام ہر ایسے طریق کو چاہتے ہیں، جس سے رشتہ جڑا رہے۔ یہ تعلق قائم رہے۔ اس لئے کہ یہ اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے۔

عورت کے ذریعے خاندانوں میں محبت قائم ہوتی ہے...... ایک اور دو کے اتحاد کا ذریعہ نہیں کہ خاوند اور بیوی مل جائیں۔ ایسی بات ہے کہ جب خاوند بیوی آپس میں ملیں گے، تو خاوند کے عزیز، بیوی کے عزیزوں سے، اور بیوی کے عزیز، خاوند کے عزیزوں سے ملیں گے۔ یہ دو کا ملنا نہیں ہے۔ یہ کئی کا ملنا ہے۔ یہ دو خاندانوں کا ملنا ہے، دو خاندانوں کا آپس میں جڑ جانا ہے۔ پھر حقوق قائم ہو جاتے ہیں۔ محبتیں ہو جاتی ہیں۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمائے۔ اور نو ازواج مطہرات ہوئی ہیں۔ ان کی مصلحت یہی تھی کہ ان خاندانوں سے جوڑ لگایا جائے۔ جن کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کے لئے کام لینا تھا۔ جب خاندانوں میں نکاح ہو گیا، وہ مربوط ہو گئے۔ ٹوٹ نہیں سکتے تھے۔ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین میں کام لیا، ان نکاحوں کی برکت سے قبیلے اسلام میں داخل ہوئے۔ اس لئے کہ عرب میں اس کی بڑی رعایت کی جاتی تھی کہ جہاں سلسلہ ورشتہ دامادی کا قائم ہو گیا، وہ کئی کئی پشتوں تک اس کی رعایت کرتے تھے اور ان حقوق کو مانتے تھے۔

جب مصر فتح ہوا تو مصر سے جو قیدی پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جو زوجہ مطہرہ ہیں۔ وہ مصر سے پکڑی ہوئی آئی تھیں۔ آ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرما لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دیکھو مصر سے سسرال کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کی

رعایت کرنا پوری امت پر حق عائد کر دیا کہ مصر والوں کی رعایت کرو۔ کیونکہ وہ میری سسرال بن گئی۔ یہ جو داماد اور سُسر کا رشتہ ہے یہ گویا اتنا لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ خاندان اس سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ عزیز نکاح کا تعلق ہے۔ حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثٌ" ① تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں"۔

ان میں سے ایک چیز فرمائی کہ وہ عورت ہے۔ عورت کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ وہ معاذ اللہ شہوت رانی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تعلق ومحبت کے قائم ہونے کا ذریعہ ہے۔ محبتیں عورت کے راستے سے قائم ہوتی ہیں۔ مرد تو اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی دکان پر، کوئی دفتر میں، کوئی کھیتی باڑی میں۔ یہ جو رشتہ داریاں جڑتی ہیں، اور حقوق ادا ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ عورتوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں۔ اگر عورت بدسلیقہ ہو، وہ توڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے اندر سلیقہ ہو، خاندانوں کو ملا دیتی ہے۔ محلِ محبت فی الحقیقت عورت ہے۔ اس لئے کہ اسی سے محبتوں کے اگلے سلسلے چلتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثٌ" ② تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ اس میں سے خوشبو کو پسند فرمایا۔ نماز کو پسند فرمایا، اور عورت کو پسند فرمایا۔ اسواسطے کہ خوشبو لگے گی، تو ملائکہ کا ہجوم ہو جائے گا۔ یہ بھی محبت باہمی کا ذریعہ بن جائے گی۔ عورت آئے گی، یہ بھی خاندانوں کے جڑ جانے کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس سے بھی محبت واتحاد قائم ہوا۔ تو نکاح کی بڑی غرض وغایت وحدت باہمی اور سکون باہمی ہے۔

نکاح کی غرض وغایت...... یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جو نکاح کی غرض وغایت ذکر کی گئی، وہ سکون باہمی ذکر کی گئی ہے۔ لیکن نسل بڑھنا، یہ تو طبعی طور پر بڑھے گی۔ غرض وغایت اصلی جو ہے وہ یہ ہے۔ ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ③ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑی جوڑا نکال دیا۔ مرد میں سے عورت نکال دی، عورت میں سے مرد نکال دیا۔ ورنہ دونوں سلسلے الگ الگ ہیں۔ مرد میں سے اگر کوئی نکلتا تو مرد ہی نکلتا۔ عورت میں سے عورت نکلتی۔ اس قدر عجیب قدرت صناعی ہے کہ مرد میں سے عورت نکال دی۔ اور عورت میں سے مرد کو پیدا کیا۔ فرمایا کہ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا۔ اگر عورت انسانوں کی جنس میں سے نہ ہوتی، فرشتوں میں سے یا جنات میں سے ہوتی، کبھی باہمی محبت قائم نہ

① جامع العلوم والحکم، ص: ۳۰. ② الحدیث اخرجه الامام البیهقی فی سنة الکبریٰ وقال: لفظ حدیث علی وفی روایة موسی قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: حبب الی من الدنیا (تابعه یسار بن حاتم عن جعفر بن سلیمان عن ثابت عن انس) وری ذالک جماعة من الضعفاء عن ثابت والله اعلم، دیکھئے: السنن الکبریٰ للبیهقی ج:۷ ص:۷۸
③ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیة: ۲۱.

ہوتی۔دوسری جنس کے ساتھ میلان ہی نہیں ہوتا۔جانوروں میں ہر طبقے میں ہزاروں مادائیں ہیں۔شیر ہے تو شیرنی بھی ہے۔بھیڑیا ہے تو اس کی مادہ بھی ہے۔انسانوں کا کبھی رجوع نہیں ہوتا ہے۔اس لئے کہ غیر جنس ہے کبھی میلان نہیں۔اپنی جنس کی طرف میلان ہوتا ہے۔اس لئے فرمایا کہ ہماری قدرت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا،تمہاری جنس میں سے ایک تمہارے اندر میں سے،تا کہ تمہارا جب جٹ بنے تو تمہارے میں محبت قائم ہو۔اگر غیر جنس کا جوڑا ملا دیتے۔جنی عورت بنا دیتے،تمہارا رابطہ کبھی نہ ہوتا۔وہ مقصد اور موضوع ختم ہوجاتا ہے تو۔﴿أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ ① تم میں سے تمہارے نفسوں میں سے پیدا کیا۔﴿أَزْوَاجًا﴾ تمہارے جوڑوں کو۔کیوں پیدا کیا؟ ﴿لِتَسْكُنُوْٓا إِلَيْهَا﴾ تا کہ تم اس سے سکون حاصل کرو۔﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ اور تم خاوند بیوی میں محبت اور مودت پیدا ہو۔تم ایک دوسرے کے خیر خواہ بنو۔ایک دوسرے میں تم میں محبت پیدا ہو۔اس لئے ہم نے جوڑا بنایا اور فرمایا: ﴿إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ② جو لوگ فکر رکھتے ہیں،وہ اس چیز کی قدر کریں گے،جو ہم کہہ رہے ہیں۔جو بے فکر ہیں،عقل ہی نہیں رکھتے،انہیں کیا خبر ہوگی کہ اس میں کیا مصلحت ہے؟ لیکن جب تم زندگی گزاروگے،اور اس مقام پر آؤگے۔تمہیں قدر آئے گی کہ ہم نے تم کو کتنی بڑی نعمت دی ہے۔جو تمہارا جوڑا تم میں سے پیدا کیا۔تا کہ تم میں سکون پیدا ہو۔

نکاح اللہ کی قدرت کی نشانی بھی ہے...... نکاح کو آیت کہا گیا ہے۔آیت قدرت کی نشانی کو کہتے ہیں۔کہ خدا ہی کر سکے،دوسرا نہ کر سکے۔اسے آیت کہتے ہیں۔جیسے قرآن کریم کی آیتیں ہیں۔آیت کرسی ہے،آیتِ استخلاف ہے،آیت الرحمٰن ہے،آیت رحمت ہے۔یہ اللہ کی آیتیں اور قدرت کی نشانیاں ہیں۔کوئی دوسرا ایسا کلام نہیں لاسکتا۔اسی طرح سے اس کے افعال میں بھی کچھ آیتیں ہیں فرمایا۔﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنٰهَا﴾ ③ . یہ ہماری آیتوں میں سے ہے کہ زمین ہم ہی بناسکتے ہیں،کوئی دوسرا نہیں زمین مردہ ہوجاتی ہے، بارش برسا کے ہم اسے دوبارہ زندہ کردیتے ہیں۔کہیں فرمایا: إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَا يَنْخَسِفَانِ مِنْ مَّوْتِ أَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ ④ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی آیتوں میں سے دو آیتیں ہیں، جیسے قرآن کی آیت کا جواب نہیں۔ان آیتوں کا بھی جواب نہیں کہ اس جیسا کوئی سورج بنادے۔چاند جیسا چاند بنا دے۔تو زمین سورج اور چاند کو بھی آیت کہا اور فرمایا: ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ﴾ ⑤ یہ جورات ہے یہ ہماری قدرت کی نشانی اور آیت ہے اسی کے اندر سے جب ہم کھینچتے ہیں،تو دن نکل آتا ہے۔اندھیروں میں سے چاند نکل آتا ہے۔ابھی دنیا پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔کہیں نور کا نشان نہیں تھا۔انسانوں نے محنت کر کے مصنوعی انڈے، قمقمے لاکھوں چلائے چاندنا تو ہوگیا۔مگر رات بدستور رہی۔دن نہیں نکلا ہماری قدرت دیکھو۔جب دن نکالنا چاہتے

---

① پارہ: ۲۱،سورۃالروم،الآیۃ: ۲۱۔ ② پارہ: ۲۱،سورۃالروم،الآیۃ: ۲۱۔ ③ پارہ: ۲۳ سورۃ یٰس،الآیۃ: ۳۳۔

④ الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ،باب صلوۃالکسوف،ج: ۴،ص: ۴۴۲۔ ⑤ پارہ: ۲۳ سورۃ یٰس،الآیۃ: ۳۷۔

ہیں۔بس سورج کی آمد آمد ہوئی، اور رات غائب ہوئی یا تو دنیا پر ظلمت چھائی ہوئی تھی یا ایک دم چاند نے کی حکومت قائم ہوگئی۔ایک دم عالم میں نور پھیل گیا۔یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے۔

اسی طرح سے قدرت کی نشانی نکاح کو بھی کہا گیا ہے آپ کہیں گے نکاح میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ دو مرد عورت کا نکاح کر دیا۔اس میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ کہ اللہ ہی بنا سکتا ہے اور کوئی نہیں تو نکاح میں آیت ہونے کی کیا شان ہے؟ خطیب نے خطبہ پڑھ دیا۔مولانا انصاری صاحب نے بڑا عمدہ خطبہ پڑھا، ایجاب و قبول ہوگیا۔اس میں قدرت کی نشانی کیا ہے؟

اس میں قدرت کی نشانی یہ ہے کہ دو بول پڑھے جانے سے پہلے مرد کو عورت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔بالکل ایک اجنبیت تھی۔اگر رشتہ داری بھی ہوگی، تو رشتہ داریاں ہزاروں سے ہوتی ہیں، لیکن یہ کہ اس مرد کے قلب کا لگاؤ اس عورت سے تھا، قطعاً نہیں یا اس عورت کا لگاؤ مرد سے تھا، قطعاً نہیں۔وہ بالکل اجنبی، یہ بالکل اجنبی، اس کا دل اس سے بیگانہ، اس کا دل اس سے لیکن جہاں چار حروف پڑھے گئے، ایجاب و قبول ہوا۔ایک دم انقلاب پیدا ہوا۔ اب اس مرد کے دل کا تعلق اس عورت سے قائم ہوا۔ایسے وقت اگر یہ خبر آئے کہ میری بیوی کو تکلیف ہے، اسے دکھ پہنچے گا۔اگر اسے پہلے خبر پہنچتی تو کہتا ہزاروں عورتیں تکلیف میں ہوں گی۔لیکن چار حرف پڑھے گئے، اور قلب کا رابطہ قائم ہوگیا۔عورت کو اگر اطلاع ہو جائے کہ جس سے میرا نکاح ہوا ہے خدانخواستہ وہ کسی تکلیف میں ہے۔وہ پریشان ہو جائے گی۔لیکن نکاح پڑھے جانے سے پہلے پچاس خبریں آتیں۔وہ کہتی ہزاروں مرد ہیں، عزیز بھی ہیں، رشتہ دار بھی ہیں، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ دو حرف پڑھنے کے بعد جو انقلاب عظیم برپا ہوا، یہ اللہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ جو دلوں کو ایک دم موم اور مائل کر دیا۔ابھی اجنبیت تھی، ابھی یگانگت پیدا ہوگئی۔ابھی بے تعلقی تھی، منٹ بھر کے بعد تعلق پیدا ہوگیا۔یہ مرد عورت بے واسطہ تھے، اب ایک دم واسطہ پیدا ہوگیا۔ایسے میں اگر کوئی خوشی کی خبر بیوی کی نسبت آئی، خاوند کا دل بڑھ جائے گا، کہ جس سے میرا نکاح ہوا، اس کی کیسی عمدہ خبر سنی۔ خاوند کی طرف سے کوئی خوشی کی خبر پہنچے، اس کا دل بڑھ جائے گا کہ جس سے میرا رشتہ قائم ہوا۔اس کے لئے بڑی عزت کا سامان ہے۔وہ عورتوں میں سر اونچا کرے گی کہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔یہ مردوں میں سر اونچا کرے گا۔لیکن جب تک چار حرف نہیں پڑھے گئے تھے، نہ اس کا سر اونچا تھا، نہ اس کا سر اونچا تھا۔یہ جو ایک دم عظیم انقلاب برپا ہوگیا۔یہ خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ میرا آپ کا کام تو نہیں ہے۔یہی معنی ہیں نشانی ہونے کے کہ قلوب میں، روحوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہوگیا۔اس لئے فرمایا: ﴿مِنْ اٰیٰتِہٖ﴾ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا اور اسی کی نشانی یہ بھی کہ تم میں دو حرف کے پڑھے جانے سے اچانک سکون و مودت پیدا کر دیا۔حق تعالیٰ شانہٗ نے اسے موضع انعام میں ذکر فرمایا۔معلوم ہوتا ہے اللہ کو یہ محبوب و مطلوب ہے کہ یہ خاوند بیوی ملیں۔ان میں محبت پیدا ہو۔غرض و غایت نکاح کی یہ ذکر کی گئی۔تو

جب اللہ کا منشاء یہ ہے کہ مرد عورت جن کا نکاح ہے، وہ محبت سے ملیں۔ تو انبیاء کیسے نہیں پسند کریں گے؟ انبیاء وہی چیز پسند کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہو۔ وہ اللہ کے ترجمان بن کر آتے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کو بھی پسند ہے کہ محبت باہمی پیدا ہو جائے۔

خانگی زندگی میں سکون کا راز...... یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایسی چیزیں عمل میں لاتے تھے جس سے محبت بڑھے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بیٹھ کر ایک برتن میں کھانا کھاتے۔ اور ایسے دنوں میں جب وہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ زمانہ جاہلیت میں دستور یہ تھا، ایام حیض میں عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کے سائے کو بھی ناپاک سمجھتے تھے۔ ایک الگ کوٹھری میں بٹھا دیتے تھے، روٹی پانی بھی دیتے تھے تو بانس کے نلکے سے دیتے تھے کہ کہیں اس کا سایہ نہ پڑ جائے۔ یہ نجس ہوگئی۔ اسلام نے اس خیال کو مٹایا کہ یہ بیہودگی ہے۔ وہ نجاست حکمی ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ کوئی اس کا عین اور بدن تھوڑا ناپاک ہوا ہے۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی استنجا کر کے آئے، تو وضو کرنی واجب وہ حکمی نجاست ہے، یہ تھوڑا ہے کہ کوئی برائی اور گندگی لگی ہوئی ہے۔ حکمی طور پر نجاست ہے۔ حکم ہے کہ پاک بنالو۔ طاہر بن جاؤ۔

اسی طرح سے ایام حیض میں جو نجاست ہے، وہ حکمی ہے، یہ نہیں کہ بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے۔ اس کا دھونا ضروری ہے۔ حکم خداوندی ہے نجس سمجھو، پاک بناؤ۔ مگر زمانہ جاہلیت والے اس نجاست کو اتنی بڑی نجاست سمجھتے تھے کہ عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کا کھانا، پینا اور مکان تک الگ۔ اس کے سائے سے بچتے تھے۔ اسلام نے یہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عین اس زمانے میں جب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ایام گذر رہے تھے۔ ایک برتن میں کھانا کھایا اور نہ صرف یہی بلکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے لقمہ لیا منہ میں رکھ لیا، زبان لگا دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس سے چھین کے خود تناول فرمالیا۔ تاکہ امت کو بتلادیں کہ عورت کی ذات میں کوئی نجاست نہیں آتی۔ اس سے محبت قطع کر دینا، اسے اچھوت بنا دینا، یہ انسانیت کے خلاف بات ہے۔ یہ اسی لئے تھا تاکہ اس تعلق کی مضبوطی زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس واسطے اس قسم کی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم عملاً فرماتے۔

حدیث میں ہے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے فرمایا: آؤ ہم اور تم مل کر دوڑیں۔ آپس میں بھاگ ہوئی کہ کون آگے نکلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے، صدیقہ رضی اللہ عنھا پیچھے رہ گئیں۔ اخیر عمر میں جب بدن مبارک بھاری پڑ گیا۔ پھر ایک دفعہ فرمایا کہ اچھا ہم اور تم مل کے بھاگیں۔ کون آگے نکلتا ہے۔ اب کے صدیقہ رضی اللہ عنھا آگے نکل گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک بھاری پڑ گیا تھا۔ فرمایا: ''تِلْکَ بِتِلْکَ'' چلو برابر سرابر قصہ ہوگیا۔ ایک دفعہ ہم جیت گئے تھے۔ ایک دفعہ تم جیت گئیں۔ اب کوئی کہے، انبیاء علیہم السلام کو بھاگ دوڑ سے کیا تعلق؟ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے دل کو مٹھی میں

لینے کے لئے، اس کی دلداری کرنے کے لئے یہ چیزیں فرمائیں۔ اور فرمایا: ہر وہ لہو لعب جو حرام ہے بیوی کے ساتھ جائز ہے۔ تاکہ اس کا دل مٹھی میں آئے، اس کی دلداری دل جوئی ہو۔ مقصد یہ ہے، اس کے لئے تسلی کا سامان ہو۔ اس کے ساتھ محبت و یگانگت کا معاملہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اَکْرَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا اَلْطَفُکُمْ اَھْلًا'' ① ''تم میں سے زیادہ قابل تکریم مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔ اور بیویوں کے ساتھ لطف و محبت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو''۔

سخت گیری نہ کرتا ہو، تیز و تندلب و لہجے سے نہ بولتا ہو۔ ہر وقت ڈرانے اور دھمکانے کے فکر میں نہ رہے، جیسے بے وقوف خاوندوں کی عادت ہوتی ہے اپنی شوخی اور قوت جتانے اور حکومت قائم رکھنے کے لئے سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔ جب آئیں تو ناک منہ چڑھی ہوئی ہے، تاکہ بیوی بیچاری ڈر جائے، کہ کوئی شیر اور بھیڑیا آ گیا تاکہ میرا رعب رہے۔ یہ نہایت لغو حرکت ہے انسانیت و محبت کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

ایک صحابی ہیں حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ انہوں نے کہیں اپنی بیوی کو مارا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہوئے۔ چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا۔ فرمایا اے انجشہ! کانچ کی شیشیوں کو توڑ ڈالنا کوئی جوان مردی کی بات ہے؟ عورت پر ہاتھ اٹھایا؟ لڑنا تھا تو کسی مد مقابل سے لڑتے اپنے سے زیادہ قوی سے لڑتے۔ اگر تمہیں کوئی شوخی اور طاقت دکھلانی تھی۔ عورت پر ہاتھ اٹھایا؟ نازک صنف کو مارنا شروع کیا، تاکہ آپ کی بہادری واضح ہو اتنے بڑے بہادر ہو، عورت کو مارا اور آ کے فخر کیا کہ میں نے مارا۔ بھئی کسی پہلوان پہ ہاتھ اٹھایا ہوتا۔ کسی جوان مرد کے مقابلے پہ آتے تم ایک مارتے، وہ چار رسید کرتا۔ جوانی معلوم ہو جاتی۔ عورت کے مقابلے پہ جوانی دکھلانا کہ میں بڑا طاقت ور ہوں۔ یہ تو کمینوں کی سی بات ہے۔ شرافت کی بات نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے، خفا ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ تو یہ تھا کہ ایک پیالے میں کھانا کھاتے ہیں۔ بعض اوقات بھاگنے دوڑنے کو فرمایا، تاکہ عورت کا دل مٹھی میں رہے، اس کی مدارت ہو۔ اس کے ساتھ لطف و اکرام کا برتاؤ ہو۔ اور دوسرا برتاؤ جو حضرت انجشہ رضی اللہ عنہ نے کیا، تو آپ نے ڈانٹا، خفا ہوئے اور ناراض ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ دونوں خاوند بیوی میں مدارات کا برتاؤ رہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے اگر یہ دونوں مدارات اور لطف کا برتاؤ کریں گے، خانگی زندگی بہترین ہو جائے گی۔ جس گھر کے اندر خاوند بیوی ایک ذات ہوں، ایک دل اور ایک جان ہوں۔ اولاد میں بھی محبت پیدا ہو گی۔ عزیزوں میں بھی محبت پیدا ہو گی۔

اور جہاں خاوند بیوی کی لڑائی ہے۔ یہ اس کی صورت دیکھ کر منہ بچھور رہا ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھ کر منہ بچھور رہی ہے، اس کا نتیجہ ہو گا کہ اولاد میں بھی وہی چیزیں پیدا ہوں گی۔ اور گھر جہنم بن جائے گا۔ اس کا منہ ادھر کو، اس کا منہ ادھر کو۔ وہ گھر کیا ہوا۔ وہ تو دوزخ ہو جائے گی۔ جنت جب بنے گا گھر، جب ایک کو دیکھ کر دوسرا خوش ہو۔

① البحر المحیط، ج: ۱۰، ص: ۳۳.

نیک بیوی آدمی کی سعادت کی علامت ہے...... حدیث میں فرمایا ہے: آدمی کی خوش نصیبی اور سعادت کی تین علامتیں ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ آدمی کا رزق اس کے وطن میں اترے اس کے لئے مارا مارا نہ پھرے کہ دنیا میں رزق کی تلاش کرتا ہوا جارہا ہے۔ جہاں گھر ہے وہیں رزق کا سامان اللہ نے کردیا۔ پہلی علامت خوش نصیبی کی یہ ہے۔

دوسری علامت یہ فرمائی گئی، اس کو گھر وسیع ملے، تنگ کوٹھری نہ ہو، کہ دیکھ کر اس کے دل میں تنگی اور گھٹن پیدا ہو جائے۔ صحن اسکا وسیع ہو، مکان ذرا اچھا ہو، اس لئے کہ مکان کی خوشنمائی سے دل میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے، اور مکان کی تنگی اور گھٹن سے دل میں بھی تنگی اور گھٹن پیدا ہوتی ہے۔ تو دوسری علامت خوش نصیبی کی یہ فرمائی گئی کہ مکان اور اس کا صحن وسیع ہو، گھر اچھا ملے۔ تاکہ دل میں بھی وسعت پیدا ہو۔

اور تیسری علامت یہ ہے کہ بیوی نیک بخت ملے۔ جب اس کی صورت دیکھے، دل میں خوشی پیدا ہو جائے، اور جب اسے گھر میں چھوڑ کر جائے تو وہ مرد کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔ ایسی صالحہ بیوی کہ وہ اللہ کا بھی حق ادا کرے، اپنے خاوند کا بھی حق ادا کرے۔ فرمایا: وہ آدمی خوش نصیب ہے جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں۔ گھر بھی درست ہو، بیوی بھی درست ہو۔ روزی بھی اسکی اس کے وطن میں اترے۔ باہر مارا مارا نہ پھرے۔ یہ تین علامتیں خوش نصیبی کی فرمائی گئیں۔ ان میں بڑی علامت یہ ہے کہ بیوی صالحہ ملے۔ جب اسے دیکھے، دل کے اندر خوشی بھر جائے اور جب اس کے ساتھ برتاؤ اور معاملہ کرے، خوشی پیدا ہو کہ بڑی سمجھدار ہے اور جب اسے گھر پہ چھوڑ کے جائے تو اتنا مطمئن رہے کہ میرے گھر میں کوئی خرابی نہیں آسکتی، میری بیوی سلیقہ مند ہے، خوش نصیب ہے۔ تو واقعی بیوی کی صلاحیت وسوچ مندی، اور اعلیٰ درجہ کی ہوش مندی نہایت ہی بڑی نعمت اور ایک بڑی مسرت ہوتی ہے۔

فن نحو کے امام یحییٰ ابن اکثم رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے واقعات میں ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ مگر انتہائی بدصورت، رنگ بھی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھوں میں زردی اور دانتوں میں بھی زردی۔ غرضیکہ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہوسکتی ہیں وہ سب جمع تھیں۔ اور بیوی اتنی حسین و جمیل تھی کہ ملکوں میں اس کا جواب موجود نہیں۔ جتنی علامتیں حسن و جمال کی ہوسکتی تھیں، وہ بیوی میں تھیں۔ جب دونوں خاوند بیوی بیٹھتے، جیسے دھوپ چھاں بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک طرف دھوپ چھن رہی ہے۔ دوسری طرف رات نظر آرہی ہے۔ جب ایک دوسرے کے سامنے بیٹھتے تو یحییٰ ابن اکثم بیوی کو خطاب کرکے کہتے تو بھی یقیناً جنتی ہے۔ میں بھی یقیناً جنتی ہوں دونوں جنتی ہیں۔ کیوں؟ اس واسطے کہ مجھے تو ملی تجھ جیسی بیوی۔ تو میرا کوئی منٹ شکر گزاری سے خالی نہیں ہوگا۔ شکر کے راستے سے تو جنت میں جاؤں گا اور تجھے ملا مجھ جیسا خاوند کہ کوئی منٹ بھی تیرا صبر سے خالی نہیں۔ تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی۔ میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔ حقیقت یہی ہے اگر بیوی صالحہ ہو اور حسن و جمال بھی ہو۔ دونوں کی خوش نصیبی ہے۔ وہ اسے دیکھ کے خوش ہے، وہ اس سے راضی ہے۔ تو محبت باہمی مقصود ہے۔

بیوی کے انتخاب کا معیار...... مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھ لینا چاہئے کہ محبت عورت سے محض

صورت کی وجہ سے نہ کرنی چاہئے۔صورت ڈھلتی ہوئی دھوپ ہے۔آج اچھی صورت ہے،کل کو بگڑ گئی۔بڑھاپے میں تو کم سے کم بگڑ ہی جاتی ہے اور اللہ بھلا کرے بخار کا کہ دو تین دن ہی میں حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔تین دن بخار آیا۔نہ رنگ رہا، نہ عنفوانی رہی گلاب کا سا رنگ تھا وہ ختم ہوگیا قصہ۔اور اگر بخار نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں۔بڑھاپا آ کے صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت کہیں گئی ہی نہیں۔وہ سب کی صورتیں ختم کر دیتی ہے۔صورت ایک آنی جانی چیز ہے۔اس لئے اگر کوئی بیوی سے محبت محض صورت کی وجہ سے کرے گا، وہ محبت غائب ہو جائے گی۔اس لئے کہ جب صورت ڈھلی،محبت بھی ڈھل جائے گی۔اس واسطے محبت کاہے سے کرنی چاہئے؟ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا معیار ارشاد فرمایا۔فرمایا:"تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا" ①

عورت سے چار وجوہ سے نکاح کیا جاتا ہے،کبھی تو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے۔صاحب جمال ہے۔ آدمی کا دل چاہا،نکاح کرلیا۔کبھی اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ نکاح کریں گے تو جائیداد قبضے میں آئے گی۔رئیس بن کے بیٹھ جائیں گے۔کبھی اس کی حیثیت عرفی کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ بڑے اونچے خاندان کی ہے،اس کا نام بلند ہے۔اس کے ماں باپ کی عزت دنیا میں قائم ہے۔میں ایسی عورت سے نکاح کروں گا تو میری بھی عزت بڑھ جائے گی۔اور کبھی اس کی دینداری کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، کہ اس کا دین بہت اعلیٰ ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ" ② نہ صورت کو دیکھو، نہ حسب کو دیکھو، دین کو دیکھو۔اس لئے کہ اگر دین کی وجہ سے محبت قائم کریں گے،تو مرتے دم تک قائم رہے گی۔اس میں ڈھلاؤ کی کوئی صورت نہیں۔لیکن اگر صورت کی وجہ سے محبت کی،تو جہاں جوانی ڈھلی،محبت میں کمی آگئی۔اور آپس میں لڑائی شروع ہوگئی۔دولت کی وجہ سے محبت کی۔تو دولت کو رات دن آفت آتی رہتی ہے۔جائیداد وغیرہ خدانخواستہ ختم ہوگئی،محبت کو بھی خیر باد کہیں گے،جب وہ بات ہی نہیں رہی،جس کی وجہ سے محبت تھی۔اور اگر حیثیت عرفی یا ظاہری عزت کی وجہ سے کی۔تو عزت وذلت تو اضافی چیز ہے،کبھی عزت ہو جاتی ہے،کبھی ذلت ہو جاتی ہے۔کبھی وقار،کبھی بے وقار۔تو جہاں بے وقاری پیدا ہوئی۔آپ کی محبت ختم ہو جائے گی۔لیکن اگر دین کی وجہ سے محبت ہے،فرض کرلو عورت کالی کلوٹی ہے۔آدمی یہ سمجھے گا،حق تعالیٰ نے اس کا حق میرے اوپر قائم کیا،میرا فرض ہے کہ میں اس کا حق ادا کروں۔چاہے یہ گوری ہے،چاہے یہ کالی ہے۔چاہے یہ دولت مند ہے۔چاہے یہ مفلس ہے۔چاہے یہ باحیثیت ہے،چاہے یہ بے حیثیت ہے۔میری قسمت میں لکھ دی گئی،میرے اوپر اس کا حق آ گیا ہے۔میرا فرض ہے کہ مرتے دم تک اس کا حق ادا کروں۔دین کی وجہ سے مرد وعورت کا معاملہ سدا بہار ہو جاتا

① الصحيح للبخاري، كتاب النكاح، باب الاكفاء في الدين، ج: ١٦، ص: ٣٣. ② الصحيح للبخاري، كتاب النكاح، باب الاكفاء في الدين، ج: ١٦، ص: ٣٣.

ہے۔اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح دین کی وجہ سے کرو۔ تاکہ محبت میں دوام حاصل ہو جائے حقوق کی ادائیگی دائمی طور پر ہو جائے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح سنت ہے اس لئے کہ وہ محبت اور اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے۔شیاطین کے ہاں نکاح سے بُغض ہے۔اس لئے کہ وہ اتحاد کا ذریعہ ہے۔شیاطین چاہتے ہیں کہ لڑائیاں ہوں، پھوٹ پڑے۔ نکاح ہونے نہیں دیتے، انہیں نکاح سے چڑ ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ آدمی زناکاری اور بدکاری کی طرف چلے، اس لئے کہ بدکاری کا انجام لڑائی، پھوٹ قلوب کی کدورت اور قلق ہے۔

زوجین میں لڑائی، بڑے فتنے کا پیش خیمہ بنتی ہے......یہی وجہ ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے، شیطان روزانہ عصر کی نماز کے بعد سمندر کے کنارے یا پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اس پر بیٹھتا ہے۔ پانی پر اس لئے بچھاتا ہے کہ اللہ میاں سے مقابلہ کرتا ہے ان کا پانی کے اوپر عرش ہے۔تو میں بھی اپنا عرش بچھاتا ہوں۔ فرق اتنا ہے، ان کا عرش جو پانی پر ہے وہ نہایت لطیف اور پاک ہوتا ہے۔اور یہ کڑوا، نمکین، اور بعض اوقات اس سے اذیت بھی پہنچتی ہے۔یہ مادی پانی ہے۔وہ روحانی پانی ہے۔مگر بہر حال شیطان ظاہری صورت بناتا ہے کہ اگر اللہ میاں عرش پر ہے، تو میں بھی عرش پر ہوں۔ان کا عرش پانی پر، تو میرا عرش بھی پانی پر۔ کیونکہ یہ حق کے مقابلے میں ہے۔تو وہاں بھی کمبخت مقابلہ ہی ٹھانتا ہے۔صورت ہی مقابلے کی بنالیتا ہے، روزانہ سمندر پر تخت بچھا کر اس کے اوپر بیٹھتا ہے۔ کیوں بیٹھتا ہے؟ اس کے شتونگڑے، اس کی اولاد وذریت دن بھر میں لوگوں سے بدکاریاں کراتی ہیں۔ ہر ایک آکر اس کے پاس رپورٹ دیتا ہے۔میں نے فلاں کی نماز قضا کرادی۔شیطان کہتا ہے کہ کام تو بہت عمدہ کیا، مگر کوئی بڑی بات نہیں کی، کہ تجھے انعام یا شاباش دوں۔ دوسرا آتا ہے میں نے فلاں سے زنا کروادیا ہے۔کہتا ہے کہ ہاں ٹھیک کیا۔مناسب، کام کیا۔کوئی بڑا قابل قدر کام نہیں کیا۔ایک آتا ہے میں نے جھوٹ بلوادیا، جھوٹی گواہی دلوادی، کہتا ہے تو نے بھی اچھا کام کیا۔مگر کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ایک آتا ہے کہتا ہے کہ میں نے آج خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔حدیث میں ہے اس کو سینے سے لگاتا ہے کہ تو میرا سپوت۔تو نے بڑا کام کیا ہے۔تیرے سے میں خوش ہوں تیرے سے زیادہ بہترین میری دوسری اولاد نہیں ہے۔تو نے یہ کام کیا کہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔تو سینے سے لگاتا ہے، چمٹاتا ہے، اسے شاباش دیتا ہے۔ (1)

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زنا کا فعل برا ہے۔اس پر شاباش دینی چاہئے تھی۔یہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ یہ تو گھروں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔لڑائی بھی ہو جاتی ہے، صلح بھی ہو جاتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کیوں خوش ہوتا ہے؟ اس لئے کہ خاوند بیوی کی لڑائی دو کی لڑائی نہیں ہے، بلکہ سو کی لڑائی ہے۔اس لئے کہ جب خاوند بیوی لڑیں گے، تو خاوند کے جتنے عزیز ہیں، وہ خاوند کی حمایت کریں گے۔بیوی

---

(1) الصحيح لمسلم، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب تحريش الشيطان...... ج: ١٣، ص: ٤٢٦.

کے جتنے رشتے دار ہیں، وہ بیوی کی حمایت کریں گے۔ تو دو آدمیوں میں نہیں چلی، بلکہ دو گھرانوں میں چل گئی۔ اب گھرانے ایک دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ ان کے مدمقابل، یہ ان کے مدمقابل۔ پھران دونوں گھرانوں کے لوگ آدھے اُدھر آ جائیں گے، آدھے اِدھر آ جائیں گے۔ بیوی والے بیوی کی طرف، خاوند والے خاوند کی طرف۔ تو دو گھروں میں نہیں چلی، دو خاندانوں میں چل جاتی ہے۔

اور اگر خاوند بیوی با حیثیت ہیں۔ جیسے ملک اور ملکہ، بادشاہ اور بادشاہ بیگم ہیں۔ ان میں لڑائی ہو جائے تو فوجیں کٹ مرتی ہیں۔ دو ملکوں میں لڑائی ہو جاتی ہیں اور جنگ عظیم برپا ہوتی ہے۔ تو دو کی لڑائی، یہ حقیقت سینکڑوں کی لڑائی ہے اور جب دو خاندانوں میں چلتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے؟ بدگوئی الگ، وہ اسے برا کہیں گے وہ اسے، غیبت کا گناہ سرزد ہوا۔ یہ اس کے ایذارسانی کے درپے ہے۔ وہ اس کے درپے ہے۔ یہ ایذارسانی کا گناہ الگ۔ اس کے بعد مقدمہ بازی چلے گی۔ وہ الگ بے عزت، یہ الگ بے عزت، پھر مقدمہ بازی میں جانبین کا روپیہ خرچ ہوا۔ لاکھوں انہوں نے برباد کئے، لاکھوں انہوں نے، جائیداد ختم ہوئی۔ تو ایک گناہ میں سینکڑوں گناہ چھپے ہوئے ہیں۔ جب دو میں لڑائی ہوگی، تو غیبتیں الگ ہوں گی۔ چغلخوریاں الگ ہوں گی، مقدمہ بازی الگ ہوگی، مال الگ ختم ہوگا، گھر الگ بے عزت ہوگا، شہر میں الگ فتنہ برپا ہوگا۔ لوگ کہیں گے، میاں دیکھا۔ فلاں دو بڑے بن رہے تھے۔ کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ دیکھا آپ نے لڑائی ہو رہی ہے؟ وہ الگ تحقیر کر رہا ہے، الگ برائی بیان کر رہا ہے۔ تو بدنامی الگ، مال کی بربادی الگ، عزت کی تباہی الگ، سکون دل الگ ہٹا۔ بیوی خاوند کی لڑائی ایک گناہ نہیں، بلکہ سینکڑوں گناہ اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اس لئے شیطان خوش ہوتا ہے کہ اس میں فتنہ پھیلتا ہے، اور ہزاروں گناہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر کسی نے جھوٹ بول دیا۔ بس ایک گناہ، ختم ہوگیا، لیکن اس گناہ میں غیبت بھی ہے۔ عزت کی تباہی ہے، مال کی بربادی ہے، وغیرہ وغیرہ شیطان کے لئے کتنا خوشی کا موقع ہے؟

تو انبیاء علیہم السلام نکاح کے ختم ہونے پر خفا اور ناراض ہیں۔ اور شیاطین نکاح کے کمزور ہونے اور ٹوٹ جانے پر خوش ہیں۔ اس لئے کہ نکاح ٹوٹنے سے فتنہ پھیلے گا۔ اور اگر نکاح جڑا رہے گا، تو امانت داری پھیلے گی۔ انبیاء امانت کے حامل ہیں۔ شیاطین فتنہ کے حامل ہیں، وہ فتنہ پردازی پر خوش ہیں۔ یہ امانت داری پر خوش ہیں۔ انبیاء کو نکاح سے محبت ہے اور شیاطین کو اس کے ٹوٹ جانے سے محبت ہے۔

بیوی پر خاوند کی انتہائی اطاعت واجب ہے...... اس لئے خاوند سے کہا گیا ہے کہ تو عورت سے لطف و کرم کا معاملہ کر۔ عورت کو کہا گیا ہے کہ تو اپنے خاوند کے سامنے انتہائی اطاعت سے پیش آ۔ حدیث میں ہے اگر خاوند کسی کام کا حکم دے۔ اور عورت نہ مانے، تو جس دن اور رات میں اس نے حکم نہیں مانا، اس دن اور رات میں تمام ملائکہ اس عورت کے اوپر لعنت کرتے ہیں، کہ تو نے خاوند کی نافرمانی کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ

اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کرو۔ بیوی کے مقابلے میں اتنا واجب الاحترام شریعت اسلام نے خاوند کو بتایا، کہ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام نہ ہوتا تو سجدے کرنے کی اجازت دے دیتا، اس تک کے لئے میں تیار ہو جاتا۔ معلوم ہوا، بیوی کے اوپر اطاعت لازم ہے۔ ①

گویا یوں سمجھو، کہ ایک تو رب حقیقی ہے، جو اللہ رب العزت ہے۔ عورت کے حق میں اس کا خاوند رب مجازی ہے، جو اس کی پال پرورش کرتا ہے محنت کر کے کماتا ہے۔ بیوی کے ہاتھ پہ لا کے دیتا ہے، تو اس کے حق میں گویا وہ ایک مجازی طور پر رب ہے۔ اس واسطے عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس خاوند کی جو رب مجازی ہے اور اللہ کا سایہ ہے اس کی اطاعت کرے۔

اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ جب نکاح ہو گیا تو ظاہر بات ہے عورت پر ماں باپ کا تو کوئی حق باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تعظیم و توقیر کرے۔ لیکن یہ کہ خاوند کے مقابلے میں ماں باپ کوئی امر یا حکم دیں، اس کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ جب عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے آ گئی، وہ گھر اس سے منقطع ہو گیا۔ ماں باپ کے حقوق ختم ہو گئے۔ اب تو وہ خاوند کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر یہ اطاعت کرے گی، وہ رحم کرے گا۔ تو اسی کا گھر بنے گا۔ اور اگر اس نے لڑائی جھگڑا اٹھان لیا، اور اس نے سختی کی۔ ماں باپ کا تو گھر رہا نہیں کہ وہاں جا کے پناہ پکڑے، خاوند کو الگ ناراض کر دیا۔ نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی۔ تو دانش مندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خاوند کی اطاعت کرے۔ نافرمانی کرنے میں نہ اس گھر کی رہے گی نہ ماں باپ کے گھر کی رہے گی۔ تو ادھر سے عورت کو یہ حکم دیا کہ انتہائی اطاعت کر۔ انتہائی مدارات کر اور اگر تو نہیں کرے گی تو ملائکہ علیہم السلام تجھ پر لعنت کریں گے۔ ادھر خاوند کو کہا کہ انتہائی شفقت کر لطف و کرم کا برتاؤ کر تو نے اگر ذرا کمی کی تو تیری گردن قیامت میں نپے گی کہ تجھے ہم نے بادشاہ بنایا تھا، تو نے اپنی رعیت کے ساتھ ظلم کیوں کیا؟ عورت تیرے عیال میں تھی، تیری زیر تربیت تھی۔ تجھے اس کے اوپر سختی کا کیا حق تھا؟

پھر یہ کہ عورت تجھے باندی بنا کے تھوڑا ہی دی گئی ہے کہ تیری محکومہ ملازمہ ہے وہ تو برابر کی شریک زندگی ہے۔ جو تیرا حق ہے، وہی اس کا حق ہے۔ کوئی باندی ملازمہ اور نوکر نہیں ہے۔ تجھے کیا حق ہے کہ اسے حقیر سمجھے یا کم مرتبہ سمجھے؟ تو مرد کو کہا گیا کہ تو اس کی انتہائی توقیر کر۔ انتہائی محبت کر۔ عورت کو کہا تو انتہائی اطاعت کر۔ جب ادھر سے اطاعت، ادھر سے شفقت ہو گی۔ تو گھریلو زندگی کی گاڑی اچھی طرح چلے گی۔ اگر ادھر سے اطاعت، ادھر سے شفقت نہ ہو، تو گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ گھر تباہ ہو جاتا ہے اولاد ہوئی تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ رشتہ دار اور ماں باپ الگ پریشان ہوتے ہیں۔ اس واسطے فرمایا گیا ہے کہ دونوں مل کر اس گھر کو چلاؤ۔ جیسے بیل گاڑی ہوتی ہے۔ دو بیل آگے جڑے ہوتے ہیں تو بیل گاڑی چلتی ہے۔ اگر ایک کندھا ڈال دے، گاڑی آگے نہیں چلے گی تو

① السنن لابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأۃ، ج: ۶ ص: ۴۲.

گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی جب تک خاوند بیوی محبت سے مدارات سے نہ چلیں۔اسی واسطے جگہ جگہ تاکید کی گئی۔

کم خرچ نکاح میں برکت دی جاتی ہے......مگراس میں ایک بات یادر کھنے کی ہے۔وہ یہ کہ یہ چیز جب ہوگی جب نکاح میں برکت ہو،اگر نکاح میں خدانخواستہ برکت نہ ہوئی،پھر برے آثار پڑتے ہیں۔اورنکاح میں برکت کب ہوتی ہے؟فرمایا گیا جس نکاح میں خرچ کم ہوگا اس میں برکت زیادہ ہوگی۔جس نکاح میں خرچ زیادہ ہوگا،برکت اٹھالی جائے گی۔اس لئے کہ خرچ عموماً فخرومباہات کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے کہ برادری میں ناک نہ کٹ جائے۔ہم ذرا اونچے سمجھے جائیں۔اس لئے آدمی حیثیت سے بڑھ کر خرچ زیادہ کرتا ہے۔اور یہ غلطی ہے۔اس لئے کہ جسے برادری کہتے ہیں،وہ ہرصورت میں ناک کاٹنے ہی کے فکر میں رہتی ہے۔کتنا ہی خرچ کرلے،آدمی کی ناک نہیں رہتی۔اس لئے کہ بھائی برادراس فکر میں رہتے ہیں کہ ذراسی کمزوری ملے،اسے ہی اچھالتے ہیں۔تو جسے ناک کہیں،وہ پھر بھی نہیں رہتی۔تو مایہ بھی کھوئی،اورناک بھی کٹوائی،فائدہ کیاملا؟

وہ کسی ساھوکارنے اپنی بیٹی بیاہی،تواس نے یہ سوچا کہ میں اتنا خرچ کروں کہ دنیا میں آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔تاکہ دنیا میں میرانام ہوجائے۔تواس نے ایک ہزار آدمی کی تو بارات بلائی۔اورخداجانے پچیس چالیس قسم کے کھانے پکوائے۔تمام کمرہ کھانوں سے بھرگیااور ہر ہرمہمان کے لئے کہیں بستر کہیں تکیئے غرض سامان کی انتہا کردی اور چلتے ہوئے فی مہمان دس دس گنی بھی دیں۔دس دس پونڈ بھی پیش کئے جواب تک کسی نے نہیں دیئے تھے۔مقصد یہ تھا کہ میرانام ہوجائے کہ بھائی ساہوکارنے بڑی شادی کی۔یہ سب کچھ کرکرا کے جب بارات رخصت ہوئی۔لاکھوں روپے کا سامان بھی اپنی لڑکی کو دیا۔تو ساہوکارذرامیل بھرآگے چلا گیا کہ کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھوں۔تاکہ میری تعریف کرتے ہوئے لوگ جاویں گے،کہ بھائی لالہ جی نے بڑا کام کیا۔اور ساہوکارنے بڑا جہیز دیا۔توذرادل میرابڑھے گا۔اس واسطے بارات کورخصت کرکے،گھوڑے پرسوار ہوکر،دوسرے راستے سے میل بھرآگے جاکے آپ جھاڑی میں جاکر بیٹھ رہے،جہاں سے بارات گذرنی تھی۔کہ لوگ جب تعریفیں کرتے ہوئے گذریں گے،میرادل خوش ہوگا،اور میری محنت وصول ہوجائے گی۔میں نے اپنا گھر کھویا ہے۔گھرتو کھویا گیا،دل تو نہ کھویا جائے۔جب وہاں بارات پہنچی۔اتفاق سے وہاں زمین ناہموار تھی۔اونچ نیچ تھی۔مٹی بہت جمع ہوگئی تھی۔اندیشہ تھا کہ اگر گاڑیاں گزریں،تو الٹ جائیں گی اور لوگ گریں گے۔تو یہ ارادہ کیا گیا کہ بھئی پہلے مٹی درست کرلو۔یہ جو مٹی جمع ہوگئی۔اسے کھود کر ایک طرف پھینک دو۔تو پھاوڑے کی تلاش ہوئی جس سے مٹی کھودا کرتے ہیں۔اتفاق سے پھاوڑا کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔اب کسی کو کیا خبر تھی کہ ہمیں راستہ میں سڑک بھی بنانی پڑے گی جو پھاوڑار کھتے،کسی نے بھی نہیں رکھا۔لوگوں نے کہا،بھئی!تلاش کروجہیز میں ہوگا،سارے جہیز میں تلاش کیا،پھاوڑانہ ملا۔ساروں نے کہا۔سسرے نے دیا ہی کیا،پھاوڑاتک تو دیا ہی نہیں۔بس ساہوکار اٹھے کہ،لعنت اس بارات کے اوپر،لعنت اس خرچ کے اوپر،سارا گھر کھودیا،اوراب بھی میں سسرا ہی بنارہا۔اور یہ کہ ”کیا

دیا سسرے نے، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں"۔

اور جو کچھ دیا تھا، وہ سب اکارت۔ تو جسے ناک کہتے ہیں۔ ناک رہ جانا، برادری والے کسی کی ناک نہیں رہنے دیتے۔ وہ ناک کاٹ کے ہی رہتے ہیں۔ پھر آدمی بے وجہ فضول اپنا گھر بھی تباہ کرے، ناک بھی کٹوائے؟ موقع سے اعتدال کا جو درجہ ہے، اس کے مطابق خرچ کر دے۔ بیٹی کو دینا ہے، ساری عمر دے سکتا ہے۔ یہ کیا ضروری کہ آج ہی دے۔ آج جو دے رہا ہے وہ محض نام آوری کے لئے دے رہا ہے۔ بیٹی پیش نظر نہیں ہوتی۔ ناک پیش نظر ہوتی ہے۔ شریعت یہ کہتی اگر کچھ دو تو بیٹی کو دو۔ ناک کو کچھ مت دو۔ یہ رہنے والی نہیں، یہ تو کٹ جاتی ہے۔ بیٹی کو دے، تو ساری عمر دے سکتا ہے۔ مگر وہ بھی اعتدال کے ساتھ دے۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی بیٹی ہے، چلو بہت سا دے دیا۔ لیکن اگر اور بھی بیٹی ہے، تو اور اولاد کا بھی حق ہے۔ اب نام آوری کے لئے سارا گھر ایک کے اوپر خرچ کر دیا، کل کو جب دوسری شادی ہوگی، اور ہاتھ پلے کچھ نہیں ہوگا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ بڑا بے وقوف آدمی تھا۔ پہلی پہ تو اتنا خرچ کر دیا۔ دوسری اولاد کیا سوتیلی تھی، حقیقی نہیں تھی؟ اس کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ جب ناک نہیں کٹی تھی۔ تو اب کٹ جائے گی۔ اس واسطے آدمی مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے۔

حدیث میں فرمایا گیا: اس نکاح میں برکت دی جاتی ہے، جس میں خرچ کم ہو۔ اور جس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے، اس سے برکت اٹھالی جاتی ہے، یا کم کر دی جاتی ہے۔

معاملات میں سب سے زیادہ آسان نکاح ہے ...... اس کی بنا یہی ہے کہ وہ زیادہ خرچ مفاخرت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نام آوری یا نمود کی وجہ سے۔ یہی خراب کرنے والی چیز ہے۔ ورنہ نکاح کو اللہ نے سب سے زیادہ آسان بنایا ہے جسے ہم نے سب سے زیادہ مشکل بنا رکھا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نکاح ایسی سادہ چیز تھی کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور ایسے جلیل القدر صحابی ہیں کہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ اتنے بڑے لوگوں میں ہیں۔ اور جنت کی بشارت جن دس لوگوں کو دی گئی ہے، ان میں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔ تو دنیا ہی میں جنتی ہیں۔ اتنے جلیل القدر ہیں۔ ایک دن مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے تو کپڑے اور چہرے پر زرد دھبے تھے۔ فرمایا، عبدالرحمن! یہ کیا بات ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے۔ اس زمانے میں جب نکاح ہوتا تھا تو ایک خاص قسم کا عطر ہوتا ہے، جو زعفران سے بنتا تھا۔ اس کو لگاتے تھے تو کپڑے پر کوئی دھبہ بھی آ جاتا تھا۔ جیسے بعض عطر مخصوص ہوتے ہیں۔ جو نکاح ہی کے دن لگائے جاتے ہیں، جیسے لڑکی کو نخ جلا کر بسایا جاتا ہے۔ نخ یہ چھوٹے چھوٹے چو پارے سے ہوتے ہیں، ان کو جب جلاتے ہیں، تو خوشبو مہکتی ہے کپڑوں میں وہ خوشبو لگاتے ہیں تو کپڑے مہک اٹھتے ہیں۔ اس کو نخ بسانا کہتے ہیں۔ وہ شادی ہی کے دن لگائی جاتی ہے۔ ویسے اس کو کوئی نہیں لگاتا۔ ایسا ہوتا ہے، رواج کی بات ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زرد رنگ کیسا؟ عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے اور نکاح کے دن خوشبو لگائی۔ فرمایا: کنواری سے نکاح کیا ہے یا بیوہ سے؟ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! بیوہ سے۔ فرمایا کیوں؟ عرض کیا، یا رسول اللہ! پہلی بیوی مرگئی تھی، اس کی کچھ اولاد تھی۔ کنواری سے کرتا تو پال نہ سکتی۔ بیوہ بیچاری خدمت کردے گی۔ اولاد کو پال دے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی۔ (1)

آپ نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق کون ہوسکتا تھا۔ صحابی بھی جلیل القدر ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر محبوب کون ہوسکتا تھا؟ ان کی دنیا اور آخرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اندر پوشیدہ ہے۔ ایمان نام ہی محبت کا ہے۔ تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عاشق صادق، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوبِ کامل۔ نکاح کرتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلاتے۔ یہاں نکاح ہوتا ہے کہ جب تک نویل نہ پھرے، جب تک برادری اور کنبے کے سر نہ جمع ہوں، یہ ناک کی مصیبت ہے کہ کہیں یہ نہ کٹ جائے۔ چاہے گھر میں کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن ناک کی وجہ سے جمع کریں گے۔ اور وہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک کو دعوت نہیں دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی برا نہیں مانا۔ یہ نہیں فرمایا بھئی! ہمیں تو تم نے بلایا ہی نہیں۔ نہ کوئی شکایت کی معلوم ہوا نکاح جیسی سادہ چیز اسلام میں کوئی نہیں تھی، کہ نکاح کریں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو خبر نہ ہو۔ معلوم ہوا گھر میں بیٹھ کر کرلیا۔ اتنی سادہ چیز تھی۔

نکاح میں معمولی دو خرچ ہیں...... نکاح کے بڑے اخراجات دو ہی ہیں۔ ایک مہر کا خرچ ہے۔ ایک ولیمہ کا خرچ ہے۔ خاوند کے ذمہ یہی ہے کہ ولیمہ کرے اور مہر ادا کرے۔ یہ اتنے آسان بنا دیئے کہ ولیمے کے بارے میں فرمایا: ''اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ'' (2) اگر کچھ بھی نہ ہو، تو ایک بکری ذبح کر کے کھانا کھلا دو۔ بکری بھی نہ ہو۔ جو ہاتھ چلے ہے، وہی کھلا دو۔

اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوگئی گھر میں کچھ تھا نہیں کہ ولیمہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ کیا کھلاؤں گھر میں تو فقر و فاقہ ہے۔ اسی وقت ایک شخص ہدیہ میں کچھ کھجوریں لے کر آیا، اور ایک مٹکا لے کر آیا آپ نے گٹھلیاں نکلوا کے مٹکے میں ملوا کے چمڑے کے دستر خوان پہ ڈال دیا۔ حاضرین سے فرمایا: کھاؤ، یہ ہمارا ولیمہ ہے۔ (3) تو بکری نہیں لانی پڑی، جو پاس تھا کھلا دیا۔ بس ولیمہ ہوگیا ایک خرچ نکاح میں یہ تھا۔ یہ اتنا سادہ، اور ایک مہر کا خرچ ہے۔ تو فرمایا گیا: دس درہم بھی اگر کسی کے پاس ہوں، نکاح ہوجائے

---

(1) الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب الصفرة للمتزوج، ج:۱۶ ص:۱۲۷.

(2) الصحیح للبخاری، کتاب النکاح، باب الصفرة للمتزوج، ج:۱۶ ص:۱۲۷.

(3) المعجم الکبیر للطبرانی، ذکر ازواج رسول اللہ ﷺ، صفیة بنت حیی... ج:۲۴ ص:۶۷. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رواہ الطبرانی وفیہ النھاس بن فھم وھو ضعیف مجمع علیہ، دیکھئے: مجمع الزوائد ج:۹ ص:۲۵۱.

گا۔دس درہم کی ہندوستانی قیمت اڑھائی روپے بیٹھتی ہے۔تو اڑھائی روپے میں نکاح شرعی ہوسکتا ہے۔

نکاح میں زیادہ خرچ کا نتیجہ...... یہ جو آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے۔تو نکاح تو ہوجاتا ہے۔ تھوڑی بہت واہ واہ بھی ہوجاتی ہے۔مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھر برباد ہوجاتا ہے۔

ہمارے ہی عزیزوں میں سے تھے شیخ ظفر حسین صاحب مرحوم بہت بڑے رئیس تھے،ان کی حویلی آج بھی دیوبند میں کھڑی ہے،یوں معلوم ہوتی ہے کہ شاہی قلعہ ہے۔ہاتھی کے گھسنے کا دروازہ اور بڑی بڑی چیزیں۔انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نکاح کیا۔تو ولیمہ جو کیا ہے،وہ فقط سارے دیوبند کا نہیں بلکہ دیوبند کے اردگرد جتنے دیہات تھے،سب کو مدعو کیا۔ہزاروں دیہات والے۔پھر ایک وقت کا نہیں،بلکہ ایک ہفتے تک دعوت کی۔پورے سات دن یعنی چودہ وقت کا کھانا کھلادیا۔

اور یہ بھی اعلان تھا کہ دیہاتیوں کو آنے میں زحمت ہوگی،کوئی دس میل سے آئے گا کوئی بیس میل سے۔تو کھانے پک پک کے بہلیوں پر گاؤں گاؤں پہنچے۔اور گھر گھر تقسیم ہوئے۔ایک ہفتے تک کھانے پہنچتے رہے،بڑا نام ہوگیا،دنیا میں ایسا ولیمہ کسی نے نہیں کیا ہوگا۔دنیا ایک وقت کا ولیمہ کرتی ہے،انہوں نے چودہ وقت کھلادیا۔مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نکاح تو ہوگیا،لیکن آج اگر جاکے دیکھا جائے ان کی اولاد کا گزر بھیک کے ٹکڑوں پر ہے (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ) کسی نے خدا واسطے دے دیا،کھانا کھالیا نہیں تو نہیں۔ایسی شادی سے فائدہ کیا؟ یہ خانہ آبادی نہیں یہ تو خانہ بربادی ہے۔

نکاح میں پاک ثمرات کب ظاہر ہوتے ہیں...... میں اس پہ عرض کررہا تھا کہ پاک ثمرے جب ظاہر ہوتے ہیں جب نکاح میں برکت ہو۔اور برکت جب ہوتی ہے،جب نکاح میں خرچ کم ہو۔اس لئے جو رائج الوقت مہر ہو اس کو باندھ دو۔کوئی خاص مہر تلاش کرنا،یا جہیز کے سلسلے میں بہت زیادہ حدود سے گزر کر خرچ کرنا،یہ سب غلط چیزیں ہیں۔مسلمانوں کی جائدادیں اس میں تباہ ہوئی ہیں۔یا شادی کی رسوم میں،یا غمی کی رسوم میں۔مرنے والا مرتا ہے،وہ تو گیا۔اس کے بعد اب برادری کے کھانے ہورہے ہیں۔چالیس دن کا الگ ہورہا ہے۔دس دن کا الگ ہورہا ہے۔برسی الگ ہورہی ہے،اور چہلم الگ ہورہا ہے۔نہیں ہوتا تو قرض لے لے کر کرتے ہیں۔تو مسلمانوں کی جائیدادیں برباد ہوئی ہیں۔حکومتیں چھن گئیں۔شادی کی رسموں میں،یا غمی کی رسموں میں رسوم کی وجہ سے مسلمان تباہ ہوئے۔اور اب تک بھی ہوش نہیں آتا،اسی میں مبتلا ہیں۔

بہر حال میں نے اس لئے عرض کیا کہ نکاح کی غرض وغایت باہمی سکون ومودت ہے۔مودت ومحبت کا اثر جب پڑتا ہے۔جب نکاح بابرکت ہو۔بابرکت جب بنتا ہے۔جب اخراجات میں کمی کی جائے۔نام ونمود اور شہرت کے جذبات سے خالی ہو۔فرض کی ادائیگی پیش نظر ہو کہ اولاد کا فرض ہے،اللہ کا حکم ہے،اس کو ادا کررہے ہیں۔اس میں دین پیش نظر ہو۔خاوند کے پیش نظر بھی یہ ہو کہ لڑکی سے اس کے دین کی وجہ سے نکاح کررہا ہوں۔ وہ خوب صورت ہو یا بدصورت اس کے ساتھ دین کی وجہ سے معاملہ کروں گا۔میرے ذمہ تو حق ہے۔مرتے دم تک

مجھے ادا کرنا ہے۔ وہ مالدار ہو یا بے مال ہو۔ میرے ذمے اس کا حق ادا کرنا ہے۔ جب اللہ نے میرے حصے میں لگا دیا ہے، مجھے حقوق کی ادائیگی پیش نظر ہے۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ محبت سے برتاؤ کرو، میرا فرض ہوگا کہ میں اپنی بیوی کا دل مٹھی میں رکھوں اس کی مدارت کروں اسکے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤں۔ اس میں پھر ایسی برکت ہوگی کہ اولاد میں برکت ہوگی، گھر بار میں برکت ہوگی، معاملات میں بھی برکت ہوگی۔

ادھر عورت کا یہ فرض ہے وہ یوں سمجھے کہ خاوند کا حق مجھ پر عائد کر دیا گیا۔ یہ خوبصورت ہو یا بدصورت۔ میرا فرض ہے اس کا حق ادا کرنا۔ میرے لئے وہ رب مجازی بنایا گیا ہے۔ یہ انتہائی بدصورت سہی، مگر میرے لئے تو سرتاج ہے۔ میرا فرض ہوگا میں اس کے حقوق ادا کروں گی۔ یہ جذبات ہوں گے تو حقوق کی ادائیگی مرتے دم تک ہوگی۔ گھر جنت بن جائے گا۔ عارضی چیزوں پر مدار ہوگا۔ دولت، عزت، حیثیت، یہ آنی جانی چیزیں ہیں۔ آتی بھی ہیں، جاتی بھی ہیں، ان پر اگر مدار رکھ دیا، محبت بھی عارضی ہوگی۔ چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔ تو مقصود اصلی اور غرض وغایت نکاح کی یہ ہے: ﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ ① اس لئے تم میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا۔ تم میں انس، سکون ہو۔ تم ایک دوسرے کے ساتھ محبت ومودت کا برتاؤ کرو۔ اگر تم غور وفکر کرو تو یہ اللہ کی بڑی قدرت کی نشانی ہے۔

نکاح کے احکام...... نکاح کی یہ غرض وغایت رکھی گئی۔ اس غرض وغایت کے تحت احکام وہ رکھے گئے جن سے میل ملاپ پیدا ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند بیوی میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ فرشتے تو ہیں نہیں، انسان ہی تو ہیں۔ اس کا مضائقہ نہیں۔ بعض دفعہ خاوند ناخوش ہو جاتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ بیوی بھی ناخوش ہو جاتی ہے، اسے بھی ناز ہوتا ہے۔ وہ بھی خاوند کو چار باتیں کہہ دیتی ہے۔ ایسا بھی گھروں میں ہوتا ہے۔ جب وہ بشر ہیں، تو ہوگا اس میں ہدایت یہ کی گئی ہے کہ اگر ایسا ہو تو حکمت سے کام لے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: یہ عورت جو ہے، یہ بائیں پسلی کی پیدائش ہے۔ بائیں بھی پسلی آدم علیہ السلام کی نیچے والی۔ جو زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے، اس سے پیدا ہوئی۔ اس کے مزاج میں ٹیڑھ ہے اور تھوڑی سے کجی ہے۔ فرمایا نہ اسے بالکل ویسے ہی چھوڑ دو، ورنہ اور ٹیڑھی بنے گی اور نہ بالکل سیدھی کرنے کی فکر میں رہو، ورنہ ٹوٹ جائے گی۔ تو نہ بالکل سیدھی کرو، نہ ویسے ہی چھوڑ دو۔ کچھ نرمی، کچھ گرمی، کچھ مدارات، کچھ ڈانٹ ڈپٹ، کچھ سمجھانا بجھانا، دونوں چیزیں رہنی چاہئیں۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است

فرمایا گیا نہ بالکل ویسے آزاد چھوڑ دو، زیادہ ٹیڑھی ہو جائے گی۔ نہ اتنی سختی کرو کہ وہ بالکل ٹوٹ جائے۔ اعتدال کا معاملہ رکھو۔

---

① پارہ: ۲۱ سورة الروم، الآية: ۲۱.

اس واسطے قرآن حکیم میں اس کی ہدایت کی گئی۔ برداشت اور صبر کے برتاؤ کا حکم دیا گیا فرمایا گیا:
﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ ① نیک بیویاں کون ہیں؟ نیک ازواج کون ہیں؟ جو صالحات ہیں۔ وہ اللہ کی عبادت گزار بندیاں ہیں۔ جو اپنے نماز روزے، دین و دیانت کی پابند ہیں۔ وہی صالح بن سکتی ہیں۔ چکنی چپڑی باتیں کرنے والی صالح نہیں ہوتیں۔ حق ادا کرنے والی صالح ہوتی ہیں۔ ''حٰفِظٰتٌ'' جو غیب کی حفاظت کریں۔ غیب سے مراد خاوند کے راز اور اسرار ہیں وہ کسی پہ ظاہر نہیں کرتیں۔

خاوند کی ناقدری کا انجام...... بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ کسی محفل میں بیٹھیں۔ اس نے کہا تیرا خاوند ایسا برا، اس نے کہا تیرا ایسا برا۔ رات دن اسی لعن طعن میں مبتلا ہیں۔ اگر اس (تقریر) میں میری بہنیں بھی شریک ہوں، جو سن رہی ہوں۔ وہ بھی کان کھول کر سن لیں۔ جہاں میں نے ان کے لئے یہ کہا ہے کہ خاوند کا فرض ہے ان کی مدارات کرے۔ حقوق ادا کرے۔ یہ کرے وہ کرے۔ کچھ اس کے ذمے بھی حقوق ہیں۔ کچھ ان میں بھی کجی اور ٹیڑھ ہے۔ وہ اپنی اصلاح و حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن عورتوں میں وعظ فرمایا۔ عورتیں ایک طرف تھیں، مرد ایک طرف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور عورتوں کے گروہ میں وعظ فرمایا، ''تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ فَإِنِّي أُرِيْتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ'' ② اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کثرت سے دیا کرو۔ اس لئے کہ جہنم میں کثرت سے عورتوں کو دیکھتا ہوں صدقہ دو گی تو بلیات رد ہوں گی۔ حدیث میں ہے: ''اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ كَمَا يُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ'' ③

صدقہ اس طرح سے اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے، جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ تو فرمایا صدقہ کثرت سے کیا کرو۔ اس لئے کہ عورتوں کو جہنم میں میں کثرت سے دیکھتا ہوں۔ حدیث میں ہے: ایک عورت کھڑی ہوئی، اس کا حلیہ بھی آتا ہے۔ کالے رنگ کی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی حبشی ہوگی۔ کہنے لگی: ''وَبِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟'' یارسول اللہ! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ہی جہنم میں زیادہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بھی ہم ہی چولہا جھونکیں۔ یہاں بھی آگ وہاں بھی آگ۔ دونوں جگہ آخر ہماری کیا مصیبت آئی۔ ایسا آخر کیوں ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ ارشاد فرمائی۔ وہ میری بہنوں کے سننے کی ہے اور اس کو پلے باندھ لیں۔ اس لئے کہ انہوں نے یا مردوں نے مجھے اس کرسی پر بٹھلایا ہے یہ کرسی معالج کی ہے، جو دلوں کا علاج کرتا ہے۔ معالج چن چن کر امراض سامنے رکھ دے کہ یہ کھوٹ ہے، یہ بیماری ہے۔ تاکہ علاج کر سکیں۔ وہ طبیب بہت خائن

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم، ج: ۲ ص: ۳۔
③ الصحیح لابن حبان، ج: ۱۴، ص: ۱۲۱۔ حدیث صحیح ہے، دیکھئے: السلسلۃ الصحیحۃ ج: ۴ ص: ۴۰۷ رقم: ۱۹۰۸۔

ہوگا کہ وہ تعریف کے کلمات کہہ جائے، اور کھوٹ کو ظاہر نہ کرے۔ وہ حکیم نہیں وہ علاج نہیں کرسکتا۔ اس واسطے اگر میری بہنیں یہاں ہوں تو برا نہ مانیں۔ بہرحال جو اصلی بات ہے وہ کہہ دوں تا کہ علاج کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور یہ میں تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں نقل کررہا ہوں۔ اس واسطے میرے سے برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ناقل ہوں، حکم شرعی جو ہے وہ پہنچا دیا۔ اب تم برا مانو یا بھلا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عورت نے کہا ''وَبِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟'' آخر ہم ہی کیوں آگ میں ہیں۔ یہاں بھی وہاں بھی۔ یہ ہماری قسمت میں ہی کیوں آگ رہ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دو وجہیں ارشاد فرمائیں۔

''تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ'' تم میں دو بیماریاں اور دو روگ ہیں۔ ایک ''تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ'' لعن کی تم میں کثرت ہے۔ جس مجلس میں عورتیں بیٹھیں گی، لعن لعن نام رکھنا، تیرا زیور بہت برا، میرا زیور بہت اچھا۔ اس کی صورت اچھی نہیں، میری صورت اچھی، اس کا لباس خراب، میرا لباس اچھا۔ دنیا بھر کی بات اگر مجلس میں ہے تو وہ یہ فلانی بری اور میں اچھی صورت بھی میری اچھی، حیثیت سے بے خبر ہو۔ جاہل کا کام دوسرے کو طعن دینا ہے کیونکہ ان میں جہالت زیادہ ہوتی ہے، اس واسطے دوسرے کو طعنے دیتی رہتی ہیں۔ اگر اپنے عیب پیش نظر ہوں۔ دوسرے کو طعن دینے کی کبھی جرات نہیں ہوسکتی۔ اس کی بنا یہ ہے کہ اپنی چیز پیش نظر ہوتی ہے۔ دوسرے کی ہوتی نہیں اپنی برائی سامنے ہے نہیں بس دوسروں کی برائی نظر آتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے آئینہ ہے تو صورت تو اچھی نظر آرہی ہے اور دل کا آئینہ ہے نہیں کہ یہ دیکھے دل میں کیا کارگزاری ہے۔ اس واسطے فرمایا کہ: ایک بات تم میں یہ ہے کہ تم کثرت سے لعن طعن کرتی ہو۔ ایک مرض تو تم میں یہ ہے۔ اور فرمایا ''وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ'' دوسرے یہ کہ خاوندوں کی ناقدری اور کفران نعمت یہ بھی تمہارے اندر زیادہ ہے۔ یہ میں نہیں کہتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، میں تو اسے نقل کررہا ہوں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، ایک خاوند عمر بھر سلوک کرے، جب وہ زیور مانگے، تو زیور بھی لا کے دے اور جب خاوند کے ساتھ اس کی لڑائی ہوگی تو کیا کہے گی؟ مَارَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ میں نے تو اس اجڑے گھر میں آ کے کبھی خیر دیکھی ہی نہیں۔ مصیبت ہی میں مبتلا رہی، سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ عمر بھر جو اس نے سلوک کیا تھا، وہ ایک جملے میں ختم کردیا، کہ میں نے تو کبھی اس گھر میں خیر دیکھی ہی نہیں۔ بس ڈولے میں آئی تھی اور کھٹولی میں نکل جاؤں گی۔ بیچ میں یہی مصیبتیں میری تو قسمت میں تھیں۔ یہ ناقدری کا حال ہے۔ اب وہ خاوند غریب دیکھ رہا ہے کہ میں نے چوری کر کے، ڈکیتی ڈال کے اس کے لئے اشیاء فراہم کردیں اور اس نے یہ قدردانی کی کہ ''مَارَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ'' میں نے کبھی اس اجڑے گھر میں آ کے خیر دیکھی ہی نہیں، اب وہ بیچارہ جواب دے تو کیا دے۔ اپنا سا منہ لے کر چپکے سے آ جاتا ہے۔ یا تو خفا ہو، پھر لڑائی بنتی ہے۔ سوائے اس کے کہ صبر کرے کہ اس عورت سے کون لڑے۔ غریب آ جاتا ہے۔ ①

---

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب كفران العشير و كفر دون كفر، ج: ١ ص: ٥٠.

ہمارے مولانا عبدالرب صاحب مرحوم تھے۔ انہوں نے عورتوں کی ذہنیت نمایاں کرنے کے لئے بڑی مقفّی بات کہی۔ کہنے لگے اگر خاوندان سے پوچھے گھر میں تمہارے پاس کچھ ہیں کپڑے؟ تو کہیں گی، آئے تھے کپڑے وہ چار چیتھڑے پڑے ہوئے ہیں، کون سا میرے لئے لباس بنایا تھا؟ اور اگر کہے کہ تمہارے پاس جوتا بھی ہے؟ تو کہیں گی۔ آئے تھے جوتے، وہ دو لیتھڑے پڑے ہوئے ہیں۔ لاکے دیئے تھے تم نے جوتے اور پوچھے کہ بھئی برتن بھی ہیں گھر میں؟ دھرے تھے برتن، وہی چار ٹھیکرے پڑے ہوئے ہیں۔ خود باپ کے گھر سے لے آئی تھی، وہ کام آرہے ہیں، ورنہ تم نے کون سے لاکے دیئے تھے۔ غریب کے سارے کئے کرائے پہ پانی پھیر دیا۔ اس نے محنت کی، عمر بھر کما کما کے دیا۔ یہ اس کی قدر نکلی کہ چار چیتھڑے ملے، دو لیتھڑے ملے، اور چار ٹھیکرے ملے، یہ اس کی قدر دانی ہوئی خاوندوں کی ناقدری کرنا تمہارا شیوہ ہے۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اتنی ناقدری کرتی ہیں کہ عمر بھر کے احسان کا بدلہ دو لفظ میں چکا دیتی ہیں۔ فرمایا: یہ وجہ ہے کہ جہنم میں کثرت سے جاؤ گی۔ اس کا علاج بتایا کہ صدقہ کثرت سے دو۔ تاکہ غضب خداوندی بجھے۔ اس لئے کہ لعن طعن کرنے سے اللہ کا غصہ بھڑکتا ہے۔ کفران نعمت سے اللہ کا غضب بڑھتا ہے۔ صدقہ دو گی، یہ غضب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جتنی غریبوں کی خبر گیری صدقات خیرات سے کرو گی۔ تو اس برائی کی تلافی ہو جائے گی، جو تمہارے اندر ہے۔ تب جا کے اس عورت کو بات ذرا تسلیم ہوئی۔

عورت مرد کو اپنی ہدایت پر نہ چلائے...... اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمادیا کہ: ہوتا تو "نَاقِصَاتُ الْعَقْلِ؟" اس پر کھڑی ہوگئی ہم میں کیا نقصان عقل ہے؟ گویا اپنے نزدیک وہ بڑی افلاطون تھی، ارسطو بنی ہوئی تھی کہ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں اور بعضوں کو تو یہ دعوی ہوتا ہے کہ مردوں میں کیا عقل رکھی۔ عقل تو ہمارے اندر ہے اور یہ ایک حد تک انہوں نے صحیح بھی کہا۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "مَارَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّدِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحدٰ كُنَّ" ①

فرمایا کہ ہیں تو یہ ناقص العقل! مگر بڑے بڑے مردوں کی جو کامل العقل ہوتے ہیں، ان کی عقلیں اچک لے جاتی ہیں، اسے پاگل بنا کے چھوڑتی ہیں۔ ایسے اتار چڑھاؤ سے بات کریں گی، اچھا خاصا عقلمند آدمی ان کے سامنے بیوقوف بن جائے گا، اور جو کہیں گی، وہ کرنا پڑے گا۔

چنانچہ ان رسوم کے بارے میں جب لوگ کہتے ہیں کہ بھئی تم عقلمند ہو، تم یہ کیا کر رہے ہو، کہ جی عورتیں نہیں مانتیں گویا عورتیں حکام ہیں۔ آرڈر وہاں سے آتا ہے۔ یہ حضرات نیاز مند اور غلام ہیں۔ تعمیل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ جواب دیتے ہیں۔ تو ان کا ایک حد تک دعوی بھی صحیح ہے کہ ہم عقل مند ہیں۔ جب عقلمند کو بے وقوف بنانے کی قدرت ہے تو اور اس سے زیادہ کیا عقل مندی ہوگی؟ مگر فرمایا کہ: ناقص العقل اور ناقص الدین۔ اس پر ایک عورت

① السنن لابن ماجه، كتاب الفتن، باب فتنة النساء، ج: ١٢ ص: ٦.

نے عرض کیا۔ یارسول اصلی اللہ علیہ وسلم ہم میں کیا نقصان عقل ہے اور نقصان دین کیا ہے؟

فرمایا مہینہ میں بیس دن نماز پڑھو گی، دس دن سوؤ گی تو دین سے محروم ہی رہیں؟ اور نقصان دین کیا ہوتا ہے؟ اتنے دن دین سے بالکل محروم نہ نماز نہ روزہ، اور نقصان عقل یہ ہے۔ اگر عدالت میں شہادت ہوتو دوعورتیں ایک مرد کے برابر لی جاتی ہیں۔ گویا وہ آدھے مرد کے برابر ہیں۔ تو عقل بھی آدھی رہ گئی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کی جو خلقت ہے، وہ مرد کی نسبت کمزور ہے۔ جیسے قوی ظاہری کمزور ہیں، قویٰ باطنی بھی کمزور ہیں۔ (فہم اور عقل وغیرہ) مگر بھئی! یہ جنس کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بعض عورتیں ایسی بڑی عقل مند گزری ہوں کہ ہزاروں مرد بھی عقل وفہم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ وہ افراد کی بات ہے، یہ جنس کی بات ہے۔ جنس مرد کی قوی ہے۔ عورت کی جنس ضعیف ہے۔ اب اگر اتفاق سے کوئی عورت پہلوان بن جائے تو جنس اپنی جگہ رہے گی، افراد ایسے ہی نکلیں گے۔

جیسے ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک حمیدہ بانو پہلوان ہے۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو اس نے پچھاڑ دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مجھے کوئی نہیں پچھاڑ سکتا۔ ہر لڑائی کے اندر وہی پالا جیتتی ہے۔ اب جنس تو اس کی کمزور رہے گی۔ اتفاق سے ایک عورت ایسی بھی قوی نکل آئی جنس تو ناقص العقل رہے گی۔ لیکن اتفاق سے بعض عورتیں ایسی کامل العقل بھی گزری ہیں کہ انہوں نے سلطنتیں چلائیں ہیں۔ مردوں میں وہ عقل کی قوت نہیں، جو ان کے اندر ہے، تو وہ افراد کا قصہ ہے، افراد، آحاد دانش مند بھی نکلیں، شاعر بھی نکلیں، ادیب بھی نکلیں، محدِّث ومفسّر بھی نکلیں۔ مگر جنس جو ہے اس کی عقل میں بہرحال نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا: ''لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً'' ① وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنی سلطنت کے کاروبار عورت کے ہاتھ دے دیئے۔ یعنی اس کی عقل پہ چھوڑ دیئے وہ لے کے سارے کنبے کو ڈوبے گی۔ اس کی جیسی عقل ہے اس کے مطابق چلے گی۔ عورت کی عقل مرد کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ اتفاق سے کوئی اعلیٰ ترین عقل والی نکل آئے تو وہ ایک فرد کی بات ہوگی، جنس کی نہیں، بلکہ بعضوں کو، گدھوں سے بھی کم عقل ہوتی ہیں۔ بعضے ایسے بھی انسان نکلتے ہیں۔ مگر یوں نہیں کہا جائے گا کہ انسانوں کی جنس بے عقل ہے۔ مردوں کی جنس عقلمند، عورتوں کی جنس کم عقل، بعضی عورتیں بڑی عقل مند، بعضے مرد بڑے بے وقوف، یہ الگ قصہ ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ نقصان عقل بھی ہے، نقصان دین بھی ہے۔ اس واسطے تمہارا فرض ہے کہ مردوں کی ہدایت پر چلو۔ انہیں اپنی ہدایتوں پر مت چلاؤ۔ ورنہ وہ بھی ڈوبے گا اور پورا کنبہ بھی ڈوبے گا اگر تمہاری ہدایتوں پر چلا۔

عورت پر خاوند کیسے مہربان ہوسکتا ہے...... تو میں نے چند باتیں عرض کیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی غرض و

① الصحيح للبخاري، كتاب المغازي، باب كتاب النبي صلى الله عليه وآله وسلم الى قيصر...... ج: ۱۳، ص: ۳۳.

غایت کیا ہے؟ وہ باہمی سکون ومودت ہے۔نسل کی تکثیر خود بخود ہوگی۔احکام کیا ہیں کہ مرد کے ذمے شفقت واجب ہے۔عورت کے ذمے اطاعت واجب ہے۔مرد کا کام یہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ کرے۔ بیوی کا کام یہ ہے کہ کامل اطاعت کا برتاؤ کرے۔اور اپنے خلاف بھی ہو،تو سننے کی عادت ڈالے۔یہ نہ ہو کہ جہاں خاوند نے مزاج کے خلاف بات کہی اور اس کی ناک چڑی ہوئی ہے۔ایک کیا چار جواب دینے کو تیار۔اس سے بے مہری پیدا ہو جاتی ہے۔یہ واقعہ ہے کہ گھر کی گاڑی جب چلتی ہے،جب عورت خاوند کی مطیع ہو اور خاوند عورت کا مطیع بن جائے،مگر مطیع کب بنے گا؟ جب عورت انتہائی محبت اور ایثار کا برتاؤ کرے گی۔اطاعت،اطاعت کو کھینچتی ہے۔سرکشی کرے گی تو اسے بھی نفرت پیدا ہو جائے گی۔اگر کوئی عورت یہ چاہتی ہے کہ میرا خاوند بالکل میرے کہنے میں رہے،میرا غلام بن جائے۔تو پہلے خود غلام اور باندھی بن جائے۔وہ بھی مجبور ہو کے غلام بن جائے گا۔غلام بنانا،غلام بننے سے ہوتا ہے۔پہلے خود عملاً باندی بن کے دکھلائے وہ خود بخود غلام بن جائے گا۔اطاعت سے راحت ہوتی ہے؟ جتنی اس کی اطاعت کی جائے گی،وہ بھی اس کی اطاعت کرے گا۔تو عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے اس فکر میں رہے کہ کن چیزوں سے میرا خاوند ناخوش ہوتا ہے،میں وہ بات نہ کروں اور جن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے،قصداً ہی وہ چیزیں کروں کہ اس کا دل راضی ہو،جتنا راضی ہوگا،میرے اوپر مہربان بن جائے گا،میرا گھر چلے گا۔اور مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کی ذہنیت کیا ہے۔کن چیزوں سے یہ خوش ہوتی ہے۔وہ چیزیں کرے۔یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اپنی عورت کو راضی کرنے کے لئے اس کی خواہشات کچھ پوری کرے۔آخر اس کا کچھ حق بھی تو ہے۔وہ گھر میں آتی ہے،اپنے جذبات لے کر آتی ہے۔اگر خاوند ان جذبات کی رعایت نہیں کرے گا۔تو کیا محلے والے رعایت کریں گے؟ یہ خاوند کا فرض ہے۔جانبین سے جب یہ بات ہوگی،تو گھر کی گاڑی عمدگی کے ساتھ چلے گی۔پھر سکون ومحبت اور باہمی مودت پیدا ہو جائے گی۔

عورت کی طرف سے نافرمانی پر تنبیہ کے درجات......اس میں اگر اتفاق سے کوئی ناچاقی پیش آ گئی،تو جانبین کو ذرا صبر وتحمل سے کام لینا چاہئے۔یہ نہ ہو کہ ایک دم آپے سے باہر نکل کے وہیں جنگ چھڑ جائے۔چنانچہ قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہدایت کی فرمایا:﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ﴾ ① نیک بیویاں کون ہیں؟ جو قانتات ہیں،عبادت گزار ہیں۔اس لئے کہ جو اللہ کا حق ادا کرے گی،وہی خاوند کا حق ادا کر سکتی ہے۔جو حق تعالیٰ کی نافرمانی کرے،وہ کسی کی مطیع نہیں بن سکتی۔آگے فرمایا:''حٰفِظٰتٌ للغیب'' غیب کی حفاظت کریں،مرد کے رازوں اور اسرار کی۔بعض مفسرین نے لکھا ہے۔کہ غیب سے مراد خاوند کا مال ودولت ہے۔اس کی حفاظت کرے۔یہ سمجھے کہ میں اس کی نگراں ہوں۔اگر وہ باہر جائے تو گھر میرے سپرد ہے۔پوری طرح سے اس کی حفاظت کرے۔

① پارہ:۵،سورۃ النساء،الآیۃ:۳۴.

آگے فرماتے ہیں: ﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ﴾ ① جن عورتوں سے تمہیں یہ خطرہ ہو کہ اب یہ نافرمانی کریں گی۔ اس کا پارہ تیز ہو گیا ہے۔ اب ممکن ہے یہ جنگ پہ آ جائے۔ اور مقابل آ جائے۔ اس کی ہدایت دی۔ یہ نہ ہو کہ تم یہ محسوس کرو کہ بیوی میں غصہ بڑھ گیا ہے۔ یہ مدمقابل آئے گی۔ تم چار برے بھلے کہہ کے اس کے دل کو بیزار کر دو۔ فرمایا جس سے نافرمانی کا خوف ہو، وہ خفا ہو چکی ہے۔ کچھ زبان سے کہہ بھی رہی ہے، بکواس بھی کر رہی ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بالکل بات ٹوٹ جائے۔ تو پہلا درجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو برا بھلا کہہ کے گھر سے نکال دو۔ نہیں ﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ ② کچھ وعظ و نصیحت بٹھلا کے کرو۔ اور یوں کہے کہ شریف زادیوں کے یہ دستور نہیں ہوا کرتے۔ شریف گھرانے کی بیویوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرافت سے رہیں، اس طرح سے رہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے تو پیار و محبت سے سمجھایا جائے۔ جو شریف الطبع عورت ہوگی۔ وہ یہ لفظ سن کر فوراً پگھل جائے گی۔ اور غصہ ڈھیلا پڑ جائے گا۔ تو چار لفظوں سے نصیحت کرنا، یہ کارگر بن جائے گا اور جھگڑا و فساد ختم ہو جائے گا۔ گھر جنت بن جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی بے وقوف ہے کہ نصیحت نے اس پر اثر نہ کیا، اب بھی یہ نہیں کہا اسے جدا کر دو۔ یا معاذ اللہ اسے طلاق دے کر نکاح توڑ دو۔ نہیں۔ فرمایا جب نصیحت سے نہیں مانی، تو ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ ③ دوسرا علاج یہ ہے کہ اس کو بستر سے تنہا چھوڑ دو، اپنا مردانے میں آ کے لیٹنا شروع کر دو۔ جو شریف زادی ہے، طبیعت میں رعایت ہے، وہ سمجھے گی خاوند کی نگاہ پھر گئی ہے، راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے وہ تو گھر چھوڑ کے باہر بیٹھ گیا۔ مردانہ میں سونے لگا۔ اب گھر میں نہیں آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں مجھ سے بالکل ہی بیزار ہو جائے۔ کہیں گھر ہی اجڑ جائے، تباہ ہو جائے۔ تو اب پیام و سلام شروع ہو جائیں گے۔ آدمی پہنچے گا، تشریف لائیے، ذرا بات چیت کیجئے۔ وہ جو ایک بعد تھا، وہ ختم ہو جائے گا۔ تو اول درجہ یہ ہے کہ نصیحت کر دے، نصیحت سے نہ مانے تو اسے گھر میں تنہا چھوڑ کے باہر قیام کر لے۔ ایک رات نہیں گزرنی پائے گی کہ دماغ سیدھا ہو جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی کوڑھ مغز ہے کہ اس کو نہ نصیحت کا اثر ہوا نہ باہر کا۔ اس نے کہا میری جوتی سے اگر باہر لیٹ جائے، لیٹ جائے جا کے۔ پھر آ دے گا۔ دو دن میں آ دے گا، چار دن میں آ دے گا، جھک مارے گا، پھر آ دے گا۔ یہ جو ایسی کوڑھ مغز ہے تو اس کے بارے میں فرمایا ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ ④ تھوڑی سی تنبیہ تھوڑی سی مار پٹائی بھی ایسے حالات میں جائز ہے۔ مگر شریعت نے مار پٹائی کی صورت بھی بتلائی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لکڑی لے کے اس کے سر ہو جاؤ۔ غریب کے ہاتھ پیر توڑ دو، یہ نہیں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ''وَاضْرِبُوْهُنَّ'' (مار سکتے ہیں) کی تفسیر یہ کی ہے کہ اسی کا دوپٹہ لے کر ذرا اسے البیٹ دے کے دو چار مار دو۔ اس سے تم کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی طرف سے مجھے یہ بھی اختیار حاصل ہے۔

① پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴. ② پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴.
③ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴. ④ پارہ: ۵ سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴.

مارنا پیٹنا مقصود نہیں ہے۔تھپڑوں سے مارے یا لکڑی سے مارے۔یہ نہیں بلکہ اس کی صورت یہی ہے کہ اس کا دوپٹہ یا رومال لے کر ایک دو البیٹ دے کے رسید کرے۔چوٹ دوٹ تو اسے لگے گی نہیں۔وہ یہ سمجھ لے گی کہ اُوہو یہ کام بھی اس کو آتا ہے۔کل اگر اس کے ہاتھ میں لکڑی آگئی، تو کیا ہوگا؟ گھبرائے گی، مگر یہ اس کا علاج ہے جو کوڑھ مغز ہو۔جس پر نہ نصیحت اثر کرے، نہ بستر پر تنہا چھوڑ دینا اثر کرے۔ایسی کوڑھ مغز کا تو یہی علاج ہوسکتا ہے۔مگر اس کے باوجود اس کی اجازت نہیں کہ اس کو چھوڑ دو۔یا نکاح توڑ دو۔

﴿فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا﴾ ① اب اس کے بعد اگر اطاعت کرلے تو بس اب راستہ چھوڑ دو۔زیادہ اسے تنگ مت کرو۔مقصود پورا ہوگیا لیکن اگر کوئی ایسی احمق ہے کہ نہ نصیحت نے اثر کیا، نہ خاوند کے چھوڑ کر چلے جانے نے اس پر اثر کیا اور دو چار دوپٹے، البیٹ دے کے اس نے کھینچ مارے، اس کا بھی اثر نہ ہوا۔معلوم ہوا بڑی احمق ہے۔اس کے دل میں کوئی کجی اور عناد بھرا ہوا ہے، الٹی کھوپڑی کی ہے۔اس کے لئے اب چوتھا علاج ہے۔یہ نہیں کہا کہ اب اُسے نکاح سے جدا کردو۔یہ اب بھی اجازت نہیں دی۔

علاج یہ کہ اب تحکیم کا مسئلہ جاری کرو۔حَکَم بناؤ۔ایک حَکَم عورت کی طرف سے آئے، ایک حَکَم مرد کی طرف سے، دونوں طرف سے ایک ایک ثالث مقرر ہو۔وہ دونوں ثالث مل کر فریقین کی شکایتیں پیش کریں۔بیوی کا ثالث کہے کہ بیوی کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔خاوند کا ثالث کہے کہ خاوند کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔فرماتے ہیں حق تعالیٰ ﴿إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا﴾ ② اگر نیک نیتی سے یہ دونوں ثالث بات چیت کریں گے، تو اللہ ضرور اصلاح فرمادے گا اور صلح صفائی ہوجائے گی۔اور وہ جو کدورت بیٹھ گئی تھی، وہ نکل جائے گی۔

عندالضرورت آدابِ طلاق......لیکن اگر اتنا کوڑھ پڑ گیا ہے کہ بجائے خود ثالث بھی فیصلہ نہیں کرسکتے۔اب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے مزاجوں میں توافق نہیں ہے۔عمر بھر ان میں کھٹ پٹ رہے گی، لڑتے رہیں گے۔اب اجازت دی گئی کہ اتنے مرحلے گزارنے کے بعد اس حالت میں طلاق دے سکتے ہو۔لیکن طلاق میں میں نے جیسے عرض کیا ایک طلاق سنت ہے ایک طلاق بدعت ہے۔تو طلاق بدعت ممنوع ہے۔طلاق سنت یہ کہ ایک طلاق دے، تاکہ مدت عدت میں پھر تمہیں رجوع کرنے کا حق رہے۔اگر ایک دم تینوں دیدیں۔اور پڑ گئیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ بائنہ ہوگئی، بات ہاتھ سے نکل گئی۔بہت ممکن ہے۔بعد میں پچھتاوا پیدا ہو، کہ بھئی ایسے جھگڑے تو روز ہوجاتے ہیں۔میں نے اپنی بیوی کو الگ کردیا۔پھر بیٹھ کر روئے گا۔اور بیوی بھی روئے گی۔اس لئے فرماتے ہیں اگر مجبور ہوگئے ہو اور طلاق دینی ہی پڑے تو طلاق سنت ہی دو۔ایک طلاق دینے کے بعد عدت کی مدت گزارے۔عدت میں بلا نکاح رجوع کرسکتا ہے۔طلاق دینے کے بعد ممکن ہے دل میں آئے میں نے بڑی غلطی کی کہ طلاق دے دی۔معاملہ سنبھل سکتا تھا۔تو جدید نکاح کی ضرورت نہیں۔بس رجوع کرلے اس سے معاملہ

---

① پارہ: ۵سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۴۔ ② پارہ: ۵سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۵۔

شروع کر دے۔ وہ اس کی بیوی ہے۔ پھر بھی اگر نباہ نہیں ہوسکا، پھر آگے دوسری طلاق کا حق ہے۔ پھر آگے اس کی عدت ہے۔ اس میں پھر رجوع کرنے کی گنجائش ہے۔ جب کوئی بھی گنجائش نہ ہو اور معلوم ہو کہ یہ عورت ہی ایسے مزاج کی ہے اور یہ گھر ہی کو تباہ کر کے رہے گی۔ جب تیسری طلاق دے کے قصہ پاک کیا جاسکتا ہے۔

آپ نے اندازہ کیا کہ شریعت نے کتنی برداشت کی ہے۔ اگر لڑائی کا خوف ہو تو نصیحت کرو، نصیحت سے نہ مانے تو ذرا گھر میں اس کو تنہا چھوڑ دو۔ اس سے نہ مانے تو اس کے دوپٹے سے ذرا اس کو تنبیہ کر دو۔ اس سے بھی نہ مانے تو ثالث مقرر کر لو اور اس سے بھی نہ مانے تو طلاق سنت دے دو۔ نکاح کو قطع مت کرو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح کتنی محبوب چیز ہے کہ اسے توڑنا نہیں چاہتے۔ اور شیاطین کے ہاں اتنی مبغوض چیز ہے وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح نکاح ٹوٹ جائے۔ اور نا چاقی پھیل جائے۔ خاوند بیوی کو لڑانے والا شیطان بھی آتا ہے، تو اسے بڑا شیطان گلے لگاتا ہے کہ تو ہے میرا سپوت۔ تو نے بڑا کام کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ نکاح انبیاء علیہم السلام کو محبوب اور عزیز ہے۔ اور شیاطین کو نکاح کا ٹوٹنا عزیز ہے۔

اللہ کے جوڑ کو باقی رکھنے والے ہی نیک نہاد ہیں...... تو نیک نہاد وہ ہوں گے جو انبیاء علیہم السلام کے راستے پر چلیں گے۔ اور نکاح کرنے کے بعد دل میں عہد باندھیں کہ ہمیں صبر و تحمل سے اپنی بیوی کی داشت کرنی ہے۔ اس کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ اگر وہ تھوڑی بہت زیادتی بھی کرے گی، ہمیں صبر و تحمل کرنا ہے، درگزر کرنا ہے، اسے لئے کہ ہمیں گھر بگاڑنا نہیں ہے۔ اور گھر بھی الگ رہا۔ دو خاندانوں کو لڑوانا نہیں ہے۔ یہ خاوند اور بیوی کے مزاج کے اوپر موقوف ہے۔ یہ نیک نیتی سے سچا معاملہ رکھیں گے تو دو گھر بھی جڑے رہیں گے، دو خاندان جڑے رہیں گے۔ دو برادریاں آپس میں جڑی رہیں گی۔ انہوں نے بے وقوفی کی تو دو خاندانوں اور برادریوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ دارومدار ان دو کے اوپر ہے۔ اگر وہ دونوں حقوق پہچان لیں۔ نکاح کی غرض و غایت آداب اور وہ حقوق پہچان لیں جو شریعت نے بیان کئے ہیں تو گھر بار، برادری سب عزیز و اقارب درست اور اپنی جگہ رہیں گے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ ایک آدمی پوری برادری کو سنبھالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اور وہ کتنا برا انسان ہوگا جو پوری برادری میں پھوٹ ڈالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اس واسطے نکاح کا مرحلہ بڑا نازک بھی ہے اور آسان بھی ہے۔ آسان تو یہ کہ چار بول پڑھے گئے اور وہ جڑ گئے، نازک اس لئے کہ ذمہ داریاں اس میں بہت آجاتی ہیں۔ عورت کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ مرد کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ ان کا نبھانا صبر و تحمل والے کا کام ہے، جو ذرا ذرا سی چیزوں میں آپے سے باہر نکل جانے کا عادی ہو، وہ تو لڑائی ہی کرا کے رہے گا۔ خاندانوں میں بگاڑ ہی پیدا کر کے رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اس لئے نکاح کو اپنی آیت بتلایا، کہ یہ ہماری قدرت کی ایک بڑی نشانی ہے۔ ہم ہیں دلوں کے بدلنے والے جب اللہ دلوں میں جوڑ لگا دے۔ تو نیک طینت بندہ وہ ہے جو اللہ کے جوڑ کی عزت کرے۔ اسے مرتے دم تک باقی رکھے۔ اور اس کی غرض و غایت کہ تم سکون حاصل کرو، مرد عورت کی طرف رجوع

کر کے سکون حاصل کرے۔ عورت مرد کی خدمت کر کے سکون حاصل کرے۔ اور ان دونوں کے درمیان میں مودت، محبت اور رحمت کا علاقہ ہو، غضب وقہر اور توڑ پھوٹ کا علاقہ نہ ہو۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾ ① اس نکاح میں قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ میں کہتا ہوں ان ساری چیزوں کو ادا کیا جائے، تو ہر ہر چیز مستقل ایک قدرت کی نشانی ہے۔ اگر خاوند اور بیوی اس پر تیار ہوں اور عمل کریں تو ساری چیزیں نشانیاں بن جائیں گے۔ مگر ان کے لئے جو غور و تفکر کرتے ہیں اور عقل لڑاتے ہیں۔

''تبریک''......اس آیت کی روشنی میں یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کیں کہ اس وقت نکاح کی تقریب تھی۔ عزیز و اقرباء نے تو مبارک باد پیش کی۔ میری مبارک باد یہ ہے کہ میں نے نکاح کے بارے میں اس کے حقوق و آداب عرض کئے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں، ان دونوں خاندانوں کے سامنے لڑکے والوں اور لڑکی والوں کے لئے بھی۔ بس فرق اتنا ہی ہے کہ آپ حضرات نے عزیز داری کے ضمن میں مبارک باد دی۔ میں ایک خادم قوم ہونے کی حیثیت سے مبارک باد دیتا ہوں۔ اور خادم قوم کا کام یہی ہے۔ کہ خدمت کے طریقے پیش کر دے۔ یہ سب سے بڑی مبارک باد ہے اگر خاوند بیوی ان نصائح پر عمل کریں۔

تو سب سے بڑی مبارک باد کی بات فی الحقیقت یہی ہوگی۔ اور وہی نکاح باعثِ خیر و برکت ہوگا۔ اب آپ سب حضرات دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں خاوند بیوی میں باہمی محبت نصیب فرمائے۔ جو دو گھرانے آپس میں جڑے ہیں۔ ان دونوں کے اندر محبت و مودت کا رشتہ قائم ہو۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی میں لگے رہیں اور ایک دوسرے سے محبت و مدارات کا نفع حاصل کریں۔ ان کے دلوں میں سکون و تحمل رہے اور ایک دوسرے کے لئے خوشی کا باعث بنیں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا وَّآخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۲۱.

فلسفۂ موت

موت جیسے فزعِ اکبر ہے۔ جیسے عظیم ترین مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا۔ بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علقم پیدا ہونے کا، اور نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا۔ اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ . اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا. وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (1) اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ .

تمہید ...... بزرگانِ محترم! میری اس وقت حاضری کا مقصد ملتان میں نہ کوئی جلسہ تھا، نہ کوئی مجلس تھی نہ کوئی تقریب اور وعظ کا تخیل ذہن میں تھا۔ میری حاضری کا مقصد حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بانی مدرسہ خیر المدارس وملتان) کی وفات کے بعد یہ پہلی حاضری تھی تاکہ تعزیت ادا کروں۔ تعزیت کے لئے ہجوم اور مجمع نہیں ہوتا، اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، تو میں روک دیتا اور مجھے امید تھی کہ مولانا محمد شریف صاحب (مہتم مدرسہ خیر المدارس، فرزندِ ارجمند حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ) مان بھی لیتے لیکن اچانک آ کر معلوم ہوا کہ کوئی جلسہ بھی ہے اور اجتماع بھی۔ جلسہ اور تقریر میں ان سب کے لئے ضرورت پڑتی ہے نشاط کی، طبیعت میں انشراح ہو نشاط ہو۔ یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں مگر میں اس وقت حاضر ہوا ہوں ایک بجھے ہوئے دل کے ساتھ۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا غم سامنے ہے، یہاں آ کر تازہ ہو گیا۔ حالانکہ ان کی وفات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے مگر میرا تعلق اتنا قوی تھا ان سے اور قلبی رابطہ برسہا برس سے تھا۔

(1) پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۵۳.

مولانا مرحوم جب جالندھر میں مقیم تھے۔ پنجاب کا جو بھی میرا سفر ہوا دو جگہ اترنا لازمی ہوتا تھا۔ جالندھر میں مولانا مرحوم کی وجہ سے، اور امرتسر میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم کی وجہ سے۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا موحوم کا قیام ملتان میں ہوا۔ یہاں بھی ایک آدھ مرتبہ ان کی حیات میں حاضری ہوئی۔ اس وقت ان کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع ہے حاضری کا۔ تو وہ سارے تعلقات سامنے آگئے، وہ ساری تاریخ سامنے آگئی۔ اس وجہ سے دل پر غم کا ایک بوجھ ہے تو اس بجھے ہوئے دل سے میں کیا تقریر کروں اور کیا جلسے کا حق ادا کروں؟ اور اوپر خود میرا ابھی اب ضعیفی کا عالم ہے قوت بھی وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ جذبات بھی سرد پڑ چکے ہیں۔ ایسی حالت میں تقریر ہو تو کیا ہو؟

بہر حال جب ہو گیا ایک اجتماع اور حضرات جمع ہو گئے ان کا احترام بھی ضروری ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اس لئے غم کے سلسلے میں تعزیتی تقریر ہوگی۔ کوئی خاص وعظ ونصیحت اس میں نہ ہوگا۔

عالم کی بقاء روحانیت کی بقاء سے ممکن ہے...... حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات ایک مقناطیسی ذات تھی جو قلوب کا رجحان تھا، اور دل کھینچتے تھے اور ان کی وفات جیسا کہ مقولہ مشہور ہے۔ ''**موت العالم موت العالم**'' ''عالم کی موت فی الحقیقت عالَم کی موت ہے'' اس لئے کہ عالم کے ذریعے سے حیات پھیلتی ہے وہ حیات یہ نہیں ہے جو کھانے پینے کی ہے وہ حیات روحانی ہوتی ہے اور وہی حقیقی حیات بھی ہے اور وہی حقیقی روح بھی ہے، اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا ہے۔ اسی روح سے اقوام زندہ ہوں گی اور اسی روح کے نکل جانے سے پژمردگی طاری ہوگی۔

فرمایا ایک موقع پر کہ: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ①

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے یعنی اپنی روح آپ کے اندر ڈالی ہے وہ عالم کی روح ہے، اور وہ کتاب اللہ اور قرآن کریم ہے جس کو روح بتلایا گیا ہے۔ فی الحقیقت یہ زندگی ہے سارے عالم کی۔ یہ روح ایک فرد سے نکل جائے تو وہ مردہ ہو جائے گا۔ پوری کائنات سے نکل جائے تو کائنات بھی مردہ ہو جائے گی۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ'' ②

''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جس وقت اس عالم میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہوگا'' جب یک بھی باقی نہیں رہے گا تو قیامت آجائے گی۔ تو قیامت اس پورے عالم کی موت ہے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ اس عالم کی زندگی اور اس کی روح ''اللہ اللہ'' ہے۔ جب یہ روح نکل جائے عالم مردہ ہو جائے گا، اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ آسمان وزمین ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ساری کائنات کا شیرازہ منتشر

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ شوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

ہو جائے گا۔ غرض عالم کی روح وہ فی الحقیقت ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے، نہ صرف پورے عالم کی بلکہ ایک ایک جز کی روح بھی یہی ہے۔

''ہر چیز تسبیح خواں ہے''...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: درخت کی ہر ہر ٹہنی بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہے تسبیح بند ہو جاتی ہے اس پر زردی چھا جاتی ہے، وہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ روح نکل گئی، موت طاری ہو گئی۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ تسبیح بند ہو جاتی ہے جب کہ وہ ٹھہر جاتا ہے۔ تسبیح بند ہو جانے کے بعد ٹھہرا ہوا پانی سڑتا بھی ہے بدبودار بھی ہوتا ہے۔ یہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ تو پانی کی زندگی بھی تسبیح و تہلیل سے ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: امام کے لئے مکروہ تحریمی ہے کہ ایسے کپڑے پہن کر امامت کرائے کہ پسینے میں زرد ہوئے ہوں۔ پسینے کی بو آ رہی ہو۔ اس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ جب بدبودار کپڑے ہوں گے اور تعفن ہوگا تو مقتدیوں کو اقتداء کرتے ہوئے کراہت پیدا ہوگی، نشاط باقی نہیں رہے گا۔ جو ایک رابطہ ہے بندہ اور خدا کے درمیان میں وہ پورا قائم نہیں رہ سکے گا، اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ امام کے لئے صاف ستھرے کپڑے پہننا ضروری ہیں، اتنے میلے نہ ہوں کہ ان میں سے بدبو آنے لگے۔ رنگ بدل جائے، ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ بدبو سے متقدیوں کو عار پیدا ہوگی۔

حقیقی وجہ یہ ہے کہ کپڑا گندا ہو کر اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ ذکر اللہ منقطع ہو جاتا ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، انقباض پیدا ہوتا ہے روح میں۔ تو درحقیقت عالم قائم نہیں رہے گا۔ عالم کی جزیات ختم ہو جائیں گی تو ہر ہر چیز اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ①

''کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں ہے جو حق تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف نہ ہو۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھتے یا آواز کو نہیں سنتے۔'' تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے اور درحقیقت وہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے اپنی زبان میں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیر دھاڑ رہا ہے۔ فی الحقیقت وہ اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ پرندے سیٹیاں بجاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چہچہا رہے ہیں۔ حقیقت میں وہ ذکر الٰہی میں مصروف ہیں اپنی زبان میں۔ تو ؎

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کو اللہ نے ایک زبان دی ہے۔ وہ اپنی زبان میں اللہ کی حمد و ثناء اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ ہم اس کی زبان کو نہیں سمجھتے، اور ہم ان کی زبان کو اگر نہیں سمجھتے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے ہی بھائی بندوں کی سب زبانیں کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی پشتونی آدمی پشتو میں اللہ کو پکارنے لگے، دعائیں مانگنے لگے، ہم کیا کریں گے،

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴.

بیٹھے ہوئے دیکھتے رہیں گے۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ٹھیٹھ پنجابی میں آپ بولیں تو میں کیا سمجھ لوں گا۔ کوئی انگریزی میں اللہ کو پکارے تو ہم کیا سمجھیں گے، تو ہزاروں زبانیں دنیا میں رائج ہیں انسانوں میں۔ ہم اپنے بھائی بندوں کی زبانیں نہیں جانتے۔ اگر پرندوں کی زبان بھی نہ جانیں تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ ہر ایک کی ان کی ایک تسبیح ہے...... اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے نہ سمجھیں۔ تو فرمایا گیا:

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ.﴾ ① تم ان کی تسبیح کو نہیں پہچانتے باقی معجزے کے طور پر اگر اللہ کسی کو بتلا دے پرندوں کی بولیاں تو اس کی قدرت ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ.﴾ ② اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں بتلا دی گئی ہیں۔

جب پرندے بولتے تو سلیمان علیہ السلام فرماتے کہ یہ فلاں بات کہہ رہا ہے۔ وہ سمجھتے تھے ان کی بولیوں کو۔ یہ آواز کبھی آسکتی ہے ہم لوگوں کے کان میں بھی معجزانہ طریق پر، جیسے کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر کے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے زور زور سے آواز آرہی تھی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سن رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں دے دیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ انہوں نے وہ کنکریاں دیں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ جب اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو منتقل کی گئیں تو تسبیح کی آواز سننا بند ہوگئی۔ تسبیح جاری رہی ہوگی مگر سنائی نہیں دی۔ اعجازی طور پر ہم سن بھی سکتے ہیں۔ جب اللہ کا کوئی معجزہ کسی پیغمبر کے ہاتھ ظاہر ہونا چاہے۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ٹیلیگراف آفس میں جائیں اور جا کر کہیں کہ بھائی یہ تار دے دو، کہ میں فلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔ اس نے پیتل کی ٹلی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ شروع کی۔ تو آپ کہیں گے کہ: احمق آدمی میں نے یہ کہا ہے، کہ میرے آنے کی اطلاع دے دو۔ تم نے کھٹ کھٹ شروع کردی، وہ کہے گا احمق تو تُو ہے۔ اسی کھٹ کھٹ میں یہ سارا علم پہنچ رہا ہے دوسرے ملک میں۔ باقی تو اس کھٹ کھٹ کی آواز سے واقف نہیں ہے۔ میں نے اس کی مشق کی ہے، اس کا فن حاصل کیا ہے۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ ایک دفعہ کھٹ ہوگی تو الف مراد ہوگا۔ دو دفعہ ہوگی تو ب مراد ہوگی۔ تین دفعہ ہوگی تو ج مراد ہوگا۔ تو کھٹ کھٹ سن رہا ہے۔ اور حقیقت میں یہ علم ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہو رہا ہے، تو اس فن کو حاصل کرے گا۔ تو تجھے بھی معلوم ہو جائے گا۔ نہیں حاصل کرے گا، تو نہیں پتہ چلے گا۔

تو جس طرح ہم اس کھٹا کھٹ سے علم نہیں سن سکتے۔ نہیں سمجھ سکتے اسی طرح جانوروں کی آوازوں کو ہم سنتے ہیں مگر تسبیح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ان کی زبان میں تسبیح ہے، ذکر ہے اپنی زبان میں، وہ کر رہے ہیں۔

ملائکہ علیہم السلام کو بھی مختلف تسبیحات دی گئی ہیں۔ وہ اپنی زبان میں تسبیح کرتے ہیں، ممکن ہے ان کی زبانیں بھی

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴۔ ② پارہ: ۱۹، سورۃ النمل، الآیۃ: ۱۶۔

متعدد ہوں۔ اپنی اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، بعض روایات میں ان کی تسبیحات بھی آئی ہیں۔ جیسے فرمایا گیا ہے کہ بعض ملائکہ کی تسبیح ہے کہ: ''سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰى وَزَيَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَائِبِ'' ''پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو زینت دی ہے ڈاڑھیوں سے، اور عورتوں کو زینت دی ہے مینڈیوں اور چوٹیوں سے''۔

یہ ان کی زبان میں تسبیح ہے ان کی۔ وہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ تو مختلف تسبیحات ملائکہ بھی کرتے ہیں، جنّات بھی کرتے ہیں۔ آسمان بھی تسبیح میں مصروف ہیں، زمین بھی تسبیح میں مصروف ہے۔ ستارے بھی تسبیح میں مصروف ہیں۔

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ ①...... قرآن کریم نے خطاب فرمایا ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ آسمانوں میں جو ہیں وہ بھی مصروف، پہاڑ۔ اور یہ تو ہے تسبیح۔

ہر چیز نمازی بھی ہے...... قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز نمازی بھی ہے اپنے اپنے انداز سے نماز بھی ادا کرتی ہے۔ فقط ذکر ہی میں مصروف نہیں ہے۔ دعویٰ کیا ہے قرآن کریم نے:

﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ ②

''ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی پہچان لیا ہے اور اپنی تسبیح کو بھی جان لیا ہے۔'' تو ہر ایک مخلوق نماز پڑھ رہی ہے۔ باقی اس کی نماز اسی انداز کی ہے جیسے اللہ نے اس کی ساخت بنائی ہے، جیسے اس کی ہیئت بنائی ہے اس ڈھنگ کی اس کی نماز بھی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ رکوع اور سجدہ نہیں ہے، وہ ایک انچ نہیں ہٹ سکتے۔ اطاعتِ خداوندی میں لگے ہوئے ہیں۔ چوپائیوں کی نماز میں رکوع ہے۔ ان کی ہیئت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت سر کو جھکائے ہوئے رکوع میں ہیں۔ حشرات الارض ہیں، سانپ، بچھو، کیڑے، مکوڑے، ان کی نماز سجدہ سے ہے۔ قیام اور رکوع نہیں ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے۔ جیسے انسان زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی نماز تشہد کے ساتھ ادا ہو رہی ہے، تسبیح میں مصروف ہیں۔

جنت اور دوزخ کی نماز دعاء مانگنا ہے۔ جنت بھی دعاء کر رہا ہے کہ: اے اللہ! مجھے بھر دے اور وعدۂ خداوندی ہے کہ ہم بھر دیں گے۔ جہنم کی بھی یہی صدا ہے کہ مجھے بھر دیجئے، میری غذا مجھے پہنچایئے۔ قیامت کے دن دوزخ کو بھر دیا جائیگا۔ اہل جہنم جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ مگر دونوں کی آواز بند نہیں ہوگی۔ جہنم کہے گا ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'' اور لایئے ابھی تو میں خالی ہوں، جنت کہے گا میرے ہزاروں شہر خالی پڑے ہیں۔ آبادکاری فرمایئے، آپ کا وعدہ ہے کہ بھر دیں گے، تو جنت کے لئے حق تعالیٰ ایک مستقل مخلوق پیدا فرمائیں گے، جس سے آبادکاری ہوگی جنتوں کی۔ جہنم کے لئے مستقل مخلوق نہیں بنائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ اپنا قدم رکھ دیں گے اس پر، جیسا قدم ان کی جناب کے لائق ہے، تو وہ کہے گا قط قط۔ بس بس۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے میں بھر گیا۔ اس کی دعاء قبول

① پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۱۸۔ ② پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱۔

ہو جائے گی۔تو جنت اور جہنم کی نماز دعاء مانگنے سے ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کی نماز ہے صف بندی، کروڑوں ملائکہ صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ ہزار ہزار برس سے، کوئی جماعت رکوع میں ہے۔کوئی جماعت سجدہ میں ہے۔کوئی قیام میں ہے۔صفیں بنی ہوئی ہیں۔صف بندی ان کی نماز ہے۔سیارے ہیں جو گھومتے ہیں، ان کی نماز حرکت دوراں ہے کہ جہاں سے چلے تھے پھر وہیں لوٹ آئیں۔گھومنا ہی ان کی نماز ہے۔

اسلام کی نماز کی عظمت اور جامعیت...... یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اسلام کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کر دی ہیں۔درختوں کا سا قیام بھی ہے، چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔جنت و دوزخ کا سا سوال و دعاء بھی ہے اور سیارات کا سا دوران بھی ہے۔اس واسطے کہ ایک رکعت پڑھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔اس کے ساتھ ایک اور ملاؤ تا کہ شفعہ بن جائے تو دو یا چار رکعت کی نماز میں آپ کیا کرتے ہیں، جو کام پہلی رکعت میں کیا الحمد پڑھی، سورت پڑھی، تسبیح پڑھی...... دوسری رکعت میں پھر وہیں سے شروع کر دیتے ہیں، وہی الحمد، وہی سورت، وہی تسبیح، وہی تحمید۔تو جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آگئے ایک دور ہے تمہاری نماز میں۔تو سیارات جیسی گردش بھی آپ کی نماز میں۔تو جامع ترین نماز ہے کہ جتنی ہیئتیں ممکن ہیں عقلاً وہ سب دی گئی ہیں، تا کہ بندہ عبادت اور تذلل کے ساتھ پیش ہو، کھڑا ہو تو تذلل، بیٹھے تو اپنی ذلت کا اظہار، جھکے تب ذلت کا اظہار۔

عبادت کا صحیح مفہوم......غرض عبادت نام ہے اظہار تذلل کا۔انتہائی درجہ کی ذلت اپنی پیش کی جائے۔اس لئے کہ جس ذات کے سامنے آدمی کھڑا ہوتا ہے وہ انتہائی عزت کے مقام پر ہے کہ اس کے بعد کوئی درجہ نہیں عزت کا۔ اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کی جائے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔تو ذلیل محض بن کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا۔اس لئے کہ وہ عزت کے انتہائی مقام پر ہے اس کا فرض ہے کہ ذلت کے انتہائی مقام کو پیش کرے۔کھڑے ہوتے ہیں آپ جامد و ساکت۔یہ ایک درجہ ہے اظہار ذلت کا۔رکوع کیا تو گردن جھکا دی، یہ دوسرا درجہ ہے اظہار ذلت کا۔اس کے بعد ہاتھ اٹھائے، دعائیں مانگیں، تو بھیک مانگنا، یہ سب سے زیادہ انتہائی درجہ ہے ذلت کا۔تو جتنی ہیئتیں ہیں وہ سب اظہار تذلل کی ہیں۔جتنے اذکار ہیں نماز میں یا عظمتِ خداوندی کا اظہار ہے یا اپنی نیاز مندی کا اظہار ہے۔انہی دو چیزوں پر مشتمل ہیں تمام اذکار، تو ذکر بھی، افعال بھی، ہئیت بھی سب اظہار ذلت کے ہیں نماز میں۔

صرف نماز اپنی ذات میں عبادت ہے......اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ حقیقی معنوں میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔دوسری عبادات اور [illegible] سے عبادت بنی ہیں، اپنی ذات سے عبادت نہیں۔نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔ روزہ......اس کا معنی یہ ہے کہ کھانے پینے سے آدمی مستغنی ہو جائے، تو کھانے سے، پینے سے، بیوی سے مستغنی

ہونا، یہ اللہ کی صفت ہے۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ مشابہت ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ کہ کھانے سے بھی بری، پینے سے بھی بری، بیوی سے بھی بری، تو یہ اظہار ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اظہار عزت ہے۔ یہ عبادت تعمیل حکم کی وجہ سے ہے۔ حکم دیا تعمیل کرو تو بن گئی عبادت۔

زکوٰۃ...... اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔ اس کے معنی عطا کرنے کے ہیں کہ فقیروں کو دو، عطا کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ یہ تشبیہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو عین عزت ہے۔ زکوٰۃ عبادت بنی اس لئے کہ حکم ہے کہ زکوٰۃ دو، تو تعمیل ارشاد نے اس میں پیدا کر دیئے معنی عبادت کے۔ اس طرح سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں اور وہ عبادت ہے لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں یہ تو اللہ کی صفت ہے۔

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا۔ ①

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔ ②

تو سچ کہنا اور سچ بولنا حق تعالیٰ کی شان ہے بندہ اگر سچ بولے گا تو مشابہت پیدا کرلے گا کمالات خداوندی کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہے یہ تو عین عزت ہے۔ پھر بھی وہ عبادت ہے کہ حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اللہ کا کہنا ہے سچ بولو۔ تعمیل کے لئے گردن جھکا دی کہ سچ بولوں گا۔ سچ کو عبادت بنا دیا تعمیل حکم نے۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں تھی۔ ورنہ اللہ کی صفت نہ ہوتی۔

صرف نماز پوری کائنات پر فرض ہے...... لیکن نماز کی ہر ہیئت اظہار ذلت کے لئے ہے۔ ہر ذکر بھی اپنی ذلت کے اظہار پر مشتمل ہے اس واسطے نماز اپنی ذات سے عبادت ہے محض تعمیل حکم سے عبادت نہیں، اس کے اندر خاصیت ہی اظہار تذلل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری کائنات پر فرض کی گئی ہے۔ زکوٰۃ، حج اور سچ بولنا فرض نہیں کیا گیا، فرمایا گیا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ③ ہر چیز نے اپنی نماز کو پہچان لیا۔ یہ نہیں فرمایا: ''كُلٌّ قَدْ عَلِمَ حَجَّهٗ، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ زَكٰوتَهٗ۔'' تو نماز کائنات کی ہر چیز پر فرض کی گئی ہے۔ انسان، جن، فرشتہ درخت، پہاڑ اور پتھر سب کے لئے عبادت اور نماز لازمی قرار دی گئی ہے تو اصل معنیٰ کے لحاظ سے نماز ہی عبادت ہے۔ بقیہ عبادتیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادتیں بنی ہیں۔

ربط مع الحق بدوں نماز ممکن نہیں...... یہی وجہ ہے کہ بندے کا حقیقی رابطہ اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ آپ زکوٰۃ دیں گے تعلق مع الخلق درست ہو جائے گا۔ غریب کی خبر گیری ہوگی، وہ آپ کا ممنون ہوگا۔ تعلقات استوار ہو جائیں گے، اس تعمیل کی وجہ سے اللہ سے بھی تعلق پیدا ہوگا، مگر حقیقتاً وہ تعلق ہے مخلوق کے ساتھ۔ اس واسطے رابطہ بندے کا اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر نماز میں قصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رابطہ حق تعالیٰ سے قائم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر (نماز میں) دوسرا خیال لاتا ہے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حق تعالیٰ

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۲۲۔ ② پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۸۷۔ ③ پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱۔

فرماتے ہیں: میرے ہوتے ہوئے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے تجھے حیا نہیں آتی۔ اگر متنبہ ہو گیا بندہ، پھر تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ نہ ہوا تو پھر خود بے رخ بن جاتے ہیں۔ توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اٹھک بیٹھک رہ جاتی ہے۔ تو نماز سے ہی فی الحقیقت رابطہ قائم ہوتا ہے۔

نماز سے دیدارِ خداوندی کی استعداد...... اس لئے حدیث میں فرمایا گیا: تمام نمازوں کے بارے میں اور خصوصیت سے صبح اور عصر کی نمازوں میں کہ ان دونوں سے استعداد پیدا ہوتی ہے دیدارِ خداوندی کی۔ نماز ہی سے اللہ کو دیکھنے کی صلاحیت بندہ میں آتی ہے۔ عمر بھر نماز پڑھتا رہے گا تو ابتداء عقیدے کی آنکھ سے دیکھے گا، پھر کشف کی آنکھ سے دیکھے گا۔ اور پھر ایک وقت آئے گا کہ آخرت میں اس آنکھ سے بھی دیکھ سکے گا۔ تو مقصودِ اصلی عبادت سے معبود کو دیکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے اور یہ صرف نماز سے ممکن ہے۔ تو حقیقی عبادت نماز ہی ہے۔

روحِ خداوندی ہر چیز میں موجود ہے...... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ: حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا۔ اس روح کے اندر یہ عبادات بھی شامل ہیں۔ تعمیل ارشاد ہی اس کی روح ہے فی الحقیقت، بندے میں اللہ نے قرآن کی روح ڈال دی تا کہ اس میں بندگی پیدا ہو اور اللہ کی معبودیت ظاہر ہو۔ ''وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا''۔ پیغمبر! عالم امر کی روح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈال دی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے سے وہ روح ہم تک پہنچ گئی، ہمارے اندر بھی وہ روح ہے ہم اس روح کو داخل رکھیں گے تو قوی رہیں گے۔ قوت کی علامت اس روح کی برقراری ہے اور ضعف کی علامت اس روح کا نکل جانا ہے۔

مسلم اقوام کی پریشانی کا علاج...... دنیا میں مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ فلاں قوم نے ہمیں تباہ کر دیا، فلاں قوم نے اپنی مکاریوں سے ہمیں پریشان کر دیا۔ ہماری جائدادیں ختم کر دیں۔ ہمارے جان و مال کو ختم کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ: یہ شکایت بالکل غلط ہے...... شکایت تو کفار کو ہونی چاہئے کہ تمہاری نا ہنجاری سے ہم بدعنوان بن گئے۔ اگر تم صحیح معنوں میں اپنے دین پر قائم رہتے تو ہم تمہاری ٹھوکروں کے نیچے رہتے، ہم تمہاری اتباع کرتے لیکن جب تم اپنے نہج پر نہیں ہو تو ہم سے کیا توقع رکھتے ہو، کہ ہم تمہاری پیروی کریں یا پابندی کریں۔

تو حقیقت میں شکوہ ہے مسلمانوں کا۔ مسلمانوں کا حق نہیں ہے غیر اقوام سے شکوہ کرنے کا مسلمان آیا تھا دنیا کی اقوام کو درست کرنے کے لئے۔ اس کو اقوام امام بنایا گیا، امام ہی کا وضو نہ ہو تو کیا مقتدیوں کی نماز ہو جائے گی؟ اقوام کیوں اس کی اقتداء کریں گی۔ اور کیوں کر اس کی پیروی کریں گی؟

اس لئے کہ وہ قوت اس نے ختم کر دی جو غالب اور قاہر تھی اقوام پر۔ وہ روح ہوا کی طرح بھری ہوئی تھی۔ جب تک وہ ہے مسلمان قوی ہے، وہ نکل گئی مسلمان ضعیف ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ گیند ہے اس میں ہوا بھری ہوئی ہے اگر آپ اسے زمین پر پٹخ دیں تو گردا کھا کے دس گز اوپر جاتی ہے اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے اس میں۔ اور اگر اس میں سوئی چبھو دی جائے تو ہوا نکل جائے گی، تو جہاں ڈالیں گے، وہیں پڑی رہ جائے گی۔ اس کو آپ

پیروں سے پامال کر دیں، وہ اٹھنے کا نام نہیں لے گی، اس لئے کہ روح نکل گئی۔

روح اسلامی نکلنے سے مسلمانوں کا انجام..... مسلمانوں کی روح قرآن پاک ہے۔ اقوام کی یہ مجال نہیں کہ اس کو دبائیں، دبائیں گے پنج دیں گے نیچے، تو یہ دس گز اوپر جائے گا، اور اوپر ہی جائے گا۔ ''اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی'' (حق غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) لیکن یہ روح نہیں ہوگی، تو جہاں ڈالیں گے وہیں پڑا رہے گا۔ آج اگر مسلمان پامال ہو رہے ہیں، نہ اس لیے کہ کفار میں جان ہے۔ اس لئے کہ تم بے جان ہوگئے، جو روح تھی وہ نکال باہر کی، تو روح نکل جانے کے بعد آدمی لاشہ بن جاتا ہے۔ لاشہ کے لئے ہر انسان کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ دبائے، جلائے یا اسے دفن کر دے (الغرض آنکھوں سے اوجھل کرنا سب کے نزدیک ضروری ہے، اس دنیا میں اب اس کا کوئی مقام نہیں) اس کو گھر نہیں چھوڑتے، باہر نہیں چھوڑتے۔ اس کے تعفن سے دنیا کی صحت خراب ہوگی۔ پہلا کام یہ کرتے ہیں اسے دفن کرتے ہیں، کوئی جلاتا ہے، کوئی پانی میں بہا دیتا ہے، اور کوئی برا نہیں مناتا۔ لیکن اگر زندہ آدمی کو کوئی جلائے، تو گورنمنٹ ہی مدعی ہو جائے گی کہ اسے پھانسی دو، قوم بھی مدعی بنے گی کہ یہ بدکار ہے، مجرم ہے، روح کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں ہے کہ دبائے، دبائے گا تو مجرم ثابت ہوگا۔ لیکن جب روح نکل جائے گی، جس کا جی چاہے جلا دے، دفن کر دے، تو مسلمانوں کا یہ شکوہ کرنا کہ فلاں قوم نے ہمیں جلا دیا، یا فلاں نے گرا دیا، میں کہتا ہوں غلط ہے۔ اس نے خود اپنے کو گرا دیا ہے، جب روح نکال دی، زندگی ختم ہوگئی زندہ آدمی کو کوئی نہیں جلا سکتا۔

عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے..... میں عرض یہ کر رہا تھا کہ: حقیقی معنیٰ میں حق تعالیٰ نے دینی روح (مسلمان میں) ڈال دی، اور وہ ہے قرآن مجید۔ ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (1) تو اس عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب یہ نکل جائے گی، تو عالم لاشہ کی مانند ہو جائے گا، اور لاشہ کا انجام پھولنا، پھٹنا، سڑنا، گلنا اور ریزہ ریزہ ہو جانا ہے۔ ایک ایک چیز کا ذرہ ذرہ پھٹ جائے گا قیامت کے دن، یہ عالم کی موت ہوگی اور یہ اس لئے واقع ہوگی کہ روح نکل جائیگی۔

روح کا حسی مرکز..... اس روح کا سب سے بڑا حسی مرکز بیت اللہ شریف ہے، جس کے ذریعے چلتی ہے اسی میں تجلی خداوندی ہے، جس کے سامنے ہم جھکتے ہیں۔ یہیں سے بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انوار و برکات چلتے ہیں۔ تو یہ مرکز روح ہے فی الحقیقت، قیامت کا جب قرب ہوگا اور روح اٹھنے والی ہوگی تو حدیث شریف میں ہے کہ بیت اللہ کو ایک حبشی غلام ریزہ ریزہ کر دے گا۔ ایک ایک پتھر اس کا جدا کر دے گا۔ تو سب سے پہلے بیت اللہ ختم ہوگا۔ پھر عالم پر قیامت طاری ہو جائے گی۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ کا لشکر چلتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ نصب کیا جاتا ہے تاکہ بادشاہ آ کر

(1) پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۵۲.

ٹھہرے، ان کے ارد گرد ان کے دربار کے اُمراء کے خیمے لگتے ہیں، پھر فوجیوں کے خیمے لگتے ہیں، جب بادشاہ آتے ہیں تو بڑا شہر بن جاتا ہے لیکن جب کیمپ اجڑتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جاتا ہے بعد میں اورامراء کے خیمے اکھڑتے ہیں اور پھر میدان خالی ہو جاتا ہے، یہی صورت یہاں بھی ہے وہ خیمۂ خداوندی کہ تجلیات الٰہیہ اس میں مقیم ہیں، سب سے پہلے اس کو عالم میں قائم کیا گیا۔ فرمایا گیا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ.﴾ ① ”سب سے پہلا گھر جو اللہ نے عبادت کے لیے قائم کیا وہ وہ ہے جو مکہ شہر میں ہے اس کا نام کعبہ مقدس ہے۔“ یہ گویا خیمہ شاہی ہے جب عالم کو آباد کرنا ہوا تو سب سے پہلے خیمہ شاہی نصب کیا گیا اور جب عالم کا خیمہ اکھڑے گا اور یہ دنیا ختم ہوگی، تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جائے گا۔ جب بیت اللہ کی ایک حبشی غلام اینٹ سے اینٹ بجادے گا اور تجلی خداوندی اسے چھوڑ دے گی۔ اس کے بعد عام مساجد بھی ویران ہوں گی۔ تمام اہل اللہ کے ذکر خانے (خیمے) بھی ویران ہوں گے، اور ساری دنیا ویران ہو جائے گی۔ تو اولین چیز وہ شاہی خیمہ ہے جو سب سے پہلے نصب ہوتا ہے کیمپ میں اور اکھڑنے کے وقت سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھڑتا ہے۔ تو اولین چیز جو قائم کی گئی وہ بیت اللہ ہے اور ابتداء میں قیامت کے قرب میں وہ سب سے پہلے اکھاڑا جائے گا۔ بہر حال وہ روح ذکر اللہ ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اسی کی بقاء سے عالم باقی ہے۔

فلسفۂ موت اور علماء ربانی کی شان..... تو موت فی الحقیقت نام ہوا ذکر اللہ کے منقطع ہو جانے کا یہ منقطع نہ ہو تو آدمی مرتا نہیں۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ”مَثَلُ الذَّاكِرِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَمَثَلِ الْحَيِّ فِي الْاَمْوَاتِ.“ ② ”غافلوں کے اندر ایک بھی ذکر اللہ کرنے والا موجود ہے تو وہ مثل زندہ ہے، وہ غافلوں میں سے نہیں اس لئے مردوں کے اندر وہ زندہ ہوتا ہے۔“

تو علماء ربانی کی شان یہی بتائی گئی ہے کہ ان کا دل، روح اور دماغ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتا ہے۔ یہ اثر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ان کا صدقہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ فرمایا گیا ہے: ”كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ.“ ③ ”کوئی لمحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ سے خالی نہیں ہوتا تھا۔“ زبان سے ذکر کریں۔ قلب سے ذکر کریں، جس کو فکر کہتے ہیں۔ روح سے ذکر کریں جس کو توجہ کہتے ہیں اور معرفت کہتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طریق پر ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ ”موت العالم موت العالَم“ تو ایسے عالم کا اُٹھ جانا، پورے عالم کا اٹھ جانا ہے، کیونکہ وہ روح نکل جاتی ہے تو پورے عالم پر ایک پژمردگی چھا

---

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶۔ ② مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب المساجد و مواضع الصلوۃ، ج: ۳ ص: ۱۹۵ حدیث صحیح ہے، امام بخاریؒ نے بھی اس کے مثل روایت کی ہے دیکھئے: الصحیح للبخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ج: ۲۰ ص: ۲۳۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب الحیض، باب ذکر اللہ تعالیٰ فی حال الجنابۃ وغیرھا ج: ۲ ص: ۲۹۷۔

جاتی ہے۔ تو میں نے (ابتداء میں) عرض کیا تھا کہ مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جیسے ان کے نام میں خیر ہے ان کے مسمّٰی میں اللہ نے خیریت ہی رکھی تھی۔ اور واقعتاً خیر ہی خیر تھے۔ حدیث کا پڑھنا پڑھانا، قرآن پاک کا پہنچانا، مواعظ سے تبلیغ و تلقین کرنا۔ اپنے پروردوں کی تربیت کرنا، غرض ذکر اللہ ہی ان کا مشغلہ تھا کسی بھی انداز سے ہو۔

ایسے عالم ربانی کا اٹھ جانا یقیناً پورے عالم کے لیے موت کا بھی اور علامات موت کا یقیناً اشارہ ہے۔ جب کوئی عالم ربانی اٹھتا ہے تو قلوب محسوس کرتے ہیں کہ ایک قسم کی ظلمت طاری ہوگئی ہے۔ پورے عالم میں روحانیت میں کمی آ گئی۔ ہر شخص محسوس نہیں کرتا، صاحب دل جانتا ہے کہ نورانیت میں کتنی کمی آتی ہے، اسی واسطے فرمایا گیا کہ: ''اَلْمَوْتُ اَلْفَزْعُ الْاَکْبَرُ'' ''موت سب سے زیادہ گھبرا دینے والی چیز ہے۔'' مگر مجھے ساتھ یہ بھی عرض کرنا ہے کہ موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے، وہاں ایک تحفہ بھی ہے۔ ایک نعمت بھی ہے یہ نعمت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر موت نہ ہو عالم کی آبادکاری نہیں ہوسکتی۔

اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ...... ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو ملائکہ علیہم السلام کے سامنے پیش کیا۔ اربوں، کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے ہیں۔ ملائکہ نے انہیں دیکھ کر عرض کیا۔ یا اللہ یہ زمین میں سمائیں گے کیسے؟ یہ تو تین ارب ہوجائیں گے تو اسی وقت کہیں گے کہ نس بندی کراؤ فیملی پلاننگ کرو۔ ایک طوفان برپا ہے۔ اگر وہ پچاس ارب ہوجائیں تو زمین کا کیا حشر ہوگا؟ تو ملائکہ کو یہ خلجان گزرا کہ زمین میں یہ کیسے سمائیں گے؟

حق تعالیٰ نے کہا کہ: موت مسلط کردوں گا۔ آئیں گے بھی جائیں گے بھی، زمین خالی ہوتی رہے گی۔ اگلے آتے رہیں گے، پچھلے جاتے رہیں گے۔ تو میں نے موت کا سلسلہ قائم کیا تاکہ جانے والے جائیں، اور آنے والے خالی جگہ آ کر بستے جائیں۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا جب موت مسلط ہوگی تو ہر وقت موت کی فکر لاحق ہوگی، ان کی زندگی تلخ ہوجائے گی۔ نظام دنیا کیسے چلے گا؟ ہر وقت موت کی فکر میں غرق رہیں گے۔ فرمایا: حق تعالیٰ نے کہ اُمیدیں مسلط کردوں گا ان کے قلوب پر۔ اُمیدوں میں لگے رہیں گے، موت کا دھیان بھی نہیں ہوگا، نظام دنیا چلتا رہے گا۔

بہرحال موت جہاں ''فزع اکبر'' ہے گھبرا دینے والی چیز ہے۔ وہاں آبادکاری کا بھی ذریعہ ہے اگر موت نہ ہوتی تو اس زمین پر آبادکاری ممکن نہ ہوتی۔ تو مسافروں کی طرح آتے ہیں انسان اور چلے جاتے ہیں۔ جگہ خالی کردیتے ہیں۔

موت دنیوی تحفہ بھی ہے...... اور اگر دنیوی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی موت ایک عجیب نعمت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''الموت تحفة المؤمن'' [1] ''موت سب سے بڑا تحفہ ہے مومن کے لئے'' اس سے بڑھ کر

---

[1] علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه الديلمي عن جابر بزيادة: والدرهم والدينار مع المنافع وهما زاده الى النار، ورواه عن عائشة بلفظ: الموت غنيمة والمعصية مصيبة والفقر راحة. دیکھئے: كشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۰.

اللہ کی طرف سے کوئی نعمت نہیں دی گئی اور کیوں ہے وہ تحفہ؟ اس کی وجہ بھی حدیث میں ہے: ''اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یَصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ'' ''موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے حبیب سے جاملتا ہے''۔ تو محبوب حقیقی سے مل جانا، یہ کوئی گھبرانے کی چیز ہے؟ یہ کوئی مصیبت ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہوئی۔ بندہ اپنے خدا سے جاملے تو جس طرح کسی بندے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے ہیں، میں کہتا ہوں موت بھی خوشی کی چیز ہے۔ (اس پر بھی خوشیاں منانے کا اہتمام ہوا کرے) مگر لوگ تو یوں کہیں گے کہ یہ تو بالکل الٹی بات ہے، عقل کے بالکل خلاف، لوگ رونے لگتے ہیں خوشی کیسے منائیں گے؟

میں کہتا ہوں وہ رنج موت پر نہیں، وہ فراق پر رنج ہوتا ہے۔ موت کی خوشی ہوتی ہے کہ بندہ اپنے خدا سے جا ملا۔ اسی لئے کہا کرتے ہیں کہ کسی کی اگر اچھی موت ہو کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت خوشی کی چیز نہ ہوتی تو کیوں کہتے لوگ؟

معلوم ہوا موت گھبرانے کی چیز نہیں ہے، جو روتے ہیں، وہ موت پر نہیں روتے۔ جدائی پر روتے ہیں کہ ایک نعمت ہم سے چھن گئی۔ ایک چیز ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ تو صدمہ فراق پر ہے موت پر نہیں موت خوشی کی چیز ہے۔ اس لئے کہ یہ مصیبت تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے اللہ سے جاملے۔ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ بندہ محبوب حقیقی تک پہنچ گیا۔

موت کی تمنا کرنا علامت ولایت ہے...... اسی واسطے موت کی تمنا یہ فی الحقیقت ولایت کی علامت بتلائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہود نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم اولیاء اللہ ہیں، تو قرآن نے دعویٰ کیا کہ:

﴿قُلْ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ ① تو خود موت کی تمنا بھی ایک نعمت ہے۔ اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے۔ ''اَللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ اِلٰی مَنْ یَّعْلَمُ اَنِّیْ رَسُوْلُکَ'' ''اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے نبی ہونے کا قائل ہے''۔ اس لئے کہ موت ہی واسطہ ہے اللہ تک پہنچنے کا، موت نہ ہو تو بندہ اللہ تک کیسے پہنچے؟ تو موت ذریعہ ہے وصول الی اللہ کا۔ اس لئے موت تحفہ بھی ہے، نعمت بھی ہے اور واسطہ بھی ہے بندہ کا اللہ سے۔ اس لئے فرمایا کہ: موت کی تمنا کرنا ولایت کی علامت ہے۔

اولیاء اللہ رات دن موت کی تمنا میں رہتے ہیں۔ ان کی زبان پر تو یہ رہتا ہے:۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردیم	راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بردیم
نذر کردم کہ اگر آید بسر زیں غم روزے	تادر میکدہ، شاداں وغزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو ہم چھوڑیں گے، اور شہر مطلوب میں پہنچیں گے، جہاں اللہ سے ہمارا رابطہ قائم ہوگا۔ خدا کرے کہ وہ ساعت جلد آئے تو اولیاء اللہ کے دل میں تو (موت کی) تڑپ رہتی ہے۔

① پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ٦.

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھوپالی نقشبندی خاندان میں سے ہیں اور ہمارے عزیزوں میں سے تھے، ان سے بہت فیضان اور (مخلوق کو) فائدہ ہوا۔ مرضِ وفات جب شروع ہوا، اور موت بالکل قریب آئی تو لوگوں نے جا کر تسلی دی کہ حضرت فکر نہ کریں، ان شاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ غصہ آ گیا مولانا کو فرمایا:۔

''عمر بھر اس وقت کی تمنا میں تھے اور تم اس کو ہٹانے آئے ہو، خدا خدا کر کے وقت آیا کہ موت قریب آئی اور تم موت سے تسلی دیتے ہو کہ اور زندہ رہوں۔ خبردار اس کے بعد یہ جملہ نہ کہو، دعاء کرو حسنِ خاتمہ ہو جائے۔ تسلیاں مت دو کہ میری عمر زیادہ ہو۔ عمر بھر میں اس وقت کی تمنا میں تھا۔ وقت آیا تو تم ہٹانے آ گئے۔''

طالب علمانہ شبہ...... یہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی طالب علم، طالب علمانہ طریق سے شبہ کرے کہ ایک حدیث میں تو موت کی تمنا کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ: ''لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُ کُمُ الْمَوْتَ'' ① ''دیکھو تم میں کوئی موت کی تمنا نہ کرے'' یہاں تو فرمایا جا رہا ہے کہ موت کی تمنا نہ کرو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا دیتے ہیں کہ موت کی محبت ہر قلبِ مسلم میں ڈال دی جائے تو بظاہر تعارض ہے۔

جواب...... میں کہتا ہوں تعارض نہیں ہے جس حدیث میں فرمایا گیا کہ ''دیکھو موت کی تمنا نہ کرو'' اسی روایت میں یہ لفظ بھی ہیں۔ ''بِضُرٍّ نَزَلَ بِہٖ'' موت کی تمنا مت کرو دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر بیماری سخت ہو گئی کہ موت کیوں نہیں آ جاتی؟ افلاس بڑھ گیا، تمنا کرو، اس کی ممانعت ہے کہ دنیا کے مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا مت کرو، یہ بے اعتمادی ہے حق تعالیٰ پر اور یہ بندگی کے خلاف ہے۔ باقی اللہ سے ملاقات کے شوق میں تمنا کرنا یہ ولایت کی علامت ہے تو ہر ولی کامل دل میں شوق رکھے گا اللہ سے ملاقات کا، اور چاہے گا کہ جلد اللہ تک پہنچ جاؤں۔ بہرحال موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے وہاں ایک عظیم تحفہ اور نعمت بھی ہے۔

موت چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے...... میں کہتا ہوں کہ: اس لحاظ سے بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ اگر قیامت تک سارے بڑے بیٹھے رہا کرتے تو چھوٹوں کے جوہر کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ چھوٹوں کا نہ علم سامنے آتا نہ کمال مگر بڑوں کا کمال سامنے رہتا، سب اسی میں لگے رہتے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں تشریف رکھتے تو صحابہؓ کے جوہر نہیں کھل سکتے تھے۔ وہ ہر وقت اطاعت اور اطاعت گزاری میں رہتے، مستقل ہو کر آگے آ کر اپنی طبیعت اور قلب کے جوہر نہ دکھلاتے۔ نہ صدیق اکبرؓ کے جوہر کھلتے نہ فاروق اعظمؓ کے جوہر کھلتے۔ یہ جبھی ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، اور یہ قائم مقام بنے، قائم مقامی کا کام انجام دیا، اس میں تمام جوہر کھلے۔ تو میں کہتا ہوں کہ: اس لحاظ سے بھی موت نعمت ہے کہ چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے۔

اگر آج مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں ہیں۔ بے شک غم کی چیز ہے لیکن ان کے خلف صالح موجود ہیں۔ ان کی ذریت صالح موجود ہے، ان کے تلامذہ موجود ہیں جو اس کام کو جاری رکھیں گے اور ان کی طبیعت میں

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب کراھیۃ تمنی الموت... ج:۱۳ ص:۱۷۸.

جو جو ہر موجود ہیں وہ کھلیں گے۔ اگر مولانا ہی رہتے تو یہ چیزیں کبھی نہ کھلتیں۔ تو یہ بھی ایک فائدہ کی چیز ہے۔ اگلوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے اگے دنیا کو آباد کریں گے، وہی کلمہ پہنچائیں گے۔

موت اصلاح وتربیت کے تعدد وتفنن کا ذریعہ ہے

موت نہ ہو تو نئی نسل کے دین سمجھنے میں دشواری پیش آتی، کیونکہ ہر زمانے کی نفسیات الگ الگ ہوتی ہیں، ہر سو برس بعد نفسیات بدل جاتی ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں وعدہ کیا گیا: ''إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا.'' ① ''ہر قرن پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جاہلانہ طریق پر جو لوگ تاویلیں کر کے دین میں خلط پیدا کر دیں گے۔ اللہ سو برس کے بعد پھر مجدد پیدا کر دیں گے۔ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گا، پھر دین کو نکھار دے گا۔ اس لیے کہ سو برس میں ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر آئندہ آنے والی نسل کے نظریات الگ ہوتے ہیں، افکار الگ ہوتے ہیں، نفسیات الگ ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ اسی دور کے اہل علم اپنی نفسیات میں ان کو دین سمجھانے والے ہوں۔ پرانے لوگ اگر ہوتے تو اپنی نفسیات میں سمجھاتے تو وہ لوگ دین کو نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے اللہ نے موت کو رکھا تاکہ نئے لوگ جب آئیں تو نئے مجدد بھی پیدا ہوں، اسی زمانے کی اصطلاح میں، اسی زبان میں، اسی ڈھنگ سے دین کو پیش کریں اور سمجھائیں، تو موت اس لحاظ سے بھی بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے کہ وہ ذریعہ ہے تربیت اور اصلاح کے تفنن اور تعدد کا، تاکہ مختلف الوان سے تربیت خداوندی میں داخل ہوں۔

ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علماء وقت نے اسلام پیش کیا...... ایک زمانہ تھا کہ روایت کا غلبہ تھا۔ عوام میں سے کوئی اس وقت تک دین کی بات نہیں مانتا تھا جب تک کہ سند پڑھ کر کوئی حدیث نہ سنا دی جائے۔ تو یہ روایت کا دور تھا، روایتی طور پر دین کو قائم کیا جاتا تھا جب تک کہ عقل کے پیرائے میں نہ سمجھائیں تو ایسے علماء اللہ نے کھڑے کئے۔ امام رازیؒ، امام غزالی کہ انہیں کی زبان میں دین سمجھایا، ان کو تائب کیا، پھر ایک زمانہ تصوف پسندی کا آیا، جب تک صوفیانہ رنگ میں کوئی نہ سمجھائے، لوگ نہیں سمجھتے تھے، تو اللہ نے ایسے صوفیائے کرام کھڑے کئے کہ ہر مسئلہ کو صوفیانہ رنگ میں ڈھالتے کہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔

آج حسیات کا دور ہے فلسفۂ قدیم کا دور ختم ہو گیا جو محض نظریاتی طور پر فلسفہ تھا۔ اب حسیات کا دور ہے، مشاہدات کا دور ہے، جب تک ایسے علماء نہ ہوں کہ مشاہدات کے انداز میں سائنس کے انداز میں حسی مثالوں سے دین کو نہ سمجھائیں گے، لوگ نہیں سمجھیں گے، اگر بڑے ہی لوگ بیٹھے رہتے، آج کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے تو دین نہ سمجھا سکتے۔ اللہ نے انہیں اٹھا لیا، ان کے خلف صالح پیدا کر دیئے کہ وہ اس دور کے مطابق اسی رنگ میں سمجھائیں، تو بہر حال موت جیسے فزع اکبر ہے، جیسے عظیم ترین مصیبت ہے، ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے،

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المائة، ج: ۱۱ ص: ۳۶۲.

عظیم ترین انعام خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس کا، بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے، راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا، اور نئے نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا، اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے، اس کی تمنا بھی دل میں رکھے، تو اس لئے میں نے عرض کیا کہ لوگ موت کو ہر وقت وحشت ناک سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ وحشت کی چیز نہیں ہے اگر تعلق مع اللہ مضبوط ہے تو اس سے بڑھ کر نعمت کوئی چیز نہیں اگر غفلت ہے تو بے شک موت عظیم ترین مصیبت بھی ہے، اسی واسطے وہ کفار کے حق میں مصیبت ہے، مومن کے حق میں مصیبت نہیں۔

کافر کی تمنا..... اور فرمایا کہ: کافر تمنا کرتا ہے کہ زندگی بڑھتی ہی رہے۔ ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ. وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ.﴾ ① ”تم ان کفار کو دیکھو گے کہ سب سے زیادہ حریص ہیں دنیا کی زندگی پر موت کے نام سے بھی موت آتی ہے انہیں اور مشرکین کو اگر ہم ہزار برس کی عمر بھی دے دیں تو اسی کی تمنا کریں گے کہ ایک ہزار برس اور ہو“ یہ حال اور خاصہ کفار کا ہے، اور مومن کا یہ ہے کہ بس عمر ہو جائے تو اکتا جاتا ہے کہ اللہ جلد ہی بلا لیجئے کہ آپ سے مل لوں۔

تو بالکل برعکس ہے قصہ، تو موت سے فقط ڈرتے رہنا، گھبراتے رہنا غفلت کی علامت ہے، اور یہ غفلت (عن الحق) کفر کا سرا ہے اللہ بچائے ہر ایک کو، اور حق تعالیٰ سے موت کی تمنا کرنا یہ بیداری اور تعلق مع اللہ کی علامت ہے۔ اس لئے موت کا ایک ہی پہلو نہیں کہ آدمی رنج کرتا رہے بلکہ رنج کرنے سے روکا بھی ہے۔ طبعی رنج جتنا ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اس رنج کو پالنا، تازہ کرتے رہنا، اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا اور فرمایا: ”لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ“ ② ”وہ ہم میں سے نہیں ہے جو موت کے غم میں بال نوچ ڈالے، رخسارے پیٹ ڈالے، چھاتی پیٹ ڈالے۔“ اس لئے کہ موت آتی ہے بیدار کرنے کے لیے نہ کہ غافل بنانے کے لئے، کہ آدمی اسی میں الجھ کر رہ جائے، موت آئی، ”انا للہ“ پڑھا، اس کے بعد مرنے والے کے عمل کو جاری کیا۔ اپنے عمل کو جاری کیا، اپنی تیاری شروع کردی، تو موت بیداری پیدا کرنے والی چیز ہے نہ کہ غافل بنانے والی۔ بیداری جس سے پیدا ہو وہ تو نعمت ہے، مصیبت تھوڑا ہی ہے، مصیبت بنتی ہے اس کے لئے جس پر غفلت طاری ہو۔

غفلت عن الحق کے بُرے آثار..... غافل عن الحق کو موت کے نام سے بھی موت آتی ہے، جو اللہ سے غافل ہو موت کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرے گا، ہر وقت اسی موڑ میں رہے گا۔ پھر اس میں سرکشی تمرد اور بغاوت پیدا ہوگی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ فرعون کی عمر چار سو برس کی ہوئی، اس عمر میں کبھی بھی بیمار نہیں ہوا، کبھی بھی کوئی مصیبت

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۹۶.

② الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب لیس منامن ضرب الخدود ج: ۵ ص: ۱۷۵.

نہیں دیکھی، تو کبر اور نخوت میں اپنے آپے سے باہر ہوگیا، اور کہا: انا ربکم الاعلی ۔یعنی میں سب سے بڑا رب ہوں، اور موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہو، اور کہا:

﴿اَلَيۡسَ لِيۡ مُلۡكُ مِصۡرَ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِيۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ اَمۡ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡ هٰذَا الَّذِيۡ هُوَ مَهِيۡنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيۡنُ.﴾ ① ......کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے پاؤں کے نیچے نہریں جاری ہیں، مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ کرسیاں میری مضبوط ہیں اور میرے مخالفین کو تم عزت دار سمجھتے ہو جس کے کپڑے بھی ٹھیک نہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام، تو توہین کے درپے ہوا۔

یہ کیوں ہوا توہین کے درپے۔ اس لئے کہ غفلت تھی اللہ سے، تو غفلت والے کو موت کے نام سے موت آتی ہے۔ اور (فرعون کی) جب واقعی موت آنے لگی اور لگا ڈوبنے تو باآواز بلند کہا۔ میں ایمان لایا موسیٰ علیہ السلام پر اور ان کے پروردگار پر، جس کو فرمایا گیا:

﴿آٰلۡئٰنَ وَقَدۡ عَصَيۡتَ قَبۡلُ وَكُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ﴾ ② ......’’اب ایمان لایا جب کہ عالم غیب منکشف ہوگیا۔ اور اب تک دنیا میں فساد برپا کرتا رہا‘‘

بعض روایات میں ہے کہ جبریل علیہ السلام اس کے منہ میں ریت ٹھوس رہے تھے کہ ایسا نہ ہو یہ ایسے کلمات کہے، کہیں نجات ہی نہ ہو جائے۔ بدبخت بخشا نہ جائے۔ ساری عمر تو مخلوقِ خدا کو پریشان کیا اور اب نجات پا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ علیہم السلام پر غلبہ حال کا ہوتا ہے غلبۂ محبت کا یا غلبہ عداوت کا۔ بہر حال جب غفلت طاری رہتی ہے، اللہ سے بری رہتا ہے۔ جب بری رہے گا، موت کو ناپسند کرے گا، اور اگر غفلت کی بجائے بیداری اور قلب میں ذکر اللہ ہے تو اللہ سے قریب ہوگا اور موت کی تمنا بھی کرے گا اور وہ ذریعہ بنے گا قربِ خداوندی کا۔ تو موت کا جہاں پہلو غم کا ہے وہاں خوشی کا بھی ہے، جہاں دل بیٹھنے کا ذریعہ ہے وہاں دل کے ابھرنے کا بھی ذریعہ ہے اس واسطے دونوں پہلوؤں کی موت کے اندر رعایت رکھنی چاہئے۔ کوئی میت ہوگئی تو یہ نہیں کہ آدمی غم میں ڈوب کر آپے سے باہر نکل جائے۔ عقل سے بھی کام لے، جو اس کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔

میت پر جزع فزع ......اگر غم میں بیٹھ کر آدمی نے بین کرنا شروع کیا تو میت کو کیا فائدہ پہنچا، بلکہ میت کو تکلیف پہنچتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "اِنَّ الۡمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهۡلِهٖ عَلَيۡهِ." ③ "جب بین کر کے لوگ روتے ہیں تو میت کو تکلیف پہنچتی ہے" اور ایذا پہنچتی ہے یوں کر کے رویا جائے کہ واجبلاہ ہائے تو تو پہاڑ تھا، تو ملائکہ چوکہ لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ تھے؟ وہ کہتے ہیں واشمساہ کہ تو تو سورج تھا، ملائکہ چبھوتے ہیں کہ کیا واقعی آپ سورج تھے؟ اس سے اذیت پہنچتی ہے میت کو۔ تو رونا، بکا، نوحہ، جزع، فزع یہ میت کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

① پارہ: ۲۵، سورۃ الزخرف، الآیۃ: ۵۱-۵۲. ② پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۹۱.

③ الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ یعذب المیت.... ج:۵ ص:۳۰.

اسی واسطے حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ: میت ہونے پر پہلا کام تو یہ ہے کہ صبر کرو اور انا للہ پڑھو۔ دوسرا کام یہ ہے کہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرو، تو وہ رونے سے نہیں پہنچتا، ثواب پہنچانے سے پہنچتا ہے۔ جس کے لئے ایصالِ ثواب ہوگا اس کے لئے باعث خیر و برکت ہوگا۔ تو میت کے لئے ہمیں نافع ہونا چاہئے اور میت کا نام آئے تو اس کے لئے فائدہ کا سامان پہنچانا چاہئے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ: ''اُذْکُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ''۔ اپنے مرنے والوں کی خوبیاں یاد کرو اور لوگوں کے سامنے بیان کرو، مرنے والوں کی برائیاں مت ذکر کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اگر اللہ نے بخش دیا ہے، تم اگر برائیاں کرتے ہو اس سے کیا ہوتا ہے؟ تمہاری زبان گندی ہوگی، وہ تو مغفور ہوگیا۔ جتنا ممکن ہو خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر کرو۔ تاکہ لوگوں کو اچھا کام کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ بہر حال میت ہونے کے بعد دوسرا کام یہی ہے کہ طبعی رنج ہوتا ہے۔ اس سے اللہ نے نہیں روکا۔ لیکن عقلاً روک دیا ہے کہ غم کو پالنے کے لئے مت بڑھاؤ۔

میت پر ضرورت سے زیادہ غم کرنا رسمی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ وہ رسمی غم ہوتا ہے جس کا زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا، کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تو وصیت کر کے جاتا تھا کہ مجھے چھ مہینے رویا جائے، مجھے برس تک رویا جائے تو باندیاں کرائے پر رکھتے کہ انہیں رونے کی مشق ہوتی ہے، جہاں گردن جھکائی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہوگئے۔ تو کرایہ پر جہاں رونے والی رکھی جاتی ہوں، جہاں انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیت کے لئے آیا، یا کوئی نیا آدمی آیا وہاں انہوں نے گھیرا بنایا اور ہاہا شروع کی کہ واجبلاہ۔ واشمساہ واقمراہ۔ ہائے تو تو پہاڑ جیسا تھا وغیرہ، بیٹھی رو رہی ہیں۔ تو راہگیر کہتے تھے کہ کوئی بڑا آدمی مرگیا ہے، جو چھ مہینے گزر گئے اور اب تک رویا جارہا ہے، تو یہ علامت تھی بڑے ہونے کی۔

ظاہر بات ہے کہ یہ رونا کوئی حقیقی رونا تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو رسمی اور بناوٹی رونا تھا۔ اسلام نے تصنع اور بناوٹ نہیں سکھلائی۔ حقیقت بتلائی ہے، کہ محض تصنع اور بناوٹ سے کوئی کام کرنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ طبعی غم ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن عقلی طور پر غم کو پالنا اور بڑھاتے رہنا زمانۂ جاہلیت کی رسم تھی۔ اسلام نے یہ رسم نہیں رکھی۔ اس نے تو یہ سیدھی بات بتلا دی کہ جب کوئی انتقال کرے تو صبر جس سے آئے وہ پڑھو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آیت استرجاع میں عقلا وطبعا صبر کی تعلیم ہے...... اس آیت میں صبر اور تسلی کا پورا سامان موجود ہے۔ جب آدمی نے یوں کہا: انا للہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں۔ اس سے عقلی طور پر صبر آ گیا کہ جب ہم اللہ کی ملک ہیں تو اپنی مملوک میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔ چاہے اٹھائے، چاہے دنیا میں زندہ رکھے۔ ہم کون ہیں اس میں دخل دینے والے؟ اس سے صبر آجائے گا عقلی طور پر کہ ہم مملوک ہیں اور مالک کو اختیار ہے، اپنی مملوک میں جو چاہے کرے۔ مگر طبعاً ابھی تک گھٹن موجود تھی، طبعی رنج بھی ہوا تھا، تو دوسرے جملے میں اس کا علاج بتلایا فرمایا: وانا الیہ راجعون۔ کہ جب ہم بھی وہیں جائیں گے۔ ملاقات ہو جائے گی۔ ہمیشہ کے لئے تھوڑا ہی جدائی ہوتی ہے، تو انا للہ کے لفظ سے عقلاً اور انا الیہ راجعون سے طبعاً بھی صبر آجاتا ہے۔ دعاء اس لئے بتلائی گئی تا کہ صبر تحمل کے ساتھ اپنے عمل میں لگیں، فکر

آخرت میں لگیں، غم میں نہ گھلیں بیٹھ کر...... فارسی میں عرفی کا ایک شعر جس کا ترجمہ یہ ہے) اگر رونے سے مرنے والا واپس آجایا کرتا تو ہم ہزار برس رولیا کرتے، مگر وہ واپس آنے والا نہیں ہے۔ جو گیا سو گیا۔ اب اس جہان میں دوبارہ آنے والا نہیں ہے اب ملاقات ہوگی تو اس جہان میں ہوگی۔ یہ جہان بھی ختم ہو جائے گا۔

مؤمن اور کافر کی موت کا موازنہ...... مؤمن کو تو ہر وقت آس لگی ہوتی ہے کہ اپنے عزیزوں سے ملوں گا، دوستوں سے ملوں گا اور فلاں فلاں سے ملاقات ہوگی۔ کافر جس نے ساری زندگی اسی دنیا کو سمجھا ہے، مایوس وہ ہے مسلمان نہیں۔ اس لئے کہ اسے کوئی تمنا نہیں ہے تو بہر حال اسی حکم (اناللہ وانا الیہ راجعون) سے صبر آجاتی ہے۔

تو میں نے عرض کیا تھا کہ: اس وقت نہ کوئی جلسہ تھا نہ کوئی وعظ کہنا مقصود تھا، نہ کوئی تقریب مقصود تھی، تعزیت مقصود تھی، اور تعزیت ہنگاموں کو نہیں چاہتی، یہ ہمارے مولانا (محمد شریف صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان) نے بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ آپ لوگوں کو تکلیف دی۔ میں تعزیت کے لئے حاضر ہوا تھا تو تعزیت کر کے واپس ہو جاتا۔

لیکن خیر بہر حال جب آپ حضرات تشریف لے آئے اور آپ کا کرم ہوا اور ہماری سعادت ہوئی کہ اتنے بھائیوں کی زیارت نصیب ہوگئی، اتنے بھائیوں سے ملنا ہو گیا۔ تو مجمع کی ہیئت ایسی بن گئی کہ آپ سامنے بیٹھ گئے، مجھے اس کرسی پر بٹھلا دیا، اور سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا، تو خواہ مخواہ بولنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہیئت مقتضی ہوئی، کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس لئے میں نے وہی چند کلمے کہے جو آنکے مقصد سے متعلق تھے اور وہ مقصد تھا تعزیت۔ تو تعزیت ہی کے سلسلے میں کچھ موت کا ذکر، کچھ موت کے پہلوؤں کا ذکر، کچھ مولانا (خیر محمد صاحب) مرحوم کی خیر و خوبی کا ذکر، کچھ ان کے پس ماندگان کا ذکر، اور ان کے خلفاء کا ذکر، یہی چیزیں تعزیت میں آسکتی تھیں اس لئے چند جملے عرض کئے گئے، حق تعالیٰ شانہ صبر کی توفیق دے اور مولانا مرحوم کا نعم البدل ہمیں زیادہ سے زیادہ عطا فرمادے، اور ان کا جو کام تھا حق تعالیٰ اس کو جاری و ساری رکھے۔

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ضروری نوٹ...... ہمارے ہاں یہ بات ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکی ہے کہ ہر نو وارد سے مصافحہ کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس میں دوسرے کی راحت کا خیال پیش نظر نہیں رکھا جاتا، حالانکہ نظم وضبط مسلمان کا امتیازی نشان تھا۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی تقریر فرما چکے تو ایک اژدہام اسٹیج کی طرف اُمڈ آیا، اور مصافحہ کی کوشش میں ادب واحترام اور ایذاء مسلم کا بھی بالکل پاس نہ رہا، بلکہ ایک دھینگا مشتی کا عالم تھا جو نہایت قابل افسوس تھا، اور خصوصاً ایسے مجمع میں جہاں علماء کرام اور مدارسِ عربیہ کے طلباء کرام کی کثیر تعداد تھی۔ لیکن بایں ہمہ وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کم از کم دینی تعلیم یافتہ اصحاب سے نہ تھی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی نے مجمع کی اس پراگندہ حالت کو دیکھ کر نظم وضبط کی تعلیم فرمائی۔ اس کے باوجود حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کو اسٹیج سے اپنی رہائش تک رسائی میں انتہائی وقت اور دشواری پیش آئی۔ جلسہ کے منتظمین مجمع عام ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معذور تھے۔

یہ چند کلمات بھی جو کہ ہمارے قومی مزاج کی اصلاح کے لئے آپ نے ارشاد فرمائے تھے، ذیل میں رقم کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو عمل کی توفیق بخشے۔ (از مرتب غفرلہ)

بحیثیت مسلمان ہونے کے آداب شرعیہ اختیار کریں۔ آپ کے اندر نظم وضبط ہونا چاہئے۔ مصافحہ باعث برکت چیز ہے اور بہت خیر کی چیز ہے۔ اس پر اجر کے وعدے کئے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ دو مسلمان جب مصافحہ کرتے ہیں، اور دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ آجائے تو ہاتھ جدا نہیں کر پاتے کہ دونوں کے گناہوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ تو مصافحہ بڑی باعث برکت چیز ہے مگر ہر اطاعت کے اندر یہ شرط ہے کہ دوسرے کو اذیت نہ پہنچے، تکلیف کا سامان نہ ہو، ایذاء رسانی حرام ہے اور مصافحہ کرنا فرض نہیں۔ ایک مستحب کے لئے ایک مکروہ چیز کا ارتکاب کرے یہ غلط بات ہے۔ لوگ جو مصافحہ کے لئے دوڑتے ہیں، یہ طریقہ آدابِ اسلامیہ کا نہیں ہے۔ اسے بالکل ترک کر دیا جائے اور پھر اس طریق سے ہاتھا دھاپی، جس سے مصافحہ کرتے ہیں وہ بھی عاجز آجاتے ہیں۔ یہاں ہم پاکستان میں عاجز ہوتے، تو قاعدے سے تو ہم پولیس کی حراست میں تھے اور ان کی نگرانی میں تھے اور اب قوم کی حراست میں ہو گئے کہ جب تک حلقہ نہ بنے بھگو دھیڑ نہیں کی جاسکتی۔ یہ کیا واہیات بات ہے؟ یہ مصافحہ ہے؟ یہ تو ایذاء پہنچانا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کی تکلیف نہ کریں۔ جب میں اٹھوں تو راستہ دے دیں۔ یہ مصافحہ خیر و برکت نہیں ہوگا جس میں اذیت پہنچے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے۔ ’’اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ‘‘ ۔ ① مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو یہ ہاتھ سے تکلیف پہنچانا ہے۔

آپ حج کو جاتے ہیں۔ حجر اسود کا بوسہ یا تو مستحب ہے یا واجبات میں سے ہے، مگر جب دوسرے کو تکلیف پہنچے تو شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کو چوم لے، یہ مصافحہ ہو گیا۔ ہاتھ بھی نہ اٹھا سکو تو لکڑی سے اشارہ کرو یہ کافی ہو گیا۔ وہاں تو مصافحہ واجب تھا، اس کے لئے بدل رکھا اور یہاں تو واجب بھی نہیں ہے۔ اس واسطے خواہ مخواہ دوسروں کو اذیت پہنچانا، آپا دھاپی اختیار کرنا، اجر تو اجر، اس پر تو وبال ہوگا۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کا ارادہ نہ کریں۔ اور میں ویسے بھی کمزور ہوں، ضعیف اور بیمار ہوں، خود کو تحمل نہیں کہ ایک ہزار آدمیوں سے مصافحہ کروں۔ ہر ایک تو ایک دفعہ کرے گا، مجھے ایک ہزار مرتبہ ہاتھ اٹھانے پڑیں گے۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا بیٹھیں رہیں اور جب اٹھوں تو راستہ دے دیجئے۔

① الصحيح للبخاري، كتاب الايمان، باب المسلم من سلم المسلمون، ج: ١ ص: ٦.